

2



تاریخ افغانستان

زمانہ قبل از اسلام سے دور حاضر تک

مولانا محمد اسماعیل رحمانی مدظلہ



زمانہ قبل از اسلام سے 2011ء تک

تاریخ افغانستان

جلد دوم

تالیف

مولانا محمد اسماعیل رحمان خان مظفر
استاذ تاریخ اسلام جامعہ الرشیدیہ کراچی



پاک 1-A، گلستان جبر، یو این آر سی روڈ، کراچی
0321-3135009/0321-2000870
www.almanhalpublisher.com
almanhalpublisher@gmail.com

فہرست جلد دوم

27	روس سے سرحدی تنازع	03	فہرست جلد دوم
28	شاہ نادر خان کا خاتمہ	21	بانیسوان باب
28	ظاہر شاہ، ظاہری شاہ	21	بچہ ستہ، نادر خان اور آخری بادشاہ ظاہر شاہ
28	دوسری جنگ عظیم	21	روس سے سوویت روس تک
29	برطانیہ کی ہندوستان سے واپسی	22	سرخ فوج امان اللہ خان کے ساتھ
29	صوبہ سرحد کا مستقبل	22	امان اللہ خان کی مایوسی اور خود ساختہ جلاوطنی
30	پاک افغان تعلقات میں کشیدگی	23	افغان سیاست کا نیا کردار، جنرل نادر خان
30	افغانستان اور روس کے نئے روابط	23	بچہ ستہ قتل، جنرل نادر تخت پر
31	اعداد و ترقی کی آڑ میں سازش	23	نادر خان کے عوامی حکومت
31	سر دارداؤد اور ظاہر شاہ	24	تورالشاخ کی واپسی
32	دردخان کی برطانی	24	نادر شاہ کی پالیسیاں
33	نیا آئین اور جمہوری ادارے	25	ملک کی تنظیمی حالت
34	”مخلق“ اور ”پرچم“ پارٹی	25	کتب طبعی اور کتب حربیہ
34	قومی اسمبلی کی حالت	25	نقصان دہ پہلو
35	دردخان کی سازش	26	ذرائع ابلاغ
35	ظاہر شاہ تخت سے محروم	26	علی آباد کا دارالصحف
35	ماخذ و مراجع	26	سرکاری لباس
	تنیسوان باب	26	ذرائع آمد و رفت
36	کیمونزم کے سائے، جمہوریت اور انقلاب ثور	26	خارجہ پالیسی اور معاہدے
36	پاکستان مخالف بیانات	27	داخلہ پالیسی کے بعض پہلو اور ان کا نقصان

47	گرم پانی تک رسائی کا ردی منصوبہ	37	علیحدگی پسندوں کی تربیت
48	مجاہدین کی تحفظ میں میدان میں	37	ذوالفقار علی بھٹو کی جوانی چال
48	امریکی سفیر کا اغواء	37	اسلام پسند تنظیموں کی کارروائیاں
49	ہرات، خون شہید اس سے لالہ زار	38	داؤد خان کی کایا پلٹ تبدیلی
49	کنڑ میں قتل عام	38	شاہ فیصل مرحوم کا کردار
50	مجاہد رہنماؤں کے خلاف کارروائیاں	39	ایران کی مداخلت
50	حفیظ اللہ امین اقتدار کے لیے سرگرم	39	افغانستان کو روسی ہلاک سے نکالنے کی کوششیں
50	امین کا ماضی	39	داؤد خان کی بیونسٹوں کا مخالف بن گیا
51	ترہ گئی اور امین کا اختلاف	40	سوویت یونین کا بیچ و تاب
52	ترہ گئی کا قتل	40	داؤد خان کے بیرونی دورے
52	حفیظ اللہ امین کا دورہ حکومت	41	میر اکبر کا قتل، غنی سازش
53	ماسکو افغانستان پر چڑھائی کے لیے تیار	41	کریم ڈاؤن
53	ماخذ مراجع	41	فوج حرکت میں آگئی
	چوبیسواں باب	42	داؤد خان کو قتل کر دیا گیا
54	سوویت افواج کی افغانستان پر یلغار	42	انقلاب ثور
54	سوویت سپاہ کا افغانستان میں عمل دخل	42	ترہ گئی کون تھا؟
54	امین..... طاغوت سے مدد کا منتظر	43	ترہ گئی کی پالیسیاں
55	4 لاکھ مجاہدین	44	سوویت یونین سے ناقابل شکست رشتہ
55	بہت بڑا کھیل	44	احتماد اصلاحات
55	ایک لاکھ سوویت فوجی افغانستان میں	45	بقیم رہائیاں اور زمینیاں
56	روس کا امین کے خلاف آپریشن	45	ببرک کارمل برطرف، نت نئی فریب کاریاں
56	امین کا سیاہ کردار اور انجام بد	45	حقیقت چھپ نہ سکی
56	روسی یلغار کے پس پردہ مقاصد	46	ترہ گئی مر اپا جنگ
57	تین بڑے اہداف	46	”جہاد“ کا نیا مفہوم
58	مولانا جلال الدین حقانی کی گواہی	46	شدید ہتھیاریں
58	فوری سبب	47	انقلاب ایران

72	میں مسلمان ہوں	58	دنیا بے خبر تھی
73	کابل میں کوئی محفوظ نہ تھا	59	روس کا نیا مہرہ
73	افغان جنگ کا سوویت اسلحہ	59	ہبرک کارل، روس کی کٹھ پتلی
74	گن شب بلی کا پٹر	60	کیا امین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا؟
74	نیپام بم ہکھلوتا بم	61	ہبرک کارل ایوان صدر میں
74	زہر بلی گیس	61	کارل کے اقدامات
75	افغان حکومت کی نگاہ میں افغان خواتین کا مقام	61	کارل کے منصوبے
75	ناموس کی خاطر!	62	کیونٹزم کا بھرپور پرچار
75	عصمت بنات اسلام تار تار	62	کیونٹسٹوں کا تناسب
76	یہ لٹی لٹی مساجد، یہ آداس سجدہ گاہیں	63	پرچم اور خلق کے اختلافات
76	روس کی غلط فہمی	64	روسی افواج اور کیسیائی ہتھیار
77	گماخو دمراج	64	قرارداد مذمت اور برزنیف کا موقف
	پچیسواں باب	64	روس کو کیا خطرہ لاحق تھا؟
78	جہاد افغانستان کی نامور شخصیات اور تنظیمیں	65	جنرل ضیاء الحق کی دوراندیشی
78	مجاہد رہنماؤں کے چار حلقے	66	پاکستان نے سرحدیں کھول دیں
78	مولانا محمد یونس خالص	66	امریکا حقائق سے لاعلم رہا
79	مولانا جلال الدین خٹانی	66	مونک بھلی کے دانے
81	پروفیسر غلام محمد نیازی	67	جنرل ضیاء الحق کی پالیسی
82	گلبدین حکمت یار	68	جہاد افغانستان عظیم ترین جہاد تھا
83	مولانا محمد نبی محمدی	68	جہاد کے چار مراحل
83	پروفیسر برہان الدین ربانی	70	سوویت افواج کے مظالم
84	احمد شاہ مسعود	71	جبر و قہر کے ہولناک مناظر
85	پروفیسر عبدالرب رسول سیاف	71	مظاہرین پر نازنگ
86	بیر احمد گیلانی	71	ہمارے برقیے تم بہن لو
86	پروفیسر صنعت اللہ مجددی اور غدام القرآن	72	”خون سے لکھی آزادی“
87	مولانا نصر اللہ منصور	72	اسلام کا پرچم!

98	امریکا کے دو تحفظات	88	چند اہم کاماڈر
99	1981ء چاد کا دوسرا سال	88	مولانا ارسلان خان رحمانی
99	افغان فوج کی حالت و زار	88	کاماڈر سید الرحمن
100	حریت پسندوں کو امداد دینے کا فیصلہ کب ہوا؟	89	مولوی جان محمد
100	مجاہدین کے اختلاقات سے فائدہ اٹھایا گیا	89	کاماڈر عبدالعزیز
100	میڈیا کا انداز بدل گیا	89	مولوی دولت اللہ
101	پاکستانی طیارے کا انخوا	90	مولانا نظام الدین حقانی
101	BMD بکتر بند گاڑی	90	چھاؤ افغانستان اور شیعہ تنظیمیں
102	دادی پنج شیر پر حملے	91	ماخذ و مراجع
102	غزنی اور کابل میں کارروائیاں		چھبیسواں باب
102	”مارسل“ کھانی کی لڑائی	92	آگ ہے، اولاد ابراہیم ہے، غمزدہ ہے
103	شیر کا بچہ اور شکار	92	1980ء افغان مجاہدین کا جوش انتقام
103	مجاہدین بارودی سرنگیں استعمال کرنے لگے	92	رہنما تھو گئے
104	وزیر اعظم کشمیر	93	زبردست کارروائیاں
104	روس کا ایٹمی دھماکا	93	مزید روسی افواج کی طلب
104	ٹائٹروجن بم کا استعمال	94	افغان مجاہدین کی اعانت
104	بھارت کو اسلحے کی ترسیل	94	روس کی پاکستان کو دھمکی
105	پاکستان کی مشکلات	95	جزل اسمبلی میں صدر ریاض الحق کی تقریر
105	1982ء ظاہر شاہ، ولی خان اور باچا خان	95	ماسکوا و پکس کا بائیکاٹ
106	ظالم برزنیف چل بسا	95	عالمی سطح پر افغان مسلمانوں سے تعاون کا جذبہ
106	آندرے پوف کے مطالب	96	افغان تہذیب و تمدن کی تباہی
107	کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال	96	”واخان“ کاروس سے الحاق
107	1983ء مجاہدین کی کارروائیاں	97	برزنیف کا دورہ بھارت
108	جزل اسمبلی میں روسی افواج کی قرارداد	97	سوویت اور امریکی ہلاک
108	روس کی ہٹ دھرمی	97	امریکا کے خدشات
108	روس کے ترقیاتی کاموں کی حقیقت	98	جنگ ویت نام کا بدلہ لینے کا موقع

119	ژاور کا معرکہ	109	ہیردکن کی تجارت
119	کارل رخصت	109	کلاشن کوف کلچر
120	ڈاکٹر نجیب اللہ کون تھا؟	109	روس کی نئی حکمت عملی
120	نجیب اللہ کا دور حکومت	110	فضائی بمباری کی کثرت
121	ژاور کی دوسری جنگ	110	شرمناک مظالم
121	ژاور پر روس کا قبضہ	111	احمد شاہ مسعود اور روس کی جنگ بندی
122	کابل میں روسی اڈے کی تباہی	111	1984ء کے اہم واقعات
122	ہیرک کارل کا عبرت ناک انجام	112	افغان طیاروں کی پاکستان پر حملے
123	جہاد افغانستان کا نیا دور	112	آندری پوف کی موت، چرنکو کا اقتدار
123	نجیب ایک خونخوار درندہ	112	چٹ شیر پر ساتواں حملہ
123	خادکی ہوش ربا کار روایاں	113	روس کی مزید کارروایاں
124	سید کی دلخراش داستان	113	مجاہدین میدان میں ڈٹے ہوئے تھے
124	اعتبار نگل کی کہانی	114	قبائلی ملیشیا
125	بکلی کے جھٹکے اور	114	مجاہدین کی دھمکی
125	نجیب کے خلاف افغانوں میں جوش و جذبہ	115	ماخذ و مراجع
125	مجاہدین کے ہتھیار		ستائیسواں باب
126	نجیب کی ایک طرفہ جنگ بندی	116	فیصلہ کن جنگوں کا دور
127	مجاہدین کا رد عمل	116	1985ء کے حالات (جوڑ توڑ)
127	گھمسان کی لڑائیاں	116	مجاہدین کی کارروایاں
127	مجاہدین کے طوفانی حملے	117	ہرات کا محاذ
128	دیکھی طبعیہ کا جہاد میں حصہ	117	محاصرہ جنگیں
128	مجاہدین کے خفیہ ایجنٹ	118	روسی مظالم
128	رحمت خان کی داستان	118	سوویت یونین کا نیا سربراہ گورباچوف
129	نجیب: مجاہدین کو شراکت اقتدار کی دعوت	118	ایک بار پھر جنیوا مذاکرات
130	نجیب اور مولانا حقانی کی مکاتبت	118	پاکستان میں جمہوری حکومت
132	فتح قریب تر	119	روسی طیاروں کا شکار

146	1989ء کے حالات، دوسواضلاع پر قبضہ	133	جنیوا مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں
146	یاسر عرفات کا دورہ کابل	133	1987ء کے جنگی اعداد و شمار
146	عام معافی کا اعلان	133	پاکستان میں مہاجرین افغانستان
147	نجیب کی طرف سے صلح کی تجاویز	135	پاکستان تخریب کاری کی زد میں
147	خوست کی جنگ	136	اد جزی کیپ کا جگردوز سانحہ
147	فتح عزام کی شہادت	137	تخریب کاری کا مقصد کیا تھا؟
148	فتح عزام کی وفات	138	گورباچوف کا اعتراف شکست اور انخلا کا اعلان
149	1989ء کا جنگی گوشوارہ	138	روس اور امریکا کو اسلام سے خطرہ
150	کیونزوم کا جنازہ	138	روس اور امریکا کا گلے جوڑ
150	وسط ایشیا میں بیداری	138	جہاد افغانستان کیا تھا؟
151	روسی کی معاشی ابتری	139	امریکا کے عزائم
151	افغان جہاد کے اثرات دیگر خطوں میں	139	جنیوا مذاکرات میں سازشی دھندلے
151	مجاہدین میں اختلافات..... اتحاد کی نئی کوششیں	140	نیا ایجنڈا
152	ظاہر شاہ ناکارہ مہرہ	141	جنیوا مذاکرات پر شکست یا رکا تبصرہ
153	1990ء کا جنگی گوشوارہ	141	محمد خان جوہنجو نے جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیے
153	جنگ خلیج کا الاء	142	جوہنجو حکومت برطرف
154	خوست فتح ہو گیا	142	صدر فیاض الحق کی المناک شہادت
155	مجاہدین کی مزید کامیابیاں	143	جہاد افغانستان کا نیا دور
155	گردیز کا محاذ	143	مآخذ و مراجع
156	سودیت یونینیں مردار..... ریاستیں آزاد		انٹرنیشنل سو ایں باب
156	نیو ورلڈ آرڈر	144	سرخ رینج کی شکست اور نجیب اللہ کی تکلیف جہاد
157	پختون، ازبک اور تاجک کا فتنہ	144	15 فروری 1989ء روسی افغانستان سے نکل گئے
158	مجاہدین سماں السائیت کے جال میں	145	مجاہدین جلال آباد کی دہلیز پر
159	مسعود کے مددگار	145	سومناٹ کے پہجاری غزنوی کے دہس میں
159	فتح و شکست کا وقت اللہ کے علم میں ہے	145	روسی اسلحہ کی تازہ کیپ
160	کابل کا محاصرہ	145	نجیب محل چھوڑنے پر مجبور

173	مجددی توسیع اقتدار کے خواہش مند	160	انتیسواں باب
174	صبغت اللہ مجددی کے غلط فیصلے	161	فتح کامل، مجاہدین کی حکومت اور خانہ جنگی
174	برحمان الدین ربانی، نئے عبوری صدر	161	حکومت سازی پر مجاہدین کا اختلاف
175	حزب اسلامی اور ملیشیا کا معرکہ	162	نئی عبوری حکومت کی تشکیل
175	عبدالعلی مزاری، حکمت یار کے ساتھ	162	مسعود کاشینوں اور کیونسٹوں سے اتحاد
176	صدر ربانی، دوسرے سے مرعوب	163	نجیب کامل سے فراہم کیوں نہ ہو سکا؟
176	حزب اسلامی اور کیونسٹوں کا اتحاد	163	مسعود نے دوسرے ملیشیا کو کامل کیوں بلایا؟
177	صدر ربانی کا دورہ بھارت	164	کامل پر قہقہے کے لیے جوتوز
177	مدت صدارت میں توسیع	165	جلال آباد فتح ہو گیا
178	جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کا معرکہ	165	عبوری حکومت کی تشکیل کا معاہدہ طے پا گیا
178	صلح مصفا کی کوششیں، معاہدہ اسلام آباد	166	فتح کامل
179	جلال آباد مذاکرات	166	جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی میں کشمشی
180	پاکستان میں نئی حکومت	167	حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کی جنگ
180	معاہدہ جلال آباد کے بعد	168	حزب اسلامی کے مطالبات
181	حکمت یار کے بیرونی طاقتوں سے روابط	168	مجاہدین کو لڑانے میں کیونسٹوں کا حصہ
181	”راہبہ کونسل“ نیا اتحاد	168	صبغت اللہ مجددی مسند اقتدار پر
182	کیم جنوری 1994ء کا خوریز معرکہ	169	میاں نواز شریف کامل میں
182	ملک نکلے نکلے	169	کامل کی دیگر گوں حالت
184	ماخذ و مراجع	170	نجیب کو معافی
	تیسواں باب	170	حرکت انقلاب اسلامی اور حزب میں معرکہ
185	طالبان کا ظہور	171	پاکستان کی بے ادوی کاہر و انیاں
185	بھٹیڑیوں کی شکار گاہ، بدامنی اور لوٹ مار	171	شہر پر کن کن کا قبضہ تھا؟
186	انہیں مجاہد مت کہو	171	مولانا جلال الدین حقانی کی مصالحتی کوششیں
186	افغانستان ایک عبرت کدہ	171	مجددی پر قاتلانہ حملہ
187	جنوبی افغانستان سے ایک نئی قوت کا ظہور	172	معاہدہ ضیاء الحق
187	طالبان کون تھے؟ کہاں سے آئے؟		

204	حزب اسلامی اور طالبان کی مکشش کے عوال	188	لامحمد عمر مجاہد
205	چار آریاب پر حملے کی تیاری	189	لامحمد عمر مجاہد چار دور میں
206	طالبان کا چار آریاب پر قبضہ	190	خانہ جنگی کے دور میں
207	آخذ و مراجع	190	یہ گھڑی معشر کی ہے
	اکتیسواں باب	191	درد کی انتہا
208	لامحمد عمر، امیر المومنین	192	یہ اسی زمانے کی بات ہے
208	طالبان نے کامل پر حملہ کیوں نہ کیا؟	193	امین بولدک کی طرف
209	طالبان کے مطالبات	194	پاکستان کا تجارتی قافلہ
211	احمد شاہ مسعود کا حزب وحدت پر حملہ	195	گل آغا کی چال
211	طالبان کی مغرب کی طرف پیش قدمی	195	پاکستانی قافلہ نرنے میں
211	مزاری کا طالبان سے رابطہ	196	طالبان کی لٹیروں کے خلاف کارروائی
212	طالبان سے بدعہدی..... اچانک حملہ.....	196	فتح قدحدار
213	عبدالحی مزاری کی گرفتاری	197	اسن و امان کا قیام
213	مزاری نے یلی کا پڑا خوا کر لیا	197	فتوحات کا سیلاب
213	مزاری کا قتل	198	ربانی کی طرف سے طالبان کی حمایت
214	طالبان کا احمد شاہ مسعود سے حسن ظن	198	غزنی کے دروازے پر
214	احمد شاہ مسعود کا دوسرا حملہ	199	غزنی۔ طالبان اور حزب اسلامی آنے سائے
215	مغربی حماد..... اسماعیل خان تورون سے مکشش	199	کیا طالبان کسی کے آلہ کار تھے؟
215	طالبان، دوستم اور آئی ایس آئی	201	میڈیا سے دوری
216	طالبان کے خلاف لشکر جہاد کی روانگی	201	حکمت یار اور احمد شاہ کی ضد
217	ہراتی لشکر کا دل آرام اور ہلندہ پر قبضہ	202	حزب اسلامی نے کامل کا محاصرہ کر لیا
217	قدحدار خطرے کی زد میں	202	طالبان کا دردک پر قبضہ
217	لامحمد عمر کا عجیب فیصلہ	202	میدان شہر کی فتح
219	طالبان کی مزید پیش قدمی	203	احمد شاہ مسعود سے میدان شہر میں مذاکرات
219	اسماعیل خان، ربانی سے مدد کا طلب گار	203	سب سے پہلے میرا پوتول
220	اسماعیل خان جلاوطن، طالبان ہرات پر قابض	204	لوگر پر بلا مزاحمت قبضہ

233	سرودی سے پہلے چنی تک	220	اتحاد اسلامی کے کانڈر بھی طالبان کے حامی
234	ربانی کا جموں بیان	220	کابل کا محاصرہ بدستور جاری
234	طالبان کابل میں	221	1995ء کے آخر میں صورت حال
234	نجیب پر راہ فرار مسدود	221	دیوبند کے روسی طیارہ طالبان کے قبضے میں
235	نجیب کا عہد تک انجام	221	طالبان کے خلاف متحدہ کونسل کا قیام
236	کابل میں اسلام نافذ، مکمل امن دلمان، عام مہمانی	222	طالبان کا اتحاد سے انکار
236	اغیار کی گواہی	222	ربانی کا بیرونی دورہ اور اہداف
237	مغربی میڈیا کا شرمناک کردار	223	طالبان تکمیل حکومت کے موڑ پر
238	دارالحکومت قدح جاری رہا	223	طاہر عمر امیر المومنین
238	رشید دوسم سے پالا	224	طالبان سربراہ کا تاریخی خطاب
239	دوسم اور احمد شاہ مسعود کا مشترکہ حملہ	224	چھ نکاتی قرارداد اور بیعت
239	کابل کے دفاع کی جنگ	226	امریکا کی افغانستان میں دوبارہ دلچسپی
240	مولانا حقانی کی امدادی فوج کی آمد	226	تیل کا سمندر اور افغانستان
240	ہرات کے دفاع کا معرکہ	228	چین و امریکا طالبان مخالف اتحاد بنانے میں کوشاں
240	پاکستان میں سیاسی تبدیلی	229	طالبان کی یلغار کے نئے زاویے
241	طالبان سے مسلم دنیا کی بے اعتنائی	229	مآخذ و مراجع
241	راہنہ رائیل کو مت توڑ جواب		بتیسواں باب
242	1997ء کے اوائل کے کچھ اہم واقعات	230	فتح کابل اور سانحہ مزار شریف
243	طالبان کے خلاف خفیہ سازش کا ناکامیابا	230	جلال آباد مسخر ہو گیا
244	مزار شریف	230	ننگر ہار اور کنڑ کی فتح
244	طالبان اور جنرل عبدالماک کے مذاکرات	231	سرودی کی طرف
245	مزار شریف پر دوطرفہ یلغار	231	طالبان سربراہ کی حکمت عملی
245	قاریاب فتح، اسماعیل تور دون گرفتار	231	ملا بور جان کی شہادت
245	دوسم جلاوطن	232	سرودی فتح ہو گیا
246	طالبان مزار شریف میں	233	ربانی انتظامیہ کا اجلاس، اخلاک کا فیصلہ
246	جنرل عبدالماک کا فریب	233	ربانی اور مسعود کا کابل سے فرار

247	بغاوت کے شعلے	260	شمالی اتحاد کی باہمی لڑائیاں
247	طالبان راہنماؤں کی گرفتاری	260	اسامہ بن لادن افغانستان میں
248	عبدالملک شمل کا نیا حکمران	261	اسامہ بن لادن سوڈان میں
249	طالبان قیادت کا ختم	262	طالبان اور بن لادن
250	مختلف محاذوں سے طالبان کی پسپائی	263	پاکستان کا ایٹمی دھماکا
250	تغیر عام اور مقابلے کی تیاری	263	طالبان کا قاریاب پر حملہ
250	طالبان، پٹن خری میں	264	”میمنہ“ پر قبضہ
251	خوزیر لڑائیاں	264	شبرغان کی فتح
251	کابل اور قندوز کی جنگ	265	مزار شریف پر براہ راست حملے کی تیاری
252	طالبان قندوز کی ہمت	265	ملا فضل کی حکمت عملی
252	سیاف طالبان کے حامی	266	مزار شریف سرگرم ہو گیا
252	طالبان قندوز کی یلغار	266	مزار کے مفروین کا تعاقب
252	شمل میں ایک نئی حکومت	267	طالبان مزار شریف میں
253	طالبان کی صحافیوں پر پابندی	267	ایرانی سفارت کاروں کا قتل
253	شمل کا نیا وزیر اعظم ہلاک	267	طالبان کا مالتان پر قبضہ
253	طالبان قندوز سرحدگان پر قابض	268	قتیبہ بن مسلم کے نقوش قدم پر
254	حیرتان بندرگاہ	268	طالبان کی حیرت انگیز جنگی چال
255	دو قسم کی واہسی، طالبان کی پسپائی	269	درہ کیان کی پراسرار دنیا
255	شمالی اتحاد کا نیا خاکہ	270	طالبان کی منصور تادوری کو دھمکی
256	طالبان پر شمالی اتحاد کے مظالم	270	درہ کیان طالبان کے قبضے میں
257	قیدی طالبان سے بے رحمانہ سلوک	271	حماد بھی طالبان کے ہاتھ میں
258	ماخذ و مراجع	271	اسامہ کی حواگی۔ ملا عمر اور سعودی شہزادہ
	تین تیسواں باب	272	ہزارہ جات
259	فتح مزار شریف و بامیان	272	بامیان پر قبضہ
259	1998ء کا آغاز	273	قیدیوں پر مظالم
259	شعبہ امر بالمعروف کا قیام	274	ایرانی فوج کا افغان سرحد پر اجتماع

274	طالبان نے افغانستان کو کیا دیا؟	274	صلح و مقانی
274	اسن و امان، جینے کا حق اور عدل و انصاف	274	خواتین کا دھار اتھرم میا
274	خوف خدا اور شرعی سزائیں	274	احمد شاہ مسعود کے جاہلانہ حملے
275	قومی مرکزیت	275	لا حاصل لڑائیاں
275	اسلمی کلچر کی روک تھام	275	ماخذ و مراجع
275	منشیات کی پیداوار بند		چونتیسواں باب
276	طالبان کے خلاف عالمی سازشیں	276	طالبان کے خلاف عالمی سازشیں
276	آب پاشی اور زرعی ترقی	276	1999ء کے اہم واقعات
276	مواصلات کا نظام بحال	276	دروک کا زلزلہ، بامیان پر حزب وحدت کا قبضہ
277	دینی و عصری تعلیم	277	بدش گھر کر مارنا
277	احمد و مؤذنین کے وظائف	277	قدحاری علماء و مشائخ کا نفرنس
278	سڑکوں کی مرمت، کامل ماسٹر پلان	278	علامہ عمر پر قاتلانہ حملہ
278	سود کا خاتمہ	278	میاں آواز شریف کا تختہ الٹ گیا
279	مصنعی ترقی	279	طالبان اور دنیا کے مظلوم مسلمان
279	افغان ہلال احمر	279	انٹرنیشنل ایر لائن کا طیارہ اغوا
279	نظریاتی اور اصلاحی بگاڑ کی روک تھام	279	اگر آدھا افغانستان تباہ ہو جائے
280	قدحاری کی عید گاہ	280	مزید بات چیت نہیں ہوگی
280	تجارتی روٹیں بحال	280	2000ء اور 2001ء کے حالات
280	طالبان حکومت کا ڈھانچا	280	طالبان امارت اور حکومت و شیشیان
280	تل کا مکمل، وسط ایشیا سے افغانستان تک	280	افغان طیارے کا اغوا
281	امریکی کمپنیوں کی طالبان سے بات چیت	281	علامہ عمر بجاہ کا انتہا
281	تل کمپنیوں کا طالبان سے رابطہ کب ہوا	281	شنگھائی کانفرنس
282	طالبان برید اس کے ہیڈ کوارٹر میں	282	افغانستان میں پوست کی کاشت ختم
282	یونو کال کو کھرا جواب	282	اسلامی تحریکیں اور طالبان
283	بات چیت ختم	283	صدر بش کا اقتدار
283	بامیان کے بت	283	مشتری سرگرمیوں کا انداز

314	ہزار شریف اور عمار کے طالبان بھی قندوز میں	297	جن کو توڑنے کا فیصلہ
314	شمالی اتحاد کا کل کی دہلیز پر	298	بت فروش نہیں بت شکن
315	کاہل بھی ہاتھ سے نکل گیا	298	اسلام پر سمجھوتا نہیں ہو سکتا
315	شمالی اتحاد کے کاہل میں مظالم	299	ملا محمد ربانی کی وفات
316	درندگی کا برہنہ رقص	299	شرعی پابندیوں اور اقتصادی پابندیوں
316	طالبان کی حکمت عملی	300	کاغذ و مراجع
317	جلال آباد طالبان کے بعد		پینتیسواں باب
318	تورا بورا کا محاذ	301	گیارہ مہینہ امریکا کی افغانستان پر یلغار
319	قندوز میں 15 ہزار طالبان محصور	301	احمد شاہ مسعود کا قتل
320	قلعہ چنگی اور کمانڈر شمس الحق نامیری	301	ورلڈ ویڈیو سینٹر میں یوس
321	ایک ہزار غیر ملکی مجاہدین کی الگ راہ	302	پرویز مشرف کا کردار
321	چھ سو مجاہدین سے بد عہدی اور گرفتاری	303	طالبان کو تنہا چھوڑنے کا قطعی فیصلہ
322	177 مجاہدین صحرائیں جاں بحق	303	ملا عمر کے جرات مندانہ بیانات
322	خوڑیہ سر کے کا آغاز	304	صلیبی جنگ کا آغاز
323	ہزاروں طالبان قیدی بن گئے	304	طالبان قیادت اور اسامہ محفوظ
324	طالبان قیدیوں پر بدترین مظالم	305	پاکستان کا کردار
324	کشتیوں سے پٹکتا خون	306	پاکستانی عوام کا جذبہ
325	صحرائی قبر	307	کراچی میں لاٹک مارچ
325	مغرلی میڈیا کا احترام	308	مہلک اور ممنوع ہتھیاروں کا استعمال
326	دوست کے مظالم	308	شاہراہ ریشم بند
327	شہید کا خون ہے	309	مریم ریڈی کی گواہی
327	طالبان امارت اسلامی کا سقوط	310	ہزار شریف سے انخلا
328	اصل مشن امریکا کی تباہی	311	پاکستانیوں کا قتل عام
328	ملا عبدالسلام ضعیف کی گرفتاری	312	بامیان سے پسپائی
329	تورا بورا کے محاذ کا انجام	312	القاعدہ مجاہدین کا قندوز سے انخلا
329	طالبان پر اعتراضات کی حقیقت	313	طالبان سے ازبک مجاہدوں کا انخلا

330	ساجد قوی پر جم ہمال	دہشت گردی کی سرپرستی
343	طالبان کے بعد	خواہن کے حقوق غصب
343	طالبان قیادت کی تلاش میں آپریشن	عورتیں کمروں میں قید
343	دنیاء ادرس کی بندش	عصری تعلیم کی مخالفت
344	گوانا ماسو بے کا مقبوت خانہ	لوکیوں کی تعلیم سے محرومی؟
344	القاعدہ اور طالبان کی تعلیم نو	تہذیب اور آرٹ کے دشمن
345	کرزی کا دورہ پاکستان	بامیان کے بتوں کی تباہی
345	حکمت یاری حکمت عملی	11 دسمبر اور اسامہ بن لادن کی حفاظت
346	گل آغا کو ملا عمر کی دھمکی	احکام کی ایک جنگ
346	شاہی کوٹ کا معرکہ	عورتوں سے متعلق
348	کابل کی صورت حال	ہسپتالوں سے متعلق
349	پاکستان کے مسائل	ڈرائیوروں سے متعلق
349	"لوہہ جڑگہ" کی تاریخ	موسیقی سے متعلق
350	2002ء کا لوہہ جڑگہ	واٹس سے متعلق
350	ظاہر شاہ کی واپسی	دیگر باندیاں
350	جڑگہ میں تاخیر کی وجوہ	نماز کی پابندی
351	اخبار میں لوہہ جڑگہ کی روداد	آخری بات
352	لوہہ جڑگہ سے طالبان کے خدشات	مآخذ مراجع
352	حامد کرزی کی شخصیت	
353	مآخذ مراجع	
	سینٹیوین باب	چھتیسواں باب
	طالبان امریکا سے خبردار آ رہا	افغانستان، امریکی استعمار کے قہقہے میں
354	جنگجو سرداروں کی حکومت مخالف کارروائیاں	یون کا نفرنس
354	ایک سال میں امن و امان کی صورت حال	نئی عبوری حکومت
355	منشیات کی افزائش	حامد کرزی کون؟
355	ایران کی نئی پالیسی	نئے حکمران حامد کرزی کا خطاب
		پاکستان پر بھارتی نوآبادی افغانستان حکومت کے اثرات
		خاندانے نام سے فعال

366	وانا آپریشن اور کمانڈر نیک محمد	356	حکمت یار..... آ مادہ پیکار
367	افغان فوج کو خنزیر کا گوشت	356	افغان عوام ہتھیار اٹھائیں
367	طالبان کی شریعتی عدالتیں	357	طالبان اور القاعدہ کی نئی حکمت عملی
368	صدارتی الیکشن	358	حامد کرزی پر تاحلانہ حملہ
368	11 ستمبر کے حملے کا اعتراف	358	چهار طرفہ جنگ
369	حامد کرزی، افغان صدر	358	بش کی فرعونی سوچ
369	امریکیوں کا قبرستان	359	شمالی اتحاد کے خلاف احتجاج
370	امریکی طیاروں کا شکار	359	پاکستان کی سیاست میں تبدیلی
370	ماخذ و مراجع	359	سردیوں میں گرم محاذ
	اؤتیسواں باب	360	سن 2003ء کے اہم واقعات
371	معرکہ قناتوہا	360	ڈیڑھ سال میں 12 سوار کی ہلاک
371	2005ء کی جھلکیاں	360	عراق پر امریکی یلغار
371	تحریک مزاحمت میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں	361	کرزی کے ہمہ گیر سواروں کا طالبان سے رابطہ
371	افغان طیارے کی تباہی	362	افغانستان میں انسانی حقوق کی پامالی
372	افغانستان کی پہلی خاتون گورنر	362	افغانستان میں بھارت کا اثر و رسوخ
372	روس سے تاوان جنگ کا مطالبہ	362	ملک کا نیا آئین
372	بھارتی وزیراعظم افغانستان میں	362	دہشت گردوں سے مذاکرات؟
373	جسکی جرائم کی کشتی کا قیام	363	جزلی ڈپوس کا اعتراف
374	طالبان کی کارروائیوں پر ایک نظر	363	افغان حکومت کی پاکستانی قبائل کیلئے مراعات
375	القاعدہ کے حملے	363	نیو افغانستان میں
376	2006ء کے حالات	364	طالبان کی کامیابیاں
376	مشتریوں کی یلغار	364	کرزی حکومت کی بے بسی
377	کیس پاپ لائن کا ٹھیکہ	364	کابل میں امریکن یونیورسٹی
378	طالبان کے طوفانی حملے	365	2004ء کے معرکے
378	حامد کرزی، تعاون کے طلب گار	365	ماڈرن دینی مدارس
379	قرآن مجید کی بے حرمتی پر اشتعال	365	حکمت یار کا بیان

379	افغان فوج میں بھرتیوں کی ہم	391	حزب اسلامی سے کشیدگی ختم کرنے کی کوشش
380	کابل میں کرنیو	391	ملاداد اللہ کی شہادت
380	ملاداد اللہ کے حملے اور حمکی	392	اشتہائی کارروائیاں، کرنزی پر راکٹوں کی بارش
380	امریکی سفارت خانے کی رپورٹ	393	افغان عوام کا قتل عام
381	طالبان کی کارروائیوں کی تیز ترین لہر	393	پاک افغان تعلقات میں بہتری
382	ترجمانوں کا قتل ہو گیا	393	امن جرگے کے لیے پاک افغان مذاکرات
382	نیٹو اواج کی جنوبی افغانستان سے پسپائی	395	جرگے کے نتائج
383	طالبان کی فتوحات	395	کرنزی کا طالبان سے مذاکرات کیلئے رابطہ
383	صلح و صفائی پر غور و خوض	396	طالبان کی کارروائیاں
384	نیٹو کی تین شرائط	396	ملک کی حالت زار
384	اس جنگ نے ملک کو کیا دیا؟	397	میسائی مشنریوں کا اغوا
385	کرنزی کی مشکلات	397	اتحادیوں کا گرتا ہوا مورال
385	مجددی کی حمکی	397	امریکا کا پاکستان پر تنک
386	مدمام حسین کو پھانسی	398	طالبان کے لیے ایرانی اسلحہ
387	ماخذ و مراجع	398	تیز تر ہوتی جنگ
	انتالیسواں باب	399	تحریف قرآن کا مجرم گرفتار
	بش کا آخری راولڈ	399	امریکا کو کرنزی کے تبادل کی تلاش
	2007ء کے حالات	399	کرنزی کا طالبان کے لیے پیغام
	افغان مہاجرین کی واپسی کا مسئلہ	400	اقوام متحدہ کی سالانہ رپورٹ برائے افغانستان
	اغوا کے واقعات	400	ظاہر شاہ کی وفات
	لکھنؤ کی کاغذیہ	400	2008ء میں طالبان کی کامیابیاں
	شمالی اتحاد کا کرنزی کے خلاف جلوس	400	موسیٰ قلعہ میں علامہ عبدالسلام کی اہمیت
	نیٹو کی کچھ کامیابیاں	401	برطانوی شہزادے "ہیری" کی آمد و رفت
	طالبان سے مذاکرات کیلئے جرگہ بلائے کی تجویز	401	موسم بہار اور کابل میں پھل
	پاک افغان جرگے کا پہلا دور	401	ڈنمارک کی فوج پر حملہ
	سیاف کے ذریعے طالبان کے خلاف حماد	402	حاجی عبدالکبیر کا قتل

413	جنرل میک کرشل اور صدر اوباما کی ملاپ	402	بھارتی انجینئر نشانہ بن گئے
413	نئی پالیسی کمر؟	402	حامد کرزی پر قاتلانہ حملہ
414	کھانیانی ملی کھانوں پر	402	ارکون میں نیٹو کا کرل ہلاک
415	امریکی فوجیوں کی خود کشیوں کا ریکارڈ	402	قندھار جیل سے سینکڑوں قیدی آزاد کرائے
415	2009ء، افغانستان میں امریکی مظالم	404	کابل میں بھارتی سفارت خانہ پر حملہ
415	جراثیمی اور ممنوعہ کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال	404	فرانسیسیوں کی شامت
415	گوانتانامو بے میں مظالم جاری رہے	404	ٹارگٹ کلنگ اور اغوا کی کارروائیاں
416	طالبان کا قتل عام، دوسم اور سی آئی اے	405	نیٹو کی رسد پر حوصلہ شکن حملہ
416	نیٹو کی حالت زار، نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن	405	رسد کے نئے راستے کی تلاش
416	اٹلی ہو گئیں سب تدبیریں، نیٹو کی ساکھ ختم	406	بے گناہ شہریوں پر اندھا دھند بمباری
417	34 میں سے 33 صوبے طالبان کے پاس	406	قیدیوں پر کتے چھوڑ دیے
417	رسد پر حملے جاری رہے	406	صحافی جاوید احمد پر مظالم
418	اوباما دس سے مدد لینے پر مجبور	407	ڈاکٹر عافیہ صدیقی بگرام جیل میں
418	کنٹینر زتباہ ہوتے رہے	407	افغانستان کے خزانوں پر ڈاکرزی
418	امریکا کی ذہنی معیشت 2009ء میں	408	بش اور پرویز شرف کو چاقو اتر سے باہر
419	کرزی حکومت کے مسائل	408	عراقی صحافی نے بش کو جوتوں کا متحدہ دیا
419	کرزی بدوں اور بھارت سے دوستی بیڑیا کا خطر	409	افغانستان میں بڑے فوجی اڈوں کی تعمیر کا منصوبہ
420	کرپٹ افغان حکومت، انتخابات کی تاریخ	409	ملا محمد عمر نے مذاکرات کا امکان مسترد کر دیا
420	20 اگست 2009ء کے عام انتخابات	409	انتخابات میں شرکت کیلئے حکمت یار کی شرائط
420	کرزی نے دنگل جیت لیا	410	ماخذ مراجع
421	دعائدی کا اعتراف		چالیسواں باب
421	توہین قرآن پاک، کرزی کے خلاف نعرے	411	اوباما اور افغانستان
421	امریکا نوازا کابینہ کی تشکیل	411	2009ء کے حالات
422	طالبان کی کارروائیاں	411	اوباما کی صدارت، اوباما کی حکمت عملی
422	موسم بھار کے معرکے	412	جنرل میک کرشل کا اصرار، اوباما کو ٹیل پر اتر
423	طالبان اور امریکی اسلحہ	413	امریکی قیادت مجھے کا شکار

437	ماخذ و مراجع	423	طالبان نیٹ ورک وسیع
	اکتالیسواں باب	424	میک کرشل کی کمان میں خجرا پریش
438	امن مذاکرات اور شدید معرکے	424	فضائیہ بھی طالبان کی زد میں
438	2010ء کا افغانستان، طالبان کی کارروائیاں	425	آپریشن خجرا کی ناکامی
438	18 جنوری، کابل کا معرکہ	425	قدوز میں 98 شہری شہید
438	کابل دھماکا، اراکے افسران ہلاک	425	ملاح محمد عمر کا اہم بیان
438	امریکا اور اتحادی فورسز کے متفرق نقصانات	426	نورستان میں اتحادیوں کی بدترین پسپائی
440	امریکا، اتحادیوں اور افغان فورسز کا مطالبہ نقصانات	426	بھارتی سفارت خانے پر حملہ
440	نیٹو کے مطالبہ	426	طالبان اور القاعدہ کی تکنیک
441	افغان عوام کے مظاہرے	427	مزید کارروائیاں
441	امریکا کی کارروائیاں، سازشیں اور نا کامیاں	428	سی آئی اے کے افسران کا شکار
441	آپریشن مشترک	429	مذاکرات کی بانسری
442	آپریشن قدح ہار	430	طالبان جھانسنے میں نہ آئے
443	امریکا کا دیوالیہ، عراق جنگ ختم	431	۱۳ اکتوبر، وائٹ ہاؤس میں اہم اجلاس
443	میک کرشل کا استعفیٰ	431	2009ء: پاکستان کے لیے خطرات
445	اتحادیوں کی پسپائی	432	سرحدات پاکستان پر ڈرون حملوں میں اضافہ
445	مڈرم انٹیکشن میں اوباما کی پارٹی کو شکست	432	نظام عدل ریگولیشن
445	نیٹو کا اہم اجلاس	433	امریکی اتحادی بننے کا انعام!
445	ایک دکاندار امریکی جہازوں کو بے وقوف بنا گیا	433	جلال آباد کا ڈرون ایریش
446	ٹارڈیو	433	بلیک وائر کی پاکستان آمد
446	افغانستان کی تقسیم پر غور	434	جنوبی وزیرستان آپریشن، کوئٹہ پر امریکا کی نظر
446	رجیڈ ہالبروک، افغانستان نے دل توڑ دیا	434	کیری لوگر بل، ملاحظہ جان کا بیان
446	مسئلہ افغانستان پر استیصال کانفرنس	435	بھارت کے مورچے افغانستان میں
447	لندن کانفرنس	435	نئی امریکی پالیسی سے پاکستان سٹائر
447	کرزئی کے حزب اسلامی سے مذاکرات	436	2009ء میں پاکستان کے نقصانات
448	لوہیہ جرگہ	436	پاکستان کا دھوکہ جواب

469	افغان عوام	449	عالمی ڈورز کا نفرنس کاٹل، مصاحبتی کونسل
470	امریکی اڈے	451	کرزئی خاندان، سرمایہ بیرون ملک منتقل
472	افغان بچوں کی حالتِ زیار	451	عام انتخابات
473	ماخذ و مراجع	451	پاکستان اور بھارت کی افغانستان میں کش مکش
	تیمتالیساواں باب	453	پاکستان اور امریکا
474	افغانستان کا حال و مستقبل	453	نیٹو کی رسد بند
474	امریکا کی انخلاء سے قتل کی منصوبہ بندیاں	454	پاکستان سے طالبان لیڈروں کی گرفتاریاں
475	مذاکرات اور پاکستان کا کردار	455	روس اور امریکا کے تعلقات
478	مستقبل کے خطرات، گریٹ ٹیم	456	2010ء کی متفرق خبریں
	جواالیساواں باب	457	وکی لیکس کے انکشافات
481	کیا افغان بنی اسرائیل ہیں؟	458	ملا محمد عمر کا دوسرا پیغام
487	یہ روایت کب اور کیسے مشہور ہوئی	459	ماخذ و مراجع
489	انٹرنیٹ ربرز کی تحقیقات		بیالیساواں باب
490	والٹری بیلو کی غریب کاری	460	2011ء میں
491	جارج روز کا نظریہ	460	طالبان کی کارروائیاں
491	ایک اور دلیل	461	اسامہ بن لادن کی شہادت
492	مدنی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری	464	برہان الدین ربانی کا قتل
492	افغان اور بنو اسحاق	465	احمدولی کرزئی کا قتل
494	خلاصہ بحث	465	اسمن مذاکرات، دورے، عالمی کانفرنسیں
495	یہ پروپیگنڈا کیوں کیا گیا؟	468	بیسواں لویہ جرگہ۔ امریکی اڈوں کی منکوری
496	القدس العربی کا انکشاف	468	پاک امریکا تعلقات میں کشیدگی
498	گزشتہ موجودہ صدی کے حکمران ایک نظر میں	469	قطر میں طالبان کا سیاسی دفتر



بانیسواں باب

بچہ سقہ، نادر خان اور آخری بادشاہ ظاہر شاہ

بچہ سقہ اب افغانستان کا حکمران تھا۔ ایک دیہاتی، ناخواندہ اور امور مملکت سے قطعاً ناواقف شخص جو پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں پولیس اور فوج کو چکے دیتا رہا، صد سالہ بزرگی بادشاہت کو قدموں تلے روند کر اب افغانستان کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا تھا۔ اسے تقدیر کے کرشمے کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

بچہ سقہ نے چند دن بعد اپنی کابینہ تشکیل دی جس میں کئی افراد اسی جیسے دیہاتی اور آن پڑھ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے ساتھ ماضی کی مہمات اور معرکوں میں شریک رہے تھے اس لیے اس کے نزدیک حد درجہ قابل اعتماد تھے مگر ان میں سے بعض اس قابل بھی نہ تھے کہ خود مستحضر کر سکیں۔

روس سے سوویت روس تک: امان اللہ خان کی اقتدار سے محرومی اور بچہ سقہ کی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی افغانستان میں سوویت روس کی اس مداخلت کی راہ ہموار ہونے لگی جس کی انتہاء 1979ء میں سرخ فوج کے دریائے آمو عبور کرنے پر ہوئی۔ بچہ سقہ کی حکومت ایک کمزور حکومت تھی جو حادثات کی پیداوار تھی۔ یقیناً کسی خارجی سہارے کے بغیر وہ پنپ نہیں سکتی تھی۔

بچہ سقہ کے گردہ کے زیادہ تر افراد وہ تاجک اور ازبک تھے جن کے قبائل روس افغان سرحدوں کے ساتھ ساتھ آباد تھے۔ پھر بچہ سقہ نے سابقہ حکومت کی پالیسیوں کو ختم کرنے کے اعلان کے ساتھ اقتدار چھینا تھا اس لیے اس کے برسرِ اقتدار آتے ہی ماسکو میں کابل کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے روسی حکام کا اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا اور اس بات پر غور کیا گیا کہ آیا بچہ سقہ افغانستان میں سوویت روس کے نظریات کی کاشت کے لیے بہترین آلہ کار ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اُدھر امان اللہ خان جواز خود تخت سے دستبردار ہوا تھا، ایک بار پھر قہر مار میں حصولِ اقتدار کے لیے سرگرم ہو گیا۔ اس نے برطانیہ افغان جنگ کے ہیرو جنرل نادر خان کو قہر مار بلا کر اسے اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا اور بدلے میں اسے وزیر اعظم بنانے کا وعدہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی امان اللہ خان نے بیک

وقت دو بڑی طاقتوں سے روابط کا آغاز کیا۔ ایک طرف: رخان کو برطانوی حکام سے بات چیت کے لیے ہندوستان بھیجا جو فروری 1929ء میں بمبئی پہنچا اور برطانوی اعلیٰ افسران سے گفت و شنید کی۔ دوسری طرف غلام نبی اور غلام صدیق ماسکو میں روسی قیادت سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اسٹالن اور پرائم کوف جیسے اشتراکی قائدین سے بھی ان کی ملاقات ہو گئی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ افغانستان میں حکومت بنانے یا اسے برقرار رکھنے کے لیے حزب اقتدار اور حزب مخالف دونوں روس کے محتاج تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ روس افغانستان پر بری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔

سرخ فوج امان اللہ خان کے ساتھ: روسی قیادت نے بچہ ستہ اور امان اللہ خان کا موازنہ کرنے کے بعد آخر کار امان اللہ خان ہی کو موزوں تصور کیا کیوں کہ اسے بنیادی طور پر برطانیہ مخالف اور روس نواز تصور کیا جاتا تھا۔ روسی حکام اس کے لیے بھی تیار ہو گئے کہ وہ کامل کو بچہ ستہ سے جھینے اور امان اللہ خان کے حوالے کرنے کے لیے سرخ فوج دریائے آمو کے پار اتاریں گے۔ روس کی حمایت پر بھروسہ کر کے امان اللہ خان نے 25 مارچ 1929ء کو قندھار سے کابل کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ اس کے ہمراہ ہزارہ قبائل کے افراد کی بہت بڑی تعداد تھی۔

ادھر امان اللہ خان کا نمائندہ غلام نبی ماسکو سے واپس آ کر شمالی افغانستان میں آٹھ ہزار کاشغر جمع کر چکا تھا۔ روسی جنرل پرائم کوف بھی سرخ فوج کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا۔ 30 اپریل کو غلام نبی نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا اور پھر کابل کی طرف بڑھا۔ درہ ظلم پر بچہ ستہ کے گروہ سے زبردست مقابلہ ہوا جس میں بچہ ستہ کے تین ہزار حمایتی مارے گئے۔

افغان عوام پر اب یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ سوویت یونین امان اللہ خان کی پشت پر ہے۔ اس لیے بچہ ستہ نے عوامی جذبات کو ابھار کر انہیں اپنی حکومت کے دفاع اور امان اللہ خان کے حامیوں سے مقابلے پر تیار کرنے کی کوشش کی۔ اس نے عوام کے نام ایک پیغام میں کہا:

”میرے پیارے بھائیو! میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے امان اللہ خان پر لکھت اور تکلیف نازل فرمائی۔ یہ دنیا و آخرت کے خسارے میں رہے گا۔ آپ اٹھیے! شرابی اور بے دین غلام نبی کو ملک سے باہر نکال لیں۔“

امان اللہ خان کی مایوسی اور خود ساختہ جلاوطنی: ایسا لگتا تھا کہ امان اللہ خان جنگ جیتنے والا ہے مگر بچہ ستہ کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ وہ ”خسارے میں رہے گا۔“ امان اللہ خان کو کئی فتوحات کے بعد غیر متوقع طور پر غزنی میں شکست ہوئی۔ وہ اس شکست سے اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ اس نے افغانستان ہمیشہ کے

لیے چھوڑ دیا اور براستہ قندھار 23 مئی کو ہندوستان چلا گیا۔ اس کا ترک وطن کا فیصلہ نہایت ہچکچاہٹ تھا کیونکہ ابھی شمال سے اس کی حامی فوج غلام نئی اور روسی جنرل کے ہمراہ کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیز اس کا معتد جنرل نادر خان بھی پشاور سے افغانستان میں داخل ہو چکا تھا اور اس کے پاس بھی خاصی فوج جمع ہو چکی تھی۔ بہر کیف امان اللہ خان کے ملک چھوڑتے ہی اس کی حمایت میں لڑنے والے لوگ منتشر ہو گئے۔ غلام نئی بھی مایوس ہو کر پہلے مزار شریف اور پھر وہاں سے سوویت یونین چلا گیا۔

افغان سیاست کا نیا کردار، جنرل نادر خان: اس موقع پر افغانستان کی تاریخ میں جنرل نادر خان سب سے اہم کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ وہ امان اللہ خان کا نمایندہ بن کر ہندوستان گیا تھا اور برطانیہ کو اعتماد میں لے کر 8 مارچ کو افغانستان میں داخل ہوا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد کابل کو امان اللہ خان کے لیے مسخر کرنا تھا مگر قرآن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کابل پر قبضے اور اپنی حکومت کے قیام کا ارادہ رکھتا تھا اس لیے افغانستان آ کر اس نے امان اللہ خان سے رابطہ کیا نہ بچہ سقہ سے۔ وہ تماشا دیکھتا رہا اور پھر جوں ہی امان اللہ خان غزنی میں شکست کھا کر ہندوستان فرار ہوا، جنرل نادر اپنی فوج کے ساتھ کابل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ موجودہ پاک افغان سرحدی قبائلیوں کی بہت بڑی تعداد تھی کیونکہ یہ لوگ اسے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے والے ایک بڑے مجاہد کے طور پر جانتے تھے۔

بچہ سقہ قتل، جنرل نادر تخت پر: جنرل نادر خان نے 13 جون 1929ء کو بچہ سقہ کی فوج کو شکست دے دی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے 15 اکتوبر کو کابل میں داخل ہو گیا۔ 16 اکتوبر کو وہ کابل کے تخت شاہی پر براجمان تھا جبکہ بچہ سقہ صرف نو ماہ حکومت کر کے کوہستان کی طرف فرار ہو چکا تھا۔ جنرل نادر نے بچہ سقہ کو معافی کا جھانسا دے کر کچھ دنوں بعد گرفتار کر لیا اور پھر سر کردہ ساتھیوں سمیت اسے کابل میں توپ سے اڑا دیا۔ تخت نشینی کی توثیق کے لیے جنرل نادر خان نے ایک جرگہ طلب کیا جس میں 286 عمائد اور امراء نے اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کے بعد اس نے سابق حکمران اور اس کے وفاداروں کے خلاف کارروائیاں شروع کیں۔ امان اللہ خان کی وطن واپسی پر پابندی لگادی، اس کی جائیدادیں ضبط کر لیں، اس کے کئی اہم وفاداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ امان اللہ خان نے کچھ دن ہندوستان میں گزارنے کے بعد اٹلی میں سیاسی پناہ حاصل کی اور تادم مرگ وہیں زندگی گزاری۔

نادر خان کے عمائد حکومت: جنرل نادر خان اب شاہ نادر خان بن گیا تھا۔ اس نے 1919ء کی جنگ میں برطانیہ کے خلاف جو کارنامے انجام دیے تھے اس کی بنا پر وہ نہ صرف افغان عوام میں بلکہ ڈیورنڈ لائن کے پار سرحدی قبائل اور ہندوستانی مسلمانوں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ افغانوں کو

اس سے نیک توقعات تھیں اور نادر شاہ نے بڑی حد تک ان پر پورا اترنے کی کوشش کی۔ اس کا دور حکومت عمومی زاویہ نگاہ سے پُر اس تھا۔ البتہ سابقہ حکمران کے ان حامیوں کو کچلنے میں اس نے سختی سے کام لیا جو موجودہ حکومت کے خلاف سرگرم تھے۔ ہاں! امان اللہ خان کے خاندان کے وہ لوگ جو اس کے حامی تھے، عزت و احترام کے حق دار رہے۔ مثلاً: شہزادہ اسد اللہ خان کو جو امان اللہ خان کا سوتلا بھائی تھا شاہی فوج کا کمانڈر مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت کے دیگر اہم ارکان میں سردار شاہ محمود خان وزیر حرب، سردار احمد خان وزیر دربار، سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور میر عطا محمد خان صدر مجلس اعیان شامل تھے۔ یہ مجلس اعیان گویا حکومت کی مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ تھی۔ ان سب عمائد سے بڑا رتبہ نادر شاہ کے بھائی سردار ہاشم خان کا تھا جو صدر اعظم کے منصب پر فائز تھا اور عملاً تمام امور اس کی گرفت میں تھے۔ اس کے اختیارات کسی طرح بھی یورپی ممالک کے صدر سے کم نہیں تھے۔

نادر شاہ نے حکومت میں ہمسایہ ممالک کے ان قابل اور وفادار افراد کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا جو افغانستان کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم جو سرحد پار کر کے افغانستان چلے گئے تھے ان میں سے ایک صاحب اللہ نواز خان تھے۔ نادر شاہ نے انہیں ”وزیر فواید عامہ“ مقرر کیا تھا۔ انہوں نے بچہ ستہ کے خلاف نادر شاہ کو کامیابی دلانے میں بھی بھرپور کردار ادا کیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے ایک اور صاحب عبداللہ عرف شاہ جی افغان فوج میں نائب سالار تھے۔ نادر شاہ کا بھائی شاہ ولی خان بھی حکومت کے اہم ستونوں میں سے ایک تھا۔

نور المشائخ کی واپسی: نادر شاہ نے ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ سابق حکمران کے دور میں جلاوطن کیے جانے والے مشہور صوفی بزرگ نور المشائخ حضرت فضل عمر مجددی کو واپس کابل بلا لیا تھا۔ نور المشائخ کے جلاوطنی کے کئی سال پہلے ہی میں گزرے تھے اور وہاں وہ ”ملائے شور“ کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ نادر شاہ نے انہیں عزت و احترام سے واپس بلوا کر ”وزیر عدلیہ“ کا عہدہ دے دیا۔ نادر شاہ کو ان سے ایک خاص عقیدت تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ 1919ء کے جہاد میں حضرت نور المشائخ نے قبائل کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور لشکر کشی کے وقت وہ بذات خود نادر شاہ کے ساتھ تھے۔

نادر شاہ کی پالیسیاں: نادر شاہ نے امان اللہ خان کی ان غیر شرعی ترقی پسندانہ پالیسیوں کو پروان نہیں چڑھنے دیا جن پر افغان علماء اور عوام کو سخت اعتراض تھا۔ تاہم کچھ امور ایسے تھے جو سابق حکمرانوں کے دور سے سرکاری نظام و مزاج کا حصہ بن چکے تھے اور انہیں دور کرنا نادر شاہ کے لیے جلد ممکن نہ تھا۔ نادر شاہ ذاتی طور پر ایک خوش اخلاق، اسلام پسند، محب وطن اور خلص آدمی تھا۔ مگر اس کے پاس گہری منصوبہ

بندی اور اہداف کا تعین کرنے والے لوگوں کی کمی تھی۔ افغانستان کے شعبہ تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت تھی مگر نادر شاہ اس سلسلے میں فکر مند ہونے کے باوجود کوئی خاص تبدیلی نہ لاسکا۔

ملک کی تعلیمی حالت: اس دور میں کابل کا مشہور دینی مدرسہ ”دارالعلوم عربی“ تھا جہاں قدیم انداز میں درس نظامی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ جدید تعلیم کی کئی اعلیٰ درجہ ہیں کام کر رہی تھیں جن میں کتب منارِ نفیسہ، مکتبہ حبیبیہ، کتب استقلال، کتب زراعت، کتب طبعی، کتب نجات، کتب دوسازی اور کتب دارالمعلمین قابل ذکر ہیں۔ یہاں کتب سے مراد کالج ہے نہ کہ ابتدائی تعلیم کی درس گاہ۔

بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے کے لیے دارالحفاظ قائم تھا۔ کتب منارِ نفیسہ فنون لطیفہ یا فائن آرٹس کا مرکز تھا جہاں تالین بانی، نقاشی، مصوری اور نجاری کے فنون سکھائے جاتے تھے۔ یہ کتب شاہ امان اللہ خان کا جاری کردہ تھا اور اس میں بعض جرمن اساتذہ بھی فنون سکھاتے تھے۔ ان میں سب سے قدیم کالج کتب حبیبیہ کی بنیاد شاہ حبیب اللہ خان نے رکھی تھی۔ کتب استقلال فرانسیسی زبان سکھانے کا کالج تھا جبکہ کتب نجات میں جرمن زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ دونوں شاہ امان اللہ خان کی یادگار تھے۔ کتب زراعت جو کابل اور پغمان کے درمیان واقع تھا، باغبان اور کاشتکاری کی تعلیم کا مرکز تھا۔ کتب دارالمعلمین میں اساتذہ کو تدریس کی تربیت دی جاتی تھی۔

کتب طبعی اور کتب حربیہ: کتب طبعی شاہ نادر خان نے اپنے دور میں قائم کیا تھا۔ یہ میڈیکل کالج آگے چل کر موجودہ کابل میڈیکل یونیورسٹی بنا۔ اس کا معیار تعلیم بہترین مانا جاتا رہا ہے۔ کتب دوسازی (فارمی) کتب طبعی ہی کا پھیلاؤ تھا۔ ان کے علاوہ نادر شاہ نے یتیم خانہ نادری کے نام سے لاوارث بچوں کے لیے ایک عمدہ درس گاہ بنوائی تھی جس میں دارالافتاء کی سہولت موجود تھی۔

نادر شاہ نے عسکری تعلیم میں ترقی کے لیے کتب حربیہ (ملٹری کالج) کی بنیاد رکھی۔ اس نے سدوزئی حکمرانوں کے مرکز قلعہ بالا حصار کو اس کام کے لیے پسند کیا۔ قلعہ بالا حصار کابل کا قدیم ترین قلعہ ہے۔ چنگیز خان کے حملے کے وقت بھی یہ موجود تھا۔ 1879ء (1396ھ) میں برطانیہ نے کابل پر حملے کے دوران اسے توپوں کی مسلسل گولہ باری سے اتنا شکستہ کر دیا تھا کہ یہ پتھروں کا ڈھیر اور محض کھنڈر نظر آتا تھا۔ نادر شاہ خان نے اسے از سر نو آباد کرنے کے لیے یہاں ملٹری کالج بنانا چاہا۔ افغانستان کے قومی دن کے موقع پر نادر شاہ نے یہاں بدست خود کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ پھر عوامی سلطنت اور عوام نے کمالیس اور پھاؤڑے لے کر اس کھنڈر کو ہموار زمین میں تبدیل کر دیا۔ تاہم یہاں تعمیراتی کام کی ابتداء نادر شاہ کی زندگی میں نہ ہو سکی۔

نقصان دہ پہلو: تعلیمی شعبے کے مذکورہ بالا پہلوؤں سے واضح ہو جاتا ہے کہ نادر شاہ اور اس کے وزراء

دشیران کے ذہن میں تعلیم کو ترقی دینے کے جذبے کے باوجود کوئی مربوط، واضح اور دور رس نظام نہ تھا۔ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی کالجوں کے قیام سے تو تعلیم یافتہ لوگوں کے تین گروہ بن گئے تھے۔ یہ افراد مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی، فرانس یا برطانیہ کا رخ کر لیتے تھے اور پھر بڑی حد تک انہی کے رنگ میں رنگے جاتے تھے۔ سرکاری سطح پر کوئی ایک تعلیمی نظام نہ ہونا ملک کی بڑی بد قسمتی تھی۔

ذرائع ابلاغ: دنیا میں یہ زمانہ میڈیا دار کے آغاز کا تھا۔ اخبارات کا گھر گھر چڑھا اور ریڈیو عام ضرورت کی چیز بن چکا تھا۔ تاہم نادر شاہ کے دور میں افغانستان میں ذرائع ابلاغ ایک دو اخبارات تک محدود تھے۔ حبیب اللہ خان کے زمانے میں سراج الاخبار، امان اللہ خان کے دور میں ”امان افغان“ کچھ سترہ کے عہد میں ”حبیب الاخبار“ اور نادر شاہ کے ایام میں ”اصلاح“ مقبول ترین قومی جرائد رہے ہیں۔ بہر حال نادر شاہ نے پریس کو ترقی دینے کے لیے کئی اقدامات کیے اور جرمنی سے جدید ترین مشینیں منگوائیں جن کی بنا پر افغان پریس علاقائی ممالک میں سب سے بہتر شمار ہونے لگا۔ اتفاق اسلام، طلوع افغان، بیدار، جملہ کامل اور جلی الفلاح جیسے معیاری رسائل و جرائد نادر شاہ کے دور میں جاری رہے۔ علی آباد کا دارالصحف: 1919ء کی جنگ میں برطانیہ کو شکست دینے کے صلہ میں امان اللہ خان نے نادر شاہ کو کامل اور پغمان کے درمیان ”علی آباد“ کی جاگیر بخشی تھی۔ نادر شاہ نے اپنے دور حکومت میں عوامی فلاح و بہبود کے لیے یہاں ایک سینی ٹوریم (دارالصحف) قائم کیا۔ دق و سل کے مریض اس صحت افزا مقام میں ٹھہر کر شفا یاب ہوتے تھے۔

سرکاری لباس: حبیب اللہ خان کے زمانے سے افغان حکمران، عمامہ، امراء اور سرکاری افسران مشرقی و مغربی تمدن کا امتزاج بن گئے تھے۔ سر کو چھوڑ کر پورے جسم پر یورپی لباس (کوٹ، چٹون) پہنا کرتے تھے جبکہ سر پر افغان ٹوپی یا دستار کا رواج باقی تھا۔ نادر شاہ کا لباس بھی اس قسم کا ہوتا تھا۔ حکام کی دیکھا دیکھی عوام بھی اس وضع قلع کو اپنانے لگے تھے۔ سرکاری ملازمین، فوج، پولیس، ڈرائیور اور چوکیدار وغیرہ اسی قسم کے لباس کے پابند تھے۔

ذرائع آمد و رفت: قلعہ و وسائل کے باوجود نادر شاہ کے دور میں ذرائع آمد و رفت پر خاصی توجہ دی گئی۔ کامل سے مزار شریف تک نیا پختہ راستہ تیار کیا گیا۔ اس طرح پشاور سے کامل تک نئی سڑک تعمیر کی گئی۔ عوامی طور پر یہ تمام راستے محفوظ تھے اور چوری ڈاکے کے واقعات بہت کم ہو گئے تھے۔ ایک جاپانی سیاح نے ان دنوں تہا موٹر کار پر پورے افغانستان کا دورہ کیا اور اس دامن کی صورت حال کی بے حد تعریف کی۔ خارجہ پالیسی اور معاہدے: نادر شاہ کی خارجہ پالیسی غیر جانبداری، عدم جارحیت اور بقائے باہمی

کے اصولوں پر استوار تھی۔ وہ سابقہ دو حکمرانوں کے دور میں برطانوی اور سوویت استعمار کی ستم خیزیوں کا کچھ چکا اور ان کے عزائم سے خوب واقف تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ برسوں سے شورش زدہ اور جنگوں کا مارا ہوا افغانستان جب تک اپنے ہیروں پر کھڑا نہ ہو جائے از خود کسی نئی جنگ کا خطرہ مول لینے کے قابل نہیں۔ چنانچہ اس نے برطانیہ اور روس دونوں سے سابقہ معاہدے برقرار رکھے۔ 24 جون 1931ء کو اس نے روس سے دس برس قتل امان اللہ خان کے ساتھ کیے گئے اس معاہدے کی تجدید کی جس کا مسودہ سوویت انقلاب کے بانی لینن نے تیار کیا تھا۔ یہ 1921ء کے معاہدے کی توثیق تھی۔ ذاتی خیالات کے لحاظ سے برطانیہ مخالف ہونے کے باوجود اس نے برطانیہ کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کی اور تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی 6 مئی 1930ء کو برطانیہ سے اس معاہدے کی تجدید کی جو امیر عبدالرحمن خان کے دور میں 12 اکتوبر 1893ء کو عمل میں آیا تھا اور جس کے تحت افغانستان اور برطانیہ ہندوستان کی سرحدوں کو متعین کرنے کے لیے ڈیورنڈ لائن پر متفق ہوئے تھے۔

داخلہ یا ایسی کے بعض پہلو اور ان کا نقصان: شاہ نادر خان شاہان افغانستان میں آخری قدامت پسند انسان تھا اور ماڈرن ازم کا مخالف تھا۔ اس نے جہاں امان اللہ خان کے جدت پسند اندر رجحانات کے برعکس افغانستان کو اپنے قدیم رنگ و ڈھنگ پر برقرار رکھنے کی کوشش کی وہاں وہ سابق حکمران کے حامیوں کو دبانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

چونکہ اس نے ایک صدی سے افغانستان پر حکومت کرنے والے بارک زئی خاندان کی ہڈیوں پر اپنا راج محل تعمیر کیا تھا اس لیے لازمی طور پر اسے سب سے زیادہ خطرہ اسی خاندان اور اس کے حمایتیوں سے تھا۔ اس لیے اس نے انہیں اپنے اقتدار کے لیے شدید خطرہ تصور کرتے ہوئے انہیں دیوار سے لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تاہم یہی کوشش اس کے جلد خاتمے کا سبب بن گئی۔ اگر نادر خان کا دور طویل ہوتا تو وہ ایک کامیاب ترین حکمران ثابت ہوتا مگر اسے مدت اقتدار بھی کم ملی اور اچھے مشیر اور باصلاحیت رفقاء بھی کم میسر آئے تھے۔ اس کا زیادہ تر انحصار اپنے بھائیوں شاہ ولی اللہ، شاہ محمود اور سردار ہاشم پر تھا۔ یہ تینوں بھائی عسکری ذہنیت کے مالک تھے اور سخت گیر پالیسی رکھتے تھے۔ سارا نظم و نسق انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس تنگ نظری کا اثر یہ ہوا کہ نادر خان کی حکومت کو زیادہ استحکام نصیب نہ ہوا۔

روس سے سرحدی تنازع: نادر خان کے دور میں روس اور افغانستان میں کچھ مدت کے لیے سرحدی کشیدگی کا ماحول بھی رہا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ شمالی علاقوں کا ایک قبائلی سردار ابراہیم بیگ بار بار سوویت علاقوں میں چھاپے مار رہا تھا۔ اس نے افغانستان کو اپنی جائے پناہ بنا رکھا تھا۔ جون 1930ء میں سوویت افواج

ابراہیم بیگ کے تعاقب میں دریائے آمو عبور کر کے افغانستان میں گھس گئیں۔ یوں دونوں ملکوں میں سرحدی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ آخر روس کے کہنے پر افغانستان نے ابراہیم بیگ کو افغان علاقوں سے نکال کر روسی عملداری میں دھکیل دیا۔ روسیوں نے اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس طرح سرحدی کشیدگی ختم ہو گئی۔

شاہ نادر خان کا خاتمہ: نادر خان بنیادی طور پر ایک پختہ مسلمان تھا۔ ہندوستان کے اکابر دیوبند سے اسے نیاز مندانہ تعلق تھا۔ ظفر حسن ابیک نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ وہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ سے بیعت بھی تھا۔ مگر افسوس کہ اس باصلاحیت حکمران کا دور حکومت صرف چار سالہ رہا۔

اس کے آخری دور میں امان اللہ خان کے حامی چرخی قبیلے نے زبردست شورش برپا کر دی۔ نادر خان کا حامی قبیلہ ”مصاحبان“ اس کے مقابلے پر اتر آیا۔ دونوں قبائل کی باہمی لڑائی نے ملک میں خانہ جنگی کا ماحول پیدا کر دیا۔ نادر خان کے خلاف ان لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہو گیا جو ماؤرن ازم کے حامی تھے۔ یہ مخالفین اس کے قتل کی سازشیں تیار کرنے لگے۔

6 نومبر 1933ء کو نادر خان ”دلکشاخل“ میں طلبہ میں تقسیم انعامات کی تقریب میں شریک ہوا۔ اسی محفل میں ایک طالب علم نے فائرنگ کر کے اسے قتل کر دیا۔ یوں افغانستان ایک باصلاحیت حکمران سے بہت جلد محروم ہو گیا۔ اس کے بعد نابل، مغرب زدہ اور پھر اسلام دشمن حکمرانوں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے افغانستان کے مستقبل کو گھپ اندھیروں کی نذر کر دیا۔

ظاہر شاہ، ظاہری شاہ: نادر خان کے قتل کے بعد اس کے نوجوان لڑکے ظاہر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اسے حکومتی امور کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ تمام ملکی معاملات اس کے تینوں چچاؤں شاہ محمود، شاہ ولی اور سردار ہاشم کے ہاتھ میں تھے۔ ظاہر شاہ جو صرف ظاہری شاہ تھا، اس پر مطمئن تھا کہ اسے فیصلوں کے بوجھ سے آزاد رکھا جائے اور ملک کو اس کے چچا سنبھالے رہیں۔ ان تینوں کے بعد وہ اپنے چچا زاد اور بہنوئی سردار داد خان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔

ظاہر شاہ کو حکومتی امور سے زیادہ سیر و تفریح اور شکار سے دلچسپی تھی۔ اس کے دور حکومت کے ابتدائی برسوں میں عالمی سیاست کے حوالے سے افغانستان کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ روس کو افغانستان کے ذریعے اپنے جن مفادات کا حصول عزیز تھا وہ فی الحال پس منظر میں چلے گئے تھے کیوں کہ سوویت روس کا سربراہ اسٹالن مشرقی یورپ کی طرف متوجہ تھا۔ دھرا افغانستان کی خارجہ پالیسی بھی بظاہر غیر جانبدارانہ ہو گئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم: ظاہر شاہ کی تخت نشینی کے چھ سال جنگ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔ جرمنی کے حکمران ایڈولف ہٹلر نے عالمی طاقتوں کی استحصالی کارروائیوں اور نا انصافیوں سے تنگ آ کر جنگ کا اعلان کر دیا۔

دیا۔ برطانیہ، فرانس اور روس اس کے خلاف متحد ہو گئے اور یوں یہ جنگ مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔ پھر جب جاپان جرمنی کی حمایت میں میدان جنگ میں کودا تو صورت حال مزید ابتر ہو گئی۔

ستمبر 1939ء میں شروع ہونے والی مہیب جنگ ڈیڑھ دو کروڑ انسانوں کی ہلاکت اور درجنوں ممالک کی اقتصادی تباہی کے بعد 1945ء میں اس وقت ختم ہوئی جب امریکا نے جاپانی شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر تاریخ انسانی میں پہلی بار ایٹم بم برسائے اور جاپان کو جھکنے پر مجبور کر دیا۔ ادھر روس میں طوفان کی طرح داخل ہونے والا نظر بھی موسم کی قیامت خیزیوں کے سبب پسپائی پر مجبور ہو گیا اور خود کشی کر کے اپنے انجام کو پہنچا۔

برطانیہ کی ہندوستان سے واپسی: چھ برسوں کی اس جنگ نے پوری دنیا پر تباہ کن اثرات مرتب کیے۔ جنگ میں ملوث ممالک اور ان کے معاونین کا دیوالیہ نکل گیا تھا تاہم افغانستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی نے اسے بڑے نقصانات سے محفوظ رکھا۔ پھر جنگ کے خاتمے پر افغانستان کو ایک غیر معمولی تحفظ اس وقت ملا جب برطانیہ نے ہندوستان سے یوریا بستر سینیٹا شروع کیا۔ جنگ عظیم دوم کے صدمات نے اس سپر پاور کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ اپنی عملداری میں سورج نڈو بنے پر فخر کرتا رہے۔ اگست 1947ء میں جب برطانیہ ہندوستان سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ ہی اسے افغانستان کے سرحدی مقبوضات بھی چھوڑنے پڑے۔ اسی طرح افغانستان کی مشرقی سرحدوں کو برطانیہ کے خطرات سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی۔

صوبہ سرحد کا مستقبل: تاہم اس کے ساتھ ہی ایک اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ تھا سرحدی علاقوں کے مستقبل کا۔ درہ خیبر سے لے کر دریائے سندھ تک کا یہ علاقہ جسے 13 نومبر 1893ء کو ڈیورنڈ لائن معاہدے کے ذریعے افغانستان سے الگ کیا گیا تھا نسلی، لسانی، تہذیبی، جغرافیائی اور تاریخی لحاظ سے مکمل طور پر افغانستان سے ہم آہنگ تھا۔ اس لیے افغانستان چاہتا تھا کہ برطانیہ کے چلے جانے کے بعد یہ علاقے اسے دوبارہ مل جائیں مگر برطانیہ کا کہنا تھا کہ ڈیورنڈ لائن معاہدے کے بعد افغانستان یہ حق کھو چکا ہے۔ امیر عبدالرحمن کے بعد 1905ء میں شاہ حبیب اللہ خان، 1919ء میں شاہ امان اللہ خان اور 1930ء میں شاہ نادر خان اس کی توثیق کر چکے ہیں۔ لہذا اس علاقے کے مستقبل کا فیصلہ افغانستان نہیں کر سکتا۔

تقسیم ہند سے قبل 1947ء میں برطانیہ نے ریفرنڈم کرایا۔ افغانستان کی خواہش تھی یہ ریفرنڈم اس طور پر ہو کہ سرحد کے باشندوں سے پوچھا جائے ”آپ افغانستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا آزاد ریاست بننا پسند کریں گے؟“

مگر برطانیہ نے افغانستان کو نظر انداز کرتے ہوئے ریفرنڈم میں یہ سوال سامنے رکھا: ”آپ متحدہ

ہندوستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا پاکستان میں؟“

سرحد کے غیر مسلمان مسلم لیگ کی تحریک سے متاثر تھے اور خان عبدالغفار خان کی مقبولیت کم ہو چکی تھی۔ چنانچہ سرحد کے پختونوں نے بھاری اکثریت کے ساتھ پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

پاک افغان تعلقات میں کشیدگی: 14 اگست 1947ء کو پاکستان بن گیا۔ افغانستان کی مشرقی سرحدوں کو تقریباً ایک صدی کے طویل عرصے بعد کسی مسلم حکومت کی رفاقت نصیب ہوئی مگر افغانستان کے حکمران ظاہر شاہ نے پختون علاقوں کی پاکستان میں شمولیت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور برطانیہ کی دایمی کے بعد ڈیویڈنڈ لائن کو ناقابل قبول سمجھتے ہوئے صوبہ سرحد پر افغان علاقہ ہونے کا دعویٰ جاری رکھا۔ اس طرح پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی افغانستان اور پاکستان کے تعلقات خراب ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان خراب تعلقات کی بنیاد برطانیہ ہی نے ڈالی تھی۔ جس طرح وہ جاتے جاتے مسئلہ کشمیر کمزور کر کے پاکستان اور بھارت کو دیکھتے انگوروں پر چھوڑ دیا تھا، اسی طرح اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق پختون علاقوں کی سرحدوں کے معاملات کو اس طرح الجھا دیا تھا جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان مستقل تناؤ کا باعث بن کر رہے۔

بدقسمتی سے حکومت پاکستان کی جانب سے خیر سگالی کے رسمی جذبات کے اظہار کے باوجود افغانستان کو اعتماد میں لینے کی کوئی ٹھوس کوشش نہ کی گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کئی عشروں تک افغانستان اور پاکستان میں بہتر تعلقات پیدا نہ ہو سکے بلکہ آئے دن کشیدگی میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1950ء میں دونوں ممالک کی فوجوں کے درمیان سرحدی جھڑپیں ہوئیں جس کے بعد پاکستان نے افغانستان کی تجارتی راہداری بند کر دی۔ اس سے افغانستان کی معیشت و تجارت پر بہت برا اثر پڑا اور اسے اپنی اقتصادیات کو سہارا دینے کے لیے ایک بار پھر روس کی طرف دیکھنا پڑا۔

افغانستان اور روس کے نئے روابط: افغانستان جس پر روس کی توجہ اپنے داخلی مسائل کی وجہ سے کم ہو گئی تھی، اب دوبارہ روس کے لیے اہم ہو گیا۔ خاص طور پر اس لیے کہ اب روس کا حریف برطانیہ بھی یہاں سے جا چکا تھا۔ 1950ء میں سرحدی جھڑپوں کے بعد جب پاکستان نے افغانستان کے لیے سرحدیں بند کیں تو اسی سال افغانستان اور سوویت روس کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ طے پا گیا۔ یہ معاہدہ افغانستان اور روس کے قرب کیلئے ایک سنگ میل ثابت ہوا اور آنے والا ہر دن ان کے تعلقات کو گہرا کرتا گیا۔ اس طرح افغانستان کی غیر جانبدارانہ حیثیت ختم ہو گئی اور وہ مکمل طور پر روسی ہلاک میں چلا گیا۔ ادھر پاکستان اپنے قیام کے بعد سے امریکا کی دلچسپی کا محور رہا تھا اور اسے امریکی ہلاک میں شامل سمجھا جاتا تھا۔ روس اور امریکا کی رفاقت کا اثر پاکستان اور افغانستان پر بھی پڑ رہا تھا اور ان دونوں میں

ناصلے بڑھتے جا رہے تھے۔

امداد ترقی کی آڑ میں سازش: دسمبر 1955ء میں کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری خروشیف اور روسی وزیراعظم بلاگنن نے افغانستان کا دورہ کیا۔ اس دورے کا اصل مقصد افغانستان جیسے پس ماندہ ممالک میں کمیونزم کو فروغ دینا تھا۔ تاہم روس یہ مقصد افغانوں کو مراعات و امداد کے سہرے جال میں پھانس کر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس دورے میں افغانستان کو 100 ملین ڈالر قرضہ دینے کا وعدہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ افغانستان میں کئی اہم ترقیاتی منصوبے شروع کرنے کا اعلان کیا گیا جن میں پلوں اور شاہراہوں کی تعمیر کے علاوہ کوہ ہندوکش سے گزرنے والی درہ سالانگ کی سربنگ اور بگرام ایئر پورٹ کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ یہ ترقیاتی کام دراصل افغانستان کو فتح کرنے کے اس منصوبے کا حصہ تھے جو 50ء کی دہائی میں ہی روسی حکمرانوں کے ذہنوں میں پرورش پانے لگا تھا۔

روس جو پہلے زار شاہی کی صورت میں اسلامی دنیا پر خطرے کی تلوار بن کر لٹکتا رہا تھا 20 ویں صدی میں کمیونزم کا علمبردار بن کر پہلے سے بڑھ کر سامراجیت پر آمادہ تھا۔ 1917ء میں برپا ہونے والا بالٹیک انقلاب جو وسط ایشیا کی اسلامی تہذیب و ثقافت کو پامال کر کے افغانستان کی سرحدوں پر رک گیا تھا اب ہر حد سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ افغانستان میں جاری یہ ترقیاتی منصوبے اسی انقلاب کے لیے راستہ ہموار کر رہے تھے۔ روس نے ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق پل اتنے مضبوط اور کشادہ تعمیر کیے جن سے بڑے بڑے ٹرک، ٹینک اور بھاری اسلحے سے لدی گاڑیاں باسانی گزر سکتی تھیں۔ بگرام اور شین ڈنڈ کے علاقوں میں اتنے وسیع ایئر پورٹ تعمیر کیے گئے جن کو روسی فوجیں بڑی سہولت سے استعمال کر سکتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد روس نے افغانستان سے ”دوستی“ کا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے ایک اور قدم اٹھایا۔ اس نے افغان فوج کے افسران کی بھاری تعداد کو اعلیٰ تربیت کے لیے اپنے ہاں مدعو کیا۔ اس سے قبل افغانستان کی افواج کو جرمن یا ترک افسران تربیت دیتے تھے۔ اب پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ افغانستان کے بہادر سپاہی تربیت لینے ایک ایسے ملک جا رہے تھے جس کی اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ افغان افسران کی تربیت کا یہ منصوبہ سوویت حکومت اور ظاہر شاہ کے وسیع راستہ سردار داؤد کی ذہنی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا۔ جہاں تک ظاہر شاہ کا تعلق ہے وہ ایسے معاملات میں سرے سے دلچسپی ہی نہیں لیتا تھا اور صرف برائے نام بادشاہت اور راحت و آرام پر مطمئن تھا۔

سردار داؤد اور ظاہر شاہ: سردار داؤد خان شاہی افواج کا کمانڈر تھا، ظاہر شاہ کو اس کی قابلیت اور وفاداری

پر پورا بھروسہ تھا۔ افغانستان کی سیاست میں وہ اس وقت ابھر کر سامنے آیا جب طاہر شاہ نے ملکی انتظامات اپنے ہاتھ میں لینے کا ارادہ کیا۔ داؤد خان نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور ستمبر 1953ء میں طاہر شاہ جو کہ گزشتہ تین سال سے برائے نام حکمران تھا مطلق العنان حکمران بن گیا اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں آ گئے۔ یہ سب سردار داؤد کا کمال تھا۔ مگر اس کے بعد طاہر شاہ نے ان اختیارات کو صحیح طور پر استعمال نہ کیا۔ اس نے سردار داؤد کی احسان مندی کے اظہار کے طور پر اسے ملک کا بااختیار وزیر اعظم بنادیا اور خود کنج عاقبت ہی میں بیٹھنا پسند کیا۔ اس طرح سردار داؤد ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔

سردار داؤد خان، طاہر شاہ کا چچا زاد بھائی اور بہنوئی تھا۔ گول منول چہرے، گنجنے سر، موٹے ہونٹوں اور بھاری جسم کے ساتھ وہ قدرے بد نما دکھائی دیتا تھا مگر اس کی دماغی صلاحیتیں حیرت انگیز تھیں۔ وہ جدید تعلیم یافتہ اور بنیادی طور پر روس نواز ذہن کا حامل تھا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے افغانستان کی غیر جانبدارانہ پالیسی کو باضابطہ طور پر تبدیل کر کے اسے روسی ہلاک میں شامل کیا۔ اس کی وزارت عظمیٰ کے دوسرے سال (1954ء میں) افغانستان کے تعلیمی اداروں میں روسی اساتذہ کو تعینات کیا جانے لگا۔ عوام نے اس اقدام کو خشک و شبیہ کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس سے پہلے روسیوں کو افغانستان میں ملازم رکھنے سے سخت احتراز کیا جاتا تھا۔ کچھ مدت بعد سردار داؤد نے اپنے فوجی افسران کو تربیت کے لیے روس بھیجنے کا منصوبہ بھی منظور کر لیا۔ روسی اساتذہ کے افغانستان اور افغان افسران کے روس میں تربیت پانے کے نتائج آگے چل کر بڑے بھیاںک انداز میں سامنے آئے۔ بہت سے افسران تربیت کے زمانے میں کمیونزم کے پرستار بن گئے اور ان کی وفاداریاں سوویت روس کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ 1973ء اور 1978ء میں ایسے افسران کو استعمال کر کے ہی فوجی بغاوت برپا کی گئی جس کے بعد روس کے لیے افغانستان پر یلغار کا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا۔

داؤد خان کی برطرفی: وزیر اعظم سردار داؤد خان نے اپنی وزارت عظمیٰ کے دس برسوں میں افغانستان کو روسی کا لونگی بنانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی مگر افغان عوام نے اس کی پالیسیوں پر مبنی رد عمل کا اظہار کیا اور اس کے خلاف نفرت بڑھتی چلی گئی۔ خود حکمران طاہر شاہ بھی دیکھ رہا تھا کہ پانی سراونچا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اس نے پہلی بار اپنے اختیارات کو قطعی طور پر استعمال کیا۔ اس نے مارچ 1963ء میں سردار داؤد کو وزارت عظمیٰ کے منصب سے برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی ایک اور بڑی وجہ بھی تھی۔ شاہ کے مشیروں کا خیال تھا کہ داؤد خان اب اس حد تک اقتدار کو گرفت میں لے چکا ہے کہ کچھ عرصے بعد وہ بادشاہ کو بھی لائق اعتماد نہیں سمجھے گا۔ طاہر شاہ خود بھی داؤد کی ترک تازیوں کو خدشے کی نگاہ سے دیکھ رہا

تھا۔ تاہم اس نے جتنی فیصلے سے پہلے ایک محترمہ دارکونوج کے اعلیٰ افسران کے پاس بھیج کر یہ اطمینان کیا کہ فوج اب بھی اس کی وفادار ہے یا نہیں۔ وہاں سے مثبت جواب آنے کے بعد اس نے سردار داؤد کو بلوا کر اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

سردار داؤد کے لیے یہ صورت حال انتہائی اعصاب شکن تھی کہ اسے یوں اچانک وزارت عظمیٰ سے ہٹایا جا رہا ہے۔ اس نے بھڑک کر کہا: ”آپ حکومت نہیں چلا سکتے۔ اور نہ ہی مجھے ہٹا سکتے ہیں۔ کیونکہ فوج میری حامی ہے۔“

یہ سن کر بادشاہ نے فون کار سیور اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا: ”یہ لفون اور فوج کو بلوا کر مجھے گرفتار کر لو۔“

داؤد نے لپک کر فون لیا اور جرنیلوں کے نمبر گھمانے شروع کیے مگر کسی ایک افسر نے بھی اس وقت اس کی حمایت کا اظہار نہ کیا تب اسے احساس ہوا کہ کیونز کے فردغ کے لیے اب تک کی گئی کوششیں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوئیں۔ افغانستان پر اب تک قدامت پسندی غالب ہے۔ فوج میں اب تک دین و مذہب، وطن اور بادشاہت کے خلاف باغیانہ رجحانات زیادہ پنپ نہیں سکے۔ داؤد خان بازی ہارے ہوئے جواری کی طرح ایوان شامی سے نکل گیا۔ ظاہر شاہ کیونز کے راستے میں رکاوٹ تو نہ بن سکا تھا مگر اس کی موجودگی میں کیونز کی اتنی حوصلہ افزائی بھی نہیں ہو سکتی تھی جو داؤد خان اور اس کے سوویت آقاؤں کو مطلوب تھی۔ اسی دن داؤد خان نے طے کر لیا کہ وہ اب طویل اور گہری منصوبہ بندی کے ساتھ کیونز کے فردغ کے لیے کام کرے گا اور نتائج کا مبر تحمل سے منتظر رہے گا۔

نیا آئین اور جمہوری ادارے: سردار داؤد کی برطرفی سے عوام دم بخود رہ گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ظاہر شاہ میں حکومت چلانے کی اہلیت نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اب ملک کیسے چلے گا اور کون چلائے گا؟ اس صورت حال کے پیش نظر ظاہر شاہ کو چند اہم اقدامات کرنا پڑے۔ عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے 1964ء میں ملک کو ایک نیا آئین دیا۔ اس نئے آئین کے تحت افغانستان میں پہلی بار دو ایوانوں کی پارلیمنٹ قائم کی گئی جنہیں ”اولیٰ جرگہ“ (ایوان عام) اور ”مشرانو جرگہ“ (ایوان بالا) کا نام دیا گیا۔ انتظامیہ اور عدلیہ کو شامل کر کے اب نظام مملکت تین ستونوں پر استوار ہو گیا۔

①..... مقتضی ②..... انتظامیہ ③..... عدلیہ

اس دوران سردار داؤد جمہوری سیاسی میدان میں اتر کر ظاہر شاہ کے خلاف صف آرا ہو چکا تھا۔ وہ ظاہر شاہ کو قدامت پسند، فرسودہ روایات کا حامل اور تعمیر و ترقی کی راہ میں رکاوٹ باور کر رہا تھا اور شامی

خاندان سے اپنے تعلق کو عوامی حمایت کے لیے استعمال کر رہا تھا لیکن ادھر ظاہر شاہ نے آئندہ کسی بھی حکومت میں داؤد خان کی شمولیت کو ناممکن بنانے کے لیے آئین میں ایک شق یہ بھی شامل کر دی کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی فرد سیاست میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اس اقدام کے بعد ظاہر شاہ کا خیال تھا کہ اس نے پارلیمانی ذرائع استعمال کر کے داؤد خان کو دوبارہ برسرِ اقتدار آنے سے روک دیا ہے مگر داؤد خان ساز باز کاما رہتا۔ اس نے افغانستان کی ان تنظیموں سے روابط مضبوط کیے جو سوویت یونین کی پروردہ تھیں۔ اس کے بعد وہ خفیہ طور پر ظاہر شاہ کا تختہ اٹھانے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو گیا۔ انہی دنوں افغانستان کی سیاست میں سرگرم کیونسٹوں نے ابھر کر سامنے آنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ”پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی“ کے نام سے جنوری 1965ء میں ایک نئی سیاسی جماعت بنا ڈالی جس کا جرنل سیکرٹری نور محمد ترہ کنی تھا۔ ببرک کارمل بھی اس کا اہم رہنما تھا۔ ستمبر 1965ء کے انتخابات میں اس پارٹی کے بہت سے افراد نے کامیاب ہو کر اسمبلی میں اپوزیشن کا کردار سنبھالا اور ظاہر شاہ کے لیے درد سر بنے رہے۔ 1969ء میں ایک بار پھر انتخابات ہوئے۔ ظاہر شاہ کی خواہش کے مطابق اس بار بھی کیونسٹ حکومت نہ بنا سکے مگر اپوزیشن کی صورت میں ان کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔

”خلق“ اور ”پرچم“ پارٹی: افغانستان میں کیونسٹوں کی نمائندہ جماعت پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی اپنے قیام کے دو سال بعد 1967ء میں کئی گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ ان میں سے دو گروہوں کی اہمیت زیادہ تھی۔ ایک ”خلق پارٹی“ کے نام سے تھا جس کا سربراہ نور محمد ترہ کنی تھا۔ دوسرا گروہ ”پرچم پارٹی“ کہلاتا تھا۔ اس کا لیڈر ببرک کارمل تھا۔ خلق پارٹی میں پختونوں کی جبکہ پرچم پارٹی میں فارسیوں اور غیر پختونوں کی اکثریت تھی۔ ان دونوں پارٹیوں نے ”خلق“ اور ”پرچم“ کے نام سے اپنے اپنے اخبارات بھی جاری کیے۔ عوام میں کیونزم کی کاشت کا کام ان اخبارات نے بھرپور انداز میں کیا۔

قومی اسمبلی کی حالت: ادھر ظاہر شاہ کی گرفت حکومت پر کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ 1969ء میں اس کی جانب سے کرائے گئے انتخابات کے ذریعے وجود میں آنے والی اسمبلیاں عوامی توقعات پر پوری نہ اتر سکیں۔ 33 فیصد ممبران اسمبلی نا تجربہ کار اور ان پڑھ تھے جنہیں حالات حاضرہ سے آگاہی تھی نہ سیاسی معاملات کا کوئی تجربہ تھا۔ پھر ان اسمبلیوں کی کارروائی بھی اکثر کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے ملتوی کر دی جاتی تھی۔ یہ نام نہاد اسمبلیاں کیونسٹوں کے عزائم کو تقویت فراہم کرنے میں مددگار ثابت ہو رہی تھیں کیونکہ جب بھی اجلاس ہوتا، کیونسٹ ارکان دھواں دار تقاریر کر کے اجلاس پر چھا جاتے تھے۔ کیونسٹ اس کے ساتھ ساتھ گلی کوچوں میں نوجوانوں کو منظم کر کے حکومت کے خلاف احتجاجی جلسے جلوس اور فسادات

کرانے میں بھی مصروف تھے۔ ظاہر شاہ کے پاس اس افراتفری اور ابتری پر قابو پانے کے لیے کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ اس نے حالات کے خطرناک رخ کا بروقت ادراک نہ کیا اور کیونسٹوں کی سرگرمیوں کو روکنے میں مستعدی نہ دکھائی۔ دن گزرتے گئے، اسمبلیاں اپنی مدت پوری کرنے کے قریب پہنچ گئیں۔

داؤد خان کی سازش: یہ 1973ء تھا۔ ظاہر شاہ نے اعلان کر دیا تھا کہ اس سال عام انتخابات کے ذریعے نئی حکومت تشکیل پا جائے گی۔ عوام کو مطمئن تصور کر کے وہ جولائی میں یورپ کے دورے پر نکل گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں داؤد خان کو اپنے کھیل کا آخری مرحلہ پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے سوویت یونین سے بڑی مقدار میں جدید اسلحہ حاصل کر لیا تھا اور اپنے حق میں اس کی بھرپور حمایت کو یقینی بنالیا تھا۔ روس کی حمایت کا لازمی اثر یہ تھا کہ روس سے تربیت حاصل کر کے آنے والے فوجی افسران جن کی تعداد اب خاصی بڑھ گئی تھی، داؤد خان کا ساتھ دے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ داؤد خان نے خلق اور پرچم پارٹیوں کو بھی ساتھ دینے پر رضامند کر لیا تھا۔

ظاہر شاہ تخت سے محروم: 17 جولائی 1973ء کو ظاہر شاہ اٹلی کا دورہ کر رہا تھا کہ یکا یک اسے اطلاع ملی کہ داؤد خان مسند اقتدار پر قابض ہو گیا ہے۔ داؤد خان نے اس دن بڑی فوج کے کچھ یونٹوں کی مدد سے کابل کے اہم سیاسی مراکز پر قبضہ کر لیا تھا۔ کسی کشت و خون کے بغیر چند گھنٹوں کے اندر اندر افغانستان سے بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا اور کسی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔



مآخذ و مراجع

- ♣ تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر۔ فاروق حامد بدر
- ♣ افغانستان در مسیر تاریخ، میر غلام محمد غبار
- ♣ Encyclopedia of Islam. V. 1
- ♣ تاریخ جہاد افغانستان، ڈاکٹر انجلی خان
- ♣ افغانستان، ایک قوم کا الیہ، احمد شجاع پاشا
- ♣ Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

تیسواں باب

کیمونزم کے سائے، جمہوریت اور انقلابِ ثور

ظاہر شاہ کی بادشاہت یوں چپ چاپ ختم ہو گئی جیسے مغرب میں سورج ڈوب گیا ہو۔ دراصل اس آخری بادشاہ کی انتظامی کمزوری، خام نگرانی اور عاقبت نا امدستی نے عوام و خواص سب کو مایوس کر رکھا تھا اس لیے انقلابیوں کو بادشاہت کے خاتمے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ اب جمہوریت کا سورج تعمیر و ترقی کی کرنیں لٹا تا ہوا طلوع ہوگا۔ شروع شروع میں واقعی ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ 17 جولائی 1973ء کو داؤد خان نے حکومت سنبھالنے ہی ریڈیو پر قوم کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ ملک سے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے اور اب ”ریپبلک جمہوری نظام“ صحیح معنوں میں نافذ کیا جا رہا ہے جو ”اسلامی روح“ کے عین مطابق ہوگا۔ اس نے عوام سے ”حقیقی جمہوریت، سماجی اصلاحات، انصاف و مساوات، خوشحال معیشت اور تعلیمی انقلاب“ جیسے خوش کن وعدے بھی کیے۔ مگر داؤد خان کے عزائم جو بھی تھے، ڈھکے چھپے نہ تھے۔ وہ کیمونزم کا ہیرو کا رہتا تھا اور افغانستان کو اس رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ بادشاہت کا خاتمہ کر کے اس نے افغانستان کو سیاسی طور پر مستقل انتشار کی کھائی میں گرا دیا تھا۔

پاکستان مخالف بیانات: سردار داؤد خان کے اقتدار کا آغاز پاکستان دشمنی کے جذبات کے اظہار کے ساتھ ہوا۔ اس نے اپنی ابتدائی تقاریر میں کہا کہ پاکستان دو واحد ملک ہے جس کے ساتھ افغانستان کا تنازعہ ہے۔ پھر ایک پریس کانفرنس میں اس نے ”آزاد پختونستان“ کے مسئلے کو ”ایک ناقابل تردید حقیقت“ کا عنوان دیا۔

17 اگست 1973ء کو افغانستان کے ڈپٹی وزیر خارجہ نے کابل میں پاکستانی سفیر سے ملاقات کر کے پاکستان کی سیاسی جماعت عوامی نیشنل پارٹی کے رہنماؤں خان عبدالغفار خان، خان عبدالولی خان اور دیگر سرخ پوش رہنماؤں کی گرفتاری پر تشویش کا اظہار کیا۔ یہ لیڈر پختونستان کا مسئلہ کھڑا کر کے حکومت پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کر رہے تھے جبکہ نئی افغان حکومت اس قسم کے مسائل اٹھانا چاہتی تھی۔ اس کے چند دن بعد 26 اگست 1973ء کو افغانستان کے یوم آزادی کی تقریب سے خطاب

کرتے ہوئے داؤد خان نے پختونستان کو اپنا ”قومی مسئلہ“ قرار دیا۔

علیحیدگی پسندوں کی تربیت: داؤد خان نے صرف بیان بازی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سرحد اور بلوچستان کے علیحدگی پسند عناصر کو اپنی حمایت کا یقین دلاتے ہوئے ان صوبوں میں افراطی اور بدامنی پھیلانے کی کوشش بھی کی۔ حکومت پاکستان کا یہ بھی کہنا تھا کہ داؤد خان ان دونوں صوبوں میں ایک عوامی جنگ شروع کرنے کے لیے پندرہ ہزار سے زائد پختونوں اور بلوچوں کو عسکری تربیت دے رہا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی جوابی چال: پاکستان مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے صدمے سے ابھی تک نہیں سنبھل سکا تھا، اس لیے افغانستان کی روس نواز حکومت کی یہ کارروائیاں اس کی سالمیت کے لیے از حد خطرناک تھیں۔ وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے بڑی سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا اور داؤد خان کو لگام دینے کے لیے سیاسی داؤا استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ افغانستان کی اسلام پسند جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کی بھی کوشش کی۔

افغانستان میں اس وقت علمائے کرام اور دین دار طبقے نے اتحاد و لادینیت کی اشاعت کی ان کوششوں کو جو سرکاری سرپرستی میں جاری و ساری تھیں بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مملکت کے کیونز کم کی طرف مسلسل جھکاؤ سے اسلام کو بے حد خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ حکومت کے خلاف مسلح جہاد کی تیاریاں کرنے لگے تھے۔ حکومت کی جانب سے ان میں سے بہت سے گرفتار اور بہت سے جلاوطن کر دیے گئے تھے۔ کئی اہم شخصیتیں حکومتی عتاب سے بچنے کے لیے سرحد پار آ گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانستان پر کیونز کم کے سرخ بادل منڈلاتے دیکھ کر بعض افغان رہنما 1973ء میں یعنی ظاہر شاہ کے آخری ایام ہی میں ہتھیار اٹھا چکے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کر کے وہ پہاڑوں اور وادیوں کو اپنا مسکن بنا چکے تھے اور ان کی جانب سے سرکاری اہداف پر وقفے وقفے سے حملے جاری تھے۔ مگر ان کارروائیوں کا کوئی خاص اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ ان میں باقاعدگی اس وقت پیدا ہوئی جب 1974ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے سردار داؤد خان کی پاکستان دھمکی پالیسی سے مجبور ہو کر اسے اسی کی زبان میں جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سرحد اور بلوچستان میں علیحدگی پسندوں کی سرپرستی کی افغان سازشوں کے جواب میں ان جماعتوں کی حمایت شروع کر دی گئی جو افغان حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھا چکی تھیں۔ ان میں گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی اور مزید چند تنظیمیں نمایاں تھیں۔ یہ جماعتیں افغانستان کو ایک اسلامی مملکت کے طور پر دیکھنا چاہتی تھیں۔

اسلام پسند تنظیموں کی کارروائیاں: ذوالفقار علی بھٹو کی پالیسی کامیاب رہی۔ جب بھی کابل سے

پاکستان کے خلاف بیان بازی شروع کی جاتی یا پختونستان کا مسئلہ اٹھایا جاتا افغانستان میں اسلام پسند تنظیموں کی کارروائیاں شدت اختیار کر جاتیں اور یوں داؤد خان کو پریشان ہو کر خاموشی اختیار کرنا پڑتی۔ ان تنظیموں کے بہت سے رہنما ہجرت کر کے پشاور منتقل ہو گئے تھے اور حکومت پاکستان کی جانب سے ان کو پناہ مہیا کی گئی تھی۔ کابل یونیورسٹی کے اسلام پسند طلبہ و اساتذہ کی ایک بڑی تعداد بھی ان دنوں حکومتی چکر دھکنے سے بچنے اور اندرون افغانستان تحریک کو منظم کرنے کی تیاریاں کرنے پشاور چلی آئی تھی۔ انہی تنظیموں کی جانب سے 21 جولائی 1975ء کو سردار داؤد خان کی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کی ایک بڑی کوشش کی گئی جس کا آغاز پکتیا میں زبردست مسلح کارروائیوں سے ہوا۔ داؤد خان نے بھرپور عسکری طاقت استعمال کر کے اس کوشش کو ناکام بنا دیا مگر اس دوران اسے دانتوں پسینہ آ گیا۔

داؤد خان کی کایا پلٹ تبدیلی: داؤد خان کو یہ محسوس ہوا کہ پاکستان اور دیگر ہمسایوں سے عصمت مول لینا صرف حماقت ہے اور افغانستان کو مکمل طور پر سوویت روس سے وابستہ رکھنا اور دیگر ممالک سے تعلقات بگاڑنا کبھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتا۔ داؤد خان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ پاکستان کے خلاف اب تک کی گئی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی ہے کیوں کہ افغانستان اور قبائلی علاقوں میں اثر و رسوخ رکھنے والے علماء پاکستان کا احترام کرتے ہیں اور دونوں ملکوں میں برادرانہ جذبات کے فروغ کے خواہاں ہیں۔ یورپی اخبارات کی رپورٹیں اس کی گواہ تھیں کہ قبائلی اور سرحدی پٹھان پختونستان کے مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

ان حقائق کے پیش نظر داؤد خان نے آہستہ آہستہ پاکستان سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ ایران سے بھی افغانستان کے تعلقات بہتر نہیں تھے۔ داؤد خان اس سے تعلقات قائم کرنے پر بھی غور کرنے لگا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اب ”غیر متصادم بھائے باہمی“ کا تین فریقی سمجھوتہ کیا جائے جس میں افغانستان، پاکستان اور ایران شامل ہوں۔ اس تین فریقی معاہدے میں داؤد خان تین بانہیں ملے کر تاپتا تھا:

① ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کر لیا جائے۔ (جسے اب تک داؤد خان اور اس سے پہلے ظاہر شاہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے)

② حکومت پاکستان عوامی نیشنل پارٹی کے رہنماؤں اور دیگر پختون علیحدگی پسند لیڈروں کو، جن کا افغانستان سے گہرا تعلق تھا، رہا کر دے۔

③ ایران افغانستان کو مالی امداد فراہم کرے۔

شاہ فیصل مرحوم کا کردار: کہا جاتا ہے کہ داؤد خان کی سوچ میں اس مثبت تبدیلی کے پس پردہ سعودی

حکام کا جذبہ اخوت بھی کارفرما تھا۔ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں بڑھتی ہوئی کشیدگی اور دونوں ملکوں کی ایک دوسرے کی حدود میں مبینہ مداخلت سے سعودی حکمران شاہ فیصل مرحوم کو سخت تشویش لاحق تھی۔ چنانچہ انہوں نے دباؤ ڈال کر دونوں ملکوں کو تعلقات بہتر بنانے پر آمادہ کیا۔ اس مصالحت میں تیسرے پڑوسی ایران کو بھی شامل کرنا مفید سمجھا گیا۔ ایران میں ان دنوں رضا شاہ پہلوی کی حکومت تھی جس نے معاہدے کے مطابق بعد میں افغانستان کو خاصی مالی امداد دینا بھی کی۔

ایران کی مداخلت: ایران کی جانب سے دی جانے والی امداد یقیناً پس ماندہ افغانستان کے لیے سودمند بھی مگر اس کے پس پردہ ایران کے اپنے خفیہ مفادات بھی تھے۔ ایک طرف تو باہمی تعلقات میں بہتری کے باعث ایران اور افغانستان میں پانی کی تقسیم کا تنازع حل ہو گیا تھا پھر ایک ایشیائی مشترکہ منڈی کے قیام، ایران و افغانستان کے درمیان ریلوے لائن بچھانے اور ایشیائی ممالک کو ملانے والی عظیم شاہراہ تعمیر کرنے کے منصوبوں پر بھی غور ہونے لگا مگر اس کے ساتھ ساتھ ایران کی خفیہ ایجنسی ”ساداک“ بھی افغانستان میں سرگرم عمل ہو گئی۔ ساداک کے ایجنٹ افغانستان کے تجارتی نظام اور مالیاتی شعبوں پر حاوی ہونے لگے اور یوں ایران کو ایک طویل مدت بعد افغانستان میں مداخلت کا راستہ مل گیا۔

افغانستان کو روسی ہلاک سے نکالنے کی کوششیں: افغانستان، پاکستان اور ایران کی بھائی بندی میں امریکا کا بھی کردار تھا جو روس کے بڑھتے ہوئے قدموں سے خوفزدہ تھا۔ چنانچہ اس کی کوشش تھی کہ افغانستان کو روسی ہلاک سے کسی نہ کسی طرح نکالا جائے۔ اس مقصد کے لیے امریکا نے شاہ ایران کی (جو امریکا کا بڑا مراعات یافتہ حکمران تھا) حوصلہ افزائی کی کہ وہ افغانستان سے تعلقات مزید بہتر بنائے اور اسے مالی امداد فراہم کرتا رہے۔

بہر حال! بیرونی دنیا کی جانب سے جاری ان کوششوں کا افغانستان پر خاصا اثر پڑا، داؤد خان نے 1976ء میں اپنی خارجہ پالیسی میں تبدیلی کا آغاز کیا۔ جون 1976ء میں اس نے وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی اور دونوں رہنما ایک دوسرے کی جانب سے مطمئن ہو گئے۔ داؤد خان نے پاکستان مخالف بیانات دینا بند کر دیے اور ذوالفقار علی بھٹو نے افغانستان میں سرگرم اسلامی تنظیموں اور حریت پسند جماعتوں کی حرکات و سکنات پر پاکستان میں پابندیاں عائد کر دیں۔

داؤد خان کیونٹسٹوں کا مخالف بن گیا: ادھر داؤد خان نے حکومت سے ان افراد کو جن جن کو الگ کرنا شروع کر دیا جو سودیت یونین کے مشورہ نظر تھے۔ داؤد خان نے دیکھ لیا تھا کہ یہ لوگ کارکردگی میں صفر ہیں اور ان کی وفاداریاں کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتی ہیں۔ اس نے 1977ء میں نئی کاغذی تشکیل دی جس

میں اپنے دوستوں اور سابق شاہی خاندان کے افراد کو بطور خاص شامل کیا گیا۔ اس نے ایک نیا آئینہ بھی پیش کیا جس کے تحت ملک میں صرف ایک سیاسی پارٹی کام کر سکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نو ”قومی انقلابی پارٹی“ کے نام سے ایک سیاسی جماعت تشکیل دے ڈالی اور دیگر تمام سیاسی جماعتوں کو جن میں کمیونسٹ پارٹیاں ”خلق“ اور ”پرچم“ بھی شامل تھیں، کا اہم قرار دے دیا۔

ان اقدامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ داؤد خان نے اب سوویت روس اور کمیونزم کا اصل مکروہ چہرہ دیکھ لیا تھا اور کسی نہ کسی طرح اس جنگل سے خود کو اور ملک و قوم کو نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ روس کی جگہ باقی دنیا سے تعلقات بہتر بنانے اور فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ اس نے روس پر انحصار ختم کر کے آب پاشی، ٹیکسٹائل ملز اور دیگر منصوبوں کے لیے چین سے امداد حاصل کرنا شروع کر دی۔ نیز امریکا سے بھی اسے امداد ملنے لگی جو روس کے پھندے سے اس کی آزادی کی کوشش کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

سوویت یونین کا بیچ و تاب: سوویت یونین کا داؤد خان کی بدلتی ہوئی پالیسیوں پر چین بہ جیس ہونا لازمی امر تھا۔ افغانستان کے ابوالہنہ اقتدار سے کمیونسٹوں کا اخراج اور پاکستان و ایران سے دوستانہ مراسم کی ابتدا داؤد خان کے وہ ”سنگین جرائم“ تھے جنہیں ماسکو کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ 1977ء کے وسط میں داؤد خان کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں۔ سوویت روس کی کمیونسٹ پارٹی نے اس مقصد کے لیے بھارت کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی استعمال کیا۔ ان کی کوششوں کا پہلا ہدف یہ تھا کہ افغانستان کی دونوں کمیونسٹ پارٹیوں ”خلق“ اور ”پرچم“ کو متحد کر دیا جائے۔ یہ کوششیں کامیاب ہوئیں اور جولائی 1977ء میں ”خلق“ اور ”پرچم“ نے داؤد خان کو اقتدار سے منانے کی خاطر آپس میں اتحاد کر لیا۔

داؤد خان کے بیرونی دورے: اس دوران داؤد خان اپنی نئی پالیسیوں پر بدستور عمل پیرا رہا۔ جولائی 1977ء میں پاکستان میں فوجی انقلاب آیا۔ فوج نے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو حراست میں لے لیا اور جنرل ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ تاہم افغانستان اور پاکستان کے تعلقات متاثر نہ ہوئے بلکہ ان میں مزید بہتری آئی۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے تیسرے ماہ کا بل جاکر داؤد خان سے ملاقات کی جس کا مقصد دونوں ملکوں میں اعتماد کو برقرار رکھنا تھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد 1978ء کے موسم بہار میں داؤد خان نے پاکستان، بھارت، لیبیا، مصر، ترکی، یوگوسلاویہ، سعودی عرب اور کویت کے دورے کیے۔ ساتھ ہی جلد امریکا جانے کا اعلان بھی کیا۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اسلامی ممالک اور امریکا سے تعلقات استوار نہ کیے تو اس کی کرسی ڈھگاتی رہے گی اور سوویت یونین بڑی آسانی سے اسے اقتدار سے علیحدہ کرنے کے لیے کوئی بھی کارروائی کر گزرے گا۔

اپریل 1978ء میں سعودی عرب کے دورے میں داؤد خان نے صومالیہ اور ایتھوپیا کے تنازع کو جلد حل کرنے سے متعلق ایک مشترکہ اعلامیہ پر دستخط بھی کیے تھے۔ چونکہ ایتھوپیا روس کا حلیف اور ہمکنہ کے صومالی مسلما نوں کے حقوق آزادی کا غاصب تھا، اس لیے داؤد خان کا یہ اقدام ایتھوپیا کی حکومت کے ساتھ ساتھ روس کو بھی سخت ناگوار گزرا اور اس نے افغانستان میں اپنی پروردہ کیونسٹ پارٹیوں اور فوج کے کیونسٹ افسران کو داؤد خان کا تختہ الٹنے کے لیے ”گرین سگنل“ دے دیا۔

میر اکبر کا قتل، نئی سازش: داؤد خان سعودی عرب کے دورے سے واپس آیا ہی تھا کہ اس کے خلاف دھڑن تختہ ڈرامے کا آغاز ہو گیا۔ اس کی پہلی قسط 17 اپریل کو دیکھی گئی جب پرچم کیونسٹ پارٹی کے اخبار ”پرچم“ کے ایڈیٹر میر اکبر کو کاہل میں اچانک قتل کر دیا گیا۔ کیونسٹوں نے آن کی آن میں یہ بات دارالحکومت کے طول و عرض میں پھیلا دی کہ اس نامور صحافی کو داؤد خان نے اپنے نئے سرپرست امریکا کی خوشنودی کی خاطر قتل کر دیا ہے۔ ”میر اکبر“ کا افغانستان کی شہری آبادی خصوصاً کیونسٹوں میں بڑا نام تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے جنازے میں شریک ہوئے اور پھر اس اجتماع نے احتجاجی جلوس کی شکل اختیار کر لی۔ مظاہرین داؤد خان اور امریکا پر فرد جرم عائد کر رہے تھے۔ ان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اسی حالت میں وہ امریکی سفارت خانے کے سامنے پہنچ گئے اور شدید نعرے بازی کی۔

کریک ڈاؤن: اس کے بعد آئندہ نو دن تک حالات معمول پر نہ آ سکے۔ یہ دیکھ کر 26 اپریل کو داؤد خان نے کیونسٹ رہنماؤں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا کیونکہ وہی حکومت مخالف جذبات کو ہوا دے رہے تھے۔ ہرک کارمل اور نور محمد ترہ کئی کے ساتھ ایک اور بڑے کیونسٹ لیڈر حفیظ الشامین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم ایک سنگین کوتاہی یہ ہوئی کہ کیونسٹ افسران فوج کو گرفتار نہ کیا گیا۔ 27 اپریل کی صبح 10 بجے داؤد خان نے کابینہ کا اجلاس طلب کر لیا تاکہ حالات کے نئے رخ پر مشورہ کیا جاسکے۔ اجلاس میں گرما گرم بحث جاری تھی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ حکومت کے خلاف زیر زمین سازش کس حد تک آگے بڑھ چکی ہے۔

فوج حرکت میں آگئی: دراصل کیونسٹ رہنماؤں نے گرفتاری سے پہلے فوج کے کیونسٹ افسران سے رابطہ کر کے انہیں اعتماد میں لے لیا تھا۔ چنانچہ اگلے دن ایوان صدر میں کابینہ کا اجلاس شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے ہی کاہل کے مشرق سے بکتر بند بریگیڈ کے ٹینکوں نے حرکت شروع کر دی تھی جن کی کمان کیمپن، اسلم وطن یار کر رہا تھا۔ ادھر کرنل عبدالقادر نے مگرام ایئر پورٹ کو سنبھال لیا تھا۔ اسلم وطن یار نے پہلے کاہل کے ہوائی اے پر قبضہ کیا، گیارہ بجے اس نے وزارت دفاع کی عمارت کو تحویل لے لیا تھا۔ پھر 12 بجے وہ ٹینکوں کے ساتھ ایوان صدر پہنچا اور داؤد خان کو گرفتاری کا حکم دیا مگر

ایوان صدر کے محافظوں نے جوانی کا ردوائی شروع کر دی اور یوں ایک خونریز جنگ کا آغاز ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی کابل میں جھگڑے لڑنے لگے، بازار بند ہو گئے اور لوگ بھاگ بھاگ کر محفوظ مقامات میں پناہ لینے لگے۔ اس کے باوجود دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آکر بہت سے شہری مارے گئے۔

داؤد خان کو قتل کر دیا گیا: کئی مہینوں تک یہ لڑائی جاری رہی۔ صدر داؤد کے 1800 محافظ ایوان صدر خالی کرنے اور ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوئے۔ جب ٹینک ناکام ہو گئے تو سپر کے وقت فضا سے کئی طلب کر لیا گیا۔ چنانچہ 21 طیاروں نے ایوان صدر پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی جس سے کئی سو محافظ ہلاک ہو گئے اور ایوان صدر پر باغیوں نے قبضہ کر لیا۔ افغان فضا سے جس سرعت اور مہارت سے ایوان صدر پر حملے کیے تھے اسے دیکھتے ہوئے کابل میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ ان طیاروں کو افغان نہیں بلکہ روسی پائلٹ اڑا رہے ہیں۔ تاہم اس بات کی کسی ذریعہ تصدیق نہ ہو سکی۔

شام کے وقت باغی گرفتار شدہ کیونٹ رہنماؤں کو رہا کر چکے تھے اور کابل ریڈیو سے ”انقلاب“ کا اعلان ہو رہا تھا۔ داؤد خان کا انجام بہت جبراً ہوا۔ کیونٹ کو راہ نجات سمجھتے اور کیونٹوں کو اقتدار میں شامل کرنے والا افغانستان کا یہ حکمران آخر کار کیونٹوں ہی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ محل میں موجود اس کے خاندان کے تمام افراد حتیٰ کہ عورتوں اور بچوں کو بھی بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کیونٹوں نے اگلے دن افغانستان میں ”انقلابی کونسل“ قائم کرنے کا اعلان کیا اور دعویٰ کیا کہ اس کونسل کی طاقت کا منبع عوام ہیں اور یہ کونسل افغانستان کی آزادی اور اسلامی روایات کے تحفظ کی ضامن ہے۔

انقلاب ٹور: اس انقلاب کو ”انقلاب ٹور“ کا نام دیا گیا۔ دنیا ششدر ہو کر افغانستان میں اس کا پلٹ کودیکھ رہی تھی۔ کسی کو توقع نہ تھی کہ قدامت پسند مسلمانوں کا مرکز سمجھا جانے والا یہ ملک اس طرح کیونٹوں کا دماغ بن جائے گا۔ خود امریکا کو بھی اس کا صحیح اندازہ نہ تھا اور نہ وہ اس انقلاب کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا۔

30 اپریل 1978ء کو ”انقلابی کونسل“ کی جانب سے نور محمد ترہ کی کو افغانستان کا وزیراعظم مقرر کر دیا گیا اور افغانستان کو ”ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان“ کا نام دیدیا گیا۔ انقلاب کا دوسرا بڑا ایڈز ہرک کارل نائب وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوا جبکہ حفیظ اللہ مین کو ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ کا منصب دیا گیا۔

ترہ کئی کون تھا؟ نور محمد ترہ کئی جواب افغانستان کا پہلا کیونٹ حکمران تھا، غزنی کے ایک پنجتون چرواہے کے گھر پیدا ہوا تھا۔ وہ بڑے فخر سے بتاتا تھا کہ اس کا سن پیدائش 1917ء ہے جو کہ بائیسویں انقلاب کی کامیابی کا سال ہے۔ وہ لڑکپن میں پھل درآمد و درآمد کرنے والی ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نائٹ کلاسز میں اسکول بھی پڑھتا رہا اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ اس کمپنی کے توسط سے اسے

بہیج جانے کا موقع ملا جہاں اس کی ملاقات کیونسٹوں سے ہوئی اور وہ باقاعدہ مارکسزم کا پیروکار بن گیا۔

وطن واپس آ کر کئی سال تک وہ مختلف سرکاری محکموں میں معمولی قسم کی ملازمتیں کرتا رہا۔ وہ مطالعے کا شوقین اور مغربی ورونی ادب کا رسیا تھا۔ 31 سال کی عمر میں اس نے ”بیدار نو جوان“ نامی ایک تحریک شروع کی اور ”انگرا“ کے نام سے اس کا جریدہ بھی شائع کرنے لگا۔ 1955ء میں اسے کامل کے امریکی سفارت خانے میں ملازمت مل گئی۔ ساتھ ساتھ انقلابی تصانیف کا سلسلہ بھی جاری رہا اور یوں وہ کمیونزم کے پیروکار جدید تعلیم یافتہ طبقے کے رہنماؤں میں شامل ہو گیا۔ آہستہ آہستہ کمیونسٹ منظم ہوتے گئے اور جب 1965ء میں کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی تو تو رہ کئی اس کا پہلا جنرل سیکرٹری مقرر ہوا۔ کچھ عرصے بعد ببرک کارمل سے اختلاف کے باعث پارٹی تقسیم ہوئی تو تو رہ کئی نے ”خلق“ اور کارمل نے ”پرچم“ کے نام سے الگ الگ پارٹیاں بنالیں۔ بعد میں داؤد خان کو ہٹانے کے لیے دونوں پارٹیاں پھر متحد ہو گئیں اور یوں نئی حکومت میں ان دونوں کا حصہ تھا۔

ترہ کئی کی پالیسیاں: کیونسٹوں کا شروع سے یہ دھیرہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی مقام پر گرفت مضبوط کرنے کے لیے سب سے پہلے عوام کو دھوکا دیتے ہیں، انہیں غربت اور افلاس کے خاتمے اور تعمیر و ترقی کے نئے دور کے آغاز کا مژدہ سناتے ہیں۔ نیز ابتدا میں انہیں مذہب کے حوالے سے بھی اعتماد میں لیتے ہیں اور خود کو مذہب دوست باور کراتے ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ ملک میں لادینیت، الحاد اور اپنے مخصوص نظریات کو فروغ دے کر عوام کو دین و مذہب سے بہت دور لے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی جو لوگ دین پر ثابت قدم رہیں، کمیونسٹ انہیں قتلخا برداشت نہیں کرتے بلکہ ان پر جگر دوز مظالم ڈھا کر انہیں مسمومہ عبرت بنادیتے ہیں۔

ترہ کئی نے بھی یہی کچھ کیا۔ ”انقلاب ٹوڑ“ کے دو ہفتے بعد 7 مئی کو اس نے اعلان کیا: ”ملک کی اساس اسلام ہوگی۔“ مگر اس کے ساتھ ساتھ ”انقلاب ٹوڑ“ کا بھیانک چہرہ افغان مسلمانوں کے سامنے آتا جا رہا تھا۔ ملک میں جگہ جگہ گرفتاریاں جاری تھیں۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ داؤد خان کو اس کے خاندان سمیت مشین گنوں کی فائرنگ سے بھون ڈالا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس کی کابینہ کے تمام اہم وزراء کو بھی پھانسی دے دی گئی تھی۔ یہ سب لوگ سابق شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مئی کے پہلے عشرے میں سابق حکومت کے سینکڑوں اعلیٰ عہدے داروں کو برطرف کر دیا گیا جن میں فوجی حکام، سولین افسران اور سفارتی نمائندے بھی شامل تھے۔

ترہ کئی کی کوشش تھی کہ وہ کمیونزم کی کاشت مکمل ہونے تک نئی حکومت پر ”کمیونسٹ“ کی چھاپ نہ لگنے دے اور اسے غیر جانبدار باور کراتا رہے۔ مگر سوویت روس کے ساتھ اس کے تعلقات کوئی ڈھکے چھپے نہ

تھے۔ اس کی کیونٹ پارٹی سے وابستگی کوئی راز نہ تھی۔ خلق اور پرچم کے نظریات عوام و خواص کے سامنے تھے۔ اس لیے افغان عوام اس جہانے میں نہ آئے۔

سوویت یونین سے ناقابل شکست رشتہ: ترہ کئی کی پشت پر سوویت یونین کی حمایت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ”انقلاب ٹور“ کے فوراً بعد دنیا کے تمام ممالک میں سے سب سے پہلے روس نے نئی حکومت کو تسلیم کیا۔ پھر انقلاب کے صرف تین ہفتے بعد ہم وزیر خارجہ حفیظ اللہ امین کو ماسکو کے دورے پر دیکھتے ہیں جہاں وہ یہ اعلان کرتا ہے: افغانستان اپنے عظیم ہمسائے سوویت یونین کے ساتھ ناقابل شکست برادرانہ رشتے میں منسلک ہے۔

احتمالہ اصلاحات: اس کے ساتھ ساتھ کیونٹ حکومت نے ملک میں کئی ”اصلاحات“ متعارف کرائیں۔ مثلاً سولہ سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی ممنوع قرار دی گئی۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے کا اعلان کیا گیا۔ ملک کا سبز پرچم تبدیل کر کے سرخ پرچم متعارف کرایا گیا جو واضح طور پر کمیونزم کی علامت ہے۔ ان اصلاحات کو عوام نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ بعض اصلاحات بظاہر پرکشش تھیں۔ مثلاً: شادی کے موقع پر دلہن کے بدلے کسی قسم کی رقم لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ کسانوں کے وہ قرضے معاف کر دیے گئے جو انہوں نے زمین داروں سے لیے تھے۔ زمین سے محروم کسانوں کو کہا گیا کہ وہ بڑے زمین داروں کی زمین پر قبضہ کر لیں۔ انہیں مالکانہ حقوق جاری کر دیے گئے اور کاغذات بنا کر دے دیے گئے۔ مگر اکثر کسانوں نے ان کاغذات کو پھاڑ دیا کیوں کہ وہ جانتے تھے کسی کی زمین پر جبراً قبضہ کرنا خلاف شریعت ہے۔ جب کسانوں کو اس پر زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ زراعت سے متنفر ہونے لگے۔ انہی اصلاحات کے مطابق ثقافتی اور نسلی اقلیتوں کے حقوق تسلیم کیے گئے۔ نسلی اقلیتوں کو عام شہریوں کے برابر حقوق میا کرنے کا اعلان کیا گیا۔ چونکہ یہ تمام تبدیلیاں کمیونسٹوں کی جانب سے سامنے لائی جارہی تھیں اس لیے عوام انہیں شک و شبہ کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر احکام شریعت اسلامیہ کے خلاف تھے۔ بلکہ غور کرنے پر ان میں سے اکثر معقول احکام کے پس پردہ بھی کوئی نہ کوئی سازشی عنصر کارفرما دکھائی دیتا ہے جس سے کمیونزم کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسانوں کو زمین فراہم کرنے اور ان کے قرضے معاف کرنے کا مقصد یہ تھا کہ انہیں ممنوع احسان کر کے کمیونزم کی ”مسادات“ کا قائل کیا جائے اور یوں رفتہ رفتہ انہیں کمیونسٹ بنالیا جائے۔ اس قسم کی اکثر زرعی اصلاحات جو کسانوں کے لیے پرکشش اور زمین داروں پر ضرب کاری تھیں، انجام کار شدید نقصان دہ ثابت ہوئیں۔ زمین داروں کے جائز حقوق بھی سلب ہو گئے اور ملک میں زراعت سے دلچسپی کا رجحان ختم ہونے لگا۔ اکثر

زمین داروں نے یا تو اپنے کسانوں کی وہ مراعات ختم کر دیں جو کسی قانون کے تحت نہیں آتی تھیں۔ مثلاً: ج، آلات زراعت، پانی کی فراہمی وغیرہ۔ یا انہوں نے یہ شعبہ ہی ترک کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا ملک زراعت کے میدان میں عشروں پیچھے چلا گیا۔ اناج میں خود کفیل افغانستان غلے کی درآمد پر مجبور ہو گیا۔

یقین دہانیاں اور دھمکیاں: کمیونسٹوں کے خلاف عوامی نفرت بتدریج بڑھ رہی تھی اور ارزگان، نیروز، ہلمند اور غور جیسے دور دراز کے دیہاتوں میں مزاحمت کی چنگاریاں سنگلے لگی تھیں۔ ترہ کنی نے قبائلی رہنماؤں کو مطمئن کرنے کے لیے ڈپلومیسی سے کام لیا۔ جون کے اواخر میں اس نے ملک بھر کے سرداروں اور عوام کو جمع کر کے انہیں کہا کہ حکومت نیک عزائم کی تکمیل کے لیے ان کا تعاون چاہتی ہے۔ کسان، مزدور اور اہل علم سب کو انقلاب کا ساتھ دینا چاہیے۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے اس نے کہا کہ افغانستان بہر حال غیر جانبدار ہے۔ سوویت یونین سے امداد لینے کا یہ معنی لینا غلط ہے کہ افغانستان سوویت بلاک کا حصہ بن جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اسلام پسند طبقات کو دھمکاتے ہوئے کہا: ”جو لوگ اس کے باوجود حکومت کی مخالفت کریں گے انہیں سنگین سزا دی جائے گی۔“

ہبرک کارمل برطرف، نت نئی فریب کاریاں: اس کے ساتھ ساتھ ترہ کنی نے اپنی کرسی کو مضبوط بنانے کے لیے دیگر کمیونسٹ پارٹیوں کو کمزور کرنے کے اقدامات بھی شروع کر دیے۔ اس نے پرچم پارٹی کا وجود تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور ہبرک کارمل کو برطرف کر کے جلاوطن کر دیا مگر اس طرح اس کی پوزیشن مضبوط نہ ہوئی بلکہ اس کے مخالفین میں اضافہ ہوتا گیا۔ ترہ کنی جانتا تھا کہ ملک میں فوراً روسی طرز کا کمیونزم نافذ نہیں ہو سکتا اس لیے اس نے لینن کی بہت سی ”اصلاحات“ پر عملدرآمد کو ملتوی رکھا۔ اس نے ایک نئے قسم کا کمیونزم متعارف کرانے کی کوشش کی جو بظاہر ”اسلام دوست“ دکھائی دیتا۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ ہلکے پھلکے اقدامات کیے جو بظاہر غیر معزور ہر طبقے کے لیے قابل قبول تھے۔

اس نے ”کامریڈ“ کے لفظ کو فروغ دے کر لوگوں کو کمیونسٹ ثقافت کے قریب لانا چاہا۔ (”کامریڈ“ کا لفظی معنی دوست یا ساتھی ہیں مگر کمیونسٹ اس لفظ کو اپنے ہم فکر و ہم نظر افراد کے لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ محفلوں اور مجلسوں میں غیر کمیونسٹوں سے ممتاز رہیں) مگر عوام میں یہ تبدیلیاں پنپ نہ سکیں۔ بڑھتی ہوئی عوامی نامقبولیت کو دیکھتے ہوئے ترہ کنی نے بار بار یہ بیانات دیے کہ ہم مذہبی آزادی کے قائل ہیں۔ اس نے افغانستان کے سابق سبز پرچم کو بھی جزدی طور پر دوبارہ بحال کر دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ عمومی طور پر سرخ پرچم ہی استعمال ہوتا رہا۔

حقیقت چھپ نہ سکی: ظاہر ہے مذہب پسند عوام کو اس طرح دھوکے میں رکھنا ناممکن تھا۔ افغان عوام

سوویت یونین سے ہجرت کر کے افغانستان آنے والے ہزاروں تاجیکوں، ازبکوں، ترکمانوں اور کرغیزوں کے حالات سے بخوبی واقف تھے۔ یہ لوگ سوویت یونین کے اسلام دشمن اقدامات اور لرزہ خیز مظالم سے تنگ آ کر ہجرت پر مجبور ہوئے تھے۔ ان علاقوں کے مہاجر علمائے دین افغان عوام کو آگاہ کر رہے تھے کہ اگر انہوں نے کیونز کم کار استہزادوں کا توکل ان کا حشر وسط ایشیا کے بے کس مسلمانوں جیسا ہی ہوگا۔

ترہ کئی سرایا جنگ: آخر ترہ کئی انتہائی اقدامات پر اتر آیا۔ بندگانِ خدا کا خون بہانا اس کے لیے ایراسی آسان اور خوش گوار تھا جیسا ہر ملحد کیونٹ کے لیے۔ حکومت سنبھالتے ہی اس نے سابق صدر داؤد خان کے ہزاروں حامیوں کو فوج کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔ اب وہ کھلم کھلا مذہبی طعنے کے خلاف سرایا جنگ بن گیا۔ سب سے پہلے اس نے ان علماء کی کردار کشی شروع کی جو حکومت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ یہ کوشش بے سود رہی۔ اُلٹا عوام علمائے دین کی عزت و ناموس بچانے سڑکوں پر آگئے اور حکومتی بدزبانی پر احتجاج شروع کر دیا۔ ترہ کئی نے احتجاجی جلوسوں پر گولیاں چلوا دیں اور درجنوں افراد شہید ہو گئے۔

”جہاد“ کا نیا مفہوم: ترہ کئی نے افغان عوام کو علماء اور مذہبی طبقے کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ اس نے ان کے مذہبی جذبات کو اپنے حق میں بھڑکانے کے لیے کابل میں نام نہاد مذہبی اسکالروں کی کونسل ترتیب دی اور اس کے ذریعے یہ اعلان کر دیا کہ حکومت کے مخالفین سے لڑائی ”جہاد“ ہے۔

اس نے مسلح افواج اور عوام کو یہ پیغام دیا کہ خدا کو راضی کرنے اور جنت میں بلند مقام پانے کیلئے حکومت کے مخالفین سے ٹکرا جائیں اور ”غازی“ یا ”شہید“ کہلائیں۔ مگر اس پروپیگنڈے کا اثر بالکل برعکس ہوا۔ علمائے کرام نے کیونٹ حکومت کے خلاف لڑنے کو زیادہ شدت کے ساتھ ”جہاد“ کہنا شروع کر دیا اور کچھ ہی دنوں میں ملک کے ہر کئی کوچے میں ”جہاد“ کا لفظ عام ہو گیا جسے لوگ کئی عشروں سے بھولے ہوئے تھے۔

شدید جھڑپیں: حکومت اور عوام میں ٹکراؤ روز بروز شدید ہوتا گیا۔ کنڑ اور پکتیا میں سب سے پہلے مسلح کارروائیاں شروع ہوئیں۔ حکومتی افواج ٹیکوں، بکتر بند گاڑیوں اور توپ خانے کے ساتھ ان علاقوں میں گھس گئیں۔ اب شدید جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ مجاہدین معمولی اور پرانے اسلحے سے چھاپہ مار حملے کر رہے تھے۔ وہ گھاٹیوں اور تنگ پہاڑی راستے پر فوج کے کانوائے روک لیتے اور انہیں سنگ باری یا دیسی ہوں کا نشانہ بناتے۔ ایک لڑائی میں سو کے لگ بھگ افغان سپاہی اور ان کے ساتھ چار روسی مشیر مارے گئے جس سے معلوم ہوا کہ روس برابر افغان حکومت کی رہنمائی کر رہا ہے۔

حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے۔ سرحد کے قریب افغان دیہاتوں سے لوگ پاکستان کا رخ کرنے لگے۔ سال 1978ء کے اواخر تک تیس ہزار مہاجرین پاکستان پہنچ چکے تھے۔

انقلاب ایران: 1979ء اپنے دامن میں نئے ہنگامے لیے وارد ہوا، اس سال 16 جنوری کو شاہ ایران رضا شاہ پہلوی ملک سے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا کیونکہ ایران میں آیت اللہ خمینی کا انقلاب کامیاب ہو گیا تھا۔ انقلابیوں نے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا تھا اور ”مرگ برامریکا“ کے نعرے بلند کرتے ہوئے وہ سابقہ حکومت کی ہر علامت کو مٹا رہے تھے۔ رضا شاہ پہلوی امریکا کا چھوٹا مکران تھا مگر اس موقع پر امریکا اسے سہارا دینے نہ آیا حتیٰ کہ اسے سیاسی پناہ تک دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ مجبوراً رضا شاہ، مصر کے صدر انور سادات کے ہاں پناہ گزین ہوا اور مصری میں جلا وطنی کی حالت میں فوت ہوا۔ اس کی معزولی کے ساتھ ہی ایران کے قدیم بادشاہی نظام کا خاتمہ ہو گیا۔

اب ایران ایک نئی حیثیت اختیار کر چکا تھا جس سے عرب دنیا سمیت کئی ملکوں کو خدشات لاحق تھے۔ رضا شاہ کی حکومت اگر امریکا نواز تھی تو اب انقلابی رہنما آیت اللہ خمینی کی حکومت کا روس نواز بن جانا کوئی بعید نہ تھا۔ پھر یہ حکومت کٹر شیعہ تھی جس کے انقلابی افکار سے مسابیحی مسلم ممالک کو بھی خطرہ تھا۔ روس رضا شاہ جیسے امریکی مہرے کے گر جانے پر خوش تھا۔ اب اس کے لیے سرخ انقلاب کا دائرہ افغانستان اور عرب دنیا تک پھیلا دینا آسان ہو گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے ایران کو اپنا حلیف بنالینا زیادہ مشکل نہ تھا۔ تاہم نیا ایران بزعم خود انقلاب اسلامی کا دعوے دار اور بزور طاقت اپنے مسابیحوں پر اپنے افکار مسلط کرنے کا خواہاں تھا۔ چنانچہ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اس نے اپنے پڑوسی عراق سے ”جزیرۃ شط العرب“ کے قصبے کو بنیاد بنا کر تعلقات کشیدہ کر لیے جو جلد ہی باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہو گئے۔ یہ جنگ آٹھ برس تک جاری رہی اور اس سے عالم اسلام کے بے پناہ قیمتی وسائل خاک میں مل گئے۔

گرم پانی تک رسائی کا روسی منصوبہ: دریں حالات روس کو سازگار رضا میا تھی کہ اب وہ افغانستان سے پاکستان اور پھر بحیرہ عرب کے گرم پانی تک راستہ بنا لے۔ یہ منصوبہ مدتوں سے ماسکوم زیرِ غور تھا مگر اب اس پر عمل کا بہترین موقع سامنے آچکا تھا۔ ایران میں امریکی اثر و رسوخ کو سخت دھچکا لگا تھا۔ افغانستان میں کمیونسٹوں کا قابل اعتماد ایجنٹ ترہ کئی برس اقدار تھا جو کیونزیم کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے روس اسے کوئی ناقابلِ تسخیر رکاوٹ تصور نہیں کرتا تھا۔ پھر پاکستان میں روس نواز لابی پوری طرح سرگرم تھی اور فوجی حکومت جو عوام میں نامقبول تھی روس سے ٹکر لینے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ افغانستان میں روسی اثر و رسوخ تیزی سے بڑھتا گیا۔ اس سال فوج میں سوویت مشیروں کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہو گئی۔ یہ مشیر درحقیقت افغان فوج کے آقا تھے۔ ان کی موجودگی سے فوج کی پیشہ ورانہ حیثیت شدید متاثر ہو رہی تھی۔ ادھر کہ ہجوم کے فروغ کے لیے بھرپور اعزاز میں کوششیں

جاری تھیں۔ کیونست پارٹی کاؤں گاؤں جا کر لوگوں کو ہم خیال بنانے کے جتن کر رہی تھی۔ ان کے کارکن اور عہدے دار اپنے جلسوں میں شعائر اسلام کا کھلے عام مذاق اڑاتے تھے، نماز روزے کو جنگل پن اور دقا نویست قرار دیتے تھے۔ وہ لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ مذہبی کتب کی جگہ لینن اور مارکس کا لٹریچر پڑھیں، لڑکے اور لڑکیاں مل کر تعلیم حاصل کریں، قرآن و سنت کے مطابق عبادت کے مرد و عورتیے ترک کر کے اب سکون قلب اور نجات پانے کے وہ طریقے اختیار کریں جو کیونست رہنماؤں نے تجویز کیے ہیں۔

مجاہدین کی تنظیمیں میدان میں: ان لمہ اندہ نظریات کے خلاف علمائے افغانستان کا احتجاج بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مختلف علاقوں کے غیور مسلمان علمائے کرام اور مجاہد رہنماؤں کی قیادت اپنے طور پر جہاد کا اعلان کر چکے تھے۔ لغمان کے نورستانی تو 1978ء کے موسم خزاں ہی میں اپنے علاقے کی فوجی چوکیوں پر حملے کرنے لگے تھے پھر 1979ء کے آغاز میں کنڑ میں مجاہدین کا ایک بڑا حملہ ہوا، پانچ ہزار مجاہدین نے ”چند سرائے“ میں سرکاری فوج کا ناظمہ بند کر دیا۔ اگرچہ جہاد کے اس ابتدائی دور کی کارروائیاں پختون صوبوں تک محدود نظر آتی ہیں مگر ان مجاہدین میں وسط ایشیاء سے ہجرت کر کے آنے والی ازبک، تاجک اور ترکمان مسلمان بھی پیش پیش تھے۔ یہ لوگ کیونزم کی اذیت ناک اندھیر نگری کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے سوویت یونین سے نفرت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔

1979ء کے آغاز میں ہم جن جماعتوں کو جہادی کارروائیوں میں مصروف دیکھتے ہیں، ان میں انجینئر گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی، پروفیسر برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی، مولانا محمد نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی اور مولانا محمد یونس خالص کی حزب اسلامی (خالص گروپ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نیز پروفیسر صبغت اللہ مجددی بھی ”جہ نجات ملی افغانستان“ کے نام سے جماعت بنا کر متحرک تھے۔ کچھ دنوں بعد کابل کے جنوب میں ”صوبہ وردگ“ کے پیر سید علی گیلانی کے ”قوی اسلامی محاذ“ نے بھی جہاد کا اعلان کر دیا اور یوں کیونست حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا۔

امریکی سفیر کا اغواء: پہاڑیوں، دیہاتوں اور جنگلات میں مجاہدین کے حملوں کے آغاز کے بعد فردری میں کابل شہر میں ایک حیرت انگیز کارروائی ہوئی جس سے دنیا بھر چونکا کر رہ گئی اور یہ تاثر عام ہو گیا کہ مجاہدین شہروں میں بھی بھرپور وار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ہوا یہ کہ مجاہدین کے کسی گروپ نے امریکی سفیر ایڈلف ڈولیس کو اغواء کر لیا۔ حکومتی اہلکاروں نے اس ہوٹل کا محاصرہ تو کر لیا جس میں سفیر کو یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا مگر وہ اسے آزاد نہ کر سکے۔ دو طرفہ فائرنگ ہوتی رہی اور اس دوران امریکی سفیر کسی گولی کا نشانہ بن کر ہلاک ہو گیا۔ مشہور یہی تھا کہ سرکاری

الہکاروں کی گولیوں نے اس کا کام تمام کیا ہے۔ امریکی حکومت نے بھی افغانستان کی امداد بند کر دی۔

ہرات، خونِ شہیدان سے لالہ زار: اس دوران افغان عوام پر حکومت کی جانب سے بدترین مظالم کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مجاہدین کی کارروائیوں کو روکنے میں ناکامی کا غصہ نئے شہریوں پر نکلا جا رہا تھا۔ اپریل 1979ء میں حکومت نے ”انقلاب ٹور“ کی پہلی سالگرہ منائی اس موقع پر جہاں سرکاری تقریبات دھوم دھام سے منائی جا رہی تھیں وہاں ہرات میں عوام ایک احتجاجی مظاہرہ کر رہے تھے۔ ترہ کئی حکومت نے اس احتجاج کو سختی سے کچلنے کے لیے فوج کو ایکشن لینے کا حکم دیا۔ ہرات میں سترہویں ڈویژن کے سپاہی تعینات تھے۔ اس فوج کے افسران میں سے سینئر کپٹن اسماعیل خان تورون اور کپٹن علاؤ الدین نے ان ظالمانہ احکام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ ڈویژن کے تقریباً تمام سپاہی جن کی تعداد دس ہزار تھی، مظاہرین سے جا ملے۔ انہوں نے سرکاری اسلحہ خانہ لوٹ لیا اور ہتھیار مظاہرین میں تقسیم کر دیے۔ پر جوش مظاہرین مسلح ہو کر ہرات میں رہائش پذیر سوریہ شہریوں کی آبادی پر ٹوٹ پڑے اور ان کے چھ سوا فراد کو موقع پر قتل کر دیا۔

اس خبر سے حکومتی ایوانوں میں سناٹا چھا گیا۔ ترہ کئی اور امین کے نزدیک روسیوں کا قتل ناقابل معافی جرم تھا اور اب ہرات کے تمام شہریوں کو اس کا خیارہ بھگتنا تھا۔ چنانچہ کامل اور قندھار سے کئی ڈویژن فوج ہرات پہنچ گئی۔ ادھر فضا یہ بھی حرکت میں آ گئی۔ بکتر بند گاڑیوں اور توپ خانے کے ساتھ لیس فوج شہر پر حملہ آور ہوئی۔ فضا یہ نے اندھا دھند بمباری کی، پہلے ہرات میں موجود فوج کے ہیڈ کوارٹر کو نشانہ بنایا گیا۔ اسے تھس نہس کرنے کے بعد عام شہری آبادی پر بمباری شروع کر دی گئی۔ اس قتل عام میں ہرات کے اسلام پسند فوجیوں کے علاوہ پانچ ہزار سے زائد عام شہری شہید ہوئے، گویا سرخ انقلاب کے داعیوں نے اپنی پہلی انقلابی سالگرہ ارضی وطن کو اہل وطن کے خون سے سرخ کر کے منائی۔

مگر اس قسم کی ستم رانیوں سے افغان مجاہدین کے حوصلے سرد نہ پڑے، بلکہ ان کے دلوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ برہان الدین ربانی، گلبدین حکمت یار، مولوی نبی محمدی اور مولوی محمد یونس خالص کے ساتھ اب ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا۔ ہرات کے کپٹن اسماعیل خان تورون نے اب باقاعدہ مجاہد رہنما کا روپ دھار لیا اور حکومت کے لیے مزید پریشانیاں پیدا کر دیں۔ غیور افغان عوام خونِ معاف کرنے کے قائل نہیں اس لیے ایسا ہر سانحہ ان کے خون کو اور گرم کر دیتا تھا۔

کنٹر میں قتل عام: ہرات کے ہولناک واقعے سے چند دن پہلے 20 اپریل 1979ء کو کنٹر میں بھی نہایت

لڑنے خیز واقعہ پیش آچکا تھا۔ صوبے کے قصبے ”کیرالا“ میں دوسو پولیس اہلکار اور 20 روسی شیر پینچے اور پوری ہستی کی آبادی کو ایک میدان میں جمع کر لیا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ بستی کے سکین مجاہدین سے ملے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے ان پر مشین گن سے گولیاں برسائی شروع کی گئیں جس سے کم از کم بارہ سو افراد شہید ہو گئے۔ پھر ان نعشوں کو بلڈوزر کے ذریعے ایک گڑھ میں دفن کر دیا گیا۔ آخری سانسوں تک یہ شہداء ”اللہ اکبر“ کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ان کا حوصلہ اور ولولہ ایمانی قابل دید تھا۔

مجاہد رہنماؤں کے خلاف کارروائیاں: ملک بھر میں مجاہد رہنماؤں کے گرد گھیراٹک کیا جا رہا تھا۔ مشہور افغان بزرگ ملا محمد ابراہیم مجددی جو ”ملا شور“ کے نام سے معروف تھے اپنے خاندان کے ایک سو مردوزن اور بچوں سمیت گرفتار کر لیے گئے۔ ملا صاحب پر شرم ناک مظالم ڈھائے گئے۔ ان کے خاندان کے دوسرے اہم رہنما پروفیسر صبغت اللہ مجددی پر (جو پشاور میں تھے) قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ ان کی رہائش گاہ پر بم بھیجا گیا مگر پروفیسر صاحب خوش قسمتی سے محفوظ رہے۔

حفیظ اللہ امین اقتدار کے لیے سرگرم: ان دنوں افغانستان کا ڈپٹی وزیراعظم اور وزیر خارجہ حفیظ اللہ امین بڑی پُرکاری سے حصول اقتدار کے لیے سرگرم تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ترہ کئی نے طاقت کا توازن اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ملک کا صدر بھی وہی ہے اور وزیراعظم بھی۔ پھر اس نے افغان کابینہ کے اہم ترین افراد کو بیرون ملک سفیر بنا کر انہیں ناکارہ پرزہ بنادیا ہے۔ مثلاً: نائب وزیراعظم ببرک کارمل جنکو سلواکیہ میں اور ڈاکٹر نجیب اللہ ایران میں بحیثیت سفیر تعینات کر کے عملاً معطل کر دیے گئے تھے۔ ایسے میں ضروری تھا کہ ترہ کئی کے استبدادی حربوں کو ناکام بنادیا جاتا۔

چنانچہ امین نے حد درجہ ہوشیاری سے اس مقصد کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ اس نے اہل ہرات کے قتل عام کو اپنی ترقی کا زینہ بنایا اور جلد ہی اسے ڈپٹی وزیراعظم سے وزیراعظم بنادیا گیا۔ گویا اب ترہ کئی صرف صدر تھا۔ تاہم اصل حکمران وہی تھا۔ امین اس کا دست راست تھا۔ گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ امین کے اختیارات بڑھتے گئے۔ 27 جولائی 1979ء کو اسے کیونٹ پارٹی کا سیکرٹری بنادیا گیا پھر اس نے وزیر دفاع کا عہدہ بھی حاصل کر لیا۔

امین کا ماضی: امین کا ماضی یہ تھا کہ وہ 1929ء میں کابل کے نواحی صوبے پغمان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے کابل یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ 1957ء میں حکومت نے اسے انتظامی امور کی اعلیٰ تعلیم MBA کے لیے امریکا بھیج دیا۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ امریکا میں مقیم افغان طلبہ کی ایک تنظیم کا صدر جنم لیا گیا۔ 1965ء میں جب افغانستان میں عام انتخابات

ہونے لگے تو امن وطن واپس آگیا۔ اس نے انتخابات میں حصہ لیا مگر ناکام رہا۔ کچھ عرصے بعد وہ کیونسٹوں کی نمائندہ سیاسی جماعت وہ پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہو گیا۔ جلد ہی اس نے افغان سیاست میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔

امن کیونسٹوں میں مقبول ہونے کے علاوہ وہ امریکا کے نزدیک بھی پسندیدہ مہرہ تھا۔ اسی وجہ سے ترہ کئی بھی اسے خاص اہمیت دیتا تھا۔ 1978ء کے ”انقلاب ثور“ میں اس کا کردار سب سے نمایاں تھا کیونکہ اسی نے کیونسٹ فوجی افسران سے رابطہ کر کے انہیں داؤد خان کے خلاف کارروائی کے لیے تیار کیا تھا۔

ترہ کئی اور امن کا اختلاف: حفیظ اللہ امن افغانستان کا وزیراعظم بن چکا تھا اور اب اسے اقتدار کے بلند ترین منصب تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری درپیش نہ تھی۔ امن کا کمال یہ تھا کہ اس نے صدر ترہ کئی کو اپنے عزائم کی ذرا بھی بھٹک نہیں پڑنے دی اور اسے پوری طرح اعتماد میں لیے رکھا۔ چنانچہ ترہ کئی نے اکثر امور اس کے سپرد کر دیے۔ ترہ کئی کی اس سادہ لوحی سے امن نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے ترہ کئی کو ”بابائے قوم“ کا خطاب دے ڈالا۔ کامل میں جگہ جگہ اس کی تصویریں آویزاں کر دیں۔ اس طرح گویا خود کو اس کا سب سے مستند و جاہل ثابت کر دیا۔ افغانستان میں کیونسٹ اصلاحات اور دیگر تمام نئی تبدیلیوں کے منصوبے اب وہی مرتب کر رہا تھا..... تاہم اس کا کوئی منصوبہ عوامی اشتعال کو ختم نہ کر سکا۔

امن کی یہ ترک تازیاں روس کی نظر سے پوشیدہ نہ تھیں۔ روسی حکام بہر کیف ترہ کئی پر زیادہ اعتماد کرتے تھے اور امن کو امریکا کا منکور نظر ہونے کی بنا پر شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ امن انتخاب اختیار ہونے کے باوجود عوامی مزاحمت پر قابو پانے اور کیونسٹوں کو مقبول بنانے میں ناکام ہے۔ چنانچہ ستمبر 1979ء میں ترہ کئی ماسکو گیا تو روسی صدر برژنیف نے اس سے تنہائی میں ملاقات کے دوران امن کے منصوبوں کی ناکامی پر تنقید کی اور اسے برطرف کرنے کا مطالبہ کیا۔

11 ستمبر 1979ء کو ترہ کئی کامل واپس آیا۔ ہوائی اڈے پر کیونسٹوں نے اس کا زبردست استقبال کیا۔ اگلے دن وزراء کے اجلاس میں ترہ کئی امن پر برہم ہوا اور اسے برطرف کر دینے کا عندیہ دیا۔ ترہ کئی کو معلوم نہیں تھا کہ اس وقت تک امن نہ صرف فوج اور پولیس کو اپنی منہی میں لے چکا تھا بلکہ مجلس وزراء کی اکثریت اس کی حامی تھی۔

امن نے 14 ستمبر 1979ء کو مجلس وزراء کا اجلاس بلا لیا اور فوری طور پر اپنے مخالف چند وزراء کو معزول کرنے کے احکام جاری کر دیے۔ یہ احکام جب ایوان صدر پہنچے اور صدر ترہ کئی کو ان پر دستخط کرنے کا کہا گیا تو وہ کئی کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ امن کتنی طاقت کا حامل ہے۔

اس نے صورت حال کو سنبھالنے کے لیے امین کو فون کیا۔ طے یہ ہوا کہ دونوں روسی سفیر کی موجودگی میں ایوان صدر میں بیٹھ کر بات چیت سے باہمی تنازعات کا کوئی حل نکال لیں گے۔ ترہ کنی نے امین کو فون پر ہی کہا کہ روسی سفیر اسی وقت آرہا ہے۔ تم بھی فوراً آ جاؤ۔ یہ واقعہ 15 ستمبر 1979ء کا ہے۔

ترہ کنی کا قتل: ان دونوں کیونٹ لیڈروں کی یہ آخری بات چیت تھی جنہوں نے پری ہوئی۔ امین مزید کہنے سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے روسی سفیر کے آنے سے پہلے پہلے آنا فانا صدارتی محل کا محاصرہ کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ خود وہاں پہنچا اور کارروائی کا اشارہ دیا۔ صدارتی محل گولیوں کی تڑاتڑ سے گونج اٹھا۔ چند ہی لمحوں میں ترہ کنی اپنے تین قابل اعتماد وزراء، خفیہ پولیس کے سربراہ اور محافظوں سمیت موت کے گھاٹ اتر گیا۔

بعض ذرائع کا کہنا تھا کہ ترہ کنی کو اس موقع پر قتل نہیں کیا گیا تھا بلکہ زخمی حالت میں اغوا کر کے ایک کوٹری میں بند کر دیا گیا تھا۔ تین مئی بعد 18 اکتوبر 1979ء کو اسے وہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔

بہر صورت افغانستان میں کیونٹزم کی زہریلی فصل ہونے والا دشمن اسلام صرف ایک سال، چار ماہ اور چند دن حکومت کر کے نہایت ذلت و رسوائی کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی حفیظ اللہ امین نے افغانستان کے دوسرے صدر کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔ ترہ کنی کی موت کی خبر کو خفیہ رکھا گیا۔ 16 ستمبر کو انقلابی کونسل نے اعلان کیا کہ ترہ کنی کو علالت کی وجہ سے پارٹی کی ذمہ داریوں سے سبک دوش کر دیا گیا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ اس کے قتل کی بات مشہور ہو گئی جس سے ملک میں مزید انارکی پھیلنے لگی۔

حفیظ اللہ امین کا دور حکومت: افغانستان کا اقتدار اب حفیظ اللہ امین کے پاس تھا۔ ترہ کنی کی طرح وہ روس کا خصوصی مہرہ نہ تھا اس لیے ماسکو نے اس کی حکومت کو خوش آمدید نہ کہا۔ روس کے اس رویے کے رد عمل میں امین امریکا سے تعلقات بہتر بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ امریکا نے خیر سگالی کے پہلے قدم کے طور پر افغانستان کی امداد بڑھادی اور اپنا ایک مسافر بردار طیارہ افغان ایئر لائنز کو بطور تحفہ دے دیا۔ ادھر عظیم و ستم کا خونیں عفریت افغانستان میں ایک بار پھر خون آشامی کا ذوق پورا کرنے لگا تھا۔ امین نے بھی ترہ کنی کی طرح اقتدار سنبھالنے ہی سابق حکومت کے وفاداروں اور اپنے مخالفین کو بے دریغ قتل کرنا شروع کر دیا۔ مگر جلد ہی امین کو اندازہ ہو گیا کہ ایک طرف سوویت کے نزدیک ناپسندیدہ رہ کر اور دوسری جانب عوام کی نظروں میں قابل نفرت بن کر وہ زیادہ دن اقتدار کے مزے نہیں لوٹ سکتا۔ چوں کہ وہ ایک منصوبہ ساز آدمی تھا اس لیے اس نے ایک طرف تو ماسکو کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وہ افغانستان میں سوویت اصلاحات رائج کرنے، عوامی شورش پر قابو پانے اور دیگر ترقیاتی کاموں کو سرانجام دینے کی سب سے بہتر اہلیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس نے ادھر ادھر

صحافیوں، فنکاروں اور دیگر شعبوں کے افراد کے گروپ بنائے اور انہیں حکومتی سرپرستی کا یقین دلایا۔

یہی نہیں بلکہ مذہبی طبقے کو متاثر کرنے کے لیے اس نے کچھ زرخیز علماء کو جمع کر کے ایک ”جمعیت علماء“ قائم کی اور اس کے ارکان علماء کو ”اولوالامر“ کا لقب دیا۔ عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ حکم خداوندی کے مطابق ”اولوالامر“ کی اطاعت کریں۔ تاہم امن کے یہ منصوبے بھی افغان عوام کو متاثر نہ کر سکے اور اسے مذہبی طبقے سے حسب خواہش ایک ”اچھا مسلمان“ ہونے کی سند مل سکی۔

ماسکو افغانستان پر چڑھائی کے لیے تیار: ادھر سوویت یونین امن کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس کے متبادل پر غور کر رہا تھا۔ روسی حکام دیکھ رہے تھے کہ افغانستان میں حالات قابو سے باہر ہوئے جا رہے ہیں۔ داؤد خان، ترہ کئی اور اب امن بھی کیونز م کے مخالفین کو کچلنے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اب افغانستان کے اسلام پسند مسلمانوں کی مزاحمت کے خاتمے کے لیے براہ راست کارروائی ناگزیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر کام شروع کر دیا گیا۔ روسی سپاہیوں کا جم غیر وسط ایشیا میں جمع ہونے لگا۔ وہاں ٹینکوں، توپوں اور طیاروں کا ایک میلہ لگ گیا۔

روس نے اس سے پہلے کسی مخالف ملک میں افواج اتارنے کی مشقیں بھی کر لی تھیں۔ افغانستان پر باقاعدہ حملے سے کئی ماہ قبل دس ہزار روسی فوجی اینٹونوف 22 طیاروں کے ذریعے جنوبی یمن اور انجولیا میں اتار گئے تھے۔ یہ ساری کارروائیاں اور مشقیں نہایت خفیہ رکھی جا رہی تھیں حتیٰ کہ امریکا کی فعال ایجنسیوں کو بھی صورت حال کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ روسی حکام ایک طرف امن کو دوتی کے پیغامات بھیج رہے تھے اور دوسری طرف دریائے آمو کے قریب چالیسویں بریگیڈ کے سپاہی حملے کے لیے تیار کھڑے تھے۔



مآخذ و مراجع

..... تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی و تھا العاصم۔ فاروق حامد بدر

..... تاریخ جہاد افغانستان، ڈاکٹر انجیل بی خان

..... افغانستان، ایک قوم کا الیہ، احمد شجاع پاشا

..... اردو ڈائجسٹ، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء

Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

چوبیسواں باب

سوویت افواج کی افغانستان پر یلغار

سوویت سیاہ کا افغانستان میں عمل دخل: روسی سپاہی دسمبر 1979ء سے پہلے بھی افغانستان میں موجود تھے۔ ترہ کئی اور اہمین حسب ضرورت ان کے چھوٹے چھوٹے دسے طلب کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ جدید ترین روسی اسلحے کے استعمال کے لیے سوویت فوجی ہی کام آتے تھے۔ جون 1979ء تک افغانستان میں سوویت مشینوں کی تعداد 8 ہزار تک پہنچ گئی تھی جن میں نصف سولین اور نصف فوجی آفیسر تھے۔ اس کے علاوہ دسمبر 1979ء میں عمومی یلغار سے پہلے روس 25 ہزار کے لگ بھگ فوج افغانستان بھیج چکا تھا۔

اہمین کو معلوم تھا کہ وہ ماسکو کی نظر میں ناپسندیدہ ہے اس لیے وہ اسے خوش کرنے کے لیے مجاہدین کے خلاف بمباریوں کا ردوائیوں کی کوشش کر رہا تھا۔ اکتوبر 1979ء میں اس نے پکتیا میں مجاہدین کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے 40 ہزار افغان سرحد پار کر کے پاکستانی قبائلی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ سرکاری فوجیں یہ اطمینان کر کے واپس چلی گئیں کہ مجاہدین فرار ہو گئے ہیں مگر مجاہدین اپنے اہل و عیال کو پاکستانی کیمپوں میں ٹھہرانے کے بعد دوبارہ پکتیا میں داخل ہو گئے اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر کارروائیاں شروع کر دیں۔

اہمین..... طاغوت سے مدد کا منتظر: اتنی زبردست افواج اور جدید ترین اسلحے کے باوجود حالات کی باگ ڈور اہمین کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی۔ ترہ کئی کے دور کی طرح اہمین کے ایام اقتدار میں بھی افغانستان کے بڑے شہروں میں رات کو مستقل کرفیو نافذ رہتا تھا۔ اہمین اتنا خوفزدہ تھا کہ دارالحکومت میں ہر وقت بمباری تعداد میں افواج جمع رکھنا ضروری خیال کرتا تھا۔ اہمین اب لے دے کے روسی طاغوت سے مدد کا منتظر تھا۔ چنانچہ اس نے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے واضح طور پر کہا تھا: ”اگر ہم پر حملہ ہوا تو ہم مدد کے لیے روس ہی کو پکاریں گے۔“

مگر سوویت روس کو اہمین کی پکاری ضرورت نہ تھی۔ اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یلغار کا حتمی

فیصلہ کر لیا تھا۔

4 لاکھ مہاجرین: ادھر پاکستان افغانستان کے حالات سے شدید متاثر ہو رہا تھا۔ دسمبر کے اواخر تک پاکستان میں پناہ لینے والے افغان مہاجرین کی تعداد 4 لاکھ سے زائد ہو چکی تھی۔ یہ صورت حال خود امین کے منہ پر ایک طمانچہ اور اس کی نااہلیت کا واضح ثبوت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امین نے ہجرت کرنے والے تمام افراد کو واپسی کی دعوت دی اور ان کے لیے معافی کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی حزب اسلامی کے سربراہ مولوی محمد یونس خالص پر زور دیا کہ وہ مہاجرین کو واپسی پر آمادہ کریں مگر جب تک امین اپنی روش تبدیل نہ کرتا، ہم زندہ مہاجرین واپس کیسے آ سکتے تھے۔ چنانچہ مولوی یونس خالص نے امین کی اہل ستر دکر دی۔

عسکران پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے افغانستان پر روسی حملے کا شدید خطرہ محسوس کرتے ہوئے دسمبر کے اواخر میں وزیر خارجہ آغا شامی کو کابل بھیجنے کی کوشش کی مگر وہ برف باری کی وجہ سے نہ جا سکے۔

بہت بڑا کھیل: دسمبر کے آخری عشرے میں روس نے افغانستان میں سرخ افواج اُتارنے کی منصوبہ بندی پر عمل کر ڈالا۔ اس کے لیے بہت بڑا کھیل کھیلایا گیا۔ روس نے دنیا پر یہ ظاہر کیا کہ وہ مال بردار جہازوں میں بڑے پیمانے پر افغانستان کے لیے امدادی ساز و سامان روانہ کر رہا ہے۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ طے شدہ پلان کے مطابق 23 دسمبر 1979ء کو روس نے کچھ نئے ٹینک اور جدید اسلحے کے کچھ ذخائر کابل پہنچا دیے۔ پھر افغان حکام کو ایک تقریب میں مدعو کیا جہاں ان کی ردی شراب سے تواضع کی گئی۔ انہیں بھی تاثر دیا گیا کہ روس فوجی امداد میں اضافہ کر رہا ہے۔

ایک لاکھ سوویت فوجی افغانستان میں: 23 اور 26 دسمبر کے درمیان روس کے ایٹونوف اور الیوشن طیارے بگرام ایئر پورٹ پر روسی سپاہ کو اُتارتے رہے۔ امین کابل انتظامیہ اور افغان فوج یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے مگر انہیں لب کشائی کی جرأت نہ تھی۔ روسی طیاروں نے ان دو تین ایام میں بگرام ایئر پورٹ تک 350 پروازیں کیں اور ہزاروں سپاہی یہاں اُتار دیے۔ یہ ایئر پورٹ برسوں پہلے روس نے ایسے ہی کسی موقع پر اپنا اڈا بنانے کے ارادے سے تعمیر کیا تھا۔

26 دسمبر کی شام تک ایک لاکھ سوویت سپاہی افغانستان میں داخل ہو چکے تھے۔ تب امین نے ایک انجانا خطرہ محسوس کرتے ہوئے 26 دسمبر کی شام کو افغانستان کی چوتھی آرمرڈ بریگیڈ کے افسران کا اجلاس طلب کیا اور ان کی رائے معلوم کی۔ بحث کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے جس سے روس کے ساتھ تعلقات متاثر ہوں اور انقلاب ”ٹوڑ“ کے مقاصد کو ٹھیس پہنچے۔

کاش! یہ بے حمت عسکران اور افسران عساکر کیونزم کی ٹینک اُتار کر حالات کا جائزہ لیتے تو انہیں

سوویت یونین کا ہر اقدام افغانستان کی سالمیت اور آزادی کے خلاف ایک زہر آلود خنجر دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ روس کے پرستار روسی آقاؤں سے یہ گمان کیسے کر سکتے تھے؟ وہ خوش فہمی کی دنیا میں مست تھے۔ روس کا امن کے خلاف آپریشن: اُدھر ہزاروں روسی مشیر جو افغان فوج کے غیر علانیہ آقا تھے، حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے امن کے حامی افسران کو کمروں میں بند کر کے تالے لگا دیے اور بہت سے سرکردہ عہدے داروں کو بیڑیاں لگا کر انہیں نقل و حرکت کے قائل نہ رہنے دیا۔

حفیظ اللہ امین کچھ دنوں پہلے ہی سوویت مشیروں کی تجویز پر کامل کے محفوظ ایوان صدر کو چھوڑ کر ایوان دارالامان منتقل ہو گیا تھا۔ یہاں روسی اس پر آسانی سے ہاتھ ڈال سکتے تھے کیونکہ یہ شاعر محل شہری آبادی سے دور تھا۔ 27 دسمبر کی دوپہر تک امن یہاں داد پیش دے رہا تھا۔ اسے کچھ خطرات محسوس ہو رہے تھے مگر سہ پہر کو روسی وزیر مواصلات نے بڑے خوشگوار موڈ میں اس سے ملاقات کی اور کہا: ”اگر ہر چیز معمول کے مطابق ہے تو پھر سب ٹھیک ہے۔“

اس دوستانہ رویے سے وہ امن کو حتی الامکان بے فکر رکھنا چاہتا تھا۔ اسی شب K. G. B کے خاص کمانڈوز دستے دارالامان کی طرف بڑھے اور اسے زرخے میں لے لیا۔ وہ امن کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر محل کے محافظ سپاہیوں نے مقابلہ شروع کر دیا۔ بہر کیف وہ مشاق روسی کمانڈوز کو روک نہ سکے اور مارے گئے۔ امن بھی اس معرکے میں گولی کا نشانہ بن کر موت کے گھاٹ اتر گیا۔ اس کے خاندان کے بہت سے افراد بھی قتل کر دیے گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امن کو معرکے کے بعد گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔

امن کا سیاہ کردار اور انجام بد: حفیظ اللہ امن 16 ستمبر 1979ء سے 27 دسمبر 1979ء تک صرف 102 دن حکومت کر کے اپنے انجام کو پہنچا۔ مختصری مدت میں اس نے افغان عوام و خواص پر جو مظالم ڈھائے تھے ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔ وہ اپنے ہر مخالف کو بے دریغ قتل کر دیا کرتا تھا چاہے وہ کتنی ہی بڑی حیثیت کا حامل کیوں نہ ہو۔ اس نے اپنے پیشرودہ کئی کے حامی سیاست دانوں اور افسران کو مر دا ڈالا، افغانستان کی بڑی بڑی شخصیات کو جیلوں میں ٹھونس دیا، اس کے حکم پر قتل اور گرفتار کیے جانے والوں میں سیاست دان، علمائے کرام، دانشور، بیوروکریٹ، سول، فوجی، ملازمین اور عوام سب ہی شامل تھے۔ اقتدار سنبھالنے وقت اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جیلیں خالی کر دے گا مگر چند ماہ میں اس نے جیلوں میں دو گنا قیدی بھر دیے تھے۔

روسی یلغار کے پس پردہ مقاصد: روس کا مقصد صرف افغانستان کی حکومت تبدیل کرنا نہیں تھا۔ یہ کام تو وہ اپنے افغان ایجنٹوں اور خفیہ ایجنسیوں سے بھی لے سکتا تھا۔ روس اپنے ان استعماری عزائم کے

تحت افغانستان میں داخل ہوا تھا جو مدتوں سے اس کے سامنے تھے۔ جن کے تحت وہ وسط ایشیا پر قابض ہوا تھا۔ وہ افغانستان کے جذبہ جہاد کو کچل کر یہاں کیونزم کا بت کھڑا کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کے انمول معدنی وسائل کو اپنے قبضے میں لینے کا خواہش مند تھا۔ اس سے بڑھ کر وہ اس دروازے کو استعمال کر کے پاکستان کو گرفت میں لے سکتا تھا اور پھر بحر ہند کے راستے عرب ممالک تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ الغرض سوویت روس افغانستان کے ذریعے پورے عالم اسلام کو مغلوب کرنے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر اسے معلوم نہ تھا، اس نے ایسی دھرتی پر قدم رکھ دیا ہے جہاں کے غیر مسلمان ہر دور میں سردھڑکی بازی لگا کر اپنے ایمان، آزادی اور عزت کی حفاظت کرتے آئے ہیں۔

چار بڑے اہداف: روس کے افغانستان پر حملے کے پس پردہ مقاصد کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں اور اس پر بڑی بحث ہو چکی ہے تاہم چند باتیں بہت واضح ہیں:

① کیونزم کا غلبہ..... روس کیونزم کا داعی تھا اور دنیا بھر میں اس لادینی و لٹھرانہ نظام کو غالب دیکھنا چاہتا تھا۔

② یہودی عزائم کی تکمیل..... کیونزم کے بانی مارکس اور لینن یہودی تھے۔ روس میں بالٹوئیک انقلاب برپا کر کے زار شاہی کو ختم کرنے اور اسے کیونزم کا مرکز بنانے میں یہودی لابی پیش پیش تھی۔ اٹلیس کے یہ نمایندے تغیر عالم کے ناپاک منصوبے کو جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کیونزم کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ وسط ایشیا میں قصر اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد افغانستان ان کی راہ میں حائل تھا۔ اسے مسخر کیے بغیر تغیر عالم کا قدیم یہودی منصوبہ اہمورارہ جاتا۔

③ گرم پانیوں تک رسائی..... روس عرصہ دراز سے گرم پانیوں تک رسائی کا خواہش مند تھا۔ اس کے لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے رقبے میں کوئی ایسا سمندر نہ تھا جو سال بھر کھلا رہتا ہو۔ یہ سمندر موسم سرما میں منجمد ہو جاتے تھے جس کی وجہ سے روس کے لیے بحری راستوں کے ذریعے تجارتی و فکری مقاصد حاصل کرنا ناممکن تھا۔ روس کے زار پیٹر اول نے اپنے وصیت نامے میں تاکید کی تھی کہ ہمارے ملک کے لیے جنوب کی طرف بڑھ کر گرم سمندروں تک پہنچنا اور وہاں بحری معسکر قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ وصیت نامہ روسی فوجوں کی نظر میں ہمیشہ خاصی اہمیت کا حامل رہا اور اس کے مطابق جنوب کی فتوحات ان کی ترجیح میں شامل رہیں۔ افغانستان پر قابض ہوئے بغیر روس کا آگے بڑھنا محال تھا اس لیے یہ خطہ اس کی استعماری سرگرمیوں کا ایک عرصے سے نشانہ اور اس کے فتوحات کے منصوبے میں شامل تھا۔

● معدنی دولت پر قبضہ..... روس افغانستان کی معدنی دولت اور قدرتی وسائل کو کسی روک ٹوک کے بغیر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ خلیج کے مسلم ممالک کا تیل بھی اپنے قبضے میں لینے کے لیے بے تاب تھا۔ ماہرین ارضیات کے مطابق افغانستان میں تیل، گیس، فولاد، جست اور قیمتی پتھروں کے بے پناہ ذخائر مدفون ہیں۔ قدرتی گیس کے بعض ذخائر دریافت بھی کر لیے گئے تھے، یہ گیس سوویت یونین کو برآمد کی جارہی تھی اور اس کی قیمت عالمی منڈی کے نرخ سے کہیں کم تھی۔ گویا کم خرچ بالائین والہ معاملہ تھا۔ مگر اب روس یہ دولت براہ راست اپنے قبضے میں لینا اور پھر خلیج کی اسلامی ریاستوں متحدہ عرب امارات وغیرہ کا تیل چھیننا چاہتا تھا۔

مولانا جلال الدین حقانی کی گواہی: اس سلسلے میں روس کی نظر صرف افغانستان پر نہیں تھی بلکہ پاکستان پر قبضہ کیے بغیر اپنی مہم کو بالکل ادھورا سمجھتا تھا۔ عظیم مجاہد کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی نے ماہنامہ ”الحق“ کے جون 1988ء کے شمارے میں شائع ہونے والے اپنے انٹرویو میں دونوں الفاظ میں کہا تھا کہ اس خطے کے لیے روس کی حکمت عملی کا پہلا مرحلہ یہی تھا کہ افغانستان پر مکمل تسلط کے بعد پاکستان کے صوبہ سرحد اور بلوچستان پر قبضہ کیا جائے۔ روس اس راستے سے گرم پانیوں اور خلیج کے تیل کے چشموں تک رسائی کا عزم کیے ہوئے تھا۔

فوری سبب: یہ تو مستقل اسباب تھے جن کی بنا پر روس کو بہر حال افغانستان میں ایک نہ ایک دن قدم رکھنا تھا۔ داؤد خان اور ترہ کنی جیسے کیونسٹ ایجنٹ شعوری یا لاشعوری طور پر روس کے اس انتہائی مقصد کے لیے زمین ہموار کرتے رہے تھے۔ مگر جب روس نے یہ دیکھا کہ اس کے ایجنٹ حالات پر قابو پانے اور اہداف کے حصول میں ناکام ہیں اور افغان علماء اور مجاہدین میدان جہاد میں اتر کر کیونسٹ نظام کے لیے خطرہ بن گئے ہیں تو اسے بازی چلتی محسوس ہوئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر بلاتاخیر پوری طاقت سے مجاہدین کو نہ پکڑا گیا تو افغانستان کیوزم کا مورچہ بننے کی بجائے اس کے خلاف اسلام کا قلعہ بن جائے گا۔ چنانچہ وہ افغانستان پر ٹوٹ پڑا۔ اور اس سلسلے میں کسی کی ملامت اور ناراضی کو خاطر میں نہ لایا۔

دنیا بے خبر تھی: 27 دسمبر 1979ء کو سرخ فوج کے افغانستان میں داخل ہونے کے بعد افغانستان دنیا کی نگاہوں کا محور بن گیا۔ چند دن پہلے تک کسی کو اندازہ نہ تھا کہ سوویت روس اس طرح افغانستان میں کھلی مداخلت کی جرأت کرے گا۔ امریکی سی آئی اے تک حقائق سے لاعلم تھی۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے بھی باقی دنیا کی طرح خبر 28 دسمبر کی صبح نشر کی۔ اور تو اور خود پاکستان تک کو میسج نہ پڑ سکی۔ جنرل ضیاء الحق کو امین سے روس کی ناراضی اور اس کے امریکا کی طرف جھکاؤ کا اچھی طرح علم تھا، وہ روس کے

افغانستان میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے بھی فکر مند تھے اور امن کو سہارا دینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے 23 دسمبر کو وزیر خارجہ پاکستان آغا شای کو کابل بھیجے کا فیصلہ بھی کیا تھا مگر برف باری کے سبب یہ سفر ملتوی ہو کر 28 دسمبر کو طے کیا گیا تھا۔ اس دن دوبارہ آغا شای آمادہ سفر تھے مگر علی الصبح سوویت یلغار کی اطلاع ملی۔ اگر پاکستانی ایجنسیوں کو اس کی ذرا بھی خبر ہوئی تو آغا شای کا دورہ 28 دسمبر کو طے نہ کیا جاتا۔

روس کا نیا مہرہ: چند دن تک دنیا بھر میں چڑی گولیاں ہوتی رہیں کہ اب افغانستان کا نیا نظام حکومت اور سیاسی سیٹ آپ کیا ہوگا؟ مگر سوویت یونین پہلے ہی اس مقصد کے لیے ایک مہرہ تیار کر چکا تھا۔ یہ ببرک کارمل تھا۔ کیونست پرچم پارٹی کا سربراہ ببرک کارمل 1929ء میں دژانی قبیلے میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا خاندان افغانستان میں نہایت معزز شمار ہوتا تھا۔ اس کا باپ محمد حسین خان ہرات اور پکتیا کا گورنر رہا تھا۔ وہ جدید تعلیم کا دلدادہ تھا مگر عام افغانوں کی طرح کیونزم سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ ایک حد تک وہ روایتی مسلمان تھا۔ بچپن ہونے کے باوجود اس خاندان میں پشتو کی بجائے دری زبان بولی جاتی تھی۔

کارمل نے کابل کے امانیہ ہائی اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی جو شاہ امان اللہ خان نے ملک میں جدید تعلیم عام کرنے کے لیے کھولا تھا۔ اس نے 1948ء میں ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کی۔ 1960ء میں اس نے قانون و سیاسیات میں یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی۔ اس دوران افغانستان کے سیاسی معاملات کے علاوہ نظام تعلیم میں بھی کیونست اثرات غالب آتے جا رہے تھے۔ یہ داؤد خان کی ”جدید اصلاحات“ کا کرشمہ تھا۔ کارمل اس ماحول سے متاثر ہوا اور ”مارکسی نظریات“ کا پیروکار بن گیا۔ اس کی ذہن سازی میں کیونست دانشور اور صحافی میر اکبر کا بڑا ہاتھ تھا۔

1965ء میں افغانستان میں سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت ملی تو وہ کئی کے ساتھ مل کر کیونست پارٹی، پی ڈی اے (پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان) بنانے میں اس کا کردار نمایاں تھا۔ یہ پارٹی کے چند بنیادی ارکان میں شامل تھا۔ بعد میں اختلاف کے باعث ترکہ کئی نے ”خلق پارٹی“ اور کارمل نے ”پرچم پارٹی“ کے نام سے الگ الگ دھڑے بنا لیے۔ تاہم اپریل 1973ء کے انقلاب ثور میں یہ دونوں دھڑے یکساں طور پر شریک تھے۔ حکومت سازی میں بھی ببرک کارمل کا نمایاں مقام تھا۔ یعنی ترہ کئی کے بعد اس کو نائب وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔ مگر کچھ دنوں بعد ترہ کئی نے اسے معطل کر کے سفیر کی حیثیت سے چیکو سلواکیہ بھیج دیا تھا۔ کارمل تب سے وہاں ”پراگ“ میں کرب و انتظار کی زندگی گزار رہا تھا۔ ببرک کارمل، اس کی کٹھ پتلی: سوویت روس نے افغانستان پر باقاعدہ حملہ کرنے سے پہلے جب

اپنے مہروں پر نظر دوڑائی تو کارل سب سے موزوں نظر آیا۔ چنانچہ اسے اپنے عزائم سے آگاہ کر دیا گیا۔ کارل نے اقتدار کی پُرکشش قیمت پر اپنی وفاداریاں سوویت یونین کے نام کر دیں۔ ماسکو ہی میں کارل کی وہ تقریر ریکارڈ کی گئی جو 27 دسمبر کی شب روسی افواج کے ہاتھوں امین کے قتل کے بعد کامل ریڈیو سے افغان عوام کو سنا کی گئی تھی۔ حالانکہ کارل ابھی افغانستان پہنچا بھی نہیں تھا۔ اس تقریر میں کارل نے جو کچھ کہا تھا، اس کا لب لباب یہ ہے:

”میرے بہادر و دلیر ہم وطن خواتین و حضرات! میں آپ سے اظہار عقیدت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ نے حفیظ اللہ امین کے دور میں ہونے والے ظلم و ستم، جبری ہجرت، انسانیت سوز مظالم اور ہزاروں افراد کے بے رحمانہ قتل عام کا مشاہدہ کیا۔ اس کی براہ راست نگرانی میں خوں آشام درعدوں نے عوام کو قہقاہوں کی طرح کاٹا کیونکہ حفیظ اللہ امین امریکی جاسوس ادارے سی آئی اے کا ایجنٹ تھا۔ یہ امریکی سامراجی نظام عوام کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے جو کہ اس کی ایلیسی حرکتوں اور فرعون کی کارستانیوں سے تنگ آ گئے تھے۔“

کیا امین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا؟ ببرک کارل کی یہ تقریر جھوٹ اور فریب کی بدترین کی مثال تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ امین کو قتل کرنے میں افغان عوام کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ لوگ اس سے متفر ضرور تھے مگر اسے قتل کرنے کے لیے خود روس نے کے جی بی کے کمانڈرز بھیجے تھے جن کی قیادت جنرل وکٹر پاپوٹن (Papotin) کر رہا تھا۔ یہ جنرل اس لڑائی میں خود بھی شدید زخمی ہوا تھا اور کچھ دنوں بعد مر گیا تھا۔ بہر کیف سوویت یونین اور اس کے ایجنٹوں نے دنیا کو یہی دکھانے کی کوشش کی کہ امین کا قتل مقامی عوام کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔ روس کی خبر رساں ایجنسیوں نے نہ صرف یہ بے بنیاد خبر مشہور کی کہ امین سی آئی اے کا ایجنٹ تھا بلکہ یہاں تک دعویٰ کیا کہ وہ امریکا کے ایما پر افغانستان کی اسلامی جماعتوں کے ساتھ مل کر 1978ء کے انقلاب ثور کے تمام اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حالانکہ اسی حفیظ اللہ امین کو ستمبر 1979ء میں برسر اقتدار آنے پر روسی صدر برزنیف نے مبارک باد دی تھی۔

روس افغانستان میں ایک لاکھ سپاہی داخل کر دینے کے بعد یہ ڈھنڈورا بھی پیٹ رہا تھا کہ اس نے حفیظ اللہ امین کی درخواست پر عسکری مداخلت کی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ سی آئی اے کا ایجنٹ ہوتا تو وہ روس سے مداخلت کی درخواست کیسے کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سی آئی اے کا ایجنٹ تھا نہ اسلام پسند جماعتوں سے اس کا کوئی تعلق تھا۔ وہ بھی ایک پکا کمیونسٹ تھا مگر ترہ کئی سے ذرا کم درجے کا۔ یہ بھی روسی پروپیگنڈا تھا کہ امین نے روس سے مداخلت کی اپیل کی تھی۔ حقیقت اس کے بالکل

برعکس تھی۔ امین کیونٹ ہونے کے باوجود سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے خوفزدہ تھا۔ وہ روسی فوج کو مداخلت کی دعوت نہیں دے سکتا تھا؟ بالفرض اگر روسی فوج اس کی اپیل پر دوستانہ مدد کے لیے آئی تھی تو اس نے آتے ہی سب سے پہلے امین کو کیوں قتل کیا؟

اصل میں روس اس سے خوفزدہ تھا کہ امین اس کے جرائم کے خلاف سب سے بڑا چشم دید گواہ نہ بن جائے اور کل کلاں دنیا کو یہ نہ بتادے کہ روس نے اس کو دھوکے میں رکھتے ہوئے افغانستان میں اتنی بڑی مداخلت کر ڈالی ہے۔ چنانچہ روس نے اس عینی گواہ کو سب سے پہلے ختم کیا۔ پھر دنیا کو بتایا کہ ہمیں امین نے بلاتھا اور افغان عوام نے اسے بے پناہ مظالم ڈھانے اور امریکا کی دلالی کرنے کے باعث قتل کر دیا ہے۔

ہبرک کارل ایوان صدر میں: امین کے قتل کے چار دن بعد روس نے اپنا نیا مہرہ افغانستان میں اتار دیا۔ کارل سوویت یونین کی موثر رائلٹ ڈویژن نمبر 360 کے حفاظتی حصار میں ایک ٹینک پر سوار کابل کے ایوان صدر پہنچا۔ یہ یکم جنوری 1980ء کی بات ہے۔ راتوں رات سوویت یونین کے آزمودہ وفاداروں پر مشتمل ایک کامینہ تشکیل دے دی گئی جس میں جنرل عبدالقادر، میجر اسلم وطن یار، اسد اللہ سروری، فیض محمد، میجر شیر جان مزدور یار، محمد رفیع، سلطان علی کشتمند اور محمد گلاب زئی جیسے کیونٹ شامل تھے۔ روس نے کامینہ میں پرچی اور خلتی دونوں عناصر شامل کروائے تھے تاکہ توازن برقرار رہے۔

اسد اللہ سروری اور سلطان علی کشتمند دونوں نائب وزیر اعظم قرار دیے گئے۔ انا بیتا رطب زاد (خاتون) کو وزیر تعلیم، محمد رفیع کو وزیر دفاع، محمد گلاب زئی کو وزیر داخلہ، دوست محمد کو وزیر خارجہ، مزدور یار کو وزیر ٹرانسپورٹ اور فیض محمد کو وزیر قبائلی امور بنادیا گیا۔ کارل خود ملک کا وزیر اعظم، انتھابانی کونسل کا صدر اور مسلح افواج کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ گویا تمام کلیدی عہدے اسی کے پاس تھے۔ ایک نیا حکمران افغانستان کی پہلی خفیہ ایجنسی کے طور پر قائم کیا گیا۔ جسے ”خدمت دولتی“ یا ”خاڈ“ کہا جاتا تھا۔ پرچی کیونٹ ڈاکٹر نجیب اللہ کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔

کارل کے اقدامات: کابل پہنچنے کے دو دن بعد 3 جنوری 1980ء کو کارل نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اپنے نئے پروگرام کا اعلان کیا اور عوام کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ نئی حکومت مسائل پر بہت جلد قابو پالے گی۔ ہر کیونٹ حکمران کی طرح اس نے زرخیز مذہبی رہنماؤں کو استعمال کرتے ہوئے مذہبی طبقے کی توثیق دور کرنے کی کوشش بھی کی۔ پھر اس نے سابقہ حکومت کے مظالم کا سدباب کرنے کا اعلان کرتے ہوئے جیلوں سے آٹھ ہزار کے لگ بھگ قیدی رہا کر دیے۔ مگر یہ ایک دھوکا تھا۔ رہا ہونے والے اکثر قیدی وہی کیونٹ تھے جو کارل کے حامی تھے اور امین سے سیاسی

رقابت کی پاداش میں سزا بھگت رہے تھے۔ عام قیدیوں کو ”رحم دلی کے اس دریا“ سے ایک گھونٹ بھی ملا۔ کارل اپنا سیاسی قد بڑھانے کے لیے اہمن پر تنقید کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی الزام عائد کیا کہ اہمن افغانستان کے پنجتن صوبے پاکستان کے حوالے کرنا چاہتا تھا اور اس وطن فردوسی کی جگہ اب قوم کو ”محب وطن قیادت“ نصیب ہوئی ہے۔ مگر عوام پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک کیونسٹ کی کارکردگی روس کو خوش نہ کر سکی تو وہ دوسرے کیونسٹ کو آگے لایا گیا ہے۔ ان کے نزدیک کارل کی لچھے دار تقاریر بے معنی تھیں، اس کے چمکدار پروگرام اور منصوبے خرافات کا انبار تھے۔ وہ اسے روس کی کٹھ پتلی تصور کرتے تھے اور یہ سو فیصد درست تھا۔ کارل بذات خود ہر وقت روسیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اس کے ڈرائیور، محافظ، باورچی، معالج سب روسی تھے۔ وہ روس کے اشارے پر ناچتے کے ساتھ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

کارل کے منصوبے: کارل نے افغان عوام کو اپنا حامی بنانے کے لیے جو کھوکھلے اور لاحاصل منصوبے پیش کیے تھے ان کی ایک جھلک یہ ہے:

① ایک نیا نعرہ ملک بھر میں متعارف کرایا گیا: ”آگے بڑھیے اور قیام امن میں ساتھ دیجیے۔“

② کہا گیا کہ قید و بند اور پھانسی کی سزائیں ختم کر دی جائیں گی۔

③ تمام غیر انسانی غیر جمہوری قواعد و ضوابط منسوخ کر دیے جائیں گے۔

④ اسلام کے مقدس احکام، آئین، اصولوں، قانون و انصاف، مذہبی اعتقادات اور آزادی خیال و نظریے کا احترام کیا جائے گا۔

⑤ بے جا ٹیکس ختم کیے جائیں گے۔

⑥ محب وطن جماعتوں، عوامی دہشتی تنظیموں، آزادی صحافت اور آزاد احوالات کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

لیکن یہ سب کچھ دکھاوا تھا۔ افغانستان میں اصل آقا ب سوویت مشیر تھے جو اعلیٰ عہدوں، وزارتوں اور عسکری مناصب سے لے کر زراعت اور تعلیم تک ہر شعبے میں پوری طرح مداخلت کر رہے تھے۔

کیونز م کا بھڑپور پر چار: کارل کی نام نہاد اصلاحات کے پردے میں کیونز م کا پرچار پوری تیزی سے کیا جا رہا تھا۔ تجارتی تنظیموں تک کو سوویت نظام کے مطابق کام کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ہر ماہ پینکڑوں

افغان بچوں کو روسی نظریات کا خوگر بنانے کے لیے ماسکو بھیجا جانے لگا۔ ”ڈیموکریٹک“ کے نام سے

افغان نوجوانوں اور ”پولٹیز“ کے نام سے افغان نوجوان لڑکیوں کی تنظیم قائم کی گئیں جو نسل کو روس

نواز بنانے کے لیے سرگرم تھیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں نیا نصاب متعارف کرایا گیا جس میں کیونز م

جذب کر دیا گیا۔ تعلیمی اداروں میں انگریزی کی بجائے روسی زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت دے دی گئی۔ تمام اساتذہ کو تحبیہ کر دی گئی کہ وہ کیونسٹ پارٹی "پرچم" میں شامل ہو جائیں ورنہ انہیں برخاست کر دیا جائے گا۔ ملک کے سب سے بڑے تعلیمی مرکز کابل یونیورسٹی میں سوویت یونین کے کیونسٹ اور ملحد اساتذہ کو تعینات کر دیا گیا۔ تمام نیوز ایجنسیوں اور اخبارات بلکہ رسالوں اور ڈائجسٹوں تک کو پابند کر دیا گیا کہ وہ سوویت یونین سے مواد لیا کریں۔ کابل ریڈیو کو نشریاتی مواد حاصل کرنے کے لیے روس کا محتاج بنادیا گیا۔ اس کی اکثر نشریات اب سوویت یونین کے ٹرانسمیٹر سے حاصل کی جانے لگیں۔

کیونسٹوں کا تناسب: بڑے نسلی ولسانی گروہوں خصوصاً پنجتو لوں، تاجکوں، ازبکوں اور فارسی بانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی خاصی تعداد کیونسٹوں پر مشتمل تھی، مگر چونکہ افغانستان میں اکثریت ناخواندہ ہے اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب بہت کم ہے اس لیے مجموعی طور پر ملک بھر میں کیونسٹ 5 فیصد سے بھی کم تھے۔ ان کا زیادہ زور کابل میں نظر آتا تھا جو ملک کا سیاسی و تجارتی مرکز تھا۔ جبکہ باقی شہروں اور دیہاتوں میں ان کی تعداد برائے نام تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کیونسٹ کبھی انتخابات میں فتح یاب ہو کر حکومت نہیں بنا سکے بلکہ جبر و تشدد اور خونیں انقلابات کے ذریعے برسر اقتدار آئے۔ عوامی حمایت سے اس عہدوی کے سبب ان کی اسلام دشمن پالیسیاں عوام کو مزید متنفر کرتی رہیں۔ یہ ایک ایسے ہی تھا کہ چند فیصد کیونسٹ عملاً پورے ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ سیاست، تعلیم، فوج غرض ہر جگہ ان کی اجارہ داری تھی اور ایک کروڑ تیس لاکھ افراد ان کی ستم رانیوں کے لیے تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔

پرچم اور خلق کے اختلافات: کارل اور اس کے آقاؤں کے المادی اقدامات سے ملک میں عوامی نفرت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ اشتعال سے لبریز غیور افغان مسلمان صرف یہ چاہتے تھے کہ غاصب روسی افواج ملک سے نکل جائیں اور ملک کی سیاست کا فیصلہ علماء، قبائلی عمائد اور مقامی مخلص رہنماؤں کی مرضی سے ہو۔ روسی فوجوں کے کندھوں پر بیٹھ کر کارل کا ان کے ملک کی مسند اقتدار تک پہنچ جانا، ان کے لیے ایک حقیر آمیز مطالبہ ہے کہ نہیں تھا۔ ہر افغان مسلمان اس صورت حال پر رنجیدہ تھا۔ اور تو اور خود افغان کیونسٹوں میں بھی ایک بڑی تعداد روس کی مداخلت پر چہم بہ چہیں تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ کارل کے اقتدار سنبھالتے ہی سول انتظامیہ اور سرکاری اداروں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں لوگ ملازمین چھوڑ گئے۔ کئی ملکوں میں افغان سفیروں نے استعفیٰ دے دیا۔ افغانستان کی بعض کھلاڑی ٹیمیں غیر ملکی دوروں پر چہمیں انہوں نے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا۔

ناراض کیونسٹوں میں زیادہ تر "خلق" کے لوگ تھے۔ کیونکہ روسی مداخلت نے ان کا اقتدار ختم کر دیا

تھاکر ناراض پرمجیوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ فروری 1980ء تک تین ہزار سے زائد ملٹی اور پرمجی افراد سرکاری ملازمتوں سے استعفیہ دے چکے تھے۔ کارل کے دور حکومت کے آغاز میں غلج اور پرمجی دھڑوں میں باقاعدہ خانہ جنگی کی صورت حال پیدا ہوئی۔ خلیقوں نے ترہ کئی اور امن کے دور میں پرمجیوں کو روسی تھا۔ اب پرمجی جیل سے رہا ہوتے ہی محبوب خلیقوں کے گرد گھیراؤ لگنے لگے۔

روسی افواج اور کورسکیائی ہتھیار: کارل کی حکومت برائے نام ہی تھی۔ اس لیے روس کو اسے بچانے اور فعال رکھنے کے لیے زبردست تحفظ فراہم کرنا پڑا۔ سرخ افواج اب بگرام ایئر بیس، کابل کی چھاؤنیوں اور شاہراہ سالانگ پر بکثرت نظر آتی تھیں۔ عسکری لحاظ سے شاہراہ سالانگ نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ سوویت یونین سے کابل تک افواج کے آنے جانے کا واحد زمینی راستہ بھی تھا۔ بہت جلد روسی کٹر اور جلال آباد بھی پہنچ گئے۔ جلال آباد میں ایک مکمل رائل ڈویژن تعینات کر دیا گیا۔ سرخ افواج نے آئے ہی امن وامان قائم کرنے کے نام پر ظلم و ستم کے نئے ریکارڈ قائم کرنے شروع کر دیے تھے۔ صدیوں سے ماسکو افغان مسلمانوں کو اپنا سخت ترین حریف تصور کرتا آیا تھا۔ اب یہ آزاد منش خیور مسلمان اپنے نام نہاد دھکمرانوں کے سیاہ کرتوتوں کی پاداش میں ماسکو کی درانتی تلے آچکے تھے۔

ابھی سرخ افواج کو آئے تین ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ کئی مقامات پر افغانوں کی مسلح شدہ لاشیں برآمد ہوئیں۔ اعزازہ لگایا گیا کہ انہیں کیسیائی ہتھیاروں سے قتل کیا گیا ہے۔ نیز مجاہدین کے مقابلے میں ہلاک ہونے والے روسیوں کے سامان سے کیس ماسک ملتا بھی اس گھناؤنے جرم کا راز فاش کرتا تھا۔ مغربی میڈیا میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ روس نے کیسیائی ہتھیاروں سے لڑنے والے کئی یونٹ افغانستان بھیجے ہیں۔

قرارداد مذمت اور برزنیف کا موقف: روس کے سب سے بڑے مخالف امریکا کو افغانستان میں اس مداخلت پر نہایت تشویش تھی کیونکہ وہ خود اس خطے پر اپنے اثرات بڑھانے اور روسی اثر و رسوخ کو قائم کرنے کے لیے بے چین تھا۔ چنانچہ 14 جنوری 1980ء کو سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا۔ 104 ممالک نے سوویت یلغار کے خلاف ووٹ دیا جبکہ اس کے حق میں صرف 18 ووٹ آئے۔ عالمی رائے عامہ کے اس دباؤ کے جواب میں روسی صدر برزنیف نے کہا کہ ان کی فوج افغان حکومت کی طلب پر وہاں قیام امن کے لیے گئی ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین معاہدے کی شق 4 کے تحت یہ عمل بالکل جائز ہے۔ برزنیف نے یہ بھی کہا کہ اگر مداخلت نہ کی جاتی تو روس کے جنوب میں سنگین حالات پیدا ہو جاتے جسے ہم کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

روس کو کیا خطرہ لاحق تھا؟ یہ ”سنگین حالات“ کیا تھے؟ برزنیف نے اس کی وضاحت نہیں کی۔ مگر

حقیقت یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے کیونسٹ حکومتوں کی ناکامی اور ان کے خلاف مجاہدین کی کامیاب کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے روس کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں افغانستان میں اس کی منصوبہ بندی کے بالکل برعکس کیونسٹوں کی جگہ ایک اسلام پسند حکومت قائم نہ ہو جائے جو اشتراکیت کی خاطر اس کی 60 سالہ کوششوں پر پانی پھیر دے۔

اس دور کے حالات کے گہرے جائزے، افغانستان کی صورت حال کے مطالعے اور پھر برزنیف کے اس بیان پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ روس کے افغانستان پر یکدم اتنے بڑے لاؤ لشر کے ساتھ ٹوٹ پڑنے کی سب سے بڑی اور فوری وجہ یہی تھی۔ اگرچہ دیگر اسباب اور وجوہ جو مستقل حیثیت رکھتے تھے، اپنی جگہ اہم تھے۔ مثلاً: گرم پانی تک رسائی، امریکا کے بڑھتے ہوئے دائرہ کار کی روک تھام، کمیونزم کو دیگر ملکوں تک پھیلانے کی خواہش وغیرہ۔

دنیا روسی یلغار کی جو وجوہ بھی بیان کرے، اسے افغان حکومتوں اور ماسکو کی کشاکشی قرار دے یا امریکا اور روس کی جنگ..... خود افغان مسلمانوں پر یہ واضح تھا کہ یہ ہولناک یورش اصل میں اسلام کے خلاف ہے، یہاں اسلامی حکومت بننے کے امکانات کو روکنے کے لیے ہے۔ وہ جانتے تھے کہ روس نے وسط ایشیا میں اللہ اور رسول کا نام لینے پر پابندی لگا دی ہے۔ مساجد کو متقل اور مدارس کو ویران کر دیا ہے۔ اب وہ یہی قیامت افغانستان میں بھی ڈھانا چاہ رہے ہیں۔ چنانچہ افغانوں کی فطری دغدغہی غیرت کو جوش آیا اور وہ نہایت تیزی سے اپنے اپنے علاقائی مجاہد رہنماؤں کی قیادت میں جمع ہونے لگے۔ یہاں سے جہاد افغانستان کی وہ درخشاں تاریخ شروع ہوتی ہے جسے لکھتے ہوئے اسلامی مؤرخ کے قلم کا ہر لفظ احترام و عقیدت کے جذبات سے سرشار ہو جاتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کی دوراندیشی: جیسا کہ یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ روس کا منصوبہ افغانستان کی فتح کے بعد بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنا تھا۔ دوسرے لفظوں میں پاکستان کے ساحلی علاقے اس کا اہم اور قدیم ترین اہداف میں شامل تھے۔ اس لیے روسی یلغار سے پاکستان کو تشویش لاحق ہونا ایک لازمی امر تھا۔ پاکستان کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق اگرچہ جمہوری نظام میں رہنے ڈالنے اور 1973ء کے آئین میں چند ترامیم کرانے کے باعث ملک کی سیاسی پارٹیوں کے نزدیک قابل ملامت رہے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ انہوں نے سوویت یلغار کا مقابلہ جس پامردی سے کیا وہ تاریخ کا روشن باب ہے۔

ان کی مسکری دوراندیشی نے روس کے حملے کے مضمرات اور اس کے ”آئندہ اہداف“ کو بجا بجا لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فوراً یہ اعلان کیا کہ افغانستان پر حملہ دراصل پاکستان کی سلامتی پر ضرب ہے۔ افغان

مجاہدین پاکستان کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں لہذا ہر ملک اور عوام کو ان کی غیر مشروط طور پر مدد کرنا چاہیے۔ پاکستان نے سرحدیں کھول دیں: انہوں نے پاکستان کی سرحدیں افغان مجاہدین اور مہاجرین کے لیے مکمل طور پر کھول دیں۔ صوبہ سرحد میں مہاجرین کی خیمہ بستیاں میں روزانہ ہزاروں لٹے پٹے افغان آکر پناہ لیتے اور حکومت پاکستان ان کی ہر ممکن مدد کرتی۔ ان مہاجرین کو اجازت تھی کہ وہ ملک کے کسی بھی علاقے میں جا کر تلاش روزگار کر سکتے ہیں۔ مجاہد ہتھیاروں سے تحفظ کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوتے۔ ان کی اہم اور بڑی مشاورتی مجالس پشاور میں منعقد ہوا کرتی تھیں جہاں مجاہد تنظیموں کے دفاتر بکثرت تھے۔

جنرل ضیاء الحق نے وزارت خارجہ کو تاکید کر دی تھی کہ وہ دنیا کے ہر فورم اور سر سطح پر سب سے پہلے مسئلہ افغانستان کی آواز اٹھائے اور اس سلسلے میں کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لائے۔ حکومت پاکستان کی اس جدوجہد نے بہت جلد عرب ممالک کو اس خطرے کا احساس دلادیا جو سوویت درانتی کی شکل میں عالم اسلام کے تشخص کو پارہ پارہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ عرب شیوخ نے افغان مجاہدوں اور مجاہدوں سے مالی تعاون کے لیے دل کھول کر امداد فراہم کرنا شروع کر دی۔

امریکا حقائق سے لاعلم رہا: بلاشبہ امریکا نے اس جنگ میں بطور خاص دلچسپی لی اور روس مخالف مغربی ممالک بھی اس میں اپنا حصہ ڈالتے رہے۔ ان کی یہ ہمدردیاں محض اپنے مفادات کے تحفظ اور روس سے دیرینہ عداوت نکالنے کے لیے تھیں۔ امریکا نے افغان جنگ کے لیے اسلحہ بھی فراہم کیا کیونکہ روس کو اس خطے میں روکنا اس کی اہم ترین ترجیح تھی۔ مگر اس سے مجاہدین کے جہاد کی حیثیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ جنگ کفر و اسلام کے عالمی مصر کے کی حیثیت سے شروع ہوئی تھی اور اسی حیثیت سے اس کا اختتام ہوا۔

ہم جنگ کے آغاز میں دیکھتے ہیں کہ دنیا کو افغانوں کے احوال کا کچھ پتا نہ تھا۔ داؤد خان اور ترہ کنی کے دور میں یہ مجاہد پرانی رانٹوں حتیٰ کہ توڑے دار بند قوتوں، ٹکواروں اور خنجروں سے لڑ رہے تھے۔ تقریباً چار برس تک کسی بیرونی اعانت کے بغیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے افغان جہادی رہنماؤں سے رابطے ضرور تھے مگر امریکا کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا کی بدنام زمانہ سی آئی اے تک کو سوویت عزائم کا اندازہ نہ ہو سکا۔

مونگ پھلی کے دانے: جب 27 دسمبر 1979ء کو سوویت یونین کی افواج افغانستان میں گھس گئیں تب امریکا کو اپنی غفلت پر عداوت ہوئی مگر صدر امریکا جی کارٹر سمیت ان کی کابینہ کے کسی فرد کو تو یہ نہ تھی کہ افغانستان کی مزاحمت چند ہفتوں سے زیادہ برقرار رہ سکے گی۔ دو سال تک افغان مجاہدین صرف اپنے مل بوتے پر اس سخت ترین جہاد میں مصروف رہے۔ یہ ابتدائی دو سال اس لحاظ سے نہایت

ہولناک تھے کہ روس نہایت آزادی سے عوام کا قتل عام کرتا چلا جا رہا تھا اور کسی مبالغے کے بغیر خون کے دریا بہا رہا تھا۔ روسی طیارے روزانہ جگہ جگہ بمباری کر رہے تھے مگر دنیا خاموش تماشاخی بنی دیکھ رہی تھی۔ مجاہدین کے پاس جدید اسلحہ تھا نہ ذرائع مواصلات، علاج معالجے کا انتظام تھا نہ کوئی پناہ گاہ۔ جنرل ضیاء الحق برابر کوشش کر رہے تھے کہ امریکا اور مغربی ممالک روس پر دباؤ ڈالیں اور مجاہدین کو جدید اسلحہ فراہم کیا جائے جو روسی اسلحے کی نگر کا ہو۔ مگر سب کو یقین تھا کہ آج نہیں تو کل مجاہدین سرنگوں ہو جائیں گے، لہذا کسی مغربی ملک نے اس خسارے کے کاروبار میں سرمایہ کاری کی ضرورت نہ سمجھی۔

بہت کہنے سننے کے بعد امریکی صدر جی کارٹر نے جنرل ضیاء الحق کو افغانستان کے لیے معمولی سی امداد پیش کی جسے جنرل ضیاء الحق نے ”موگ پھلی کے دانے“ کہہ کر مسترد کر دیا۔ ”موگ پھلی کے دانے“ کہنے میں یہ دلچسپ نکتہ مضر تھا کہ صدر جی کارٹر ذاتی کاروبار کے اعتبار سے موگ پھلی کی کاشت کاری کے لیے مشہور تھے۔

جنرل ضیاء الحق کی پالیسی: روس افغان جہاد سے متعلق صدر ضیاء الحق کی پالیسی نہایت برعکس اور کامیاب تھی۔ اگر وہ اس جنگ میں براہ راست شامل ہو جاتے تو غالباً بازی ہار جاتے کیونکہ بھارت اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پاکستان پر پشت سے حملہ کر دیتا۔ مگر افغانستان کو اس کے حال پر چھوڑ دینا بھی تلافی تھی جس کا خفیازہ پاکستان ہی کو بھگتنا پڑتا۔ لہذا جنرل ضیاء الحق نے ایک محتاط اور موثر راستہ اپنایا۔ انہوں نے نہ صرف پورے عالم اسلام بلکہ مغربی دنیا کو بھی افغانستان کی شدت اور روس کی زیادتیوں کا احساس دلایا اور یوں روس کو سفارتی طور پر تنہا کر دیا۔ افغان مجاہدین اور روس کے لیے عالمی امداد کی فراہمی میں ان کا کردار سب سے نمایاں رہا۔ پھر ایک طرف انہوں نے مجاہدین کے لیے پاکستان کو دوسرا گھر بنا دیا اور دوسری طرف اس جہاد میں شرکت کے لیے دنیا بھر سے آنے والے مجاہدین کے لیے بھی پاکستان کے دروازے کھول دیے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود انہوں نے روس سے تعلقات اتنے کشیدہ نہیں ہونے دیے کہ نوبت جنگ تک پہنچ جاتی۔ روس کی شکایات اور احتجاج کا نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ جواب دیا گیا۔ جس میں معذرت تھی نہ اشتعال انگیزی بلکہ ایک باوقار اور دو ٹوک اعجاز تھا۔ جنرل صاحب کی پوری ٹیم اسی اعجاز سے کام کر رہی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ روسی سفیر صوبہ سرحد آیا اور وہاں کے گورنر جنرل فضل حق سے مجاہدین افغانستان کو پناہ دینے پر ناراضی کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ ان مجاہدین کو روکا جائے۔ جنرل فضل حق نے برملا جواب دیا: ”یہ کام ہمارے بس سے باہر ہے۔ بارڈر اتنا

طویل ہے کہ ہم اپنی ساری فکری لگا کر بھی مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر ہمیں اپنے عوام کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کی غیرت اپنے بھائیوں کا راستہ بند کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔“

روسی سفیر نے دوبارہ اپنے موقف پر اصرار کیا تو جنرل فضل حق نے کہا: ”آپ سپر پاور ہیں، آپ افغانستان کی جانب سے بارڈر بند کر دیں تاکہ مہاجرین ہمارے پاس آئی نہ سکیں۔ روسی سفیر نے اسے ناممکن قرار دیا تو جنرل فضل حق نے کہا: ”جب آپ سپر پاور ہو کر ایسا نہیں کر سکتے تو ہم اس قابل کہاں کر مہاجرین کو روک سکیں۔“ اس پر روسی سفیر اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

جہاد افغانستان عظیم ترین جہاد تھا: یہ کہنا حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہوگا کہ افغان جنگ امریکا اور روس یا اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کی جنگ تھی۔ تاریخی حقائق بتاتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ جنگ مسلمانوں کی نسل کشی، اسلامی عقائد و نظریات کی پامالی اور اسلامی تہذیب و تمدن کی تباہی کے اس سلسلے کی کڑی تھی جو سترہویں صدی عیسوی سے جاری تھا۔ روس وسط ایشیا کے مسلمانوں کو زندہ درگور کرنے کے بعد افغانستان کو بھی اسی انجام سے دوچار کرنا چاہتا تھا۔ اب اگر یہاں مجاہدین اس کی راہ میں مزاحمت کی مضبوط دیواریں کھڑی نہ کر دیتے تو روس پاکستان کے بعد بحیرہ عرب کے راستے غلجی ریاستوں سے لے کر مشرق وسطیٰ تک کے اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چلا جاتا۔ پاکستان سے مصر تک کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں پہلے سے کمیونسٹ پارٹیاں موجود نہ ہوں اور وہاں وسط ایشیا اور افغانستان کی طرح کمیونزم کی کاشت زور و شور سے نہ ہو رہی ہو اور روسی افواج کے لیے زمین ہموار نہ کی جا رہی ہو۔

اس پس منظر میں دیکھا جائے تو افغان جنگ کو تاریخ اسلام کا عظیم ترین جہاد کہنا چاہیے۔ یہ وہ جہاد تھا جس میں بے سرو سامان پس ماندہ اور ناقہ کش مسلمان دنیا کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکرائے گئے۔ جس میں مشرق و مغرب کے اہل ایمان یکجا ہو کر کفر کے راستے میں ڈٹ گئے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے وہ نظارے دکھائی دیے کہ بدردوا حزاب کی یادیں تازہ ہونے لگیں۔

جہاد کے چار مراحل: کمیونزم کے خلاف افغان مسلمانوں کے جہاد کو ہم چار مراحل یا چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا دور..... ظاہر شاہ کے آخری ایام اور داؤد خان کے ایام اقتدار پر مشتمل ہے۔ جس میں علمائے کرام نے جہاد کا تقاضا محسوس کر کے تیاری شروع کر دی تھی۔

دوسرا دور..... اپریل 1978ء کے انقلاب ثور سے لے کر حفیظ اللہ امین کے قتل تک دی جانے والی قربانیوں اور جدوجہد پر مشتمل ہے۔

تیسرا دور..... 27 دسمبر 1979ء کو امین کے قتل اور روسیوں کی سرخ یلغار سے شروع ہوتا ہے اور 15 فروری 1989ء کو روسیوں کے رسواکن اخلا پر ختم ہوتا ہے۔

چوتھا دور..... روسیوں کی واپسی کے بعد نجیب انتظامیہ کے ساتھ معرکوں پر مشتمل ہے جو 1992ء میں مجاہد تنظیموں کے کامل پر قبضے کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔

پہلا دور: ہم دیکھتے ہیں کہ انقلاب ثور سے پہلے بھی افغانستان میں اسلامیت اور کمیونزم کے درمیان کشاکش جاری تھی۔ داؤد خان کا جبر و تشدد اس اسلامیت کے خلاف تھا۔ اس دور میں بھی کمیونسٹ پارٹی کے ناپاک عزائم کے خلاف کچھ مذہبی جماعتیں سرگرم ہو چکی تھیں۔ کئی علمائے کرام اس سلسلے میں قید و بند کی مشقتیں برداشت کر رہے تھے اور کچھ پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا کر جہاد کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ دوسرا دور: انقلاب ثور کے بعد جب کمیونزم باقاعدہ حکومت کی شکل میں عوام پر مسلط ہو گیا تو اس کے ردِ عمل میں 2 جون 1978ء کو مذہبی اور حریت پسند جماعتوں نے جہاد کا باقاعدہ نعرہ بلند کیا۔ ترہ کئی اور امین نے اس آواز کو دبانے کے لیے جبر و تشدد کا ہر حربہ آزما کر دیکھ لیا مگر وہ ناکام رہے۔

اس ظلم و ستم کی انتہا یہ تھی کہ لوگوں کو اجتماعی طور پر بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر دیا جاتا تھا۔ ایک بار دینی علاقوں سے سینکڑوں افراد کو مجاہدین سے تعلق کے الزام میں گرفتار کر کے کامل کی طرف روانہ کیا گیا۔ مگر انہیں کسی عدالت میں پیش کیا گیا نہ کوئی جیل خانہ انہیں جگہ دے سکا۔ کامل پہنچانے سے پہلے ہی ان سے ڈیڑھ سو افراد کو چلنے ٹرکوں سے نیچے گرا دیا گیا۔ پھر بیٹروں چھڑک کر زندہ جلادیا گیا۔ باقی لوگوں کے لیے بلڈور کے ذریعے ایک کھائی کھودی گئی پھر انہیں کھائی میں پھینک دیا گیا اور بلڈور چلا کر زندہ دفن کر دیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعد میں اس لرزہ خیز واقعے کا الزام مجاہدین پر عائد کر دیا گیا۔

روس کے پٹو، عالم و جابر افغان حکام ہر کارروائی میں روسی درندوں کے ساتھ تھے، ان بدبختوں نے جیلوں کو بے گناہ لوگوں سے بھر دیا۔ ترہ کئی اور امین کے دور میں تیس ہزار افراد کو قید کیا گیا۔ قیدیوں کو کوڑے لگانا، ناخن اُتارنا، نیند سے باز رکھنا اور جسم کو جلانا، کمیونسٹ حکام کے نزدیک ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔ ان قیدیوں کو ایک تسلسل سے قتل بھی کیا جاتا رہا۔ ان گنت علماء، دانشور، اساتذہ، پروفیسر، ڈاکٹر، صنعت کار، تاجر، مزدور اور کسان اس ذوقِ خون آشامی کی بھیجٹ چھا گئے۔ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ کمیونزم کے حامی نہیں تھے یا ان کا حکومت مخالف افراد سے قریبی یا دور کا کوئی تعلق تھا۔ سرکاری اداروں اور تعلیم گاہوں سے اسلامی آثار کو کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کی گئی۔ کامل یونیورسٹی کی مشہور مسجد کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہاسٹل اور ڈانس کلب تعمیر کر دیا گیا۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں جہاد افغانستان اپنے پہلے مرحلے میں گزر رہا تھا۔ افغان مسلمان ہر قسم کے مصائب برداشت کرتے رہے مگر انہوں نے اپنے ایمان اور عزت و آبرو کا سودا نہ کیا۔

تیسرا دور: پھر دسمبر 1979ء میں روسی یلغار کے بعد جہاد کا تیسرا سب سے جاں گسل اور طویل ترین مرحلہ شروع ہوا۔ اب افغان مسلمانوں کا مقابلہ صرف ملت فروش کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ افغان سپاہیوں سے نہیں تھا بلکہ ان کے سامنے روس کی مٹی کی فوج تھی جسے دنیا کی سب سے بڑی فوج کہا جاتا تھا۔ اس لشکر کے پاس جدید ترین وسائل اور بہترین اسلحہ تھا۔ کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ روسی افواج کی علاقے پر حملہ کریں اور ناکام واپس آجائیں۔ تقریباً تین صدیوں کی تاریخی یہ بتاتی تھی کہ مشرق، مغرب اور جنوب میں روس نے جس ملک کے خلاف جارحیت کی، اسے سرنگوں ہونا پڑا۔

سوویت افواج کے مظالم: روسی افواج کا طریقہ کار یہ تھا کہ کسی بھی علاقے پر حملہ کرنے کے بعد وہ سب سے پہلے ظلم و دہشت کی ایسی لڑزہ خیز مثالیں پیش کرتے کہ لوگوں کے ہوش اُڑ جاتے اور دنیا بھر کا غم اُٹھنے لگتی۔ دہندہ مفت روسیوں کا اتنا رعب طاری ہو جاتا کہ کسی کو ان کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوتی۔

روسی افواج نے افغانستان میں داخل ہو کر جو جگر سوز مظالم ڈھائے ان کا ریکارڈ کئی جلدوں کا تقاضا کرتا ہے۔ بگرام ایئر پورٹ پر اترنے کے چند دنوں بعد تک ہی روسی فوج شہروں سے، دیہاتوں تک ہر جگہ پھیل گئی۔ ان کے ساتھ افغان فوجی محض خادم ہوتے تھے۔ قوت روسیوں کے پاس تھی۔ ان کے نزدیک خونِ مسلم اتنا سستا تھا کہ محض مذاق میں، اپنا دل بہلانے کے لیے خون کی ندیاں بہا دیتے۔

کنز کے علاقے چنڈرے میں روسیوں نے عوام کو ایک جگہ میں مدعو کیا اور کہا گیا کہ ایک ”اہم اعلان“ کیا جائے گا۔ جب گاؤں کی آبادی وہاں جمع ہو گئی تو ان پر کئی اطراف سے مشین گنوں کے دھانے کھول دیے گئے۔ گولیوں کی بارش اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ سب کے ختم ہو جانے کا یقین نہ ہو گیا۔ اس طرح ”ڈاگز“ نامی دیہات کے باشندوں کو اجتماعی طور پر اس طرح قتل کیا گیا کہ ان کے جسم کے اعضا کے ٹکڑوں، لوتھروں اور یونیوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔

فروری 1980ء میں صوبہ لغمان کے گاؤں علی شنگ میں جلسے کا اعلان کر کے دیہاتیوں کو جمع کیا گیا۔ یہ 650 افراد تھے۔ انہیں روسیوں سے جبر کر تین بڑے گروہوں میں زندہ دفن کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد مجاہدین نے وہاں آکر کھدائی کی تو یہ دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے کہ شہداء میں ایک عورت بھی تھی جس کی گردن میں قرآن مجید جمائل تھا اور اس کا دودھ پیتا بچہ اس کے سینے سے چٹا ہوا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ردی بھیڑیے عورتوں اور بچوں کو بھی کسی رعایت کا حق دار نہیں سمجھتے تھے۔ بلاشبہ وہ نسلِ افغان کو ختم کر دینے پر

نکلے ہوئے تھے کیونکہ اسی قوم سے غزنوی اور غوری جیسے مجاہد پیدا ہو کر دنیائے کفر کے سینے پر سوگم دلنے رہے تھے۔ اب درندہ صفت روسی افغان مسلمانوں کے خون سے اپنی صدیوں کی پیاس بجھا رہے تھے۔

جبر و قہر کے ہولناک مناظر: سوویت سپاہی اپنی دہشت کا سکہ بٹھانے اور عوام کو خوف و ہراس کی تصویر بنا کر ان کی قوت مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے بالکل وہی انداز اپنا رہے تھے جو صدیوں پہلے اس خطے میں چنگیز خان نے اپنایا تھا۔ اُس وقت بھی کھوپڑیوں کے مینار قائم کیے جاتے تھے اور متبوضہ علاقوں میں لاشوں کے ٹیلے بھی دور سے نظر آتے تھے۔

روس نے بھی اسی قسم کی دہشت گردی کو اپنایا اور انسانی حقوق کی پامالی کا بدترین ثبوت فراہم کیا۔ روسی یلغار کے پہلے سال کے اختتام پر جب مقتول افغانوں کا تخمینہ لگایا گیا تو وہ 5 لاکھ سے متجاوز تھے۔ اس نسل کشی کے علاوہ انسانی تمدن و معاشرت سے تعلق رکھنے والی ہر شے کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی، آبادیوں کو بلند کر دیا گیا، کنویں خراب کر دیے گئے، مساجد کو شہید کر دیا گیا، ہسپتالوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی، دینی مدارس ویران کر دیے گئے، دیہاتوں میں اسکولوں اور ان میں پڑھنے والے بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔

مظاہرین پر فائرنگ: سوویت درندوں کا جبر و تشدد دیہاتوں تک محدود نہیں تھا۔ کامل جیسے شہر کے متمدن اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس کی زد میں تھے۔ جس طرح وہ دیہاتوں میں مجمع عام پر کسی روک ٹوک اور جھجک کے بغیر فائر کھول دیتے اسی طرح کامل، قندھار، ہرات اور غزنی کے شہری بھی ان کا نشانہ بن گئے۔ انہیں بین الاقوامی ملامت کا کوئی خوف تھا نہ کہیں جواب دی کا کوئی ڈر۔ روسیوں کی آمد کے ایک ماہ بعد فروری 1980ء میں کامل کے شہریوں نے سوویت مظالم کے خلاف احتجاجاً ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ روسی فوج حرکت میں آگئی اور اس نے کامل پولیس کے ساتھ مل کر عوام پر فائر کھول دیا جس سے سینکڑوں افراد جاں بحق اور زخمی ہو گئے۔

ہمارے برقعے تم یمن لو: یہ تو دارالحکومت کے عام شہریوں پر ”کیونزم“ کی مساوات اور ”انسانی حقوق“ کی کرم فرمائیاں تھیں۔ ان عالموں نے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ و طالبات کو بھی نہ بخشا جو خاصے معتدل اور آزاد خیال شمار ہوتے تھے اور ان کا مجاہدین سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اپریل 1980ء میں کامل کے ہائی اسکولوں، کالجوں اور کامل یونیورسٹی کے ہزاروں طلبہ و طالبات نے کلاسوں کا بائیکاٹ کر کے احتجاجی مظاہرہ کیا۔ طالبات نعرے لگا رہی تھیں: ”روس کے غلامو! ہمارے برقعے تم یمن لو، اب ہم بدوحش اٹھائیں گی۔“

لڑکیوں نے روسی صدر برزنیف کے خلاف فلک و کاف نعرے لگائے۔ کامل ”برزنیف کی موت..... خدایوں کی موت“ کے نعروں سے گونج اٹھا۔ سینکڑوں طالبات وزیر تعلیم ”انابتار طلب زاد“ کے کمر کے سامنے جمع ہو گئیں جو ایک بدکردار اور حیابا خستہ عورت تھی۔ یہاں طالبات نے نعرے لگائے: ”قاصد عورتیں افغانستان کے تعلیمی ادارے چلانے کی حق دار نہیں ہیں۔“

”خون سے لکھی آزادی“: طلبہ و طالبات کے اس مجمع کو جو مکمل طور پر پُر امن مظاہرہ کر رہا تھا، سبوتاژ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر ایسا کرنا کریر تھا تب بھی آنسو گیس، لاشی چارج یا کوئی اور متبادل طریقہ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مگر روسی درندے جو افغان طلبہ و طالبات کو سیکولر تصور کیے ہوئے تھے، ان کی جانب سے ملی دومی غیرت کے اس مظاہرے پر غضب ناک ہو گئے۔ انہوں نے کیونسٹ پولیس اہلکاروں کو ساتھ لے کر اس مجمع پر اندھا دند فائرنگ کی جس سے درجنوں طلبہ و طالبات شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ ایک لڑکی نے اپنی زخمی سہیلی کے بہتے خون میں انگلی ڈبو ڈبو کر اپنے برقعے پر ”آزادی“ کا لفظ تحریر کر دیا۔

اسلام کا پرچم! کامل کے ”سوریہ ہائی اسکول“ اور ”رابعہ ہائی اسکول“ کی بچیوں نے ایک مظاہرے میں بے مثال جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ایک سبز کپڑا بانس پر باندھ کر اسلامی پرچم بنالیا اور کامل کی سڑکوں پر نکل آئیں۔ وہ ”اسلام زندہ باد، روسی ایجنٹ مردہ باد، برزنیف مردہ باد، کامل مردہ باد“ کے نعرے لگا رہی تھیں۔

روسی نو جیوں نے ان پر فائرنگ شروع کر دی مگر ان کے قدم نہ اکھڑے۔ ایک روسی سپاہی نے پرچم اٹھانے والی لڑکی کو نشانہ بنایا۔ اس کا دایاں ہاتھ چھلنی ہو گیا۔ اس نے پرچم بائیں ہاتھ میں تمام لیا۔ روسی نے اسے بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ مگر بچی نے پرچم کو گرنے سے پہلے ساتھ کھڑی دوسری بچی کے حوالے کر دیا اور چلا کر کہا: ”یہ اسلام کا پرچم اب تمہارے حوالے ہے، اسے گرنے مت دیتا۔“

ایک اور مظاہرے میں بچیوں کو کسی افغان عہدے دار کی جیب نظر آ گئی۔ سب نے اسے گھیر لیا اور اسے تاج توتوڑ جوتے رسید کیے جس سے گاڑی کے شیشے ٹوٹ گئے۔ اس کے بعد سرکاری اہلکاروں نے اندھا دند فائرنگ کی جس سے کئی بچیاں شہید اور کئی زخمی ہو گئیں۔

میں مسلمان ہوں: ایک دن کامل یونیورسٹی کی فیکلٹی آف فارمی کے سامنے طالبات نے مظاہرہ کیا۔ سرکاری کارندوں اور دوسروں کی فائرنگ سے ایک طالبہ کی ٹانگ زخمی ہو گئی اور وہ گر پڑی۔ کچھ دیر بعد وہاں سے ایک سرکاری گاڑی کا گزر ہوا۔ گاڑی میں سوار کیونسٹوں نے اسے ساتھ بٹھا کر ہسپتال لے چلنے کی پیش کش کی مگر اس غیرت مند لڑکی کا جواب تھا: ”میں مسلمان ہوں۔ چاہے یہاں ایڑیاں رگڑو رگڑو“

کر مر جاؤں مگر کسی کا فری کاڑی میں نہیں بیٹھوں گی نہ ان سے علاج کراؤں گی۔“

کابل میں کوئی محفوظ نہ تھا: ظلم و تشدد کی اس آمدھی سے کابل کے تمام اسلام پسند شہری شدید متاثر ہوئے۔ سرکاری ادارے تو ایسے لوگوں سے پہلے ہی خالی کر دیے گئے تھے۔ کابل یونیورسٹی بھی محفوظ نہیں رہی۔ اسلام کے شیعہ انیوں کو چون چین کر نکالا اور غائب کر دیا گیا۔ یونیورسٹی کی شریعت فیکلٹی میں 67 طلبہ تھے۔ ان میں سے صرف چھ زندہ بچ گئے باقی سب لا پتہ ہو گئے۔ غالب گمان یہی تھا کہ دیگر ہزاروں افراد کی طرح انہیں بھی کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر قتل کر دیا گیا ہے۔ روسیوں کی آمد کے بعد بدنام زمانہ پل چرخی جیل میں ایک لاکھ سے زائد افراد کو مختلف اوقات میں لایا گیا اور ترپا ترپا کر نہایت بے رحمانہ اعزاز سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان میں بارہ تیرہ سال کے بچوں سے لے کر 70، 80 سال کے بزرگ بھی شامل تھے۔ ان کی اکثریت علمائے کرام، ائمہ مساجد، قراء، حفاظ، مؤذنین، طلبہ مدارس دینیہ اور دین دار لوگوں پر مشتمل تھی۔

کابل کے مشہور دینی ادارے ”جامعہ ابوحنیفہ“ کے پانچ سو طلبہ کو گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں سے صرف چھ سات طلبہ زندہ بچ کر نکل سکے، باقی سب شہید کر دیے گئے۔ غرضیکہ اس دور میں کابل کا کوئی مسلمان محفوظ نہ تھا۔

افغان جنگ کا سوویت اسلحہ: سوویت یونین اس جنگ میں دنیا کا جدید ترین اسلحہ استعمال کر رہا تھا۔ اصل میں اس کی پالیسی یہ تھی کہ افواج کا جانی نقصان کم سے کم ہو اور دوبارہ مقابلے کی فوجی الامکان نہ آئے۔ چنانچہ روسی فوج ہر قسم کا بھاری اسلحہ آزادانہ طور پر استعمال کر رہی تھی۔ عام طور پر روسی فوج کے کالوائے جس قسم کے اسلحے سے لیس ہو کر چلتے تھے، اس کی ایک جھلک درج ذیل ہے:

✱ ٹینک: 62-152

✱ 40 کلومیٹر تک مار کرنے والی 155 ملی میٹر کی توپیں

✱ 800 میل رینج سے 13 تا 41 راکٹ بیک وقت فائر کیے جاسکتے تھے۔

✱ بھاری مشین گنیں

✱ راکٹ لانچر

✱ درجنوں اقسام کی بارودی سرنگیں

✱ مارٹر توپیں

✱ ریکائل لیس توپیں

♣ گم ہٹیا رے 19:27

♣ دیو پکیر مال بردار ہٹیا رے "انتونوف" 12\12

♣ بمبار ہٹیا رے 18.5U 25

♣ گن شپ ہٹلی کا پٹر 18-M1-24

یہ وہ ہتھیار اور وسائل تھے جو دنیا کی کسی جدید ترین فوج کو کسی بھی قسم کی جنگ میں درکار ہو سکتے تھے۔ گن شپ ہٹلی کا پٹر: ان تمام ہتھیاروں میں گن شپ ہٹلی کا پٹر سب سے زیادہ تباہ کار تھے۔ دو ہر جگہ ہر زاویے سے حملہ کر سکتے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان کی جگہ کھس سکتے تھے۔ کھائیوں میں اتر سکتے تھے۔ آبادیوں پر معلق رہ کر بمباری کر سکتے تھے۔ ان سے جھاکتی مشین گنیں بارش کے قطرہوں کی طرح بے حساب گولیاں برساتی تھیں اور ان کی بمباری سے آن کی آن میں آبادیاں تودہ خاک بن جاتی تھیں۔ افغانستان میں ہر طرف گن شپ ہٹلی کا پٹروں کی دہشت ناک کہانیاں گردش کرتی رہتی تھیں۔

نیپام بم، کھلوتا بم: گن شپ ہٹلی کا پٹر شہری اور دیہی آبادیوں پر نت نئے انداز سے حملہ آور ہوتے تھے۔ بسا اوقات وہ نیپام بم جیسا مہلک ہتھیار بھی استعمال کرتے تھے، جو آٹافٹ آبادیوں کو جھلسا کر رکھ دیتا تھا۔ کئی وہ بستیوں پر چھوٹے چھوٹے ڈبے پھینکتے، ہر ڈبے میں ایسا خطرناک کیسیائی مادہ ہوتا تھا جو دوسو لیٹر آتش گیر مواد سے زیادہ تباہی پھیلایا سکتا تھا۔ صرف ایک ڈبے سے نکلنے والے مواد کے زمین پر پھیل جانے سے دوسو فٹ کے اندر اندر آکسیجن ختم ہو جاتی اور لوگ گھاکھوٹ کر ہلاک کیے جانے والوں کی طرح تڑپ تڑپ کر مرجاتے۔ جب ایسے سینکڑوں ڈبے پھینکے جاتے تو گاؤں کے گاؤں اور قصبوں کے قصبے قبرستان بن جاتے۔

گن شپ ہٹلی کا پٹروں سے کھلوتا بم (بونی ٹریپس) بھی پھینکے جاتے۔ ٹانیوں، چاکلیٹیوں، کھلوتا گاڑیوں اور خوبصورت جانوروں کی شکل میں تیار کیے گئے یہ بم بے حد تباہ کن تھے۔ یہ معصوم افغان بچوں کے قتل عام کا ایک شیطانی حربہ تھا۔ ہزاروں بھولے بھالے بچے ان بموں کو کھلوتا سمجھ کر اٹھاتے اور پھر ایک دھماکے سے ان کے چہرے جھلس جاتے، یا جسم کے پرچے اڑ جاتے۔ لاکھوں بچے ان بموں کی وجہ سے عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے۔ اس کے علاوہ مدرسوں میں پڑھنے، پارکوں میں کھیلنے اور وادیوں میں کھریاں چرانے والے بچوں پر پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے خصوصی بم پھینکے جاتے جن سے ان گنت بچے شہید اور اپاہج ہوئے۔

زہر ملی گیس: روسی فوج بے دریغ کیسیائی ہتھیار استعمال کر رہی تھی۔ زہر ملی گیس خوبصورت اور کسائم ان کا خاص ہتھیار تھی۔ روسی فوج میں کیسیائی ہتھیار استعمال کرنے والے چند یونٹ بطور خاص شامل کیے گئے تھے

جو گیس مارک پہن کر حملہ آور ہوتے تھے۔ اس گیس سے متاثر ہونے والے یا تو مر جاتے یا قاتل زدہ ہو جاتے..... معمولی متاثر ہونے والوں کے جسم پر سرخ داغ پڑ جاتے، جلد اور ناک سے خون جاری ہو جاتا۔

افغان حکومت کی نگاہ میں افغان خواتین کا مقام: روسی درندہ کی ستم رانیوں کا سب سے روح فرسا پہلو یہ ہے کہ وہ پردہ نشین افغان خواتین کی کھلے عام عصمت دری کرتے اور انہیں بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ اُن گنت افغان خواتین ان بدبختوں کی ہوس کی بھیشت چڑھ گئیں۔ ایسے واقعات اتنی کثرت سے پیش آئے کہ ان کا صحیح اندازہ لگانا محال ہے۔ روسیوں کی اس بد لگائی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ خود کھ پتلی افغان حکومت کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ایک موقع پر بعض روسی عہدے داروں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے افغان وزارت داخلہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو وہاں سے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے افغان عورتوں کی عصمت دری کی نہ صرف اجازت دی گئی بلکہ یہ شرم ناک جواب دیا گیا..... ”تمام افغان عورتیں روسیوں کی تسکین کے لیے ہیں۔“ اس کے بعد روسیوں کو اپنی شیطانی خواہشات پوری کرنے میں برائے نام جھجک بھی نہ رہی۔

ناموس کی خاطر! جب افغان عوام نے کھ پتلی حکومت کا یہ رویہ دیکھا تو انہوں نے از خود عورتوں کو روسیوں کے شر سے بچانے کے لیے عجیب و غریب اقدامات شروع کر دیے جو مجبوری و مقبوری کے ساتھ ساتھ غیرت و حیثیت کی اعلیٰ مثال بھی تھے۔ روسیوں کا جس آبادی سے گزر رہا تھا وہاں کے باشندے فوراً اپنی خواتین کو گھروں کے نہ خانوں، کوٹھڑیوں اور گوداموں میں چھپا دیتے۔ کوئی اور گوشہ نہ ملتا تو خواتین غسل خانوں میں مقفل ہو جاتیں۔

بعض اوقات عورتیں خود اپنی عصمت کو بچانے کے لیے انتہائی اقدامات پر مجبور ہو جاتیں۔ کنڑ کے ایک دیہات میں ایک روسی کسی گھر میں گھس گیا۔ اس نے خاتون خانہ کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہا، غیرت مند عورت نے کلباڑی کا دار کر کے روسی کو قتل کر دیا۔ ایک اور بستی میں ایک روسی سپاہی جبراً کسی عمر رسیدہ عورت کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس عورت کی نو جوان لڑکی کو بہکا کر اپنے دام میں لارہا تھا۔ بوڑھی عورت کو پتا چلا تو اس نے پورے گھر پر مٹی کا تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی۔ اس کی بیٹی اور روسی مجلس کر مر گئے۔ وہ خود بھی زندہ نہ بچ سکی مگر جیتے جی اپنی اولاد کو روسیوں کی ہوس کا نشانہ نہ بننے دیا۔

عصمت بنات اسلام: تاریخ افغانستان کے ایک گاؤں میں چھ روسی بٹلی کا پترا ترے، انہوں نے گاؤں والوں کو جمع کر کے مطالبہ کیا کہ مجاہدین کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔ حالانکہ اس گاؤں میں کوئی مجاہد تو کجا کوئی جوان مرد بھی نہیں تھا۔ وہاں صرف عورتیں، بچے اور بوڑھے تھے۔ روسیوں نے ٹپش میں آکر گاؤں کی

تمام عورتوں کو بے پردہ کر دیا اور پھر ان میں سے چھ خوبصورت لڑکیوں کو چھانٹ کر ساتھ لے گئے۔ خاصگی دیر بعد وہی پہلی کا پڑنفا میں دوبارہ نمودار ہوئے۔ ان سے یکے بعد دیگرے ان چھ لڑکیوں کی برہنہ لاشیں زمین پر پھینک دی گئیں۔ اس قسم کے لرزہ خیز واقعات افغانستان کے مختلف حصوں میں پیش آتے رہے۔ بعض اوقات وہ پہلی کا پٹروں سے لڑکیوں کی لاشوں کی بجائے ان کی شلواریں پھینک جایا کرتے تھے۔ ان لاپرواہیوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی جن کے والدین عمر بھران کی یاد میں روتے روتے مزار گئے۔

یہ لٹی لٹی مساجد، یہ اُداس سجدہ گاہیں: مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے اور اسلام سے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے روسی اور کیونسٹ سپاہی اسلامی شعائر کی توہین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ دو قرآن مجید کے نسخوں کو کوڑے میں پھینک دیتے، اس کے مقدس اوراق کو بوٹوں سے پامال کرتے، مساجد اور دینی مدرسوں کو بلند وزر چلا کر زمین کے برابر کر دیتے، بستیوں پر بمباری کر کے ایک ہی وقت میں سینکڑوں افراد کو موت کی نیند سلا دیتے، خدا اور رسول کی شان میں علانیہ گستاخیاں کرتے پھرتے۔

افغانستان میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ہزاروں اجڑی ہوئی مساجد نوچ کنٹاں تھیں۔ تباہ حال مدارس سسکیاں لے رہے تھے۔ عورتیں بے آبرو ہو رہی تھیں، بچے ذبح ہو رہے تھے، بوزوحوں کے لمبے آمیز آنسو ان کی اڑھیوں کو تر چکے تھے۔ ماؤں بہنوں کی کھٹی کھٹی چیخوں سے اسلام کا یہ قلعہ ماتم کدہ بن چکا تھا۔ یہ تھا وہ ”اسن واماں“ جس کے قیام کے لیے روس افغانستان میں داخل ہوا تھا..... جس کے گمن دہریے آج بھی گایا کرتے ہیں۔

روس کی غلط فہمی: روسیوں کا خیال تھا کہ وہ جبر و قہر کے یہ مناظر دکھا کر افغان مسلمانوں کو دبا لیں گے اور ان کی عزاحت دم توڑ دے گی مگر یہ ان کا خیال خام تھا۔ افغان مسلمان اسلام کی جرات و بسالت کا وہ اعلیٰ نمونہ ہیں کہ کفار کا کوئی لشکر ان کے حوصلوں کو شکست نہ کر سکا، وہ وقتی طور پر مغلوب ضرور ہوئے مگر انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی۔ میدان جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا ان کی روایت نہیں۔ اگر وہ ختم ہوئے ہیں تو لڑتے لڑتے اور ہارے ہیں تو سینے پر زخم کھاتے کھاتے..... ہرزخم ان کے جوش انتقال کو بڑھاتا ہے اور ہر وقتی شکست ان کی شجاعت و حمیت پر چوٹ لگاتی ہے۔ اسی قوم کا ایک فرد شہاب الدین غوری تھا جو پرتھوی راج سے شکست کھانے کے بعد غور واپس آ کر پورے سال بستر پر نہیں لیٹا۔ جنگ کی تیاری کرتا رہا اور اگلے سال ہندوستان میں کھس کر اس نے پرتھوی راج کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ افغانوں کی نفسیات انہیں کسی جابر کے آگے جھکنے نہیں دیتی۔ ان کے ہاں قتل کبھی معاف نہیں کیا جاتا۔ وہ نسل در نسل خون یاد رکھتے ہیں اور موقع ملے ہی عالم سے بدلہ لینے میں دیر نہیں کرتے۔ انہیں ظلم و ستم کا

تختہ مشق بنا کر مرعوب کر دینا ناممکن ہے۔ انہیں چنگیز خان کے قہرناکیاں بھی سمیٹ زدہ نہ کر سکیں جس نے ایک ہفتے میں ہرات کے 16 لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا تھا مگر وہ پھر بھی چنگیزی افواج سے نبرد آزما رہے۔ کبھی ہرات کے شمس الدین کی قیادت میں اور کبھی خوارزم کے سلطان جلال الدین کے پرچم تلے۔



مآخذ و مراجع

- ❦ تاریخ جہاد افغانستان، ڈاکٹر انجلی خان
- ❦ افغانستان - ایک قوم کا المیہ، احمد شجاع پاشا
- ❦ اردو ڈائجسٹ، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، فروری 1990ء،
- ❦ المسلمون فی افغانستان، ڈاکٹر محمد عبدالقادر احمد
- ❦ تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر - فاروق حامد بدر
- ❦ Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

پیشواں باب

جہاد افغانستان کی نامور شخصیات اور تنظیمیں

مجاہد رہنماؤں کے چار حلقے: اس سے پہلے کہ ہم جہاد افغانستان کی زریں تاریخ صفحہ بصفحہ اُلٹنا شروع کر دیں، مناسب ہوگا کہ پہلے افغانستان کے مختلف علاقوں میں برسرِ پیکار ان مجاہد رہنماؤں اور ان کی جماعتوں پر ایک نظر ڈال لیں جن کا ذکر آئندہ بار بار آتا رہے گا، جہاد افغانستان میں اہم کردار ادا کرنے والی شخصیات کو ہم چار 4 حلقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- ① علمائے کرام..... ان میں مولانا محمد یونس خالص، مولانا جلال الدین حقانی، مولانا ارسلان خان رحمانی، مولانا نظام الدین حقانی اور مولانا نصر اللہ منصور قابل ذکر ہیں۔
- ② صوفیائے کرام..... ان میں سلسلہ نقشبندیہ کے مولوی محمد نجی محمدی، پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور سلسلہ قادریہ کے پیر سید احمد گیلانی نمایاں تھے۔
- ③ جدید تعلیم یافتہ حضرات..... ان میں گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربانی، احمد شاہ مسعود اور عبدالرب رسول سیاف پیش پیش رہے۔

④ افغان فوج سے الگ ہونے والے..... ان میں ہرات کے کمانڈر اسماعیل خان تور دون، خوست کے کرنل افضل خان، پکتیا کے کرنل احمد سعید اور کمانڈر رضا بٹاکبر شاہ مشہور ہیں۔

جوئے احرار ملت جادہ پیمائشِ جمل سے

مولانا محمد یونس خالص: مولانا محمد یونس خالص کو افغانستان کے جلیل القدر علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ 1920ء میں صوبہ ننگرہار میں پیدا ہوئے۔ نہایت بے لوث، جرأت مند اور صاف گو شخصیت کے مالک اور عابد و زاہد انسان تھے۔ ان کی عمر کا بڑا حصہ درس و تدریس اور علمی مشاغل میں گزرا۔ وہ ایک ادیب اور صحافی بھی تھے۔ کابل میں ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وہ نقشبندی سلسلے کی روایات کے امین بھی تھے۔ تقویٰ اور خدا خوفی میں قرونِ اولیٰ کی تصویر تھے۔ مزاج پر علمی رنگ غالب تھا۔ اس کے

ساتھ ساتھ وہ ایک نہایت متحرک اور فعال لیڈر تھے۔ ہر دور میں حکمرانوں کے خلاف کلمہ حق بلند کرتے رہے۔ ظاہر شاہ اور داؤد خان کے زمانے میں متحرک ہونے والے عام مجاہدین اور تمام گروپ انہیں اپنا بڑا تصور کرتے تھے اور ان کے مشوروں سے استفادہ کرتے تھے۔ انہیں ملک میں استاد الا ستادہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مولانا محمد یونس خالص نرم مزاجی، اعتدال پسندی اور بل جل کر کام کرنے کی زبردست صلاحیت کے حامل ہونے کے باوجود احکام شریعت میں کسی قسم کی چلک روا نہیں رکھتے تھے۔ امانت و دیانت اور ہم آہنگی کا یہ عالم تھا کہ عبدالرب رسول سیاف سے اختلافات کے باوجود ایک عرصے تک ان کی جماعت ”اتحاد اسلامی“ کے ”خازن بیت المال“ رہے۔

ترہ کئی کے دور میں وہ بزرگ مجاہد رہنما اور سرپرست کے طور پر برہان الدین ربانی، عبدالرب رسول سیاف اور گلبدین حکمت یار وغیرہ کے ساتھ ”حزب اسلامی“ میں شامل رہے۔ یہ تنظیم جلد ہی ”حرکت انقلاب اسلامی“ میں بدل گئی مگر بعد میں مجاہد رہنماؤں کے اختلاف اور ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث جلد ہی سبوتاژ ہو گئی۔ یہ 1979ء کی بات ہے تب مولانا خالص نے پرانی حزب اسلامی کا از سر نو احیاء کر دیا اور ان پر اعتماد کرنے والے 30 ہزار کے لگ بھگ مسلح مجاہدین اس گروپ میں شامل ہو گئے۔ یہ گروپ حزب اسلامی خالص گروپ کے نام سے مشہور ہوا۔

مولانا خالص نامور عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ مرد میدان بھی ثابت ہوئے۔ وہ تنگی سازشوں اور جوڑ توڑ کی سیاست سے الگ تھلگ ہو کر میدانِ جہاد میں اترے تھے اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود مدت دراز تک مجاہدوں پر داؤد شجاعت دیتے رہے۔ وہ بذاتِ خود عام مجاہدین کے ساتھ سخت ترین محروکوں میں لڑا کرتے تھے۔

نگر ہار، ارزگان، پکتیا، پکتیکا، قندھار، زابل، غزنی اور جنوب مشرقی صوبوں پر خالص گروپ کی بھرپور گرفت تھی۔ اس تنظیم میں بڑے بڑے جنگجو کمانڈر شامل تھے۔ بعد میں ظہور پذیر ہونے والے طالبان کے امیر ملا محمد عمر مجاہد بھی اس دور میں اسی جماعت میں شامل تھے۔

مولانا خالص میڈیا پر زیادہ نظر نہیں آتے تھے کیونکہ ان کا زیادہ وقت جنگ کے میدانوں میں گزرتا تھا۔ میڈیا پر خود کو نمایاں کرنے اور اقتدار کے لیے تنگ و دو کرنے کی بجائے ان کی نظر ہمیشہ امت کے مفاد عامہ پر رہتی تھی۔

مولانا جلال الدین حقانی: مولانا جلال الدین حقانی کا تعلق پکتیا کی تحصیل ”دزی“ کے گاؤں ”کنڈاو“ سے تھا۔ وہ 1940ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا قبیلہ ”زوران“، دلیری اور معرکہ دانی میں مشہور تھا۔ انہوں

نے افغانستان کے مختلف دینی مدارس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آخر پاکستان میں اکوڑہ خشک کی مشہور دینی درس گاہ جامعہ حقانیہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور یہیں ایک سال تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔

مولانا حقانی کو افغانستان میں جہاد کا بانی قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اُس دور میں کمراندھ کر میدانِ جہاد میں اتر گئے تھے جب لوگ جہاد کے مفہوم تک کو بھول چکے تھے۔ یہ ظاہر شاہ کے اقتدار کے آخری چند برس تھے۔ جن میں کمیونسٹ افغانستان کی سیاست پر چھانے لگے تھے۔ علمائے دین کمیونسٹوں سے شدید خطرہ محسوس کر رہے تھے جبکہ کمیونسٹ اسی شدت سے دینی رہنماؤں کو راستے سے ہٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ کمیونزم کے اس سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے سرپر کفن باندھ کر میدان میں اترنے والوں میں مولانا جلال الدین حقانی سب سے پیش پیش تھے۔

جب دو کمیونسٹ پارٹیوں پرچم اور خلق کے تعاون اور فوج کی ملی بھگت سے سردار داؤد خان برسرِ اقتدار آیا تو مولانا جلال الدین حقانی اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ اب افغانستان کا اسلامی تشخص ختم ہوا چاہتا ہے اور اسے بچانے کے لیے جہاد کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا۔ چنانچہ مولانا حقانی وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے سردار داؤد کے حکومت سنبھالتے ہی مسلح جہاد کا اعلان کر دیا۔ سرکاری فوج نے ان کے گھر کو زرعے میں لے کر نذرِ آتش کر دیا جبکہ مولانا خود بھی بدل کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ مدت پاکستان میں رہے۔ آخر کار املی و عیال کو پاکستان چھوڑ کر دوبارہ افغانستان پہنچے اور داؤد کی حکومت کے خلاف گوریلا لڑائی شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پاکستان کے آزاد قبائلی علاقوں سے ریوالوں، بندوقیں اور دیسی دستی بم خرید کر سرکاری مراکز، فوجی اڈوں اور پولیس چوکیوں پر حملے شروع کر دیا کر دیے۔ ایک سال کے اندر اندر وہ ایک کمیونسٹ مخالف قوت کے طور پر مشہور ہو گئے۔

27 اپریل 1978ء کو تھرہ کئی نے ”انقلابِ ثور“ کے نام سے باقاعدہ طور پر ”کمیونسٹ انقلاب“ برپا کیا تو علمائے کرام اور مفتیانِ عظام نے اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ سب سے مشہور فتویٰ ”دارِ خیل“ کے بزرگ عالم حضرت مولانا عبدالغنی صاحب کا تھا۔ انہوں نے انقلابِ ثور کے صرف دس دن بعد جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا۔

اس فتوے کے بعد مولانا حقانی کے ساتھیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور جلد ہی وہ پکتیا اور پکتیکا میں سب سے مضبوط جہادی کمانڈر کے طور پر مشہور ہو گئے۔ کئی ضلعی میڈیکل کوارٹر بھی ان کے قبضے میں آ گئے۔ اس دوران مولانا محمد یونس خالص، پروفیسر عبدالرب رسول سیاف، پروفیسر برہان الدین ربانی، گلبدین حکمت یار اور دیگر مجاہد رہنماؤں نے لے کر حزبِ اسلامی کے نام سے ایک جہادی تحریک کی بنیاد

رکھی۔ اس کی تشکیل میں مولانا حقانی کا کردار نہایت اہم تھا۔ بعد کے دور کی تمام بڑی مجاہد تنظیموں کے سربراہ ابتداء میں اسی حزب اسلامی میں شامل تھے۔ پھر کچھ مزید تنظیموں کی شمولیت کے بعد اس کا نام ”حرکت انقلاب اسلامی“ رکھ دیا گیا مگر تھوڑی مدت بعد یہ اتحاد بھی تنازعات کا شکار ہو کر بکھر گیا۔ اس موقع پر مولانا محمد یونس خالص نے ”حزب اسلامی“ کا نام دوبارہ بحال کر کے کام شروع کر دیا اور جلال الدین حقانی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ 1979ء کا واقعہ ہے۔ جب 27 دسمبر 1979ء کو روس نے افغانستان میں مداخلت کی تو مولانا حقانی سرخ افواج کے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ وہ ہزاروں نوجوانوں کو گوریلا تربیت دے چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے روسی افواج کے خلاف زبردست کارروائیاں کیں جس کی بنا پر وہ پورے ملک میں ”امام شامل ثانی“ کے لقب سے پہچانے جانے لگے۔

روس افغان جنگ کے نو برسوں میں سب سے بڑے اور سخت ترین معرکے انہی کے علاقوں میں برپا ہوئے اور ایسے ہر موقع پر اس مرد درویش نے اپنی قوت ایمانی اور جذبہ جہاد کے ساتھ روس کی ٹڈی دل افواج کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ ان معرکوں کی تفصیل ان شاء اللہ آگے اپنے موقع پر آئے گی۔

مولانا جلال الدین وہ پہلے کمانڈر تھے جنہوں نے افغانستان میں زمین و آسمان معسکر بنائے جن میں ”ژاؤر“ کا معسکر مجاہدین کا سب سے بڑا معسکر شمار کیا جاتا تھا۔ مولانا نے روسی بمباری سے بچنے کے لیے بڑے بڑے غار بھی کھدوائے تھے اور اس طرح سرخ افواج سے سالہا سال طویل جنگ کی پیش بندی کی تھی۔ افغانستان کے تباہ شدہ مدارس کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنے کے لیے انہوں نے وزیرستان کے سرحدی علاقے میران شاہ میں منہج العلوم کے نام سے ایک بڑا دینی مدرسہ قائم کیا جس میں وزیرستان کے علاوہ افغانستان کے تباہ شدہ 80 سے زائد مدارس کے طلبہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔

پروفیسر غلام محمد نیازی: ظاہر شاہ کے آخری دور میں کیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلق رکھنے والے باشعور مسلمان بھی متحرک ہو چکے تھے۔ ان میں کامل یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے معروف استاذ پروفیسر غلام محمد نیازی سرفہرست تھے۔ یونیورسٹی میں عملاً کیونزم کا راج تھا۔ یونیورسٹی کی مسجد کو ڈانس کلب میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں پروفیسر نیازی نے ”اسلامی جماعت“ کے نام سے ایک تحریک چلائی اور ان کے شاگردوں (کامل یونیورسٹی کے طلبہ) نے ”نوجوانان اسلام“ کے نام سے ایک تنظیم بنائی۔ عبدالرحیم نیازی اس کے روح رواں تھے جبکہ یونیورسٹی کے دو نامور اساتذہ پروفیسر برہان الدین ربانی اور پروفیسر عبدالرب رسول سیاف ان طلبہ کی سرپرستی کر رہے تھے۔

داؤد کے دور حکومت میں جب اسلام پسند لیڈروں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع ہوا تو پروفیسر غلام

محمد نیازی اور پروفیسر عبدالرب رسول سیاف کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں پروفیسر نیازی کو حالت قید و بند میں پھانسی دے دی گئی جبکہ سیاف ایک عرصے بعد رہا ہو گئے۔ اس دوران پروفیسر برہان الدین ربانی اور ”نوجوانان اسلام“ کے ایک فعال نوجوان لیڈر گلبدین حکمت یار چند ساتھیوں سمیت ہجرت کر کے پشاور آ گئے تھے۔ انہوں نے پشاور میں دیگر مجاہد رہنماؤں کے ساتھ مل کر افغانستان میں عسکری کارروائیوں کا فیصلہ کیا۔ چونکہ حکومت پاکستان داؤد خان کی پاکستان مخالف پالیسی سے تنگ تھی اس لیے اس دور کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ان مجاہد رہنماؤں کی سرپرستی شروع کر دی۔

گلبدین حکمت یار نے ”نوجوانان اسلام“ کو ”جمعیت اسلامی“ کے نام سے موسوم کر کے افغانستان میں کام شروع کر دیا۔ بعد میں اس نے حزب اسلامی (حکمت یار گروپ) کا نام اختیار کیا جبکہ حزب اسلامی (یونس خالص گروپ) الگ سے کام کر رہا تھا۔ اس دوران ”جمعیت اسلامی“ کے نام سے برہان الدین ربانی نے الگ جماعت بنالی۔

گلبدین حکمت یار: جہاد افغانستان کے حوالے سے دنیا بھر میں سب سے زیادہ شہرت پانے والے دو تین ناموں میں سے ایک نام انجینئر گلبدین حکمت یار کا ہے۔ وہ 1949ء میں پنجتون قبیلے ”خردئی“ میں پیدا ہوئے۔ کامل یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔ شروع سے اسلام پسند اور انقلابی خیالات کے حامل تھے۔ وہ افغان اسلام پسند نوجوانوں کی تنظیم ”نوجوانان اسلام“ کے صوبہ اول کے رہنما تھے۔ 1972ء میں اپنی انقلابی سرگرمیوں کے باعث جیل کاٹی۔ 1973ء میں داؤد خان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حکومتی پکڑ دھکڑ کے باعث روپوش ہو گئے اور موسیٰ خیل میں امام مسجد بن کر وقت گزارتے رہے۔ 1974ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کچھ مدت بعد پشاور میں ”حزب اسلامی“ کی بنیاد رکھی۔

جلد ہی اس تنظیم نے ”حکومت پاکستان“ کے تعاون سے افغانستان میں کیونٹس حکومت کے خلاف محاط اور محدود دعوایں کام شروع کر دیا۔ اس بنا پر حکمت یار کو ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جو انقلاب ثور سے بہت پہلے کیونٹس افغان حکومتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت انہیں وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی سرپرستی حاصل تھی۔ حزب اسلامی کا انداز کار عسکری کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی رہا ہے۔ وہ جمہوریت اور انتخابات پر یقین رکھتی ہے۔ ننگر ہار، کنڑ، بغلان اور قندوز اس کے خاصی ملتے رہے ہیں۔ اس کے قائد حکمت یار بذاتِ خود میدانِ جنگ کے آدمی نہیں تاہم وہ ایک بہترین سیاست دان ہیں جنہیں درجنوں سرفروش کمانڈروں کا اعتماد حاصل رہا ہے۔ جہاد افغانستان کے دور میں وہ خود عموماً پاکستان میں مقیم رہتے ہوئے افغانستان میں اپنے کمانڈروں سے رابطہ رکھتے تھے

اور میڈیا پر افغان عوام کے موقف کی بھرپور وکالت کرتے تھے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی ایک بڑی تعداد اس تنظیم میں شامل رہی ہے۔

حزب اسلامی جدید تعلیم یافتہ اسلام پسند افراد کی جماعت ہے جو نظریاتی لحاظ سے سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبیدہ اور جماعت اسلامی کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خوشہ چیں ہے اور علمائے کرام و فقہاء کی تقلید سے کسی حد تک آزاد رہتا پسند کرتی ہے۔ جماعت اسلامی اور حزب اسلامی کے تعلقات نہایت گہرے رہے ہیں اور جماعت اسلامی کے نزدیک مجاہدین میں سب سے قابل اعتماد لیڈر مگر بدین حکمت یا رہی رہے ہیں۔ حکمت یا جماعت اسلامی کے بعد عالم عرب کی حکیم تحریک "الاخوان المسلمون" کے انکار سے بڑی حد تک اتفاق کرتے تھے اور ایرانی انقلاب سے بھی متاثر تھے۔ ایرانی انقلاب کے بانیوں سے ان کے قریبی گہرے روابط رہے ہیں۔ حکمت یا کو ذاتی طور پر فتنہ خفی کا پابند نہ جاتا ہے۔ یاد رہے کہ حزب اسلامی کا ایک گروہ حکمت یا سے الگ ہو کر مولوی محمد یونس خالص کی قیادت میں معروف جہاد رہا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نظریاتی طور پر حزب اسلامی سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے تھے اور علماء و فقہاء کی آراء پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ اس گروپ کا ذکر مولانا یونس خالص کے تعارف کے ضمن میں پیچھے آچکا ہے۔

مولانا محمد نبی محمدی: حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولانا محمد نبی محمدی ایک مشہور صوفی بزرگ، جید عالم دین اور بے باک اسلامی رہنما تھے۔ ان کی ولادت 1921ء میں ہوئی۔ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم اپنے والد اور افغانستان کے نامور علمائے کرام سے حاصل کی۔ پھر درس و تدریس اور سلسلہ قادریہ کے جاوید سلوک و احسان سے وابستہ رہے۔

افغان جہاد کے دور میں وہ عمر رسیدہ ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود مجاہدین کو منظم کرنے میں پیش پیش رہے۔ جہاد افغانستان کے حوالے سے اگرچہ میڈیا پر دیگر جماعتیں زیادہ اثر انداز تھیں مگر مشرقی صوبے کے میدانوں میں کارکردگی کے لحاظ سے حرکت انقلاب اسلامی سب سے آگے شمار ہوتی تھی۔

جہاد کا اصل مرکز افغانستان کے دیہات تھے اور ایسے علاقوں میں مولانا کی شخصیت نہایت قابل احترام اور ان کی جماعت بے حد مقبول تھی۔ مولانا محمدی کے عقیدت مند احکام شریعت کی پابندی میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ دوسرے فنکوں میں یہ کٹرنڈ ہی لوگوں کی جماعت تھی جس کی قیادت روایتی پنڈت فکر علماء اور صوفیاء کے ہاتھ میں تھی۔ کابل، قندھار، غزنی، لوگر، قندوز اور بغلان اس تحریک کے اہم مراکز تھے۔

پروفیسر برہان الدین ربانی: پروفیسر برہان الدین ربانی 1935ء میں شمال مشرقی افغانستان کے صوبے

بدخشاں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق تاجک قوم سے ہے۔ کابل یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ سر چلے گئے اور جامعہ الازہر سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آ کر کابل یونیورسٹی کی ”کلیۃ الشریعہ فیکلٹی“ میں تدریس کرنے لگے اور پروفیسر کہلائے۔ وہ کابل یونیورسٹی سے اسلامی تحریک چلانے والے پہلے رہنما پروفیسر غلام محمد نیازی کے سب سے معتد رفیق تھے۔ حکمت یار سے بھی ان کی رفاقت اسی دور سے رہی۔

حکمت یار سے ان کا پہلا اختلاف داؤد خان کی حکومت کے خلاف کام کے طریقہ کار کے حوالے سے تھا۔ پروفیسر ربانی پر امن سیاسی حل کے خواہاں تھے جبکہ حکمت یار مسلح تحریک کے قائل تھے۔ پروفیسر غلام محمد نیازی نے جیل جانے سے پہلے ربانی کو اپنا نائب بنادیا تھا اس لیے ربانی خود کو انقلابی تحریکوں کا جائز سربراہ تصور کرتے تھے۔ حکمت یار سے ان کے اختلاف کی یہ دوسری بڑی بنیاد تھی۔

1974ء میں پروفیسر ربانی سعودی عرب گئے اور شاہ فیصل سے مل کر انہیں کمیونسٹ انقلاب کے خطرات سے آگاہ کیا۔ واپس آ کر کچھ مدت بعد انہوں نے جمعیت اسلامی کی بنیاد رکھی۔ ربانی اس کے سربراہ تھے جبکہ احمد شاہ مسعود اس کے سرکردہ کمانڈر اور مرکزی قوت تصور کیے جاتے تھے۔

دیگر تنظیموں میں عسکری اور سیاسی امور کی باگ ڈور بالائی سطح پر ایک فرد یا مرکزی شوروی کے اختیار میں ہوتی تھی مگر ”جمعیت اسلامی“ کا کمزور پہلو یہ تھا کہ اس میں سیاسی امور پروفیسر برہان الدین ربانی کے پاس تھے جبکہ عسکری امور میں عسکری شعبہ خود مختار تھا اور سیاسی قیادت کی منشاء سے ہٹ کر فیصلے کر سکتا تھا۔ یہ کیفیت احمد شاہ مسعود کی کمان میں ہزاروں ازبک، تاجک اور ترکمان مجاہدین کی جمعیت اسلامی میں شمولیت کے بعد پیدا ہوئی اور اس سے آگے چل کر ناقابل حلانی نقصانات سامنے آئے۔ پروفیسر ربانی کے عرب ممالک سے گہرے تعلقات رہے ہیں اور انہیں وہاں سے خطیر امداد ملتی رہی ہے۔

احمد شاہ مسعود: احمد شاہ مسعود افغان جنگ کے سب سے شہرت یافتہ کمانڈر تھے۔ وہ 1952ء میں پنج شیر کے علاقے بازارک کے گاؤں جنگلک میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق تاجک نسل سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد افغان حکمرانوں کے بہترین سالاروں میں شمار ہوتے تھے، گویا احمد شاہ مسعود کو خون پہ گری درٹے میں ملے تھے۔ انہوں نے مختلف فوجی چھاؤنیوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

1974ء میں وہ انسٹی ٹیوٹ آف پولی ٹیکنیک میں زیر تعلیم تھے کہ داؤد خان برسر اقتدار آ گیا۔ احمد شاہ مسعود کابل یونیورسٹی کی طلبہ تنظیم نو جوانان اسلام کے ابتدائی سینئر ارکان میں شامل ہونے کی وجہ سے زیر عتاب آ گئے چنانچہ وہ اپنے آبائی علاقے پنج شیر چلے گئے اور یہاں سے کمیونسٹوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔

ان کے استاذ پروفیسر برہان الدین نے ”جمعیت اسلامی“ قائم کی تو مسعود اس سے وابستہ ہو گئے تاہم ان کا زیادہ وقت شیخ شیر میں عسکری مہمات میں گزرتا تھا جبکہ برہان الدین ربانی سیاسی امور اور میڈیا دار میں نمایاں تھے۔ جمعیت اسلامی کی اصل قوت احمد شاہ مسعودی کو سمجھا جاتا تھا۔ احمد شاہ مسعود کو تاریخ کے مطالعے سے گہری دلچسپی تھی۔ اس مطالعے نے جنگی چالوں اور عسکری حربوں سے متعلق ان کے تجربے کو انتہا تک پہنچا دیا تھا۔

فرانسیسی زبان سے واقفیت کے باعث اس جنگجو کمانڈر نے زمینی جنگ کے ساتھ ساتھ ”میڈیا وار“ میں نہایت شاعرانہ نتائج حاصل کیے۔ مغربی ذرائع ابلاغ خصوصاً فرانسیسی میڈیا نے ہمیشہ احمد شاہ مسعود کو غیر معمولی انداز میں نمایاں کیا۔ اس لحاظ سے جلد ہی وہ عالمگیر شہرت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور ”شیر شیخ شیر“ کا لقب پایا۔ کمیونسٹوں اور روسیوں سے برسر پیکار رہنے کے باوجود احمد شاہ مسعود مغربی نظام زندگی اور فلسفہ وطنیت سے بے حد متاثر تھے اس لیے یہ جنگ ان کے نزدیک جہاد سے زیادہ دفاع وطن کی لڑائی تھی۔

ان کے بعد کے طرز عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دیگر مجاہد رہنماؤں کے برخلاف شاید وہ افغانستان میں کسی کٹر اسلامی حکومت کے قیام کی خواہش نہیں رکھتے تھے۔ خود کو ملک کی غالب تر موثر قوت کے طور پر منوانے کا جذبہ ہمیشہ ان کے دل میں جاگزیں رہا۔ احمد شاہ مسعود کی ہوشیاری کا یہ عالم تھا کہ مغربی میڈیا کے علاوہ روسی نمائندوں حتیٰ کہ جی بی کے اہلکاروں سے بھی ان کے گہرے روابط رہے اور وہ حسب موقع سب سے اپنا سیاسی و عسکری مفاد حاصل کرتے رہے۔ احمد شاہ مسعود جہاد افغانستان کی کامیابی کے کئی سال بعد ظہور پذیر ہونے والے طالبان کے آخری ایام میں 10 ستمبر 2001ء کو ایک قاتلانہ حملے میں جاں بحق ہو گئے۔

پروفیسر عبدالرب رسول سیاف: پروفیسر عبدالرب رسول سیاف 1945ء میں کابل کے قریب ”پنمان“ میں پیدا ہوئے۔ کابل یونیورسٹی میں کچھ مدت زیر تعلیم رہنے کے بعد جامعۃ الازہر (قاہرہ) سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ 1973ء میں اپنی اسلامی سرگرمیوں کے باعث گرفتار ہوئے اور طویل مدت تک شدید مصائب برداشت کیے۔ انہیں پھانسی دینے کا فیصلہ ہو سکتا تھا مگر حفیظ اللہ امین (جو بعد میں افغانستان کا صدر بنا) ان کا خالہ زاد بھائی تھا۔ اس کی سفارش سے وہ سزائے موت سے بچ گئے۔ رہائی پانے کے بعد ہجرت کر کے پشاور پہنچے۔ تنظیموں کے جوڑ توڑ کے چند مراحل کے بعد ”اتحاد اسلامی“ کے نام سے ایک جماعت بنائی۔ سیاف عربی کے بہترین مقرر تھے اس لیے عرب دنیا میں انہیں بے حد

مقبولیت حاصل ہوئی۔ حاجی ممالک اور سعودی عرب ان سے بطور خاص مالی تعاون کرتے رہے۔

پیر احمد گیلانی: پیر احمد گیلانی کے والد بغداد سے ہجرت کر کے کابل آئے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ سے خاندانی نسبت کی بنا پر یہ گھرانہ افغان عوام میں نہایت معزز شمار ہونے لگا۔ شاہ امان اللہ خان پیر احمد گیلانی کے والد کو اپنے قریب رکھتا تھا۔ پیر احمد گیلانی کی جماعت محاذ ملی (پیمان اتحاد اسلامی) کے نام سے فعال رہی، جنرل عبدالرحمن اس کے منتظم اور کمانڈر سلیمان گیلانی عمومی کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔

پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور خدام الفرقان: پروفیسر صبغت اللہ مجددی کا تعلق بھی افغانستان کے ایک روحانی خانوادے سے تھا۔ ان کے والد شیخ اسماعیل مجددی نے کمیونزم کے خلاف ابتداء ہی میں آواز بلند کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ ظاہر شاہ کا دور تھا اور وزیراعظم داؤد خان شافعی انقلاب کے نام پر اتحاد اور لادینیت کو سرکاری سطح پر پھیلانے کی مہم شروع کر چکا تھا۔ مولانا شیخ اسماعیل مجددی نے اس طوفان کے خلاف مزاحمت کے لیے 1966ء میں غزنی کے نور المدارس میں ایک تنظیم ”خدام الفرقان“ کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم نے جلسے جلوسوں اور احتجاجی مظاہروں کے ذریعے ظاہر شاہ کو مسلمانان افغانستان کے جذبات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی اور ایک رسالہ ”ندائے حق“ بھی جاری کیا مگر ظاہر شاہ اور داؤد خان کے ہاں علماء کی آواز کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

ظاہر شاہ کے بعد داؤد خان کے دور میں ”خدام الفرقان“ کو کچلنے کی بڑی کوششیں کی گئیں۔ اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کیا جانے لگا۔ ترہ کئی کے دور میں انقلاب ٹور کے آغاز کے ساتھ ہی خدام الفرقان کے قائدین نے جن میں پروفیسر صبغت اللہ مجددی اور کمانڈر مولانا ارسلان خان رحمانی پیش پیش تھے، ملک بھر کے مفتیان کرام سے رابطہ کیا اور ان سے جہاد کے بارے میں فتویٰ طلب کیا۔ سب نے متفقہ طور پر جہادی فرضیت کا فتویٰ دیا۔ تب خدام الفرقان کے قائدین میدان میں کود گئے۔ انہوں نے خفیہ طور پر مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ وہ رات کی تاریکی میں لوگوں سے مل کر انہیں دعوت جہاد دیتے اور کمیونسٹ حکومت کے خلاف ”شب نائے“ تقسیم کرتے جن میں بتایا جاتا کہ یہ حکومت کافر ہے، دشمن دین و ایمان ہے، علماء اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے چکے ہیں لہذا عوام ندائے جہاد پر لبیک کہنے میں دیر نہ کریں۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے سرکاری عمال کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی۔ سب سے پہلے ان تعلیمی اداروں کو تباہ کرنا شروع کیا جہاں طلبہ کو کمیونزم کی تعلیم دے کر دین سے باغی بنادیا جا رہا تھا۔ اس دوران کمیونسٹوں نے مولانا اسماعیل مجددی کو گرفتار کر لیا اور کسی نامعلوم مقام پر لے جا کر شہید کر دیا۔ ان کی شہادت کے بعد خدام الفرقان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی اور نئی جہادی و انقلابی

جماعتیں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس دوران پروفیسر صبغت اللہ مجددی نے الگ تنظیم بنائی جو کہ نجات ملی (جبه آزادی) کے نام سے کام کرتی رہی۔ اگرچہ یہ جماعت عسکری لحاظ سے کمزور تھی تاہم مجددی صاحب کو ایک روحانی شخصیت ہونے کے ناتے افغان عوام میں بہت احترام حاصل تھا اس لیے جہادی قاصدین بھی انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

عرب ممالک میں مجددی صاحب کی شخصیت خاصی معروف تھی اس لیے جہاد کے آخری دور میں وہ سیاسی طور پر زیادہ اہمیت اختیار کر گئے اور نئی عبوری افغانستان حکومت کے پہلے سربراہ مقرر ہوئے۔
مولانا نصر اللہ منصور: مولانا نصر اللہ منصور جہاد افغانستان کے اولین قاصدین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک درویش صفت عالم دین اور ماہر گوریلا کمانڈر کے طور پر مشہور تھے۔ انہوں نے ذاتی سیاسی فوائد حاصل کرنے سے گریز کیا اور ہمیشہ اعلیٰ مناصب کے لیے دوسروں کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ صنف اول کے کمانڈر اور ذہنی رہنما ہونے کے باوجود وہ جہاد کے حوالے سے میڈیا پر اتنے معروف نہیں تھے جیسا کہ ان کی حیثیت کا تقاضا تھا۔ ان کا اصل نام فضل الرحمن تھا مگر انہیں نصر اللہ منصور کے نام سے شہرت ملی۔ وہ 1940ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق قبیلہ ”سہاک“ سے تھا۔ صوبہ پکتیا کا علاقہ ”زرمّت“ ان کا مسکن تھا۔ انہوں نے غزنی کی مشہور دینی درس گاہ ”جامعہ فاروقیہ“ سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔

1966ء میں ظاہر شاہ کے دور کی جدت پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے اکابر علماء کے اتحاد سے ”خدا ام الفراتان“ نامی تنظیم قائم کی گئی۔ مولانا اسماعیل مجددی اس تنظیم کے پہلے سربراہ تھے۔ مولانا نصر اللہ منصور اس تنظیم کے بانی ارکان میں شامل تھے۔ وہ 1973ء میں اس کے مرکزی نائب امیر مقرر کر دیے گئے۔ یہ ظاہر شاہ کا دور تھا جس میں انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

ترہ کنی کے دور میں وہ ”حرکت انقلاب اسلامی“ میں شامل ہوئے اور مولانا محمد نبی محمدی کے دست راست بنے۔ ”حرکت انقلاب اسلامی“ کئی بڑے جہادی لیڈروں کے مشترکہ پلیٹ فارم کے طور پر کچھ عرصے تک فعال رہی مگر جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی۔ الگ ہونے والے لیڈروں نے اپنی اپنی جماعتیں قائم کر لیں۔ علمائے کرام نے ان جہادی لیڈروں کو ایک اتحاد بنانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تو ”حرکت انقلاب اسلامی“ کے دوسرے رہنماؤں مولانا محمد نبی محمدی اور مولانا نصر اللہ منصور کے درمیان اس اتحاد میں شرکت کے حوالے سے اختلاف ہو گیا۔ حرکت انقلاب اسلامی کی شورشی کے فیصلے کے مطابق مولانا نصر اللہ منصور اتحاد میں شمولیت کے حامی تھے جبکہ مولانا محمد نبی محمدی اس سے گریزاں تھے۔ اس صورت حال میں ارکان شورشی نے مولانا نصر اللہ منصور کو نیا امیر جن کربجاہ دین کے اتحاد میں شمولیت اختیار

کر لی۔ یوں حرکت انقلاب اسلامی (انصر اللہ منصور گروپ) وجود میں آیا۔ جبکہ مولانا محمد نبی محمدی حرکت انقلاب اسلامی (محمدی گروپ) کے نام سے علیحدہ کام کرتے رہے۔ مولانا انصر اللہ منصور کچھ عرصے تک اتحادی تنظیموں کے ساتھ سرگرمی سے جہاد میں مصروف رہے مگر پھر بیرونی امداد کے حوالے سے بعض تنقیدات نے انہیں علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ ادھر مولانا محمد نبی محمدی اتحاد میں شامل ہو گئے۔

مولانا انصر اللہ منصور آخر تک اپنے گروپ کے ساتھ علیحدہ طور پر مصروف جہاد رہے۔ صوبہ پکتیا اور گرد و نواح کے علاقوں میں ان کی گرفت نہایت مضبوط تھی۔ جہاد کے آخری مراحل میں وہ ایک غیر ملکی سازش کے تحت ایک اچانک حملے میں شہید کر دیے گئے۔

چند اور اہم کمانڈر

مولانا ارسلان خان رحمانی: مولانا ارسلان رحمانی کا تعلق صوبہ پکتیکا کے علاقے ارغون (ارغون) سے تھا۔ ارغون کا نواحی گاؤں ”خالق داد بابا کلمے“ ان کی جائے پیدائش تھا۔ انہوں نے 17 سال دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے اور پھر 15 سال تدریسی خدمات انجام دینے میں گزارے۔ وہ تفسیر، حدیث اور دیگر علوم و فنون کے استاذ الاساتذہ شمار ہوتے تھے۔ داد خان اور ترہ کنی کے دور میں انہوں نے مولانا شیخ اسماعیل مجددی کی جماعت خدام القرآن میں شمولیت اختیار کی۔ وہ اس تحریک کے نہایت سرگرم عہدے دار تھے۔

خدام القرآن ختم ہوئی تو وہ حرکت انقلاب اسلامی میں شامل ہو گئے۔ پھر پارٹیوں کے جوڑ توڑ اور دینی تنظیموں کی تشکیل کے بعد پروفیسر عبدالرب رسول سیاف کی جماعت ”اتحاد اسلامی“ میں آ گئے۔

مولانا ارسلان رحمانی کی کارروائیوں کا خاص مرکز ارغون تھا۔ وہ تین بار گرفتار بھی ہوئے مگر ہر بار فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ صوبہ پکتیکا میں روسی فوج ان کے نام سے کام لیتی تھی اور انہیں آدم خور کہہ کر یاد کرتی تھی۔

کمانڈر سید الرحمن: کمانڈر سید الرحمن 1949ء میں پیدا ہوئے۔ یہ گلبدین حکمت یار کے ہم قبیلہ تھے اور بعد میں انہی کی جماعت حزب اسلامی کے نامود کمانڈر بنے۔ کابل یونیورسٹی سے ایم اے اکنامکس کرنے کے دوران یہ ”نوجوانان اسلام“ میں شامل ہو گئے تھے۔ ترہ کنی حکومت کے دور میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور کیونٹ عدالت نے سزائے موت سنائی۔ انہیں پچانسی گھنٹہ کی طرف لے جایا جا رہا تھا کہ انہوں نے راستے میں سرکاری محافظوں کو اسلام اور ملک و ملت کے ناموس کی دہائی دی۔ اس

میکسواں باب

پارٹیشننگ سے متاثر ہو کر سرکاری اہلکاروں نے انہیں فرار ہونے کا موقع دے دیا۔ یہ طویل سفر کرتے ہوئے پارا چتر کے راستے پاکستان پہنچے اور حزب اسلامی میں شامل ہو گئے۔ جلد ہی ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں لوگر، کونڑ، غزنی اور وردگ میں اہم ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ وہ متحدہ بار دشمن کے محاصرے میں آئے، ساتھیوں کو ان کی شہادت کا یقین ہو جاتا مگر وہ اتنے میں گھیرا تو ذکر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک بار محاصرے سے نکل کر کسی مسجد میں پہنچے تو وہ وہاں ان کے لیے دعائے مغفرت کی جا رہی تھی۔ سید الرحمن کی ڈاڑھی جوانی میں ہی سفید ہو گئی تھی۔ کہتے تھے: ”اتنے ساتھیوں اور مجاہدوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا ہے۔ اس کے بعد بال کا لے کیسے رہ سکتے ہیں۔“

مولوی جان محمد: افغانستان کے جنوب مشرقی اور مغربی اضلاع ہی نہیں شمال میں بھی بڑے بڑے مجاہد کمانڈر کیونٹ اور سوویت افواج سے نبرد آزما رہے۔ ان میں ایک اہم نام مولوی جان محمد کا ہے۔ افغانستان کا انتہائی شمالی صوبہ بدخشاں جو کہ دنیا کی چھت ”پامیر“ کے ساتھ جا لگتا ہے ان کا مرکز تھا۔ تحصیل فیض آباد کے علاقے ”یفتل“ میں گاؤں ”نفل خواہ“ ان کا مسکن تھا۔ وہ نسلاً تاجک تھے۔ بخار اور بخلان کے قدیم طرز پر کام کرنے والے دینی مدارس سے دینی تعلیم حاصل کی۔ کامل کے مدرسہ قلعہ جواو اور بدخشاں کے ”مدرسہ خرقہ مبارک“ میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔ سرخ انقلاب کے بعد جولائی 1978ء میں جہاد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کی وابستگی حزب اسلامی (یونس خالص گروپ) سے رہی۔ 1980ء میں انہوں نے کونہ غازیان (سابقہ نام کونہ ڈولڈان) پر ایک بڑا خونریز معرکہ لڑ کر دشمن کے مشہور مرکز ”عقاب شہین چھاؤنی“ پر قبضہ کر لیا۔ شاہراہ بدخشاں پر حریف افواج کے کانوے اکثر ان کے ہندو تیر حملوں کی زد میں رہے۔ ان کے زیر قیادت مجاہدین روس کی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں کھس کر بھی سوویت یونین کے خلاف گارو دائیاں کرتے رہے۔

کمانڈر عبدالحمید: کمانڈر عبدالحمید غیر خان کا تعلق بدخشاں سے تھا۔ ان کی ولادت 1951ء میں ہوئی۔ حصول تعلیم کے بعد 1971ء میں ”عصری تعلیمی اداروں میں تدریس شروع کر دی۔ سرخ انقلاب کے خلاف اساتذہ و طلبہ کو متحد کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپریل 1979ء میں انہوں نے فیض آباد کے تحصیل ہیڈ کوارٹر پر قبضہ کر کے کیونٹوں کو ہراساں کیا۔ اسی سال پشاور آ کر برہان الدین ربانی سے ملے اور اہمیت اسلامی کے نامزد کمانڈر بن کر دوبارہ شمالی افغانستان میں مصروف پیکار رہے۔

مولوی دولت اللہ: بدخشاں کی سب ڈویژن دورانہ کا گاؤں جو کہ دریائے آمو کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ مولوی دولت اللہ اس گاؤں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے تیرہ کئی دور میں ہی بربل دریا

”مسکندر دلاور شہید“ کے نام سے ایک مرکز بنالیا تھا جس سے وہ دریائے آمو میں چلنے والی روسی کشتیوں پر حملے کرتے رہے۔ اسلحے سے لدی روسی کشتیاں ڈیونا ان کا خاص مشغلہ تھا۔ وہ روس کے اندر بھی کارروائیاں کرتے رہے۔ ایک بار دشت لُج کے روسی انٹرپورٹ کو بھی حملے کا نشانہ بنایا۔ وہ مقبوضہ مسلم ریاستوں کے مسلمانوں کو اسلامی کتب اور اسلحہ فراہم کرنے کا ٹھن کام بھی انجام دیتے رہے۔

مولانا نظام الدین حقانی: مولانا نظام الدین حقانی 1934ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی اور وسطی تعلیم افغانستان کے دینی مدارس میں حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خشک (پاکستان) آگئے۔ علوم دینیہ کی تحصیل کے بعد 17 سال تک درس و تدریس سے منسلک رہے۔ یہ ان کی یکسوئی کا دور تھا جس میں وہ ہر تفرغ علم کے لیے وقف تھے۔ ظاہر شاہ کے دور میں وہ پہلی بار اس وقت منظر عام پر آئے جب کیونسٹوں نے ایک جلسے میں لینن پر زور دیا تھا۔ اس ناپاک جسارت کے خلاف علمائے کرام نے احتجاجی تحریک شروع کر دی۔

مولانا نظام الدین اس تحریک کے روح رواں تھے۔ ان کی سر توڑ کوششوں سے پکلتیا میں چھ ماہ تک ان مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونسٹوں کے مظالم سے مجبور ہو کر 1974ء میں انہوں نے پاکستان ہجرت کی اور اہل و عیال کو محفوظ مقام پر پہنچا کر جہلا میں شریک ہو گئے۔ وہ مولانا جلال الدین حقانی کے دست راست بن گئے اور آخر تک ان کے نائب کی حیثیت سے معروف کار رہے۔

ترہ کئی کے دور میں انہوں نے مزارگی کس (پکلتیا) کا مشہور محرک لڑا۔ اس دور میں ان کے بھائی عبدالسلام کو جیل میں تشدد کے ذریعے شہید کر دیا گیا۔ ان کے دوسرے بھائی مولانا فتح اللہ حقانی جو نامور گوریلہ کاڈر تھے، 1985ء کے ایک بڑے معرکے میں شہید ہوئے۔ افغان جہاد میں ان کے خاندان کے کم و بیش 12 افراد نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

نوٹ: یہ افغان جہاد کی اہم شخصیات کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ درجنوں رہنماؤں اور بیسیوں نامور کاڈروں کی ایک فہرست ہے جن کا ذکر طوالت کے خدشے سے ترک کیا جا رہا ہے۔

جہاد افغانستان اور شیعہ تنظیمیں: افغانستان میں شیعہ آبادی کا تناسب تقریباً 10 فیصد ہے جن میں امامیہ اور اسماعیلی فرقتے شامل ہیں۔ 1978ء کے انقلاب ثور کے بعد ان میں سے لاکھوں افراد نے ایران میں پناہ لی۔ یوں ایران بھی افغانستان پر روسی حملے سے متاثر ہوا۔ مستقبل میں افغانستان کے اندر شیعہ مفادات کے تحفظ کے لیے شیعہ رہنماؤں نے بھی ایران میں تنظیم سازی شروع کر دی اور کئی چھوٹے چھوٹے شیعہ عسکری گروپ وجود میں آ گئے جن کا اتحاد ”حزب وحدت“ کے نام سے قائم ہوا۔

شیعہ مسلمانوں نے افغان جہاد میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ تاہم ایران کی بھرپور سرپرستی نے انہیں سیاسی طور پر اہمیت دلوا دی۔ چونکہ ایران روس کا اتحادی تھا اس لیے وہ قصداً روس کے خلاف ان تنظیموں کو میدان جنگ میں فعال کرنے سے کتراتا رہا۔ اس کے برخلاف شیعہ تنظیمیں، سنی تنظیموں کے لیے مشکلات ضرور پیدا کرتی رہیں۔ روسی افواج کی واپسی کے بعد ایران نے شیعہ تنظیموں کو میدان میں لاکھڑا کیا۔ اس مقصد کے لیے وہ انہیں بے پناہ عسکری وسائل مہیا کر چکا تھا۔ اس طرح نئی حکومت کی تشکیل میں شیعہ تنظیموں کو جہاد میں اپنے کردار کی نسبت زیادہ حصہ دلوانے کی کوشش کی گئی۔ ان امور کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ جہاد افغانستان کے اصل دور میں جو 1979ء سے 1988ء تک محیط تھا، ایران نواز شیعہ تنظیموں کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔ اہم کردار انہی قائدین، کمانڈروں اور جماعتوں کا تھا جن کا ہم تعارف کرا چکے ہیں۔



مآخذ و مراجع

- ❖ افغانستان کی کہانی حقائق کی زبانی۔ ڈاکٹر مفکر احمد
- ❖ افغانستان ایک قوم کا الیہ۔ احمد شجاع پاشا
- ❖ اردو ڈائجسٹ، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، فروری 1990ء
- ❖ تاریخ جہاد افغانستان۔ ڈاکٹر انجلی خان

چھبیسواں باب

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے

1980ء افغان مجاہدین کا جوشِ انتقام: تاریخ اپنے آپ کو دہرائی تھی۔ مجاہدین افغانستان مولوی محمد یونس خالص، مولوی محمد نبی، گلبدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود، عبدالرب رسول سیاف جیسے محرکِ آزاد رہنماؤں کی قیادت میں جمع ہو رہے تھے۔ ان مجاہد رہنماؤں نے داؤد اور ترہ کنی کے زمانے میں جہاد کے لیے زمین ہموار کر لی تھی۔ وہ تقریباً تین سال سے نو جوانوں کو گوریلا تربیت دے رہے تھے۔ افغان باشندے پیدائشی طور پر جھاکش اور سخت جان ہوتے ہیں اور ان کا ہر فرد ایک حد تک اسلحہ چلانا ضرور جانتا ہے۔ اس لیے انہیں گوریلا تربیت حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ روسی یلغار کے وقت مجاہد رہنماؤں کی تربیت لینے والے نو جوانوں کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہو چکی تھی اور وہ پورے افغانستان، خصوصاً اس کے مشرقی، وسطیٰ اور جنوبی صوبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

رہنما متحد ہو گئے: افغان جہاد کے ابتدائی ایام میں ان تنظیموں اور قائدین کے درمیان کوئی مؤثر رابطہ نہیں تھا۔ یہ سب بکھری ہوئی شکل میں اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں سرخ افواج سے برسرِ پیکار تھے۔ مجاہدین کے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں تھی البتہ نظم و ضبط کا فقدان تھا اور وہ ان جدید عسکری وسائل سے محروم تھے جن سے کیونٹ اور سوویت افواج لیس تھیں۔ روسی افواج کی مداخلت سے قبل مجاہدین کا مختلف تنظیموں کے درمیان علاقائی اور نسلی چپقلش بھی موجود تھی، اس کے علاوہ ان کے کمانڈر عموماً ایک دوسرے پر اعتماد کرنے میں تامل کر رہے تھے۔ بڑے رہنماؤں کے اپنے اپنے تحفظات اور دشمنات تھے، اسی لیے جس تیزی سے ان کی تنظیمیں وجود میں آتی تھیں، کچھ مدت بعد اسی طرح تحلیل ہو جاتی تھیں، اس صورتِ حال کی کئی مثالیں مجاہد رہنماؤں کے تعارف کے تحت آچکی ہیں۔

دریں حالات مجاہدین کو منظم کرنے کی سخت ضرورت تھی ورنہ ان کی جدوجہد کارگر ہونے کے امکانات زیادہ نہیں تھے۔ مجاہد رہنماؤں نے جلد ہی باہمی اعتماد کے قیام کی ضرورت محسوس کر لی۔ سرخ افواج کا

مداخلت کے صرف ایک ماہ بعد 28 جنوری 1980ء کو چھ جہادی تنظیموں کا اتحاد وجود میں آ گیا۔ پروفیسر برہان الدین ربانی اتحاد کی سپریم کونسل کے صدر بن گئے۔ اس اتحاد کی تشکیل میں امریکہ اور حکومت پاکستان کا خاص کردار تھا جبکہ مالی تعاون میں سعودی عرب نے گہری دلچسپی لی۔ خادم الحرمین شریفین شاہ خالد مرحوم نے مجاہد ہنماؤں کے اتحاد کا خیر مقدم کرتے ہوئے 24 ملین ڈالر کی خطیر رقم بطور عطیہ فراہم کی۔

زبردست کارروائیاں: اس کے بعد افغانستان میں روسی افواج کے خلاف زبردست کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ 13 فروری 1980ء کو مجاہدین نے جلال آباد پر پورٹ تباہ کر دیا۔ 10 مارچ کو مجاہدین نے خوزیز لڑائی کے بعد کامل طور پر شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں سینکڑوں روسی سپاہی مارے گئے۔ 11 اپریل کو مجاہدین نے ننگرہار میں ایک سو کے لگ بھگ روسیوں کو ہلاک کر دیا۔ تاہم روس کی جوابی فضائی کارروائیوں میں درجنوں مجاہدین بھی شہید ہو گئے۔ کامل کے گرد و پیش میں بھی مجاہدین کی گوریلا کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ 24 مئی کو انہوں نے فوج کامل میں اسلحے اور گولہ بارود کا ایک بڑا ذخیرہ نذر آتش کر دیا۔ اُدھر ننگرہار میں زوردار معرکہ ہوا اور تین سو روسی داخل جہنم ہو گئے۔ 9 جون کو ہرات میں زبردست لڑائی کے دوران 874 روسی مارے گئے۔ اس دن مجاہدین کی ایک بڑی تعداد گوریلا کارروائیوں کے لیے کامل میں ٹکس گئی اور روسی افسران کو پہلی بار احساس ہوا کہ کامل پر ان کی گرفت کمزور ہے۔

ان مجاہدین کے داخلے کے اگلے دن 10 ہزار تازہ دم سوویت سپاہیوں نے آکر کامل میں مورچے بنائے تاہم مجاہدین کا خوف کامل پر مسلط رہا۔ موسم گرما میں پٹان اور ہرات بھی شدید معرکوں کا مرکز بن گئے۔ ہرات کی کارل انتظامیہ دو ماہ بعد سرنگوں ہو گئی جبکہ پٹان پر بھی مجاہدین قابض ہو گئے۔ کھ پتلی حکمران ببرک کارل اس صورت حال سے اتنا حواس باختہ تھا کہ 18 جون کو اس نے خودکشی کی کوشش کر ڈالی۔ اسے بچانے کی کوشش میں اس کا ایک محافظ ہلاک اور دو زخمی ہو گئے۔

مزید روسی افواج کی طلب: خود سوویت انتظامیہ مجاہدین کی خلاف توقع شدید مزاحمت پر حیران تھی۔ جولائی میں اس نے 65 ہزار سپاہیوں پر مشتمل مزید 5 ڈویژن فوج افغانستان بلائی تاکہ مجاہدین کا زور توڑا جاسکے۔ اگست کے اواخر تک مزید 16 ہزار سپاہی منکوائے گئے۔ اس طرح افغانستان میں سوویت فوج کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہو گئی جبکہ ببرک کارل دنیا کو دھوکے میں رکھنے کے لیے یہ بیان دے رہا تھا کہ افغانستان میں روسی سپاہیوں کی تعداد صرف 10 ہزار ہے۔

ببرک کارل اپنی حیثیت سے خوب واقف تھا اس لیے وہ موسم گرما میں ہونے والی اسلامی دوزائے خارجہ کانفرنس میں بھی شریک نہ ہوا۔ اس کی اپنی افواج اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ روسی افواج کی ستم

ریزیاں بہت سے افغان سپاہیوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ ایک دن روسیوں نے چھ افغان طلبہ کو گرفتار کر کے ان سے نازیبا سلوک کیا تو ایک افغان رائل برادر سپاہی سے رہانہ گیا۔ اس نے فائرنگ کر کے چار روسیوں کو وہیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر خود روسیوں کے انتقام سے بچنے کے لیے خودکشی کر لی۔

9 مارچ 80ء کو ذرائع ابلاغ نے یہ دھماکا خیز خبر نشر کی کہ اب تک 60 ہزار افغان فوجی مجاہدین میں شہداء ہو چکے ہیں۔ ماہ ستمبر میں روس کے وادی پنج شیر پر حملے کے دوران ایک ہزار افغان فوجی مجاہدین سے جا ملے۔ 6 اکتوبر کو روسی افواج نے سو سے زائد افغان فوجیوں کو فراری کی کوشش پر گولی مار کر ہلاک کر دیا، افغان فوجیوں کی تعطیلات منسوخ کر دیں اور ان کی خط و کتابت پر پابندی عائد کر دی۔ افغان سرکاری افواج کی تعداد گھٹتے گھٹتے 7 ماہ کے دوران صرف 50 ہزار رہ گئی۔

روسی وسط ایشیا کے ہزاروں مسلم فوجیوں کو بھی امریکا اور چین سے جنگ کا دھوکا دے کر افغانستان میں لے آیا تھا۔ ایسے بہت سے سپاہی حقیقت کھلتے ہی مجاہدین سے جا ملتے تھے۔ آخر کار نومبر 80ء میں روس نے تمام مسلم سپاہیوں کو وسط ایشیا واپس بھیج دیا۔

افغان مہاجرین کی اعانت: روس کے خلاف مزاحمت کے اس ابتدائی دور میں مجاہدین کو جدید اسلحے اور خوراک و رسمد کے لیے اخراجات کی شدید ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں لاکھوں کی تعداد میں افغان مہاجرین پاکستان اور ایران کا رخ کر رہے تھے۔ پاکستانی کمیپوں میں 10 لاکھ سے زائد مہاجرین جمع ہو چکے تھے۔ ان کی ضروریات کی کفالت کے لیے بہت بڑے پیمانے پر تعاون درکار تھا۔ صدر ضیاء الحق نے اس موقع پر افغان مہاجرین کے لیے امدادی فنڈ قائم کیا جس کے بہترین نتائج برآمد ہوئے۔ 11 مارچ 1980ء کو جب اس کی ابتدا ہوئی تو اس میں 20 لاکھ روپے جمع تھے۔ نومبر میں یہ رقم 26 کروڑ سے تجاوز کی گئی۔ مظلوم افغانوں کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنے والے ملکوں، اداروں اور افراد نے دل کھول کر تعاون کیا۔ عرب اس سلسلے میں سب سے آگے تھے۔ ایک سعودی تاجر سید حسن عباس نے آٹے کی 20 لاکھ بوریاں فراہم کیں۔

روس کی پاکستان کو دھمکی: پاکستان کی اس پالیسی سے روس بے حد برہم تھا۔ اکتوبر 1980ء کے آغاز میں روسی وزیر خارجہ نے اپنے پاکستان ہم منصب آغا شای سے ملاقات کی۔ بعد میں صدر ضیاء الحق نے ایک بیان میں انکشاف کیا کہ روس ہمیں ”ٹھیک“ کر دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔

روس پاکستان کو عملاً بھی متنبہ کر رہا تھا۔ ایک سال کے دوران روس اور افغان طیارے میسوں بار پاک افغان سرحد کی خلاف ورزی کر چکے تھے۔ روس نے بارڈر پر اعداد و ہند بارودی سرنگیں بچھانے کا

کام بھی شروع کر دیا تھا تاکہ مہاجرین کے قائلے سلامتی سے پاکستان نہ پہنچ سکیں۔

صدر ضیاء الحق ایک طرف افغان مسئلے سے نبرد آزما تھے، دوسری طرف تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں ان کی مخالف تھیں۔ سابق حکمران پارٹی، پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ بیگم نصرت بھٹو بر ملا کہہ رہی تھیں کہ ہم افغان باغیوں کو پاکستان میں پناہ لینے کی اجازت نہیں دیں گے۔ 22 اپریل 80 کو صدر ضیاء الحق کی افغان پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے ببرک کارمل کی حکومت کو قاتل بقول قرار دیا۔

جنرل اسبلی میں صدر ضیاء الحق کی تقریر: تاہم صدر ضیاء الحق اپنی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے یکم اکتوبر 80 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسبلی کے اجلاس میں افغان بحران کے حوالے سے جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے عزم مضبوط کا پتہ دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا: "افغانستان میں مزاحمت کی تحریک ایک غیر قوم کے جذبہ حب الوطنی کا اظہار ہے..... جس نے کبھی بیرونی تسلط برداشت نہیں کیا۔" انہوں نے اس تقریر میں سوویت افواج کی غیر مشروط واپسی اور افغانستان کی آزادانہ خود مختار حیثیت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ ماسکوا لیکس کا بائیکاٹ: افغانستان پر روسی حملے کو دنیا بھر میں تشویش کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ اس حقیقت کا اس وقت کھل کر اظہار ہوا جب 27 ممالک نے ماسکو میں منعقد ہونے والے اوپیکس گیمز 1980ء میں شرکت سے انکار کر دیا۔ ان میں سعودی عرب، مراکش، اردن، بحرین، سوڈان، ملائیشیا جیسے اسلامی ملکوں کے علاوہ برطانیہ، آسٹریلیا، جاپان، چین، ہالینڈ، ناروے، نیوزی لینڈ اور چلی بھی شامل تھے۔ اگست کے آغاز میں جب ماسکوا لیکس گیمز اختتام پذیر ہوئے تب تک ان کا بائیکاٹ کرنے والے ملکوں کی تعداد 60 تک پہنچ گئی تھی۔ بائیکاٹ کی اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے امریکی میڈیا نمایاں کردار ادا کر رہا تھا۔

عالمی سطح پر افغان مسلمانوں سے تعاون کا جذبہ: سعودی عرب نے افغان مہاجرین کی امداد کے لیے ریاض میں ایک خصوصی فنڈ قائم کر دیا تھا۔ مئی 1980ء تک اس فنڈ میں تقریباً ساڑھے 4 کروڑ ریال جمع ہو چکے تھے۔ بیرون ممالک میں مقیم افغان بھی روس کے خلاف رائے عامہ مہوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تہران میں افغان طلبہ نے افغان سفارت خانے پر قبضہ کر کے اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑنے کا عزم ظاہر کیا۔ سابق افغان حکمران طاہر شاہ نے جو کہ 1973ء سے اٹلی کے دارالحکومت "روم" میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے، فرانس کے ایک خبری ادارے کو انٹرویو دیتے ہوئے مغربی طاقتوں سے یہاں تک کی کہ وہ روس کو افغانستان سے باہر نکالنے کی کوشش کریں۔ ایک اور بیان میں طاہر شاہ نے کہا کہ افغان عوام صرف زعرہ رہنے کا حق مانگ رہے ہیں، عالمی ضمیر ان کی بے کسی پر توجہ دے۔

بھارتی مسلمان افغانستان میں روسی دہشت گردی کے خلاف پرزور احتجاجی مظاہرے کر رہے تھے۔ خود بھارتی وزیراعظم سزا اندرا گاندھی نے افغان بحران کو سنگین قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس سے دو بڑی طاقتوں میں جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ بھارت کے معروف عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ فیصل ایوارڈ میں ملنے والی رقم افغان مہاجرین کی امداد کے لیے جمع کرادی تھی۔

جنوری 1981ء میں مکہ مکرمہ میں 37 مسلم ممالک کے سربراہ اور نمایندوں کا عظیم الشان اجتماع ہوا۔ طائف سے مکہ مکرمہ تک کاروں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اس اجتماع میں شاہ خالد نے اپنی یادگار تقریر کے دوران اسلامی ممالک سے اہل کی کہ وہ القدس اور افغانستان کو آزاد کرانے کے لیے متحد ہو جائیں۔

1980ء کے اواخر اور 1981ء کے اوائل میں شدید موسم سرما کے باوجود روس کے خلاف معرکے جاری رہے۔ 29 اکتوبر کو قدوز میں مجاہدین نے ایک لڑائی میں کیوبا کے دو جرنیلوں سمیت 117 روسی ہلاک کر دیے۔ دو دن بعد جلال آباد میں پورٹ پر حملے میں مجاہدین نے تین ٹینک اور دو ہیلی کاپٹر تباہ کر دیے۔

افغان تہذیب و تمدن کی تباہی: روس افغانستان کی تہذیب و ثقافت اور قدیم اسلامی آثار کو تباہ کر رہا تھا۔ کیا یہ بات صدمہ انگیز نہیں تھی کہ روسیوں نے کابل میں اترنے کے صرف 10 دن بعد 7 جنوری 1980ء کو غزنی میں اسلام کے بطل جلیل قاتح ہند سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ منہدم کر دیا تھا۔ پھر ایک سال کے اندر اندر افغانستان کا نظام تعلیم تبدیل کر دیا گیا۔ دینیات اور تاریخ اسلام کے مضامین خارج کر کے لینن اور مارکس کی سوانح حیات اور کمیونسٹ تحریک کا تعارف نصاب میں شامل کر دیا گیا۔ اہلنا و قائل افغان طلبہ کو پُرکشش ترغیبات دے کر ماسکو بھیجا جا رہا تھا، جو آمادہ نہ ہوتے انہیں جبراً بھیجا جاتا، جہاں برین واشنگ (ذہنی غسل) کے ذریعے انہیں کمیونزم کا داعی بنادیا جاتا تھا۔

پاکستان میں پناہ لینے والے افغان وزارت تعلیم کے ایک اعلیٰ افسر شہباز وزیر زئی کے بیان کے مطابق افغانستان کے طلبہ و اساتذہ کی اکثریت مجاہدین سے مل گئی تھی اور روسی فوجی کمیونزم مخالف طلبہ و اساتذہ اور محکمہ تعلیم کے اسلام پسند افسران کو چن چن کر شہید کر رہے تھے۔

”واخان“ کا روس سے الحاق: پاکستان اور روس کو جدا کرنے والی پٹی ”واخان“ جغرافیائی لحاظ سے بے پناہ اہمیت کی حامل تھی۔ یہ بیک وقت پاکستان، چین، وسط ایشیا کی سوویت ریاستوں اور افغانستان کا سنگم تھی۔ برطانیہ نے سرحدیں تشکیل دیتے وقت یہ حصہ اس پیش بندی کے طور پر افغانستان میں شامل کر لیا تھا تاکہ اس کی ہندوستانی سرحدیں روس سے براہ راست نہ ملنے پائیں اور وہ روسی جارحیت سے محفوظ رہے۔ تقسیم ہند کے بعد یہی پٹی پاکستان کو روسی حملے سے محفوظ رکھنے اور چین سے پاکستان کے

فاسلوں کے سٹنے کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اب چونکہ روس کے لیے پاکستان کی افغان نوازی ناقابل برداشت تھی اس لیے اپنی سرحدیں پاکستان سے متصل کر کے پاکستان کو دھمکانے کے لیے اس نے ”داخان“ کو روسی ریاستوں میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کے لیے سجائے جانے والے اسٹیج ڈرامے میں شرکت کے لیے کھپتلی صدر افغانستان ببرک کادل اکتوبر کے وسط میں ماسکو گیا۔ وہاں اس نے روسی حکام کے حسب منشا ”داخان“ کی اپنی بطور تحفہ روس کے حوالے کر دینے کا اعلان کیا۔

5 نومبر 1980ء کو ”داخان“ باضابطہ طور پر سوویت روس کا حصہ بن گیا اور پاک سوویت سرحدیں باہم مل گئیں۔ اب روس جب چاہے افغانستان سے گزرے بغیر پاکستان پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ صدر خیاہ الحق کو دی گئی کھلی دھمکی ”ہم تمہیں ٹھیک کر دیں گے“ پر عمل کی پہلی جھلک تھی۔ اس نئی صورت حال سے پاکستان سمیت ہمسایہ علاقوں میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

برزنیف کا دورہ بھارت: اس کے ساتھ ساتھ روس نے اپنے دوست بھارت کے ساتھ تعلقات مزید مضبوط کر کے اسے اپنے موقف کی حمایت پر آمادہ کرنے اور اس کے ذریعے پاکستان پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے روسی صدر برزنیف نے بذات خود دسمبر 1980ء میں وہاں کا دورہ کیا۔ اس نے بھارتی وزیراعظم مزارا اندرا گاندھی کو اس حد تک قائل کر لیا کہ 9 دسمبر کو مزارا گاندھی کا یہ منجھکے خیز بیان اخبارات کی شہ سرفی بنا: ”افغان مسئلے پر عالمی برادری کے شور و غوغا نے روس کو افغانستان پر قبضہ برقرار رکھنے پر مجبور کیا ہے۔“

سوویت اور امریکی ہلاک: افغانستان پر روسی حملے کے زمانے میں دنیا واضح طور پر سوویت اور امریکی ہلاکوں میں تقسیم تھی۔ یہ دونوں بڑی طاقتیں پوری دنیا پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ روس کیونکہ نظام کا داعی تھا اور اس لادینی نظام کے فروغ کے لیے ہر سطح پر جدوجہد کر رہا تھا۔ وسط ایشیا میں اسے زبردست کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں اور وسط ایشیا کے بعد اب وہ افغانستان پر بھی قابض ہونے پر تلا ہوا تھا۔ امریکا سرمایہ دارانہ نظام کی بالادستی کا خواہاں تھا اور ساری دنیا میں اس کی سیاسی، عسکری اور اقتصادی قوت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

دنیا کے ہر خطے میں کچھ ممالک امریکی ہلاک میں شامل تھے اور کچھ روسی ہلاک میں۔ برصغیر میں پاکستان، امریکی ہلاک کا ممبر تھا اور بھارت روسی ہلاک کا۔ خلیج میں ایران روس نواز تھا اور عراق امریکا نواز۔ مشرق وسطیٰ میں سعودی عرب، اردن اور بحرین امریکا نواز تھے جبکہ شام روس نواز۔

امریکا کے خدشات: سیاسی اثر و رسوخ اور کامیاب ڈپلومیسی کے لحاظ سے ہمیں اس دور میں امریکا

روس سے کچھ آگے نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود روس کی بے پناہ عسکری طاقت سے خود امریکا خوف محسوس کرتا تھا۔ اس لیے افغانستان میں روسی افواج کی مداخلت سے امریکا کو واضح طور پر خطرات لاحق تھے۔ وہ ایشیائی ممالک جو امریکا نواز تھے اور مستقبل میں امریکن کالونیاں بن سکتے تھے، اگر سوویت روس کے زیر اثر آکر امریکی ہلاک سے نکل جاتے تو نہ صرف امریکا ان تمام مراعات اور فوائد سے محروم ہو جاتا جو اسے ایشیائی علاقوں میں دستیاب تھے بلکہ عالمی تناظر میں وہ چین اور برطانیہ کی طرح ایک دوسرے درجے کی بڑی طاقت بن کر رہ جاتا اور سپر پاور کا مرتبہ صرف روس کے لیے مخصوص ہو جاتا۔ یہ صورت حال امریکا کے لیے قطعاً قابل برداشت نہ تھی۔

جنگ ویت نام کا بدلہ لینے کا موقع: اس سے قبل روس اور امریکا میں سرد جنگ ایک عرصے سے جاری تھی اور دونوں طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے عجیب و غریب حربے آزماتی رہی تھیں۔ امریکا کو "ویت نام" کی جنگ میں ناکامی کا زخم خوب یاد تھا۔ امریکا نے اس جنگ میں پانچ لاکھ فوجی استعمال کیے تھے جن پر یومیہ چالیس بلین ڈالر خرچ ہوتے تھے۔ اتنی بھنگی جنگ کو روس کی مداخلت نے ناکام بنا دیا تھا جس نے ویت نامیوں کو کھلے عام اسلحہ فراہم کیا تھا اور ان کی امریکا کے خلاف لڑائی کو جائز قرار دینے ہوئے ہر سطح پر ان کی حمایت کی تھی۔ اب امریکا یہی سلوک روس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ امریکی کانگریس کے ارکان اس پر متفق تھے کہ مجاہدین افغانستان کی جدوجہد آزادی کی حمایت کر کے روس کے عزائم کو ناکام بنانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے امریکا نے شروع ہی سے روس کی فوجی مداخلت پر شدید تنقید کی تھی اور اپنے زیر اثر ممالک کو بھی روس کے خلاف احتجاجی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے مہاجرین کے لیے بھی کچھ نہ کچھ امداد فراہم کی تھی۔ وہ سفارتی محاذ پر بھی روس کے خلاف ہر مہرہ استعمال کر رہا تھا۔ امریکا کی پالیسیوں کے مطابق مغربی میڈیا چیخ و پکار کو دنیا کو افغانستان میں روسی مظالم کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔

امریکا کے دو تحتفظات: مگر اس کے باوجود امریکا کے گھاگ سیاست دان اب تک میدان جنگ میں مجاہدین سے تعاون کا حوصلہ نہیں کر سکے تھے جس کی وجہ تھیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ امریکا کو امید نہیں تھی کہ مجاہدین روس کو پسپا کر سکیں گے۔ غالب امداد یہی تھا کہ چند ماہ کے اندر اندر روسیہ صورت افغانوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ امریکا کیوزم مخالف تحریک سے اظہار ہمدردی کر کے اپنا اخلاقی مقام بلند کرنا اور روس کا اصل چہرہ دنیا کو دکھانا ضرور چاہتا تھا مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ ایسی جنگ میں کود پڑے جس کی ناکامی طے ہے اور جس میں فتح پانے کے بعد روس امریکا سے شدید انتقام کے درپے ہو سکتا تھا۔

دوسری وجہ افغانوں کی ”اسلام دوستی“ تھی جو اس جنگ کی نظریاتی بنیاد تھی۔ امریکا خواہ مخواہ ایسے ”اسلام دوستوں“ کی مدد کیوں کرتا جو کامیاب ہو جاتے تو افغانستان کو ”اسلامی“ بنا دیتے اور ناکام ہوتے تو امریکا کو ان سے تعاون کا خمیازہ روس سے کھلی جنگ کی صورت میں بھگتنا پڑتا۔

یہی وجہ تھی کہ امریکی صدر جیمی کارٹر کے فوجی سلامتی کے مشیر زنگینو برزنسکی نے جب پاکستان کا دورہ کیا تو صدر ضیاء الحق کو بڑی محدود امداد کی پیش کی تھی اور صدر ضیاء نے اسے ”مونگ پھلی کے دانے“ قرار دے کر مسترد کر دیا۔

1981ء جہاد کا دوسرا سال: 1981ء میں روس کے خلاف افغان مجاہدین کی تحریک جہاد اپنے دوسرے برس میں داخل ہو گئی تھی۔ ان کی کارروائیوں میں روز بروز شدت آتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ”واخان“ کے علاقے میں 900 روسی چھاپہ ماروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ شمالی علاقوں کے صحرائی میدانوں میں مجاہدین قدیم جنگوں کی طرح باقاعدہ گھڑسوار دستوں کی شکل میں روسی افواج پر حملہ آور ہوتے تھے۔ ایک روسی فوجی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:

”مجاہدین کے گھڑسوار دستے ہمیں بالکل بے بس اور مایوس کر دیتے ہیں۔ وہ ہمارے ٹینکوں اور توپوں پر حملہ آور ہو کر ہماری پیش قدمی روک دیتے ہیں۔“

18 جنوری 1981ء کو روس نے 126 ٹینکوں اور ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ وادی پنج شیر پر حملہ کیا۔ احمد شاہ مسعود نے کئی دن کی خونریز لڑائی کے بعد یہ خوفناک حملہ پسپا کر دیا۔ مجاہدین نے بعض علاقوں میں شرعی عدالتیں بھی قائم کر لی تھیں۔ 10 فروری 1981ء کو ایسی ایک عدالت میں چند افغان کیونسٹ افسران کو پیش کیا گیا جنہوں نے خواتین کی آبروریزی کی تھی۔ جرم ثابت ہونے پر انہیں جج عام میں سگسار کر دیا گیا۔

افغان فوج کی حالتِ زار: افغان سرکاری فوج کا مورال بے حد گر گیا تھا، تقریباً 70 فیصد سپاہی فوج سے نکل کر مجاہدین کے ساتھ مل گئے تھے یا سرحد عبور کر کے پاکستان آ گئے تھے۔ سرکاری فوج میں 25 ہزار کے لگ بھگ وہی افراد رہ گئے تھے جو پہلے کیونسٹ تھے یا کسی وجہ سے مجبور تھے۔ فرار ہونے والے سپاہی عموماً اپنی رائفلیں اور کبھی کبھار ٹینک اور توپیں بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ جبراً نئے بھرتی ہونے والے سپاہیوں کے لیے عمر کی حد 21 سال کی بجائے 20 کر دی گئی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ان سپاہیوں کی تربیت کا کوئی معقول نظام نہیں تھا۔ یہ اناڑی سپاہی جب کسی معرکے میں مجاہدین کے دوہوا جاتے تو بلا تامل ہتھیار پھینک دیتے۔ ایک جائزے کے مطابق روس کی مداخلت کے بعد افغان سرکاری افواج میں

جبراً بھرتی کیے جانے والے سپاہیوں کی اکثریت پہلے معرکے میں ہی مجاہدین سے جا ملتی تھی۔
افغان حریت پسندوں کو امداد دینے کا فیصلہ کب ہوا؟ مگر دو سال کی متواتر جنگ کے ان کون
مناظر نے جب نہ صرف امریکا بلکہ ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ مجاہدین افغانستان ناقابل شکست
ہیں، تب امریکا نے مجاہدین کے بارے میں اپنے خیالات تبدیل کیے۔

اب امریکا میں نئی قیادت آچکی تھی۔ 20 جنوری 1981ء کو صدر ریگن نے نئے امریکی
صدر کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ گزشتہ صدر کی بہ نسبت وہ مجاہدین کے حق میں خاصے پرجوش نظر آئے کیونکہ
اب امریکی سیاست دانوں کو افغان مجاہدین کی امداد کے ذریعے روس سے بدلہ لینے میں کامیابی کی
خاصی امید ہو چکی تھی۔ صدر ریگن نے بذات خود پاکستان کا دورہ کیا اور افغان مہاجر خیمہ بستی میں جا کر
مظلوم افغانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

مجاہدین کے اختکافات سے فائدہ اٹھایا گیا: مجاہد تنظیموں کو اب خاطر خواہ امداد ملنے لگی۔ مگر اس
دوران ان تنظیموں کا وہ چہرہ جماعتی اتحاد جو سوویت حملہ کے فوراً بعد وجود میں آیا تھا، عملاً ختم ہو چکا تھا۔
امریکا نے بھی اسے صحیح معنوں میں فعال کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مستقبل کے افغانستان کو "اسلامی
مملکت" نہ بننے دینے کے لیے مجاہدین کا افتراق ضروری تھا۔ اگر وہ متحد ہوتے تو امریکا کو ان سے
سودے بازی میں مشکلات پیش آتیں۔ اب امریکا ضرورت پڑنے پر بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اگر مجاہد
تنظیمیں ایک امیر کے تحت متحد ہوتیں تو ضابطے کے لحاظ سے بیرونی امداد اور فنڈز بھی ایک جگہ جمع ہوتے
اور ضرورت کے مطابق مختلف تنظیموں کو ملتے رہتے۔ اب ہر لیڈر اپنے طور پر امداد لے رہا تھا اور اس لحاظ
سے امریکا اور دوسری روس مخالف طاقتوں سے تعلقات بہتر رکھنے پر مجبور بھی تھا۔ اس صورت حال نے
مستقبل میں مجاہدین کی قربانیوں کے بار آور ہونے میں شدید رکاوٹ ڈالی۔

میڈیا کا انداز بدلی گیا: مجاہدین کو اسلحہ اور مالی امداد کی ترسیل تو شروع ہو گئی مگر حیرت انگیز طور پر مغربی
میڈیا کا رویہ بدل گیا۔ پہلے مجاہدین کی ہر کارروائی بڑی بڑی سرخیوں میں آتی تھی مگر اب ان خبروں کو کبھی نظر
اعمال نہ کیا جاتا اور کبھی کبھار وہیں جگہ دی جاتی۔ اس پالیسی کا اثر ایشیائی میڈیا پر بھی ہوا۔ یہاں بھی
رفتہ رفتہ مجاہدین کی خبروں کی وہ حیثیت نہ رہی جو شروع کے دنوں میں تھی۔ حالانکہ پہلے کی بہ نسبت اب نماز
زیادہ گرم تھے اور کارروائیاں زیادہ تیز تر ہو رہی تھیں۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے افغانستان کی جدوجہد آزادی کی
خبروں کو نمایاں جگہ دینا اخبارات کی پالیسی نہیں رہی یا اسے تقبیح اوقات سمجھا جانے لگا ہے۔

مغربی میڈیا نے ان دنوں ایک اور کام کیا۔ اس نے مجاہد لیڈروں کے مغرب سے تعلقات کی گرم جوشی

اور سردھری کا جاکرہ لے کر انہیں دوصوں میں بانٹ دیا۔ اعتدال پسند اور بنیاد پرست۔ اعتدال پسند وہ تھے جو مغرب اور امریکا کے لیے قابل قبول تھے۔ بنیاد پرست وہ تھے جن سے مستقبل میں اسلامی حکومت کے قیام کا خطرہ لاحق تھا۔ صیحت اللہ مجددی، ہدیر احمد گیلانی اور احمد شاہ مسعود کو پہلے گردہ میں جبکہ مولوی محمد یونس خالص، حکمت یار اور مولانا محمد نبی محمدی جیسے رہنماؤں کو دوسرے گردہ میں شامل کر لیا گیا۔

پاکستانی طیارے کا اغوا: 2 مارچ 1981ء کو پی آئی اے کے طیارے کے اغوا کے ذریعے پاکستان کو ایک بار پھر شدید دباؤ میں ڈال دیا گیا۔ ہائی جیکرز طیارے کو اغوا کر کے کابل لے گئے۔ انہوں نے اپنا تعلق ”الذوالفقار“ نامی تنظیم سے ظاہر کیا اور یرغمال بنائے جانے والے مسافروں کے بدلے 92 افراد کی رہائی کا مطالبہ کیا جو مختلف مقدمات کے تحت پاکستانی جیلوں میں قید تھے۔ کچھ دنوں بعد ہائی جیکرز طیارے کو دمشق لے گئے۔ حکومت پاکستان کے نمائندوں اور ہائی جیکرز کے درمیان مذاکرات کے کئی ادوار کے بعد آخر کار 55 افراد کو جیلوں سے رہا کر کے دمشق پہنچانے کا معاہدہ ہو گیا۔ 15 مارچ کو ان 55 افراد کے بدلے جہاز کے مسافروں کو آزادی مل گئی۔

ہائی جیکنگ کی اس سازش کے پیچھے روس اور کارل انتظامیہ کی سرپرستی کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ کامل ایئر پورٹ پر کارل انتظامیہ ہائی جیکروں کو مکمل تحفظ فراہم کر رہی تھی اور ہائی جیکرز حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ بھی کرتے رہے تھے کہ کارل انتظامیہ کو افغانستان کی جائز حکومت تسلیم کر لیا جائے۔

BMD بکتر بند گاڑی: مجاہدین کو ممکنہ امریکی امداد فراہم ہونے کے خطرے کے پیش نظر روس نے ان دنوں ایک نئی بکتر بند گاڑی تیار کر کے افغانستان میں مصروف پیکار اپنی افواج کے حوالے کی۔ اسے B.M.D کہا جاتا ہے، اس پر 72 ملی میٹر کی توپ تین مشین گنیں اور ٹینک ٹرنک میزائل نصب تھے۔ یہ بکتر بند گاڑی سب سے پہلے لوگر کے علاقے میں استعمال کی گئی جو کہ مجاہدین کے لیے محفوظ کیپ کی حیثیت رکھتا تھا، یہاں مولوی محمد نبی محمدی اور ان کے رفقاء کا ٹھکانہ تھا۔ کابل سے جنوب کی جانب جانے والا ہر کانوائے ان کی زد میں رہتا تھا۔

آخر کار B.M.D بکتر بند گاڑیوں کی مدد سے لوگر پر حملہ کیا گیا۔ کئی دنوں تک خون ریز جھڑپیں ہوتی رہیں۔ مگر مجاہدین کو یہاں سے بے دخل نہ کیا جاسکا۔

صوبہ فراه میں بھی مولوی محمد نبی محمدی کے رضا کار بکثرت تھے۔ یہاں پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج بھیجی گئی جسے فضائیہ کی مدد بھی حاصل تھی۔ مولوی محمد نبی محمدی کے نائب مولوی محمد شاہ نے پندرہ سو مجاہدین

کے ساتھ دشمنوں کا دلیری سے مقابلہ کیا، دس دن تک جنگ جاری رہی، مجاہدین جزوی نقصان اٹھا کر منتشر ضرور ہو گئے مگر حریف افواج کی واپسی کے کچھ دنوں بعد وہ دوبارہ فعال ہو گئے۔

وادئ پنج شیر پر حملے: روسیوں نے وادی پنج شیر پر وقفوں وقفوں سے کئی بڑے حملے کیے، احمد شاہ مسعود نے کامل کوئٹل سے ملانے والی شاہراہ سالانگ کو غیر محفوظ بنایا تھا اس لیے روسی پنج شیر کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ پہلے حملے میں ہیلی کاپٹرز کے ذریعے چھاتہ بردار سپاہی بھی اتارے گئے مگر احمد شاہ مسعود نے دس ہیلی کاپٹرز تباہ کر کے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ دوسرا حملہ بھی ناکام رہا، اس کے بعد احمد شاہ مسعود نے خود آگے بڑھ کر بگرام ایئر پورٹ پر کھڑے روس کے بائیس عدد انٹینوف ٹرانپورٹ طیارے تباہ کر دیے، یہ روس کے لیے ایک بڑا دھچکا تھا۔

غزنی اور کامل میں کارروائیاں: غزنی میں قاری تاج محمد ایک آزاد کمانڈر کی حیثیت سے معروف جہاد تھے۔ ان کے دو ہزار مجاہدین کامل انتظامیہ کی چودھویں ڈویژن کے ساتھ برس بیکار رہے، بعد میں سوویت افواج کا ایک بریگیڈ بھی ان کے خلاف مقابلے میں شامل ہو گیا۔ جس کے بعد غزنی میں مزاحمت کا زور کم پڑ گیا۔

کامل کے قریب مولوی یونس خالص کی تنظیم کے کمانڈر عبدالحق نے زبردست کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ وہ بڑے بڑے کمیونسٹ رہنماؤں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔ خاد کا نائب سربراہ بھی اس کی منصوبہ بندی کے مطابق قتل ہو گیا جس سے کامل انتظامیہ میں مکمل بلی گج گئی۔ عبدالحق کے ساتھی کامل انتظامیہ کو ہراساں کرنے کے لیے کامل کے بجلی گھروں پر حملہ کر کے انہیں ناکارہ بناتے رہے تھے۔ کامل کے قریب کوہ حانی مولوی شفیع اللہ کا مرکز تھا، اس کے ساتھ وہ کامل جلال آباد شاہراہ اور کامل کی سرکاری تھیںات کو نشانہ بناتے رہتے تھے۔

”مارسول“ گھٹائی کی لڑائی: شمالی علاقوں میں ”بلخ“ کے کمانڈر ذبیح اللہ کو خطرناک تصور کیا جاتا تھا، ”مارسول“ کی گھٹائی سے مزار شریف پر اس کے متواتر حملوں نے سوویت افواج کا ناظمہ بند کر دیا تھا۔ کمانڈر ذبیح اللہ کی سرکوبی کے لیے روس نے زبردست تیاریوں کے ساتھ ”مارسول“ گھٹائی پر فضائی حملے شروع کیے، ایک ہفتے تک پہاڑوں پر لگا تار بمباری ہوتی رہی، جب روسیوں کو یقین ہو گیا کہ یہاں سے مجاہدین کا نام و نشان تک مٹ چکا ہو گا تب وہ وادی میں داخل ہوئے۔ مگر مجاہدین ان کے استقبال کے لیے تیار تھے، گھٹائی کی جنگ شروع ہو گئی، حملہ آوروں کو لینے کے دینے پڑ گئے، وہ مارسول کی گھٹائی میں داخل نہ ہو سکے بلکہ ان کو اپنی جان پر بین گئی، آخر کار فضا میں داخلات کر کے روسی سپاہیوں کو باہر نکالا۔

شیر کا بچہ اور شکار: 1981ء کے دوران مجاہدین کو امریکی اسلحہ ملنے لگا، اس اسلحے کی ترسیل کا راستہ پاکستان تھا۔ سب سے پہلے بارودی سرنگیں فراہم کی گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ دیگر انواع و اقسام کا اسلحہ بھی بھیجا جانے لگا۔ یہ اسلحہ صرف امریکی ساختہ نہیں تھا۔ اس میں مختلف ذرائع سے حاصل کردہ روسی ساختہ ہتھیار بھی شامل تھے۔ یہ ان ہتھیاروں کے علاوہ تھے جو مجاہدین کی بولسٹوں اور روسیوں سے مال غنیمت کے طور پر حاصل کرتے تھے۔ مصر کے صدر انور سادات نے ایک موقع پر انکشاف کیا کہ انہوں نے امریکی ایماء پر اپنے اسلحہ خانوں سے روسی ساختہ اسلحے کی بڑی کھپ مجاہدین کے لیے روانہ کی تھی۔ مجاہدین اس اسلحے کی تربیت کہاں حاصل کرتے تھے؟ پاکستانی حکومت سے یہ سوال کئی بار کیا گیا۔ گورنر محمد فضل حق نے اس کا گول مول جواب کچھ یوں دیا: ”بھلی کے بچے کو تیرنا اور شیر کے بچے کو شکار کرنا کون سکھاتا ہے“ مطلب یہ تھا کہ اسلحہ چلانا افغانوں کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ انہیں تربیت کی ضرورت نہیں۔ تاہم روس ہمیشہ یہ شک ظاہر کرتا رہا ہے کہ پاکستانی ایجنسیاں سرحدی علاقوں میں تربیتی کیمپ قائم کر کے مجاہدین کو جدید اسلحہ کا ماہر بنا رہی ہیں۔ ذمینی حقائق کے مطابق روس کا یہ شک درست تھا۔ پاکستان میں آئی ایس آئی کے تحت چلنے والے درجنوں ٹریننگ کیمپوں میں ہزاروں مجاہدین کو تربیت دی جا رہی تھی تاہم یہ نظام اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ روس کبھی اپنے الزامات ثابت نہیں کر پایا۔ میڈیا کے ذریعے پھیلنے والا عام تاثر یہ تھا کہ مجاہدین کو ملنے والا بیرونی اسلحہ امریکا اپنے خرچے پر فراہم کر رہا ہے۔ مگر مجاہدین کے ذرائع کے مطابق اسلحے کے تمام معارف عرب شیوخ برداشت کر رہے تھے۔ امریکا اسلحے کی ہر کھپ کا معاوضہ ان سے وصول کرتا تھا۔

مجاہدین بارودی سرنگیں استعمال کرنے لگے: اپریل 1981ء میں امریکی اسلحے کی پہلی کھپ بارودی سرنگوں کی شکل میں مجاہدین کو پہنچی۔ مجاہدین نے فوراً اس کا بھرپور استعمال شروع کر دیا۔ اب وہ روسی فوجی قاتلوں کو زبردست نقصان پہنچانے اور ان کے راستے میں آنے والے پل اڑا کر ان کی نقل و حرکت دشوار کرتے رہے۔

مئی میں موسم گرما کی آمد کے ساتھ ہی مجاہدین نے زوردار حملے شروع کر دیے۔ انہوں نے 7 مئی کو جلال آباد ایر پورٹ پر ایک حملے میں 9 روسی طیارے اور پانچ ٹینک تباہ کر دیے۔ اس معرکے میں بیسیوں روسی اور کمیونسٹ سپاہی ہلاک ہوئے۔ انہی دنوں قندھار میں خون ریز معرکہ ہوا جو کئی دن جاری رہا۔ اگرچہ مجاہدین نے 700 کے لگ بھگ روسی اور کارل سپاہی ہلاک و زخمی کیے جبکہ روسیوں کی فضائی بمباری سے سینکڑوں شہری جاں بحق ہو گئے۔ مجاہدین کی گرفت بعض علاقوں میں اتنی مضبوط تھی کہ

وہ عارضی طور پر شہروں اور قصبوں پر قبضہ بھی کر لیتے تھے۔

وزیراعظم کشمند: ادھر کارل حکومت کی ناکامی ساری دنیا پر واضح ہو چکی تھی، اس لیے روسی حکام بہرک کارل کے متبادل پر غور کرنے لگے تھے۔ جبکہ کارل انہیں کسی بھی قیمت پر اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر ابتدائی مرحلے کے طور پر بہرک کارل کے ”نام نہاد اختیارات“ مزید کم کر دیے گئے اور پارلیمانی امور کی زمام کو تھامنے کیلئے ایک نیا مہرہ سامنے لایا گیا یہ ”سلطان علی کشمند“ تھا۔ 11 جون 1981ء کو اسے افغانستان کا نیا وزیراعظم مقرر کر دیا گیا۔ بہرکف کارل یا سلطان علی دونوں کھ پکے تھے، اصل فریق روسی اور مجاہدین تھے۔ جن میں کانٹے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

روس کا ایٹمی دھماکا: افغانستان کی صورتحال نے عالمی سطح پر روس کا دبہ خاک میں ملادیا تھا۔ ماسکومیں اعلیٰ سطحی اجلاسوں میں غور کیا جا رہا تھا کہ کس طرح اپنی قوت و دبہشت کا سکہ دوبارہ جمایا جائے اس کے علاوہ، امریکا کا مجاہدین سے تعاون بھی کھل کر سامنے آچکا تھا جو کہ روس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجاہدین کو امریکی بارودی سرنگیں ملنے کے کچھ ہی دنوں بعد روس نے 23 اپریل 1981ء کو زیر زمین ایٹمی دھماکا کر کے گویا دبے لفظوں میں امریکا اور افغان جنگ میں اس کے حامیوں کو ایک تنبیہ کی تھی۔

ٹائٹروجن بم کا استعمال: اس کے ساتھ ہی روس نے مجاہدین کے خلاف ٹائٹروجن بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، 27 مئی کو مجاہدین کے ٹھکانوں پر پہلے قسم کے ٹائٹروجن بم برسائے گئے جن سے وہاں موجود 18 مجاہدین کی لاشیں ناقابل شناخت حد تک سخ ہو گئیں..... اس تجربے کے بعد 11 اگست 1981ء کو روس نے دنیا میں پہلی بار ”ٹائٹروجن بم“ کا تجربہ کر ڈالا اور یوں امریکا پر سبقت حاصل کر لی۔ روس کی اس کارروائی کو دنیا بھر میں سخت تشویش کی نظر سے دیکھا گیا۔ امریکی صدر رونالڈ ریگن نے خاص طور پر اس صورتحال سے دونوں بڑی طاقتوں میں ایٹمی جنگ چھڑ جانے کا خطرہ محسوس کیا۔ روس کا پلہ بہر حال بھاری تھا۔ علاوہ ازیں خبر رساں ذرائع بتاتے تھے کہ سوویت یونین میں ذخیرہ کردہ کیمیائی ہتھیاروں کی مقدار 73 لاکھ ٹن کے لگ بھگ ہے، یہ مقدار امریکن ذخائر سے 8 گنا زائد تھی۔

بھارت کو اسلحے کی ترسیل: روس نے اپنے ہلاک کو مضبوط کرنے کے لیے اگست کے اواخر میں بھارت کو جدید ترین 25 طیارے بھی فراہم کر دیے تھے جو کہ 60 ہزار فٹ کی بلندی پر 8 سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کر سکتے تھے۔ یہ خبر بھی ذرائع ابلاغ کا موضوع بنی ہوئی تھی کہ روس نے امریکا کے ایٹمی ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ ان حالات میں نوجانب امریکی صدر ریگن نے ایک طرف تو روس کو ایٹمی میزائلوں پر مکمل پابندی کا منصوبہ پیش کش کیا۔ دوسری طرف پاکستان کو روس اور

بھارت کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایف 16 طیارے فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ ایٹمی میزائلوں پر پابندی کا منصوبہ روس نے مسترد کر دیا جبکہ پاکستان کو ایف 16 طیارے کی فراہمی میں خود اسریکا تحفظات کا شکار ہو گیا حالانکہ پاکستان کو ان کی شدید ضرورت تھی۔ تقریباً ہر ہفتے روسی اور افغان جنگی طیارے پاکستانی سرحدوں میں بھی گھس کر کارروائیاں کر رہے تھے اور پاکستان ان کی روک تھام سے عاجز تھا۔

پاکستان کی مشکلات: ستمبر 1981ء تک افغانستان سے 62 بار پاکستان کی سرحدی حدود اور 35 بار فضائی حدود کی خلاف ورزی کی جا چکی تھی۔ یہ شرح روز بروز بڑھتی گئی۔ صرف ماہ نومبر میں افغان سرکاری افواج نے 23 بار پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کی۔ پاکستان کے پُر زور احتجاج پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس ماہ جنرل اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں پاکستان نے افغانستان سے سوویت افواج کے انخلا کی قرارداد پیش کی جسے بھاری اکثریت کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ افغان جنگ پاکستان کے لیے ایک ناقابل برداشت بوجھ تھی۔ بعض حلقوں اور ملک کی طرف سے پھیلایا جانے والا یہ تاثر سراسر غلط تھا کہ پاکستان امدادی فنڈز کو اپنی معیشت کے استحکام کے لیے بڑی کامیابی سے استعمال کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ سے پاکستان کو معاشی استحکام تو کیا حاصل ہوا! اس کی اقتصادی بربادی میں رہی سہی کسر بھی نکلتی جا رہی تھی۔

افغانوں کے لیے امدادی فنڈز میں بعض افسران ذاتی مفادات کے لیے خرد برد کرتے ہوں گے مگر یہ رقم پاکستانی معیشت کی ترقی کے لیے ہرگز استعمال نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ بیرونی امداد کے تمام ذخائر مل کر بھی مہاجرین کی ضروریات کے لیے کافی نہیں تھے۔ حکومت پاکستان بہر صورت اس مد میں اپنے خزانے سے خطیر اخراجات خرچ کرنے پر مجبور تھی جو کہ کل بیرونی امداد کے برابر تھے۔ پاکستان جیسے غریب ملک کے لیے یہ بہت بڑا استحسان تھا..... بلاشبہ ایک عظیم قربانی تھی جس کے پیچھے اسلامی اخوت کا عالمگیر جذبہ کارفرما تھا۔

یہ بات بھی واضح تھی کہ افغانستان کا جہاد پاکستان کی بقا کے لیے ناگزیر تھا اور مہاجرین کی کفالت سے بے فکر ہوئے بغیر مجاہدین میدانوں میں قدم نہیں جما سکتے تھے۔ سو پاکستان بڑی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ یہ ذمہ داری نبھاتا رہا۔ دسمبر 1981ء تک پاکستان میں افغان مہاجرین کی تعداد 20 لاکھ سے بڑھ چکی تھی۔ یہ بے سرو سامان لوگ اپنے پیچھے 10 لاکھ عزیزوں، رشتہ داروں اور ہم وطنوں کی لاشیں چھوڑ کر آئے تھے۔

1982ء کا ہر شاہ، ولی خان اور باجیا خان: 1982ء کے دوران افغان مجاہدین کی مسلسل کامیابیوں سے دنیا کو روس کی جلد یا بدیر واپسی کا یقین ہونے لگا تھا۔ چنانچہ مختلف اہم شخصیات نے

مستقبل کے افغانستان میں اپنا کردار محفوظ رکھنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ افغانستان کے سابق حکمران کاہر شاہ نے اعلان کیا کہ وہ افغانستان واپس آ کر مجاہدین کے شانہ بشانہ روس سے لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر مجاہدین نے اس بیان کو بدعتی پر محمول کیا۔ مجاہد رہنما عبدالرب رسول سیاف نے متنبہ کیا کہ اگر کاہر شاہ افغانستان واپس آئے تو انہیں قتل کیا جاسکتا ہے۔

ادھر پاکستان کے سیاسی رہنما خان عبدالولی خان 18 مارچ 1982ء کو کابل میں ببرک کارمل سے ملے اور پاک افغان تنازعات کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ جبکہ ان کے والد سردار محمد علی خان عبدالغفار خان نے 19 اگست کو اپنے بیان میں اپیل کی کہ مجاہد رہنما ان کے ساتھ مل کر بات چیت کریں تاکہ افغانستان میں جاری جنگ کا پراسن حل نکالا جاسکے۔

کالم برزنیف چل بسا: امریکی صدر رونالڈ ریگن کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح روس سے ایٹمی جنگ کا خطرہ اور افغانستان کا قضیہ ختم ہو جائے۔ انہوں نے مئی 1982ء میں روسی صدر برزنیف کو اس ٹرڈ پر باہمی منابہت کی پیش کش کی کہ روسی افواج افغانستان سے واپس چلی جائیں تاہم روس کا رویہ متغی رہا۔ اس سال کے آخر میں روس پر 18 سال تک حکومت کرنے والا حکمران لیونڈ برزنیف 10 نومبر 1982ء کو 75 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ برزنیف ایک انتہا پسند انسان تھا، اس نے افغانستان میں لاکھوں مسلمانوں کا خون بہایا جس کے وجہ ہمیشہ اس کے دامن پر رہیں گے۔ برزنیف کے بعد سوویت خفیہ ایجنسی کے جی بی کے سابق سربراہ آندرے پوف کو پہلے پارٹی کا سیکرٹری جنرل اور پھر روس کی سپریم پریزیڈنٹ کا رکن مقرر کر دیا گیا۔ 1982ء کے اواخر اور 1983ء کے اوائل میں آندرے پوف کی حیثیت صدر کی نہیں تھی لیکن عملاً برزنیف کی جگہ وہی روس کا سربراہ تھا۔

آندرے پوف کے مطالب: آندرے پوف نے برزنیف کی پالیسی کو جاری رکھا۔ اس نے 24 اپریل 1983ء کو ایک بیان میں واضح کر دیا کہ روس افغانستان سے لائق نہیں رہ سکتا۔ اس نے تخفیف الملحہ سے متعلق صدر ریگن کی تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔ اس کے برسر اقتدار آنے کے بعد روسی افواج نے نقا شدت سے افغانوں پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا۔ روسی حیلاروں نے ایک بار پھر دیہاتوں پر اندھا دھند بمباری کا خونیں سلسلہ شروع کر دیا جس سے ہزاروں عورتیں، بچے اور بوڑھے شہید ہو گئے۔ بستوں کی بستیوں ملیا میٹ ہو گئیں۔

یہ مثال زیادہ تر پاکستانی سرحد کے قریب واقع افغان صوبوں میں ڈھائے جا رہے تھے۔ غالباً روس کی شش یہ تھی کہ ان دیہاتوں کو جو مکمل طور پر سرحدی پٹی پر مجاہدین کی پناہ گاہیں بن سکتے تھے، بالکل ختم کر دیا

جائے تاکہ مجاہدین کے رہنے، چھپنے اور عام آبادی میں گھل مل کر محفوظ ہو جانے کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ روسی گن شپ ہیلی کاپٹروں نے دیہی علاقوں پر خوفناک پروازیں بڑھادی تھیں۔ وہ آفاتنا نمودار ہوتے اور آبادیوں کو آگ کے شعلوں میں تبدیل کر دیتے۔ صوبہ لوگر خاص طور پر ان سے شدید متاثر تھا۔ گن شپ ہیلی کاپٹر پہاڑی گھاٹیوں اور گہری کھائیوں سے یکدم نمودار ہوتے، مقامی لوگوں کو ان کی گھن گرج اس وقت سنائی دیتی جب وہ خاصے قریب آ جاتے تھے۔ لوگوں کو پناہ گاہوں میں چھپنے کے لیے بمشکل دواڑھائی دینا پڑتی تھی، اس دوران جو کسی غار یا سرنگ میں کود جاتا وہ فوج جاتا، باقی سب القسام جمل بن جاتے۔

کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال: یہ گن شپ ہیلی کاپٹر اب کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کر رہے تھے۔ 20 دسمبر 1982ء کو (آندرے یوف کے برسرِ اقتدار آنے کے ایک ماہ بعد) ایک علاقے میں ان کی کیمیائی بمباری سے 184 افراد شہید ہو گئے، ان میں عورتوں اور بچوں کی اکثریت تھی۔ ایک روسی سپاہی کاسلوف نے جو فرار ہو کر مجاہدین سے جا ملا تھا، سرخ افواج کے کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کی تصدیق کی تھی۔ اس نے بتایا کہ غور بند میں ایک کارروائی کے دوران میں نے فوج کو کیمیائی ہتھیار استعمال کرتے دیکھا، کیمیائی بموں کے گرنے سے زمین سرخ ہو جاتی تھی۔

1983ء مجاہدین کی کارروائیاں: سوویت مظالم بڑھتے گئے مگر مجاہدین کی ہمت دھوٹے کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچی۔ روسی بحیثیت کا ہر مظاہرہ ان کے جذبہ جہاد کو بلند تر کر دیتا تھا۔ 1982ء اور 1983ء کے درمیان انہوں نے لگا تار کارروائیاں جاری رکھیں۔ ”نورستان“ سے روسی افواج کا صفایا کر کے وہاں شرعی احکام کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ مولوی افضل کو اس شرعی ریاست کے وزیر اعظم کا عہدہ دے دیا گیا۔ جنوری 1983ء میں مجاہدین کے ایک ترجمان کمانڈر فاروق نے ذرائع ابلاغ سے گفتگو کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ افغانستان کے 95 فیصد رقبے پر مجاہدین کا تسلط ہے۔ 23 فروری 1983ء کو کابل میں سرخ افواج کی 65 ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ مجاہدین نے اس سے دو دن پہلے ہی کابل کی سرکاری عمارتوں اور سوویت دفاتر پر اتنے راکٹ برسائے کہ تقریب سالگرہ کے انتظامات درہم برہم ہو گئے۔ کئی اہم شخصیات تباہ ہو گئیں۔ ایندھن کے ذخائر ضائع ہو گئے۔ روسی اور کارل سپاہیوں کی خاصی تعداد ہلاک و زخمی ہو گئی۔ مئی میں ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ کارل فوج کا ایک یونٹ 97 ٹینکوں سمیت مجاہدین سے آملا۔ اگرچہ مجاہدین ٹینکوں سے کوئی فوری فائدہ حاصل نہیں کر سکتے تھے مگر یہ واقعہ کارل سپاہ کا مورال گرانے کے لیے کافی تھا۔

اس موسم گرما میں مجاہدین کو امریکا سے بھاری ہتھیار بھی ملنے لگے۔ ان ہتھیاروں میں طیارہ شکن توپیں

بھی تھیں۔ اس سے پہلے وہ روسی طیاروں کے مقابلے میں صرف امریکی 7MM-12 کی مشین گنز ہی استعمال کر رہے تھے جو قطعاً کافی تھیں۔ طیارہ شکن توپوں کے آنے سے مجاہدین روسی طیاروں کا بہتر انداز میں مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے۔ انہیں ان جدید ہتھیاروں کی تربیت حاصل کرنے میں ذرا وقت تو لگا مگر جب وہ انہیں چلانا سیکھ گئے تو دنیا کو حیرت انگیز نتائج حاصل کر کے دکھائے۔

جنرل اسبلی میں روسی انخلا کی قرارداد: ادھر 17 جون 1983ء کو آندرے پوف باقاعدہ طور پر سوویت یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس پر افواج کی واپسی کے لیے عالمی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ خود اس کے حلیف بھارت کی وزیراعظم اندرا گاندھی روسی افواج کو واپسی کا مشورہ دے رہی تھیں۔ جولائی 1983ء میں چین نے افغان قذافی کے حل کے لیے ثالثی کی پیش کش کر دی۔ عالم اسلام کے مختلف ممالک زور دیتے رہے کہ افغان مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے ذریعے حل کیا جائے۔ آخر ستمبر 1983ء میں مسئلہ افغانستان کو جنرل اسبلی کے ایجنڈے میں شامل کر لیا گیا۔ دو ماہ بعد 25 نومبر کو جنرل اسبلی میں روسی افواج کے انخلا کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔

روس کی ہٹ دھرمی: مگر روس اب تک اپنی ضد پر ڈٹا ہوا تھا۔ اگرچہ افغانستان میں اس کے یومیہ آٹھ کروڑ ڈالر خرچ ہو رہے تھے جو ایک خطرناک رقم تھی مگر ہمیشہ فتح یاب ہونے والا سرخ رینجہ اتنی جلدی ہار ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے عسکری اخراجات پورے کرنے کے لیے انتہائی اقدامات سے بھی گریز نہیں کیا۔ مارچ 1982ء کے دوران روس نے اپنے محفوظ سونے کے ذخائر سے 60 ٹن سونا فروخت کر دیا تھا جس سے عالمی منڈی میں سونے کے بھاؤ گر گئے۔ اس قدر زبردست اقتصادی نقصان برداشت کرتے ہوئے روس افغانستان کو بھنبھوڑتا رہا اور افغانوں کو زیر کرنے کے لیے نئے منصوبے بناتے ہوئے بے تحاشا دولت لٹاتا رہا۔ 1983ء کے اواخر میں اس نے دریائے آمو پر ایک بڑا پل تعمیر کرا کے افغانستان میں افواج اور اسلحے کی ترسیل آسان بنادی۔

روس کے ترقیاتی کاموں کی حقیقت: روسی افواج کی مداخلت کے بعد افغانستان کی معاشی و اقتصادی حالت تباہ ہوتی جا رہی تھی۔ صنعت کار اور مزدور ملک چھوڑ کر ہجرت کر رہے تھے۔ افغانستان کی یہ تباہ حالی خود روس کے لیے انتظامی مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ خصوصاً ذرائع توانائی اور مواصلات کی کمزوری اس کی عسکری مہمات کے لیے نقصان دہ تھی۔ چنانچہ اس نے کئی اہم اقدامات کیے اور کئی تعمیراتی کاموں کا آغاز کیا۔ ہوائی اڈوں کی توسیع کی۔ کابل اور جلال آباد جیسے بڑے شہروں کی اندرونی سڑکوں اور بعض بڑے شہروں کو ملانے والی شاہراہوں کو از سر نو تعمیر کیا۔ نئے بجلی گھر اور ہسپتال قائم کیے۔

زکوں، فوجی گاڑیوں اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کی سہولت کے لیے ان گنت درکشاپ کھلوائے۔

کئی اشتراکی ملکوں نے روس کے ساتھ افغانستان کے ان تعمیری و ترقیاتی کاموں میں دلچسپی لی۔ چیکو سلواکیہ نے آب پاشی کے نظام کی تجدید کے لیے قرضے دیے۔ مشرقی جرمنی نے بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے پلانٹ مہیا کیے۔ بلغاریہ نے آٹھ ٹیلی فون ایکسچینج فراہم کیے۔ روس کے ان اقدامات کا فائدہ صرف بڑے شہروں کو تھا جہاں اس کے کارندے اور سرکاری اہلکار آباد تھے۔ افغان عوام ان سہولتوں سے برائے نام استفادہ کر رہے تھے۔

ہیروئن کی تجارت: افغانوں کے اصل مسائل جوں کے توں تھے بلکہ ان میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بے روزگاری، خانہ بربادی، غربت، بھوک و افلاس اب عجیب عجیب شکلیں اختیار کر کے اجتماعی مسائل کو جنم دے رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ دنیا میں ”ہیروئن“ جیسے خطرناک نشہ کا چرچا ہوا۔ افغان مہاجرین کے جرائم پیشہ افراد کے علاوہ وہ لوگ بھی جو غربت و افلاس سے تنگ آ چکے تھے ہیروئن فروشی کا دھندا کرنے لگے تھے۔ اس صورت حال سے مہاجرین کو پناہ دینے والا پاکستان شدید متاثر ہوا۔ چند سالوں میں یہ خطرناک نشہ ملک کے کونے کونے میں پھیل گیا۔ پھر یہ سلسلہ یہیں نہیں رکا۔ دنیا بھر میں اس کی منڈیاں کھل گئیں۔ ہیروئن کے تاجروں کے دارے نیارے ہو گئے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کروڑ پتی بن گئے۔ بڑے بڑے جرائم پیشہ افراد، انڈورلڈ کے ڈان اور بدعنوان حکومتی عہدے دار اس قبیح کاروبار میں شامل ہوتے گئے۔ پاکستان جہاں اکا دکا شرابی اور ایفونی نظر آتے تھے، ہیروینچروں کا گڑھ بن گیا۔ مغربی صحافت نے اس معاملے کو اتنا اچھالا کہ بیرون ملک سفر کرنے والے ہر پاکستانی کو ہیروئن کا تاجر تصور کر کے شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

کلاشن کوف کلچر: لٹے پٹے افغانوں کے پاس ہیروئن کے بعد دوسری شے جسے فروخت کر کے وہ اپنا پیٹ پال سکتے تھے، اسلحہ تھا۔ یہ اسلحہ زیادہ تر روسی ساخت کا ہوتا تھا جسے مجاہدین معرکوں میں دشمن سے جیتنے تھے۔ ضرورت سے زائد اسلحہ فروخت ہونے پاک افغان سرحد کے بازاروں میں آ جاتا تھا۔ اس صورت حال سے جرائم پیشہ افراد کی بن آئی۔ پاکستان میں پہلی بار ”کلاشن کوف کلچر“ متعارف ہوا۔ سیاسی، گروہی، لسانی اور فرقہ واریت کی لڑائیوں میں ایک دوسرے کی جان لینا معمول بن گیا۔

روس کی نئی حکمت عملی: 1983ء میں مجاہدین کے اتحاد اور تنظیم میں غیر معمولی بہتری نظر آئی۔ ان کے ذاتی اختلافات اور رقابتیں پس منظر میں چلی گئیں اور وہ اکثر محاذوں پر مشترکہ اعزاز میں حریف کا مقابلہ کرتے دکھائی دیے۔ سات جماعتی اتحاد ایک بار پھر فعال ہو گیا۔ اشتراک عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجاہدین نے کئی علاقوں

میں روس اور افغان افواج کو محاصرے میں لے لیا۔ ارفون اور دوست کا محاصرہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں طویل عرصے تک جنگ جاری رہی۔ روسیوں کے لیے شاہراہوں کی حفاظت اور ان پر سفر کرنا بڑا مشکل تھا۔ وہ مجاہدین کے تندہ تیز حملوں کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے انہوں نے شاہراہوں کی مستقل حفاظت کے انتظامات کیے۔ دروازوں، چوراہوں اور اہم مقامات پر مضبوط فوجی بکتر اور سورہے بنائے۔ ہاں ہماری تعداد میں سپاہی تھینا کر دیے گئے۔ کامل انتظامیہ کو 15 سوئٹزرلینڈ کے کئے تاکہ تباہ شدہ گاڑیوں کا متبادل موجود رہے۔ ہر تانے کے ساتھ گن شپ ہیلی کاپٹروں کی پرواز لازمی قرار دی گئی۔ کمران تمام حفاظتی اقدامات کے باوجود مجاہدین روسی تانوں پر حملے کرتے رہے۔

نضائی بمباری کی کثرت: روس نے میدانِ فوج کی بجائے اب فضائی طاقت کو زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا۔ پہلے نضائیہ صرف دیہاتوں پر بمباری کرتی تھی، اب مجاہدین کے مورچوں کو نشانہ کر کے انہیں اندھ بے ہوش کرنا شروع کیا۔ نضائیہ بمباری کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ کامل کے شمال کی ایک شاہراہ مجاہدین کے قبضے میں تھی۔ روسیوں نے وہاں ان گنت ہلیاروں کے ساتھ حملہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہلیاروں کی کثرت کے باعث آسمان چھپ گیا تھا۔ اس علاقے کے چپے چپے پر اتنی بمباری کی گئی کہ مجاہدین کے مورچے، کھیت، دیہات، سڑکیں، پل..... سب بے نام و نشان ہو گئے۔ شکر درہ اور استالیف کو اس طرح تباہ کیا گیا کہ ایک ذی روح بھی بچنے نہ پایا..... سب کچھ آنا تانے کا ڈھیر بن گیا۔

شرمتاک مظالم: افغانوں پر روس کے ہولناک مظالم کی داستانیں اب باقاعدہ رپورٹوں کی شکل میں میڈیا پر آتی جا رہی تھیں۔ پیرس اور اسلو میں ان لرزہ خیز واقعات پر باقاعدہ کام ہوا جو انسانی حقوق کی شرمناک خلاف ورزیوں پر مبنی تھے۔ 13 مارچ 1983ء سے 16 مارچ تک ایک غیر جانبدار عدالت میں افغانستان سے جان بچا کر نکلنے والے مختلف لوگوں نے چشم دید شہادتیں پیش کیں۔ کامل پولیس کے ایک اعلیٰ افسر محمد ایوب نے عدالت میں بتایا کہ ہماری وزارت داخلہ مکمل طور پر روسیوں کے قبضے میں ہے۔ ہر کام ان کی منشا کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اس نے بتایا کہ صرف وزارت داخلہ مکمل 12 ہزار سے زائد افراد کو بدترین تشدد کے ذریعے ہلاک کر چکی ہے۔ تشدد کے طریقوں میں بجلی کے جھکے دینا، کئی کئی راتوں تک بے گم رکھنا، قیدیوں پر کتے چھوڑ دینا، والدین کی آنکھوں کے سامنے ان کے بچوں کو تختہ مشق بنانا اور عورتوں کی عصمت دری کرنا معمول باتیں ہیں۔ اس نے بتایا کہ سوویت سپاہی ”انسانی شکار“ کے پروگرام بنا کر آبادیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ پہلے بمباری کی جاتی ہے، جب دیہاتی مکانات سے نکل کر بھاگتے ہیں تو باقاعدہ شکار شروع ہوتا ہے۔ فکری گن شپ ہیلی کاپٹروں میں ہوتے ہیں اور نیچے

پرداز کے ذریعے بھاگتے ہوئے خوفزدہ انسانوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے چلے جاتے ہیں۔

مختلف افغان باشندوں نے بتایا کہ انہیں معمولی خشک و شیبے کی بنیاد پر دو دو ہفتے مسلسل کھڑا رکھا گیا، بجلی کے شاک دیے گئے۔ زہریلی ادویات کھلائی گئیں۔ ایک شخص نے بتایا کہ روسیوں نے ایک آٹھ سالہ بچے سے مجاہدین کا اتنا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی، جب اس نے زبان نہ کھولی تو اس پر بیٹرول چھڑک کر زعمہ جلادیا گیا۔ بعض دیگر اداروں کی رپورٹوں کے مطابق مارچ 1983ء تک سوویت افواج افغانستان میں دس لاکھ افراد کو شہید کر چکی تھیں۔ ایک لاکھ سے زائد افراد وہاں سیاسی قیدیوں کی حیثیت سے زندانوں میں گل سڑ رہے تھے۔ روسی 72 ہزار افغان بچوں کو ذہنی غسل دے کر کیونسٹ بنانے کے لیے ماسکو لے جا چکے تھے۔ جبکہ 27 لاکھ افغان پاکستان میں پناہ گزینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی کفالت پر دس لاکھ ڈالر یومیہ خرچ ہو رہے تھے جن کا نصف حصہ پاکستان ادا کر رہا تھا۔

روس پاکستان کو اس ”مسلم دوستی“ کی سزا دینے کے لیے نئی سازشوں میں مصروف تھا۔ وہ دوسو پاکستانی نوجوانوں کو ماسکو میں دہشت گردی کی تربیت دے رہا تھا تاکہ ان کے ذریعے پاکستان کے امن و امان کو تہہ و بالا کیا جاسکے۔

احمد شاہ مسعود اور روس کی جنگ بندی: یہ پورا سال حملہ آوروں کے لیے اس لحاظ سے اطمینان بخش تھا کہ مجاہدین کے اہم کمانڈر احمد شاہ مسعود اور سوویت یونین کے درمیان ایک سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا تھا۔ دیگر مجاہد تنظیمیں احمد شاہ مسعود کے اس فیصلے کو غداری سے تعبیر کرتی تھیں مگر احمد شاہ مسعود کے حامیوں کے نزدیک یہ فیصلہ درست تھا۔ ان کے بقول وادی پنج شیر چار سالہ جنگ میں روس کے مسلسل حملوں کے باعث بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہو چکی تھی۔ کمیت تباہ ہو گئے تھے اور مجاہدین کے لیے باہر سے غلہ منگوانا پڑ رہا تھا۔ دشمن سے وقتی صلح کر کے احمد شاہ مسعود مقامی نظم و نسق کو بہتر بنانا، بنیادی ضروریات کا انتظام کرنا اور مجاہدین کو از سر نو تربیت دینا چاہتا تھا۔

بہر کیف اس معاہدے کا سب سے بڑا فائدہ روس کو ہوا۔ کیونکہ دریائے آمو سے کابل تک پہنچنے والی شاہراہ احمد شاہ مسعود کے علاقے سے گزرتی تھی۔ یہاں مجاہدین کی کارروائیاں بند ہو جانے سے روس کا کابل سے براہ راست زمینی رابطہ بحال ہو گیا۔

1984ء کے اہم واقعات: اس کامیابی کو سوویت یونین نے اگلے برس مزید فتوحات کا ذریعہ بنایا۔ 1984ء کے آغاز ہی میں ارغون میں محصور سوویت اور افغان سپاہیوں نے زبردست جنگ کے بعد مجاہدین کا محاصرہ توڑ دیا۔ اس معرکے میں چھ سو مجاہدین شہید ہوئے تھے۔ (یہ تعداد روسی ذرائع کے

مطابق ہے) مجاہدین کے نقصانات کا بڑا سبب وہ بارودی سرنگیں تھیں جو ازخون کے ارد گرد چپے چپے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کامیابیوں سے ہیرک کارل کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اب وہ اپنی تقاریر میں نہایت غرور و تکبر کے ساتھ اپنی فتوحات کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ اپنی افواج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اس نے ان کی تنخواہیں دوگنا کر دیں اور مجاہدین کو بڑی بڑی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ پاکستان پر بھی رعب جماڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ جون 1984ء میں ایک دھمکی آمیز بیان کے دوران اس نے کہا: ”ہمارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ ہم پہاڑوں کو پگھلا سکتے ہیں۔“ افغان طیارے کھلم کھلا پاکستانی حدود کی خلاف ورزی کر کے بمباری کرنے لگے تھے۔

افغان طیاروں کے پاکستان پر حملے: 14 اگست 1984ء کو جبکہ پاکستان میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا افغان طیاروں نے چوبیس گھنٹے کے اندر دوبار سرحدی حدود کی خلاف ورزی کر کے آبادی پر بمباری کی جس سے یوم آزادی منانے والے 13 پاکستانی شہری جاں بحق ہو گئے۔

مجموعی طور پر 1980ء سے 1984ء کے آغاز تک صرف چار سال کے دوران افغان طیارے 411 بار پاکستان کی حدود کی خلاف ورزی کر چکے تھے مگر پاکستان ہمسائیگی کا لحاظ کر کے صبر تحمل کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اس سلسلے کا سب سے روح فرسا واقعہ 29 ستمبر 1984ء کو پیش آیا جب افغان طیاروں نے کرم ایجنسی کے پزرونی بازار پر اندھادھند بمباری کر کے تقریباً 200 افراد کو شہید اور کروڑوں روپے کی مالیت کا تجارتی سامان تباہ کر دیا۔ اس خوفناک بمباری کے نتیجے میں سینکڑوں دکانیں جلے کا ڈھیر بن گئیں اور کئی عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔

آندرے پوف کی موت، چرنکو کا اقتدار: اس سال سویت یونین کی قیادت ایک بار پھر تبدیل ہوئی۔ برزنیف کے جانشین آندرے پوف کو زیادہ مہلت اقتدار نہ مل سکی اور وہ 11 فروری 1984ء کو فوت ہو گیا۔ اس کی عمر 69 برس تھی۔ 12 اپریل کو ”چرنکو“ نے سوویت یونین کے نئے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔

بیج شیر پر ساتواں حملہ: ادھر احمد شاہ مسعود نے ایک سالہ جنگ بندی کی مدت ختم ہوتے ہی شاہراہ سالانگ پر ایک بار حملے شروع کر دیے تھے۔ احمد شاہ مسعود نے روس کی پیش کش کے باوجود ناکہ بندی میں توسیع سے انکار کر دیا تھا۔ آخر روس نے پندرہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک بڑی فوج بیج شیر پر حملے کے لیے روانہ کر دی۔ یہ وادی بیج شیر پر ”ساتواں بڑا حملہ“ تھا۔

روس کے U-16 طیارے وادی بیج شیر پر کارپٹ بمباری کے لیے نہایت بلندی پر غور و

تھے۔ پہلی کانپٹروں پر چھاتہ بردار فوج بھی تیار تھی۔ فضا سے اندھا دھند بمباری شروع ہوئی تو مجاہدین کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ سوویت توپ خانہ اور بکتر بند گاڑیاں آگے بڑھتی رہیں۔ بیخ شیر کی گھائیوں میں کئی مقامات پر جھڑپیں ہوئیں جن میں فریقین کا خاصا جانی و مالی نقصان ہوا۔ آخر کار احمد شاہ مسعود نے جنگی حکمت عملی کے تحت پہاڑ کی چوٹیوں اور بظنی وادیوں میں پناہ لے لی۔ سوویت چھاتہ بردار دستے ’علی تنگ‘ اور ’اندراب‘ میں لڑتے رہے۔ چند دنوں کے اس معرکے بعد کابل ریڈیو نے احمد شاہ مسعود کی مکمل شکست اور بیخ شیر پر سرکاری کا اعلان کر دیا۔ جلد ہی ببرک کارمل نے خود بیخ شیر کا دورہ کر کے دنیا کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہاں سے احمد شاہ مسعود کا قبضہ ختم ہو چکا ہے۔ تاہم احمد شاہ مسعود اور اس کے جانناز جو بیخ شیر کی آبادی سے ہٹ کر پہاڑوں اور وادیوں میں موجود تھے اور اس کے بعد بھی متحرک اور فعال رہے۔ روس کی مزید کارروائیاں: چونکہ بیخ شیر کی اس جنگ میں سوویت چھاتہ برداروں کا خاص کردار تھا اس لیے اس معرکے کے بعد افغانستان میں چھاتہ بردار افواج کی طلب میں اضافہ ہو گیا۔ ان کی بڑی تعداد افغانستان پہنچنے لگی، روس نے ایک نئی اسٹیشنل فوج ”سوویت ایراسالٹ بریگیڈ“ بھی تشکیل دے ڈالی۔ خوفناک حد تک بے رحم ”اسپیٹر ناز“ دستے بھی تیار کیے جو مجاہدین کے بھیس میں دیہاتوں پر حملے کرتے تھے اور ان مظالم کی ذمہ داری مجاہدین پر ڈال دیتے تھے۔

احمد شاہ مسعود کی کارروائیوں کا جواب دینے کے لیے روس نے ایک بار پھر بڑے فضائی حملے کے لیے ماہ ستمبر میں عید الاضحیٰ کے دن بیخ شیر پر ”آٹھواں حملہ“ کیا۔ TU-16 طیاروں کی ہولناک بمباری سے تین سو افراد شہید ہو گئے۔ روس کا کہنا تھا کہ یہ سب مجاہدین تھے مگر مقامی لوگوں کے مطابق ان میں اکثریت عام لوگوں کی تھی۔

نومبر میں اسی طرح کے حملے اور بمباری میں لوگر کے چار سو شہری جاں بحق ہوئے۔ دوران سال روس کے بارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک لشکر نے افغان فوج کے ساتھ پارہ چنار اور کابل کے درمیان واقع علی خیل (جامی) کی چھاؤنی کا محاصرہ کرنے والے مجاہدین پر حملہ کیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں مجاہدین محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ روسیوں نے اسے اپنی ایک بڑی کامیابی تصور کیا۔

مجاہدین میدان میں ڈٹے ہوئے تھے: روس کی ان تمام فتوحات کے باوجود مجاہدین کا حوصلہ روزِ اوّل کی طرح بلند تھا۔ وہ سر ہٹھیلی پر رکھ کر ہر میدان میں سرخ افواج کو لاکر رہے تھے۔ ایک وادی میں شکست کھا کر پسپا ہونے والے مجاہدین اگلے دن کسی دوسرے علاقے میں درجنوں روسیوں کا صفایا کر چکے ہوتے تھے۔

روس افغانستان کی دلدل میں دھنس چکا تھا۔ اس جنگ میں اس کے آٹھ کروڑ ڈالر یومیہ خرچ ہو رہے تھے۔ اس کی معیشت، زوال کی جانب جا رہی تھی۔ 1984ء کے دوران ستر ہزار سے زائد امدادی سپاہی افغانستان بھیجے گئے تھے۔ جدید ترین طیاروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر دیا گیا تھا مگر چند وقت کا میا بیوں کے سواروں کو کچھ ہاتھ نہ آیا۔ 28 دسمبر 1984ء کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق پانچ سال میں 10 ہزار سے زائد روسی اور افغان فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک اور رپورٹ میں انکشاف کیا گیا تھا کہ روس اور کابل انتظامیہ کو مجاہدین کے ہاتھوں 34 ارب روپے سے زائد مالی نقصان ہو چکا ہے۔

عالمی سطح پر یہ خبریں روس کو بدنام کرنے کے لیے کافی تھیں کہ اس کی کارروائیوں کے نتیجے میں افغانستان کے 10 لاکھ شہری جاں بحق ہو چکے ہیں جبکہ 25 لاکھ افغان معاشی بد حالی کی انتہاء کو پہنچ کر ناقہ کشی پر مجبور ہیں۔

16 نومبر 1984ء کو جنرل اسبلی کے اجلاس میں ایک بار پھر روسی افواج کے افغانستان سے فوری انخلاء کی قرارداد بھاری اکثریت سے منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ امریکا نے مجاہدین کے لیے امداد دو گنی کرنے کا اعلان کر دیا اور مہاجرین کی امداد کے لیے دس لاکھ ڈالر کی منظوری دے دی۔

قبائلی ملیشیا: روس اور کابل حکومت کے لیے حالات دشوار ہوتے جا رہے تھے۔ مجاہدین کا زور توڑنے کے لیے کابل انتظامیہ نے قبائلیوں کی وفاداریاں خریدنے پر توجہ دی۔ قبائلیوں میں بکتے والوں کی کمی نہ تھی۔ کابل نے ایسے سرداروں اور ان کی نئی سپاہ پر مشتمل ایک نئی ملیشیا بنانے کی سرٹوڈ کوشش شروع کر دی۔ بعض سرداروں قبائل کبھی کبھی کابل انتظامیہ کے ساتھ مل جاتے اور کبھی مجاہدین کی صف میں کھڑے نظر آتے۔ ان دنوں کابل کے ایوانوں میں ان کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہو گئی تھی۔ آخر کار ایک ملیشیا تیار کر لی گئی۔ عصمت اللہ مسلم نامی ایک سردار کو اس ملیشیا کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا۔ وہ مجاہدین سپلائی لائن پر حملے کر کے ان کا اسلحہ لوٹنے لگا۔ سروبی کے سردار حسن خان کرخیل نے بھی حکومت سے معاہدہ کر لیا۔ اسے سروبی کے بجلی گھر دار بجلی کے کھمبوں کی حفاظت کا ذمہ دار بنادیا گیا۔ کیونکہ مجاہدین کچھ مدت پہلے پل چرخ کی بجلی گھر تباہ کر چکے تھے۔ اگر سروبی کا بجلی گھر بھی ناکارہ ہو جاتا تو کابل بالکل تاریک ہو جاتا۔ ان سرداروں کے علاوہ جمعہ خان نامی ایک اکھڑ اور بدماغ کمانڈر بھی 500 جنگجوؤں سمیت کابل کی چھتری تلے آ گیا تھا۔

مجاہدین کی دھمکی: ایسے ملت فروش سرداروں کے بارے میں مجاہدین کا طرز عمل بڑا صاف اور دو ٹوک تھا۔ وہ غداروں کو کھلی تنبیہ کر دیتے کہ ان حرکتوں سے باز آ جائیں بصورت دیگر انہیں نشان عبرت بنادیا

جائے گا۔ سرودی کے حسن خان کو مولانا یونس خالص کا ایک ہی دھمکی آمیز پیغام کافی ہو گیا: ”باز آ جاؤ ورنہ لڑائی کے لیے تیار رہو۔ ہم تمہیں برباد کر دیں گے۔“ حسن خان ایسا گھبرایا کہ سرودی چھوڑ کر سیدھا پاکستان پہنچ گیا۔ البتہ جمعہ خان پر تنبیہات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر ایک کارروائی میں اسے قتل کر دیا گیا۔



مآخذ و مراجع

- ❦ تاریخ افغانستان من قبیل الفتح الاسلامی الی وقتنا المعاصر۔ فاروق حامد بدر
- ❦ تاریخ جہاد افغانستان۔ ڈاکٹر انجی بی خان
- ❦ اردو ڈائجسٹ، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، فروری 1990ء
- ❦ افغانستان۔ ایک قوم کا المیہ۔ احمد شجاع پاشا
- ❦ المسلمون فی افغانستان، ڈاکٹر محمد عبدالقادر احمد
- ❦ جہاد افغانستان اور فتح مبین۔ مولانا مشتاق احمد عباسی
- ❦ Encyclopaedia Britannica (Afghanistan)

ستائیسواں باب

فیصلہ کن جنگوں کا دور

1985ء کے حالات (جوڑ توڑ): 1985ء کا آغاز عالمی سطح پر مضامتی عمل ہموار کرنا نظر آ رہا تھا۔ 10 جنوری کو روس اور امریکا نے جوہری اسلحے کی تخفیف کے بارے میں مذاکرات شروع کرنے پر اتفاق کر لیا۔ روس اور امریکا میں جینیوا مذاکرات شروع ہوئے۔ اگرچہ افغانستان سے سوویت افواج کی واپسی کا سلسلہ طے نہ ہو سکا مگر جینیوا مذاکرات جاری رکھنے پر دونوں عالمی طاقتیں مشتق تھیں۔

ادھر کارل نے بھی لویہ جرگہ طلب کر کے افغان عوام کا اعتماد حاصل کرنے کی از سر نو کوشش کی۔ جرگہ میں 1776 نمائندے شریک ہوئے۔ مگر یہ محض کچھ پہلی تماشائیت تھا۔ ادھر جرگے کا اجلاس ہو رہا تھا، ادھر چری کے پہاڑوں پر مجاہدین کی راکٹ باری سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ بہر حال پنجتون قبائل اور کارل انتظامیہ کے درمیان مفاہمت کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے خاد کے سربراہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو ذمہ دار بنا دیا گیا، کیونکہ وہ خود بھی پنجتون تھا اور قبائل کے عوام سے اس کے قریبی روابط تھے۔

مجاہدین کی کارروائیاں: ان دنوں پکتیا سے لے کر پاراچنار تک کی پٹی مجاہدین کی کارروائیوں کا خاص مرکز تھی۔ یہ پٹی کامل سے پچاس میل کے فاصلے پر آخر ختم ہوتی تھی اس لیے کامل ہمہ وقتی خطرے کی زد میں تھا۔ کامل میں ساٹھ ہزار سوویت و افغان سپاہی ہر وقت پہرا دیتے رہتے تھے۔ اس طرح مجاہدین کا شہر میں داخلہ تو مشکل ہو گیا تھا مگر مجاہدین اکثر راکٹ حملوں اور بم دھماکوں کے ذریعے کارل انتظامیہ اور سوویت اہلکاروں کو سراسیمہ کرتے رہتے تھے۔ اس سال بھی احمد شاہ مسعود نے سالانگ کامل شاہراہ پر سوویت افواج کے لیے مشکلات پیدا کیے رکھیں۔ آخر سوویت افواج نے پنج شیر پر نواں حملہ کیا۔ اس حملے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ احمد شاہ مسعود نے ”پیش گر“ پر جارحانہ حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیا تھا۔ مجاہدین نے پیش گر سے 5 کرٹل، سو سے زائد افسران اور 350 سپاہی گرفتار کر لیے تھے۔

اس کے رد عمل میں قوری طور پر دشمن کی فضا نیہ نمودار ہوئی اور اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ اس

ہولناک بمباری سے مجاہدین کا اتنا نقصان نہ ہوا مگر 130 افغان وسویت قیدی ہلاک ہو گئے۔ روس اور افغان میڈیانے اُلٹا مجاہدین پر الزام لگایا کہ انہوں نے قیدیوں کو ہلاک کر کے بدترین ظلم کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد سوویت یونین نے بڑا حملہ کر کے پیش گرواپس لے لیا مگر وہ اپنے بقیہ قیدی آزاد نہ کرا سکا۔ ہرات کا محاذ: ہرات میں اسماعیل خان کے مجاہدین سرگرم عمل تھے۔ انہوں نے زمین دوز سرنگ کے ذریعے روسیوں کی ایک ناقابلِ تخییر چوکی تک رسائی حاصل کی اور وہاں قبضہ کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ ایئر پورٹ پر بھی راکٹوں سے حملے کرتے رہتے تھے۔ ایک دن شین ڈنڈ، ہولناک دھماکوں سے گونج اٹھا۔ پتا چلا کہ 20 طیارے تباہ ہو گئے ہیں۔ سوویت یونین اور کارل انتقامیہ کی نفاذیہ کو اتنا بڑا دھچکا پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

محاصرہ جنگلیں: 1984ء کے بعد 1985ء میں بھی مجاہدین نے خوست، تانی، جاجی اور بری کوٹ کا محاصرہ جاری رکھا۔ روس کو ان علاقوں میں خوراک و رسد اور اسلحے کی ترسیل میں بے حد دشواری پیش آرہی تھی۔ اس نے مجاہدین پر کئی بڑے حملے کیے مگر جزوی کامیابی کے سوا کچھ نہ ملا اور مکمل طور پر مجاہدین کو منتشر نہ کیا جاسکا۔ چونکہ یہ عسکری مراکز بارودی سرنگوں کے جال سے گھرے ہوئے تھے اس لیے مجاہدین آسانی سے ان پر قبضہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک رپورٹ کے مطابق روس 1985ء کے دوران تک افغانستان میں 20 لاکھ بارودی سرنگیں بچھا چکا تھا۔ یوں افغانستان کے چپے چپے پر موت کا یہ جال بچھا ہوا تھا۔ محاصرہ جنگلیں جاری رہیں۔ آخر کار ایک مقام پر روس کو کامیابی ہوئی۔ 6 جون 1985ء کو سرخ افواج نے بری کوٹ کا محاصرہ توڑ ڈالا اور مجاہدین نقصان اٹھا کر پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔ اس کارروائی کے دوران سوویت افواج نے چار دیہات صفحہ ہستی سے مٹا دیے اور کم از کم دو ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

مجاہدین کا سات گروہی اتحاد بہر حال فعال تھا۔ پشاور میں اس کا صدر دفتر آباد رہتا تھا۔ اس سال اقوام متحدہ کی تقریب سالگرہ میں شرکت کے لیے اس سات گروہی اتحاد نے اپنا وفد بھی بھیجا تھا۔ 1985ء کے اواخر میں ببرک کارمل ایک ہارے ہوئے لار چاروے بس انسان کی مانند نظر آتا ہے۔ وہ بیمار بھی تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح تھاریب میں بکثرت شرکت نہیں کرتا تھا۔ جب اس نے ماسکو کا دورہ کیا تو وہاں اس کو وہ اہمیت نہ ملی جو کبھی ملا کرتی تھی۔ دراصل ماسکو اب اسے پٹا ہوا مہرہ سمجھ کر ہٹانا چاہتا تھا۔ سوویت یونین کو اب کارمل کے متبادل کی تلاش تھی۔ عالمی مبصرین ”سلطان علی کشمند“ اس کے لیے موزوں ترین شخص قرار دے رہے تھے۔

روسی مظالم: 1985ء میں بھی روسی مظالم جاری رہے۔ سوویت افواج نے 15 مئی کو افغانستان کے دیہاتوں میں ایک ہزار افراد شہید کر دیے۔ انہی دنوں قندھار میں بمباری سے 70 افراد کو شہید کیا گیا۔ دوران سال مجموعی طور پر کم از کم 35 ہزار افراد کی شہادتیں منظر عام پر آئیں۔

سوویت یونین کا نیا سربراہ گورباچوف: سوویت یونین کے سربراہ اور کیونسٹ پارٹی کے صدر "چرنکو" کو اقتدار کے زیادہ دن نصیب نہ ہوئے۔ آندرے پوف کی طرح اس کا دور حکومت بھی مختصر ثابت ہوا۔ بعد ازاں میخائل گورباچوف نے کیونسٹ پارٹی کی صدارت اور روس کے نئے حکمران کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ گورباچوف نے اپنے پیشرو حکمرانوں سے خاصا مختلف انداز اختیار کیا۔ سوویت روس کی رو بہ زوال معیشت بتا رہی تھی کہ کیونزم اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔ گورباچوف نے پالیسیوں میں تدریجی طور پر تبدیلیاں کر کے آنے والے خطرات سے بچنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے پہلی بار سوویت عوام کو تحریر و تقریر کی محدود آزادی دی تو صحافی حکومت سے افغان جنگ کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ جب حکومت انہیں مطمئن نہ کر سکی تو روس میں یہ تاثر دن بدن بڑھنے لگا کہ افغان جنگ ایک احمقانہ مہم کے سوا کچھ نہیں۔ گورباچوف بنیادی طور پر یکا کیونسٹ تھا مگر وہ نئے حالات کے تحت کیونزم میں کچھ اہم تبدیلیاں کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کے عزائم ماضی کے حکمرانوں کی طرح توسیع پسندانہ نہیں تھے۔ شاید اس لیے کہ سرخ رنجیدہ سات سال سے افغانستان میں لڑتے لڑتے لہو لہان ہو چکا تھا۔ وہ پہلے اپنے زعموں کے بھرنے کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ فی الحال افغانستان سے واپسی کا کوئی باعث راستہ نکالا جائے۔ چنانچہ 25 مئی 1985ء کو ایک بیان میں گورباچوف نے کہا: "ہم ہیردنی مداخلت سے آزاد افغان دوستی کے خواہش مند ہیں۔ ہم افغان مسئلہ کے سیاسی حل کی حمایت کرتے ہیں۔" ایک بار پھر جینوا مذاکرات: گورباچوف کے بیانات سے یہ واضح تاثر مل رہا تھا کہ سوویت یونین افغانستان سے واپسی اختیار کرنا چاہتا ہے اور غالباً اس کے لیے وہ خاصی سخت شرائط بھی قبول کر لے گا۔ روس کے اس رویے کے پیش نظر 17 دسمبر 1985ء کو افغان مسئلے پر جینوا میں بالواسطہ مذاکرات کے چھٹے دور کا آغاز ہوا۔ مذاکرات سے قبل امریکا افغان مسئلے کے حل کے لیے ضامن بننے کے لیے تیار ہو گیا۔ طے ہوا کہ معاہدہ حکومت پاکستان اور حکومت افغانستان کے درمیان ہوگا تاہم افغان اختلافیہ کے وفد کے سخت رویے کے باعث مذاکرات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔

پاکستان میں جمہوری حکومت: 1985ء کے دوران پاکستان میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی آئی۔ صدر ضیاء الحق نے عام انتخابات منعقد کرائے جن کے نتیجے میں محمد خان جونیجو نے نئے وزیراعظم کی حیثیت

سے عہدہ سنبھالا۔ انتقال اقتدار کے ان ایام میں افغانستان کی جانب سے پاکستان پر مسلسل فضاؤں حملے ہوتے رہے۔ صرف مئی کے پہلے عشرے میں افغان طیاروں نے 60 بار پاکستانی علاقوں پر حملے کیے۔ 29 جون کو وزیراعظم محمد خان جوینجو نے خبردار کیا کہ آئندہ اگر کوئی افغان طیارہ پاکستانی حدود میں داخل ہوا تو جوابی کارروائی کی جائے گی۔

روسی طیاروں کا شکار: ستمبر کے مہینے میں مشرقی افغانستان زبردست جنگوں کا مرکز بن رہا۔ خواست میں تین ہزار کارمل اور 500 روسی افسران محصور تھے اور گردنواح میں شدید لڑائی جاری تھی۔ مجاہدین کو امریکا کی طرف سے ملنے والے اسٹینگر میزائلوں نے روسی طیاروں کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ مجاہدین دھڑا دھڑ طیارے اور ہیلی کاپٹر گرا رہے تھے۔

6 ستمبر کو پکتیا میں سات روسی ہیلی کاپٹر اور طیارے مار گرائے گئے۔ اگلے دن، ایک مسافر بردار افغان طیارہ مجاہدین کے میزائلوں کا نشانہ بنا جو روس اور افغان افسران اور سپاہیوں کو لے جا رہا تھا۔ 52 افراد اس کارروائی میں ہلاک ہوئے۔ اس سے اگلے روز 9 ستمبر کو مجاہدین نے پاکستانی سرحد کے قریب دوروی مگ طیارے تباہ کر دیے۔

ژادور کا معرکہ: اس دوران ہزاروں روسی اور افغان سپاہی مشرقی افغانستان میں ژادور پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ یہ مجاہدین کا سب سے بڑا عسکری مرکز تھا جس میں سرنگوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان میں بجلی اور جزیروں تک کا انتظام تھا۔ پورے افغانستان میں مجاہدین کو فراہم کیے جانے والے اسلحے کے ذخائر یہاں موجود تھے۔ روسیوں اور کارمل کے سپاہیوں نے ژادور کے عسکری مرکز پر قبضے کی سرتوڑ کوشش کر ڈالی مگر مجاہدین کی جرأت ایمانی، پامردی اور اولوالعزمی کے سامنے ان کی پیش نہ گئی اور آخر وہ لاشوں کے ڈھیر چھوڑ کر پسپا ہو گئے۔ اس جنگ کے بارے میں 11 ستمبر 1985ء کو مولانا جلال الدین حقانی کا یہ بیان ذرائع ابلاغ پر نشر ہوا کہ گزشتہ ہفتے افغانستان کی تاریخ کی سب سے ہولناک جنگ لڑی گئی۔ سال 1985ء کے اختتام پر سامنے آنے والے اعداد و شمار کے مطابق اس ایک سال میں 7920 روسی و افغان فوجی ہلاک ہوئے۔ 5829 عام شہری جاں بحق ہوئے۔ مجاہدین کا جانی نقصان 2152 افراد تک رہا۔ روسی و افغان فضا سے 42 طیارے، 64 ہیلی کاپٹر، 837 ٹینک اور کئی ہزار تباہ ہو گئے۔

کارمل رخصت: 1986ء شروع ہوا تو افغانستان میں ببرک کارمل کے دن پورے ہو چکے تھے۔ اب وہ اہم سرکاری تقاریب سے بھی اکثر غیر حاضر رہتا تھا۔ اپریل 1986ء میں بلائے گئے بڑے جرگے میں بھی کارمل موجود نہ تھا۔ صرف اس کا تحریری پیغام پڑھ کر سنا دیا گیا۔ البتہ کیونسٹ پارٹی کی مرکزی

کمپنی کے سیکرٹری ڈاکٹر نجیب اللہ نے خاصی طویل اور پر جوش تقریر کی۔ آخر 4 مئی کو کارل ریڈیو سے اعلان ہوا کہ ببرک کارل نے خرابی صحت کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے جو قبول کر لیا گیا ہے اور اس کی جگہ ڈاکٹر نجیب اللہ کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری چن لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر نجیب اللہ کون تھا؟ 28 سالہ ڈاکٹر نجیب اللہ اپنے بھاری ڈیل ڈول کی وجہ سے ”تیل“ کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ بڑا عیار، چوکس اور جب زبان انسان تھا۔ فنِ تقریر کا خوب ماہر تھا۔ سیاسی جوڑ توڑ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اس کے ساتھ وہ حد درجہ بے رحم اور سفاک بھی تھا۔ وہ ایک پٹھان بینکار کا بیٹا تھا۔ 1947ء میں پکتیا میں پیدا ہوا تھا۔ 1964ء میں وہ ڈاکٹر بننے کے لیے کارل یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ اسی زمانے میں وہ جمہوری پارٹی کا کارکن بن گیا اور پوری مستعدی سے ببرک کارل کے زیر سایہ پرچم پارٹی کے لیے کام کرتا رہا۔ ڈاکٹر بننے کے بعد بھی وہ علاج معالجے کی بجائے سیاسی مشاغل میں مصروف رہا۔ تقریر کی صلاحیت نے اسے ترقی حاصل کرنے میں خاص مدد دی۔ خلق پارٹی کے اقتدار کے دور میں وہ ایران میں افغانستان کا سفیر مقرر ہوا۔ بعد میں مشرقی یورپ چلا گیا۔

سوویت یلغار کے ساتھ خلق کا اقتدار ختم ہوا اور ”پرچمی“ اپنے رہنما ببرک کارل کی قیادت میں برسرِ اقتدار آئے تو نجیب اللہ واپس آ گیا۔ 1980ء میں وہ افغان خفیہ ایجنسی ”خاد“ کا سربراہ بن گیا جو کہ مجاہدین اور ان کے حامیوں کے خلاف لڑنے کا پروایاں کرتی رہی۔ چار سال بعد وہ نومبر 1985ء میں پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا سیکرٹری مقرر ہوا اور ببرک کارل کے استعفیٰ کے بعد 1986ء میں اس نے نئے افغان حکمران کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔

نجیب اللہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سوویت خفیہ ایجنسی کے جی بی کا ایجنٹ تھا۔ اسی بنا پر سوویت حکام اس پر بھروا اعتماد کرتے تھے۔ جب انہوں نے کارل کو از کار رفتہ محسوس کر لیا تو ان کی نظر میں نجیب ہی اس عہدے کے لیے موزوں تر محسوس ہوا۔ نجیب اللہ نے برسرِ اقتدار آتے ہی حکومتی مشینری کو فعال کرنے کی کوشش کی۔ وہ مکر و فریب اور جبر و تشدد کے ذریعے ان مشکلات پر قابو پانا چاہتا تھا جو ببرک کارل کے زوال کا باعث بنی تھیں۔

نجیب اللہ کا دور حکومت: اس نے فوری طور پر ملک بھر کا دورہ کیا اور قبائلی عمائد سمیت مختلف طبقات کے لوگوں کو اعتماد میں لینے کی کوشش کا آغاز کیا۔ وہ ملک کو کوئی نیا سیاسی لائحہ عمل تو نہ دے سکا کیونکہ اس کی حیثیت کھ پتی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اس نے کارل کی پالیسیوں کو مربوط کر کے انتظامی ہڈ زور کرنے پر توجہ دی۔ ہر مکار حکمران کی طرح اس نے بھی مذہب پسندی کا دعویٰ کیا، خود کو سچا اور پکا مسلمان کہا۔

اسلام دوستی کے نعرے لگائے۔ مساجد میں نماز جمعہ کے اجتماعات میں شرکت کی۔ مگر یہ سب ایک ڈھونچ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اصل میں تو وہ بھی کارل کی طرح الحاد، ظلم اور سفاکی کی راہ پر گامزن تھا۔ نلاد کی سربراہی کے تجربات اس کے کام آ رہے تھے۔ اس نے اپنے مخالفین اور دشمنوں کو خفیہ کارروائیوں کے ذریعے ہلاک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی پارٹی کے کارکنوں کو بھی فوجی بھرتی میں مستی برتنے پر سخت سرزنش کی اور جبری بھرتی پر زور و شور سے عملدرآمد کرایا۔

ژااور کی دوسری جنگ: آغاز 1986ء میں ژااور کا محاذ ذرائع ابلاغ کا اہم موضوع رہا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ مجاہدین کا سب سے بڑا مرکز تھا اور یہاں مولانا جلال الدین حقانی پورے افغانستان کے مجاہدین کو اسلحہ کی ترسیل کا نظام سنبھالے ہوئے تھے۔ یہاں مجاہدین کو تربیت بھی دی جاتی تھی۔ فغانائی حملوں کے دفاع کے لیے یہاں زبردست انتظامات تھے۔ ستمبر 1985ء کے حملے کی ناکامی کے بعد سوویت اور افغان افواج نے بھرپور تیاریوں کے ساتھ آغاز گزرا 1986ء میں یہاں دوبارہ حملہ کیا۔ بارہزار سپاہی جو ہر قسم کے ہلکے اور بھاری اسلحے سے لیس تھے، کئی خطوط سے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ حملہ عین ان دنوں میں ہو رہا تھا جب جینوا میں افغان مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک بار پھر مذاکرات کا دور چل رہا تھا۔ سوویت افواج ژااور پر کامیاب فغانائی حملے کے لیے خواست کو مرکز بنانا چاہتی تھی۔ مجاہدین نے اس سے پہلے ہی خواست انٹرپورٹ کو ناکارہ بنانے کے لیے وہاں گولہ باری شروع کر دی تھی۔

ادھر دیگر تنظیموں کے مجاہدین بھی کشاکشاں کشاکشاں ژااور کی طرف لپک رہے تھے۔ مولانا جلال الدین حقانی کی قیادت میں وہ قدم قدم پر حملہ آوروں کی لاشیں گرا رہے تھے۔ یوں روسی بڑی فوج کا آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ تب دشمن نے چھاتہ بردار سپاہی اُتارنے کا فیصلہ کیا۔ مجاہدین فغانائی حملوں اور چھاتہ برداروں کی یلغار کو نہ روک سکے مگر انہوں نے بڑی افواج کی رفتار توڑ دی تھی۔ ژااور کے گرد و نواح میں پینچ پینچ سوویت اور افغان فوج کے دو ہفتے صرف ہو گئے۔ اس دوران مجاہدین ایک بنا لائن کا مکمل صفایا کر چکے تھے۔ اس کے 500 میں سے بمشکل 70 افراد زندہ واپس جاسکے۔ تاہم جگ پوری شدت سے جاری رہی۔ کئی دنوں تک اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کون فتح یاب ہوگا؟ آخر کار چھاتہ بردار سپاہ کی مدد سے 24 اپریل کو روسی سپاہی ژااور میں داخل ہو گئے۔

ژااور پر روس کا قبضہ: یہاں دست بدست جنگ کا آغاز ہوا۔ فریقین کے بے شمار افراد معرکے کی نذر ہوئے۔ ممکن تھا کہ مجاہدین دشمن کو پسپا کر دیتے مگر اس دوران ان کے کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی فغانائی بمباری کا نشانہ بن کر شدید زخمی ہو گئے۔ تب مجاہدین نے خفیہ راستوں سے یہ علاقہ خالی کر دیا

ضروری سمجھا۔ مولانا جلال الدین ہخانی کو پاکستان پہنچا دیا گیا۔ اکثر مجاہدین بھی بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ اڑھائی سو مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا۔ زور 24 اپریل کو روس کے قبضے میں آ گیا۔ یہاں سے اسلحے کے بے پناہ ذخائر برآمد ہوئے۔ افغان حکام اور روس نے اسے اپنی تاریخی فتح قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زور میں مجاہدین روس کی فضائیہ اور چھاتہ بردار فوج کو اس لیے ناکام نہ بنا سکے کہ ان کے پاس موجود طیارہ شکن ہتھیار کثرت استعمال کی وجہ سے صحیح طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ غالباً مجاہدین کو ابھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ جدید اسلحہ بھی متواتر استعمال سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو وہ طیارہ شکن توپوں کو وقفہ وقفہ سے ٹھنڈا ہونے کا موقع دیتے رہتے۔

بہر کیف روس کو اس مہم کی خوشیاں منانے کے زیادہ دن نہ ملے۔ مجاہدین نے بہت جلد خود کو منظم کر لیا اور مشرقی افغانستان میں ان کی کارروائیاں پوری شدت سے دوبارہ شروع ہو گئیں۔

کابل میں روسی اڈے کی تباہی: 27 اگست 1986ء کو کابل کے گرد و نواح سے کمانڈر عبدالحق نے شہر پر چار تک حملہ کیا اور 107 ایم ایم، بی ایم 12 قسم کے میزائل برسائے۔ ان کا ہدف کابل میں واقع سوویت یونین کا ایک فوجی اڈہ تھا۔ میزائل گرنے سے وہاں اسلحے کے ذخیرے کو آگ لگ گئی۔ ہولناک دھماکوں کے ساتھ وہاں ذخیرہ شدہ میزائل پھٹنے لگے۔ پورا کابل لرزنے لگا۔ ان دھماکوں میں ایک ہزار کے قریب روسی اور افغان اہلکار ہلاک ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ روسی خفیہ ایجنسیوں نے اسی حملے کا بدلہ لینے کے لیے اوہڑی کیمپ راولپنڈی کو تباہ کیا تھا۔

بہرک کارل کا عبرت ناک انجام: نجیب کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سابق حکمران بہرک کارل داؤد ترہکئی اور امین کی طرح اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی متضاد آراء پھیلی ہوئی تھیں مگر معتبر ذرائع کے مطابق مئی 1986ء میں بہرک کارل کے مستعفی ہوتے ہی اسے زیرِ حراست لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس دن کے بعد اس کی کوئی خبر ملنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایک بات تو واضح تھی کہ کارل کے استعفیٰ کے بعد صدارتی محل فائرنگ سے گونج اٹھا تھا اور اسی دن کابل میں روسی افواج نے کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ صدارتی محل میں کیا ہوا تھا؟ صرف اتنا پتا چل سکا کہ کارل کے سوتیلے بھائی کو گولی مار دی گئی ہے اور وہ خود لا پتا ہے۔

کارل سے یہ سلوک پرچم پارٹی کے ارکان کے لیے ناقابل برداشت تھا چنانچہ وہ نجیب اور اس کی انتظامیہ کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے۔ نجیب اللہ اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد جون کے آغاز میں کارل کے حامیوں کی فائرنگ کا نشانہ بنا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس کی جان بچ گئی۔ 25 نومبر کو ایک بار پھر اس

پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ یہ بھی کارل نواز گروپ کی کارروائی تھی۔ نجیب اللہ اس بار بھی زخمی ہوا مگر جان بچ گئی۔ نجیب پہلے ہی کارل کے حامیوں کے خلاف کارروائیاں کر رہا تھا۔ اب ان کارروائیوں میں شدت آگئی چنانچہ کارل کے باپ جنرل حسین کو بھی گرفتار کر کے کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ کارل کے حامیوں کو جن جن کر نشانہ بنایا گیا۔ دسمبر کے آغاز میں خبر پھیل گئی کہ کارل کو خفیہ حراست میں قتل کر دیا گیا ہے۔ کچھ مدت گزر جانے پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ ہرک کارل ماسکو چلا گیا تھا، وہاں اس نے نجیب کے خلاف پرحم پارٹی کی سرگرمیوں کی سرپرستی جاری رکھی۔ 3 دسمبر 1996ء کو ماسکو ہی میں اس کا انتقال ہوا۔

جہاد افغانستان کا نیا دور: نجیب کی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی جہاد افغانستان اپنے تیز ترین اور فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا۔ مجاہدین کی صفوں میں ایک نیا نظم و ضبط دیکھنے میں آیا۔ ان کی کارروائیاں اب ایک حیران کن دلو لے کا مظہر ہوتیں۔ عوام جوق در جوق مجاہدین کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ اب وہ لوگ بھی مجاہدین کی حمایت کرنے لگے جنہیں روس کے بارے میں کچھ خوش فہمیاں باقی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ روس نے کارل کو کبھی نہیں بخشا اور نجیب جیسے خونی بھیڑیے کو افغانستان پر مسلط کر دیا ہے تو وہ مکمل طور پر مایوس ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ روسی حکام کے ہاں افغانستان کی فلاح اور تعمیر و ترقی کا تصور کوئی مطلب نہیں رکھتا۔ وہ اس ملک کو ایک مقلد بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

نجیب ایک خونی درندہ: اب تک مسلط ہونے والے کمیونسٹ حکمرانوں میں نجیب کی شخصیت سب سے گھناؤنی اور مکروہ تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ افغانستان کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی ”خاد“ کا پہلا سربراہ تھا۔ یہ ایجنسی روس کی ”کے جی بی“ اور بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ کے اشتراک عمل سے وجود میں آئی تھی۔ انہوں نے نجیب کو اس عہدے پر فائز کرنے سے پہلے اسے بار بار آزمایا۔ ہر آزمائش میں نجیب نے اہل وطن کے خون میں ہاتھ رنگ کر اپنی ”وفاداری“ کا ثبوت فراہم کیا۔ اس کے بعد نجیب ”خاد“ کا سربراہ بن کر افغان عوام پر ایک خون آشام بلا کی طرح مسلط ہو گیا۔

خاد کی ہوش ربا کارروائیاں: ”خاد“ نے افغانوں پر جو ہوش ربا مظالم ڈھائے ان کی تفصیل کئی سو صفحات کا تقاضا کرتی ہے۔ سردست چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں:

تنگر ہار کے گاؤں ہشار شاتی کے ایک اسکول ٹیچر کو اغوا کر کے زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر زخمی حالت میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا گیا جو ہر لمبی کھینوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان مکھیوں کے کانٹے سے وہ ساعت و بصارت سے محروم ہو گیا۔ پانچ سال تک مسلسل تشدد کے بعد اسے رہا کیا گیا۔ یہ سزا صرف اس لیے دی گئی کہ اس نے اسکول میں کمیونسٹ پارٹی کے کسی

عہدیدار کے بیٹے سے سبق کے بارے میں کوئی سوال پوچھ لیا تھا۔

✽ کابل یونیورسٹی کے طالب علم محمد آغا کو 1981ء میں گیارہ طلبہ سمیت اغوا کر کے زہریلے دھوکے سے بھرے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ انہیں بجلی کے جھکے دیے گئے۔ برقی ڈنڈوں سے بیٹا گیا۔ چار طلبہ کو زندہ دفن کر دیا گیا۔ باقی تشدد کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ محمد آغا کے مطابق اسے برف میں کئی کئی گھنٹے دبا کر رکھا جاتا اور روزانہ پانچ بار بجلی کے ڈنڈوں سے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ وہ 1987ء میں رہا ہوا۔

✽ سابق فوجی اسرار الدین کا بیان ہے کہ اسے مجاہدین سے تعلق کے شبہ میں گرفتار کر کے اٹھارہ ماہ تک بدترین ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دوران اسے کئی کئی راتیں مسلسل جگایا گیا۔ بال اٹھا ڈے گئے۔ جسم پر اُبلتا ہوا پانی پھینکا گیا۔ چھت سے الٹا لٹکا کر گلے میں طوق ڈال دیا گیا۔ ننگا کر کے رات بھر برف باری میں کھڑا رکھا گیا۔

✽ لوگر کے ایک دو فروش محمد صدیق کو 1982ء میں گرفتار کیا گیا۔ اسے ایک ایسے کمرے میں قید کر دیا گیا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ ”خاؤ“ کے ایجنٹ زنبور سے اس کے جسم سے بال نوچے رہتے۔ برقی ڈنڈوں سے ہٹائی اور بجلی کے جھکے روز کا معمول تھا۔

سیدی دلخراش داستان: ننگر ہار کے ضلع روزات کے ایک اسکول ”سید“ کو 1985ء میں گرفتار کر کے ایک بنجرے میں بند کر دیا گیا۔ اسے برہنہ کر کے اس پر کھولتا ہوا تیل چھڑکا گیا جس سے پورے جسم پر آبلے پڑ گئے۔ اگلے دن ان زخموں پر دوبارہ اُبلتا ہوا تیل ڈالا گیا۔ اس پر اتنا تشدد کیا جاتا کہ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ اسے مسلسل بھوکا پیاسا رکھا جاتا اور پانی طلب کرنے پر نمک ملا کر دیا جاتا۔ پھر اس سے ایک کاغذ پر زبردستی دستخط لیے گئے جس پر ناکردہ جرائم کی ایک فہرست درج تھی۔ تین سال کی تشدد آمیز قید کاٹنے کے بعد اسے رہائی ملی۔

اعتبار نگل کی کہانی: جلال آباد کا دکاندار اعتبار نگل بتاتا ہے: ”خاد کے ایجنٹوں نے میری دکان پر چھاپا مارا۔ کوئی قابل اعتراض چیز نہ ملی مگر وہ مجھے گرفتار کر کے لے گئے۔ دس گھنٹے تک برف کے فرش پر لٹایا گیا۔ جس سے پورا جسم منفلوج ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد بجلی کے شاک دیے گئے۔ ہر شاک پر میں کئی فٹ اوپر اُچھل کر دھڑام سے نیچے گرتا۔ یہ پوری رات بجلی کے جھکے سے تھپتھپاتے اور برقی لاشیوں سے مار کھاتے گزری۔ روز ایک گاڑی آئی اور کئی قیدیوں کو لے جاتی جب وہ آتی تو سب کے روٹکتے کھڑے ہو جاتے اور جب جاتی تو باقی رہ جانے والے قیدی سسکیاں لے کر رونے لگتے۔ معلوم ہوا کہ روزانہ کچھ قیدیوں

نے مجاہدین کو اسٹینگر میزائل فراہم کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اب اس کے نتائج سامنے آرہے تھے۔ مجاہدین نے بہت جلد اسٹینگر میزائلوں کا استعمال سیکھ لیا تھا۔ اس طیارہ شکن ہتھیار کی خوبی یہ تھی کہ اسے ایک آدمی کا دھڑے پر رکھ کر فائر کر سکتا تھا۔ اس کے حساس کیمرے اور انفرا ریڈ سینسز نے ہدف متعین کرنا آسان تر کر دیا تھا۔ مجاہدین نے اس ہتھیار کے ذریعے 60 تا 70 فیصد درست نشانے لگائے اور ان گنت طیارے اور ہیلی کاپٹر گرائے۔ صحیح نشانوں کی یہ شرح خود اسٹینگر میزائل بنانے والی کمپنی کے ہدف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ مجاہدین کا دوسرا اہم ہتھیار 12 ایم بی توپ تھی جو 8 سے 9 کلومیٹر تک مار کرتی تھی۔ یہ توپیں مجاہدین کو پہلی بار 1984ء میں ملی تھیں۔

7 آر پی جی راکٹ لانچر مجاہدین کا سب سے مقبول ہتھیار تھا۔ جو ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں، ٹرکوں، مورچوں، عمارتوں اور پیدل سپاہیوں سمیت ہر ہدف کو کامیابی سے تباہ کرتا تھا۔ اس کے علاوہ مجاہدین گرد پوں کی شکل میں مندرجہ ذیل اقسام کا اسلحہ استعمال کر رہے تھے:

♣ مارٹنوب 60MM, 82MM, 107MM

♣ ریکائل لیس توپ 72MM, 82MM, 122RR

♣ اینٹی پرسنل اور اینٹی ویکل بارودی سرنگیں۔

♣ سام میزائل۔

♣ بلو پائپ میزائل

♣ بھاری اسٹین گن 12MM

♣ زیکوئیک 14.5MM, Z.KI.....

انفرادی ہتھیاروں میں کلاشنکوف اور گرینوف سب اسٹین گن کا استعمال عام تھا۔

نجیب کی ایک طرفہ جنگ بندی: مجاہدین کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں اور اپنی مسلسل ہزیمتوں سے خوزدہ ہو کر 1987ء کے آغاز میں نجیب نے مجاہدین کو ایک طرفہ جنگ بندی کی پیش کش کی اور توئی کاہر کی کہ مجاہدین بھی مثبت رد عمل کا مظاہرہ کریں مگر مجاہد رہنماؤں نے اسے ایک دھوکا قرار دینے ہوئے قابل اعتنا نہ سمجھا۔ اس کے باوجود 16 جنوری 1987ء کو نجیب کی طرف سے چھ ماہ کے لیے غیر مشروط طور پر یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اقدام کو ”آشتی ملی“ (قومی مصالحت) کا نام دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی نجیب نے کمیونسٹ حکومت کے سابقہ رویے کے برعکس مجاہدین کو ”اشرار“ کے بجائے ”روٹھے ہوئے بھائی“ کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا۔

مجاہدین کا رد عمل: مجاہد رہتا جانتے تھے کہ نجیب افغانستان میں کیونرم اور اس کے حامیوں کی ناکامی کا یقین کرنے کے بعد اپنا اقتدار بچانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ اس لیے وہ اس فریب سے قطعاً متاثر نہ ہوئے۔ 16 جنوری 1987ء کو جنگ بندی کے اعلان کے چند گھنٹوں بعد ہی مجاہدین کی طرف سے زبردست کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ ڈاکٹر نجیب نے بار بار اعلان کیا کہ مجاہدین نے جنگ بندی کی تو پہلے سے بڑھ کر خونریزی ہوگی مگر اس کی گیدڑ بھیسکیوں کا کوئی اثر ہوتا تھا نہ ہوا۔

گھمسان کی لڑائیاں: حقیقت یہ ہے کہ نجیب اور روسی افسران اس نام نہاد جنگ بندی سے صرف سنبھلنے کا وقت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے عزائم کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ”قوی مصالحت“ کے اعلان کے صرف 21 روز بعد کابل سے افغان روسی افواج کا ایک بہت بڑا کانوائے قندھار روانہ ہوا جس نے قندھار اور جنوبی علاقوں کی لڑائیوں میں بھرپور شرکت کی۔ جنوری 1987ء کے اواخر اور فروری کے اوائل میں قندھار خونریز جھڑپوں کا مرکز رہا۔ 31 جنوری کو مجاہدین نے ایک بڑے حملے میں قندھار کے اسلحہ ڈپو کو تباہ کر دیا جس میں 11 روسی ہلاک ہو گئے۔ اس دوران کابل سے چلنے والا کانوائے بھی آن پہنچا تھا اور مجاہدین پورے دولے سے اس کا مقابلہ کر رہے تھے۔ 11 فروری کو آنے والی خبروں کے مطابق گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ 50 روسی فوجی ہلاک اور 15 مجاہدین شہید ہو چکے تھے۔ روسیوں کا یہ حملہ بھی ناکام ہوا اور میدان مجاہدین کے ہاتھ رہا۔ فروری کے اواخر میں آنے والی ایک رپورٹ کے مطابق نام نہاد جنگ بندی کے اعلان کے بعد صرف 40 دن میں 1400 روسی اور افغان سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ مطلب یہ کہ نجیب کا جنگ بندی کا ڈرامہ مکمل طور پر ناکام ہو چکا تھا۔

مجاہدین کے طوفانی حملے: مارچ 1987ء میں مجاہدین نے قندھار انٹرپورٹ پر ایک بڑا حملہ کیا جس میں روس کے 14 طیارے اور ہیلی کاپٹر تباہ ہو گئے۔ اپریل کے اواخر میں نجیب اللہ نے اعتراف کر لیا کہ اس کا ایک طرف اعلان جنگ بندی ناکام ہو گیا ہے۔ ان دنوں شمالی اور مغربی صوبوں میں بھی مجاہدین بڑھ چڑھ کر حملے کر رہے تھے۔ 9 مئی کو مجاہدین نے ہرات کے جنوب میں 4 فوجی چوکیوں پر قبضہ کر لیا۔ 19 مئی کو بلخ میں دو بمبار طیارے اور ایک جاسوس طیارہ مار گرایا گیا۔ 21 جولائی کو کابل کے قریب 3 ہیلی کاپٹر تباہ کر دیے گئے۔ ماہ جون میں ارغنداب اور ژنڈک علاقہ میدان جنگ بنا رہا۔ مجاہدین نے ایک طویل جنگ کے بعد سینکڑوں روسی سپاہیوں کو ہلاک کر کے دشمن کو پسپا کر دیا۔ ادھر گریز میں لڑنے والے روسیوں کی مدد کے لیے کابل سے ایک تازہ دم لشکر روانہ ہوا۔ مگر راستے میں مجاہدین نے اسے روک لیا۔ شدید مقابلے کے بعد یہ اعدادی فوج نہایت اتر حالت میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ 24

جون 1987ء کا واقعہ ہے۔ مجاہدین نے 27 جون کو ننگر ہار میں روسیوں کی اہم چوکیوں پر قبضہ کر لیا اور اسی دن لوگر میں روسی افواج کا محاصرہ توڑ دیا۔ 29 جون کو ہرات کے نواح میں اس کے ایک اڈے کو ہتھام کر کے 150 فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ اسی روز پکتیا میں اسلحہ و گولہ بارود کا بہت بڑا ذخیرہ مجاہدین کے ہاتھ آ گیا۔ 30 جون کو مجاہدین نے فرہاہ میں 45 روسی و افغان سپاہیوں کو ہلاک کر دیا۔ اسی دن اطلاع ملی کہ شمال میں بدخشاں کا قصبہ شہر بزرگ روسیوں کے قبضے سے آزاد کر لیا گیا ہے۔ اسی دن سوویت حکام کا بیان شائع ہوا کہ ہم افغانستان میں اپنی فضائیہ کا مزید نقصان برداشت نہیں کریں گے۔ دنیائے اس بیان کو روس کی جانب سے اعتراف شکست کے مترادف سمجھا۔

دیہی طبقے کا جہاد میں حصہ: چند دنوں کی ان کامیابیوں کا رورائیں سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں اس سال مجاہدین کس قدر تیز رفتاری سے فتح مبین کی منزل کی طرف سفر کر رہے تھے۔ قوت ایمانی، اخلاص، جرأت و استقامت اور حب الوطنی کے علاوہ مجاہدین کی کامیابیوں کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مقامی آبادی خصوصاً دیہی طبقے کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔ سینکڑوں دیہات ایسے تھے جہاں کے سو فیصد مرد گلی یا جزوی طور پر جہاد میں حصہ لیتے تھے۔ مقامی آبادی کا تعاون گوریلا جنگ کی کامیابی کی شرط اول تصور کیا جاتا ہے۔ مجاہدین کو یہ تعاون پوری طرح حاصل تھا کیونکہ یہ جنگ تمام افغان عوام کی جنگ تھی۔

مجاہدین کے خفیہ ایجنٹ: مجاہدین کی جنگیں صرف میدانوں اور پہاڑوں میں نہیں لڑی جا رہی تھیں بلکہ شہروں میں بھی ان کے کارندے پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا اپنا جاسوسی نظام بھی تھا جس کے ذریعے وہ دشمن کے عزائم سے باخبر رہتے تھے۔ ان کے جاسوس ڈرائیوروں، خاکروبیوں، چرواہوں، بھکاریوں اور خوانچہ فروشوں کی شکل میں دیہاتوں سے لے کر کابل کی سرکاری عمارتوں کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض جاسوس جدید ترین حساس آلات سے لیس ہوتے تھے اور بحیرہ العقول معلومات حاصل کر کے اپنی قیادت کو پہنچاتے رہتے تھے۔

رحمت خان کی داستان: رحمت خان ایک ایسا ہی مرد مجاہد تھا جس نے اندھے فقیر کا بھیس بدل کر آٹھ سال تک مجاہدین کے لیے روسیوں کی جاسوس کی۔ وہ کابل کے فوجی ہیڈ کوارٹر کے سامنے سڑک پر بمبیک مانگا کرتا تھا۔ اس کی جیب میں ایک ننھا سا خود کار کیمبرہ ہوا کرتا تھا جو ایک سیکنڈ میں بارہ تصاویر اُتار سکتا تھا۔ مجاہدین کے چند مکائنڈروں کے سوا کوئی بھی رحمت خان کی اصلیت سے واقف نہیں تھا۔ رحمت خان کی جانب سے دی گئی معلومات اور تصویروں پر مبنی ٹھوس شواہد کے ذریعے مجاہد رہنمایہ جان لیتے تھے کہ کون لوگ روسیوں سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور کون سے خدائر مجاہدین میں شامل ہو کر کابل ہیڈ کوارٹر

سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ روسیوں کے ایسے وفاداروں کو نگاہ میں رکھا جاتا اور مزید ثبوت حاصل کرنے کے بعد انہیں ہلاک کر دیا جاتا۔ کئی برس بعد آخر ایک روسی افسر کو رحمت خان پر شک ہو گیا۔ اس نے اس کا تعاقب کیا اور کابل میں واقع اس کے خفیہ ٹھکانے پر چھاپہ مارا۔ وہاں ایک مجاہد تنظیم کے چند کارکن بھی موجود تھے۔ انہیں شہید کر دیا گیا۔ تلاشی لینے پر وہاں سے ایک فائل برآمد ہوئی جس میں افغانستان کے ایسے اڑھائی ہزار باشندوں کے کوائف موجود تھے جو روسیوں کے لیے کام کر رہے تھے۔ کمال یہ تھا کہ ہر ایک کی ایسی تصویر بھی چسپاں تھی جس میں وہ روسی افسران سے ملاقات کر رہا تھا۔ اس کے بعد رحمت خان کو فوجی ہیڈ کوارٹر کے سامنے سے بھیک مانگتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ جبر و تشدد کا ہر حربہ آزمانے کے باوجود روسی افسران اس سے کچھ نہ اگلواسکے۔ آخر کار اسے شہید کر دیا گیا۔ بہر حال افغانستان میں مجاہدین کے ایسے سرفروش جاسوس ختم نہ کیے جاسکے جو دشمنوں کی صفوں میں گھس کر ایک اعصاب شکن جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسے جاسوسوں کی اطلاعات پر ہی مجاہدین نے 28 فروری 1987ء کو مختار میں ”خاؤ“ کے چار کارندوں کو گرفتار کیا تھا۔ جنہیں مجاہدین کی شرعی عدالت نے فوری سماعت کے بعد پچاسی کی سزا سنائی تھی۔ ان جاسوسوں کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ وزراء، گورنر اور ان کے رشتہ دار تک ان کی نظروں میں رہتے تھے۔ چنانچہ مجاہدین ایسے لوگوں کو خاص طور پر حملوں کا نشانہ بناتے اور عموماً کامیاب رہتے۔ 2 جون 1987ء کو مجاہدین نے قندھار کے گورنر کے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ 7 جون کو اس خبر نے ذرائع ابلاغ میں بلی چل چادی کہ مجاہدین نے پکتیا کے گورنر کو اس کے چھ محافظوں سمیت قتل کر دیا ہے۔

نجیب کی طرف سے مجاہدین کو شراکت اقتدار کی دعوت: ادھر نجیب نے دنیا کو دھوکا دینے کے لیے جگ بندی کی مدت میں 18 اگست 1987ء تک توسیع کا اعلان کیا اور بزمِ خود ”سفیر امن و آشتی“ بننے کی کوشش کی مگر بے سود۔ جب یہ مدت اختتام پذیر ہوئی تو نجیب نے ایک اور چال چلی۔ اس نے مجاہدین کو شراکت اقتدار کی دعوت دے ڈالی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ وزارت خارجہ اور وزارت دفاع کو منتقلی کر کے، صدر اور نائب وزیر اعظم سمیت 26 وزارتوں کے عہدے مجاہد رہنماؤں کے سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہے۔ نجیب یہ سب کچھ روس کے کہنے پر کر رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح میدانِ جنگ میں ہریزہوں کے رسوا کن مناظر کا اختتام ہو اور مجاہدین عہدوں کی چھینا جھپٹی میں مصروف ہو کر منتشر ہو جائیں۔ مگر مجاہدین نے عواقب کا اندازہ کر کے اسے بھی مسترد کر دیا اور روسی افواج کے کھل انخلا اور کٹھ پتلی کا مکمل انتظامیہ کے خاتمے تک جہاد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔

نجیب اور مولانا جلال الدین حقانی کی مکاتبت: نجیب نے صلح کے اعلان کے دوران خط و کتابت کے ذریعے مجاہدین روڈ کو الگ الگ مٹانے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس نے مولانا جلال الدین حقانی کے نام اپنے خط میں لکھا:

”جاری جنگ میں ہماری اور آپ کی جانب سے بے گناہ مسلمان مارے جا رہے ہیں۔ پشتونوں اور افغانوں کے گاؤں اور مکانات تباہ ہو رہے ہیں، ہمارے وطن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ وطن اور قوم کی بربادی کو روکنے کے لیے ہم اپنی پارٹی کی جانب سے صلح کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ ہماری انقلابی حکومت الحیاء باللہ لاری نہیں، وہ اسلام کے مقدس نام کو بے اعتبار کرنے اور نظروں سے گرانے کا کوئی پروگرام نہیں رکھتی۔ آئین کی دوسری شق کے مطابق اسلام کا بحیثیت دین احترام کرنا سب پر واجب ہے۔ روسی انواع کے محدود فوجی دستے جب بھی صلح کے امکانات روشن دیکھیں گے تو ہم سے صلح دشورے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ روسی دستے افغانستان میں غیر ملکی مداخلت ختم کرنے آئے ہیں تاکہ افغانستان جلد ہی ایک مستقل اور آزاد غیر جانب دار مملکت بن جائے۔ ہم آپ کو آپ کی شخصی حیثیت اور عزت برقرار رکھنے کا مکمل یقین دلاتے ہیں اور عزم کرتے ہیں کہ ایک خوشحال، پاک، تقویٰ کی حامل اسلامی مملکت تشکیل دیں گے۔“

مولانا جلال الدین حقانی نے اس خط کا مندرجہ ذیل دعوایں جواب دیا۔

”آپ ایک طویل مدت سے کیونزم، سوشلزم اور الحاد و دہریت کے وکیل بنے ہوئے ہیں، ان کوششوں کے نتیجے میں افغانستان کی امت اور مجاہدین کی بڑی تعداد اپنے جگر گوشوں، بھائیوں اور والدین سے محروم ہو چکی ہے۔ دس لاکھ سے زائد مسلمان آپ کی ”برکات“ سے فیضیاب ہو کر روسیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں، جبکہ پچاس لاکھ سے زائد پردیس میں جلا وطنی کی زندگی کاٹ رہے ہیں۔ یہ بات تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ جس دن افغانستان میں سرخ استعمار کی حامی حکومت مستحکم ہو جائے گی، اسی دن روسی لوٹ جائیں گے، انہیں اس کے سوا اور چاہیے بھی کیا؟ یہاں تو وہ سخت پریشانی کے لم میں شب و روز کاٹ رہے ہیں۔

مجھے تعجب ہے کہ آپ نے تو اپنے اختیار کردہ راستے پر پورے غور و فکر سے قدم دھرا اور اشتراکی عقیدہ اختیار کیا ہوگا۔ پھر آپ نے آخر کیسے نام نہاد آئین کی دوسری شق میں اسلام کی بحیثیت دین تضمین پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اور کیا محض اس شق کی بدولت روسیوں کے مظالم، ستم، وحشت اور کئے دھرے سے نظریں پھیرنا ممکن ہے۔ پشتون کی مثال ہے کہ سورج کو دو انگلیوں سے نہیں

چھپایا جاسکا۔ یہ کوئی خواب نہیں جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ روسی افغانستان میں کس لیے آئے ہیں۔ کیا آپ کو گزشتہ آٹھ برس کے دوران خود اپنے بزرگوں اور کیونزم کے استادوں کے ساتھ بیٹی ہوئی داستان یاد نہیں۔ نور محمد ترہ کئی نے بھی قومی مصالحت کا اعلان کیا تھا۔ پھر وہ اپنے انجام کو پہنچا تو نئے آنے والے امین نے بھی قومی مصالحت کے اعلان میں عافیت جانی۔ لیکن اسے مہلت مل نہ پائی، جلد ہی قصر دارالامان میں روسیوں کی مرضی سے امین کے جسم کا گوشت اور ہڈیاں خاک میں ملا دی گئیں۔ پھر کارل نے آشتی ملی کے اعلان کے ساتھ بعض دکھاوے کی مذہبی رسومات کا اجرا کیا اور قیدیوں کو رہائی دینے کا اعلان بھی کیا۔ جونہی کارل کو پہلے جرنی جیل کے تاریک زندان میں دھکیلا گیا تو آپ نے اپنے بزرگوں کے اتباع میں وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اب آپ کی باری ہے۔ جلد ہی آپ کو اپنے دوست روسیوں کی مدد سے جیل یاموت میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ اگر آپ سنجیدگی سے اسلام، وطن اور ملت کی خدمت کے خواہش مند ہیں تو درج ذیل شرائط قبول کیجیے۔

خود کو ملت افغان اور اسلام کے علمبرداروں کے حوالے کر دیجیے۔ روسیوں کو غیر مشروط اختلاء پر مجبور کیجیے۔ اپنے ہاں موجود مرتد عناصر اور کیونزم کے فلسفے پر یقین رکھنے والوں کو قتل کر دیجیے۔ خوست، گردیز، ارگون جیسے کسی اہم علاقے کو مرکز قرار دے کر وہاں فوجی کارروائی بند کر دیجیے۔ جونہی آپ کی طرف سے یہ اقدامات کیے جائیں گے ہم آپ سے گفتگو اور ملنے پر غور کریں گے۔“

نجیب اللہ کو اس قدر دندان شکن جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے کچھ دنوں تک غور و فکر کے بعد اگلا خط روانہ کیا جس میں یہ تاثر دیا کہ اسے مولانا حقانی سے خاص تعلق ہے اور وہ انہیں بہت کچھ دینے کے لیے تیار ہے۔ چونکہ کمیونسٹ انقلابی ایک مدت سے مولانا حقانی کے قتل کا حکم جاری کر چکے تھے اس لیے نجیب نے اظہارِ دوستی کے لیے ساتھ ہی ایک سرکاری معافی نامہ بھی ارسال کیا جس میں یہ تحریر تھا کہ جلال الدین حقانی ولد فتح خان ساکن زوزان کے قتل کا حکم منسوخ کر کے انہیں معافی دی جاتی ہے۔ یہ خط 6 دسمبر 1987ء کو تحریر کیا گیا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا:

”میں نے آپ کے سوا کسی سے قلمی تعلقات نہیں رکھے، میں نے وطن، اسلام اور غیرت کی خاطر آپ کو معافی نامہ ارسال کیا ہے۔ اب ہمارے وطن میں بھڑکتے شعلوں کو بجھ جانا چاہیے۔ اس لیے ہمارا اور آپ کا ملنا نہایت ضروری ہے۔ آپ جو کچھ چاہتے ہیں میں آپ کو دینے پر تیار ہوں۔

ہم آپ کی اور وزان کی پگڑیاں نیچی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر آپ ملے میں کسی قسم کی چنگا پھٹ محسوس کرتے ہیں تو میں ملاقات سے قبل اپنے بیس اہم وزراء اور عہدے دار آپ کے پاس بطور یرغمال چھوڑنے کو تیار ہوں۔ ہم یہ مسئلہ گفتگو سے حل کرنا چاہتے ہیں۔ اب حالات کے بگڑنے اور وزان کے علاقے کی بیواؤں اور یتیموں کی ذمہ داری میرے بجائے آپ کے کندھے پر ہے۔ جن قیدیوں کو آپ رہا کرنا چاہتے ہیں ان کے کوائف روانہ کر دیں، میں سب کو رہا کر ادوں گا۔“

مولانا حقانی نے اس بار بھی ایمانی غیرت اور مومنانہ استقلال کا مظاہرہ کیا اور نجیب کی دسیہ کاریوں کا منہ توڑ جواب دیتے ہوئے لکھا:

”آپ کا معافی نامہ میرے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا، یہ اسلام اور وطن کے سامنے بیچ ہے، کیونکہ راہ اسلام میں شہادت میرے لیے وجہ افتخار ہے۔ روسی استعمار کے زیر سایہ رہنا خواہ کتنا ہی مقتدر اور مادی سہولیات سے لبریز ہو میرے لیے دنیا و آخرت میں طوق لعنت اور بے عزتی ہے۔ آپ نے تحریر کیا ہے کہ وطن میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹھنڈا ہو جانا چاہیے۔ یہ اچھی بات ہے لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ لہو کا یہ سیلاب روسیوں کے جلو میں آنے والے کیونزم کے مظالم کے سبب بہنا شروع ہوا ہے۔ اگر آپ اتنی قوت اور صلاحیت رکھتے ہیں کہ کیونزم کا خاتمہ کر سکیں تو پھر لہو کے یہ شعلے دھیمے پڑ سکتے ہیں۔“

آپ نے بھی یہی لکھا ہے کہ آپ وزان کی پگڑیاں نیچی نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ کتنی مرتبہ روسی ملیاؤں کی ہوائی اور توپ خانے کی زنی بمباری سے سینکڑوں بے گناہ معصوم بچوں، بیواؤں اور یتیموں کو اپنے ہی تباہ شدہ لمبے تلے چل دیا گیا۔ اب وزان کی پگڑیاں مزید کس حوالے سے بلند کرنا چاہتے ہیں۔ وزان کی عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرنے کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہے۔

قیدیوں کے بارے میں اتنا لکھ سکتا ہوں کہ اسلام کے نام پر گرفتار ہونے والے تمام افغانستان کے قیدی ہمارے بھائی ہیں اور اگر آپ کی مراد خاص پکیتیا یا وزان سے تعلق رکھنے والے قیدی ہیں تو صرف ان کی رہائی کی کوئی ضرورت نہیں۔ انہیں گرفتار ہی رکھیے۔“

مولانا حقانی کے دونوں جوابات نے نجیب کی چالاکی اور جرب زبانی پر خاک ڈال دی اور اسے دوبارہ کچھ لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

فتح قریب تر: جوں جوں سال 1987ء اختتام کی جانب سرک رہا تھا، مجاہدین کی فتح مندی کے آثار واضح تر ہوتے جا رہے تھے۔ گلبدین حکمت یار، احمد شاہ مسعود، مولوی محمد یونس خالص، برہان الدین

ربانی، مولوی محمد نبی محمدی، صبغت اللہ مجددی، پروفیسر سیاف اور دیگر مجاہد رہنماؤں کے بیانات اخبارات کی سرسرخوں کی زینت بننے لگے تھے۔ سات جماعتی اتحاد اب خاصا مضبوط ہو گیا تھا۔ مجاہد رہنما اب فتح یابی کی منزل کے بعد حکومت سازی کے مراحل کو قریب آتا دیکھ رہے تھے۔ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار اعلان کر رہے تھے کہ افغانستان میں عبوری حکومت کے لیے جلد انتخابات منعقد کیے جائیں گے۔

جنیوا مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں: مجاہدین کے اس استقلال کا نتیجہ نکلا کہ فروری 1982ء سے شروع ہونے والے جنیوا مذاکرات فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے لگے۔ روس، امریکا، پاکستان اور افغانستان کے نمائندے ساڑھے پانچ سال سے ان مذاکرات میں شریک تھے۔ روس نے اس سال انخلا پر پوری طرح آمادگی ظاہر کی مگر وہ واپسی کے لیے چار سال کی سہلت طلب کر رہا تھا۔ جبکہ حکومت پاکستان جلد از جلد انخلا پر زور دے رہی تھی۔

امریکی وزیر دفاع کا کہنا تو یہ تھا کہ جس طرح سوویت یونین نے دو ہفتے کے اندر ایک لاکھ بیس ہزار سپاہی داخل کیے تھے، اس طرح وہ دو ہفتے کے اندر انہیں واپس بھی لے جاسکتا ہے۔

1987ء کے جنگی اعداد و شمار: 1987ء میں مجاہدین اور روسی و افغان افواج میں کل 4776 معرکے ہوئے۔ روسی افواج نے مجاہدین پر 1692 حملے کیے جبکہ مجاہدین نے 2983 بار حملے کیے۔ ان معرکوں میں روس کے 272 ہیلی کاپٹر اور 246 جنگی طیارے تباہ ہوئے جن کا مجموعہ 518 ہوا ہے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل 1980ء سے 1986ء کے اواخر تک مجموعی طور پر چھ سو کے لگ بھگ ہیلی کاپٹر اور طیارے تباہ کیے جا چکے تھے۔

مجاہدین نے 1987ء میں 3746 روسی اور 6573 افغان سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ نیز 17535 ایسے سپاہی قتل کیے جن کے روسی یا افغان ہونے کی شناخت نہیں ہو سکی۔ مجموعی طور پر وہ حریف کے 18057 مرنے والے کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے جبکہ ان کے اپنے 2857 مرنے والے شہید ہوئے۔ یہ تعداد حریف کی نسبت چھٹا حصہ ہے۔ اس سے مجاہدین کی جنگی مہارت، حوصلہ مندی اور ان کے ساتھ نصرت خداوندی کی شمولیت کا یقین ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں مہاجرین افغانستان: 1987ء میں افغانستان کے کوہسار حملہ آور سرخ افواج کو مکمل شکست سے دوچار ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے اور مستقبل کے آئق پر سپیدہ نمودار ہونے لگا تھا لیکن ادھر پاکستان کی نئے مسائل سے دوچار ہو رہا تھا۔ روس کے ایجنٹ بڑی کامیابی سے یہ پرچار کر رہے تھے کہ

پاکستان کے نئے مسائل کی جزا افغان مہاجرین ہیں۔ 306 وسیع خیمہ بستوں کے علاوہ پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے یہ تیس لاکھ مہاجرین اب پاکستان کی آبادی کا حصہ بننے لگے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں کچھ مسائل تو واقعی ان کے بعض گروہوں کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے مگر بعض مسائل ان پر تھوپے بھی جا رہے تھے۔

اصل میں مہاجرین کے حالات، مسائل، ضروریات اور ان کی وجہ سے پیدا شدہ الجھنیں ہر جگہ یکساں نہیں تھیں۔ یہ مہاجرین کئی قسم کے تھے۔ ایک قسم مالدار اور بارسوخ خاندانوں کی تھی۔ یہ لوگ خاندانی جاگیر دار، رئیس اور جاہ و اقتدار کے مالک تھے۔ ان کی تعداد چندنی صد سے زائد نہیں تھی۔ بیرون ممالک میں بھی ان کے سرمایے کے ذخائر اور جائیدادیں تھیں۔ انہوں نے پاکستان میں کوٹھیاں خرید لیں اور آرام سے رہنے لگے۔ کچھ مدت بعد ان میں سے کچھ لوگ بھارت جا کر بمبئی یا دہلی میں بس گئے۔ بہت سے مغربی ممالک میں جا آباد ہوئے۔ ان میں سے زیادہ تر ماڈرن، لبرل یا بے دین تھے۔ دوسری قسم اعلیٰ سرکاری ملازمین، افسران اور تعلیم یافتہ افراد کی تھی۔ ان میں سے اساتذہ و انجینئرز، ڈاکٹر پروفیسر اور سائنس دان وغیرہ شامل تھے۔ ان کے جانے سے افغانستان کا ہر شعبہ بری طرح متاثر ہوا۔ ان میں آزاد خیال، قدامت پسند، دھریے اور اسلام پسند سب ملے جلتے تھے۔ تناسب کے لحاظ سے یہ بھی چند فیصد تھے۔ تیسری قسم ان متوسط سرمایہ داروں کی تھی جو اپنی جمع پونجی سمیٹ کر پاکستان آ گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر ٹرانسپورٹ یا ہوٹل سازی کے شعبے سے وابستہ تھے۔ ٹرانسپورٹروں کے پاس مال برداری کی گاڑیاں ٹرک وغیرہ پہلے سے موجود تھے جنہیں یہ ساتھ لے آئے تھے یا پاکستان آ کر نئی گاڑیاں خرید لی تھیں۔ یہ پاکستان کی ٹرانسپورٹ لائن میں کھپ گئے تھے۔ ہوٹل چلانے والوں نے پاکستان میں بھی شاہراہوں پر ہوٹل بنالئے۔

چوتھی قسم خانہ بدوشوں اور گلہ بانوں کی تھی۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں تھے جو اپنے مال موٹیٹی سمیت آتے تھے اور جہاں گاہوں کی تلاش میں علاقے تبدیل کرتے رہتے تھے اسی لیے ایک جگہ تک کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ یہ خود کفالتی اور جھاکشی کی زندگی گزار رہے تھے اور پاکستان کے لیے کسی مسئلے کا باعث نہیں تھے۔ پانچویں قسم ان شہری اور دیہی افراد کی تھی جو اپنا سب کچھ لٹا کر پاکستان آئے تھے اور مہاجر کیمپوں میں آ بسے تھے۔ ان کی تمام کفالت حکومت پاکستان سرکاری خزانے اور امدادی رقوم سے کر رہی تھی۔ 30 لاکھ مہاجرین میں اس قسم کے افراد کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔

جنرل ضیاء الحق نے ملکی خزانے کو ناقابل تھل بوجھ سے بچانے کے لیے انہیں اجازت دے دی تھی کہ

دہ کام کاج کر کے خود اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پال سکتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگ منت مزدوری یا چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے کراچی، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ جیسے بڑے شہروں میں آ جاتے تھے۔ اس طرح خیمہ بستیوں میں رش اور سرکاری خزانے پر دباؤ میں کچھ تخفیف ہو جاتی تھی۔ مگر اس آزادی کی وجہ سے مہاجرین کے روپ میں تخریب کاروں کا ایک ریلہ پاکستان میں پھیل گیا جس نے ضیاء الحق کی حکومت اور پاکستان کو شدید نقصان سے دو چار کیا۔

پاکستان تخریب کاری کی زد میں: تخریب کاری کا ہوش رہا سلسلہ 1986ء میں شروع ہو چکا تھا۔ مگر 1987ء میں یہ نہایت شدت اختیار کر گیا۔ کابل انتظامیہ اور خاد نے روسی انفران کے تعاون سے افغانستان میں کئی تربیتی کیمپ قائم کر دیے تھے جہاں ہزاروں تخریب کاروں کو تربیت دی جا رہی تھی۔ یہ تخریب کار مہاجرین کے بھیس میں آسانی سے سرحدیں عبور کر جاتے تھے۔ ان کی تباہ کاریوں نے پاکستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان دہشت گردانہ واقعات کی ایک جھلک دیکھئے۔

نیم فروری 1987ء: دو بم دھماکوں سے کوئٹہ کو قدرتی گیس فراہم کرنے والی پائپ لائن تباہ ہو گئی۔ کوئٹہ سے 80 کلومیٹر دور قلعہ عبداللہ کے قریب ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑا دیا گیا۔

❖ 8 فروری..... پشاور کے ایک بھرے بازار میں پارسل بم دھماکے سے تین افراد جاں بحق اور 26 زخمی ہو گئے۔

❖ 14 فروری..... بنوں میں ایک مسافر بس بم دھماکے سے تباہ ہو گئی۔ ایک بچے سمیت تین مسافر جاں بحق اور تین شدید زخمی ہو گئے۔

❖ 19 فروری..... پشاور میں ایک اسکول کے سامنے سڑک میں ہولناک بم دھماکا ہوا۔ جس سے تیرہ بچے اور راہ گیر جاں بحق جبکہ 50 سے زائد زخمی ہوئے۔ یہ حادثہ اتنا الم ناک تھا کہ پشاور کے شہری سراپا احتجاج بن گئے۔ بعض سازشی عناصر یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ تخریب کاری میں تمام مہاجرین اور مجاہدین ملوث ہیں۔ دوسرا پروپیگنڈا یہ تھا کہ تخریب کاری تو روس کر رہا ہے مگر اس کی وجہ پاکستان کا مہاجرین کو پناہ دینا تھا۔ گویا گھوم پھر کر ذمہ داری مہاجرین پر عائد ہوتی ہے یا حکومت پاکستان پر۔ چنانچہ ان پروپیگنڈوں سے متاثر افراد نے احتجاج کا رخ مہاجرین اور مجاہدین کی طرف پھیر دیا۔

❖ 21 فروری..... شہریوں کے ایک مشتعل گروہ نے پشاور میں قائم مجاہد تنظیموں کے دفاتر پر پہلے بول دیا۔ اگر انتظامیہ آڑے نہ آتی تو یقیناً خون خرابا ہو جاتا۔

❖ 14 مئی..... پشاور کے مرکز میں اڈے میں پارسل بم دھماکا ہوا، چار مسافر جاں بحق اور 40 کے قریب زخمی ہوئے۔

2 جون کو راولپنڈی کی ایک مارکیٹ میں ایسے ہی ایک دھماکے سے 27 افراد زخمی ہو گئے۔ اگلے ہی روز پشاور میں بم دھماکے سے دو افراد جاں بحق اور 24 زخمی ہو گئے۔

❖ 7 اگست..... پشاور میں جی ٹی روڈ پر ایک دکان میں بم دھماکا ہوا۔ اندر موجود تمام افراد ختم ہو گئے۔ دکان بلبے کا ڈھیر بن گئی۔ آس پاس موجود 34 افراد زخمی ہوئے۔

❖ 11 اگست..... مردان شہر میں تین دھماکوں میں 18 افراد لقمہ اجل بن گئے۔

❖ 7 ستمبر..... پشاور میں پھر دھماکا ہوا۔ دس جاں بحق اور 6 زخمی ہو گئے۔

❖ 12 ستمبر..... پاراچنار میں بارودی سرنگ پھٹنے سے پانچ افراد جاں بحق ہو گئے۔

تخریب کاری کا یہ ہولناک سلسلہ پورے سال جاری رہا۔ سرحدی شہروں کے بعد پنجاب بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

❖ 19 ستمبر..... راولپنڈی کے ہیرو دھالی اڈے پر بم دھماکا ہوا۔ 4 افراد جاں بحق اور 12 شدید زخمی ہو گئے۔

کراچی بھی تخریب کاروں کی یلغار کا شکار ہوا۔ 15 جولائی کو یہاں ایپریس مارکیٹ اور بوہری بازار میں 4 ہولناک بم دھماکے ہوئے جن میں 72 افراد جاں بحق اور اڑھائی سو زخمی ہوئے۔ شہر میں آگ سی لگ گئی۔ یہاں پہلے سے پٹھان مہاجر منافرت کی فضا موجود تھی۔ اس حادثے سے پٹھانوں اور افغانوں کے خلاف مزید اشتعال پھیل گیا۔

او جڑی کیسیب کا جگہ روز سانحہ: مجموعی طور پر 1987ء کے دوران پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں تخریب کاری کے 259 واقعات پیش آئے جن میں 264 قیمتی جانیں تلف ہوئیں اور 1069 افراد زخمی ہوئے۔

تخریب کاری کے واقعات کی یہ جھلک دکھانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین افغان مسئلے کے بارے میں ضیاء الحق حکومت پر پڑنے والے دباؤ کا اندازہ لگا سکیں۔

تخریب کاری کے اس سلسلے کا سب سے روح فرسا سانحہ 10 اپریل 1988ء کو راولپنڈی میں پیش آیا۔ یہاں شہری آبادی میں واقع قدیم اسلٹروڈ پو ”او جڑی کیپ“ اچانک شعلے اُگلنے لگا۔ یہاں ذخیرہ کیے گئے ہزاروں راکٹ اور میزائل لرزہ خیز دھماکوں کے ساتھ چلنے اور پھٹنے لگے۔ لگتا تھا اسلام آباد اور

راولپنڈی پر کسی دشمن فوج نے حملہ کر دیا ہے۔ اس سانحے میں 100 سے زائد شہری جاں بحق اور ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ زخمی ہوئے جبکہ چار پانچ ہزار مکانات مکمل یا جزوی طور پر تباہ ہوئے۔ ان دنوں ادھڑی کیپ افغان مجاہدین کے لیے امریکی اسلحے کی تازہ ترین کھیپ سے بھرا ہوا تھا۔ اس حادثے سے بیشتر اسلحہ تباہ ہو گیا۔ پاک فوج کے افسران اور جوانوں خصوصاً بمبر جنرل جاوید ناصر نے اس موقع پر بے پناہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان ہتھیلی پر رکھ کر ادھڑی کیپ کو باقی ماندہ اسلحے سے خالی کیا جس کے پھینکنے کا ہر آن خطرہ موجود تھا۔ اگرچہ اس حادثے کے اصل ذمہ داروں کا پتا نہ چلایا جاسکا مگر جس طرح روسی ایجنٹ سال بھر سے پاکستان کو تخریب کاری کا نشانہ بنا رہے تھے اسے دیکھتے ہوئے غالب قیاس یہی تھا کہ روس نے پاکستان کو سبق سکھانے کے لیے یہ انتہائی اقدام کیا ہے۔ اس اندازے کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ ان دنوں جیو انداکرات کا حتمی اجلاس ہونے والا تھا۔ معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ روس نے پاکستان کو ڈیورنڈ لائن کا مسئلہ دوبارہ کھڑا کرنے کی دھمکی بھی دی تھی مگر صدر ضیاء الحق مجاہدین کے مفادات کو نظر انداز کرنے والے اس معاہدے کو قبول کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ممکن ہے اس دھماکے کے ذریعے صدر ضیاء کو ”سیدھے ہو جانے“ کا پیغام دیا گیا ہو۔

تخریب کاری کا مقصد کیا تھا؟ بہر حال تخریب کاری کے اس اعصاب شکن سلسلے کا سب سے بڑا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ افغان مجاہدین کے بیس کیپ میں ابتری پھیلا دی جائے، ان کی سپلائی لائن کو کاٹ دیا جائے، افغان مہاجرین اور مجاہدین کو گلے لگا کر انصار کی سنت کو زندہ کرنے والے پاکستانیوں کا رویہ تبدیل کر دیا جائے اور حکومت پاکستان کو افغان مسئلے کے بارے میں اپنی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ افغانستان کی وادیوں میں ناکامی کا منہ دیکھنے والا سرخ رچھ میدان چھوڑنے سے پہلے آخری حربے کے طور پر یہ داؤد آزمایا تھا۔ اگر اہل پاکستان کی رائے عامہ مجاہدین اور افغان مہاجرین کے خلاف ہو جاتی تو لازماً ضیاء حکومت کو اپنی افغان پالیسی برقرار رکھنے میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس صورت میں حکومت پاکستان مجاہدین کی سرپرستی اور ان کی کفالت سے دست کش ہو سکتی تھی۔ اگر خدا نخواستہ ایسا ہو جاتا تو افغانستان کے میدانوں کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ مجاہدین کا نظم و ضبط درہم برہم ہو جاتا، ان کے حوصلے پست ہو جاتے، سودیت یونین ہاری ہوئی جنگ جیت جاتا اور تحریک جہاد افغانستان کا میابی کی منزل کے قریب پہنچ کر سبوتاژ ہو جاتی۔ مگر صدر ضیاء الحق نے اس سنگین صورت حال کا نہایت پامردی سے سامنا کیا اور تخریب کاری کی ہولناکیوں سے متاثر ہوئے بغیر جہاد افغانستان کی سرپرستی جاری رکھی۔

گورباچوف کا اعتراف شکست اور انخلا کا اعلان: افغان مجاہدین کے جہاد مسلسل اور اہل پاکستان کے بے لوث نصرت کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1987ء کے اختتام پذیر ہونے تک سوویت یونین نے عملاً اپنی شکست تسلیم کر لی اور افغانستان سے انخلا کے لیے پرتولنے شروع کر دیے۔ روسی حکمران صدر گورباچوف نے اچانک اعلان کر دیا کہ اگر جینو معاہدے پر 15 مارچ 1988ء تک دستخط کر دیے جائیں تو 15 مئی 1988ء کو روس اپنی افواج کا انخلا شروع کر دے گا اور 15 ماہ میں اس کی افواج کی واپسی مکمل ہو جائے گی۔ گورباچوف کے اس اعلان سے دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔ یہ واضح لفظوں میں اعتراف شکست تھا۔

روس اور امریکا کو اسلام سے خطرہ: سوویت یونین افغانستان سے جا رہا تھا مگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے بعد افغانستان میں ایک اسلامی حکومت قائم ہو جائے جو اس کے سر پر خطرے کی تلوار بن کر نکلتی رہے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ افغانستان سے نکل کر بھی یہاں اپنی حمایت یافتہ حکومت کو برقرار رکھے گا اور اس ملک کو اسلامی مملکت بننے کا وہ خواب پورا نہیں ہونے دے گا جو مجاہد رہنما دیکھتے آئے ہیں۔ سوویت یونین کی اس سوچ سے اس کے روایتی حریف امریکا کو بھی مکمل طور پر اتفاق تھا۔ امریکا پہلے تو صرف یہ چاہتا تھا کہ ایشیا میں سوویت یونین کے اثرات مزید بڑھنے نہ پائیں۔ افغانستان میں سوویت افواج کی تنہائی سے امریکا کا یہ ہدف پورا ہو گیا تھا اور اسے اطمینان ہو چکا تھا کہ سوویت یونین اب اس کے لیے کوئی بڑا خطرہ نہیں بن سکتا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اب امریکا کے سامنے ایک نیا مسئلہ اکھڑا ہوا تھا۔ وہ خود ان مجاہدین کو تشریش کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جو افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کا عزم کیے ہوئے تھے۔

روس اور امریکا کا گٹھ جوڑ: یہاں تاریخ ایک نئی کر دھ لیتی ہے اور ہم دو عالمی طاقتوں اور روایتی حریفوں کو اسلام کے خلاف ایک صف میں کھڑا دیکھتے ہیں۔ جینوا مذاکرات جن کے تحت روس نے افغانستان سے واپسی اختیار کی تھی دراصل روس اور امریکا کی اس مشترکہ سوچ کا نتیجہ تھے کہ روسی افواج کے افغانستان سے نکل جانے کے بعد وہاں کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں ہونی چاہیے۔ دونوں بڑی طاقتیں ”اسلام“ کو مستقبل قریب میں اپنا سب سے بڑا حریف تصور کرنے لگی تھیں۔ کیوں یہ ”اسلام“ ہی تھا جس نے ان دونوں میں سے ایک کو افغانستان کی وادیوں میں تاریخ کی عبرت ناک شکست سے دوچار کیا تھا۔

جہاد افغانستان کیا تھا؟ یہاں ہمیں ایک بار پھر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ جہاد افغانستان صرف افغانوں کی قومی لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ تمام عالم اسلام سے جمع ہونے والے پختہ فکر مسلمانوں کا مقدس جہاد تھا۔ ایشیا سے لے کر افریقہ تک ہر خطے کے فرزند ان توحید نے اس میں جانی و مالی استطاعت کے

مطابق حصہ لیا تھا۔ کراہوں مسلمان اور ان گنت اللہ کے برگزیدہ بندے اس جہاد میں فتح یابی کے لیے شب و روز دعا کیں کرتے رہے تھے۔ ان قربانیوں کے نتیجے میں نصرتِ الہیہ مسلمانوں کے شامل حال ہوئی اور سوویت یونین کا عفریت اپنی بے پناہ طاقت اور لامحدود وسائل کے باوجود رسوا کن ہزیمت سے دوچار ہوا۔ اس جہاد سے نہ صرف اس کی عسکری طاقت کو شدید نقصان پہنچا بلکہ اس کی اقتصادیات کا بھی جنازہ نکل گیا۔ یہی نہیں بلکہ خود کمیونزم کا باطل نظام لرزے لگا اور اس کا بودا پین پوری دنیا پر عیاں ہو گیا۔

امریکا کے عزائم: اس جہاد میں اگر امریکا اور روس مخالف ممالک نے مجاہدین کی مدد کی تھی تو اس میں انسانی ہمدردی یا جذباتِ حریت کی بے لوث حمایت کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ طاقتیں صرف اپنے سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی مفادات کے تحفظ کے لیے مجاہدین سے تعاون کر رہی تھیں۔ امریکا کا تو شروع سے وطیرہ رہا ہے کہ وہ اپنے حریف سے کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے اس کی مخالف قوموں کو مضبوط کر کے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی کوشش اس نے افغانستان میں اُس وقت کی جب اسے یقین ہو گیا کہ افغان مجاہدین پر سرمایہ کاری اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوگی۔

مگر جب جہاد کے ثمرات چننے کا وقت آیا تو امریکا کو یہ گوارا نہ ہوا کہ مجاہدین آزادانہ طور پر افغانستان کا مستقبل اپنے ہاتھوں میں لے سکیں۔ اس سلسلے میں امریکا نے 1985ء میں ہی پیش بندیاں شروع کر دی تھیں اور روسی حکام کو بھی اپنے خدشات سے آگاہ کر دیا تھا۔ جیو انڈا کرات کے نام پر ان طاقتوں میں جو گفتگو ہو رہی تھی اس کے ذریعے دونوں اپنے مفادات کا تحفظ چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ افغان مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح مشروط آزادی پر آمادہ کر لیا جائے تاکہ وہ مستقبل میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہ بن سکیں۔

یہ دونوں طاقتیں جانتی تھیں کہ اسلام کا سیاسی و معاشی نظام سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام پر فوقیت رکھتا ہے اور ان دونوں نظاموں کی بہ نسبت کہیں زیادہ فطری، آزمودہ، انسان دوست اور امن پرور ہے۔ انہیں احساس تھا کہ اسلامی نظریہ ہی کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظریے کا توڑ ثابت ہو سکتا ہے۔ جیو انڈا کرات میں سازشی دھندے: چنانچہ یہ دونوں طاغوتیں اپنے مفادات کے تحفظ اور اسلامی نظریے کے مقابلے کے لیے اپنے رویوں میں ہلک پیدا کرنے لگیں۔ انہوں نے کئی چیزوں پر اتفاق کر لیا اور جیو انڈا کرات کو جلد از جلد اس طور پر نتیجہ خیز بنانے کی کوششیں شروع کر دیں کہ روس اور امریکا کے مفادات محفوظ رہیں جبکہ مجاہدین کا کردار تانوی ہو جائے۔ 1982ء میں جب جیو انڈا کرات کا آغاز ہوا تھا تو اقوام متحدہ نے اس کے لیے چار نکاتی اصول وضع کیے تھے۔

- ۱۱ افغانستان کے اقتدار اعلیٰ، علاقائی سالمیت، سیاسی آزادی اور غیر جانبداری کا تحفظ کرنا۔
- ۱۲ افغان عوام کو بیرونی مداخلت کے بغیر اپنا سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام ترتیب دینے کا حق دینا۔
- ۱۳ افغانستان سے غیر ملکی افواج کی مکمل واپسی۔
- ۱۴ افغان مہاجرین کی بحفاظت واپسی کے لیے سازگار حالات مہیا کرنا۔

نیا ایجنڈا: یہ مذاکرات کئی سال تک نہایت ست رومی سے چلتے رہے مگر اب جبکہ فیصلہ کن موڑ آچکا تھا امریکا، سوویت یونین اور کابل انتظامیہ نے نہایت تیزی سے اس چار نکاتی فارمولے کی روح کو سرخ کرتے ہوئے نیا ایجنڈا تیار کیا۔ انہوں نے معاہدے میں ایسی شرائط شامل کر دیں جو افغان مجاہدین، مہاجرین اور ضیاء حکومت کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ ان شرائط میں یہ بھی شامل تھا کہ پاکستان افغان مسئلے سے یکسوئی اختیار کر لے گا اور مجاہدین سے تعاون ختم کر دے گا۔ مگر روس اور امریکا پر یہ پابندی عائد نہیں کی جارہی تھی بلکہ افغانستان کا مستقبل انہی کے سپرد کیا جا رہا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ افغان مجاہدین کو بھی اس معاہدے سے لائق رکھا جا رہا تھا۔

اس کے بعد ان طاقتوں نے جلد از جلد معاہدے پر دستخط کرانے کے لیے پاکستان پر دباؤ ڈالا شروع کر دیا۔ مذاکرات کو حتمی شکل دینے کے لیے 22 فروری 1986ء کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ امریکی نمائندوں نے دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ معاہدے کے بعد افغانستان کو خود مختاری اور سیاسی آزادی حاصل ہو جائے گی، روس اور امریکا اس ملک کے بارے میں عدم مداخلت کی پالیسی اپنائیں گے..... مگر روس کا کابل انتظامیہ کی اور امریکا کا اپنے حامیوں کی عسکری امداد بند کرنا معاہدے میں باقاعدہ تحریری طور پر شامل نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ صرف ایک چال تھی۔ اصل عزائم کچھ اور تھے۔ شیخ عبداللہ عزام شہید نے امریکا کی اس سازش کا پردہ چاک کرتے ہوئے تحریر کیا: ”امریکا کی کوشش ہے کہ وہ جہاد کے میدانوں پر قبضہ کر لے۔ جنگ کی زمام اسلام پسندوں سے چھین کر انہیں میدان سے دور کر دے۔“ (آیات الرحمن فی الافغان)

امریکا اب پاکستان کے ذریعے اسلام پسند مزاحمتی تنظیموں کو ملنے والی امداد روکنا چاہتا تھا اور اس کی بجائے افغانستان کے مزاحمتی گروپوں سے براہ راست روابط قائم کر کے ان سے سودے بازیاں کرنے کا خواہش مند تھا۔ یعنی جو گروپ امریکا کی پالیسیوں کا تحفظ کرنے کا معاہدہ کرتے، امریکا انہیں نوازتا اور جو گروپ بے پلک رویہ اختیار کرتے، امریکا انہیں عسکری، سیاسی اور اقتصادی امداد سے محروم کر کے دیوار سے لگانے کی کوشش کرتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مجاہدین امریکا نواز اور اسلام پسند دھڑوں میں تقسیم ہو جاتے

اور ان کے درمیان اقتدار کی جنگ چھڑ جاتی۔ روس کو یہ فائدہ حاصل ہوتا کہ اس کی کٹھ پتلی نجیب افغانستان کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع مل جاتا۔ اس سازش کا ایک مرحلہ یہ بھی تھا کہ افغانستان کو سیاسی طور پر چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور یہاں کوئی مضبوط مرکزی حکومت کبھی قائم نہ ہونے دی جائے۔

جینوا مذاکرات پر حکمت یار کا تبصرہ: اپریل 1988ء میں جینوا مذاکرات کا فیصلہ کن اجلاس شروع ہو گیا۔ وزیراعظم پاکستان محمد خان جوینجو معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے آمادہ تھے مگر صدر ضیاء الحق، وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان اور وزیر مملکت برائے خارجہ امور زین نورانی سمیت متعدد معاملہ فہم سیاست دانوں کی رائے اس کے برخلاف تھی۔ اس دوران 12 مارچ کو حزب اسلامی کے امیر گلبدین حکمت یار نے جینوا مذاکرات کے حوالے سے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ”روس مجاہدین کے ہاتھوں زچ ہو کر افغانستان سے اپنی واپسی کا اعلان کر رہا ہے مگر وہ ان لوگوں سے مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہے جو میدان جنگ میں اس کا مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ وہ مسئلہ افغانستان کے حل کے لیے بھاگ بھاگ کر وائٹنگن جاتا ہے اور اس طرح دنیا کو باور کرانا چاہتا ہے کہ جنگ افغان مجاہدین اور اس کے درمیان نہیں بلکہ امریکا اور اس کے مابین ہو رہی ہے۔ اس طرح وہ خود کو جھوٹی تسلی دے رہا ہے کہ ۱۰ ایک سپر پاور سے لڑ کر واپس جا رہا ہے۔ حالاں کہ دنیا جانتی ہے افغانستان میں امریکی فوجیں نہیں ہیں بلکہ مجاہدین لڑ رہے ہیں مگر جینوا مذاکرات میں مجاہدین کا کوئی حصہ نہیں۔ اس قسم کے معاہدے سے افغانستان میں اسن قائم ہو سکتا ہے نہ مہاجرین اپنے وطن واپس جاسکتے ہیں۔“ (نوائے وقت، 12 مارچ 1988ء)

محمد خان جوینجو نے جینوا معاہدے پر دستخط کر دیے: بہر کیف 14 مارچ 1988ء کو محمد خان جوینجو نے جینوا معاہدے پر دستخط کر دیے۔ اس طرح مسئلہ افغانستان کے بارے میں اصولاً پاکستان کا کردار ختم ہو گیا اور یہ معاملہ روس اور امریکا کے رحم و کرم پر رہ گیا۔ مجاہدین کی قوت، تنظیم اور اتحاد کو اس سے شدید دھچکا لگا۔ صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق جو کہ افغانستان میں ایک پاکستان دوست اور اسلام پسند حکومت کے خواہاں تھے اپنے منصوبوں کو تکمیل تک پہنچانے سے قاصر ہو گئے۔ وزیر خارجہ پاکستان صاحبزادہ یعقوب خان نے جوینجو کے اس فیصلے پر احتجاجاً استعفا دے دیا۔

معروف دانشور ریڈائے سلہری نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا: ”مجھے نظر آ رہا ہے کہ ہم نے آہستہ آہستہ قدم بقدم پاکستان اور افغانستان میں اپنے ذہنی اُحد کی خلیج کی طرف پلٹنا اور کھٹکا شروع کر دیا جو بد قسمتی اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے آٹھ دس سال پہلے دو برابر اسلامی ملکوں میں حاصل تھی اور جسے بفضل تعالیٰ افغان مجاہدین اور مہاجرین نے پاٹ دیا ہے۔ معاہدہ جینوا پاکستان کی کشمیر اور مشرقی

پاکستان سے محرومیوں کے سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔“ (مسئلہ افغانستان، ص: 547)

بہر کیف جنیوا معاہدے کی رُو سے 15 مئی 1988ء کو روسی افواج آہستہ آہستہ دریائے آمو کے پار اتر تاشروغ ہو گئیں مگر جاتے جاتے روس نجیب انظامیہ کی حفاظت کے زبردست انتظامات کر کے جا رہا تھا۔ نجیب کو اتنا اسلحہ فراہم کر دیا گیا تھا جو کئی سالوں کی جنگ کے لیے کافی تھا۔ روسی افسران اور مشیر اب بھی اس سے تعاون کے لیے موجود تھے مگر پاکستان اب افغان مسئلے میں فعال کردار ادا کرنے سے قاصر ہو گیا تھا۔

جونیو حکومت برطرف: جنیوا معاہدے نے جہاد افغانستان کے شیدائی صدر ضیاء الحق کی اُمیدوں پر اس طرح پانی پھیرا کہ وہ منتخب جمہوری حکومت سے بدلہ ہو گئے۔ چنانچہ صرف ڈیڑھ ماہ بعد 29 مئی کو انہوں نے صدارتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسمبلیوں اور رسول حکومتوں کی بساط پلٹ دی۔ اس اقدام سے ان کے مخالف حلقوں کی افرادی قوت بڑھتی چلی گئی اور اندرون خاندان کے خلاف سازشوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

جون میں انہوں نے شریعت آرڈی نہیں جاری کر کے پاکستان میں اسلامی نظام کی بالادستی کی جانب ایک اہم پیش رفت کی۔ 14 اگست کو قوم سے آخری خطاب میں اس مرد مومن نے کہا: ”لاکھوں مسلمان خون کے دریا پار کر کے پاکستان آئے تھے، کیوں کہ وہ پاکستان کو اپنی آخری پناہ گاہ سمجھتے تھے۔ تحریک آزادی کے تمام شہیدوں اور بہادروں کو ہمارا سلام..... ہماری حکومت پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنائے گی تاکہ قیام پاکستان کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔ اسلام ایسا رشتہ ہے جو قوم کے اتحاد کی بنیاد ہے۔ اسلام کو باقی تمام باتوں پر بالادستی حاصل ہے۔“

صدر ضیاء الحق کی المناک شہادت: اس تقریر کے تیسرے دن 17 اگست کو بہاولپور ایئر بیس سے ان کا طیارہ اُڑا اور چند لمحوں بعد فضا میں اس کے پرے نچے اڑ گئے۔ جہاد افغان میں صفِ اول کے سپاہی کا کردار ادا کرنے والا یہ مسلم حکمران پورے عالم اسلام کو سو گوار کر گیا۔ اس کے جنازے میں پندرہ بیس لاکھ افراد کی شرکت یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی کہ قوم اسے امر کی مہرہ نہیں مردِ مجاہد تصور کرتی تھی اور جہاد افغانستان کے بارے میں اس کی پالیسی پر اعتماد کرتی تھی۔ صدر ضیاء الحق کی شہادت کے پس پردہ سازشوں کا مجید آج تک نہیں کھل سکا۔ زیادہ شک روس یا امریکا پر ہی کیا جاتا ہے۔ روس کی صدر ضیاء الحق سے دشمنی تو بالکل واضح ہے مگر امریکا بھی مسئلہ افغانستان کے بارے میں صدر ضیاء الحق کے کردار کو اپنی آئندہ پالیسیوں کے حوالے سے خطرناک تصور کرتا تھا۔ اس لیے یہاں سی آئی اے کا ملوث ہونا قطعاً

بید نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ”کے جی بی“ اور ”سی آئی اے“ دونوں کے اشتراک سے یہ کھیل کھیلایا گیا ہو۔

جہاد افغانستان کا نیا دور: جنیوا معاہدے اور صدر ضیاء الحق کی شہادت کے بعد جہاد افغانستان اپنی تاریخ کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ ایک ایسا دور جس میں مجاہدین کو اپنی جنگ خود لڑنا تھی۔ محبت اور اعتماد کے رشتوں کو ٹھیس پہنچانے والے امریکی ایجنٹ اب ان کی صفوں میں داخل ہو چکے تھے اور چند گام پر نظر آنے والی منزل خاصی دور ہو گئی تھی۔ مگر مجاہد رہنماؤں نے صدر ضیاء الحق کی شہادت کا صدمہ برداشت کرتے ہوئے اپنے حوصلے برقرار رکھے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے دی اور روس کو یہ موقع نہ دیا کہ وہ انخلا کے وعدے سے منحرف ہو سکے یا اپنے عزائم کو دوبارہ پروان چڑھانے کی ہمت کرے۔ انہوں نے دنیا کو یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ جنیوا معاہدے سے ان کی قوت کو دھچکا لگا ہے۔ وہ میدانوں میں اپنی جنگ لگاتار لڑتے رہے۔

ضیاء الحق کے بعد ان کی سخت ترین سیاسی حریف پیپلز پارٹی کی رہنما بے نظیر بھٹو سیاسی ونگل جیت کر نومبر 1988ء میں پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہو گئی تھیں۔ مجاہدین نے اس تبدیلی کو بھی اپنے عزائم کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا۔



مآخذ و مراجع

- ♣..... تاریخ جہاد افغانستان۔ ڈاکٹر ایچ بی خان
- ♣..... افغانستان ایک قوم کا الیہ۔ احمد شجاع پاشا
- ♣..... آیات الرحمن فی افغان۔ شیخ عبداللہ عزام شہید
- ♣..... ماہنامہ صدائے مجاہد: جلد 1988ء، 1989ء،
- ♣..... ماہنامہ الارشاد: جلد 1988ء، 1989ء،
- ♣..... ہفت روزہ بکیر: جلد 1988ء، 1989ء،
- ♣..... ماہنامہ الحق اکوڑہ تنک: مارچ 1988ء
- ♣..... اردو ڈائجسٹ: مارچ 1989ء، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، جہاد افغانستان نمبر فروری 1990ء، جون 1992ء، شہید پاکستان ضیاء الحق نمبر اگست 1989ء، اگست 1990ء

اٹھائیسواں باب

سرخ پچھ کی شکست اور نجیب اللہ کی خلاف جہاد

مجاہدین کے لیے نجیب اور روسیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ پوری ہمت اور اشتقامت سے نجیب کے خلاف معرکہ آراء رہے۔ مشرقی اور جنوبی افغانستان میں نہایت ہولناک جنگیں شروع ہو گئیں۔ مجاہدین اب مورچوں، چوکیوں، چھاؤنیوں اور قلعوں پر بڑے بڑے حملے کر رہے تھے۔ 9 ستمبر 1988ء کو جنوبی افغانستان کا قصبہ اسپین بولدک مجاہدین کے قبضے میں آ گیا جس سے قندھار کی طرف پیش قدمی کا راستہ کھل گیا۔

دوسری طرف 30 ستمبر کو مجاہدین نے صوبہ پکتیکا کی مرکزی چھاؤنی ”ارگون“ کے راستے میں واقع ”زامہ خولہ پوسٹ“ پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں 22 مجاہدین زخمی جبکہ ایک شہید ہوا۔ پوسٹ سے 52 دشمنوں کو زخمی و گرفتار کر لیا گیا۔ اس مہم کی قیادت حرکت الجہاد الاسلامی کے نامور گوریلا لیڈر، کمانڈر خالد زبیر کر رہے تھے۔ اگلے چند دنوں میں شرناور ارگون چھاؤنی سمیت پورا پکتیکا مجاہدین کے قبضے میں آ گیا۔

15 فروری 1989ء روسی افغانستان سے نکل گئے: انہی معرکوں کے دوران 1989ء کا آغاز ہوا۔ اس سال 15 فروری کا دن افغانستان کی تاریخ میں کبھی نہ بھلایا جاسکے گا۔ یہ وہ دن تھا جب روس کی سرخ فوج کا اختلاء مکمل ہوا اور اس کا آخری سپاہی بھی دریائے آمو کے پار چلا گیا۔ یاد رہے کہ 1987ء کے اواخر میں جنیوا معاہدے کو نتیجہ خیز بنا کر اپنی افواج کے اخلاکاً وعدہ کرتے ہوئے گورباچوف نے اس مقصد کے لیے 15 ماہ کی مہلت طلب کی تھی مگر جنیوا معاہدے کے بعد روس نے صرف 8 ماہ کے اندر افواج کی واپسی مکمل کر لی۔ یہ مجاہدین کا خوف نہیں تو اور کیا تھا؟ اس تاریخی واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو ڈائجسٹ کے مدیر اور ممتاز صحافی الطاف حسن قریشی لکھتے ہیں: ”15 فروری 1989ء کو افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کا واقعہ کسی طور بھی بیسویں صدی کے بہت بڑے سیاسی معجزے سے کم نہیں۔ آزاد اور غیور افغان مجاہدین کی ہمالیہ ایسی عزیمت اور ایمانی قوت نے اور

سندروں جیسی گہری وطن کی محبت اور تاریخی شعور نے اشتراکی فلسفے، طرز حیات اور سرخ استعمار کو اس قدر ذلت آمیز شکست دی ہے کہ اس کے جلال و ہیبت کا سینہ شش ہو گیا ہے۔ روسی قیادت کو یہ اعتراف کرنا پڑا ہے کہ افغانستان میں فوجیں بھیج کر اس نے سخت غلطی کی تھی اور آئندہ ایسی غلطی کسی بھی جگہ نہیں دہرائی جائے گی۔“ (اُردو ڈائجسٹ، مارچ 1989ء)

مجاہدین جلال آباد کی دہلیز پر: روسی افواج کے ٹکٹے ہی مجاہدین نے افغانستان کے بڑے اور مرکزی شہروں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ موسم بہار میں وہ جلال آباد کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ٹرنخیل چھاؤنی فتح ہو چکی تھی جسے جلال آباد کے لیے ریڑھ کی ہڈی کے مترادف کہا جاتا تھا۔ مجاہدین شہر کے محاصرے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عالمی طاقتیں جو مجاہدین کو لڑانے میں ناکام ہو چکی تھیں، نجیب کو خطرے کی زد میں دیکھ کر سبکریاں تھیں۔

سومناٹ کے پجاری غزنوی کے دیس میں: بھارت بھی افغانستان میں پاکستان دوست اسلامی حکومت کے قیام کے امکانات سے خوفزدہ تھا۔ چنانچہ ان دنوں اس نے افغانستان میں مداخلت کا آغاز کر دیا اور اپنے مفادات کے تحفظ اور روس کا حق خدمت ادا کرنے کے لیے نجیب کی بھرپور مدد شروع کر دی۔ نجیب کے ”را“ سے گہرے تعلقات رہے تھے اس لیے بھارتی لابی نجیب کو اپنا دوست تصور کرتی تھی۔ جلال آباد کو مجاہدین کے زعمے میں آٹا دیکھ کر بھارت نے ہماری جنگی ساز و سامان سمیت اپنے 600 عسکری مشیر اور کئی فوجی طیارے کاٹل اُتار دیے۔ لیفٹیننٹ جنرل گہتا اور میجر جنرل مدن کار نے کاٹل میں کیونسٹ فوجیوں کی تربیت شروع کر دی۔ اگلے ماہ جلال آباد کو بچانے کے لیے کاٹل سے آٹھ ڈیڑھ لاکھ گرویز سے دو بریگیڈ اور ہرات سے ایک بریگیڈ فوج جلال آباد میں جمع ہو چکی تھی۔

روسی اسلحے کی تازہ کھپی: روس نے اپنی افواج کے انخلاء کے باوجود نجیب انتظامیہ کی مدد کا فیصلہ کیا تھا اس لیے وہ بھی ہر ممکن طور پر اس سے تعاون کر رہا تھا۔ جلال آباد کی جنگ میں اس کے افسران اور مشیر شریک تھے۔ اس کے علاوہ نجیب کو خفیہ طور پر چار سو نئے ٹینکوں اور 20 توپاں بمبار طیاروں کا تحفہ بھی پہنچا دیا گیا تھا اور مزید 31 طیارے بھیجے کا وعدہ کیا تھا۔ ادھر مجاہدین جلال آباد کے علاوہ ایک سمت سے کاٹل کی طرف بھی بڑھ رہے تھے۔ 11 رجمن کو انہوں نے کاٹل ایئر پورٹ پر راکٹوں سے زبردست حملہ کیا۔ مجاہدین کا کہنا تھا کہ انہوں نے کاٹل انتظامیہ کی ٹین میں سے دو دو قومی لائسنس توڑ دی ہیں اور اب دوشمیر سے صرف تین کلومیٹر دور رہ گئے ہیں۔

نجیب محل چھوڑنے پر مجبور: اگلے دنوں میں کاٹل پر مجاہدین کی راکٹ باری اتنی شدید ہو گئی کہ نجیب

کے لیے صدارتی محل محفوظ نہ رہا اور اس نے فوجی ہیڈ کوارٹر میں رہائش اختیار کر لی۔ ادھر روس اپنے بچے ہوئے مہرے کی مدد کے لیے مسلسل امداد بھیج رہا تھا۔ اس نے دو سو جدید ترین ٹینک، اسلحے کے لکڑے ہوئے چھ سو ٹرک اور کئی فوجی دستے کا بل بھیج دیے۔

1989ء کے حالات، دو سو اضلاع پر قبضہ: اگرچہ کابل کو مجاہدین تین سال بعد فتح کر سکے اور جلال آباد کی فتح میں بھی خلاف توقع تاخیر ہوتی گئی مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ مجاہدین ان مرکزی پرشہروں پر قبضے سے پہلے باقی افغانستان میں اپنے قدم زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ مجاہدین نے اپنی ساری طاقت جلال آباد یا کابل پر مرکوز نہیں کی بلکہ پورے ملک میں تسلسل کے ساتھ کارروائیاں جاری رکھیں۔ روسی افواج کے انخلاء کے صرف چھ ماہ کے اندر اندر انہوں نے ملک بھر میں دو سو اضلاع اور تحصیلوں اور کئی صوبائی دارالحکومتوں پر قبضہ کر لیا۔ 10 جون کو انہوں نے مزار شریف میں گولہ بارود کے ایک بڑے ذخیرے کو نشانہ بنایا، اس حملے میں سات ہزار چار سو ٹن گولہ بارود اور ہتھیاروں سمیت ایک سو ستر ٹینک بھی تباہ ہوئے۔ 25 جون 1989ء کو مجاہدین نے کابل کے شمال میں پروان کی ایک فوجی چوکی حسین کوٹ پر قبضہ کر لیا۔ 27 جون کو کابل کا سب ڈویژن ”بچہ کوٹ“ مجاہدین کے قبضے میں آ گیا۔

یاسر عرفات کا دورہ کابل: انہی دنوں تنظیم آزادی فلسطین کے رہنما یاسر عرفات کابل کے دورے پر آئے۔ ان کا مقصد کابل انتظامیہ اور مجاہدین میں تصفیہ کرنا تھا مگر مجاہدین نے ان کے کسی بھی فارمولے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یاسر عرفات 15 فیصد رقبے پر قابض کابل انتظامیہ کو افغانستان کی حکومت باور کر رہے تھے جب کہ 85 فیصد پر تسلط رکھنے والے مجاہدین کی عبوری حکومت کو انہوں نے افغانستان کی نمائندہ حکومت تسلیم نہیں کیا تھا جب کہ مجاہدین کا اعلان تھا کہ جب تک ان کی عبوری حکومت کو افغانستان کی نمائندہ حکومت نہیں مانا جاتا وہ کسی سے مذاکرات نہیں کریں گے۔

عام معافی کا اعلان: حالات یہ تھے کہ ظالموں کا یوم حساب قریب نظر آتا تھا۔ 16 لاکھ افغان مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے میں روسیوں کا ساتھ دینے والے کمیونسٹوں کے اقتدار کے دن گئے جا چکے تھے۔ مجاہدین کی عبوری حکومت بھی قائم ہو گئی تھی جس کے وزیر اعظم پروفیسر عبدالرب رسول سیاف مقرر ہوئے تھے۔ اسی عبوری حکومت نے ایک ایسا اعلان کیا جس سے دنیا کی بڑی بڑی مہذب اور تعلیم یافتہ اقوام سرگرمیاں رہ گئیں۔ مجاہدین کی عبوری حکومت نے فیصلہ سنایا: ”ہم ان لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کرتے ہیں جو دشمن کے دھوکے میں آ گئے، ہم ایسے افراد سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، ہم نجیب حکومت سے منحرف ہونے والے تمام افراد کو جان و مال کی امان دیں گے۔“

اسلامی اخلاق کی عظیم تعلیمات پر بنی اس اعلان نے ملک میں قیام امن کو آسان کر دیا، ساتھ ہی مخالفین کی حکومت میں ہل چل بچ گئی۔ ہر صوبے سے کابل انتظامیہ کے سپاہی بھاگ بھاگ کر مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونے لگے۔ کئی پاکستانی بلی کاپٹروں اور طیاروں سمیت ان سے آٹے حتیٰ کہ اسلام آباد میں متعین افغان سفیر عبدالوکیل بہرہ مند نے بھی مجاہدین کی عبوری حکومت کے ماتحت آنے کا اعلان کر دیا۔

نجیب کی طرف سے صلح کی تجاویز: مجاہدین اور نجیب انتظامیہ کے درمیان معرکوں کا سلسلہ تیز تر ہوتا گیا۔ کابل پر مجاہدین کے راکٹ اور میزائل حملے جاری رہے۔ مجبور ہو کر اگست 1989ء میں نجیب نے مجاہدین کو صلح کی پیش کش کی جو چند تجاویز پر مشتمل تھی مگر مجاہدین نے اسے مسترد کر دیا۔ مجاہدین کی عبوری حکومت کے وزیراعظم پروفسر سیاف نے کہا کہ ڈاکٹر نجیب کے لیے صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت خود کو ہمارے حوالے کر دیں۔

خوست کی جنگ: اگست 1989ء میں خوست ایک بار شدید جنگ کی لپیٹ میں آ گیا۔ دو ہفتوں کی خون ریز جھڑپوں میں دو ہزار سے زائد کیونٹ سپاہی ہلاک اور 500 کے قریب گرفتار ہوئے۔ ستمبر میں بھی خوست کا معرکہ جاری رہا۔ اس میں دونوں جانب کے جانی نقصانات غیر معمولی تھے۔ یاد رہے کہ مشرقی افغانستان کے اکثر معرکوں میں پاکستانی مجاہدین تنظیمیں پیش پیش رہتی تھیں، جن میں حرکت الجہاد الاسلامی اور حرکت المجاہدین کے باہمت اور دلیر مجاہدوں کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں۔

شیخ عبداللہ عزام کی شہادت: مجاہدین کے لیے اس سال کا سب سے بڑا سانحہ شیخ عبداللہ العزام کی شہادت تھا۔ جو عرب مجاہدین کے سربراہ اور عالم عرب میں جہاد کے سب سے بڑے نقیب تھے۔ افغان جہاد میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ شیخ 1941ء میں فلسطین میں پیدا ہوئے تھے۔ یہودی درندوں کے مظالم اور انگریز استعمار کی چیرہ دستیوں نے فلسطینیوں پر عرصہ حیات تک کر رکھا تھا اور فلسطینی نہایت کسمپرسی کے عالم میں اپنی بقاء کی جدوجہد کر رہے تھے۔ شیخ نے قیام اسرائیل کے بعد کم عمری میں فلسطین مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو کر برطانوی اور اسرائیلی افواج کے خلاف مزاحمت میں حصہ لیا۔ بعد میں حالات زیادہ خراب ہونے پر وہ مہاجرین کے ساتھ مشرقی اردن آ گئے۔ ابتدائی تعلیم اردن میں حاصل کرنے کے بعد الشریعہ کالج دمشق سے 1966ء میں بی اے کیا اور عثمان کے ایک اسکول میں تدریس شروع کر دی۔ 1969ء میں انہوں نے اردن یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس دوران وہ ایک بار پھر ارض فلسطین کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اسرائیل کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے۔ وہ شام اور فلسطین میں کئی برس تک گوریلا کارروائیوں میں مصروف رہے۔ اس دوران انہوں

نے تنظیم آزادی فلسطین کے لادینی نظریات کی پرزور تردید کی اور یاسر عرفات کو یہ سمجھانے کی بڑی کوشش کی کہ وہ اپنی تحریک کی بنیاد عصیت اور لادینیت کی بجائے اسلام اور دینی اخوت پر رکھیں اور اسے جہاد فی سبیل اللہ کے فریضے کے طور پر انجام دیں۔ مگر یاسر عرفات روس سے اتنے متاثر تھے کہ قائل نہ ہو سکے۔ اپنی کوششیں رائگاں دیکھ کر شیخ دوبارہ درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔

اس دوران انہوں نے 1973ء میں جامعۃ الازہر سے اصول فقہ میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ 1980ء تک وہ اردن یونیورسٹی میں شریعت کالج کے استاد کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران ان کی علمی صلاحیتوں کا چرچا دور دور تک ہو چکا تھا۔ چنانچہ 1981ء میں انہیں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں تدریس کی پیش کش کی گئی۔ چنانچہ موصوف اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ وہ پہلے سے ذہنی طور پر افغان جہاد سے پوری طرح ہم آہنگ اور اس کے پر جوش حامی تھے۔ پاکستان میں رہ کر انہیں مجاہد ہمناموں سے قریبی روابط قائم کرنے کا موقع ملا اور ان کے جذبہ جہاد میں شدت آ گئی۔ انہوں نے اپنی ملازمت سے قتل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر افغانستان کا رخ کیا اور خود کو جہاد کے لیے وقف کر دیا۔ عرب نوجوانوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لیے، انہوں نے جگہ جگہ تقاریر کیں جن سے لاکھوں لوگ متاثر ہوئے اور نہایت مؤثر رسالے، پمفلٹ اور مضامین لکھے۔ آپ کی تصنیف ”آیات الرحمن فی جہاد افغان“ نے دنیائے عرب میں جہاد کا ایک نیا دلولہ پیدا کر دیا۔ آپ کی تقاریر اور تحریروں نے ہزاروں عرب نوجوانوں کو افغانستان میں روسیوں کے بالمقابل لاکھڑا کیا۔ سینکڑوں عرب شیوخ نے اپنی تجویزوں کے منہ مجاہدین کے لیے کھول دیے۔ افغانستان میں لڑنے والے عرب مجاہدین ان کی کمان میں جہاد کرتے تھے اور ان کے بیانات اور تقاریر سے روحانی غذا حاصل کرتے تھے۔ آپ نے احیائے جہاد کے لیے ایک ماہنامہ ”الجباد“ بھی جاری کیا۔ جمعہ 24 نومبر 1989ء کو وہ اپنے دو بیٹوں 18 سالہ محمد اور 7 سالہ ابراہیم کے ساتھ یونیورسٹی ٹاؤن پشاور کی مسجد میں خطبہ دینے جا رہے تھے کہ راستے میں نامعلوم تخریب کاروں نے ان کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا۔ شیخ اپنے دونوں بچوں سمیت موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون... شیخ کی وفات پر جہاد افغانستان کا ایک باب بند ہو گیا مگر انہوں نے جن نوجوانوں کو جہاد کا سبق پڑھا دیا تھا وہ نہ صرف افغانستان بلکہ دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لیے کربت ہو چکے تھے۔

شیخ خیم عدنانی کی وفات: 18 اکتوبر 1989ء کا دن بھی مجاہدین کے لیے حسرت انگیز تھا۔ اس دن انہیں شیخ خیم محمد العدنانی کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا تھا۔ شیخ موصوف عرب مجاہدین کے ہر دل عزیز رہنا

اور شیخ عبداللہ العزام کے دست راست تھے۔ وہ 1942ء میں بیت المقدس میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے مصر سے سیاسیات اور اقتصادیات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ بعد میں وہ سعودی عرب میں ایک اعلیٰ عہدے پر ملازم ہو گئے۔ انہیں ماہانہ 24 ہزار ریال تنخواہ ملتی تھی مگر جب افغان جہاد شروع ہوا تو انہوں نے خود کو اس کا آوازہ بلند کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ ساتھ ساتھ یہ گاہے افغانستان آتے اور یہ رقم مجاہدین کے فنڈ میں دے دیتے۔ ان کا اکثر وقت عالم عرب میں جہاد کا صورت پھونکتے ہوئے گزرتا۔ بعد میں انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اہل و عیال کے ساتھ پاکستان آ گئے اور شیخ عزام کے شانہ شہانہ کام کرنے لگے۔ وہ مجاہدین کے ساتھ اگلے مورچوں پر لڑتے اور خود راتوں کو پہرہ دیتے۔

ان کی خواہش تھی افغانستان میں ایک مثال اسلامی حکومت قائم ہو جس کے سپاہی قدم بقدم آگے بڑھتے ہوئے مسجد اقصیٰ کو پنجہ یہود سے آزاد کرائیں۔ شیخ عربی اور انگلش کے زبردست مقرر تھے۔ دنیا بھر میں اس بارے میں تقاریر کرتے اور پرمغز لکچر دیتے۔ ان کی بلند ہمتی کا یہ عالم تھا کہ ایک معرکے میں مجاہدین دشمن کے گھیرے میں آ گئے۔۔۔۔۔ انہوں نے دائر لیس پر اپنی قیادت سے مدد طلب کی۔ چنانچہ وہاں سے مجاہدین کا ایک گروپ کمک کے لیے روانہ ہونے لگا۔ شیخ نسیم بیاری اور ضعف کے باوجود اس گروپ کے ساتھ چل پڑے۔ پروفیسر سیاف نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو بولے: ”مجھے گھسٹ گھسٹ کر بھی اگلے مورچوں پر جانا پڑے تو جاؤں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میری تقاریر سن کر اپنی جانیں داؤ پر لگانے والے دشمن کے محاصرے میں ہوں اور میں یہاں بیٹھا رہوں۔“ چنانچہ شیخ اگلے مورچوں پر پہنچ گئے اور دشمن کی ہولناک گولہ باری اور بموں کی بارش میں چار گھنٹے تک مجاہدین کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو فتح عنایت کی۔ موصوف احیائے جہاد کے عالمی دورے پر تھے۔ اس دوران فلوریڈا (امریکا) میں مقیم مسلمانوں کی ایک تقریب سے خطاب کیا اور اس کے بعد دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

نوٹ: عرب مجاہدین کے ایمان افروز حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ان پر سینکڑوں اور اقل لکھ دیے جائیں مگر اس طرح ہمارا سلسلہ تاریخ مزید طوالت اختیار کر جائے جب کہ ہم اختصار کے درپے ہیں۔ اس لیے موضوع کو سینٹے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

1989ء کا جنگی گوشوارہ: 1989ء اختتام پذیر ہوا تو اس ایک سال میں مجاہدین کی کامیابیوں کے درج ذیل اعداد و شمار ریکارڈ پر آئے: اس ایک سال میں 27 ہزار 7 سو 13 دشمن ہلاک، 22 ہزار 5 سو 10 زخمی اور 5 ہزار 4 سو 4 گرفتار ہوئے جب کہ 12 ہزار 2 سو 71 فوجی مجاہدین سے

آئے۔ نجیب انقلابیہ اور اس کے مددگاروں کے 568 طیارے، 3 ہزار ایک سو چھ ٹینک، 4 ہزار پانچ سو پچاس گاڑیاں اور ایک ہزار دو سو 87 بھاری ہتھیار تباہ ہوئے۔ مجاہدین کو مال غنیمت میں 28 ٹینک، 166 گاڑیاں، 483 بھاری اسلحہ اور 16 ہزار کی تعداد میں ہلکا اسلحہ حاصل ہوا۔

کیونزم کا جنازہ: افغانستان میں سوویت یونین کی ناکامی نے دنیا بھر میں کمیونسٹوں کو رسوا کر دیا۔ مختلف خطوں میں کیونزم کی بنیادیں لرزنے لگیں اور کمیونسٹ پارٹیاں ہر جگہ شکست کھا کے پسپا ہونے لگیں۔ 1989ء کے اواخر میں بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی کے سابق سربراہ کو پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔ کمیونسٹ پارٹی ملکی معاملات چلانے کے اپنے کلیدی کردار سے دست بردار ہو گئی۔ اس کے بعد حیرت انگیز طور پر بلغاریہ کے مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق بحال کر دیے گئے۔ مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ دنیا کا مضبوط ترین ملک سمجھا جاتا تھا مگر دیوار برلن گرنے کے کچھ مدت بعد مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ حکومت بھی گر گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے ایک ہنگامی اجلاس کے بعد پولٹ بیورو اور حکومت میں شامل تمام ارکان نے استعفیے دے دیے۔ یہی نہیں بلکہ پارٹی کے سربراہ اور اس کے وزیراعظم کو چند ارکان سمیت پارٹی سے نکال دیا گیا، کیونکہ یہ ثابت ہو گیا تھا وہ کیونزم کے نام پر قوم کو دھوکا دیتے ہوئے ملکی دولت اپنے ذاتی اکاؤنٹس میں ٹھونٹے جارہے تھے۔ چیکوسلواکیہ میں بھی یہی ہوا اور کمیونسٹ پارٹی کے 8 ممتاز ارکان کو مرکزی کمیٹی سے خارج کر دیا گیا۔ 1990ء کے شروع میں پولینڈ میں بھی کمیونسٹ پارٹی توڑ دی گئی۔ آذربائیجان کے مسلمانوں نے بھی علیحدگی پسند تحریک شروع کر دی۔ دارالحکومت باکو میں لینن چوک کا نام آزادی چوک رکھ دیا گیا۔ مسلح نوجوانوں نے روسی چوکیاں تباہ کرنا شروع کر دیں۔ روسی ریاست لیتھونیا نے تو باقاعدہ آزادی کا اعلان کر دیا اور جب گورباچوف نے وہاں حالات پر قابو پانے کے لیے ہنگامی دورہ کیا تو اسے غیر ملکی سربراہ کا پردو کوئل دیا گیا۔

وسط ایشیا میں بیداری: روس کی وسط ایشیائی ریاستوں کا یہ حال تھا کہ وہاں جبر و ستم کی زنجیریں ٹوٹ رہی تھیں اور ستر سال سے اپنا اور اپنی تین نسلوں کا ایمان پوشیدہ رکھنے والے مسلمان تیزی سے ابھرنے لگے تھے۔۔۔۔۔ ان ریاستوں میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی ایک نئی شکل سامنے آنے لگی۔ کہا جاتا تھا کہ اب ان کی جیب میں پارٹی کا کارڈ اور دوسری جیب میں قرآن مجید کا جیبی کانفسہ ہوتا ہے۔ ازبکستان یونیورسٹی میں ”شعبہ الحاد“ کا پروفیسر رزمیٹوف جسے پہلے لوگ کسی آفسیر کی عزت دیتے تھے، اب گلی سے گزرتا تو ہر طرف سے آوازیں ابھرتیں: ”وہ دیکھو! بے دین جا رہا ہے“، اگر وہ کہیں پھسل جاتا تو صدائیں بلند ہوتیں: ”اور کھدا کا انکار۔“

روسی کی معاشی ابتری: روس کی معاشی ابتری اس درجے کو پہنچ گئی کہ ماسکو دیوالیہ پن سے بچنے کے لیے اپنے علاقے فروخت کرنے پر غور کرنے لگا۔ روسی صدر گوباجوف نے جاپان کو پیشکش کردی کہ اگر وہ روس کی تباہ حال معیشت کو سہارا دینے کے لیے روس میں سرمایہ کاری کرے تو روس اسے وہ چار جزیرے واپس کر دے گا جو اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران فتح کیے تھے۔ روس دنیا کا سب سے بڑا زرعی ملک شمار ہوتا تھا لیکن افغانستان سے پسپا ہونے کے بعد وہ دوسرے ملکوں سے غلہ برآمد کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ ملک میں خوراک کی قلت کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ ڈبل روٹی خریدنے کے لیے لوگوں کو لمبی لمبی قطاریں بنانا پڑ رہی تھی۔ روسی روپل جو ڈالر کا مقابلہ کیا کرتا تھا اتنا گر گیا کہ اب ایک پاکستانی روپے کے بدلے دو سو روپل مل رہے تھے۔

افغان جہاد کے اثرات دیگر خطوں میں: ان حالات میں جنوری 1990ء میں گورباچوف نے ایک حیران کن بیان دیا جس میں کہا گیا کہ سوویت پارلیمنٹ، سوویت یونین میں شامل جمہوریاتوں سے متعلق ایک قانون وضع کرے گی جس کے تحت اگر کوئی جمہوریہ سوویت یونین میں شامل نہیں رہنا چاہتی تو اسے علیحدگی کا حق دے دیا جائے گا۔ روسی صدر کے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ غریب سوویت یونین کے تار و پود بکھرنے کو ہیں اور وسط ایشیا میں ایک بار پھر اسلام کے چراغ جلنے والے ہیں۔ درحقیقت روس کی عبرتناک شکست کے بعد وسط ایشیائی مسلم ریاستوں میں آزادی کا زبردست دلولہ پیدا ہو گیا تھا۔ شمالی افغانستان کے گوریلا کمانڈر پہلے بھی دریائے آمو کے پارا کا دکا کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔ اب نہ صرف ان کارروائیوں میں اضافہ ہو گیا بلکہ افغان جہاد میں شرکت کے لیے وہاں سے آنے والے مجاہدین نے اپنا نیٹ ورک قائم کر کے ان ریاستوں میں اسلامی حکومتیں قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی جن میں تاجکستان کے مجاہدین پیش پیش تھے۔ جنوری 1990ء میں ”کے جی بی“ نے اپنی ایک رپورٹ میں ماسکو حکومت کو خبردار کیا تھا کہ افغان تحریک مزاحمت کے اثرات وسط ایشیا میں پھیل چکے ہیں اور وہاں مسلح جدوجہد کے لیے نوجوانوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ وسط ایشیا کی مسلم آبادی کے دریائے آمو کے پار افغانوں سے صدیوں قدیم مذہبی اور ثقافتی رشتے ہیں۔ اس لیے جہاد افغانستان کے اس دوسرے مرحلے کو روکنا مشکل ہو گیا ہے۔

مجاہدین میں اختلافات: اتحاد کی نئی کوششیں: اس دوران افغانستان میں مجاہدین کی نجیب انصاریہ کے خلاف کارروائیاں جاری تھیں اور خواست خاص طور پر بڑی ججزیوں کا مرکز تھا۔ مجاہدین کی عبوری حکومت اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔ شرعی عدالتوں میں مقدمات بھی منائے جا رہے

تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ مستقبل کی افغان حکومت کی تشکیل، شراکتِ اقتدار اور تقسیمِ اختیارات کے سوالات نے مجاہد رہنماؤں کو الجھا دیا تھا۔ ایسے میں مجاہدین کو باہم لڑانے کے لیے عالمی طاقتوں نے بھی بڑی سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ چنانچہ جہادی تنظیموں میں اختلافات بڑھنے لگے تھے اور اسی وجہ سے فتوحات کا دھارا دست پڑ گیا تھا جس سے نجیب افغانیہ کو سنبھلنے کا موقع مل رہا تھا۔ مجاہدین کی اس باہمی کشاکشی میں حزبِ اسلامی اور جمعیتِ اسلامی کے اختلافات زیادہ واضح تھے..... جو اس وقت کی سب سے بڑی مجاہد تنظیمیں شمار ہوتی تھیں۔ جون 1990ء میں مجاہدین کے درمیان باہمی یکجہتی پیدا کرنے کے لیے ایک بہت بڑی مشاورتی کانفرنس ہوئی..... جہاد کے 12 سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ تمام تنظیموں کے کمانڈر ایک جگہ جمع ہوئے۔ اس مشاورت کے مقاصد یہ تھے کہ مجاہدین کی صفوں میں انتشار پھیلانے والے کیونسٹ ایجنٹوں کی سرگرمیوں کی روک تھام کی جائے، قبائل کی باہمی دشمنیاں اور کمانڈروں کے ذاتی اختلافات دور کیے جائیں اور تنظیموں کے باہمی روابط مضبوط اور تعلقات بہتر بنائے جائیں..... مجاہد رہنماؤں کو یہ احساس بھی ہو گیا کہ فتح کا مل کے لیے تمام تنظیموں کا ایک کمان کے تحت حملہ کرنے ناگزیر ہے۔ اسی مقصد کے تحت کمانڈر احمد شاہ مسعود نے اکتوبر 1990ء میں پاکستان کا دورہ کیا۔ 1979ء کے بعد یہ ان کا پہلا دورہ پاکستان تھا۔ انہوں نے چترال میں ہونے والی افغان کمانڈروں کی شوریٰ میں بھی شرکت کی۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ حزبِ اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار سے کئی ملاقاتوں کے بعد مکمل اتفاق رائے ہو گیا ہے، یہ بھی ملے ہو گیا کہ انتخابات کے ذریعے جو جماعت جس علاقے میں اکثریت حاصل کرے گی وہاں اس کی حکومت ہوگی۔

ان دنوں پاکستان میں انتخابات ہو رہے تھے کیوں کہ اگست 1990ء میں صدر پاکستان غلام احسن خان نے صدارتی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اسمبلیاں تحلیل کر کے بے نظیر بھٹو کی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بے نظیر بھٹو پر الزام تھا کہ وہ ملکی مفادات کے ادراک اور عوامی حمایت کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہیں، چنانچہ عام انتخابات منعقد ہوئے جن میں اسلام پسند قوتیں آئی جی آئی (اسلامی جمہوری اتحاد) کے نام سے میاں نواز شریف کی قیادت میں لیبرل سیاست دانوں کے مقابلے میں متحد ہوئیں، اس طرح میاں نواز شریف نئے وزیر اعظم کے طور پر برسرِ اقتدار آ گئے۔ چون کہ وہ جبرل ضیاء الحق کے مداح تھے اس لیے مسئلہ افغانستان میں ان سے بہتر کردار ادا کرنے کی توقعات تھیں۔

ظاہر شاہ ناکارہ مہرہ: ادھر 1990ء کے اواخر میں روس اور امریکا اس بات پر متفق ہو گئے کہ ڈاکٹر نجیب کو ہٹا کر جلاوطن سابق افغان بادشاہ ظاہر شاہ کو دوبارہ افغانستان کا کھپتی حکمران بنادیا جائے۔ ان

وہ عراق کو شکست دینے کا کام اپنی افواج اور جدید اسلحے کے بل بوتے پر کر ڈالے گا مگر اس جنگ کا سارا خرچہ عرب ممالک ہی کے ذمے ہوگا۔ اس کے علاوہ امریکا نے کئی دیگر کڑی شرائط بھی منوالیں۔ کویت پر عراقی قبضے کے تین ماہ بعد، امریکی فوجیں خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں اتریں اور اسے اپنا مستقر بنا کر کئی اتحادی ممالک کی افواج کے ساتھ جنوری 1991ء میں عراق پر حملہ آور ہو گئیں۔ یہ جنگ تقریباً ایک ماہ تک جاری رہی۔ امریکا اور اتحادی ممالک کے طیاروں نے اوسطاً روزانہ اڑھائی ہزار جے کر کے بغداد اور دوسرے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ آخر عراقی صدر صدام حسین کو شکست تسلیم کر کے کویت سے افواج نکالنا پڑیں اور اتحادیوں کی کڑی شرائط کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اس جنگ کے نتیجے میں عراق کی عسکری و اقتصادی قوت پارہ پارہ ہو گئی جبکہ امریکا کا فوج میں مستقل طور پر عسکری اڈے بنانے کا موقع مل گیا۔ یہ عربوں کی نادانی کا کرشمہ تھا کہ امریکا کے استعماری اقدامات کو کھلی جھوٹ مل گئی جن سے پوری اسلامی دنیا کی سلامتی کو خطرات لاحق ہو گئے۔ امریکا کا فوج میں اڈے بنانا ایک طویل المیعاد منصوبے کی تکمیل کے لیے تھا جس کے تحت وہ مستقبل میں نہ صرف عرب دنیا بلکہ ایشیائی مسلم ممالک خصوصاً پاکستان، افغانستان اور ایران کو اپنے زیر دام رکھنا چاہتا تھا۔

خوست فتح ہو گیا: ادھر افغانستان میں کیونٹ حکومت کے خلاف مجاہدین کی کارروائیاں جاری تھیں۔ مارچ 1991ء میں مجاہدین نے خوست پر فیصلہ کن حملے شروع کر دیے۔ بے پناہ قربانیوں پر مشتمل ایک طویل جدوجہد کے بعد آخر کار 31 مارچ کو مجاہدین خوست کی چھاؤنی اور شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ خوست چھاؤنی کی فتح نے کیونسٹوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ نجیب نے اس موقع پر باقاعدہ سرکاری سطح پر سوگ منانے کا اعلان کیا۔ خوست کی فتح جہاد افغانستان کا ایک شاندار باب شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ میں مجاہدین کی کئی تنظیموں کے سینکڑوں جانبازوں نے حصہ لیا۔ حرکت المجاہدین اور حرکت الجہاد الاسلامی کے نوجوان خیل اول پر پیش پیش رہے۔ عظیم مجاہد رہنما مولانا جلال الدین خٹانی کا کردار سب سے نمایاں رہا کہ انہوں نے اپنی پوری قوت اس معرکے میں جمونیک دی تھی۔ مجاہدین نے اس لڑائی میں ٹینک بھی استعمال کیے جو مولانا جلال الدین خٹانی نے فراہم کیے تھے۔ مولانا کے بھائی کمانڈر ظلیل خود ایک ٹینک چلا رہے تھے۔ جنگ کے آغاز میں مجاہدین کو سخت مشکلات کا سامنا تھا۔ کھانے پینے کی اشیاء بہت کم تھیں۔ ان کے دو ٹینک تباہ بھی ہوئے۔ پھر ایک بڑے کمانڈر ملا قدح ہاری کی شہادت نے بظاہر ان کی پیش قدمی روک بھی دی تھی مگر اس کے باوجود قافلہ حق آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ فتح نے ان کے قدم چومے۔ مجاہدین نے فاتح بن کر قتل و غارت کا مظاہرہ کرنے کی بجائے عنود و گمراہ

فرانڈلی کا جوت دیا۔ دشمنوں کو قتل کرنے کی بجائے گرفتاری پر اکسایا۔ مولانا جلال الدین جھانی ہمیشہ جنگی لباس میں ملیں رہا کرتے تھے۔ تاہم فتح خواست کے بعد وہ سفید لباس زیب تن کر کے شہر میں داخل ہوئے اور وہاں ایک مدرسے کے افتتاح کا اعلان بھی کیا۔

پچھلے مراکز میں موجود سینکڑوں مجاہدین بھی والہانہ اعزاز میں خواست پہنچے گئے۔ شہر کے انٹرپورٹ پر حریف کے سینکڑوں طیارے مال غنیمت کے طور پر موجود تھے۔ مجاہدین ان میں بیٹھ کر لطف اٹھانے لگے۔ اس کامیابی کے نتیجے میں دشمن کی کئی اہم پوسٹیں جو گیارہ سال سے ناقابل تحریک تھیں، بغیر لڑائی کے فتح ہو گئیں۔ اس شاعرانہ فتح کے بعد پاکستان سے کئی چوٹی کے علمائے کرام نے خواست کا دورہ کیا جن میں جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمن بھی شامل تھے۔ مجاہد رہنماؤں نے اعلان کیا کہ خواست کی فتح پورے افغانستان کی فتح کا دروازہ ہے۔

خواست کی فتح میں اس وقت کے سینکڑوں جیالے فرزند کام آئے، بڑے بڑے نامی گرام مجاہدین شہید ہوئے۔ ان میں ایک نام ”نور الاسلام بابر“ کا بھی ہے، یہ ایک بھارتی گلوکار تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی۔ وہ اپنے دیس کے تاریک ماحول کو چھوڑ کر افغانستان آ گیا اور آخر دم تک مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑتا رہا۔ نور الاسلام بابر کے پڑوسن جہادی نعمات آج بھی مسلمانوں کے دلوں کو ایک نیا جذبہ عطا کرتے ہیں۔

مجاہدین کی مزید کامیابیاں: خواست کی فتح کے بعد مجاہدین نے رے کے بغیر ہرات، کابل اور غزنی کی طرف طوفانی پیش قدمی شروع کر دی۔ گردیز کے محاصرے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حتیٰ کہ پہلے ہفتے میں ناریاب کے ضلع قیصر کو آزاد کر لیا گیا۔ اس لڑائی میں 125 دشمن ہلاک اور 350 گرفتار ہوئے۔ ہزاروں کلاشن کوفیں اور 12 ٹینک مجاہدین کے ہاتھ آئے۔ مئی کے دوسرے عشرے میں تخار میں کیونسٹوں کے پانچ ہزار فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ کارروائی احمد شاہ مسعود کی کمان میں ہوئی۔ تخار کے تین اضلاع پر مجاہدین کا قبضہ ہو گیا۔ 28 مئی کو مجاہدین شدید جنگ اور محاصرے کے بعد قندھار میں داخل ہو گئے۔ کیونسٹوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مجاہدین نے قندھار انٹرپورٹ کو تارہ بتا دیا۔

گردیز کا محاذ: 1991ء کے پورے موسم گرما میں گردیز شدید ترین جنگ کا میدان بنا رہا۔ مجاہد تنظیموں کے مشترکہ لشکر نے گردیز کا سخت ترین محاصرہ کیا ہوا تھا اور کیونسٹوں کو اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی تھی۔ موسم سرما میں بھی یہ صورت حال برقرار رہی۔ دسمبر 1991ء میں مجاہدین نے کابل گردیز شاہراہ پر قبضہ کر کے کیونسٹوں کی مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ ادھر خود کیونسٹوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان میں کشت و خون کی نوبت آ گئی۔ دسمبر کے اواخر میں گردیز چھاؤنی میں نجیب افواج کے

مختار دھڑوں میں گولہ باری سے 70 فوجی ہلاک ہو گئے۔

سوویت یونین مردار..... ریاستیں آزاد: اس دوران تیزی سے شکست و ریخت کا شکار سوویت یونین اگست 1991ء میں اپنی موت آپ مر گیا۔ اس میں شامل ریاستوں نے خود مختاری کا دعوٰی کر دیا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وسط ایشیا کی تمام ریاستوں نے اسلامی ممالک کی حیثیت سے آزادی کا اعلان کیا ہے۔ سوویت روس کے عوام نے خود کیونزوم سے بیزاری کا کھل کر مظاہرہ کیا۔ ماسکو میں مشتعل ہجوم نے کیونزوم کے بانی کارل مارکس کے مجسمے کے منہ پر سیاہی مل دی اور تھوڑوں سے اس کا حلیہ بگاڑ دیا۔ کیونسٹ انقلاب کے بانی لینن کا دیو پیکر بت کرین کے ذریعے گرا کر پاش پاش کر دیا گیا۔ کیونسٹ پارٹی تحلیل کر دی گئی۔ گورباچوف سر توڑ کوشش کے باوجود سوویت یونین کو بچاسکا اور نہ اپنی کرسی کو۔ دسمبر 1991ء میں اسے مجبوراً اپنے منصب سے استعفیٰ دینا پڑا۔ اس کی جگہ ”بورس یلسن“ نے روس کے نئے حکمران کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

نیو ورلڈ آرڈر: سوویت یونین کی شکست و ریخت اور جنگ خلیج 1991ء کے بعد امریکا نے پوری دنیا پر تسلط کے لیے ”نیو ورلڈ آرڈر“ کے نام سے ایک تھانیداری نظام متعارف کرایا جس کے تحت اس نے دنیا بھر میں ”امن و امان“ کے قیام کو اپنی ذمہ داری قرار دیا اور اس مقصد کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے کا جواز پیدا کیا۔ اس پروگرام میں روس امریکا کے شانہ بشانہ تھا۔ اس کے علاوہ برطانیہ، فرانس، جاپان اور دیگر عالمی طاقتوں نے بھی ”نیو ورلڈ آرڈر“ کے مقاصد کے حصول میں امریکا کا ساتھ دیا۔ نیو ورلڈ آرڈر کے بنیادی مقاصد تین تھے:

- ① افغانستان سمیت دنیا میں کہیں بھی بنیاد پرستوں (پنہ فکر مسلمانوں) کی حکومت قائم نہ ہونے پائے۔
- ② مشرق وسطیٰ میں عربوں پر اسرائیل کی عسکری و سیاسی بالادستی اس طرح مکمل طور پر قائم کر دی جائے کہ عرب ممالک اسرائیل کے سامنے جھک جائیں۔

- ③ دنیا بھر میں اسلام کے احیاء کی مؤثر تحریکوں کو سبوتاژ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں 13 ستمبر 1991ء کو ماسکو میں روس امریکا معاہدہ ہوا جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ امریکا ان ممالک کو جو اس کی تھانیداری قبول کرتے ہیں، مجاہدین کا تعاون بند کرنے پر مجبور کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1991ء کے اواخر تک بہت سے پُر جوش اسلامی ممالک بھی مجاہدین کی اعانت سے دست کش ہو گئے جن میں پاکستان اور سعودی عرب بھی شامل تھے۔

امریکا کو خطرہ تھا کہ اگر افغانستان میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو مستقبل میں وسط ایشیا کی آزاد مسلم

ریاستیں جن میں کیونزم کے اثرات نہایت گہرائی کے ساتھ رچ بس گئے تھے، اس اسلامی نظام کے تحت آجائیں گی۔ اس لیے وہ افغانستان میں اسلامی حکومت کا خواب سبوتاژ کرنے کے لیے مجاہدین کو ایسی مخلوط حکومت بنانے پر مجبور کرنے لگا جس میں بنیاد پرست مسلمانوں کی نمائندگی کم از کم ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نجیب انتظامیہ کو بھی بھرپور مدد فراہم کر رہا تھا تاکہ اس طرح مجاہدین پر سیاسی اور عسکری دباؤ ڈال کر انہیں اپنی من پسند حکومت کی تشکیل پر آمادہ کر سکے۔ خود نجیب نے نومبر 1991ء میں واشنگٹن پوسٹ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اس ضرورت کو کھل کر بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ میری حکومت اس علاقے میں امریکا اور اسرائیل کے مفادات کا بہتر تحفظ کر سکتی ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے فوری اثرات اس وقت عیاں ہو گئے جب الجزائر میں ہونے والے عام انتخابات میں ”اسلامی سالویشن فرنٹ“ نے 202 نشستیں حاصل کیں جبکہ اس کی مخالف سیکولر پارٹی صرف 17 سیٹیں حاصل کر سکی مگر اس موقع پر نیو ورلڈ آرڈر کے مقاصد کے تحت الجزائر کی فوج نے مارشل لا لگا کر الیکشن کے نتائج کو کالعدم قرار دے دیا۔ اس سانحے نے ثابت کر دیا کہ امریکا افغانستان میں بھی اسلامی حکومت نہیں بننے دے گا اور اس مقصد کے لیے کسی قاعدے یا حد کا پابند نہیں رہے گا۔

پختون، ازبک اور تاجک کا فتنہ: نجیب حکومت کا دم لیوں پر دیکھ کر عالمی طاقتیں افغانستان کو مستقل خاندہ جنگی میں مبتلا رکھنے کا ایک گھناؤنا منصوبہ ترتیب دے رہی تھیں۔ اس منصوبے کا خلاصہ افغانستان کی لسانی بنیادوں پر تقسیم تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ اسلام اور کیونزم کے درمیان برپا معرکوں کو پختون اور غیر پختون کی لڑائیوں میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس طرح جہاد اور اسلامی نظام کے قیام کا ہدف پس پشت چلا جائے گا اور جنگجو افغان اپنی صلاحیتیں باہم کٹ مرنے میں ضائع کرتے رہیں گے۔ سابق افغان حکمران اور کیونٹ پارٹی کے ”پرچم“ دھڑے کے سربراہ ببرک کارمل کو اس مقصد کے لیے ایک بار پھر متحرک کیا گیا۔ اس کے دھڑے میں زیادہ تر ازبک، تاجک اور فارسی بان شامل تھے جن کی اکثریت شمالی افغانستان میں آباد تھی۔ انہوں نے کارمل کے اشارے پر شمال میں نجیب کی گرفت سے آزاد مقامی حکومتیں قائم کر لیں اور نجیب سمیت تمام پختونوں کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

اس دوران مجاہدین نے خواست رنج کیا تو نجیب کی پوزیشن مزید کمزور ہو گئی۔ اس تناسب سے شمال کے کیونٹ جزیروں کی خود مختاری میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے پختون اور غیر پختون منافرت بڑھانے کے لیے یہ پروپیگنڈا بھی کیا کہ خواست کی فتح کے بعد فارسی، تاجک اور ازبک کیونسٹوں کا قتل عام کیا گیا جبکہ پختون کیونسٹوں کو زعمہ چھوڑ دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ پختون کیونسٹ ہوں یا مجاہد، وہ سب

ایک ہیں اور غیر پختونوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

برک کارل کے اشارے پر کام کرنے والا شمال کا سب سے بڑا کمانڈر رشید دوستم تھا جس کا مرکز جوزجان تھا۔ وہ ایک اکھڑ اور دستم پیشہ انسان تھا۔ اس کے ماتحت ہزاروں جنگجو تھے۔ میرانکوں اور طیاروں سمیت اسے ہر قسم کے عسکری وسائل میسر تھے۔ اس کا بھائی مجید دوستم بھی ایک اہم کمانڈر تھا۔ ان کی فوج کلم جم میٹیا کہلاتی تھی۔

انہی دنوں شمال کے ”حیرتان“ بارڈر پر تھیں جنرل مومن بھی (جو نظریاتی طور پر برک کارل کا حامی تھا) نجیب سے ٹالاں ہو گیا۔ اس نے اسمگلنگ اور لوٹ مار کے ذریعے بے پناہ دولت جمع کر لی تھی اور تاشقند میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرائے تھے۔ اس نے پختون کمیونسٹوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے نجیب کے بعض احکام کو کھلم کھلا مسترد کر دیا۔ کابل میں نجیب کا کمانڈر جنرل نبی عظیمی بھی خفیہ طور پر برک کارل کے لیے کام کر رہا تھا اور نجیب سے بغاوت کے لیے تیار تھا۔ ان کے علاوہ نجیب حکومت کا وزیر خارجہ عبدالوکیل اور جنرل اسلم وطن یار کابل میں نجیب کے خلاف محلاتی سازشوں کے بنیادی کردار تھے۔

مجاہد رہنما السانیت کے جال میں: یہاں تک تو بات مجاہدین کے حق میں تھی کہ کمیونسٹ پختون اور غیر پختون میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہو چکے ہیں۔ اگر مجاہد رہنما ذاتی اغراض خصوصاً ہوس اقتدار سے بالاتر رہتے ہوئے اتحاد و اتفاق اور حکمت و تدبیر سے کام لیتے تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پورے افغانستان کو کمیونسٹوں سے پاک کر کے ملک میں اللہ کا عطا کردہ نظام نافذ کر سکتے تھے مگر ان میں سے بعضوں کی مفاد پرستی، ہوس وجاہ اور باہمی اعتماد کے فقدان نے کمیونسٹوں کو کھل کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ یہاں روس اور امریکا کی سازشوں کو کامیابی سے آگے بڑھاتے رہیں۔ مجاہدین کی جانب سے اس نادانی کا پہلی بار اظہار اس وقت ہوا جب ایک طرف احمد شاہ مسعود نے شمالی افغانستان کی مجاہد تنظیموں کے اتحاد ”شورائے نظام“ کے چیئر مین ہونے کی حیثیت سے شمالی افغانستان کا کنٹرول سنبھالنے والے، نجیب کے باغی کمیونسٹ کمانڈروں سے حلیفانہ تعلقات قائم کیے اور اُدھر گلبدین حکمت یار نے نجیب کے معتمد کمانڈروں جنرل رفیع اور جنرل شاہنواز تنائی سے خفیہ روابط استوار کیے۔ اگر ہم حسن ظن سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ دونوں مجاہد کمانڈر کمیونسٹوں کو مجاہدین کے اقتدار کے نیک مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ حالات کچھ اور رخ اختیار کر گئے اور وہ نہ ہوا جس کی مسلمانوں کو ان قائدین کی سیاسی و عسکری بصیرت سے توقع تھی۔ گلبدین حکمت یار نے جنرل شاہنواز کو حزب اسلامی کا تعاون فراہم کر کے نجیب کے خلاف بغاوت کرائی مگر یہ کوشش کامیاب نہ

ہو سکی۔ بلکہ ہوا یہ کہ شمال میں اس کوشش کو بھی پختونوں کی سازش سے تعبیر کیا گیا۔

مسعود کے مددگار: اس دوران احمد شاہ مسعود، رشید دوستم اور دوسرے کیونسٹ جنرلوں کے درمیان لسانی بنیادوں پر روابط مضبوط ہوتے گئے۔ کامل انتظامیہ کے ایک بڑے کمانڈر جنرل آصف دلاور سے بھی احمد شاہ مسعود کے خاص تعلقات قائم ہو گئے کیوں کہ آصف دلاور بھی تاجک تھا۔ انہی دنوں اہل شمال کے اس اتحاد میں ایک اور نئی طاقت شامل ہو گئی۔ یہ بغلان کے مشہور اسماعیلی پیشوا سید کیان اسماعیل کا پوتا منصور نادری تھا۔ وہ امریکا میں زیر تعلیم ایک عیاش نوجوان تھا اور شراب و شباب کا دلدادہ تھا۔ امریکا نے اسے کامیاب مہرے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنے خاص تعاون کے ساتھ افغانستان بھیج دیا۔ یاد رہے کہ منصور نادری کے دادا سید کیان کوروسی یلغار کے دوران ماسکو کی مکمل سرپرستی اور بھرپور مالی و عسکری حمایت حاصل رہی تھی۔ اب امریکا پوتے کو اسی قسم کے کردار کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ بہر کیف ایہ مختلف الخیال جنگجو گروہ ”پختون حکمرانی کے خاتمے“ کے مشترکہ ہدف کے لیے جمع ہو گئے اور ان میں شامل معروف جہادی رہنما احمد شاہ مسعود کو اب ایک لبرل مسلمان اور تاجک قوم کے نمائندے کے طور پر شہرت ملنے لگی۔

ان حلیفانہ تعلقات کی بنا پر اہل شمال نے نجیب انتظامیہ سے بغاوت کر کے صوبہ تخار اور پروان احمد شاہ مسعود کے حوالے کر دیے۔ اسی اتحاد کے بل بوتے پر احمد شاہ مسعود، دوستم ملیشیا اور حزب وحدت نے شمال کے اہم ترین شہر ”بلخ“ پر قبضہ کیا۔ شہر فتح کرنے کے بعد وہاں جولوٹ مار ہوئی اس سے لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور یہ واضح ہو گیا کہ جمعیت اسلامی تمام تردعوؤں کے باوجود کیونسٹوں پر حاوی نہیں۔ حالانکہ اس سے قبل احمد شاہ مسعود کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جمعیت اسلامی جب چاہے کیونسٹوں کو مار بھگائے گی۔ لبرل افغانستان کے خواب کی تکمیل کے لیے 1992ء کے اوائل میں عالمی طاقتوں نے ایک بار پھر ظاہر شاہ کو افغانستان واپس لانے اور اس کے ذریعے ایک وسیع البیاد حکومت کے قیام کا شوشہ بڑے زور و شور سے اٹھایا مگر اکثر مجاہد رہنماؤں نے اسے قبول نہ کیا۔

فتح و شکست کا وقت اللہ کے علم میں ہے: حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی میں لسانیت کی بناء پر انفریق کی وجہ سے مجاہدین کی طاقت بکھر گئی اور فتح کامل میں تاخیر در تاخیر ہوتی چلی گئی۔ فروری 1992ء میں فاتح خواست مولانا جلال الدین حقانی نے کراچی کا دورہ کیا اور اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا جہاد کسی شخصیت یا نام کے خلاف شروع نہیں ہوا بلکہ باطل نظام کی سرکوبی کے لیے شروع ہوا تھا اور باطل نظام کے خاتمے تک جاری رہے گا۔ انہوں نے کامل کی فتح میں تاخیر کے بارے میں اٹھائے گئے شبہات کی نفی

کرتے ہوئے کہا: ”لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اب تک فتح کیوں نہیں ہوئی تو یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ اس جہاد کی بدولت افغانستان کے کتنے علاقے آزاد ہو چکے ہیں اور سوویت ریاستیں آزاد ہو رہی ہیں۔ خود حضور اکرم ﷺ نے مکہ کئی سال بعد فتح فرمایا۔ فتح و شکست کا وقت اللہ کے علم میں ہے۔“

اس کے کچھ ہی دنوں بعد کابل کا فیصلہ کن معرکہ شروع ہو گیا۔ جس سے پوری دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔

کابل کا محاصرہ: مارچ 1992ء میں احمد شاہ مسعود، حکمت یار، رشید دوستم اور دیگر کمانڈروں نے اپنی افواج کابل کے گرد جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ نجیب کی جانب سے احمد شاہ مسعود کو 40 لاکھ ڈالر کی پیش کش کی گئی کہ وہ پیچھے ہٹ جائے مگر احمد شاہ مسعود نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔ اور حزب اسلامی نے نجیب کو 25 اپریل تک ڈیڈ لائن دے دی کہ وہ کابل کو مجاہدین کے حوالے کر دے ورنہ مجاہدین بزور قوت شہر میں داخل ہو جائیں گے۔



مآخذ و مراجع

- ♣..... افغانستان کی کہانی، حقائق کی زبانی۔ ڈاکٹر مفکر احمد
- ♣..... ماہنامہ صدائے مجاہد: جلد 1988ء، 1989ء، 1990ء، 1991ء، 1992ء
- ♣..... ماہنامہ الارشاد: جلد 1988ء، 1989ء، 1990ء، 1991ء، 1992ء
- ♣..... ہفت روزہ تکبیر: جلد 1988ء، 1989ء، 1990ء، 1991ء، 1992ء
- ♣..... اردو ڈائجسٹ: مارچ 1989ء، جہاد افغانستان نمبر اپریل 1989ء، جہاد افغانستان نمبر فروری 1990ء، جون 1992ء

انتیمواں باب

فتح کابل، مجاہدین کی حکومت اور خانہ جنگی

حکومت سازی پر مجاہدین کا اختلاف: اپریل میں کابل کا محاصرہ جاری تھا مگر اس دوران مجاہد تنظیموں میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ یہ بات افسوس ناک تھی کہ کابل کے دروازے پر کئی مجاہد تنظیموں میں اب تک حکومت بنانے کے کسی فارمولے پر مکمل اتفاق نہیں ہو سکا تھا۔ ہر ایک کا اپنا اپنا نظریہ تھا۔ گلبدین حکمت یار اور پروفیسر برہان الدین ربانی دونوں حکومت سازی کے لیے انتخابات کو واحد طریقہ تصور کرتے تھے مگر حکمت یار انتخابات کے فوری انعقاد کے خواہاں تھے جبکہ ربانی اس مرحلے کو موخر کرنا چاہتے تھے۔ بعض رہنما جیسے صفت اللہ مجددی، پیر احمد گیلانی اور مولانا محمد نبی محمدی ان بکھیلوں میں پڑنے کی بجائے ظاہر شاہ کی افغانستان والپسی کو ترجیح دے رہے تھے۔ ان کے نزدیک ملک کے قدم رواج کے مطابق ”لو یہ جرگہ“ ہونا اور ظاہر شاہ کو اقتدار سپرد کر دینا اختلافات کا واحد حل تھا۔ کسی ممکنہ حل تک پہنچنے کے لیے پشاور میں مجاہد تنظیموں کا اجلاس شروع ہوا جو کئی دن تک جاری رہا۔ پروفیسر سیاف نے اس مشاورت میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ صدیق کا نجو اور آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل جاوید ناصر بھی اس اجلاس میں شریک تھے۔ سعودی حکمران شاہ فہد نے بھی ایک خط لکھ کر مجاہدین کو تائید کی کہ وہ آپس کے اختلافات کو احسن طریقے سے ختم کر دیں۔

گلبدین حکمت یار اس اہم اجلاس میں شرکت کیے بغیر افغانستان چلے گئے تھے کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ احمد شاہ مسعود گھم جم پلٹیشیا اور شیعہ تنظیموں کے ساتھ مل کر کابل پر مکمل قبضے کی تیاری کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات مجاہدین کے درمیان طے تھی کہ حکومت سازی کے فارمولے پر اتفاق کے بعد وہ کابل میں داخل ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر فتح خانہ جنگی میں بدل سکتی تھی۔ حکومت سازی کے بارے میں حکمت یار کا اپنا خیال یہ تھا کہ فی الحال حکومت عبوری کونسل کے 38 ارکان کے سپرد کر دی جائے جو ایک سال تک برقرار رہے اور اس دوران مستقل حکومت کے لیے انتخابات کروائے جائیں۔

نئی عبوری حکومت کی تشکیل: بہر حال حکمت یار کی مرضی کے خلاف 24 اپریل 1992ء کو مجاہد

تنظیموں کے سربراہوں کے درمیان حکومت سازی کے مندرجہ ذیل معاہدے پر اتفاق ہو گیا:

- ① پروفیسر صبغت اللہ مجددی (جو جہاد افغانستان کے بزرگ رہنما تھے) دو ماہ کے لیے کابل کی عبوری حکومت کے سربراہ ہوں گے۔
- ② دو ماہ بعد جمعیت اسلامی کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی دو سال تک کے لیے صدر بن جائیں گے۔
- ③ وزارت عظمیٰ کا منصب گلبدین حکمت یار کو دیا جائے گا۔
- ④ وزارت داخلہ، اتحاد اسلامی کے استاذ سیاف کو، وزارت تعلیم مولانا یونس خالص کو اور وزارت خارجہ پیر سید احمد گیلانی کی تنظیم ”محاذ ملی اسلامی“ کو دی جائے گی۔
- ⑤ وزارت دفاع جمعیت اسلامی کے احمد شاہ مسعود کے سپرد ہوگی۔
- ⑥ وزارت عدلیہ، حرکت انقلاب اسلامی کے مولوی محمد نبی محمدی کے حوالے ہوگی۔
- ⑦ نیز تین وزارتیں شیعہ تنظیموں کو دی جائیں گی۔

اس معاہدے پر تمام تنظیموں کے اتفاق کے باوجود گلبدین حکمت یار نے اسے مسترد کر دیا اور اپنے حسب مرضی فارمولے پر اصرار جاری رکھا۔ حکمت یار خود کابل کے قریب اپنے مورچوں میں پناہ گئے تاکہ شہر پر قبضے کی کارروائی کی براہ راست قیادت کر سکیں۔ شیعہ تنظیموں نے شروع سے اجلاس کا بائیکاٹ کیا تھا کیونکہ وہ حکومت میں 25 فیصد حصے کی طلب گارتھیں۔

مسعود کا شیعوں اور کمیونسٹوں سے اتحاد: شیعہ تنظیموں کا عسکری اور سیاسی طور پر کوئی خاص وزن نہ تھا مگر اس موقع پر انہوں نے افغانستان کی نئی عبوری حکومت میں اپنے استحقاق سے زیادہ حصہ وصول کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ چھوٹے چھوٹے شیعہ گروپوں پر مشتمل حزب وحدت ان کی نمایندہ تھی۔ کریم غللی اس اتحاد کا مرکزی لیڈر تھا۔ چونکہ ایران اس اتحاد کا پشت پناہ تھا اس لیے غللی ایران اور پشاور کے درمیان پکڑ لگا رہتا تھا۔ بعد میں ان کے ایک رہنما آیت اللہ محسنی نے غللی سے علیحدہ ہو کر الگ شیعہ اتحاد بنالیا۔ اس گروپ نے معاہدہ پشاور کو مسترد کر دیا جس میں صبغت اللہ مجددی کو عبوری حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا اور شیعہ گروپوں کو تین وزارتوں کا حق دار تسلیم کیا تھا۔ ایران کے مذہبی رہنما خانہ اہی نے کھلے لفظوں میں کہا کہ ایران صرف تین وزارتوں پر راضی نہیں، اسے پورا حق دیا جائے۔

احمد شاہ مسعود نے اس موقع پر اپنی فطری ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے شیعہ گروپوں کو اپنے قریب

کر لیا۔ ساتھ ہی رشید دوستم کی حکم جم ملیشیا اور کیونسٹوں کا اعتماد بھی حاصل کر لیا۔ دراصل احمد شاہ مسعود بادشاہ مگر بننا چاہتا تھا مگر طبقہ جو پختون طبقہ جس کا تناسب مسعود کے حامی تاجیکوں سے بہر حال زیادہ تھا مسعود کو حکمران کے طور پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس لحاظ سے مسعود کے سیاسی حریف گلبدین حکمت یار کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ مسعود کے نزدیک اس کا توڑ بھی ہو سکتا تھا کہ شیعوں اور کیونسٹوں کو ساتھ ملا یا جائے۔ احمد شاہ مسعود کو پہلے ہی شمالی افغانستان کی جہادی تنظیموں کے اتحاد ”شورائے نظام“ کے رئیس کی حیثیت حاصل تھی۔ اب شورائے نظام، حزب وحدت اور حکم جم ملیشیا کے اتحاد سے ایک بڑی طاقت وجود میں آگئی جو کامل پر قابض ہو کر حسب مرضی حکومت بنا سکتی تھی۔

نجیب کا بل سے فرار کیوں نہ ہو سکا؟ اپریل 1992ء میں مجاہدین نے کامل کا محاصرہ کیا تو شہر میں نجیب کے خلاف بغاوت کی فضا بن چکی تھی۔ اس وقت جنرل نبی عظیمی اور دوسرے کیونسٹ افسران نے نجیب کو یہ پرفریب مشورہ دیا کہ وہ رشید دوستم کی ملیشیا کو کامل کی حفاظت کے لیے طلب کر لے۔ نجیب نے یہ بات مان لی، رشید دوستم گیارہ طیاروں میں مسلح جنگجو لے کر کامل کے ہوائی اڈے پر اترے اور ایئر پورٹ، ریڈیو اسٹیشن، ٹی وی اسٹیشن اور دیگر اہم مقامات پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد نجیب نے جنرل عظیمی کے دباؤ پر مجبوراً اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا اور کسی جائے پناہ کی تلاش میں بیرون ملک جانے کے لیے، ایئر پورٹ روانہ ہو گیا مگر راستے میں کیونسٹوں کے ایک کمانڈر عبدالرزاق نے طے شدہ منصوبے کے مطابق اس کو روک کر واپس کر دیا۔ آخر نجیب ایک لٹے پٹے مسافر کی طرح اقوام متحدہ کے دفتر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ درحقیقت قدرت خداوندی مسلمانوں کے اس قاتل کو فرار کا موقع نہیں دینا دینا چاہتی تھی جس کے مظالم سے سرزمین افغانستان کا سینہ شق تھا۔ اسے اپنے جرائم کی عبرت کا سزا ان سچے مومنوں کے ہاتھوں ملنا لکھی تھی، جو ابھی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔

مسعود نے دوستم ملیشیا کو کامل کیوں بلایا؟ نجیب کے استعفیٰ کے بعد کامل کا انتظام دفاعی کونسل کے ججز میں جنرل نبی عظیمی اور دوسرے کیونسٹوں نے سنبھال لیا۔ احمد شاہ مسعود کی کوشش یہ تھی کہ وہ شمال کے کیونسٹوں پر بھی غالب رہے اور مجاہد تنظیموں میں بھی اس کا پلہ سب سے بھاری ہو۔ پہلے مقصد کے حصول کے لیے بلخ اور مزار شریف پر تنہا جمعیت اسلامی کا قبضہ ضروری تھا اور دوسرے مقصد کے لیے کامل کا مکمل طور پر زیر نگین آنا شرط تھا۔

احمد شاہ مسعود نے ”ایک تیر سے دو شکار“ کرنے کی کوشش کی اور فتح کامل کے موقع پر دوستم ملیشیا کے زیادہ سے زیادہ افراد کو کامل بلالیا۔ اس طرح شمالی افغانستان میں دوستم کی عسکری طاقت کم ہو گئی جس

سے احمد شاہ مسعود مناسب موقع پر قائمہ اٹھا کر پلچ اور مزار شریف پر مکمل تسلط حاصل کر سکتا تھا۔ دوسری طرف کابل میں جمیعت اسلامی کے حامی کیونسٹوں کا کنٹرول ہو گیا جو مسعود کی فتح کے مترادف تھا۔ مزید برآں یہ کہ حزب اسلامی کے مقابل مسعود کو اپنی افواج زیادہ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ حزب کا مقابلہ کرنے کے لیے کیونسٹ موجود تھے۔

اس منظر نامے کو دیکھ کر بظاہر تو ایسا لگتا تھا کہ مسعود بہت کامیاب جا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کامیابیاں احمد شاہ مسعود کو اس کے اصل راستے سے دور لے گئیں۔ خطرناک سیاست و عسکریت کی اس بازی میں مقاصد اس طرح الجھ گئے کہ جہاد اور نفاذ اسلام جیسے اہم حقائق بھولی بھری داستان بن گئے۔ یہ بھی نہ ہوا کہ جمیعت اسلامی کیونسٹوں پر غالب رہتی بلکہ وہ خود ان کے زیرِ دام آ گئی۔ دو ستم ملیشیا کو کابل میں مداخلت کا موقع دینا، کیونسٹوں کی ان سازشوں کو تکمیل کا ذریعہ بننا جس کے تانے بانے روس امریکا نے کئے تھے۔ اپریل 1992ء کے آخری تیرہ دن افغانستان کی تاریخ میں نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ہم ان ایام کی روداد ترتیب وار پیش کرتے ہیں۔

کابل پر قبضے کے لیے جوڑ توڑ: 18 اپریل کو پشاور کے گورنر ہاؤس میں مجاہد رہنماؤں کا طویل ترین اجلاس ہوا جس میں وزیر اعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف بھی شریک تھے۔ اجلاس کسی نتیجے کے بغیر ختم ہو گیا۔ حکمت یار اجلاس کے دوران ہی پشاور سے افغانستان چلے گئے۔ کیونکہ خبر ملی تھی ایران کے انقلابی کمانڈر رشید گروپوں کی مدد کے لیے زابل میں داخل ہو گئے ہیں اور شین ڈنڈائیر پورٹ پر قبضے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دراصل یہ سب کچھ امریکا اور دوسری عالمی طاقتوں کے ایما پر ہو رہا تھا۔ یہ طاقتیں ایران کے ذریعے افغانستان میں مجاہد تنظیموں کے مقابلے میں ایک متوازی طاقت منظم کرنا چاہتی تھیں تاکہ افغانستان میں بدامنی اور خانہ جنگی کا ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے۔

گلبدین حکمت یار کے افغانستان پہنچنے سے ایک روز قبل حزب اسلامی نے کابل کے گرد اپنے مضبوط مورچوں سے نکل کر شہر کے شمال مغرب میں خیبر خانہ کی پہاڑیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب حزب اسلامی کے مورچے وزارت دفاع کی عمارت ”دارالامان“ سے صرف 10 کلومیٹر کے فاصلے پر آ گئے تھے اور یہاں سے شہر پر میزائل داغے جا رہے تھے۔

ادھر حزب اسلامی کے مقابلے کے لیے رشید دو ستم اور کیونسٹ جنرل عبدالمومن کے دھڑوں نے باہم اتحاد کر لیا۔ کیونسٹوں کے جنرل آصف دلاور، جنرل بابا جان اور جنرل نبی عظیمی بھی اس وقت حزب اسلامی کے مقابل تھے۔ احمد شاہ مسعود نے بھی کابل پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے ہٹیاروں کے ذریعے

کچھ فوج بگرام ایئر پورٹ پر اترادی۔ شہر پر قبضے کی اس کوشش کے دوران کئی مجاہد رہنما مجاہدین سے اپیل کرتے رہے کہ وہ کامل پر حملے سے احتراز کریں کیونکہ یہ انتقال اقتدار کے معاہدے کی خلاف ورزی ہے۔ تاہم ایسی صدائیں صدائیں اٹھ اٹھتے ہوئیں۔

پیر 20 اپریل کو پل چرخی جیل نجیب افغانیہ کی گرفت سے آزاد کرائی گئی۔ یہاں موجود چار ہزار افراد کو رہائی نصیب ہوئی۔ انقلاب ٹور کے بعد سے اس حکومت خانے میں روسیوں اور کمیونسٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ناقابل بیان مظالم کا سلسلہ جاری تھا۔ اس دن حکمت یار نے کامل کے باہر اپنے معسکر سے حزب کے ریڈیو 'پیام آزادی' پر اعلان کیا کہ وہ کامل اور دوسرے شہروں کا محاصرہ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ کمیونسٹ مسلح گروپ کامل سے نکل جائیں اور اقتدار بلا شرکت غیرے مجاہدین کے حوالے کیا جائے۔ اگلے ایک دو دنوں میں یہ بات واضح ہو گئی کہ احمد شاہ مسعود کو مغربی ممالک اور امریکا کے ہاں مقبولیت حاصل ہو گئی ہے اور مغربی طاقتیں کسی تنظیم کی حمایت اور کسی کی مخالفت کر کے مجاہدین کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں۔ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے منگل 21 اپریل کو واضح کیا کہ امریکا احمد شاہ مسعود کی سربراہی میں وسیع اہلیا د حکومتی تشکیل دینا چاہتا ہے۔ بدھ 22 اپریل کو احمد شاہ مسعود نے گلبدین حکمت یار سے 40 منٹ تک وائرلیس پر بات چیت کی کہ وہ کامل پر میزائل باری کا سلسلہ بند کر دیں مگر حکمت یار نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ جواباً مسعود نے اعلان کیا کہ اب وہ بزور قوت کامل کا دفاع کرنے پر مجبور ہوں گے۔

جلال آباد فتح ہو گیا: جمعرات 23 اپریل 1992ء کا دن جلال آباد کی فتح کا شہدہ لے کر آیا۔ مجاہدین نے تین سال سے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اس دوران یہاں ان گنت معرکے ہوئے تھے جن میں بڑے بڑے نامور مجاہدین نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ دو سال قبل مجاہدین کو جلال آباد سے پسپائی بھی ہوئی تھی جس کے بعد نجیب حکومت نے جلال آباد کو ناقابلِ تسخیر قرار دیا تھا مگر مجاہدین نے تیاری کر کے دوبارہ شہر کا محاصرہ کیا اور ایک سال کی لگا تار کوشش کے بعد آخر فتح کامل سے ذرا پہلے یہ شہر مجاہدین کے قبضے میں آ گیا۔

عبوری حکومت کی تشکیل کا معاہدہ طے پا گیا: جمعہ 24 اپریل 1992ء کو پشاور میں مجاہدین کا اہم اجلاس ہوا جس میں حکومت پاکستان اور سعودی حکمران شاہ فہد کے نمائندہ خصوصی شہزادہ ترکی انصاف نے متفقہ طور پر اس معاہدے کی توثیق کی جس میں صیغۃ اللہ مجددی کو دو ماہ کے لیے عبوری افغان حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ تاہم حزب اسلامی نے اب بھی معاہدے میں شمولیت اختیار نہ کی۔

اجلاس کے بعد صیغۃ اللہ مجددی نے تمام مجاہد تنظیموں سے اپیل کی کہ وہ نئی عبوری حکومت کی تابعدار رہیں۔ انہوں نے مغربیہ 50 افراد کی کابینہ کے ہمراہ کابل جانے کا اعلان بھی کیا۔ بہر کیف کابل کا محاصرہ کرنے والی تنظیموں اور گرد و پوں نے پشاور میں ہونے والے فیصلوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی روش برقرار رکھی۔ 24 اپریل کو جس دن اس معاہدے کی توثیق ہوئی، اسی دن دو ستم ملیشیائے کابل ایئرپورٹ پر قبضہ کر لیا۔ اگلا دن یعنی اتوار 25 اپریل 1992ء ”فتح کابل“ کا دن کہلاتا ہے۔ اس دن جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کے درمیان کابل کے زیادہ سے زیادہ علاقے پر قبضے کی دوڑ شروع ہوئی۔ جمعیت اسلامی نے کمیونسٹوں کے تعاون سے اور حزب اسلامی نے ان سے مزاحمت کر کے شہر کے کئی حصوں پر قبضہ کر لیا۔

فتح کابل: احمد شاہ مسعود کی فوج اور دو ستم ملیشیائے پہلے ہی بگرام اور دوسرے اہم مقامات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ 25 اپریل کو انہوں نے خواجہ روش ایئرپورٹ، ریڈیو اسٹیشن، ٹی وی اسٹیشن اور وزارت دفاع (دارالامان) کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا۔ اُدھر حزب اسلامی کے دستے شہر میں داخل ہو گئے اور انہوں نے صدارتی محل اور وزارت داخلہ سمیت کئی اہم مقامات پر قبضہ کر لیا۔ یہ دن تین بجے کا وقت تھا۔ 4 بجے تک تقریباً پورے کابل پر جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ شام کو عالمی ذرائع ابلاغ زور و شور سے یہ خبریں نشر کر رہے تھے۔ افغانستان سے روسیوں کے بعد اب ان کے مہرے نجیب کا بوریا بستر بھی گول ہو چکا تھا۔ پاکستان سمیت عالم اسلام کے کونے کونے میں لوگ شکرانے کے نواہل ادا کر رہے تھے۔ روسیوں اور کمیونسٹوں کے خلاف مجاہدین افغانستان کا 14 سالہ جہاد ایک شاعر فتح پر مکمل ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس فتح میں مجاہدین متعارف بھی نظر آ رہے تھے مگر اس کے باوجود کابل پر قبضہ نہایت اطمینان اور امن و سکون سے ہو گیا۔ کوئی خونریزی ہوئی نہ غارت گری۔ عوام کو عام معافی دے دی گئی۔ لوگ احتیاطاً گھروں میں بیٹھے رہے۔ کوئی خون خرابہ نہ تھا نہ ہنگامہ۔ بجلی اور پانی کا نظام بحال تھا۔ کھانسی، کھانسی، کھانسی کے خاتمے کے ساتھ ہی تاریخ افغانستان کا یہ یادگار دن اختتام پذیر ہوا۔

جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی میں کشاکش: فتح کابل میں بڑا حصہ حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کا تھا۔ بہت خوب ہوتا کہ دونوں تنظیموں کے سربراہ جو جہاد افغانستان میں بے مثال ہمت و شجاعت اور بہترین قیادت کا ثبوت دے کر پورے عالم اسلام میں ایک بلند اور معزز مقام حاصل کر چکے تھے، اس موقع پر ایثار و قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے کسی مناسب حل پر متفق ہو جاتے مگر افسوس! ایسا نہ ہوا۔ فتح کابل کی خوشیاں جو مسلمانوں کو 14 سالہ جہاد اور بے شمار قربانیوں کے نتیجے میں ملی تھیں، مسعود اور حکمت

یار کے اختلاف کی نذر ہو گئیں۔

گلبین حکمت یار جو پہلے ہی مجددی کی سربراہی اور کمیونسٹوں کی شمولیت کے باعث معاہدہ انتقال اقتدار سے الگ رہے تھے، بدستور اپنے موقف پر اڑے رہے۔ انہوں نے فتح کا بل کے فوراً بعد اعلان کیا کہ اب مجاہدین کا بل پر قابض ہو چکے ہیں اس لیے پشاور معاہدے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر صیغۃ اللہ مجددی نے کا بل آنے کی کوشش کی تو ہم ان کے طیارے کو مار گرائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی حکمت یار نے دائر لیس پر کا بل میں موجود کمیونسٹ جرنیلوں سے مطالبہ کیا کہ وہ خود کو حزب اسلامی کے سپرد کر دیں تو ان سے مناسب سلوک ہوگا۔ ورنہ اگر وہ فرار ہونے کی حالت میں پکڑے گئے تو ان کے لیے کوئی ضمانت نہ ہوگی۔

گلبین حکمت یار کے سخت اور منفرد موقف نے انہیں بہت سے مجاہد رہنماؤں کی ہمدردی سے محروم کر دیا تھا۔ احمد شاہ مسعود نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور فتح کا بل کے فوراً بعد پشاور میں موجود نئی عبوری حکومت کے کمانڈروں سے رابطہ کر کے دریافت کیا: ”کیا آپ حکمت یار سے مقابلے کے لیے آمادہ ہیں؟“ جواب ملا: ”دارالحکومت آپ کے قبضے میں ہے۔ آپ جو چاہیں اقدام کریں۔“

حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کی جنگ: فتح کا بل کے 14 گھنٹے بعد حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کے مابین باقاعدہ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اتوار 26 اپریل 1992ء کو ”وزیر اکبر خان“ کا علاقہ میدان جنگ بنا رہا۔ حزب اسلامی نے دھمکی دی کہ اگر دو سٹم پلیٹیا کا بل سے نہ نکلی تو کا بل پر بھرپور حملہ کر دیا جائے گا۔ احمد شاہ مسعود نے جواباً کہا:

”اگر حزب نے حملہ کیا تو ہم اس کے مورچوں کو تھس نہیں کر دیں گے۔“

27 اپریل کو بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خواجہ روٹن ایئر پورٹ اور گبرام ایئر بیس دونوں جمعیت اسلامی اور دو سٹم پلیٹیا کے قبضے میں تھے۔ یہاں سے کمیونسٹ ہوا باز طیارے اڑا کر حزب کے ٹھکانوں کو نشانہ بناتے رہے جبکہ احمد شاہ مسعود کے جنگجوؤں نے زمینی پیش قدمی جاری رکھی۔ انہوں نے حزب اسلامی کو ”تصرصارت“ سے پسپا کر دیا اور نہایت تیزی سے شہر کے زیادہ تر حصے پر قبضہ کر لیا۔ اب لڑائی شہر کے جنوب میں ہو رہی تھی۔ گزشتہ 14 برسوں میں شہر کی یہ گت کبھی نہیں بنی تھی۔ چنانچہ بالا حصار اور دیگر ٹکڑوں کے ہزاروں افراد شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ یہ لڑائی جاری تھی اور ادھر عالم اسلام کے ممتاز علماء اور نامی گرامی شخصیات کی جانب سے جنگ بندی کی پرزور اپیلیں ہو رہی تھیں۔ سعودی عرب سے شیخ محمود الصواف، مصر سے ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور شام سے شیخ عبدالفتاح ابو غدہ نے پینامات

بھجوائے کہ مجاہدین فوری طور پر باہمی قتل و قاتل ترک کر کے مذاکرات کی میز پر آ جائیں۔

حزب اسلامی کے مطالبات: 27 اپریل کا دن گزرتے گزرتے کاہل شہر میں حزب اسلامی کی پوزیشن خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے جنگ بندی پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ دونوں فریق شہر کے اہم عسکری مقامات سے سبکدوش ہو جائیں۔ حزب اسلامی نے حکمت یار کو وزارت عظمیٰ دیئے، برہان الدین ربانی کو صدر بنانے اور دو ستم ملیشیا کو کاہل سے نکالنے پر بھی اصرار کیا۔ اگرچہ یہ بات طے تھی کہ صیغۃ اللہ مجددی صرف دو ماہ کے لیے صدر ہوں گے اور ان کے بعد برہان الدین ربانی کو صدر بنایا جائے گا، مگر حکمت یار کے لیے مجددی کا عارضی تقرر بھی ناقابل قبول تھا۔

مجاہدین کو لڑانے میں کیونسٹوں کا حصہ: فتح کاہل کے ساتھ مجاہد تنظیموں کے اختلافات کا شدید اثر ہو کر مستقل محاذ آرائی کی صورت اختیار کر لیا، یقیناً قارئین کے لیے باعث تعجب ہوگا۔ مگر اس کھیل کے پس پردہ سازشوں پر غور کیا جائے تو حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ پیچھے بتایا جا چکا ہے کہ عالمی طاقتیں، مقامی قوتوں کو استعمال کر کے افغانستان کو محاذ جنگ بنائے رکھنے کی تیاریاں بہت پہلے کر چکی تھیں۔ یہ عالمی طاقتیں امریکا اور روس تھیں جبکہ اس خطے میں ایران اور بھارت ان سے بھرپور تعاون کر رہے تھے۔ افغانستان میں اس مقصد کے لیے ان کیونسٹ جزیروں سے کام لیا جا رہا تھا جو تاجک یا ازبک تھے اور ہرک کاہل کی پرچم پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مجاہد رہنما احمد شاہ مسعود اور حکمت یار بھی اسی سازش کا شکار ہو گئے۔ احمد شاہ مسعود نے خود کو بادشاہ گر کی حیثیت دینا چاہی اور شمال کی مجاہد تنظیموں کے اتحاد شورائے نظار کو کیونسٹوں کی باقی ماندہ طاقتوں سے متحد کر کے یہ تصور کر لیا کہ وہ کیونسٹوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح حکمت یار نے جزل شاہنواز اور جزل رفیع جیسے کیونسٹوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اصل کھیل کیونسٹ کھیل رہے تھے۔ باقی سب شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال ہو رہے تھے۔

صیغۃ اللہ مجددی مستند اقتدار پر: منگل 28 اپریل 1992ء کو پروفیسر صیغۃ اللہ مجددی اپنے قافلے کے ساتھ پشاور سے کامل پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ سفر سڑک کے ذریعے کیا تھا۔ شہر کے مرکزی علاقوں پر اب جمیعت اسلامی کا کنٹرول تھا، اس لیے مجددی کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ انہوں نے پورے اطمینان سے کامل ریڈیم (Regime) کے وزیر خارجہ عبدالوکیل سے حکومت کا چارج لیا اور پھر ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ملک کی تعمیر نو کریں۔ نجیب کو ہم

معاف نہیں کر سکتے، یہ کام عوام کا ہے۔“ پھر انہوں نے حکمت یار پر تنقید کرتے ہوئے کہا: ”اگر حکمت یار نے لڑائی بند نہ کی تو ان کے خلاف شرعی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔“

اس دن ترکی، سعودی عرب، ایران اور دیگر مسلم ممالک کی جانب سے صیغۃ اللہ مجددی کو افغانستان کا اقتدار سنبھالنے پر تہنیتی پیغامات موصول ہوتے رہے۔ افغانستان کی تاریخ میں ایک طویل مدت بعد یہ منظر دیکھنے میں آیا تھا کہ ایک صحیح العقیدہ دین دار مسلمان مسند اقتدار تک پہنچا تھا۔ کہنہ سال و سفید ریش صیغۃ اللہ مجددی ذاتی طور پر ایک نیک و صالح بزرگ اور صوفی منش انسان تھے۔ افغانستان میں سلسلہ نقشبندیہ کو رواج دینے میں ان کے خاندان کا کردار نمایاں ہے۔ ان کے والد شیخ اسماعیل مجددی ظاہر شاہ کے دور میں کیونزم کے خلاف صف آراء تھے اور اسی جدوجہد میں شہید ہوئے۔

صیغۃ اللہ مجددی کہتے تھے: ”ہم نے جہاد اس وقت شروع کیا تھا جب مجاہدین کی موجودہ نسل ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی۔“

گلبین حکمت یار کو بھی صیغۃ اللہ مجددی کی سیرت و کردار پر کوئی اعتراض نہ تھا، مگر ان کا موقف یہ تھا کہ مجددی کی پارٹی کمزور ہے لہذا اسے کیونٹ آسانی سے دبا لیں گے۔ چند روز بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ خدشہ درست تھا۔ بہر کیف مجددی کو منتخب کرنے والے مجاہد رہنماؤں کا کہنا یہ تھا کہ اس وقت لچک دار رویہ رکھنے والی اقلیتی پارٹی کے سربراہ کو صدر بنا کر ہم دنیا کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں کہ کابل میں بنیاد پرست کی بجائے وسیع البیاد حکومت وجود میں آئی ہے۔ اس طرح ہم ناقابل برداشت خارجی دباؤ سے محفوظ رہیں گے۔ مجددی کو لچکدار رویہ رکھنے والا سیاست دان اس لحاظ سے سمجھا جاتا تھا کہ وہ ظاہر شاہ کے دوبارہ افغانستان آکر اقتدار سنبھالنے کی تجویز کی حمایت کرتے رہے تھے۔

میاں نواز شریف کابل میں: بدھ 29 اپریل کو وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف اور سعودی حکمران شاہ فہد کے خصوصی نمائندے شہزادہ ترکی الغیصل نے کابل پہنچ کر صیغۃ اللہ مجددی کو مبارکباد دی۔ میاں نواز شریف نے نئے افغان حکمران کو 250 ملین روپے کا امدادی چیک بھی پیش کیا۔ اس روز کابل کے بعض حصوں میں جمعیت اسلامی اور حزب کے مابین لڑائی جاری تھی۔ جمعیت اسلامی اور دوستم ملیشیا نے مل کر حزب اسلامی کو وزارت داخلہ سے پسپا کر دیا جبکہ میاں نواز شریف کے طیارے کی دابھی کے چند منٹ بعد ایئر پورٹ کو کسی نامعلوم گروہ نے میزائلوں کا نشانہ بنایا۔

کابل کی دیگر گوں حالت: کابل فتح ہو گیا تھا۔ حکومت مجاہدین کی تشکیل کردہ جماعت کے پاس تھی مگر شہر کی اب یہ حالت تھی کہ اس میں بجلی، پانی اور مواصلات کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ اہم سرکاری عمارتیں

کھنڈر بن گئی تھیں، اشیائے خورد و نوش ناپید تھیں، ایک وقت کا کھانا 55 ڈالر میں مل رہا تھا، افغان کرنسی اتنی مرمی تھی کہ لوگ روپوں کا تھیلا بھر کر لے جاتے اور بمشکل ایک دن کا راشن حاصل کر پاتے۔ اور حزب اسلامی سے لڑائی بھی جاری تھی۔ شیعہ اور کیونسٹ، مجاہدین کی اس کمزور حکومت کو پوری طرح دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔ غرض مجددی حکومت کو ان گنت مسائل کا سامنا تھا۔ اس موقع پر مجددی نے عالم اسلام سے اپیل کی کہ وہ مشکل گھڑی میں ان کا ساتھ دے اور افغانستان کی تعمیر نو میں تعاون کرے۔ یہ بات قابل اطمینان تھی کہ تمام مسلم ممالک کے علاوہ روس، بھارت اور امریکا نے بھی مجاہدین کی حکومت کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ نئی حکومت ان ممالک کے نزدیک ”بناو پرست“ نہیں تھی۔

نجیب کو معافی: جوعہ یکم می کو صنت اللہ مجددی نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے ہزاروں افغان مسلمانوں کے قاتل ڈاکٹر نجیب اللہ کو معاف کرنے کا اعلان کر کے لوگوں کو چوکا دیا۔ چند روز پہلے اپنے پہلے خطاب میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم نجیب اللہ کو معاف نہیں کر سکتے۔ یہ عوام کا کام ہے کہ اسے معاف کریں، مگر اب عوام کی جانب سے کسی مطالبے کے سامنے آئے بغیر انہوں نے خود اسے معافی دینے کا اعلان کر کے خود اپنے موقف کی لٹی کر دی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے صنت اللہ مجددی ان کیونسٹ جنرلوں سے خاصے مرعوب ہیں جو کابل میں اپنی افواج کے ساتھ تعینات تھے۔ نجیب اللہ کو معافی دینے میں ان کیونسٹ جنرلوں کا دباؤ یقیناً کارفرما تھا۔ درنہ مجاہدین اور افغان مسلمان اس درندہ صفت انسان کو معاف کرنے کے روادار نہیں تھے جس نے ہزاروں عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو ناقابل بیان مظالم کا نشانہ بنانا کرقل کیا تھا۔

حرکت انقلاب اسلامی اور حزب میں معرکہ: دن گزرتے گئے مگر کابل میں امن و امان قائم نہ ہو سکا۔ شہر کے نواح میں قائم حزب اسلامی کے مورچوں سے شہر پر بار بار راکٹ برساتے جاتے تھے۔ یہ جنگ دوسرے صوبوں میں بھی پھیلنے لگی تھی۔ مولوی محمد نبی محمدی اور مولانا نصر اللہ منصور جو حرکت انقلاب اسلامی کے دوا لگ الگ دھڑوں کے قائد تھے، ایک بار پھر متحد ہو گئے تھے کیونکہ دوسرے صوبوں پر قبضے کے لیے تیار حزب اسلامی کے مقابلے کے لیے اس اتحاد کی شدید ضرورت تھی۔ آخر 3 مئی 1992ء کو حرکت انقلاب اسلامی اور حزب اسلامی میں جنگ شروع ہو گئی۔ اس دن حزب اور حرکت کی جنگ میں 50 افراد جاں بحق اور 100 سے زائد زخمی ہوئے۔ اس جنگ کے آخر میں حزب اسلامی کا پلہ بھاری رہا اور اس نے حرکت انقلاب اسلامی سے صوبہ لغمان چھین لیا۔

پاکستان کی امدادی کارروائیاں: پاکستان اب تک افغانستان کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔ اس نے کابل میں قحط دور کرنے کے لیے 50 ہزار ٹن گندم دینے کا وعدہ کیا۔ مئی کے پہلے ہفتے میں 70 ٹرک گندم لے کر کابل پہنچے۔ حکومت پاکستان نے 30 لاکھ افغان مہاجرین کو افغانستان واپس بھیجنے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی اور اعلان کیا کہ وہاپس جانے والے ہر افغان مہاجر کو 30 ہزار روپے اور 30 یورپی گندم دی جائے گی۔

شہر پر کن کن کا قبضہ تھا؟ فتح کابل کے ایک ہفتے بعد بھی امن وامان بحال نہ ہو سکا۔ صورت حال یہ تھی کہ کابل کے شمالی اور شمال مشرقی اضلاع سے شہر کے مرکز مقامات تک تقریباً سارا علاقہ جمعیت اسلامی اور دوئم ملیشیا کے قبضے میں تھا۔ یہ فوجیں اب سرکاری افواج کے نام سے موسوم کر دی گئی تھیں۔ حزب اسلامی کی اصل طاقت جنوب میں چار آسیاب اور مشرق میں سروبی میں جمع تھی۔ مولانا یونس خالص کے کارکن بھی بڑی تعداد میں سروبی میں تھے۔ مغرب میں شیعہ تنظیم حزب وحدت مورچہ زن تھی۔

استاذ سیاف کی اتحاد اسلامی ”پیمنان“ میں مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ یکم مئی 1992ء کو اس کی حزب وحدت سے خونریز جنگ شروع ہو گئی جو کئی دن تک جاری رہی۔ آخر ہفتہ 9 مئی کو جنگ بندی کا معاہدہ ہوا۔ ادھر کابل شہر میں مجاہدین کی بہ نسبت دوئم ملیشیا کے سپاہی زیادہ تھے۔ مجاہدین کی حکومت عملاً ان کو باہر نکلنے کی قوت نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ درحقیقت یہ حکومت ان کے رحم و کرم پر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک صحافی نے صدر مجددی سوال کیا کہ آپ کابل پر حزب اسلامی کے حملوں کا دفاع کیسے کریں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا: ”براہر رشید دوئم ہماری مدد کریں گے۔“

مولانا جلال الدین حقانی کی مصالحتی کوششیں: حزب اور جمعیت اسلامی میں بھی جنگ وجدل کا سلسلہ جاری رہا۔ 4 مئی 1992ء کو حزب اسلامی نے ”فہم نادر خان“ پر قبضہ کر لیا۔ ادھر جمعیت اسلامی کے سربراہ برہان الدین ربانی پشاور سے افغانستان پہنچ گئے۔ انہوں نے ”لوگر“ میں حکمت یار سے مل کر جنگ بندی کی کوشش شروع کر دی۔ نامور مجاہد کماٹڑ مولانا جلال الدین حقانی نے ان دنوں دو سو مجاہد رہنماؤں کا وفد لے کر حکمت یار سے ملاقات کی اور جنگ بندی کا ایک معقول فارمولہ تیار کیا جسے ربانی نے منظور کر لیا مگر مسعودیت و لعل سے کام لیتا رہا۔ دراصل اسے بغلان سے اسماعیلی ملیشیا کے تین ہزار جنگجوؤں کی کمک بھی مل گئی تھی جس کا کماٹڑ منصور نادری تھا۔ اسماعیلی ملیشیا اس کی قیادت میں طیاروں کے ذریعے کابل پہنچی اور کئی اہم مقامات پر قابض ہو گئی۔ اس طرح کابل میں احمد شاہ مسعود کے حامیوں کی پوزیشن مزید مضبوط ہو گئی۔ ایسے میں مسعود کے لیے کسی امن فارمولے پر عمل کرنا بے معنی تھا۔

مجددی پر قاتلانہ حملہ: صدر مجددی کو احمد شاہ مسعود کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے طرح طرح کے

خدا شات لاحق ہو رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ صفت اللہ مجددی برائے نام حکمران تھے۔ ان کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ وہ خود کابل میں محفوظ نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے اقتدار کی طے شدہ مدت میں توسیع کرالیں مگر بظاہر یہ ممکن نہیں تھا۔ مسعود اور دوستم جب چاہتے انہیں جبراً معزول کر سکتے تھے۔ اس صورتحال میں مئی کے آغاز میں صدر مجددی نے پاکستان کا دورہ کیا تاکہ اپنی پوزیشن بہتر بنائی جاسکے۔ حکومت پاکستان اور اس کے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف مجددی صاحب کے ہمدرد تھے اس لیے پاکستان میں حاکم افغانستان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس دورے پر تبصرہ کرتے ہوئے حرکت انقلاب اسلامی کے امیر مولانا نصر اللہ منصور نے جو مجددی حکومت میں ڈپٹی چیف جسٹس تھے، ایک انٹرویو میں کہا: ”مجددی صاحب کے دورہ پاکستان کے موقع پر حکومت پاکستان نے ان کا جوشایان شان استقبال کیا اور عظیم الشان پروٹوکول دیا اس نے ہمارے حوصلوں کو ہمبزدی ہے۔“

مگر 8 مئی کو جوں ہی مجددی صاحب کا طیارہ پشاور سے واپس کابل پہنچا اس پر میزائلوں کی بارش کر دی گئی۔ جہاز کا اگلا حصہ تباہ ہو گیا جبکہ صفت اللہ مجددی بال بال بچ گئے۔ عام خیال تھا کہ یہ عبوری حکومت کی مخالف، حزب اسلامی کا کارنامہ ہے مگر صفت اللہ مجددی نے اس بارے میں خاموشی اختیار کر لی۔ حکومت سے الگ ہونے کے بعد انہوں نے انکشاف کیا کہ یہ ان کے اپنے لوگوں کی سازش تھی یعنی اس میں دوستم ملیشیا یا احمد شاہ کے لوگ ملوث تھے۔

معادۂ ضیاء الحق: فتح کابل کا سہانا سپنا مجاہدین کے لیے ایک ایسے حقیقت ثابت ہوا تھا۔ کیونسٹوں کے تسلط، ایران نواز ملیشیاؤں کی مداخلت اور عالمی طاقتوں کی خفیہ سازشوں نے کابل میں اسلامی حکومت کے قیام اور بحالی امن سے متعلق عالم اسلام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس صورت حال میں سعودی عرب کے شاہ فہد نے خاص طور پر اصلاح احوال کی کوشش کی۔ ان کی دلچسپی کے باعث وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف ایک بار پھر کابل میں جنگ بندی کے لیے متحرک ہوئے۔ انہوں نے جہاد افغانستان کے تاریخی کردار صدر ضیاء الحق کے بیٹے اعجاز الحق کو نمائندہ بنا کر کابل بھیجا۔ شاہ فہد کی جانب سے شہزادہ مناف بن سلطان بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے مجاہدین کے مصالحتی کمیشن کے چیئرمین کانڈر جلال الدین حقانی کے ساتھ مل کر مجاہد رہنماؤں میں تصفیے کے لیے دو ڈھوپ شروع کی۔

25 مئی کو کابل کے جنوب میں حزب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر میں گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود اکٹھے ہوئے۔ افغان جہاد کے چودہ برسوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں لیڈر آمنے سامنے تھے اور دبدو گفتگو کر رہے تھے۔ سچ دس بجے سے شام چھ بجے تک گفت و شنید جاری رہی اور آخر صلح کا معاہدہ

طے پا گیا۔ اس معاہدے کو ”معاہدہ ضیاء الحق“ کا نام دیا گیا۔ معاہدے میں تحریر کیا گیا تھا کہ سوویت افواج کی واپسی اور کچھ پتلی نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد جہاد کے مقاصد پورے ہو چکے ہیں لہذا جنگ بند کی جاتی ہے۔ اب ہر قسم کے تنازعے مذاکرات کے ذریعے حل کیے جائیں گے۔ ایک خالص اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ عبوری حکومت میں کوئی توسیع نہیں ہوگی۔ چھ ماہ کے اندر انتخابات کروائے جائیں گے۔ شمال سے آئی ہوئی ملیشیا ایک طے شدہ طریقہ کار کے مطابق واپس چلی جائیں گی اور دارالحکومت کا انتظام مقامی مکاناتروں کے سپرد ہوگا۔

مجددی توسیع اقتدار کے خواہش مند: کچھ مدت کا مل میں اسن واماں رہا اور شہر کی رونقیں بحال ہونے لگیں۔ 28 جون 1992ء کو صبغت اللہ مجددی کی صدارت کے طے شدہ دو ماہ پورے ہو رہے تھے اور اب انہیں معاہدہ پشاور کے مطابق صدارت پر و فیسر برہان الدین ربانی کے حوالے کرنا تھی مگر اس سے قبل صبغت اللہ مجددی نے ایسے بیانات دینا شروع کر دیے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس منصب پر برقرار رہنا چاہتے ہیں۔ یہ صورت حال احمد شاہ مسعود کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ احمد شاہ مسعود کا کہنا تھا کہ مجددی کو وقت مقررہ پر عہدہ چھوڑ دینا چاہیے جبکہ صبغت اللہ مجددی کہتے تھے: ”لوگوں کا اصرار ہے کہ میں مزید دو سال تک حکومت کروں۔“ احمد شاہ مسعود اور صدر مجددی کے درمیان فاصلے بڑھتے گئے۔ صبغت اللہ مجددی یہ محسوس کر کے نہایت برداشتہ تھے کہ مسعود اور ربانی جو انہیں حکمت یار سے لڑواتے رہے تھے اب خود حکمت یار سے صلح کا معاہدہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ وہ ذہنی طور پر جمعیت اسلامی سے دور ہوتے چلے گئے۔ اب انہیں نئے ہمدردوں کی تلاش تھی۔ ادھر افغانستان کے سیاسی بحران کی ذمہ دار مغربی طاقتوں کے پاس دو ستم ملیشیا اور حزب وحدت کی شکل میں دو ایسے مددگار موجود تھے جو حسب موقع اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے نت نئے المیوں کو جنم دینے میں ماہر تھے۔ ان مددگاروں نے صدر مجددی کو مسعود سے دور ہوتا دیکھ کر انہیں اپنے دام میں لانے کی کوشش کی اور بے یار و مددگار صدر مجددی ان کے بل بوتے پر توسیع اقتدار کی منزل کو قریب تر محسوس کرنے لگے۔ بدلے میں حزب وحدت اور دو ستم ملیشیا کو حکومت میں غالب حصہ ملنے کے امکانات روشن ہونے لگے۔ چونکہ یہ صورتحال پاکستان کے مفادات کے خلاف تھی اس لئے پاکستان نے اس موقع پر مجددی صاحب کی حمایت نہ کی۔ حرکت انقلاب اسلامی کے سربراہ مولوی نبی محمدی اور حماد اسلامی کے قائد پیر سید احمد گیلانی نے بھی اس سے اتفاق نہ کیا۔ پھر صورتحال کو سنبھالنے کے لئے پرو فیسر برہان الدین ربانی خود افغان رہنماؤں کا ایک وفد لے کر پاکستان گئے۔ 13 جون 1992ء کو انہوں نے صدر پاکستان غلام اسحاق خان سے ملاقات کی۔ صدر پاکستان نے وفد سے اتفاق کرتے

ہوئے دو ٹوک موقف اختیار کیا کہ معاہدہ پشاور کی پاسداری کرتے ہوئے صدر مجددی کو دو ماہ پورے ہونے پر اقتدار سے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔ اس وضاحت کے بعد صدر مجددی کے لئے حزب وحدت اور دوستم کو ملا کر اقتدار میں توسیع کے منصوبے پر عملدرآمد کرنا مشکل ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر مجددی کا اگر کوئی وزن تھا تو اس کا سبب پاکستان کی جانب سے ان کی مکمل حمایت تھی۔ حکومت پاکستان جو افغانستان میں ایک پاکستان دوست حکومت کا قیام چاہتی تھی، صیغۃ اللہ مجددی کے پورے دور میں ان سے ہر طرح تعاون کرتی رہی تھی۔ مگر اب خود پاکستان مجددی صاحب سے مایوس تھا، لہذا وہ بالکل تنہا نظر آ رہے تھے۔ یاد رہے کہ اتنی مدت تک صیغۃ اللہ مجددی کے ساتھ پاکستان کے اس تعاون کے پیچھے امریکی ایماء کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ مجددی حکومت بڑی حد تک ویسی ہی تھی جیسی امریکا کا بل میں دیکھنا چاہتا تھا، یعنی ایک مطلقاً قسم کی کمزور حکومت جو اپنے فیصلوں میں غیروں کی محتاج ہو۔ اپنے مختصر دور حکمرانی کے آخری ایام میں مجددی کی کوشش تھی کہ وہ حکمت یار سے تعلقات بہتر بنالیں انہوں نے حکمت یار کو اپنا بھائی قرار دیا اور اپنے بیانات میں ان کے کردار کو سراہا..... اس طرح حکمت یار کی پوزیشن مزید بہتر ہو گئی۔ تاہم صیغۃ اللہ مجددی کی حیثیت حسب سابق کمزور ہی رہی۔

مجددی کے غلط فیصلے: صیغۃ اللہ مجددی نے اپنے مختصر دور اقتدار میں کئی ایسے فیصلے کئے جن سے مجاہد رہنما ناراض تھے۔ مثلاً:

- ① پختون قوم پرستوں اور کمیونسٹوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے نجیب کو معافی دینا۔
- ② وطن پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کمیونسٹ جنرل آصف دلاور کو آدمی کا سربراہ بنانا۔ یاد رہے کہ اس اقدام میں اصل کردار احمد شاہ مسعود کا تھا مگر فیصلہ صیغۃ اللہ مجددی ہی کے قلم سے صادر ہوا تھا۔

- ③ رشید دوستم اور اس کے کمیونسٹ ساتھیوں کے جنرل کے عہدے پر ترقی دینا۔
- ④ یہ بیان دینا کہ لوگ مجھ پر دو برس تک اقتدار سنبھالے رہنے کے لئے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ بہر حال مجددی صاحب کا تو وسیع اقتدار کا ارمان پورا نہ ہو سکا۔ ان کے مذکورہ اقدامات نے ان کو مجاہد رہنماؤں کی حمایت سے محروم کر دیا جو اب بھی ایک بڑی طاقت تھے۔

برہان الدین ربانی، نئے عبوری صدر: آخر کار دو ماہ بعد 28 جون 1992ء کو صیغۃ اللہ مجددی اپنی مدت پوری کر کے خاموشی سے معزول ہو گئے۔ ان کی جگہ جمعیت اسلامی کے سربراہ پروفیسر برہان

الدین ربانی نے چار ماہ کے لیے عبوری صدارت کا منصب سنبھال لیا۔ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ چار ماہ کے اندر انتخابات کرا کے اقتدار منتخب حکومت کو سونپ دیں۔ طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق ربانی کے برسر اقتدار آ جانے سے امید تھی کہ افغانستان میں قیام امن کا خواب پایہ تکمیل کو پہنچے گا خصوصاً اس تناظر میں کہ مجددی کوئی تنازعہ کھڑا کرے بغیر سبکدوش ہو گئے تھے اور جمیعت و حزب میں ”معاہدہ ضیاء الحق“ کے مطابق صلح کا ماحول برقرار تھا۔ اب کیونستوں کو کامل سے بے دخل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا بشرطیکہ مجاہدین اس طرح متحد رہتے۔

حزب اسلامی اور ملیشیا کا معرکہ: دنیا کو حزب اسلامی کی قوت کا اندازہ اگست 1992ء میں اس وقت ہوا جب چہار آسیاب میں واقع حزب اسلامی کے ہیڈ کوارٹر سے دوستم ملیشیا کے خلاف ایک بڑی کارروائی شروع کی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ ملیشیا کے طیارے حزب کے ٹھکانوں پر گاہے گاہے بمباری کرتے رہتے تھے، لہذا اس کا مؤثر اور متواتر جواب دینا ضروری تھا، یہ لڑائی ”اسد سنبلا“ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں دوستم ملیشیا کا خاصا نقصان ہوا جس کے بعد کیونستوں کو یقین ہو گیا کہ جب تک حکمت یار اور مسعود میں صلح کا ماحول برقرار ہے ان کی دال نہیں گلے گی۔ چنانچہ اس کے بعد افغانستان میں مجاہدین کے اتحاد کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایک بار پھر خفیہ ہاتھ تیزی سے حرکت میں آ گئے، نئی منصوبہ بندیاں ہوئیں اور مجاہدین کو لڑانے والے جنگجو گروہوں نے ایک نئے زاویے پر پیش قدمی شروع کر دی۔ اس سے قبل وہ مسعود اور ربانی کے ساتھ مل کر حزب اسلامی کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے پینتر ابدل کر حکمت یار کے گرد جمع ہونا شروع کر دیا تاکہ انہیں ایک غالب قوت ہونے کا احساس دلا کر پھر سے جمیعت اسلامی کے خلاف محاذ گرم کیا جاسکے۔

عبدالحی مزاری، حکمت یار کے ساتھ: اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پہلی ”حزب وحدت“ کے سربراہ عبدالحی مزاری نے کی اور شورائے نظار سے اتحاد ختم کر کے حزب اسلامی سے تعلقات استوار کر لیے۔ نئے اتحادی میسر آ جانے سے حزب کی طاقت میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ مگر ان نئے اتحادیوں نے حزب اسلامی کو راہ اعتدال سے دور کرنے اور دیگر جماعتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کو مزید کشیدہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

حزب وحدت کے مسلح ہزارہ جات دستے جو کامل کے صوبے میں کئی اہم مقامات پر قابض تھے ایران سے اسلحے اور کرنسی کی شکل میں بھرپور امداد وصول کر رہے تھے۔ حزب وحدت کے رہنماؤں عبدالحی مزاری، کریم خلیلی اور آیت اللہ محسنی میں اختلافات ضرور تھے مگر وہ بہر صورت حکومت میں اپنی آبادی کے

تناسب سے کہیں بڑھ کر حصہ چاہتے تھے۔ حکومت ایران حزب وحدت کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ جرنل رشید دوستم کی بھی مدد کر رہی تھی۔ ہفت روزہ ”نیکبیر“ 18 جون 1992ء کی اشاعت میں انکشاف کرتا ہے کہ ایران نے حال ہی میں رشید دوستم کے لیے ایک ٹرالر بھر کر افغان کرنسی نوٹ فراہم کیے ہیں۔

صدر ربانی، دوستم سے مرعوب: پروفیسر برہان الدین ربانی بھی اپنے دور اقتدار میں صدر مجددی کی طرح کمزور اور عملاً بے بس ثابت ہوئے۔ حکمت یار اور مسعود کے مابین معاہدہ ضیاء الحق کے مطابق رشید دوستم کی فوج کو غیر مسلح کر کے کابل سے نکالنا طے ہو گیا تھا مگر دوستم ملیشیا اب بھی کابل میں ڈٹی ہوئی تھی۔

رشید دوستم نے برملا اعلان کر رکھا تھا کہ اگر اس کی فوج کو کابل سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ افغانستان کے پانچ (5) شمالی صوبوں کو لے کر الگ مملکت بنالے گا۔ دوستم کی اس دھمکی سے مرعوب ہو کر صیغہ اللہ مجددی کو اس کے خلاف کسی کارروائی کی ہمت ہو سکی نہ پروفیسر ربانی کو۔ حالانکہ ان کے پاس احمد شاہ مسعود کی زبردست فوج موجود تھی۔

اس سے اعزازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حالات بگاڑنے کے اس کھیل میں متحدہ اندرونی و بیرونی طاقتیں ملوث تھیں، جن کی خفیہ یا اعلانیہ حمایت کمیونسٹوں کے ساتھ تھی۔ اس کھیل میں امریکا، روس اور ایران کے ساتھ برطانیہ بھی شامل ہو چکا تھا۔ نیکبیر اپنی مذکورہ اشاعت میں رپورٹ دیتا ہے کہ رشید دوستم شمالی افغانستان میں ازبک ریاست کے قیام کے لیے امریکا کی ہدایت پر عمل کر رہا ہے اور اس منصوبے میں انگلستان اور ایران بھی شریک ہیں۔ الغرض اس طرح دوستم ملیشیا تقسیم وطن کی دھمکی دے کر پروفیسر ربانی کے سینے پر مونگ دتی اور کابل میں راج کرتی رہیں۔ پروفیسر ربانی اپنے اختیارات کو بروئے کار نہ لاسکے۔ کابل میں فاشی دبے حیاتی کا وہ عالم تھا کہ الامان والحفیظ۔ کمیونسٹ دور کی طرح اب بھی جگہ جگہ شراب خانے اور قحبہ خانے کھلے تھے۔ سرکاری دفاتر میں عریانی کا مظاہرہ کرتی ماڈرن خواتین حسب سابق کام کر رہی تھیں۔ نظام حکومت پر بالائی سے لے کر کھلی سطح تک اب بھی لٹھوں اور دھریوں کی اجارہ داری تھی۔ اسلامی حکومت کے اثرات دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔

حزب اسلامی اور کمیونسٹوں کا اتحاد: حکمت یار کو اس بات کا نہایت مددہ تھا کہ وزیراعظم ہوتے ہوئے بھی عملاً انہیں حکومت سازی کا موقع نہیں دیا جا رہا تھا کہ وہ کابل میں داخل تک نہیں ہو سکتے۔ حکمت یار کے یہ جذبات کمیونسٹوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی جلتی پر تیل ڈالنے میں کسر نہ چھوڑی۔ رشید دوستم نے مجاہدین کی صفوں میں اعتبار پیدا کرنے اور انہیں ایک دوسرے سے بدعنوان کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ عبدالعلی مزاری کی طرح اس نے بھی احمد شاہ مسعود کی بجائے حکمت یار کی

طرف جھکاؤ ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ حکمت یار کو اعتماد میں لینے کے لیے وہ خود حزب اسلامی کے ”قلاچی“ مرکز میں آیا اور دو بد ملاقات کی۔ وہ اپنے ساتھ ایک مولوی صاحب کو بھی لایا تھا جس نے باقاعدہ گفتگو کے آغاز سے قبل قرآن مجید کی تلاوت کی۔ اس طرح دوستی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ کیونسٹ نہیں، ایک اچھا مسلمان ہے۔ اس نے حکمت یار کو مکمل تعاون کا یقین بھی دلایا۔

غرض اس ملاقات کے ذریعے دو کٹر نظریاتی حریفوں میں اقتدار کی خاطر دوستانہ تعلقات کی بنیاد پڑ گئی۔ حکمت یار اور دوستی اس سے قبل ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن تصور کیے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ حکمت یار نے فتح کامل کے بعد مجددی حکومت کو بھی صرف اس بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کیا تھا کہ کامل میں دوستی کی کلم جم ملیشیا موجود تھی۔ حکمت یار کہتے تھے کہ چون کہ دوستی مجددی حکومت کا حلیف ہے لہذا یہ اسلامی حکومت نہیں مانی جاسکتی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ پہلے دوستی کو فیر سلخ کر کے کامل سے نکالا جائے تب وہ مجددی حکومت کو مجاہدین کی حکومت کے طور پر قبول کر لیں گے مگر اب وہ خود دوستی کے شانہ بشانہ کھڑے تھے اور اس سے مدد لے کر خوشی محسوس کر رہے تھے۔

صدر ربانی کا دورہ بھارت: صدر برہان الدین ربانی بھی صدر مجددی کے طرز فکر کی پیروی کرتے ہوئے اپنی مدت اقتدار کو طویل سے طویل تر کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ان بیرونی طاقتوں سے روابط بڑھانے کی کوشش کی جو پہلے ہی افغانستان میں مداخلت کے لیے سرگرم تھیں اور کامل میں کسی اسلامی حکومت کے خلاف تھیں۔ ان ممالک میں بھارت سرفہرست تھا۔ صدر ربانی نے بھارتی حکومت کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے بھارت کا دورہ بھی کیا۔ وہ انڈونیشیا جاتے ہوئے پانچ گھنٹوں کے لیے دہلی میں آئے اور بھارتی حکام سے ملاقات کی۔ اس کے بعد برہان الدین ربانی کو بھارت سرکار کی نظر میں ایک دوست کا مقام حاصل ہو گیا اور بھارتی حکومت ہمیشہ ان کی معاون رہی۔

مدت صدارت میں توسیع: 28 اکتوبر 1992ء کو برہان الدین ربانی کی عبوری صدارت کی مدت ختم ہو رہی تھی مگر انہوں نے ایک بہانہ پیش کر کے اس مدت میں دو ماہ کی توسیع کرائی۔ بہانہ یہ تھا کہ جب تک ”شورائے حل و عقد“ کا اجلاس نہ ہو، انتقال اقتدار ممکن نہیں۔ اس عذر کو دور کرنے کے لیے دیگر مجاہد رہنماؤں نے شورائے حل و عقد کا اجلاس منعقد کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں مگر جب اجلاس کے انعقاد کا ماحول بننے لگا تو مجاہد رہنماؤں میں اختلافات مزید کھل کر سامنے آ گئے۔ پیرگیلانی اور مولوی محمد نیا محمدی، ربانی کے مقابلے میں صدارتی امیدوار بن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مولانا یونس خالص، مولوی نیا محمدی کے حامی بن گئے۔ اس طرح معاہدہ پشاور کے ذریعے عام انتخابات تک تکمیل دی

جانے والی لیڈر شپ کونسل کے 19 ارکان دو ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ اس ماحول میں دسمبر 1992ء شروع ہو گیا اور برہان الدین ربانی کی عبوری صدارت کی دو ماہی توسیعی مدت بھی ختم ہو گئی۔ اب ان پر لازم تھا کہ وہ انتخابات کرا کے اقتدار منتخب حکومت کے حوالے کر دیتے مگر ربانی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مسلسل لیت و لعل سے کام لیتے رہے اور طے شدہ وقت گزر جانے کے باوجود مسجد اقتدار سے الگ ہونے پر آمادہ نہ ہوئے۔ گلبدین حکمت یار اس بد عہدی پر سراپا احتجاج بن گئے اور ان کی طرف سے صدر ربانی پر صدارت چھوڑنے کے لیے دباؤ بڑھنے لگا۔

جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کا معرکہ: ادھر صدر ربانی اور ان کے دست راست احمد شہزاد مسعود کو انتخابات کے مطالبے سے چڑھتی اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بھی دکھ تھا کہ ان کے مضبوط حلیف عبدالعلی مزاری نے گلبدین حکمت یار سے اتحاد کر لیا ہے۔ آخر انہوں نے ایک بار پھر میدان جنگ میں قوت آزمائی کے ذریعے اپنے اختلافات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کی۔ جنگ کا آغاز ربانی حکومت کی افواج کی طرف سے ہوا جنہوں نے کابل کے مشرق میں واقع حزب اسلامی کے مورچوں پر پانچ بجے حملے شروع کر دیے۔ جنگ کے پہلے دن شوائے نظار اور جنرل بابا جان کی فوجیں آگے بڑھتی چلی گئیں لیکن اگلے دن حزب اسلامی نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اپنے علاقے واپس لے لیے اور چھل ستون پر بھی قبضہ کر لیا۔ صلح و صفائی کی کوششیں۔ معاہدہ اسلام آباد: افغانستان میں ایک بار پھر خوں ریزی اور خانہ جنگی کا آغاز پاکستان سمیت تمام عالم اسلام کے لیے انتہائی پریشان کن تھا۔ چنانچہ از سر نو جنگ بندی اور مصالحت کے لیے دوڑ دوپ شروع ہوئی، خادم الحرمین والشریفین شاہ فہد، وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف، آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل حمید گل اور جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ ان کوششوں کے نتیجے میں 7 مارچ 1993ء کو اسلام آباد میں مجاہد رہنماؤں کے درمیان ایک اور معاہدہ ہوا۔ اس بار بھی حسب سابق اصل فریق حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی تھے۔ فرق یہ تھا کہ سابقہ معاہدوں میں جمعیت اسلامی کا پلہ بھاری تھا جب کہ معاہدہ اسلام آباد میں حزب اسلامی کی حیثیت غالب تھی۔ اس معاہدے میں گلبدین حکمت یار کو افغانستان کا بااختیار وزیراعظم تسلیم کیا گیا تھا جو اپنی مرضی کی کابینہ تشکیل دے سکتا تھا۔ تاہم جمعیت اسلامی کے نمائندے نے خاصی تنگ دود کے بعد معاہدے میں یہ ترسیم کرائی کہ وزیراعظم کابینہ کی تشکیل میں صدر اور دیگر رہنماؤں سے مشورہ کرے گا۔ بہر حال اس ترسیم سے وزیراعظم کے اختیارات میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی تھی کیوں کہ اسے مشورے پر عمل درآمد کا پابند نہیں کیا گیا تھا۔ معاہدے کے مطابق صدر برہان الدین ربانی

کی مدت صدارت میں توسیع کر دی گئی تھی مگر اب وزیراعظم کے اختیارات میں اضافے کی وجہ سے ربانی کی حیثیت قانوناً کمزور ہو گئی تھی۔ ہاں علما ربانی اور مسعودی سیاہ و سپید کے مالک تھے کیوں کہ ان کے اتحادیوں کی قوت زیادہ تھی۔ پھر پروفیسر سیاف، مولوی محمد نبی محمدی اور مولانا یونس خالص بھی ازراہ مصلحت انہی کے ساتھ تھے۔ چونکہ مصالحت کے لیے سرگرم قوتوں کو مجاہدین کی جانب سے بار بار معاہدوں کی خلاف ورزی کا تجربہ ہو چکا تھا اس لیے اس معاہدے کی توثیق حرمین شریفین میں کرانے کا فیصلہ ہوا۔ معاہدے میں شامل فریق اور مجاہد رہنما فرماؤ گئے مسعودی عرب شاہ فہد بن عبدالعزیز کی دعوت پر اگلے دن 18 مارچ 1993ء کو کجواز مقدس حاضر ہوئے اور عمرے کی سعادت حاصل کرنے کے بعد اس مقدس سرزمین اور پاکیزہ فضا میں حلف اٹھایا کہ معاہدے کی مکمل پاسداری کی جائے گی۔

جلال آباد مذاکرات: افغان عوام کو اب پختہ امید تھی کہ ان کے ایام مصائب ختم ہونے کو ہیں مگر صدافوس کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں کیے گئے قول و قرار بھی مجاہد رہنماؤں کو بدعہدی سے باز نہ رکھ سکے۔ معاہدہ اسلام آباد اور حرمین کا حلف نامہ بھی نقش بر آب ثابت ہوا۔ ابھی اس معاہدے کی روشنائی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مجاہد تنظیموں میں ایک بار پھر محاذ آرائی کا ماحول بننے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ صدر برہان الدین ربانی نے حکمت یار کو وزیراعظم کی حیثیت سے ملنے والے اختیارات کو دل سے قبول نہیں کیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ یہ اختیارات کم کر کے صدر کی حیثیت کو غالب رکھا جائے۔ جب یہ کشاکش بڑھنے لگی تو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں دوبارہ جنگ نہ چھڑ جائے۔ چنانچہ حکومت سازی کے تمام معاملات کو حتی طور پر طے کرنے کے لیے جلال آباد میں مذاکرات کا انعقاد کیا گیا جہاں سابق افغان بادشاہوں کے سرکاری شاعی محل میں 9 جہادی تنظیموں کے سربراہ ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اجلاس میں پروفیسر ربانی، مولانا یونس خالص، گلبدین حکمت یار، مولوی محمد نبی محمدی، پیر سید احمد گیلانی اور استاذ عبدالرب رسول سیاف سمیت تمام بڑے لیڈر شریک تھے۔ اجلاس کئی دن تک جاری رہا مگر حکومت سازی کے معاملات طے نہ ہو سکے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ متحارب فریقوں میں کوئی ثالث طے نہیں ہو سکا تھا۔ حالاں کہ ثالث کا تعین ضروری تھا جیسا کہ پہلے پاکستان یہ کردار ادا کرتا رہا تھا۔

افغانستان کے عوام کی نظریں جلال آباد پر مرکوز تھیں اور لوگ دھڑکتے دلوں کے ساتھ منتظر تھے کہ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس دوران ایک بدترین المیہ یہ ہوا کہ جمیعت اسلامی اور حزب اسلامی میں کامل کے شمال میں جنگ چھڑ گئی۔ احمد شاہ مسعود کی افواج نے کاپیسوا اور پروان میں حکمت یار کے ٹھکانوں پر اچانک حملہ کر کے ان دونوں صوبوں پر مکمل قبضہ کر لیا اور پھر پیش قدمی کرتے کرتے

سروبی تک پہنچ گئیں جو حزب اسلامی کا خاص گڑھ تھا۔ حزب اسلامی نے جوانی کا رروائی کرتے ہوئے کابل میں جنرل بابا جان اور جنرل مؤمن کے خلاف فوج کشی کی اور ان کے دونوں ڈویژنوں سمیت قصر دارالامان پر قبضہ کر لیا۔ اس خانہ جنگی کی وجہ اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتی تھی کہ میدان جنگ میں اپنی قوت دکھا کر دونوں فریق مذاکرات کی میز پر اپنا وزن بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر درحقیقت اس صورتحال میں مذاکرات کے بالکل سبوتاژ ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

ممکن تھا کہ یہ اجلاس بے نتیجہ ختم ہو جاتا کہ اچانک دو ہزار پانچ اور معذور افراد نے شاہی محل کا گھیراؤ کر لیا۔ یہ وہ مخلص مجاہد کارکن تھے جنہوں نے جہاد افغانستان کے دوران اپنے قیمتی اعضاء قربان کیے تھے۔ انہوں نے محل کا محاصرہ کر کے اعلان کر دیا کہ مجاہد رہنما اپنے مجتھروں کا فیصلہ کیے بغیر محل سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ یہ دھمکی کام کر گئی اور ملکی تاریخ کے اس طویل ترین سیاسی اجلاس میں جو 21 دنوں پر محیط تھا، حکومت سازی کا تفصیلی معاہدہ طے پا گیا جس کے مطابق 28 جون 1994ء تک حکمت یار کو وزیر اعظم اور برہان الدین ربانی کو صدر مملکت مان لیا گیا۔

صدر ربانی کو توقع تھی کہ وہ ان مذاکرات میں مولانا یونس خالص، پیر سید احمد گیلانی، استاد سیاف اور دیگر رہنماؤں کو قائل کر کے وزیر اعظم کے اختیارات کم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں ایک توازن برقرار رہا جو ایک خوش آئند بات تھی۔ پھر بھی ان مذاکرات کے ذریعے جو فائدہ ربانی صاحب نے اٹھایا وہ کچھ کم نہیں تھا کیوں کہ وہ اپنی مدت صدارت ختم ہونے کے بعد از سر نو صدر بن گئے تھے۔ بہر حال معاہدہ جلال آباد کے بعد حالات پر امن ہونے لگے۔ افغانستان کے جنگ زدہ عوام کو اب توقع تھی کہ امن و امان بحال رہے گا اور وہ چین کی نیند سو سکیں گے۔

پاکستان میں نئی حکومت: اس دوران پاکستان میں 18 جولائی 1993ء کو میاں محمد نواز شریف کی حکومت ختم ہو گئی۔ پنج شیر مزاری نے عبوری حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے عام انتخابات کرائے جن کے نتیجے میں اکتوبر کے مہینے میں محترمہ بے نظیر بھٹو برسر اقتدار آ گئیں۔ افغانستان کے بارے میں ان کی پالیسی بھی میاں نواز شریف سے مختلف نہیں تھی۔ یعنی ہمسائیگی کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے افغانستان میں پاکستان دوست حکومت کے قیام اور استحکام کو ترجیح دینا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ میاں نواز شریف کی طرح محترمہ کی افغان پالیسی میں بھی امریکی تحفظات کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا جا رہا تھا۔

معاہدہ جلال آباد کے بعد: معاہدے کے بعد جب حکومت سازی کا مرحلہ درپیش ہوا تو مجاہد تنظیموں میں رشید دوستم کے مسئلے پر ایک بار پھر اختلاف ہو گیا۔ حرکت انقلاب اسلامی اور اتحاد اسلامی حکومت

میں دوستم کی شمولیت کو ناقابل برداشت قرار دے رہی تھیں۔ صدر ربانی کی جمعیت اسلامی اس مسئلے پر معنی خیز خاموشی اختیار کیے رہی جبکہ حزب اسلامی کا پُر زور اصرار تھا کہ دوستم کو حکومت میں شامل کیا جائے۔ سابق صدر صبغت اللہ مجددی بھی حزب اسلامی کے موقف کے حامی تھے۔ آخر کار بڑی بحث و تجویس کے بعد مندرجہ ذیل شرائط کے تحت دوستم کو حکومت میں شامل کرنے پر اتفاق کر لیا گیا۔

① دوستم کی کلیم جم ملیشیا فوری طور پر اپنا تمام اسلحہ حکومت کے حوالے کرے۔

② کامل خالی کر دے۔

③ دوستم کی جانب سے دو مجاہد رہنماؤں کو حکومت میں نمائندگی دی جائے گی۔

اس اتفاق رائے کے بعد کامل میں حکومت سازی کا کام شروع ہو گیا اور افغان عوام نے کچھ کسانس لیا۔ حکمت یار کے بیرونی طاقتوں سے روابط: چاہیے تھا کہ اس کے بعد جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کی کشاکش کا خاتمہ ہو جاتا مگر..... اندر ہی اندر اب بھی آگ مسلسل سلگ رہی تھی۔ لڑائی بھڑکانے والی طاقتیں بدستور سرگرم تھیں اور افغان رہنماؤں کی شہ پر کسی بھی لمحے جنگ کے الاؤ میں کودنے کو تیار تھے۔

”جلال آباد مذاکرات“ کے دوران مسعود کے جنگ جوؤں نے پروان اور کاپیسا میں حزب اسلامی کے مراکز پر قبضہ کر لیا تھا اور مذاکرات کے بعد بھی یہ علاقے خالی نہیں کیے تھے۔ یہ صورتحال حکمت یار کے لیے سخت تکلیف دہ تھی۔ کیونٹ لابی اور بعض بیرونی طاقتیں پہلے ہی گلبدین حکمت یار کو اپنے تعاون کا تعین دلا کہ افغانستان پر بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کا خواب دکھا رہی تھیں۔

اس صورتحال میں حکمت یار جو حزب وحدت کے عبدالحی مزاری اور شمل کے رشید دوستم کا اعتماد حاصل کر چکے تھے، اپنے اثر و رسوخ میں اضافے کے لیے نئے راستے تلاش کرنے لگے۔ انہوں نے خود ایران کا دورہ کیا اور صدر ہاشمی رفسنجانی کی پشت پناہی اور تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر ان کے نمائندوں نے تاشقند میں رشید دوستم کے نمائندوں سے مذاکرات کیے اور ایک نئے معاہدے پر دستخط کر کے باہم حلیف بن گئے۔ اس طرح حزب اسلامی، حزب وحدت، کلیم جم ملیشیا اور ایران باہم متحد ہو گئے۔

”رابطہ کونسل“ نیا اتحاد: ان تینوں اتحادیوں کو لازمی طور پر حکومت پاکستان کا اعتماد درکار تھا، اس مقصد کے لیے چار سہ ماہ میں ایک اجلاس ہوا جس میں حکمت یار کے داماد ہمایوں جریر اور دوستم کے نمائندے جنرل فوزی نے شرکت کی۔ جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد اور اجمل خٹک بھی موجود تھے۔ یہاں حزب اسلامی، حزب وحدت اور دوستم ملیشیا کے اتحاد کو ”رابطہ کونسل“ کے نام سے باقاعدہ ایک شکل دی گئی اور افغانستان میں ایک نئی حکومت کے قیام کا خاکہ بنایا جانے لگا۔ جناب حکمت یار کے

اس تفریق پسند طرز سیاست نے تمام مجاہد رہنماؤں کو ان سے متنفر کر دیا۔ استاذ سیاف، مولانا محمد یونس خالص، مولانا نبی محمدی اور پیر کیلائی اگرچہ صدر ربانی سے بھی مطمئن نہیں تھے مگر حکمت یار کو کیونستوں کے ساتھ متحد دیکھ کر انہیں صدر ربانی سے تعاون میں عافیت نظر آرہی تھی۔ ادھر حکمت یار معاہدہ جلال آباد کو نظر انداز کر کے اب زیادہ ٹھوس لہجے میں مطالبہ کر رہے تھے کہ ربانی عہدہ صدارت سے مستعفی ہو جائیں جبکہ ربانی اس مطالبے کو برکاء کی حیثیت دینے کو بھی تیار نہیں تھے۔

یکم جنوری 1994ء کا خوزیر معمر کے آخر کار اپنی قوت کا اچھی طرح اندازہ کرنے کے بعد حکمت یار اور ان کے اتحادیوں نے کابل پر قبضے کا منصوبہ طے کر لیا۔ 31 دسمبر 1993ء کی پنج بستر رات کے آخری پہر ”رابطہ کونسل“ میں شامل تینوں طاقتوں نے کابل پر اچانک یلغار کر دی۔ حزب اسلامی نے چہار آسیاب سے پیش قدمی کی اور بالا حصار کے نشیبی علاقے ”پل محمود“ سے کابل پر گولہ باری شروع کر دی۔ ادھر نادر خان میں موجود کلیم جم بلشیا بھی آگے بڑھی اور حزب اسلامی کے دستوں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ جنوب سے حزب وحدت نے بھی لشکر کشی شروع کر دی۔ جلد ہی کابل ایئر پورٹ، ریڈیو اسٹیشن اور دیگر اہم عمارتوں پر رابطہ کونسل کے جنگجو قابض ہو گئے۔ کونسل کے تینوں بڑے رہنماؤں حکمت یار، رشید دوستم اور عبدالعلی مزاری نے پاکستان اطلاع بھجوا دی کہ کابل پر ہمارا قبضہ ہو گیا ہے اور برہان الدین ربانی شہر چھوڑ گیا ہے۔ مگر ”رابطہ کونسل“ کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ کابل حکومت کے وزیر دفاع احمد شاہ مسعود نے اسی دن بھر پور جوابی کارروائی کر کے حزب اسلامی، حزب وحدت اور کلیم جم بلشیا کو باہر دھکیل دیا۔ شام تک ایئر پورٹ بھی واپس لے لیا گیا۔ لڑائی میں فریقین کی بھاری نفرتی کام آئی۔ سینکڑوں شہری بھی جاں بحق ہوئے۔ انجام کار میدان ربانی حکومت کے ہاتھ رہا۔ اس کامیابی کے بعد حکومت کابل نے حزب اسلامی، حزب وحدت اور دوستم بلشیا کو ”باغی“ قرار دے دیا۔ یوں افغانستان کے عسکری گروہوں کے درمیان فضا اس قدر کشیدہ ہو گئی کہ لوگ کسی تھپنے کے امکان اور امن وامان کے قیام سے بالکل مایوس ہو گئے۔

ملک کلڑے کلڑے: 1994ء کا پورا سال اسی طرح مجاہد رہنماؤں کے مابین خانہ جنگی اور سیاسی کشمکش میں گزرا جس کی تفصیل میں جاننا حاصل ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس خانہ جنگی نے ملک کو نہ ختم ہونے والے انتشار اور مکمل بربادی کے گڑھے میں دھکیل دیا۔

ایک جائزے کے مطابق ان دنوں افغانستان 9 واضح حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

① کابل اور اس کے زیر انتظام شمالی علاقے: جن میں چہار یکار، پنج شیر، بدخشاں اور تخار شامل تھے۔

یہ علاقہ تا جگ لیڈروں صدر برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود کے پاس تھا۔ بھارت اور روس ان کے مددگار تھے۔ پاکستان کی بعض جہادی تنظیموں اور دینی مدارس کا ان سے حسن ظن اب تک برقرار تھا اس لیے وہ بھی ان کے حامی تھے۔

② مشرقی افغانستان کے صوبے: ننگر ہار، جنوبی کاپیسا، کابل کے نواحی علاقے لوگر، وردک، چہار آسیاب اور سرورپی..... یہاں گلبدین حکمت یار اور ان کے اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ انہیں کسی حد تک پاکستان اور بعض پاکستانی مذہبی تنظیموں خصوصاً جماعت اسلامی کی مدد حاصل تھی۔

③ شمالی افغانستان: پنج، مزار شریف، جوزجان، فاریاب اور قندوز..... یہاں ازبک لیڈر، رشید دوستم کاراج تھا جسے روس، بعض وسطی ایشیائی ریاستوں اور کسی حد تک ایران کی بھی حمایت حاصل تھی۔

④ شمال مغربی افغانستان: جہاں ہرات، بادغیس، فراه اور نیمروز پر فارسی بان کمانڈر تورون اسماعیل خان کی حکومت تھی۔ ایران اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

⑤ خوست اور اس کے نواح میں پاکستانی سرحد سے متصل علاقے: یہاں مولانا جلال الدین حقانی کی حکومت قائم تھی جو شریعت اسلامیہ کے مطابق کام کر رہی تھی۔

⑥ بامیان: یہ ہزارہ جات قبائل کی نمائندہ حزب وحدت کے پاس تھا جسے ایران کی پوری سرپرستی اور امداد حاصل تھی۔

⑦ دژہ کیان اور پل خمری: آغا خانی لیڈر منصور نادری کے قبضے میں تھے۔ اسے آغا خان کی وساطت سے مغربی دنیا کا بھرپور تعاون مل رہا تھا۔

⑧ مشرقی افغانستان میں صوبہ کنڑ (اسعد آباد): شروع سے یہ علاقہ علماء و مجاہدین کا مرکز رہا ہے۔ سوویت یونین کے خلاف جہاد کی ابتداء میں یہاں کے علماء کا بہت اہم حصہ ہے۔ یہاں کے ایک اہل حدیث بزرگ مولانا جمیل الرحمن کو مشرقی افغانستان میں جہاد کا بانی کہا جاتا ہے۔ روسی افواج اپنی یلغار کے 12 سالوں میں یہاں قدم جمانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے۔

کابل میں جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی کی نہ ختم ہونے والی محاذ آرائی سے مایوس ہو کر کنڑ کے علماء نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی جس کے سربراہ مولانا جمیل الرحمن تھے۔ چونکہ یہ حکومت مرکز سے آزاد تھی اس لیے جمعیت اسلامی اور حزب اسلامی دونوں کے نزدیک معتوب رہی۔ چند سال بعد مولانا جمیل الرحمن پر اسرار طریقے سے قتل کر دیے گئے۔ ان کے حامی اس کا الزام حزب اسلامی کو دیتے رہے۔ یہ حکومت، ستمبر 1996ء تک برقرار رہی۔

⑨ جنوبی افغانستان: یہاں درجنوں کمانڈر قدم قدم پر مورچہ زن تھے۔

ان علاقوں میں سے چند کوششیں کر کے ہر طرف قتل و غارت اور لاقانونیت کا بازار گرم تھا۔ کابل میں حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی کی جھڑپیں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ روزانہ حزب اسلامی کے مورچوں سے شہر پر راکٹ برستے اور ربانی کی فوجیں جوابی گولہ باری کرتیں۔ اس کشاکش میں 63 ہزار افراد لقمہ اجل بن چکے تھے۔



مآخذ و مراجع

- ❦ افغانستان کی کہانی، حقائق کی زبانی۔ ڈاکٹر مفکر احمد
- ❦ ماہنامہ صدائے مجاہد، جلد 1992ء، 1993ء، 1994ء
- ❦ ماہنامہ الارشاد، جلد 1992ء، 1993ء، 1994ء
- ❦ ہفت روزہ بنکیر، جلد 1992ء، 1993ء، 1994ء
- ❦ اردو ڈائجسٹ، جون 1992ء

تیسواں باب

طالبان کا ظہور

بھیڑیوں کی شکار گاہ، بدامنی اور لوٹ مار: مجاہدین کی دونوں بڑی جماعتوں حزب اسلامی اور جمعیت اسلامی میں مصالحت کی تمام کوششیں ناکام ہو جانے کے بعد صلح مجور بنما یوں ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ملک میں اب مرکزیت کا دور دور تک کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ ان حالات میں ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سینکڑوں جنگجو کمانڈر اپنی اپنی جگہ عملاً خود مختار حکمران بن گئے کیونکہ انہیں کسی بالادست قوت سے باز پرس کا اندیشہ نہ تھا۔ ایسے کمانڈروں نے جگہ جگہ چوکیاں بنالیں اور سڑکوں پر پھانک اور آہنی زنجیریں نصب کر کے متوازی حکومتیں قائم کر لیں۔ کوئی گاڑی انہیں ٹکس ادا کیے بغیر وہاں سے نہیں گزر سکتی تھی۔ مسافروں اور تاجروں کو ہر ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر کوئی نہ کوئی زنجیر تہی ہوئی نظر آتی اور ٹکس ادا کرنا پڑتا۔ صرف قندھار سے استون بولدک تک 20 سے زائد زنجیریں تھیں۔ مسافران سے گزرتے گزرتے قلاش ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی ڈرائیور ٹکس ادا کرنے میں ہنس و پیش سے کام لیتا تو اس کا حشر بہت برا ہوتا۔ افغانستان کا دورہ کرنے والے ایک صحافی راجہ عبدالوحید لکھتے ہیں:

”لوگوں نے مجھے بتایا ایسے بے شمار واقعات ہوئے کہ کسی پوسٹ پر ڈرائیور نے مسلح افراد کو یہ جگا ٹکس ادا کرنے سے انکار کر دیا تو اسے گاڑی کے نیچے لٹا کر اوپر چیک رکھ کر گاڑی کو اٹھا دیا گیا جس سے اس کی کمر کی ہڈیاں اور سینے کی پهلیاں ٹوٹ گئیں۔ بعض جگہ ایسے ”نافرمان“ ڈرائیور کے جسم کا گوشت پلاسوں سے نوچا گیا اور کھال کھینچی گئی۔“ (پندرہ روزہ جہاد کشمیر، جنوری 1996ء)

ان کی خمرستیوں کا یہ عالم تھا کہ خواتین کی عصمتیں تک محفوظ نہیں رہی تھیں۔ وہ جسے چاہتے تھے گاڑی سے اتار کر اغوا کر لیتے اور عصمت دری کر کے قتل کر دیتے۔ حد تو یہ ہے کہ لڑکے تک ان کی ہوسا کی کا شکار بننے لگے تھے۔ یہ مسلح کمانڈر نہ صرف راہزنی کے عادی تھے بلکہ اپنے زیر قسط بستروں میں بھی دن دیناڑے غنڈہ گردی کرتے تھے۔ انہوں نے ”مجاہدین“ کے پاکیزہ نام کو دل کھول کر بدنام کیا۔ ورنہ

حقیقت میں یہ مجاہدین نہیں مفاد پرست عناصر تھے جنہوں نے ذاتی مفادات کے لیے مجاہدین کا بھجس بدل لیا تھا۔ انہوں نے منشیات فروش کے ذریعے خوب دولت کما کر اسلحے کے بڑے بڑے ذخائر جمع کر لیے تھے اور کرائے کے غنڈوں اور اجرتی قاتلوں کو بھرتی کر کے لوگوں پر دہشت بٹھادی تھی۔

انہیں مجاہد مت کہو: ان دنوں کا بل کے حالات کیا تھے، ایک واقعے سے اندازہ لگائیے۔ کامل میں کام کرنے والی ایک رفاہی تنظیم کے رکن کا بیان ہے: ”میں ایک دن کہیں جا رہا تھا مگر راستہ معلوم نہ تھا۔ دیکھا کہ ایک گاڑی آ رہی ہے۔ گاڑی قریب آئی تو میں نے ہاتھ دیا لیکن گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہندو برادروں نے بریک نہ لگائی۔ میں نے زور سے کہا: مجھے راستہ بتاؤ۔ مگر وہ قہقہے لگاتے گزر گئے۔

پیچھے ایک گھر تھا میں اس طرف چلا گیا تاکہ راستہ معلوم کروں۔ دیکھا تو گھر میں ایک لڑکی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا: ”یہ کیسے مجاہدین تھے جو ابھی یہاں سے گزرے ہیں۔ میں نے ان سے راستہ پوچھنا چاہا مگر انہوں نے میری بات سنا تک گوارا نہ کی۔“

یہ سن کر لڑکی نے سرا پر اٹھایا۔ میں نے دیکھا وہ رو رہی تھی۔ اس نے کہا: ”خدا کے لیے انہیں مجاہدین نہ کہو۔ یہ تو لٹیرے ہیں۔ ابھی ابھی میرے باپ کے سامنے میری اور میری ماں کی آبرو لوٹ کر گئے ہیں۔ اس صدمے سے میرا باپ بے ہوش ہو گیا ہے۔“

افغانستان ایک عبرت کدہ: یہ تو ایک مثال ہے ورنہ ان دنوں وہاں اس سے بڑھ کر ایسے ایسے ہوش ربا مظالم توڑے جا رہے تھے جنہیں سن کر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کیا واقعی کوئی مسلمان بلکہ کوئی ابن آدم اس حد تک گر سکتا ہے اور کیا انسانیت کی اس قدر تذلیل بھی ہو سکتی ہے۔ اس دہشت گردی کا وجہ سے ایک طرف تو افغان عوام کا جینا دو بھر ہو گیا تھا اور دوسری طرف اندرونی و بیرونی تجارت کے راستے بھی بند ہو گئے تھے۔ ہاں منشیات کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ افغانستان گویا جرائم پیشہ افراد کی جنت بن چکا تھا۔ جہاں وہ ہر طرح کی من مانی کر سکتے تھے جہاں ہر طرف غنڈوں اور بد معاشرلوں کا راج تھا اور ہر شریف انسان اپنی زندگی سے عاجز تھا۔

فاتحین، علماء، صوفیاء اور غیرت مند مسلمانوں کا یہ ملک اب ایسے بھیڑیوں کی شکار گاہ بن چکا تھا جو کسی پر رحم کرنا نہیں جانتے تھے۔ جو انسان کے روپ میں شیطان تھے۔ ان کے مظالم اور شرمناک کارستانیوں نے لوگوں کو ساقتادوار کے مصائب بھلا دیے تھے۔ افغانستان کے چپے چپے سے گھٹی گھٹی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا ذرہ ذرہ بلک رہا تھا۔ سفید ریش بوڑھے مسجد کی محرابوں میں، عورتیں گھر کی تاریک کوٹھڑیوں میں سجدہ ریز ہو کر خدائے عزوجل سے رحم کی التجا کر رہی تھیں۔ ان

آہوں اور سسکیوں کے پیچھے کچھ قہقہے بھی گونج رہے تھے۔ یہ آوازیں امریکا، روس، اسرائیل اور بھارت کے ایوانوں سے آرہی تھیں۔ جو مجاہدین کی سرزمین کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک کر خوشیاں منا رہے تھے۔ انہیں اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے خواب کو سبوتاژ کر دیا تھا۔ جہاد کو دنیا بھر میں بدنام کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ اب تو خود مسلمان یہ کہہ رہے تھے کہ اگر جہاد اس عمل کا نام ہے جو افغانستان میں ہو رہا ہے اور جہاد کے ثمرات وہی ہیں جو وہاں ظاہر ہو رہے ہیں تو ہم ایسے جہاد کے بغیر بھلے۔ مجاہدین کے حامیوں کے پاس اب تو حکمت یا رک کی وکالت کے لیے کوئی دلیل تھی نہ وہ احمد شاہ مسعود اور ربانی کے کارناموں کی کوئی وجہ جواز جانتے تھے۔ ان حالات میں افغانستان ایک عبرت گاہ بن گیا تھا جسے دیکھ کر ہر درمند مسلمان تنہائی میں خون کے آنسو روتا تھا مگر دنیا جو افغانستان کو حشرات الارض کا ایک جنگل قرار دے چکی تھی بے فکر تھی۔ کسی کو پروا نہ تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے عالمی طاقتیں اسے نمونہ عبرت بنا کر مطمئن تھیں اور مسلم ممالک وہاں اصلاح احوال سے مایوس ہو کر منہ پھیر چکے تھے۔ ظاہری اسباب و وسائل کے لحاظ سے اب افغانوں کا بحیثیت قوم باقی رہنا مشکل نظر آتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ آئندہ دو چار سالوں میں یہ ملک اپنی جغرافیائی وحدت کو بیٹھے گا اور عالمی طاقتیں اس جاں بلب مریض کے اعضا تک نیلام کر دیں گی۔

جنوبی افغانستان سے ایک نئی قوت کا ظہور: مگر یاس و حرماں نصیبی کی ان گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں اچانک افغانستان کے جنوبی افق پر روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی اور افغانستان کے باشندے دم بخود ہو کر اس سمت دیکھنے لگے۔ سحر کا یہ دھندلکا بڑھتا گیا حتیٰ کہ لوگوں نے جنوبی افغانستان سے ایک نئی قوت کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس قوت نے دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی سیاست میں ایک فیصلہ کن مقام حاصل کر کے عالمی طاقتوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ نئی طاقت ”طالبان“ کے نام سے ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ دینی مدارس کے طلبہ کا گروہ تھا جو حالات کی اصلاح کے لیے میدان میں اتر تھا۔

طالبان کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ طالبان کی اکثریت کا تعلق مجاہدین کی اس دوسری نسل سے تھا جو سوویت افواج کے خلاف جہاد کے آخری دور میں میدان میں اتری یا سوویت افواج کے انخلاء کے بعد نجیب نظامیہ کے خلاف نبرد آزما رہی۔ نجیب حکومت کے خاتمے کے بعد یہ ہزاروں نوجوان اپنے گھر وں کو واپس چلے گئے۔ ان کی بڑی تعداد دینی مدارس میں اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے لگی۔ یہ مدارس قندھار، خوست اور دوسرے افغان شہروں کے علاوہ پاکستان کے صوبہ سرحد اور صوبہ بلوچستان میں قائم تھے۔ ان میں جامعہ حقانیہ اکوڑہ خشک اور جامعہ منبع العلوم میران شاہ زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ کونسل میں بھی کئی مدارس ایسے تھے جہاں افغان مہاجرین کے بچے زیر تعلیم تھے۔ یہ ہزاروں نوجوان طالبان تحریک کا حصہ بننے میں پیش پیش تھے۔

تحریک کے اکثر سرکردہ افراد گناہ تھے مگر آہستہ آہستہ اس میں مشہور اور بااثر علماء و مشائخ بھی شامل ہوتے چلے گئے۔ یوں طالبان تحریک تیزی سے مقبول ہونے لگی۔ بہر حال تحریک کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔ جن کی عمریں 18 سے 25 سال کے درمیان تھیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو پہلے کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ یہ تحریک کسی بڑی منصوبہ بندی یا وسیع اہداف کو سامنے رکھ کر شروع نہیں کی گئی تھی بلکہ یہ مقامی کمانڈروں کے ظلم و تشدد کے خلاف ایک فوری رد عمل تھا۔ طالبان کے رہنما ملامحمد عمر نے صرف پندرہ سولہ افراد کے ساتھ ان درندہ صفت افراد کو سبق سکھانے کا تہیہ کیا تھا جو افغان معاشرے میں رچی بسی شرم و حیا اور غیرت و حمیت کی دھجیاں اُڑا رہے تھے۔

ملاحمد عمر مجاہد: ملاحمد عمر مجاہد کے شب و روز جنوبی افغانستان کے شہروں، دیہاتوں اور جنگلات میں بسر ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ کامل بھی صرف دو مرتبہ گئے۔ وہ انتہائی سنجیدہ، باوقار اور کم گوانسان ہیں۔ ان کا قد ساڑھے چھ فٹ کے قریب ہے اور چہرے پر کھنی ڈاڑھی ہے۔ میڈیا سرتوڑ کوشش کے باوجود ان کی کوئی تصویر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ خود محفلوں، میڈیا اور غیر ضروری میل ملاپ سے گریز کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی مغربی صحافی کو انٹرویو نہیں دیا۔ دور حکمرانی میں یا اس سے پہلے بھی کبھی بیرون افغانستان کا سفر نہیں کیا۔ ہاں صرف جہاد میں زخمی ہو کر دو تین بار علاج کے لیے کونسل آئے تھے۔ ان کی زندگی ایک قلندرانہ راز کی مانند ہے۔

وہ 1960ء میں قندھار کے ایک نواحی گاؤں ”نودیبہ“ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولوی غلام نبی اس گاؤں کی مسجد کے امام تھے۔ ان کا نسب تعلق پنجتونوں کے قبیلے ”ظلوئی“ کی شاخ ”ہونک“ سے ہے۔ ”ہونک“ وہی قبیلہ ہے جس کے سردار ”میردیس“ نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانوں کو متحد کر کے ”ظلوئی افغان سلطنت“ کی بنیاد رکھی تھی جو افغانستان کے علاوہ ایران کے شہر اصفہان تک پھیلی ہوئی تھی۔

مگر غلام عمر کسی رئیس یا جاگیر دار گھرانے کے نہیں، ایک غریب کنبے کے فرد تھے۔ ان کا بچپن، لڑکپن اور جوانی نہایت عسرت میں گزرے۔ ان کا خاندان کسی چھوٹی سی جائیداد کا مالک بھی نہیں۔ ہاں علم و فضل اور احسان و معرفت کی دولت سے مالا مال ہے۔ خاندان میں علماء و مشائخ بھی تھے اور امامت و خطابت اور درس و تدریس بھی ان کا خاندانی منصب تھا مگر اس حوالے سے بھی یہ خاندان زیادہ مشہور نہیں تھا۔ ان کے والد، چچا اور دوسرے بزرگ گمناہی کے ساتھ دین کی خدمت کرنے اور جاکشی کے ساتھ

رزق حلال کمانے کے عادی تھے۔ یہی خصلتیں ملا محمد عمر کو ورثے میں ملیں۔

ملا محمد عمر مجاہد جہاد روس میں: محمد عمر ابھی تین سال کے تھے کہ ان کے والد مولوی غلام نبی چلے گئے۔ ان کے بڑے چچا مولوی محمد انور نے انہیں اپنی کفالت میں لے لیا اور اپنے بچوں کی طرح ان کی پرورش کی۔ انہوں نے مرحوم بھائی کی بیوہ سے نکاح کر لیا، اس طرح وہ محمد عمر کے سوتیلے باپ بھی بن گئے۔ یہ بڑے چچا ارزگان کے ضلع بیروت کی ایک مسجد کے امام اور مدرس تھے۔ زابل کا ضلع ”شکنجے“ اور بیروت وہ علاقے ہیں جہاں محمد عمر کا قبیلہ طویل مدت سے آباد تھا۔ اب اپنے چچا کے ساتھ محمد عمر بھی وہیں منتقل ہو گئے۔ یہاں انہوں نے انور چچا کے علاوہ دوسرے چچا مولوی محمد جموع سے علوم اسلامیہ کی ابتدائی کتب پڑھیں۔

1978ء میں جب محمد عمر ہدایہ پڑھ رہے تھے، افغانستان میں کمیونسٹ انقلاب آ گیا۔ یہ محمد عمر کی زندگی کا اٹھارہواں سال تھا۔ اسی سال وہ تعلیم کا سلسلہ موقوف کر کے کیونز کے خلاف میدان میں اترنے والے اولین مجاہدین کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ ڈیڑھ سال بعد روسی افواج باقاعدہ افغانستان میں داخل ہو گئیں۔ ان کے ہوش ربا مظالم سے بچنے کے لیے لاکھوں افراد پاکستان چلے گئے مگر ملا محمد عمر مجاہد کا خاندان ان سخت ترین حالات میں بھی مادر وطن کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔ شروع شروع میں محمد عمر بیروت کے آس پاس کیونسٹوں اور روسیوں سے خبردار رہا۔ اس دوران وہ دوبار شدید زخمی ہوئے۔ ایک بار ٹانگ متاثر ہوئی، دوسری بار مشین گن کی گولیوں نے ان کا جسم چھید دیا مگر محمد عمر نے جہاد جاری رکھا۔

ایک عرصے بعد وہ چچا کے مشورے سے قندھار کے جنوب مغربی ضلع ”سج دانی“ منتقل ہو گئے۔ انہوں نے گاؤں ”سنگ حصار“ کو مرکز بنا کر روسیوں پر حملے شروع کیے۔ اس دوران ایک بار پھر وہ حد درجے گھائل ہوئے حتیٰ کہ دائیں آنکھ بھی کام آگئی۔ کوئٹہ ہسپتال میں علاج ہوا اور تندرست ہوتے ہی وہ دوبارہ محاذ پر پہنچ گئے۔ اس دوران ان کی والدہ اور اہل خانہ ارزگان میں تھے جو نسبتاً محفوظ علاقہ تھا۔ محمد عمر سال ڈیڑھ سال میں ان سے ملنے چلے جاتے تھے۔

ان مہمات میں 14 برس بیت گئے۔ محمد عمر کمانڈر مولوی یونس خالص کی حزب اسلامی اور مولوی نبی محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی کے علاقائی کمانڈر کے طور پر میدان جہاد میں داخلیت دیتے رہے۔ 1989ء سے 1992ء کے دوران وہ کمانڈر نیک محمد کی کمان میں نجیب حکومت کے خلاف مصروف پیکار رہے۔ وہ راکٹ لانچر استعمال کرنے کے ماہر تھے۔ روسیوں اور کیونسٹوں کے بہت سے ٹینک ان کے چلائے ہوئے راکٹوں سے تباہ ہوئے۔ کئی مہمات میں انہوں نے مجاہد گروپوں کی قیادت کی اور اپنے اہداف کامیابی سے حاصل کیے۔ اب جنوبی افغانستان کے مجاہدین میں وہ ملا محمد عمر کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔

خانہ جنگی کے دور میں: نجیب حکومت کے خاتمے اور کابل پر مجاہدین کے قبضے کے بعد ملا محمد عمر نے قندھار کے ضلع میوند کے دیہات ”سنگ حصار“ کی ایک مسجد کی امامت کے فرائض سنبھال لیے۔ ساتھ ہی ایک مدرسہ بھی کھول لیا جس میں طلبہ تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ملا عمر خود بھی اب تک پورے عالم دین نہیں بنے تھے۔ ہدایہ سے آگے کی کتب باقی تھیں، چنانچہ وہ خود بھی باقی ماعدہ کتب کی تکمیل کرنے لگے۔ ایک روایت کے مطابق ان دنوں وہ مختصر المعانی اور مشکوٰۃ شریف پڑھ رہے تھے۔ بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مدرسے میں پڑھاتے تھے۔ دونوں روایات میں تطبیق کس طرح ہو؟ قرین قیاس یہ ہے کہ اس وقت وہ مشکوٰۃ پڑھنے کے ساتھ ساتھ نچلے درجات کے طلبہ کو پڑھاتے بھی ہوں گے۔ بہر حال پڑھائی کی مشغولیت کے باوجود وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھے۔ اپنے وطن کی حالت زار پر وہ نہایت متفکر رہا کرتے تھے۔ یہ بے چینی غالب آئی تو تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے پندرہ بیس ہم خیال طلبہ کی ایک جماعت بنا کر اصلاح معاشرہ کی ایک خاموش کوشش شروع کر دی۔

طریقہ کار یہ تھا کہ وہ وفد کی شکل میں مختلف گروپوں کے کمانڈروں سے ملے، انہیں حالات کی یقینی اور قوم کی ابتری کا احساس دلاتے اور ترغیب دیتے کہ وہ باہمی تنازعے ترک کر دیں، لوٹ مار و غارت گری بند کر لیں اور شرعی احکام کا نفاذ کر کے عوام کو امن و امان کی فراہمی یقینی بنائیں۔ تین چار ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حاجی بشیر اور چند مخلص مجاہد رہنما ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے مگر اس تربیتی کوشش کا اکثر کمانڈروں پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔

یہ گھڑی محشر کی ہے: شاید ان کی عمر اسی طرح درس و تدریس اور ترغیب و تبلیغ میں گزر جاتی اور تاریخی امن ان کا نام بھی ثبت نہ ہو پاتا مگر 1994ء کے موسم خزاں میں ایک لرزہ خیز واقعے نے ان کی زندگی اور افغانستان کی تاریخ کا دھار بدل دیا۔ انہیں اطلاع ملی کہ ایک عالم کمانڈر نے دو نو عمر لڑکیوں کو اغوا کر لیا ہے، ان کے سر مونڈ دیے ہیں اور انہیں مردانہ لباس پہنا کر اپنے فوجی کیمپ لے گیا ہے جہاں کئی بار ان کی عصمت دری کی گئی ہے۔

یہ دردناک واقعہ سن کر ملا محمد عمر سے برداشت نہ ہو سکا۔ انہوں نے فوراً اپنے مدرسے کے طلبہ کو جمع کیا جو تیس کے لگ بھگ تھے۔ ان میں سے صرف 16 کے پاس رائفلیں تھیں۔ ملا محمد عمران طلبہ کو لے کر اس بے مردمانی کے عالم میں اس عالم کمانڈر کی چوکی پر ٹوٹ پڑے۔ یہ چوکی ”پاشمون“ کہلاتی تھی۔ اس کارروائی کے نتیجے میں مظلوم لڑکیوں کو چھڑوایا گیا۔ کمانڈر کو توپ کے دھانے سے لڑاکا کر بھانسی دے دی گئی اور چوکی پر قبضہ کر لیا گیا۔

یاد رہے کہ قندھار کے لوگ یہ واقعہ معمولی فرق کے ساتھ مختلف انداز میں سناتے ہیں۔ ایک مقامی روایت اس طرح ہے کہ مہاجرین کا ایک خاندان تہن سے قندھار آ رہا تھا۔ راستے میں ان کی گاڑی کو ایک چیک پوسٹ پر روکا گیا۔ مسلح افراد کے کمانڈر نے گاڑی میں سوار دو کم عمر لڑکیوں کو زبردستی اتار دیا۔ جب ان کے والدین نے احتجاج کیا تو مسلح افراد نے ان پر فائرنگ کی کوشش کی۔ ڈرائیور بڑی مشکل سے گاڑی بھاگ کر خاندان کے بقیہ افراد کو بچانے میں کامیاب ہوا اور لوگوں کو اپنی چٹا سائی ٹرک کی مدد کی ہمت نہ ہوئی۔ اگلے دن ان معہ دم بچیوں کی لاشیں ایک مقامی مدرسے کے دروازے پر ملیں۔ ملاحظہ فرمائیے دیکھ کر تڑپ اٹھے اور ان خالموں سے بدلہ لینے پر تل گئے۔ چونکہ ان ایام میں ایسے واقعات کثرت سے پیش آرہے تھے اس لیے کوئی بعید نہیں کہ ایسے ایک سے زائد سائے قریب قریب وقوع پذیر ہوئے ہوں جن کے رد عمل میں ملامحمد عمر کو میدان میں اُترنا پڑا ہو۔

بہر کیف یوں سنگ حصار کے قریب واقع پاشمون چوکی پر قبضہ ان کے طویل سفر کا سنگ میل بن گیا۔ اس چوکی سے انہیں اسلحے اور دیگر ساز و سامان کے علاوہ دو عورتوں کی سربریدہ لاشیں بھی ملی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ غنڈوں نے عصمت دوری کے بعد شاخت مٹا ڈالنے کے لیے ان مظلوم عورتوں کے قتل کر دیے تھے۔

دردنگی کی انتہا: طالبان تحریک کے آغاز کا سبب بننے والے واقعات میں ایک اور لرزہ خیز واقعہ بھی ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق قندھار کے دیہی علاقے کا ایک شخص اپنی بیوی کو کرایے کی گاڑی پر زچگی کے لیے ہتھال لے جا رہا تھا۔ عورت شدید تکلیف کی حالت میں تھی کیوں کہ بچے کی ولادت کا وقت قریب تھا۔ راستے میں اس گاڑی کو چیک پوسٹوں پر حسب معمول روک کر اس دیہاتی سے ٹیکس لیا گیا۔ تین چیک پوسٹوں پر بھاری ٹیکس ادا کرنے کے بعد بے چارے دیہاتی کی جب غالی ہو گئی۔ جب گاڑی چوٹی چیک پوسٹ پر پہنچی اور اس کا کمانڈر دیہاتی سے کچھ وصول کرنے میں ناکام رہا تو مشتعل ہو کر اس نے دیہاتی کو گاڑی سے نیچے گھسیٹ لیا۔ دیہاتی نے گڑگڑا کر انہیں اپنی مجبوری اور اپنی بیوی کی نازک حالت سے آگاہ کیا تو جنگجوؤں کے چہروں پر شیعہ لانی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ ان کے کمانڈر نے کہا: ”ہم نے آج تک ہر قسم کے فحش مناظر دیکھے ہیں مگر کبھی بچے کی ہڈیاں کا تماشا نہیں دیکھا۔ تم بیوی کو یہیں چھوڑ جاؤ۔ ہم یہ منظر دیکھ کر رہیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ بے رحم اس تڑپتی ہوئی عورت کو کھینچے ہوئے چیک پوسٹ میں لے گئے۔ تکلیف سے ادھ موٹی خاتون خود کو عصمت کے ٹیڑوں میں گھمرا کر دیکھ کر اس قدر مضطرب اور خوف زدہ ہوئی کہ اس نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ جب ملامحمد عمر کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس بد معاشی اور دردنگی کو

مٹا کر دم لیں گے چاہے انہیں اپنی جان کی قربانی بھی کیوں نہ دینا پڑے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے: تحریک کے آغاز کے بارے میں ایک نہایت اہم روایت خود بانی تحریک ملا محمد عمر سے منقول ہے۔ یہ روایت اس اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی تھی جس میں ملا عمر کو ”امیر المؤمنین“ کا لقب دیا گیا۔ بعد میں یہ روایت طالبان حکومت کے ترجمان ماہنامہ ”امارت اسلامیہ“ میں بھی شائع ہوئی۔ اس روایت میں ملا محمد عمر کہتے ہیں:

”یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں قندھار کے علاقے ”سنگ حصار“ کے ایک چھوٹے سے مدرسے میں زیر تعلیم تھا۔ ایک دن افغانستان میں ہونے والے مظالم، ہولناکی اور خونچکاں حالات کی تصویر اچانک آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگی۔ جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ملک میں جو روستم کی گرم بازاری اور جاہل و سفاک حکمرانوں کے ہوتے ہوئے ان مدارس اور علم کے حصول کا کیا فائدہ۔ یہ سوچ کر میں نے دل و دماغ میں ایک منظم اسلامی تحریک چلانے کا نقشہ کھینچا۔ چنانچہ درس و تعلیم کا مشغلہ ترک کر کے میں اپنے ایک رفیق کار کے ہمراہ ”زنکادات“ روانہ ہوا۔ وہاں سے ایک دیرینہ ساتھی سے موٹر سائیکل لی جس پر میں اور میرے ساتھی نے سوار ہو کر شہروں اور بستیوں میں پھیلے ہوئے مختلف مدارس کا دورہ کیا۔ طلبہ کے سامنے اپنا بیجنڈا پیش کیا۔ شام تک تقریباً 53 طلبہ ساتھیوں کو میں نے اس تحریک میں کام کرنے کے لیے تیار کیا۔ سب نے اس بات پر اتفاق کیا کہ وہ کل میرے مدرسے میں حاضر ہوں گے اور اس تحریک کو فعال بنانے کے لیے غور و خوض کریں گے لیکن کل تک وہ سب ممبر کی قدرت نہ رکھ سکے اور اسی رات میرے ہاں جمع ہو گئے۔ صبح ہم مجاہدین کے سرپرست الحاج بشیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ حاجی بشیر صاحب اور دیگر تنظیموں کے قائدین نے ہمیں ضرورت کے مطابق اسلحہ دیا۔ یہی ہمارے لیے اس تحریک کا نقطہ آغاز ثابت ہوا۔“

تحریک کے آغاز میں قحروفاقے اور مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے وہ انکشاف کرتے ہیں:

”میں نے ساتھیوں سے کہا اپنا کام کرتے رہیے اور شہر میں واقع گھروں میں روٹی سالن جمع کرتے رہیے۔ اگر کچھ ٹل گیا تو کھالیں گے اور اگر کچھ نہ ملا تو صبر ہی سے کام لیں گے۔“

(ماہنامہ امارت اسلامیہ، ص: 16، مجرم 1422ھ، از سید محمد طیب آغا)

اس طرح ملا محمد عمر نے سنگ حصار اور گرد و نواح کے طلبہ کو جمع کر کے انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں اصلاح معاشرہ کا کام شروع کیا۔ ابتدائی یہ کوشش غیر مسلح اعزاز میں تھی مگر پرامن اعزاز میں تحریک کے آغاز

کے بعد غوثاٹن کی آبروریزی کے وہ جگر دوز واقعات پیش آئے جنہوں نے ملامحمد عمر کو یکدم ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ یوں قندھار کے گرد و نواح کے لوگ پہلی بار ملامحمد عمر مجاہد سے متعارف ہوئے۔ چونکہ ان کے ساتھیوں میں دینی مدارس کے طلبہ کی اکثریت تھی جنہیں افغانستان میں ”طالبان“ کہا جاتا ہے اس لیے یہ جماعت خود بخود ”طالبان“ کے نام سے مشہور ہوتی چلی گئی۔ اب مقامی لوگوں کی نظر میں ملامحمد عمر اور اس کے طالب علم ساتھیوں پر لگ گئی تھیں کہ شاید وہ انہیں جبر و جور کی زندگی سے نجات دلائیں۔ وہ گرد و نواح سے اپنے علاقوں کے بے رحم سرداروں کے مظالم کی داستانیں لے کر ان کے پاس آنے لگے۔

اپہین بولدک کی طرف: ملامحمد عمر اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورے کرتے رہے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ اس تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ پاشمون چوکی پر قبضے اور عوام کے خوشگوار دُغل نے طالبان کو بڑا حوصلہ بخشتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے ان طلبہ ساتھیوں سے رابطے شروع کر دیے جو جہاد افغانستان میں شرکت کر چکے تھے اور اب حالات سے مایوس ہو کر اپنے گھروں میں بند تھے۔ اس طرح نئے افراد آتے چلے گئے۔ جلد ہی ان کی تعداد ایک سو تک پہنچ گئی تب طالبان کی قیادت نے سڑکوں پر لوٹ مار اور رہزنی کے مستقل سدباب کے لیے دیگر اہم چاروں پر قبضہ کرنے اور وہاں سے زنجیریں کاٹنے کا فیصلہ کیا۔

ان دنوں پاکستانی سرحد کے قریب واقع بستی ”اپہین بولدک“ پر حزب اسلامی کے اختر جان نامی کمانڈر کا قبضہ تھا۔ طالبان نے پہلے اسے زنی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ سڑک سے زنجیریں ہٹا دے اور قیام امن میں ان کا دست و بازو بن جائے مگر متواتر 24 دن پند و نصیحت کے باوجود وہ نہ مانا۔ یوں تصادم ناگزیر ہو گیا اور طالبان اپہین بولدک کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی تعداد 100 تھی اور وہ ایک ٹرک پر سوار تھے۔ اس ٹرک کے پیچھے جیسے کوتر پال سے ڈھانپ دیا گیا۔ 100 کے قریب مسلح طلبہ اس ترپال کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ انہیں خاموش رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ راستے میں جب بھی کوئی چیک پوسٹ آتی تو ڈرائیور بتاتا کہ وہ چمن بارڈر پر فروخت کے لیے بھیڑ بکریاں لے جا رہا ہے۔ چونکہ اس طرح کے ٹرک عام طور پر گزرتے رہتے تھے اس لیے کسی جگہ کمانڈروں کو ٹرک کی تلاشی کا خیال نہ آیا۔ ڈرائیور کو اس مہم کے لیے خاصی رقم دے دی گئی تھی لہذا وہ ہر چیک پوسٹ پر کمانڈروں کو منہ مانگی رقم دیتا رہا اور ہر کمانڈر نے اسے بخوشی گزر رہے دیا۔ جب یہ ٹرک اپہین بولدک کے ضلعی دفتر کے پاس پہنچا تو شاہراہ پر آگے بڑھنے کی بجائے ذیلی سڑک پر مرکز دفتر کی مرکزی عمارت کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس پاس تعینات اہلکار سنبھل پاتے، سو کے مسلح طلبہ ٹرک سے کود کر ہر طرف پھیل گئے۔

اسپین بولڈک کا کمانڈر اختر جان اپنے کئی محافظوں سمیت فرار ہو گیا۔ طالبان نے باقی مسلح افراد کو آٹاٹاٹا نہتا کر دیا۔ طالبان کو اس چیک پوسٹ سے پچاس کلاشن کوفیس، دوسرا اسلحہ اور گولہ و بارود مال غنیمت میں ملا۔ یہ تاریخی واقعہ 12 اکتوبر 1994ء کا ہے۔

اسپین بولڈک پاکستان اور افغانستان کے درمیان ایک اہم سرحدی مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ جگہ قندھار شہر سے 100 کلومیٹر دور اور پاکستان کے سرحدی شہر چمن سے بہت نزدیک ہے۔ افغانستان اور پاکستان کے درمیان چلنے والے تجارتی قافلے یہاں رکتے اور ڈیزل بھرتے ہیں۔ افغان ٹرک یہاں ان پاکستانی ٹرکوں سے سامان اٹھاتے ہیں جنہیں سرحد عبور کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ ان وجوہ سے یہ جگہ نہایت اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس پر قابض ہو کر طالبان قندھار کے گرد و نواح میں ایک نمایاں قوت کی حیثیت اختیار کر گئے جس سے قندھار کے کمانڈروں کو غیر معمولی تشویش لاحق ہو گئی اور وہ طالبان کو پاکستانی ایجنسی ”آئی ایس آئی“ کے گماشتے قرار دے کر عوام کو ان سے متفرق کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ حالانکہ طالبان اور حکومت پاکستان میں اس وقت تک کوئی شناسائی نہیں تھی۔

پاکستان کا تجارتی قافلہ: طالبان کا حکومت پاکستان کے نمائندوں سے پہلا رابطہ اسپین بولڈک پر قبضے کے کچھ دنوں بعد ہوا۔ ہوا یہ تھا کہ طالبان کے ابھرنے سے پہلے ہی حکومت پاکستان وسط ایشیا سے تجارتی تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو اس میں خاصی دلچسپی لے رہی تھیں۔ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر اس سلسلے میں ان کے دست راست تھے۔ نصیر اللہ بابر نے کچھ دنوں قبل افغانستان کا دورہ کیا تھا اور وسط ایشیا کو جانے والے راستے پر قابض کمانڈروں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ پاکستان کے تجارتی قافلوں کو تحفظ فراہم کریں گے۔ قندھار کے ایک بڑے کمانڈر گل آغا نے بھی جسے ”گورز“ کی حیثیت حاصل تھی، حکومت پاکستان سے تجارتی قافلوں کو تحفظ دینے کا معاہدہ کر لیا تھا مگر بعض مقامی کمانڈر اس معاہدے کے خلاف تھے۔ خود گل آغا کے قول و قرار کا بھی کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ ایک دھوکے باز اور لالچی شخص تھا۔ اس معاہدے کے کچھ دنوں بعد اسپین بولڈک پر طالبان کا قبضہ ہو گیا۔ اصر 28 اکتوبر 1994ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے ہرات کے حاکم اسماعیل خان تور دون اور شمالی افغانستان کے حکمران رشید دوستم کو بھی تجارتی راستے کھولنے میں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ مثبت رد عمل ملنے پر اگلے ہی دن (29 اکتوبر) 30 ٹرکوں کا ایک بڑا قافلہ کویٹہ سے ترکمانستان کے دارالحکومت اشک آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔ نصیر اللہ بابر خود اس قافلے کی کمان کر رہے تھے۔ اسے قندھار اور ہرات سے گزر کر ترکمانستان میں داخل ہونا تھا، اگرچہ گل آغا کی بدطبعی کے پیش نظر اس قافلے کا افغانستان جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

گل آغا کی چال: جب یہ قافلہ چمن کی سرحد عبور کر کے اسپین بولدک پہنچا تو وہاں منتظر بالکل بدلا ہوا تھا۔ سابق کمانڈر کی جگہ اب یہاں طالبان کا قبضہ تھا جن کا پاکستان سے کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ طالبان نے قافلے کو روک لیا اور مطالبہ کیا کہ پہلے کراچی کی بندرگاہ پر افغان تاجروں کا سالہا سال سے رکا ہوا مال و اسباب و اگزار کیا جائے، تب وہ قافلے کو آگے جانے دیں گے۔ نصیر اللہ بابر طالبان کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس دوران ملا محمد عمر کو گل آغا کا پُر فریب پیغام موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ہمارا جنرل نصیر اللہ بابر سے معاہدہ ہو چکا ہے۔ عہد شکنی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ قافلے کو نہ روکا جائے۔ دراصل گل آغا خود اس قافلے کو لوٹا چاہتا تھا مگر طالبان اس کی نیت سے لاعلم تھے۔ انہوں نے گل آغا کی بظاہر مقبول بات پر مثبت رد عمل ظاہر کرتے ہوئے قافلے کا راستہ چھوڑ دیا۔

اب قافلہ اطمینان کے ساتھ قندھار کو روانہ ہوا جہاں گل آغا اور اس کے ہمنوا کمانڈر اسے لوٹنے کے لیے تیار تھے۔ یہ سب لٹیرے اور مفاد پرست کمانڈر تھے۔ انہی کی غنڈہ گردی کے باعث قندھار میں حالات نہایت خراب تھے، اگرچہ گل آغا گورنر تھا مگر وہ خود لوٹ مار میں شریک تھا۔ ان کمانڈروں نے عملاً شہر کو کئی حصوں میں بانٹ رکھا تھا اور عوام کو یہ غمال بنایا ہوا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ قندھاری کمانڈروں کی بے شری کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے ایک کیونسٹ کمانڈر منصور نے ایک شریف دین دار گھرانے کے خوبصورت لڑکے کو اغوا کر کے اس کے ساتھ زبردستی شادی رچائی تھی۔ اس دوران ایک دوسرے کمانڈر نے بھی اس لڑکے کے حسن کی تعریف سن کر اسے اغوا کرنا چاہا۔ اس بات پر دونوں کمانڈروں میں ٹھن گئی۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں اور بہت سے لوگ مارے گئے۔

منصور کا اعلان تھا کہ ہمارے علاقے میں لڑکوں سے شادی جائز ہے۔ اس نے چند نام نہاد دانشوروں کو مفتی کا لقب دے کر ان سے یہ ”فتویٰ“ بھی لے لیا تھا کہ 16 برس سے کم عمر لڑکے سے شادی کی جاسکتی ہے۔ یہ حالات ملا محمد عمر کے علم میں بھی تھے جس کے باعث وہ قندھاری کمانڈروں سے سخت متنفر تھے۔ ادھر قندھاری کمانڈر طالبان کا صفایا کرنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اسپین بولدک کا مفروضہ کمانڈر اختر جان، بدنام زمانہ کیونسٹ منصور اچکزئی اور گورنر قندھار گل آغا یہ طے کر چکے تھے کہ وہ مل کر طالبان کے خلاف بھرپور کارروائی کریں گے اور دوبارہ مرکزوں پر زنجیریں لگا کر ٹیکس وصول کریں گے۔

پاکستانی قافلہ نرنغے میں: اس منصوبہ بندی کے ساتھ یہ لوگ اسپین بولدک پر چڑھائی کے لیے روانہ ہوئے۔ اس گروہ میں منصور اچکزئی، گل آغا اور اختر جان کے علاوہ استاذِ حلیم، امیر لالانی اور سرکاتب بھی شامل تھے۔ ابھی یہ لوگ قندھار سے نکلے ہی تھے کہ انہیں پاکستان کے تجارتی قافلے کی آمد کی خبر ملی جو

اب امین بولدک سے قندھار کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ کمانڈروں نے سوچا کہ کیوں نہ طالبان پر حملے سے پہلے اس قافلے پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ چنانچہ وہ تختہ پلے کے مقام پر کھات لگا کر بیٹھ گئے۔ یہ مقام قندھار ایئر پورٹ کے قریب اور شہر سے تقریباً 12 میل کے فاصلے پر ہے۔ کمانڈروں کو توقع تھی کہ اس قافلے میں دیگر ساز و سامان کے علاوہ اسلحہ بھی آ رہا ہے۔ جون ہی قافلہ تختہ پلے پہنچا، اسے گھیرے میں لے لیا گیا۔ جب یہ اطلاع پاکستان پہنچی تو وہاں کھلی گنج مٹی۔ اسلام آباد میں ایک اعلیٰ سطحی اجلاس بلا کر قافلے کو رہائی دلانے کے لیے مختلف تجاویز پر غور ہونے لگا مگر کوئی قابل عمل صورت سمجھ نہ آ سکی۔ آخر کار جنوبی افغانستان کی نئی طاقت ”طالبان“ سے مدد لینے کا فیصلہ کیا گیا۔

طالبان کی لٹیروں کے خلاف کارروائی: طالبان اس سے پہلے ہی قندھار کے سرکش کمانڈروں کے عزائم سے مطلع ہو چکے تھے۔ اب انہیں پاکستان کے تجارتی قافلے کے گھیرے میں لیے جانے سے سخت تشویش ہوئی۔ ملت پاکستان نے افغان جہاد کے دوران افغانوں کا جس طرح ساتھ دیا تھا اس کے بدلے میں افغان کمانڈروں کا یہ سلوک شرمناک تھا۔ کوئی بھی شریف انسان اسے پسند نہیں کر سکتا تھا۔ طالبان پاکستان کو اپنا محسن تصور کرتے تھے کیونکہ اس سرزمین میں ان کے اکثر خاندانوں کو پناہ میسر آئی تھی۔ ان میں سے بہت سے پاکستان کے دینی مدارس میں تعلیم حاصل کر چکے تھے اور اس ملک کو اپنی مادر علمی سمجھتے تھے۔ ان وجوہ سے انہوں نے فوری طور پر ایک وفد بھیج کر لٹیروں کو کہا کہ وہ قافلے کو جانے دیں مگر کمانڈر اپنی ضد پر اڑے رہے اور مقابلے پر اتر آئے۔ ادھر پاکستانی انجینیئروں نے بھی طالبان سے رابطہ کر کے اس قبضے کے حل کی درخواست کی اور بدلے میں حکومت پاکستان کی جانب سے برادرانہ تعلقات کا یقین دلایا۔

تب 3 نومبر 1994ء کو طالبان نے قندھار کی کمانڈروں کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا۔ ایک زوردار جھڑپ کے بعد کمانڈر منصور چکزئی، گل آغا اور ان کے حامی بھاگ نکلے۔ طالبان بیابانوں میں دور تک منصور کا تعاقب کرتے رہے حتیٰ کہ قندھار ایئر پورٹ تک پہنچ گئے اور اسے دس محاذوں سمیت گرفتار کر لیا۔ چونکہ کمانڈر منصور لوٹ مار، ظلم و ستم اور بے حیائی میں مشہور تھا اس لیے اسے کسی رعایت کا مستحق سمجھے بغیر قندھار ایئر پورٹ پر پھانسی دے دی گئی اور لاش عبرت کے لیے سرعام لٹکادی گئی۔ اسی پیش قدمی کے دوران طالبان نے قندھار ایئر پورٹ کو کسی مزاحمتی قوت سے خالی پا کر 4 نومبر کو صبح 4 بجے اسے بھی قبضے میں لے لیا۔

قندھار: تختہ پلے کے معرکے میں گل آغا اور منصور کے گردہ کو کچلنے اور ایئر پورٹ پر قبضے کے فوراً بعد طالبان نے قندھار شہر کا رخ کر لیا۔ اس دوران جنوبی افغانستان اور پاکستان کے سرحدی شہروں میں زبرد

تیسواں باب

تعلیم پسندوں نے طلبہ ان سے آملے تھے۔ صبح سویرے طالبان جنوب سے یلغار کرتے ہوئے قندھار کے گورنر ہاؤس تک پہنچ گئے۔ دن چڑھے تک پورا شہر ان کے قدموں میں تھا۔ شہر کے ایک بڑے کمانڈر مانتیب نے بھی طالبان کی آمد کا سنتے ہی ان کی حمایت کا اعلان کر دیا اور اس کے جنگجو طالبان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ قندھار کا گورنر گل آغا اور دوسرے سرکش کمانڈر فرار ہو گئے تھے۔ 24 گھنٹے کے اندر اندر طالبان کسی قابل ذکر کشت و خون کے بغیر افغانستان کے اس دوسرے بڑے شہر پر قابض ہو گئے۔ صرف مغرب میں ”باغ پل“ کا علاقہ رہ گیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں تختہ پل سے فرار ہونے والا کمانڈر سرکاتب مورچہ زن تھا۔ طالبان نے اسے تنبیہ کرنے کے بعد تیسری رات کو کارروائی کی شروع کی۔ چوڑے حملہ ہوا اور دو گھنٹے میں باغ پل بھی فتح ہو گیا۔ اب قندھار سے لے کر اسپین بولدک تک ایک وسیع علاقہ ان کے ماتھے آ گیا جس کے بعد طالبان نے اپنی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا۔

قندھار پر قبضہ کرنے اور ظالم کمانڈروں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد جہاں دیگر درجنوں مظلوموں کو انصاف ملا وہاں اس انخواسدہ بچے کو بھی آزاد کرالیا گیا جس پر دو کمانڈروں کی جنگ ہوئی تھی۔

طالبان کا سب سے بڑا ہدف شریعت کا نفاذ اور قیام امن تھا اس لیے عوام نے ان کا خیر مقدم کیا۔ شریعت کے نفاذ کے لیے طالبان نے شرعی عدالتیں قائم کیں اور تمام معاملات قرآن و سنت کے ماتحت چلانے کا اعلان کیا۔ قیام امن کے لیے، انہوں نے سڑکوں سے زنجیریں کاٹ ڈالیں۔ تمام نکاوٹیں ہٹا دیں۔ صرف اسپین بولدک پر ایک جنگی خانہ قائم کیا اور حکومت پاکستان سے کہا کہ آئندہ پاکستان سے آنے والے ہر قافلے کو رخصت و عبور کرنے کے لیے طالبان سے اجازت لینا ہوگی۔ طالبان کے ترجمان ملا محمد غوث نے 16 نومبر 1994ء کو ایک بیان میں کہا کہ پاکستان طالبان کو نظر انداز کر کے کسی بھی قبائلی سردار سے معاہدہ نہ کرے۔ اسن دامان کا قیام: طالبان نے سڑکوں کی حفاظت کے لیے گشتی دستے مقرر کیے جس سے لوٹ مار کا خاتمہ ہو گیا۔ آبادی کو مکمل طور پر غیر مسلح کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ لوگوں نے قیام امن کو یقینی بنانے کے لیے رضا کارانہ طور پر اسلحہ جمع کرایا۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو مقامی کمانڈروں اور ان کے ماتحت لوگوں کو بڑے کمانڈروں کی جانب سے جہاد کے لیے امانت کے طور پر ملا تھا مگر اب لوگ اس کے مالک بن کر اسے بلائی کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ایسا تمام اسلحہ واپس لینا ضروری تھا۔

فتوحات کا سیلاب: تین ماہ کے اندر اندر طالبان کا سبیل رواں افغانستان کے 31 صوبوں میں سے 12 پر چھا چکا تھا۔ جنوبی اور مشرقی افغانستان کے تمام اضلاع اب مکمل طور پر ان کے قبضے میں تھے۔ ان تمام علاقوں میں طالبان کے سفید پرچم لہرا رہے تھے جن پر کلہ طیبہ جگمگا رہا تھا۔ طالبان نے اس وسیع

دریغ رہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح اعلیٰ اخلاق، ہمدردی و رواداری، نیک شہرت اور شہرپسندوں کے دلوں میں بیٹھتی چلی جانے والی خداداد ہیبت کے ذریعے فتح کیا تھا۔ اکثر علاقوں میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ طالبان کے قافلے سفید پرچم لیے قرآن و سنت کا نظام نافذ کرنے کا اعلان کرتے ہوئے جہاں بھی پہنچے لوگ جوق در جوق ان کا استقبال کرتے، جبکہ عالم کمانڈر فرار ہو جاتے۔ ارزگان، نیمروز، زابل، پکتیکا، لوگر، پکتیا اور غور جیسے بڑے بڑے صوبے آنا فوج ہو گئے۔ خواست کے حاکم مولانا جلال الدین حقانی نے اپنا علاقہ اور اسلحہ طالبان کی نذر کر دیا اور اپنے مجاہدین سمیت طالبان میں شمولیت اختیار کر کے اس تحریک کے سرپرست بن گئے۔

بلند میں عبدالغفار اخوندزادہ کی حکومت تھی۔ ایک وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے منشیات کے کھیت 16 برس سے اس کے قبضے میں تھے۔ طالبان نے حسب روایت یہاں بھی ابتدائی ایک وفد بھیج کر اخوندزادہ سے اسلحہ جمع کرانے، شریعت نافذ کرنے اور قیام امن میں مدد دینے کا مطالبہ کیا۔ عبدالغفار اخوندزادہ نے بظاہر تسلیم کر دیا مگر وہ اسلحہ جمع کرانے میں ٹال مٹول کرتا رہا۔ جلد ہی اس کی بدنیتی ظاہر ہو گئی۔ اس کے سپاہیوں نے طالبان پر بے خبری میں حملہ کر دیا۔ طالبان بھی جنگ پر مجبور ہو گئے۔ اخوندزادہ کے کئی کمانڈروں نے طالبان کا ساتھ دیا۔ اس طرح دسمبر 1994ء میں منشیات کی پیداوار کا یہ عالمی مرکز بھی طالبان کے قبضے میں آ گیا۔

برہان الدین ربانی کی طرف سے طالبان کی حمایت: کاہل حکومت نے بھی قیام امن کے لیے طالبان کی کوششوں اور فتوحات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ 1994ء کے آخری ایام میں تھے، طالبان قندھار پر قبضے کے بعد گرد و نواح کی فتوحات میں مصروف تھے کہ اس دوران صدر برہان الدین ربانی کی جانب سے ایک وفد نے قندھار آکر ملا محمد عمر سے ملاقات کی تھی اور صدر ربانی کا یہ پیغام پیش کیا تھا کہ ہم بھی ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور طالبان تحریک کے ہمنوا ہیں۔ طالبان قیادت کو کاہل حکومت کی حمایت سے غیر معمولی اطمینان ہوا اور ان کے کارکنوں کے حوصلے مزید بڑھ گئے۔

غزنی کے دروازے پر: ماہ رمضان (1415ھ) کی عبادت گزاری کے دوران بھی طالبان کی پیش قدمی ایک سیلابی دھارے کی طرح جاری رہی۔ نیا شمس سال شروع ہو گیا۔ جنوری 1995ء کی سرد ترین راتوں میں وہ غزنی کے دروازے پر تھے۔ یہاں کا گورنر قاری بابا طالبان سے جنگ پر تیار ہوا تھا کیونکہ مخالفین نے طالبان کو امر کی اور آئی آئی کے ایجنٹ مشہور کر دیا تھا، مگر غزنی کے نائب گورنر حاجی خیال محمد نے غصہ ظہر۔ طالبان کو خوش آمدید کہا۔ طالبان کے نمائندے اس سے گفت و شنید کر رہے

تھے کہ اس دوران حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار نے جو دیگر کئی کمانڈروں کی طرح طالبان کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، یہ الزام تراشی شروع کر دی کہ طالبان بیرونی طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ حکمت یار نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ ان کے پاس ایسے ثبوت موجود ہیں جن کے مطابق طالبان تحریک اسلام آباد میں مقیم برطانوی سفیر کے اشارے پر وجود میں آئی ہے۔

غزنی۔ طالبان اور حزب اسلامی آمنے سامنے: اختلافات کے باوجود طالبان کے دلوں میں حکمت یار کے لیے احترام پایا جاتا تھا اس لیے کہ وہ روس کے خلاف جہاد افغانستان کے سب سے نامور اور بڑے قائد تھے مگر اس بیان بازی سے طالبان اور حزب اسلامی کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مزید تاؤ اس وقت پیدا ہوا جب حزب اسلامی کے دستے غزنی کی سرحدی پہاڑیوں پر نمودار ہوئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ طالبان سے پہلے وہ غزنی پر تسلط حاصل کر لیں مگر غزنی کے عوام طالبان کی طرف مائل تھے۔ کئی مقامی کمانڈر بھی حزب اسلامی کا تسلط پسند نہیں کرتے تھے۔ جب حزب اسلامی کے دستوں نے غزنی پر قبضے کی کوشش کی تو طالبان اپنے ہم خیال مقامی کمانڈروں کے تعاون سے شہر میں داخل ہو گئے۔ شہر کا کنٹرول سنبھالنے ہوئے انہوں نے حزب اسلامی کا بھرپور مقابلہ کیا۔ اس دوران پکتیکا سے عظیم کمانڈر نصر اللہ منصور (جو کچھ مدت پہلے شہید ہو گئے تھے) کے مجاہدین بھی طالبان کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ اس جھڑپ کے نتیجے میں حزب اسلامی کے دستے پسپا ہو کر چار آسیاب کی طرف سمٹ گئے اور تقریباً پورا مشرقی افغانستان طالبان کے قبضے میں آ گیا۔ غزنی پر طالبان کے قبضے کے فوراً بعد کابل حکومت نے ایک اہم وفد طالبان کے پاس بھیجا جس میں وزیر مملکت فائر صدیق چکسری، راحت اللہ واحد یار اور مولوی طویل اللہ شامل تھے۔ انہوں نے پیغام دیا کہ ہم کابل حکومت کی جانب سے ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔

کیا طالبان کسی کے آلہ کار تھے؟ ان دنوں طالبان کے بارے میں امریکی اور پاکستانی ایجنٹ ہونے کی افواہیں متواتر پھیلانی جا رہی تھیں۔ اس کی ایک دلیل یہ پیش کی جا رہی تھی کہ امریکا نے اب تک طالبان کی فتوحات پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس نئی طاقت کا پشت بنانا ہے۔ حالانکہ امریکا کی خاموشی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ طالبان کی ”بنیاد پرستی“ سے آگاہ ہونے کے باوجود ان کو دوسری بنیاد پرست جماعت ”حزب اسلامی“ سے کمر اتار دیکھ کر سرور اور مطمئن تھا اور اسے تین تین تھا کہ افغانستان میں اب جلد خانہ جنگی کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ پھر امریکا کی یہ خاموشی خود طالبان کے خلاف پروپیگنڈے کو تقویت دے رہی تھی اور امریکا اس ماحول کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، اسے واقعی افغانستان میں ایک پاکستان دوست حکومت کی ضرورت

تھی۔ افغان جہاد میں 14 برس کی پرمشقت اور گراں قیمت حمایت کے بدلے پاکستان کی یہ خواہش برآئیل تھی۔ حکومت پاکستان اب مسودہ دور ربانی سے مکمل طور پر بائوس تھی کیونکہ مسعود کی جانب سے پاکستان کو افغانستان میں مداخلت پر سنگین نتائج کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ حکومت پاکستان نے تبادلہ افغان حکومت بنانے کے لیے ہی حزب اسلامی اور دوستم ملیشیا کے اتحاد ”رابطہ کونسل“ کی درپردہ حمایت شروع کر رکھی تھی۔ طالبان کے ظہور کے وقت پاکستان کی رابطہ کونسل سے دوستی برقرار تھی۔ تاہم پاکستان نے اپنے تجارتی تافلے کی آزادی میں طالبان کی بہترین کارکردگی دیکھنے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ وقت آنے پر طالبان بھی اس کے اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس وقت حکومت پاکستان کو قطعاً توقع نہ تھی کہ طالبان اتنی جلد آدھے ملک پر قابض ہو جائیں گے مگر جب طالبان نے آنا فانا مشرقی صوبوں کو فتح کر لیا تو حکومت پاکستان انہیں ”رابطہ کونسل“ کے متبادل درجہ دینے پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے لگی۔ حکومت پاکستان کو طالبان کے نظریات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے تو بہر حال ایک پراسن اور دوست افغانستان چاہیے تھا جو اس کے لیے وسط ایشیائی ریاستوں سے مواصلات کا دروازہ بن سکے۔ طالبان نے دکھا دیا تھا کہ وہ کسی بھی گردہ کی بہ نسبت افغانستان کو بہتر اور یقینی امن کی ضمانت دے سکتے ہیں۔ اس پس منظر میں طالبان کے ساتھ پاکستان کے مثبت رویے کو سرپرستی کا نام دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ بعد میں پاکستان اور طالبان حکومت کے درمیان بہترین مراسم ضرور پیدا ہوئے مگر ایسا موقع کبھی نہیں آیا کہ طالبان نے پاکستانی ایجنٹوں کے طور پر کام کیا ہو۔ وہ اپنے فیصلوں میں آزاد تھے۔ اپنی پالیسیوں میں وہ اولاً پاکستان سمیت کسی مسلم یا غیر مسلم طاقت کی خوشنودی ملحوظ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے نزدیک آئین سازی و دستور سازی سے لے کر پالیسیوں اور فیصلوں تک ہر معاملے میں شریعت ہی حرف اول و آخر تھی۔

اگر طالبان کسی بیرونی حکومت کے ایجنٹ ہوتے تو ان کے ہاں دولت کی ریل چل ہوتی۔ ان کے حکام اور افسران کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھنے کے قابل ہوتے۔ کیونکہ کوئی کسی بیرونی طاقت کا آلہ کار بننا ہے تو اس کی بھاری قیمت ضرور وصول کرتا ہے۔ مگر طالبان کے ہاں سادگی اور غربت کا یہ عالم تھا کہ عام طور پر ان کے سپاہیوں کو دوران جنگ پیٹ بھر کر کھانا بھی بمشکل نصیب ہوتا تھا۔ طالبان کے امیر ماحمد عمر سمیت تمام وزرا اور گورنر عام لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ وہ روکھی سوکھی کھاتے، بوسیدہ لباس پہنتے اور نہایت درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ مجمع میں یہ پہچان مشکل ہو جاتی تھی کہ ان میں امیر اور حاکم کون ہے اور ماتحت کون؟ ان کے گورنر مہمانوں کے لیے اپنی گاڑی چھوڑ کر خود پیدل چل پڑتے۔

میڈیا سے دوری: طالبان کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان درویشوں کی میڈیا تک کوئی رسائی نہیں تھی بلکہ ان کے اکثر عہدیدار میڈیا سمیت شہرت اور خود نمائی کے تمام ذرائع سے دور بھاگتے تھے۔ میڈیا سے ان کے فاصلوں کے باعث شروع ہی سے ان کے مخالفین کو ان کے خلاف ہر قسم کی باتیں پھیلانے کا کھلا موقع میسر رہا۔ تحریک کے ابتدائی دوسالوں میں میڈیا سے طالبان کے گریز کا یہ عالم تھا کہ وہ اخبارات کو اپنی فتوحات اور اہم بیانات کی خبریں تک نہیں دیتے تھے۔ معروف اسکالر مولانا زاہد الراشدی اس کی ایک مثال دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ 8 جون 1996ء کو کوئٹہ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ قندھار میں طالبان قیادت کے ساتھ سرکردہ جہادی رہنماؤں کی ایک اہم ملاقات ہوئی ہے۔ چونکہ یہ خبر اخبارات میں نہیں چھپی تھی اس لیے مولانا نے خبر تحریر کر کے کوئٹہ میں تعینات طالبان کے ترجمان مولوی معصوم افغانی کے حوالے کی کہ وہ اسے اخبارات کو فیکس کر دیں، مگر اس کے باوجود خبر فیکس نہ ہو سکی کیونکہ طالبان کے دفتر کے جس کمرے میں فیکس مشین تھی اس کی چابی گم ہوئی تھی۔ مولانا زاہد الراشدی تحریر کرتے ہیں:

”اس سے نہ صرف مجھے طالبان کی اصل کمزوری کا اندازہ ہو گیا بلکہ ان کے خلاف امریکا اور پاکستان کی پشت پناہی کے الزام کی حقیقت بھی سامنے آگئی کیوں کہ اگر انہیں امریکا یا پاکستان کی پشت پناہی حاصل ہوتی تو اتنی اہم خبر کے حصول کے لیے درجنوں بیرونی صحافی سرگرم عمل ہوتے یا کم از کم کوئٹہ میں سرکاری محکمہ اطلاعات کا کوئی کارندہ اس خبر کی اشاعت کے لیے تنگ و دوکر رہا ہوتا۔“

حکمت یار اور احمد شاہ کی ضد: 1995ء کے آغاز میں صورت حال یہ تھی کہ مشرقی افغانستان میں طالبان نے اپنے زیر قبضہ صوبوں کو اسلحے سے پاک کر کے وہاں مکمل امن و امان قائم کر دیا تھا۔ شرعی سزاؤں کے اجراء سے جرائم کا خاتمہ ہو گیا تھا اور لوگ برسوں بعد سکھ کا سانس لے کر معمول کی زندگی گزارنے لگے تھے۔ اس کے برعکس کابل اور اس کے گرد و نواح میں صدر ربانی اور وزیراعظم حکمت یار کے مابین کشمکش بدستور جاری تھی اور وہاں امن و امان کا دور دورہ نہ تھا۔ اقوام متحدہ کا نمائندہ محمود متری ایک سال سے وہاں قیام امن کی نمائش کو مشغول تھا۔ منسروف تنہا اب اس کے پاس کوئی نیا ”امن فارمولا“ باقی نہیں بچا تھا۔ جنوری 1995ء میں اس نے جلال آباد میں حکمت یار سے ملاقات کر کے تحارب رہنماؤں کو کسی نئے حل پر متفق کرنے کی ایک اور کوشش شروع کی۔

حکمت یار نے تجویز پیش کی کہ تمام تحارب دھڑے کابل شہر سے پارنچ کو میٹر پیچھے ہٹ جائیں، صدر ربانی مستغنی ہو جائیں، غیر جانبدار افراد کی عارضی حکومت معائنہ رست سنبالے اور چھ ماہ میں انتخابات

کرا کے اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کر دے۔ تمام دھڑے بھاری اسلحہ اس نئی حکومت کے پاس جمع کرادیں۔ مگر اس فارمولے پر بھی حسب سابق اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ خصوصاً اسلحہ جمع کرانے کی شق کو احمد شاہ مسعود نے سختی سے مسترد کر دیا۔

حزب اسلامی نے کابل کا محاصرہ کر لیا: احمد شاہ مسعود سے مکمل طور پر مایوس ہو جانے اور طالبان کو روز بروز پیش قدمی کرتا دیکھنے کے بعد گلبدین حکمت یار کو محسوس ہوا کہ اگر طالبان مزید آگے بڑھے تو حزب اسلامی کو کابل سے توجہ ہٹا کر پوری طرح طالبان کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اور اس طرح کابل پر قبضے کی ان کی کئی سالہ مہم جوئی ناکامی سے دوچار ہو سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے جلد از جلد کابل پر قبضے کی کوشش شروع کر دی۔

ان دنوں صورت حال یہ تھی کہ ربانی اور احمد شاہ مسعود نے مطلق العنان بننے کی کوششوں کے باعث اپنے تمام اتحادیوں سے تعلقات بگاڑ لیے تھے۔ اب ہزارہ جات اور دو ستم ملیشیا حزب اسلامی کے اتحادی تھے۔ پاکستان بھی ربانی حکومت سے مایوس ہو کر ایک بار پھر حکمت یار کو آڑ مانا چاہ رہا تھا۔ ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حزب اسلامی نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ ایک بار پھر کابل پر قبضے کے لیے ایک بڑی کارروائی کا آغاز کر دیا جس میں ان گنت راکٹ دانے گئے، سینکڑوں شہری لقمہ اجل بنے اور شہر کی درجنوں عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ کابل کی گلیوں میں ایک بار پھر خون بہنے لگا۔ اتحادیوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شہر کی سخت ترین ناکہ بندی کر کے خوراک و رسد کے راستے مسدود کر دیے جس کے باعث کابل میں قحط جیسی صورت حال پیدا ہونے لگی۔ کابل کے شہری اب دارالحکومت کی بجائے ان پسماندہ شہروں اور دیہاتوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے جہاں طالبان نے مکمل امن و امان بحال کر دیا تھا۔

طالبان کا وردک پر قبضہ: طالبان کی قیادت بھی اس صورت حال کا بخور جائزہ لے رہی تھی۔ جلد ہی انہوں نے یلغار کی اور برف باری کے موسم میں 2 فروری 1995ء کو صوبہ وردک پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ کابل سے صرف 35 میل دور رہ گئے۔ اس صورت حال نے حزب اسلامی کے کمانڈروں کو ششدر کر دیا جو کہ کابل پر قبضے کی تنگ و دو میں مصروف تھے۔ طالبان کو وردک پر قابض ہوتے دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ اب وہ ایک طرف سے احمد شاہ مسعود اور دوسری طرف سے طالبان کے حملوں کی زد میں آ کر پس جا رہے تھے۔ چنانچہ وہ نفسیاتی طور پر پہلے ہی مرعوب ہو گئے۔

میدان شہر کی فتح: طالبان نے حزب اسلامی کے خلاف مہم جوئی جاری رکھی۔ اس سے قبل وہ کئی بار نوذیبج کر صدر برہان الدین ربانی اور وزیراعظم حکمت یار سے نفاذ شریعت اور قیام امن کے مطالبات کر چکے

تھے۔ ان میں کئی بار مذاکرات اور بعض معاہدے بھی ہوتے تھے مگر مذاکرات کا کوئی ثمر برآمد ہوا نہ معاہدوں پر عمل، بلکہ کامل اور گرد و نواح میں بدمعاشی اور لاقانونیت اسی طرح برقرار تھی۔ صدر اور وزیراعظم کے معرکے حسب سابق جاری تھے۔ یہ دیکھ کر طالبان کو یقین ہو گیا کہ مزید مذاکرات کرنا خلق خدا کا ناقص خون بہانے والوں کو ڈھیل دینے کے مترادف ہوگا چنانچہ درودک کے فوراً بعد انہوں نے حزب اسلامی کے مضبوط گڑھ میدان شہر پر حملہ کر دیا جسے کامل کا دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک خونریز معرکے کے بعد 10 فروری 1995ء کو طالبان نے میدان شہر بھی فتح کر لیا۔ لڑائی میں دوسو افراد کام آگئے۔ اس واقعے سے دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کسی کو تو توقع نہ تھی کہ طالبان حزب اسلامی جیسی طاقت کو یوں دھچکلتے چلے جائیں گے۔

احمد شاہ مسعود سے میدان شہر میں مذاکرات: صوبہ درودک کے صدر مقام میدان شہر پر قبضے سے طالبان کو کامل کے جنوب مغرب میں ایک مستحکم عسکری پوزیشن حاصل ہو گئی تھی اور اس صورت حال سے کامل حکومت غیر معمولی خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ احمد شاہ مسعود نے اس موقع پر طالبان سے تعلقات بہتر بنانے کے لیے از خود پیش رفت کی اور اپنے نمائندوں کے ذریعے طالبان کمانڈروں نے دہلہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ اس وقت چوٹی کے طالبان افسران ملا بورجان اور ملا عبدالرزاق کے علاوہ ملا محمد عمر کے نائب ملا محمد ربانی بھی اس محاذ پر موجود تھے۔ انہوں نے احمد شاہ مسعود کی جانب سے مذاکرات کی پیشکش قبول کر لی۔ طالبان کی ان مہمات کی مرکزی کمان قندھار میں ملا عمر خود کر رہے تھے۔ طالبان کمانڈروں کا ان سے مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ وہ مرکز کو تازہ بہ تازہ صورت حال سے مطلع رکھ رہے تھے۔ احمد شاہ مسعود سے ملاقات سے قبل ملا محمد ربانی کو ملا محمد عمر کا پیغام ملا کہ احمد شاہ مسعود ایک نامور مجاہد کمانڈر ہیں، ان کی حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے، انہیں خاص امتیاز دیا جائے اور مذاکرات میں ایسا رویہ اختیار نہ کیا جائے کہ وہ ناراض ہوں۔ سب سے پہلے میرا پسٹول: آخر کار شیر پنج شیر احمد شاہ مسعود کی اپنے چند خاص رفقاء کے ساتھ میدان شہر میں آمد ہوئی۔ طالبان کے لیے یہ نہایت خوشی کا موقع تھا۔ ملا محمد ربانی اور ملا عبدالرزاق نے معزز ہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور نہایت پرسکون ماحول میں بات چیت کا آغاز ہوا۔ طالبان نے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کے قدردان ہیں، آپ پر جنگ مسلط کرنا نہیں چاہتے، بس آپ ہمارے مطالبات تسلیم کر لیں، کامل میں ان کا نام شریعت نافذ کر دیں، کیونستوں کو اہم عہدوں سے برطرف کر دیں، خواتین کو پردے کا پابند کر دیں اور مسلح گروہوں سے ہتھیار واپس لے لیں۔ احمد شاہ مسعود نے خوش گوار موڈ میں طالبان کمانڈروں کی باتیں سنیں اور جذباتی انداز میں کہا: ”طالبان تحریک میرے دل کی آواز ہے۔ لوگوں کو غیر مسلح کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ آپ اسے جمع کرنا چاہتے ہیں

ناں!..... تو یہ لیجیے..... سب سے پہلے میں اپنا ہستول آپ کے پاس جمع کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر احمد شاہ مسعود نے اپنا ہستول طالبان کمانڈروں کی طرف بڑھا دیا۔ یہ احمد شاہ مسعود اور طالبان کمانڈروں کی پہلی ملاقات تھی جس کے باعث طالبان مکمل طور پر مطمئن ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کابل کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیا۔

لوگر پر بلا مزاحمت قبضہ: ان دنوں عسکری تمبرہ نگار میدان شہر پر قابض لشکر طالبان کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ یہ تو سب جانتے تھے کہ وہ کسی بھی وقت کابل کی طرف پیش قدمی کر سکتے تھے۔ تاہم عام خیال یہ تھا کہ وہ لوگر کی طرف بڑھنے کی بجائے پغمان کے راستے کابل پر یلغار کریں گے۔ یہ راستہ مختصر بھی تھا اور اس میں مزاحمت کا خطرہ بھی کم تھا۔ مگر حیران کن طور پر طالبان کابل کی بجائے لوگر کی طرف بڑھنے لگے جو حزب اسلامی کا مضبوط مرکز تھا اور جہاں شدید مزاحمت کا خطرہ بھی تھا۔ جب طالبان "لوگر" کے قریب پہنچے تو غیر متوقع طور پر حزب اسلامی کی قیادت نے مزاحمت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی اب رائے عامہ حزب اسلامی کے خلاف ہوتی جا رہی تھی۔ لوگ یہ سوچتے پر مجبور تھے کہ جب دیگر تنظیموں کے کمانڈر طالبان سے صلح کر رہے ہیں تو اسلام کے نام پر سرگرم "حزب اسلامی" طالبان سے کیوں الجھ رہی ہے جو کہ اسن اور شریعت کا پیغام لے کر آ رہے ہیں۔ رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حزب اسلامی کے تمام کمانڈر طالبان کی آمد سے پہلے ہی اپنی تمام عسکری طاقت کے ساتھ لوگر سے نکل کر چہار آسیاب چلے گئے۔ یہ فروری 1995ء کے پہلے عشرے کا واقعہ ہے۔

حزب اسلامی اور طالبان کی کشمکش کے عوامل: حزب اسلامی اور طالبان کی کشمکش کے سلسلے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بنیادی طور پر یہ دونوں اسلام پسند طبقات تھے جو گردش حالات سے باہم مقابل آ گئے تھے۔ مشرقی افغانستان میں طالبان کے مد مقابل اور ہم پلہ واحد قوت حزب اسلامی ہی تھی۔ جب طالبان کا ظہور ہوا تب لوگر، وردک، میدان شہر، چہار آسیاب، جلال آباد اور سرحدی حزب اسلامی کے مضبوط گڑھ تھے اور یوں عملاً کابل تک پہنچنے کے تمام راستے حزب اسلامی کے پاس تھے۔ الغرض اس وقت افغانستان میں حزب اسلامی ہی طالبان کی سب سے بڑی حامی یا سب سے مضبوط حریف بن سکتی تھی۔ بد قسمتی سے حزب اسلامی نظریاتی طور پر ایک اسلامی جماعت ہونے کے باوجود طالبان کے خلاف کیے جانے والے پروپیگنڈے سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس کا حصہ بن گئی۔ اس کے عہدیدار طالبان کے خلاف بے سروپا باتیں پھیلانے میں شریک ہو گئے۔ طالبان کی مجرمانہ فتوحات کے پس پردہ کبھی امریکا کا ہاتھ بتایا جا رہا تھا، کبھی برطانیہ اور کبھی آئی ایس آئی کا۔ دراصل برسوں

سے میدان جہاد میں قیادت کرنے والے حزب اسلامی کے کمانڈروں کے لیے یہ بات قبول کر لینا بہت مشکل تھا کہ گنامو جو انوں کی ایک جماعت آگے بڑھ کر ان سے حالات کی باگ ڈور چھین لے۔

اس ذہنی غلطی میں عصری اور دینی تعلیم کی الگ الگ حلقہ بندی کا بھی خاصا دخل تھا۔ طالبان کا تعلق اس دینی طبقے سے تھا جن کی قیادت دینی مدارس کے راسخ العلماء اور مشائخ کرتے تھے۔ ان کے بہت سے نامور عہدے دار پاکستان کے دینی مدارس کی پیداوار اور علمائے دیوبند کے خاندان تھے۔ حزب اسلامی کے قائدین اور عہدے داروں میں اکثریت عصری تعلیمی اداروں کے اسلام پسند فضلاء کی تھی۔ دینی مدارس کے فضلاء اور یونیورسٹیوں کے اسلام پسندوں میں فاصلے کی یہ نفیادگیر اسلامی ممالک میں بھی ہے۔ پاکستان کی سیاست میں بھی یہ اختلاف جمیعت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کی شکل میں موجود ہے۔ یہ دونوں جماعتیں افغانستان کی اس کشاکشی میں واضح فریق کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ جمیعت علمائے اسلام اور دینی مدارس کی ہمدردیاں مکمل طور پر طالبان کے ساتھ وابستہ ہوتی جا رہی تھیں جبکہ جماعت اسلامی کا میڈیا طالبان کی مخالفت میں سرگرم تھا۔

اس صورت حال نے افغانستان میں طالبان اور حزب اسلامی کے درمیان مزید دوریاں پیدا کیں۔ یہی وجہ تھی کہ جنوبی اور مشرقی افغانستان میں وہ تمام صوبے جو علماء کے زیر قیادت تنظیموں کے پاس تھے، فوراً طالبان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے، مولانا نصر اللہ منصور شہید اور مولانا محمد نبی محمدی کے مجاہدین جوق در جوق ان کے ہمراہ ہو گئے۔ مولانا جلال الدین ہکانی اور ان کے بھائی نے خواست طالبان کے حوالے کر دیا۔ مولانا یونس خالص کے افراد بھی قدرے متذبذب کے بعد جلد ہی طالبان سے آن لے۔ پکتیا اور پکتیکا میں لوگوں نے سڑکوں پر آکر طالبان کا استقبال کیا مگر جب طالبان حزب اسلامی کے زیر قبضہ صوبوں تک پہنچے تو وہاں کی فضا اس کے خلاف تھی۔

چونکہ طالبان کے سامنے مخالفت کا پہلا پتھر حزب اسلامی کی شکل میں سامنے آیا تھا اس لیے قدرتی طور پر انہوں نے گلبدین حکمت یار کو سب سے بڑے مخالف کی حیثیت دی۔ جبکہ احمد شاہ مسعود کے بارے میں وہ دیرینک خوش فہمی میں مبتلا رہ کر اسے عظیم قائد کا درجہ دیتے رہے۔ یہی تاثر پاکستان میں طالبان کے حامیوں کا تھا کہ حزب اسلامی کی مخالفت کے ساتھ ساتھ احمد شاہ مسعود سے ان کا حسن عین بہت قوی تھا۔ مگر آئندہ حالات نے ثابت کیا کہ نہ تو حزب اسلامی طالبان کے حق میں اتنی معزز تھی نہ احمد شاہ مسعود اور بانی طالبان کے اتنے ہمدرد نکلے بلکہ معاملہ اندازے کے برعکس رہا۔

چهار آسیاب پر حملے کی تیاری: لوگر کی فتح کے فوراً بعد طالبان نے ”چهار آسیاب“ پر حملے کی تیاری

شروع کر دی۔ ”چهار آسیاب“ کا معنی ہے ”چار پن چکیاں“ یہ مقام نہ صرف حزب اسلامی کا سب سے بڑا عسکری گڑھ تھا بلکہ رابطہ کونسل میں شامل تمام جماعتوں کے لیے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ عام خیال یہ تھا کہ ”حزب اسلامی“ جو اپنی تمام قوت یہاں جمع کر چکی ہے، اب طالبان سے بھرپور کر لے گی اور خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ عسکری ماہرین کا اندازہ تھا کہ طالبان کو یہاں کئی مہینوں کی ہم جوئی کے بعد ہی کامیابی نصیب ہو سکتی ہے۔

اس دوران حزب اسلامی کے رہنما گلبدین حکمت یار حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ غزنی سے لوگر تک طالبان کی سیلابی فتوحات اور عوام کی طرف سے طالبان کو ملنے والی بھرپور پذیرائی ان سے بخفی نہ تھی۔ مذہب بھی جانتے تھے کہ افغان قوم کے دلوں میں علمائے دین کا کتنا احترام ہے، لہذا جس تحریک کو علماء کی سرپرستی حاصل ہو چکی ہو، اس کا مقابلہ عقل و دانش کے خلاف تھا۔ مگر اس کے باوجود چونکہ حکمت یار طالبان کے ”اسلامی نظام“ یا ”اسلامی نظریے“ سے ذہنی طور پر پوری طرح ہم آہنگ نہیں تھے اس لیے وہ اب بھی طالبان کی بالادستی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ حسب سابق انہیں ایک مخالف گروہ کی حیثیت دیتے تھے۔ بہر حال زمینی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے اس موقع پر انہوں نے ایک اہم فیصلہ کیا جو ان کے تدریجاً عسکری مہارت کا ثبوت تھا۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ ”چهار آسیاب“ کو خالی کر کے اپنی پوری طاقت ”سروبی“ میں جمع کر لیں اور طالبان کے لیے کامل کا جنوب مشرقی راستہ بالکل کھلا چھوڑ دیں۔ اس طرح طالبان حزب اسلامی سے ٹکرائے بغیر سیدھا کامل پر قابض احمد شاہ مسعود اور ربانی کی افواج کے مقابل آجائیں گے۔ اس کے بعد اگر طالبان احمد شاہ مسعود اور ربانی کو کامل سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو حزب اسلامی کی دلی مراد برآئے گی اور اگر احمد شاہ مسعود طالبان کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو حزب اسلامی کو طالبان کے خون میں ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

طالبان کا چہار آسیاب پر قبضہ: ان امکانات پر غور کرتے ہوئے آخر کار حزب اسلامی نے اپنی تمام عسکری طاقت، افراد، گولہ بارود، ہلکے و بھاری ہتھیار اور خوراک کے ذخائر چہار آسیاب سے سروبی منتقل کرنا شروع کر دیے۔ لوگر کی فتح کے دوسرے دن 13 فروری 1995ء کو طالبان کا لشکر سفید علم لہراتا، چہار آسیاب کے قریب پہنچا تو وہاں سے حزب اسلامی کے انخلاء کا عمل آخری مرحلے میں تھا۔ طالبان کی آمد کا غلط سن کر حزب کے کارکنان نے باقی ماندہ ساز و سامان وہیں چھوڑ دیا اور تیزی سے فرار ہو گئے۔ طالبان چہار آسیاب میں واقع گلبدین حکمت یار کے دفتر میں داخل ہوئے تو انہیں نامور جہادی رہنما کے ذاتی کپڑے اور اہم قائلین بھی ملیں۔ شاید بھولے میں یا عجلت کی وجہ سے یہ اشیاء وہیں رہ گئی تھیں۔

بہر کیف حزب اسلامی اپنے اکثر عسکری ذخائر اور اثاثے بحفاظت لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔
البتہ ہماری توہیں جنہیں پہاڑوں پر چڑھانا بے حد مشکل تھا اور کچھ ٹینک جو سفر کے قابل نہ تھے، پیچھے
چھوڑ دیے گئے تھے۔



مآخذ و مراجع

- ❦ طالبان جہاد اللہ۔ فہمی ہویدی
- ❦ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 1، 2، 3
- ❦ ہفت روزہ بحیر: جلد 1994، 1995ء
- ❦ ماہنامہ امارت اسلامی افغانستان جلد 1422ء
- ❦ قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ فائل 1994ء،
1995ء

اکیسواں باب

ملا محمد عمر، امیر المؤمنین

چہار آسیاب پر قبضے کے بعد کابل پر طالبان کی گرفت بہت مضبوط ہو گئی۔ ادھر احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی طالبان کی آمد اور حزب اسلامی کی پسپائی کو نیک ٹھگون قرار دے رہے تھے اور اپنے بیانات میں مسلسل طالبان کی تعریف کر رہے تھے جنہوں نے ان کے سب سے بڑے دشمن گلبدین حکمت یار کو آٹا نانا کنارے پر کر دیا تھا۔

طالبان نے چہار آسیاب فتح کرنے کے بعد کابل جانے والے وہ تمام راستے کھول دیے جن کی ناکر بندی کر کے حزب اسلامی نے کابل کو محاصرے میں لیا ہوا تھا۔ اس محاصرے کی وجہ سے دارالحکومت میں قحط کی سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اب جب طالبان نے شاہراہ کو عوام اور تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کے لیے کھولا تو کابل میں دوبارہ زندگی معمول پر آ گئی اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر معمولی کمی ہو گئی۔

ان اقدامات کی وجہ سے طالبان کے دقت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کابل میں ان کے بارے میں جو بے سرو پا ٹھٹھوک و شبہات گردش کر رہے تھے، وہ از خود ختم ہو گئے۔ رائے عامہ کو مد نظر رکھتے ہوئے احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی بھی طالبان کی تعریف و توصیف میں مسلسل رطب اللسان رہے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ طالبان ملائکتہ اللہ (فرشتوں کی جماعت) اور جنود اللہ (اللہ کا لشکر) ہیں۔ طالبان نے کابل پر حملہ کیوں نہ کیا؟ مبصرین کی آرا کے بالکل برعکس چہار آسیاب پر قبضے کے بعد بھی طالبان نے کابل پر حملے سے گریز کیا۔ یہ ان کی کمزوری نہیں تھی بلکہ انہیں شرعی یا اخلاقی لحاظ سے کابل پر حملے کا کوئی جواز سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ انہیں احمد شاہ مسعود اور برہان الدین ربانی سے شکایات ضرور تھیں مگر اس کے باوجود وہ ان پر اعتماد کر رہے تھے جس کی بڑی وجہ ان دونوں رہنماؤں کا طالبان سے حدود بے خوف ٹھکوار رویہ تھا جس نے طالبان کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انہوں نے قند ہار اور غزنی

کی فتح کے بعد اپنے وفود بھیج کر طالبان کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔ میدان شہر میں طالبان کے فاتحانہ داخلے کے موقع پر احمد شاہ مسعود نے خود اپنے کمانڈروں کے ساتھ وہاں آکر طالبان کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اپنا پستول طالبان کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ رویہ طالبان کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا۔

اور اب جبکہ طالبان چار آسیاب کو فتح کر کے کابل کی دہلیز پر کھڑے تھے، ریڈیو کابل سے روزانہ طالبان کی حمایت کا اعلان کیا جا رہا تھا اور ان کی تعریف و توصیف میں پروگرام پیش کیے جا رہے تھے۔ صدر ربانی نے طالبان کی حمایت پر مٹی بیانات دینے کے علاوہ طالبان کے پاس ایک وفد بھی بھیجا جس نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی اور کہا:

”اللہ کی مقدس کتاب گواہ ہے کہ ہم طالبان کے ساتھ ہیں۔“

یہ وہ برتاؤ تھا جس کی وجہ سے طالبان نے کابل حکومت کے بارے میں کسی خدشے کو دل میں جگہ نہ دی۔ انہیں یقین تھا کہ کابل حکومت اسلامی نظام کے نفاذ میں ان کا بھرپور ساتھ دے گی۔ چنانچہ طالبان نے کابل پر قبضے کا خیال دل سے نکال دیا۔ ان کے اطمینان کا یہ عالم تھا کہ کابل کے سامنے انہوں نے نہ تو باقاعدہ لشکر ترتیب دیا نہ ہی وہاں بھاری اسلحہ کی کھپ پینچائی بلکہ نگرانی کے معمولی عسکری انتظامات کو کافی سمجھا۔ ان دنوں اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے محمود مستری کی افغانستان میں قیام امن کے لیے کوششیں معنی خیز انداز میں جاری تھیں۔ طالبان نے اسے بھی قیام امن کے لیے ایک فارمولا پیش کیا تھا جس میں دو باتیں بنیادی تھیں:

- ① کابل میں طالبان پر مشتمل فوج تعینات کی جائے جو غیر جانبدار ہوگی۔
- ② کابل میں صالح مسلمانوں کی عبوری انتظامیہ قائم کی جائے جس میں ملک کے تمام صوبوں کے

نمائندے ہوں۔

مگر محمود مستری نے اس فارمولے کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور یوں بات چیت کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

طالبان کے مطالبات: ادھر احمد شاہ مسعود اور ربانی طالبان کے خلوص اور نا تجربہ کاری سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ پہلے اپنے تمام مخالفین کو ایک ایک کر کے چاروں شانے چت کریں گے اور اس کے بعد ان بھولے بھالے طالب علموں سے بھی بالآسانی منٹ لیں گے۔ انہوں نے طالبان کی حمایت اس لیے کی تھی کہ ان کی مخالف ”رابطہ کونسل“ (شورئی ہم آہنگی) کی سب سے بڑی جماعت ”حزب اسلامی“ کی قوت کو وہی پاش پاش کر سکتے تھے۔ اور واقعی طالبان کی یلغار کی وجہ سے حزب اسلامی سروبی کی طرف سینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اب مسعود اور ربانی ”رابطہ کونسل“ کی دوسری پارٹی

”حزب وحدت“ کا کام تمام کرنا چاہتے تھے جو بدستور کامل کے کنارے مقابلے پر موجود تھی۔ حزب وحدت کا قصہ نمٹانے تک طالبان کو اعتماد میں لیے رکھنا ضروری تھا۔ مسعود کو یہ بھی احساس تھا کہ اب تک ان کی حکومت نے طالبان کے مطالبات کے جواب میں عملاً کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا ہے اور یہ بات طالبان کو جو بے چینی سے کامل میں اسلامی نظام کے نفاذ کے منتظر ہیں، شک میں ڈال سکتی ہے۔

حزب وحدت پر حملہ کرنے سے قبل طالبان کی طرف سے یقینی مہلت حاصل کرنے اور انہیں پوری طرح مطمئن کرنے کے لیے احمد شاہ مسعود نے ایک بار پھر طالبان کی عسکری کمان سے چار آسباب میں ملاقات کی۔ طالبان کے مرکزی کمانڈروں ملا محمد ربانی، ملا بور جان اور ملا غوث نے احمد شاہ مسعود کا غیر مقدم کیا۔ احمد شاہ مسعود نے غیر معمولی عاجزی کا مظاہرہ کر کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی، ایک کونے میں جہاں چہل پڑے تھے، بیٹھنا چاہا اور زبان حال سے خود کو علماء و طلبہ کی خاک پا کر دریا۔ طالبان اس طرز عمل سے بڑے متاثر ہوئے۔ ملا بور جان اور ملا ربانی نے بڑی عزت و احترام سے تاجک لیڈر کو ساتھ بٹھایا اور گفت و شنید شروع ہوئی۔ طالبان احمد شاہ مسعود سے متاثر ضرور ہوئے تھے مگر ان کا اصولی موقف برقرار رہا۔ انہوں نے کسی لگی لپٹی بغیر احمد شاہ مسعود کو مشورہ دیا کہ صدر ربانی کو اپنے عہدے سے دست بردار ہو جانا چاہیے کیوں کہ حالات کے بگاڑ کو سدھارنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ طالبان نے اس گفت و شنید کے دوران کامل حکومت کو اپنا وہ فارمولا بھی پیش کیا جو اقوام متحدہ کے نمائندے محمود مستری نے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ طالبان نے مندرجہ ذیل مطالبات بھی پیش کیے:

- ① کامل میں خالص اسلامی نظام کے نفاذ کا اعلان کیا جائے۔
- ② کامل انتظامیہ، سرکاری فوج اور حساس اداروں میں کلیدی عہدوں پر فائز تمام کمیونسٹوں کو باہر نکال کر ان پر شرعی عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائے۔
- ③ کامل میں بے پردگی، بدکاری، فحاشی، رقص و موسیقی، شراب نوشی اور دیگر کھلے عام منکرات پر پابندی لگائی جائے۔
- ④ اخلاق باختہ کیونسٹ خواتین کو دفاتر سے بے دخل کیا جائے۔

احمد شاہ مسعود نے طالبان کے باقی مطالبات پر کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا مگر کامل شہر میں صرف طالبان فوج کی تعیناتی کو (جو فارمولے کا اہم حصہ تھی) بعض وجوہ سے ناقابل عمل قرار دیا۔ اس طرح کامل حکومت سے بھی بات چیت التوا میں پڑ گئی۔ درحقیقت مسعود اور ربانی طالبان کے مذکورہ مطالبات میں سے کسی ایک کے بھی حق میں نہ تھے مگر فی الحال بات چیت کو ٹالنے کے لیے ایک شق سے اختلاف کا بہانہ ہی کافی تھا۔

احمد شاہ مسعود کا حزب وحدت پر حملہ: بہر کیف اس گفتگو کی ناکامی کے بعد احمد شاہ مسعود کو یقین ہو گیا کہ طالبان کے ساتھ ڈرامہ بازی زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتی۔ بہت جلد انہیں حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا اور وہ کامل پر فیصلہ کن حملے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ چنانچہ احمد شاہ مسعود نے چند دنوں کے اندر اندر پہلے حزب وحدت اور پھر طالبان کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔

طالبان کی مغرب کی طرف پیش قدمی: طالبان مسعود کے ارادوں سے بالکل بے خبر تھے۔ کامل کے حاذ کو کسی خطرے سے خالی سمجھ کر انہوں نے مغرب کی طرف توجہ دینا زیادہ ضروری سمجھا جہاں ہرات کا حاکم اسماعیل تورون ایک نئی مخالف قوت بن کر ابھر رہا تھا۔ گزشتہ سال قندھار، زابل اور بلخ کے درجنوں کمانڈر اور ہزاروں بدقتاش جنگجو طالبان سے شکست کھانے کے بعد فرار ہو کر اسماعیل تورون سے جا ملے تھے اور وہ ان کی مشترکہ طاقت سے طالبان کے خلاف ایک بڑی جنگ کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طالبان نے چہار آسیاب پر قبضے کے بعد کامل کا رخ کرنے کی بجائے فردری 1995ء کے اواخر میں اپنی افواج کا ایک بڑا حصہ ان مغربی اضلاع کی طرف روانہ کر دیا تھا جو اسماعیل تورون کے قبضے میں تھے۔ طالبان طوفانی انداز میں مغربی صوبوں تک پہنچ گئے اور ایک خونریز جنگ کے بعد انہوں نے فراہ اور نیمروز کے صوبے اسماعیل تورون سے چھین لیے۔ ادھر احمد شاہ مسعود نے اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے یہ وقت مناسب جانا اور حزب وحدت کو کامل سے پیچھے دھکیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ 6 مارچ 1995ء کو اس کی افواج نے یکا یک شہر کے جنوب میں ”حزب وحدت“ کے ٹھکانوں پر چڑھائی کر دی۔ اس غیر متوقع حملے میں بڑی تعداد میں ٹینکوں کی مدد لی گئی۔ ”حزب وحدت“ اس لڑائی کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ ان کے سربراہ عبدالعلی مزاری سمیت بڑے بڑے لیڈر جو مورچوں میں موجود تھے انفراتری کے عالم میں پسپا ہونے لگے۔

مزاری کا طالبان سے رابطہ: شیعہ لیڈر مسعود کی بدعہد یوں سے واقف تھے اور اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے اس موقع پر عبدالعلی مزاری نے مجبور ہو کر طالبان سے رابطہ کیا اور جان کی امان کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کے لیے انہیں واسطہ بنانے کی کوشش کی، اس نے کہا:

”حکمت یار کے سروبی چلے جانے کے بعد شورئی ہم آہنگی عسکری طور پر غیر فعال ہو گئی ہے۔ اب

اس میں مسعود سے جنگ کی سکت نہیں رہی۔ لہذا طالبان درمیان میں پڑ کر ہم سے ہتھیار لے لیں

اور اس کے بدلے ہمیں جان کے تحفظ کی یقین دہانی فراہم کریں۔“

لاحمد عمر کے نائب ملا محمد ربانی نے جو طالبان کے صدر کی حیثیت رکھتے تھے، اس پیغام پر غور کیا اور

پھر احمد شاہ مسعود کو پیغام بھیجا: ”حزب وحدت اور آپ کے مابین ساہا سال سے جنگ جاری ہے۔ اس وقت وہ ہتھیار ڈالنا چاہتے ہیں مگر انہیں آپ پر وثوق نہیں۔ البتہ وہ طالبان کے پاس ہتھیار جمع کرانے کے لیے تیار ہیں۔ لہذا آپ حزب وحدت کے خلاف کارروائی روک کر طالبان کو موقع دیں کہ وہ آپ کی اور حزب وحدت کی افواج کے درمیان حائل ہو کر حزب کو غیر مسلح کر دیں۔“

احمد شاہ مسعود کی طرف سے اس پیش کش کا مثبت جواب ملنے پر ملا محمد ربانی نے اپنے دو اعلیٰ ترین افسران ملا عبدالرزاق اور ملا بوریان کو طالبان کی ایک مختصر فوج کے ساتھ اس میدان جنگ کی طرف روانہ کر دیا جہاں کچھ دیر پہلے مسعود اور مزاری کے درمیان معرکہ برپا تھا۔

طالبان سے بدعہدی..... اچانک حملہ: جب ملا عبدالرزاق اور ملا بوریان اپنے جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو دونوں طرف کے مورچے خاموش تھے۔ بظاہر حالات سازگار تھے مگر اس سے پہلے کہ طالبان حزب وحدت سے اسلحہ جمع کرنا شروع کرتے، ایک عجیب ترین بات ہوئی۔ ان پر یکایک گولیوں اور گولوں کی بارش شروع ہو گئی۔ طالبان اس غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لہذا ان کی خاصی تعداد شہید ہو گئی۔ بہت سے اس ہنگامے میں ادھر ادھر نکل کر لپٹا ہو گئے، کئی دنوں بعد ان کے بارے میں احمد شاہ مسعود کی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی خبر ملی۔

بہر کیف اس وقت ملا عبدالرزاق اور ملا بوریان اکثر طلبہ کو بحفاظت واپس لانے میں کامیاب ہو گئے۔ تب نہایت افراتفری کا عالم تھا۔ یہ بھی واضح نہیں تھا کہ حملہ احمد شاہ مسعود کی افواج نے کیا ہے یا حزب وحدت نے۔ یا دونوں اس خونیں کھیل میں شریک تھے۔ (بعد میں پتا چلا کہ یہ دونوں طاقتوں کی مل جلکت تھی کہ بجائے آپس میں ٹکرانے کے، پہلے طالبان کو ٹھکانے لگایا جائے۔)

طالبان کے خلاف کارروائی میں احمد شاہ مسعود کا ساتھ دینا حزب وحدت کی سنگین سیاسی و عسکری غلطی تھی جس سے اسے ذرہ برابر متوقع مفادات حاصل نہ ہوئے۔ احمد شاہ مسعود کی افواج اگلے دن ایک بار پھر حزب وحدت پر چڑھائی کے لیے تیار نظر آئیں جبکہ اب طالبان بھی حزب وحدت کو محفوظ راستہ دینے کے لیے اتنی آسانی سے رضامند نہیں ہو سکتے تھے۔ آخر کار خود کو دو طرفہ خطرات میں گھرا دیکھ کر حزب وحدت کی مرکزی کمان نے راہ فرار اختیار کرنے کو ترجیح دی، پارٹی کے سربراہ عبدالعلی مزاری ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک محفوظ علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر یہ راستہ طالبان کے علاقے سے گزرتا تھا جہاں ان کی چیک پوسٹیں موجود تھیں۔ چونکہ طالبان غیر محرم خواتین پر نگاہ ڈالنے سے سخت پرہیز کرتے تھے اس لیے عبدالعلی مزاری برقع پہن کر چند خواتین کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھے تھے۔ تاکہ طالبان انہیں چیک

نہ کر پائیں، مگر طالبان نے ہر موقع کے لیے مناسب انتظامات کر رکھے تھے۔

عبدالعلی مزاری کی گرفتاری: جب یہ ٹیکسی طالبان کی چیک پوسٹ سے گزری تو محافظوں نے ایک تربیت یافتہ کم سن بچے کو اشارہ کیا کہ وہ خواتین کو دیکھے بھالے۔ بچے نے تمام خواتین کے نقاب اٹھا کر دیکھے اور پھر حواس باختہ انداز میں واپس آ کر چوکی کے محافظوں سے کہا:

”ان میں سے ایک عورت کی..... اتنی..... لمبی ڈاڑھی ہے۔“

اس نے اپنے سینے تک اشارہ کر کے بتایا۔ یہ سن کر طالبان چونک گئے۔ بچے کی نشاندہی پر برقع میں لبوس عبدالعلی مزاری کو گرفتار کر لیا گیا۔ شیعہ عسکری تنظیموں کے اتحاد کے مرکزی قاعدہ کی گرفتاری کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ عبدالعلی مزاری کو فوری طور پر بڑے کمائڈروں کے پاس لے جایا گیا۔ انہوں نے طے کیا کہ شیعہ لیڈر کو مرکزی قیادت کے پاس قید ہار بھیج دیا جائے۔ چنانچہ مزاری کو اسی وقت ایک ہیلی کاپٹر میں قید ہار روانہ کر دیا گیا۔

اس ہیلی کاپٹر میں ایک رائل بردار محافظ اور پائلٹ کے سوا کوئی نہ تھا۔ ہاں ایک تابوت تھا جس میں کابل کے محاذ پر کام آنے والے ایک طالب علم کی لاش تھی۔ مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے 55 سالہ تندرست دو تانا عبدالعلی مزاری کے ہاتھ بھی کھلے رکھے گئے گویا حفاظتی انتظامات برائے نام ہی تھے۔

مزاری نے ہیلی کاپٹر انگو اکر لیا: اس صورت حال نے مزاری کو ایک غلط فیصلے پر آمادہ کر دیا۔ جب ہیلی کاپٹر غزنی کے قریب پہنچا تو مزاری نے یکا یک بے فکر محافظ پر حملہ کر دیا اور اس سے رائل چھین کر اسے وہیں قتل کر دیا۔ اس کے بعد پائلٹ کو گن پوائنٹ پر حکم دیا کہ ہیلی کاپٹر نیچے اتار لو۔ جب پائلٹ نے انکار کیا تو مزاری نے گولی چلا کر اسے بھی زخمی کر دیا۔ آخر پائلٹ ہیلی کاپٹر نیچے اتارنے پر مجبور ہو گیا۔ نیچے اترتے ہی مزاری نے قریبی دیہات کی طرف دوڑ لگا دی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ کچھ عیادیر گزری تھی کہ کچھ طالبان جو کابل سے قید ہار جا رہے تھے، اس راستے سے گزرے۔ ہیلی کاپٹر دیکھ کر ان کا ماتھا ٹھٹھا۔ قریب پہنچ کر انہوں نے ہیلی کاپٹر میں محافظ کو مقتول اور پائلٹ کو شدید زخمی پایا۔ جب پائلٹ نے انہیں بتایا کہ قیدی قریبی گاؤں کی طرف فرار ہوا ہے تو طالبان نے فوری طور پر اس دیہات کا محاصرہ کر لیا اور جلد ہی مزاری کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مزاری کا قتل اور اس کے اثرات: اس وقت تک مشہور ہو چکا تھا کہ حزب وحدت نے ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کر کے طالبان کو اپنے مورچوں کے سامنے بلایا اور پھر بیسوں طلبہ کو دھوکے سے قتل کر دیا ہے، اس لیے طالبان کے عام کارکن سخت مشتعل تھے۔ پھر مزاری کا محافظ کو قتل کر کے فرار ہونا بھی

اشتعال انگیز تھا، اس لیے کچھ طالبان نے آؤدیکھانہ تاؤ، مزاری کو وہیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اس واقعے کے بعد حزب وحدت نے جو افغانستان کے شیعہ گروہوں کی بڑی نمایندہ جماعت تھی، طالبان سے دشمنی اپنی گرہ میں باندھ لی اور ہر موقع پر انہیں انتقام کا نشانہ بنانے میں پیش پیش رہی۔

طالبان کا احمد شاہ مسعود سے حسن ظن: مسعود کی حزب وحدت کے مورچوں پر یلغار، حزب وحدت کی طالبان سے مصالحت اور قیام امن کی دعوت، طالبان پر بے خبری میں حملہ اور پھر مزاری کا قتل..... یہ سب کچھ اس طرح آنا فانا ہوا کہ کسی کو اس کے پس پردہ اصل سازش پر غور کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ طالبان کی قیادت بھی نہ سمجھ سکی کہ یہ احمد شاہ مسعود کی کارستانی ہے۔ طالبان لیڈر یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ کابل کے جنوب میں ان پر کیے جانے والے خوفناک حملے میں حزب وحدت کے ساتھ مسعود کی فوج نہ صرف شریک تھی بلکہ اصل منصوبہ ساز وہی لوگ تھے۔

طالبان کے بعض دوستوں کا خیال تھا کہ اس حملے کے ذمہ دار کابل انتظامیہ کے کیونسٹ عہدے دار جنرل آصف دلاور اور بابا جان ہیں۔ احمد شاہ مسعود کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں۔ طالبان اس حسن ظن پر مجبور تھے کیونکہ دینی مدارس میں پلٹے بڑھنے والا طبقہ، احمد شاہ مسعود کو احمد شاہ ابدالی کا دوسرا روپ تصور کرتا تھا۔ طالبان کی مسعود سے عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ایک شخص نے ملا محمد عمر کو بتایا کہ طالبان پر اس حملے میں اصل کردار احمد شاہ مسعود کا ہے اور وہ بدعہدی کا مرتکب ہوا ہے تو ملا محمد عمر نے اس اطلاع دہندہ کو ڈانٹ کر کہا:

”ایسے عظیم مجاہد کو آپ دھوکے باز کہہ رہے ہیں؟“

احمد شاہ مسعود کا دوسرا حملہ: مگر جلد ہی احمد شاہ مسعود کا اصل روپ طالبان کے سامنے آ گیا۔ کابل حکومت نے 6 مارچ کی اس جنگ کے بعد جو حزب وحدت کے خلاف شروع ہو کر طالبان پر پلٹ گئی تھی، طالبان کے خلاف ایک بڑے حملے کی تیاری کر لی۔ 11 مارچ 1995ء کو طالبان پر اچانک ایک اور بھرپور حملے کا آغاز ہوا۔ طالبان اب تک احمد شاہ مسعود کے عزائم سے بے خبر تھے۔ انہوں نے کسی قسم کی جنگی تیاری نہیں کی تھی۔ ان کی دفاعی لائن بھاری اسلحے سے بالکل خالی تھی۔ ایسے میں جب کیونسٹ افسران جنرل بابا جان اور جنرل آصف دلاور منظم انداز میں ان پر حملہ آور ہوئے تو وہ ہکا بکارہ گئے۔ یہ حملہ زمین اور فضائی دونوں انداز سے کیا جا رہا تھا۔ طالبان نے زمینی حملے کا تو حتی الامکان مقابلہ کیا اور ہلکے ہتھیاروں کے ذریعے دیر تک لڑتے رہے، کابل کی مصفا قاتی بستیوں میں دست بدست لڑائی ہوتی رہی مگر جب وہ فضائی حملے کی زد میں آئے تو ان کے پاس سوائے پسپائی کے کوئی راستہ باقی نہ بچا۔

کیونٹ پائلٹ طالبان کو نیپام بموں اور کلستر بموں کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس لڑائی میں طالبان کے کم از کم اڑھائی سو افراد شہید ہوئے جن میں اکثریت علمائے کرام، حفاظ کرام اور قراء حضرات کی تھی۔

احمد شاہ مسعود اور برہان الدین کی اس کھلی بد عہدی کے باعث طالبان کو ایک بڑے جانی نقصان کے ساتھ ساتھ شدید ذہنی صدمہ بھی پہنچا مگر ان کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کسی تاخیر کے بغیر انہوں نے کابل کے قریب اپنے دفاعی خط کو مضبوط کیا تاکہ کابل حکومت کے مزید حملے کامیاب نہ ہو سکیں۔ تازہ کمک اور بمباری اسلحے کے ذریعے انہوں نے خود کو مسعود کے مقابلے میں بھرپور مزاحمت کے قابل بنالیا تاہم ابھی وہ کابل پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

مغربی محاذ..... اسماعیل خان تورون سے کشکش: کابل پر براہ راست حملے کے منصوبے کو موخر کرتے ہوئے اب انہوں نے مغرب کی طرف توجہ مرکوز کر دی جہاں ہرات کے گورنر اسماعیل تورون سے جنگ جاری تھی، مغربی محاذ بدستور گرم تھا اور طالبان کا لشکر تیزی سے پیش قدمی کرتے ہوئے ہرات کے جنوب میں سوویت یونین کے تعمیر کردہ شین ڈنڈ اڑتیس تک جا پہنچا تھا۔ احمد شاہ مسعود کو طالبان پر دباؤ کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش تھی۔ اس نے فوری طور پر اسماعیل خان کی مدد کا فیصلہ کر لیا، اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر طالبان شین ڈنڈ ایر پورٹ پر قابض ہو گئے تو انہیں فضائی قوت حاصل ہو جائے گی جس کے بعد وہ کابل حکومت سے بھرپور نکل لے سکیں گے۔

احمد شاہ مسعود نے بلاتاخیر دو ہزار کہنہ مشق تاجک سپاہیوں کو طیاروں کے ذریعے شین ڈنڈ اور ہرات بھیج دیا تاکہ وہ طالبان کو آگے بڑھنے سے روکیں۔ ساتھ ہی کابل حکومت کے طیاروں نے بگرام سے پرواز کر کے طالبان کے خطہ اوّل پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ فضائی طاقت سے محروم طالبان اس خوفناک حملے کی تاب نہ لا سکے اور شدید جانی و مالی نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد کئی ماہ تک مغرب میں ان کی پیش قدمی رکی رہی۔

طالبان، دوستم اور آئی ایس آئی: 1995ء کا موسم گرما خاموشی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مگر اس خاموشی کے ٹپوں پر وہ ایک طوفان جنم لینے کو تھا۔ احمد شاہ مسعود، اسماعیل خان تورون اور طالبان، تینوں اپنی اپنی جگہ نئے موڑ پر تیار کر رہے تھے۔ طالبان نے اس دوران اپنی افواج کی تنظیم بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کی، رضا کاروں کی سخت تربیت کا انتظام کیا گیا۔ پاکستان میں روابط رکھنے والے طالبان عہدے داروں نے یہاں کے بڑے بڑے دینی مدارس میں اپنے لیے فضا ہوار کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ اور حکومت پاکستان کو یقین ہو چلا تھا کہ افغانستان میں ایک پاکستان دوست حکومت کے قیام کے لیے

طالبان سے بہتر فریق کوئی اور نہیں ہو سکا۔ چنانچہ حکومت پاکستان اور آئی ایس آئی نے طالبان کو اس انداز میں تعاون فراہم کرنا شروع کر دیا جس پر مکمل کھلاتعاون کی تہمت نہیں لگ سکتی تھی۔

طالبان کو اسلحے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انہیں قندھار، غزنی، میدان شہر اور لوگر سے اس کے بڑے بڑے ذخائر مل چکے تھے۔ جہاں تک افرادی قوت کا تعلق ہے، اس کے لیے افغانستان کے دینی مدارس اور متدین طبقے کے اُن گنت نوجوان موجود تھے۔ پھر پاکستان کی مغربی سرحدیں بھی کھلی تھیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے نوجوان بڑی تعداد میں طالبان کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے پہنچ جاتے تھے، پنجاب اور سندھ سے بھی طالبان کو رضا کار مل جاتے تھے۔ البتہ طالبان نضائی طاقت سے مکرم محرم تھے۔ اس کے علاوہ ان کا سفارتی محاذ خاصا کمزور تھا۔ انہیں دوسرے فریقوں سے اذراہ معلومات معاہدے کرنے اور مفادات حاصل کرنے کا تجربہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا کوئی اتحادی نہیں تھا۔ افغانستان کے تمام سیاسی دھڑے ان کے مخالف تھے اور ان سب سے طالبان کو تنہا جنگ کرنا پڑ رہی تھی۔ اس موقع پر آئی ایس آئی نے طالبان اور جہل رشید دو تہم میں ایک عسکری معاہدہ کر لیا، جس کے نتیجے میں دو تہم نے ازبک ماہرین کو بھیج کر قندھار ائیر پورٹ پر کھڑے قابلِ مرمت طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو درست کرنے میں مدد دی۔ اس طرح طالبان کو پہلی بار نضائی قوت حاصل ہوئی۔

طالبان کے خلاف لشکرِ جہار کی روانگی: شین ڈنڈ کے محاذ پر طالبان کی پسپائی ان کی پہلی شکست تھی جس نے طالبان مخالف عناصر کو بڑا حوصلہ بخشتا تھا۔ پھر احمد شاہ مسعود اور اسماعیل خان کا اتحاد بھی طالبان کے لیے خطرات میں اضافہ کر چکا تھا۔ ادھر ہلمند کا شکست خوردہ سردار عبدالغفار اخوند زادہ جو فرار ہو کر غور بند پہنچ چکا تھا، اسماعیل خان کے ساتھ مل کر طالبان سے لکر لینے پر آمادہ تھا۔ اس صورت حال نے اسماعیل خان کو بے حد خوش فہمی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے طے کر لیا کہ ایک ہی بار بھر پور انداز میں مل کر کے طالبان کا قصبہ پاک کر دیا جائے۔

اسماعیل خان تین چار ماہ تک زبردست جنگی تیاریوں میں مصروف رہا۔ اگست 1995ء کے گرم موسم میں اتحادیوں کا ایک لشکرِ جہار تیار ہو گیا جس کے بارے میں وثوق سے کہا جا رہا تھا کہ یہ قندھار کو فتح کیے بغیر نہیں لوٹے گا۔ اس میں سپاہیوں کی تعداد 25 ہزار سے کم نہ تھی۔ اس کی قیادت دو کمیونسٹ کمانڈروں جہل علاء الدین اور جہل ہلالی کے سپرد تھی۔ یہ ایک غیر معمولی فوج تھی جس کی جنگی تیاریوں ساز و سامان، جدید ہمداری اسلحے اور افرادی کثرت کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والوں کے دل دہل جاتے تھے۔ اس لشکر میں شامل ایک کمیونسٹ جہل کی خود نوشت سوانح عمری کے مطابق:

”یہ پہلا منظم ترین لشکر تھا جو جنوب مغربی علاقے سے روانہ ہوا تھا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی قاریاب اور دوسرے علاقوں سے ہمارے لشکر گئے تھے مگر کیفیت اور تعداد کے لحاظ سے وہ ہرگز اس لشکر کے مقابلے کے نہ تھے۔“

ہراتی لشکر کا دل آرام اور ہلمند پر قبضہ: مغربی سرحدوں پر تعینات طالبان کے دستے اس سیلاب کے سامنے بند نہیں باندھ سکتے چنانچہ وہ تیزی سے پسپا ہو گئے اور یوں اسماعیل خان کی افواج آرام سے ایک اہم مغربی ضلع ”دل آرام“ پر قابض ہو گئیں۔ دریائے دل آرام کے دونوں کنارے اب ان کی گرفت میں تھے۔ طالبان دل آرام سے اس طرح پسپا ہوئے کہ پھر ان کے قدم کہیں جم نہ سکے اور اسماعیل خان کی فوج نے طوفانی رفتار سے پیش قدمی کر کے ہلمند پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب وہ براہ راست قندھار پر قبضہ کرنے کی پوزیشن میں تھیں۔

قندھار خطرے کی زد میں: طالبان کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ ان کی افواج مختلف محاذوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ قندھار کے دفاع کے لیے بہت کم فوج موجود تھی اور جو سپاہی تھے وہ بھی دل شکستہ ہو رہے تھے۔ دریائے دل آرام سے 20 کلومیٹر آگے، 25 ہزار سپاہ کا اجتماع ایک ایسا منظر تھا جو بڑے بڑے بہادروں کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ طالبان کو قندھار کے دفاع کے لیے نئے رضا کاروں کی بھرتی کی اشد ضرورت تھی مگر اس وقت اہل قندھار خوف کی وجہ سے گھروں میں دبک رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر قندھار کی ایک ضعیف بڑھیا ہندو نے لڑکا باہر نکل آئی۔ اس نے طالبان کی جیب پر سوار ہو کر پورے شہر کا چکر لگایا، وہ لوگوں پر چوڑیاں پھینکتی اور ان کی غیرت کو آواز دیتی۔ تب قندھاریوں کو جوش آیا اور بہت سے لوگ قول اردو (قندھار کے مسکے) میں جمع ہو گئے، جن سے طالبان کو بقدر ضرورت رضا کار میسر آ گئے۔ ملا محمد عمر نے یہاں ایک میز پر چڑھ کر لوگوں سے خطاب کیا اور ان کی ہمت بڑھائی۔

ملا محمد عمر کا عجیب فیصلہ: ملا محمد عمر نے اس وقت ایک عجیب فیصلہ کیا جو بظاہر عقل و دانش کے خلاف تھا، مگر ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ”ان کے بہت سے فیصلے الہامی ہوا کرتے ہیں۔“ ان کے قریبی میسر بھی قاہری امکانات کی روشنی میں ان فیصلوں سے اختلاف کر جاتے ہیں مگر ان پر عمل کے بعد کامیابی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

اس وقت ان کا فیصلہ تھا کہ طالبان شہر کا دفاع کرنے کی بجائے باہر نکلیں اور آگے جا کر دشمن کو روکیں۔ طالبان قندھار سے باہر ایک ندی تک پہنچے تو ملا عمر نے حکم دیا کہ وہ ندی کا پل عبور کر کے دو

گروہوں میں تقسیم ہو جائیں، سڑک کھلی چھوڑ دیں اور سڑک کے دائیں بائیں مورچے بنالیں۔ یہ فیصلہ بڑا عجیب تھا۔ دفاعی حکمت عملی بظاہر یہ ہونا چاہیے تھی کہ پل توڑ دیا جاتا اور طالبان ندی کے اس طرف مورچے بنا کر دشمن کو روکتے۔

ہراتی لشکرات کی تاریکی میں اسی سڑک پر پیش قدمی کر رہا تھا۔ طالبان کے مخبروں نے بتایا کہ گاڑیوں کی سینکڑوں بٹیوں کی روشنی سے صحرائیں اجالا ہو رہی ہیں جس سے حملہ آوروں کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ندی کے پار مورچے بنا کر طالبان ساری رات دشمن کے حملے کا انتظار کرتے رہے۔ انہیں اپنے امیر کی حکمت عملی سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ اگر ہم ندی کے ادھر ہی مورچے بناتے تو بہتر تھا کہ شکست کھا کر بھاگ تو سکتے تھے، یہاں تو سڑک بھی صاف ہے جس پر دشمن دندا تا چلا آئے گا۔ ہم فرار بھی نہیں ہو سکیں گے۔

مگر طالبان کی اس مورچہ بندی سے خود حملہ آوروں پر رعب طاری ہو گیا۔ جب مخبروں نے بتایا کہ طالبان کھلے میدان میں سڑک کو خالی چھوڑ کر دائیں بائیں ان کے فسطح ہیں تو جنرل ہلالی اور جنرل علاؤ الدین نے پیش قدمی روک دی۔ انہوں نے سوچا کہ رات کی تاریکی میں دشمن کی قوت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے ایک دن ٹبر کرتا زہ دم ہونے اور دشمن کی طاقت کا صحیح پتا چلانے کے بعد آگے بڑھنا مناسب ہوگا۔ طالبان تمام رات اور اگلے دن بھی دشمن کے حملے کا انتظار کرتے رہے مگر ہراتی لشکر نے ہلنے کا نام نہ لیا۔

اگلی رات ملا عمر نے طالبان کو ایک اور عجیب حکم دیتے ہوئے کہا کہ وہ دشمن کے اس کیپ پر جس میں 25 ہزار سپاہی، بری اور فضائی طاقت سمیت تیار کھڑے تھے، اچانک حملہ کر دیں۔ طالبان نے امیر کے حکم پر لبیک کہا اور رات کی تاریکی میں کئی ٹرکوں میں بھر کر دشمن کے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ انہوں نے جاسوسوں کے ذریعے دشمن کا نام شب (کوڈ ورڈ) معلوم کر لیا تھا اور خود کو ہراتی لشکریوں سے مشابہہ بنانے کے لیے اپنے لیے کتوں کو گرہیں لگا لگا کر چھوٹا کر لیا تھا۔ ان انتظامات کے ساتھ طالبان صرف ہلکے اسلحے کے ساتھ یا ایک دشمن کے خطہ اول (فرنٹ لائن) پر حملہ آور ہو گئے۔ ہراتی سپاہیوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ان پریوں اچانک حملہ ہو جائے گا۔ وہ بے فکری کے ساتھ سچ سویرے کوچ کر کے شام تک قلعہ دار پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے، مگر مسلسل فائرنگ اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے ان کی خوابیدہ آنکھیں کھل گئیں اور وہ افراتفری میں نادیدہ دشمنوں کو نشانہ بنانے کی ناکام کوشش کے بعد ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ان کا خطہ اول دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹ گیا۔ طالبان ان کی بدحواسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی صفوں کے درمیان پہنچ گئے۔

یہاں طالبان نے "نام شب" کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جب کوئی طالب کسی ہراتی کی زد پر آتا تو نام شب پکار کر صاف بچ نکلتا۔ بہت سے طالبان نے خود کو "اخوند زادہ" یا کسی اور حلیف کمانڈر کا ساتھی بنا کر ان کے بچوں بچ گھنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس طرح وہ دائیں بائیں کو نظر انداز کر کے، ان کی تمام دفاعی لائنیں عبور کر کے سیدھے آگے بڑھتے چلے گئے۔ عسکری لحاظ سے یہ طریقہ بے حد خطرناک ہے مگر اس سے دشمن پر نفسیاتی دباؤ ضرور پڑ جاتا ہے اور یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ دشمن اپنی فضا پر حکومت میں لاسکتا نہ بھاری توپوں اور ٹینکوں کو۔ جوں جوں طالبان آگے بڑھتے گئے، ہراتی لشکر کے چٹکے چھوٹتے چلے گئے۔ طالبان ان کی فرنٹ لائن کو توڑنے کے بعد بلا توقف صف بندی کے ابتدائی حصے (خطہ منظرہ) تک جا پہنچے۔ اب لشکر کا کوئی گوشہ ان کی زد سے محفوظ نہ تھا۔ سپاہی تو ہیں، ٹینک اور دیگر بھاری اسلحہ وہیں چھوڑ کر اپنی جانیں بچانے کے لیے بھاگے پھر رہے تھے۔ خود جہز بلانی دومرتبہ طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بال بال بچا۔ غرض اس رات کی بازی پوری طرح طالبان کے حق میں رہی۔

23 ہزار سپاہی اسلحے کے عظیم انبار چھوڑ کر یوں فرار ہوئے کہ صبح تک کہیں ان کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا تھا جبکہ دو ہزار کے لگ بھگ طالبان کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

طالبان کی مزید پیش قدمی: اس کامیابی نے طالبان کے حوصلے اس قدر بلند کر دیے کہ وہ اگلے دن سورج کی روشنی میں بھی آگے بڑھتے رہے۔ اس دوران دشمن کی بعض گاڑیوں سے ان کی جہز ہیں بھی ہوئیں۔ جہز علاؤ الدین نے اس دن پوری کوشش کی کہ کسی جگہ دوبارہ دفاعی خطہ بنا کر طالبان کا مقابلہ کرے مگر عصر کے وقت طالبان کا ایک دستہ اس تک پہنچ گیا۔ دو بدو فائرنگ میں علاؤ الدین ایسا شدید زخمی ہوا کہ اس کے بچنے کی امید نہ رہی۔ اس کے بعد جہز بلانی نے شکست خوردہ فوج کی کمان سنبھالی اور اسے بیس کلومیٹر پیچھے لے جا کر دریائے دل آرام کے کنارے دفاعی خطہ بنالیا۔ تاہم فوج کی حالت ابتر تھی اور اس میں طالبان سے لڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی اور خطرہ تھا کہ یہاں سے پسپائی کے بعد طالبان شین ڈنڈا ایر پورٹ تک پہنچ جائیں گے۔

اسماعیل خان، ربانی سے مدد کا طلب گار: اس دوران اسماعیل خان ہرات میں اپنے مشیروں اور فوج کے کمانڈروں سے صلاح و مشورے میں مصروف تھا۔ طے یہ ہوا کہ کابل سے فوری مدد مانگی جائے۔ چنانچہ اسماعیل خان نے فون پر برہان الدین ربانی سے بات چیت کی اور فوری طور پر 5 ہزار مسلح افراد کی کمک طلب کی۔ مگر اسماعیل خان کی تمام کوششیں ریت کی دیوار کو سہارا دینے کے مترادف ثابت ہوئیں۔ طالبان ایک آندھی کی طرح آگے بڑھے اور ستمبر 1995ء کے آغاز میں شین ڈنڈا ایر پورٹ تک پہنچ گئے۔ یہ

اسماعیل خان کا آخری مورچہ تھا جس کے بعد طالبان کو ہرات تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک سکا تھا۔

اسماعیل خان جلاوطن، طالبان ہرات پر قابض: اسماعیل خان نے آخری کوشش کے طور پر شین ڈنڈا رپورٹ کے راستے میں بارودی سرنگوں کا جال بچھا دیا، مگر طالبان جو شہادت کے متوالے تھے، اس آزمائش کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ ان کی لاشوں پر لاشیں گرتی رہیں مگر وہ بارودی سرنگوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ 3 ستمبر 1995ء کو شین ڈنڈا رپورٹ بھی ان کے قبضے میں آ گیا۔

اسماعیل خان اب مزاحمت سے مایوس ہو چکا تھا۔ طالبان کے مسلح قافلوں نے جوڑکوں اور جیپوں پر کئی اطراف سے پیش قدمی کر رہے تھے، اس کے لیے تمام راستے مسدود کر دیے تھے اور اس کے خلاف گھیراؤ لگاتے چلے جا رہے تھے۔ آخر کار اسماعیل خان اپنے کئی کمانڈروں اور کئی سوماتختوں کے ساتھ ایران چلا گیا جو اس کی سرپرستی کرتا چلا آیا تھا۔ 5 ستمبر 1995ء کو طالبان نے کسی لڑائی کے بغیر ہرات قبضہ کر لیا۔ یوں طالبان حکومت کا بل اور شمالی اضلاع کو چھوڑ کر ملک کے 15 صوبوں تک پھیل گئی۔

اتحاد اسلامی کے کمانڈر بھی طالبان کے حامی: ان فتوحات نے طالبان کے اثر و رسوخ میں بے پناہ اضافہ کر دیا اور مخالف کمانڈر کے بعد دیگرے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگے۔ 25 اکتوبر 1995ء کو کابل حکومت کی سب سے بڑی اتحادی جماعت ”اتحاد اسلامی“ کے 16 کمانڈروں میں سے 11 نے طالبان کی حمایت کا اعلان کر دیا جبکہ بقیہ نے بھی طالبان سے مذاکرات شروع کر دیے۔ خود اتحاد اسلامی کے سربراہ استاذ عبدالرب رسول سیاف کے کابل حکومت سے اختلافات بڑھتے چلے گئے، جس کے رد عمل میں حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جبل السراج میں نظر بند کر دیا۔

کابل کا محاصرہ بدستور جاری: اس دوران طالبان نے کابل کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ کابل حکومت سے اب ان کی کھلی جنگ تھی۔ طالبان کا مطالبہ تھا کہ صدر ربانی فوری طور پر مستعفی ہو جائیں اور شہر کا انتظام ان کے حوالے کر دیں۔ طالبان کی طرف سے شہر پر اکا دکا حملے بھی جاری تھے اور دشمن کی چھوٹی موٹی پوسٹوں پر وہ آہستہ آہستہ قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ تاہم انہوں نے عمومی حملے کا فیصلہ نہیں کیا تھا کیوں کہ خدشہ تھا کہ ایسی کسی کوشش میں ان گنت بے گناہ شہریوں کی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

اکتوبر 1995ء کے اوائل میں طالبان کابل کے گرد مورچے مضبوط کر کے بڑے حملے کی تیاری کرتے رہے۔ 10 اکتوبر کو قندھار سے 400 ٹینکوں پر مشتمل تازہ دم فوج کابل کے محاذ پر پہنچ گئی اور شہر پر حملے کے لیے کرکس لی گئی۔ اگلے دن باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ کچھ دن قتل چہار آ سیاب طالبان کے قبضے سے نکل گیا تھا۔ 11 اکتوبر کی لڑائی میں طالبان نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ایک ماہ تک وقفے

وقفے سے کامل کے محاذ پر جھڑپیں جاری ہیں۔ 11 نومبر کو طالبان نے راکٹوں سے ایک بڑا حملہ کر کے کامل انتظامیہ کو شدید زک پہنچائی۔ 26 نومبر کو فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ طالبان شہر میں داخل نہ ہو سکے اور قدرے پیچھے ہٹ کر از سر نو مورچے مستحکم کرنے لگے۔

1995ء کے آخر میں صورت حال: 1995ء کے اواخر میں صورت حال یہ تھی کہ ملک کے تیس صوبوں میں سے 15 پر طالبان کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بقیہ 15 صوبوں میں سے 7 شمالی صوبے رشید دوستم کے پاس تھے جس نے ازراہ مصلحت طالبان سے معاہدہ کیا ہوا تھا۔ بقیہ 8 صوبوں میں سے ”کنڑ“ اہل حدیث حضرات کے پاس تھا۔ بامیان حزب وحدت کے قبضے میں تھا۔ سرول اور جلال آباد حزب اسلامی کے کنٹرول میں تھے۔ اس طرح کامل حکومت کے پاس صرف پانچ صوبے رہ گئے تھے۔ اس لحاظ سے یہ حکومت کسی طرح بھی افغانستان کی نمائندہ حکومت کہلانے کی حق دار نہ تھی۔ مگر اقوام متحدہ سمیت تمام دنیائے طالبان کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔

دیوبند کے روسی طیارہ طالبان کے قبضے میں: طالبان کا کہنا تھا کہ کامل حکومت اب صرف بھارت اور روس کے سہارے چل رہی ہے۔ یہ بات اس وقت کھل کر سامنے آگئی جب طالبان کے جیٹ طیاروں نے قندھار کے اوپر محو پرواز ایک دیوبند کے روسی طیارے کو قندھار ایرپورٹ پر اترنے پر مجبور کر دیا۔ یہ طیارہ سات روسی افراد کے عملے کے ساتھ دہلی سے کامل جا رہا تھا، اس میں کامل حکومت کے لیے جنگی ساز و سامان تھا جس میں کلاشن کوف کی 34 لاکھ گولیاں بھی شامل تھیں۔ طالبان نے طیارہ مع ساز و سامان ضبط کر لیا۔ تاہم عملے کی رہائی کے لیے یہ شرط پیش کی کہ روسی حکومت جہاد افغانستان کے دوران گرفتار اور لاپتہ کیے جانے والے علماء اور شہریوں کے بارے میں معلومات فراہم کرے۔

طالبان کے اس رویے سے اعزازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے خیر میں وہ شے کس قدر گندمی ہوئی تھی جسے مغربی دنیا ”بنیاد پرستی“ سے تعبیر کرتی ہے۔ سو ایسی حکومت بھلا طاغوتی طاقتوں کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتی ہے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جو ان واضح حقائق سے آنکھیں موندتے ہوئے طالبان کو مغربی ایجنٹ کہتے چلے آ رہے ہیں۔

طالبان کے خلاف متحدہ کونسل کا قیام: نیا شمس سال (1996ء) شروع ہوا تو نام نہاد کامل حکومت طالبان کے فیصلہ کن حملے سے پہلے پہلے اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پیر مارتی نظر آئی۔ چند ہفتوں کی برف باری کے باعث جنگی سرگرمیاں معطل رہی تھیں مگر بہار آتے ہی ایک نئی جنگ چھڑنے کا خدشہ سامنے تھا۔ صدر ربانی کے نمائندے ڈاکٹر عبدالرحمن نے گلبدین حکمت یار، رشید دوستم اور حزب وحدت کے

لیڈروں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں۔ جنوری 1996ء میں یہ مشورے جاری رہے اور فروری میں ان دھڑوں نے ایک دس رکنی کونسل بنانے پر اتفاق کر لیا جس میں طالبان شامل نہیں تھے۔ اس کونسل کا اصل ہدف باقی ماندہ افغانستان کو طالبان کے قبضے میں جانے سے روکنا تھا مگر بظاہر یہ بتایا جا رہا تھا کہ کونسل تمام گروہوں کے اتفاق سے ملک میں قیام امن کی داعی ہے۔

طالبان کا اتحاد سے انکار: حکومت پاکستان کو اس کونسل کے قیام پر تشویش تھی کیونکہ افغانستان کی سیاست سے طالبان کی بے دخلی کے بعد وہاں ایک پاکستان دشمن حکومت کا مستحکم ہونا یقینی تھا۔ چنانچہ حکومت پاکستان نے ایک طرف حکمت یار، دوستم اور حزب وحدت کے لیڈروں کو طالبان سے مصالحت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف طالبان پر زور دیا کہ وہ اپنی بعض شرائط سے دستبردار ہو کر ان دھڑوں سے اتحاد کر لیں اور ان کے ساتھ مل کر کابل پر قبضے کی کوشش کریں۔ حکومت پاکستان نے طالبان کے رویے میں پلک پیدا کرنے کے لیے انہیں چین سے ترکمانستان کی سرحد تک کئی ملین ڈالر کے خرچ سے ایک تجارتی شاہراہ بنوادینے کا لالچ بھی دیا مگر طالبان کسی اور طاقت سے برابر کی سطح پر اتحاد پر آمادہ نہ ہوئے۔ جن لیڈروں کے دامن پر ہزاروں بے گناہوں کا خون تھا اور جن کے ہاں عہد و بیان کی کوئی حیثیت نہیں تھی، طالبان اپنی موجودہ پوزیشن میں ان سے اتحاد و فصول سمجھتے تھے۔

ربانی کا بیرونی دورہ اور امداد: صدر ربانی نے جب دیکھا کہ حکومت پاکستان طالبان کا دوسرے دھڑوں سے اتحاد کرانے میں ناکام ہو گئی ہے تو وہ ایک بار پھر اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے پرامید ہو گئے۔ 3 مارچ 1996ء کو صدر ربانی ساٹھ ارکان کا قافلہ لے کر ایران، ترکمانستان، تاجکستان اور ازبکستان کے دورے پر نکلے۔ اس مہم میں انہوں نے بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں کئی ممالک نے کابل حکومت کی امداد میں اضافہ کر دیا۔ روسی ٹرانسپورٹ طیارے تاجکستان اور یوکرین سے لے کر کابل آنے لگے۔ ان میں گولہ بارود اور جدید اسلحہ بھرا ہوا تھا۔ بھارتی طیاروں نے بھی مگرام تک پروازوں کا معمول بنالیا اور دھڑا دھڑوہاں کرنسی کے ڈھیر، زمینی ریڈار اور طیاروں کے فاضل پرزہ جات منتقل کرنے لگے۔ بھارت نے کابل کی ایرلائن آریا نہ کو بھی منظم کر دیا۔

ایران بھی کابل حکومت کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ اگرچہ گزشتہ سال احمد شاہ مسعود نے کابل میں حزب وحدت کے سینکڑوں افراد قتل کر کے ایران کو برا فروختہ کر دیا تھا مگر اب طالبان کا خطرہ بڑھتا دیکھ کر ایران نے احمد شاہ مسعود سے اس دشمنی کو فراموش کر دیا۔ ایرانی حکومت نے مشہد کے قریب پانچ عسکری کمپ بنا کر اسماعیل خان کے حامی پانچ ہزار جنگجوؤں کو تربیت دینا شروع کر دی تاکہ وہ طالبان کی مختلف

جنگ میں حصہ لیں۔ شہدایہ پورٹ سے طیارے اسلحہ لے کر روزانہ بگرام ہوائی اڈے پر اترنے لگے۔ بعض اوقات ایک ہی دن میں دس دس بارہ بار پروازیں ہوتیں۔

طالبان تشکیل حکومت کے موڑ پر: ہمسایہ ممالک کی ان تمام تر سازشوں کے جواب میں طالبان کی توجہ اپنی مفوں میں اتحاد اور تنظیم پیدا کرنے پر مرکوز رہی۔ طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر کے لیے فیصلہ کن وقت آچکا تھا۔ وہ 15 صوبوں کے حکمران ہوتے بھی اگر محض ایک فوج کے سپہ سالار کی طرح رہتے تو کبھی بھی ان بڑی بڑی آزمائشوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے جن کے شعلے آفتی پر لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔

ملا محمد عمر کے غلط ساتھی جو علماء اور مجاہد تھے، انہیں احساس دلارہے تھے کہ اب وہ لمحہ آچکا ہے کہ انہیں ایک باقاعدہ اسلامی حکمران کے طور پر عہدہ حکومت سنبھالنے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ نہ صرف افغان عوام بلکہ دنیا کے کونے کونے سے افغانستان میں جہاد کے لیے جمع ہونے والے مجاہدین میں اتحاد و تنظیم قائم کرنے کے لیے بھی یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔ طالبان یہ فیصلہ شورا ایت کے ذریعے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ مارچ 1996ء کے اواخر میں سینکڑوں علماء امیر کے انتخاب کے لیے قندھار میں جمع ہو گئے۔ حکمران کے انتخاب کا یہ طریقہ مردجہ جمہوریت کے اصول پر پورا نہیں اترتا تھا مگر خلیفہ، سلطان یا امیر کے انتخاب کے جو طریقے اسلامی شریعت اور کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان کے لحاظ سے یہ سب سے موزوں تر انداز تھا۔ آنے والے علماء کی تعداد ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ یہ افغانستان کی قریبی تاریخ میں علمائے دین کی سب سے بڑی مجلس شوریٰ تھی جس نے ہر پہلو سے ملک کو درپیش سیاسی الجھنوں اور مشکلات کا جائزہ لیا۔

20 مارچ سے لے کر 13 اپریل تک کئی جلسوں میں یہ مشورے جاری رہے۔ نیا نظام حکومت کیا ہو؟ اسلامی حکومت کا منشور اور آئین کیا ہوگا؟ سیاسی چیلنجوں کا سامنا کس طرح کیا جائے گا؟ غیر ملکی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا جواب کیسے دیا جائے گا؟ شریعت کے نفاذ کے لیے مؤثر طریقے کیا ہوں گے؟ عسکری تنظیم کس طرح بہتر بنائے جائے گی؟ نظام تعلیم کیا ہوگا اور لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کس طرح مناسب ہوگا؟ اس طرح کی کئی اہم بحثیں جاری رہیں اور بہت سے اہم فیصلے ہوئے جن کی روشنی میں طالبان کی حکومت کا ایک مربوط خاکہ طے پا گیا۔

ملا محمد عمر امیر المؤمنین: 10 ذی قعدہ 1416ھ (14 اپریل 1996ء) تاریخ افغانستان کا ایک یادگار دن تھا۔ اس دن ملا محمد عمر کو ”امیر المؤمنین“ کے لقب کے ساتھ افغانستان میں طالبان کی حکومت کا مشفق سربراہ اور امیر تسلیم کر لیا گیا۔ ملا محمد عمر نے اس دن حضور نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب وہ جبریں تہن کیا ہوا قہر و قندھار کی مشہور زیارت گاہ ”خرقہ شریف“ میں محفوظ چلا آ رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جبہ افغانستان

کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو اُس دور کے عثمانی خلیفہ نے عطا کیا تھا اور صرف انتہائی خاص مواقع پر اس کی زیارت کرائی جاتی تھی۔ مقامی روایت یہ بھی ہے کہ جبہ ایک آہنی صندوق میں مقفل تھا اور زمانہ دراز سے یہ صندوق کسی سے کھل نہیں پایا تھا۔ مگر اس دن ملا محمد عمر کے ہاتھ لگاتے ہی صندوق آسانی سے کھل گیا۔ یہ ایک غیبی شہادت تھی جس کا چرچا آٹا فانا دور دور تک ہو گیا۔

ملا محمد عرب جب یہ مبارک جبہ پہن کر جمع عام میں نمودار ہوئے تو ہزاروں علماء اور قبائل کے عمائد نے نعرہ بلند کیا:

”امیر المؤمنین، امیر المؤمنین“

یہ ایک تاریخی جلسہ تھا جس کی صدارت ملک کے بزرگ ترین عالم دین، لانا عبدالغفور مینانی کر رہے تھے۔ ڈیڑھ ہزار علماء، سینکڑوں قبائلی عمائد اور ہزاروں عوام ہمہ تن گوش تھے۔

طالبان سربراہ کا تاریخی خطاب: اس دن ملا محمد عمر نے اپنے مخصوص مادہ مگر موثر لہجے میں ایک ناقابل فراموش تقریر کی۔ انہوں نے قرآن مجید کی آیت ﴿وَأَعْتَبُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا﴾ پڑھ کر اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا:

”عالم اسلام میں علماء کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں شریانیں کہ انہی پر زندگی کا دارومدار ہے۔ جب تک شریانیں فعال رہیں جسم نشوونما پاتا ہے اور مضبوط رہتا ہے۔ جب شریانیں کمزور ہو جائیں اور اپنا کام چھوڑ دیں تو روح جسم کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہے، افعال معطل ہو جاتے ہیں اور جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ اگر عالم اسلام کے علمائے کرام فکر اور عمل میں متفق ہو جائیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی ترقی مسلمانوں کی جماعتوں کے اتحاد پر منحصر ہے اور ان جماعتوں کے قائد علمائے راہنیں ہیں۔ اگر ہم متحد ہو جائیں تو کامیاب ہو جائیں گے اور اُمت کو مشقتوں اور مصائب سے نجات دلا دیں گے۔ حکومت اور صالح قیادت ہماری رفیق ہوگی۔ لیکن اگر ہم بکھر گئے اور اللہ کی اطاعت سے دور رہے تو خسارے میں پڑ جائیں گے۔ ہم دشمنوں سے مغلوب اور ان کی قوت کے آگے مجبور ہو جائیں گے۔ اب جواب دہی ہمارے کندھوں پر ہے۔ میں ایک بار پھر تاکید کرتا ہوں کہ اے برادر علمائے کرام! آپ متحد رہیں اور اس تحریک میں ہمارے ساتھ جو تعاون ممکن ہو، کر گزریں۔ بعض لوگ ہمارے اہداف کے بارے میں استفسار کرتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے اہداف و مقاصد آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن ہیں۔ لوگ محرومہ صوبوں میں ہماری

کارکردگی اور نظام دیکھ چکے ہیں کہ ہم کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے ہیں، اس کے احکام نافذ کر رہے ہیں، حدود و شرعیہ قائم کر رہے ہیں، فتنہ و فساد کو جڑ سے اکھاڑ رہے ہیں، سنت رسول اللہ کو زعمہ کر رہے ہیں، امن بحال کر رہے ہیں، لوگوں کا سکون اور چین لوٹا رہے ہیں۔

بہر حال اس کے باوجود میں سب لوگوں کے سامنے پوری صراحت سے اعلان کرتا ہوں کہ ہمارے اہداف وہی ہیں جن کے لیے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تھا، جن کے لیے قرآن مجید نازل کیا گیا، جن کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جہاد کیا اور انہیں خیر القرون کے زمانے میں نافذ کر کے دکھا دیا۔ یہ وہی اہداف ہیں جن کے لیے ہمارے 15 لاکھ شہداء نے اپنا خون پیش کیا۔ یاد رکھیے! ہمارا ہدف اسلام کے اس کامل نظام کا قیام ہے جو دنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کا ضامن ہے..... جو کہ کتاب و سنت کو تمام شعبوں میں نافذ کرنے پر مشتمل ہے۔“

چھ نکاتی قرارداد اور بیعت: ملا محمد عمر کی تقریر کے بعد ان کے نائب ملا محمد ربانی اور دیگر علماء نے خطاب کیا۔ اس موقع پر پانچ روزہ اجلاس کے خلاصے کے طور پر درج ذیل چھ نکاتی قرارداد منظور ہوئی:

① برہان الدین ربانی کو حکمرانی سے معزول کر کے ملا محمد عمر کو افغانستان کا حکمران چن لیا گیا ہے۔

② معزول حکومت سے جنگ جاری رہے گی۔

③ ہم اپنے پیارے وطن میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کرتے رہیں گے۔

④ غیر ملکی طاقتوں کو اپنے ملک میں مداخلت کی اجازت نہیں دیں گے۔

⑤ ملک کی سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔

⑥ مخالف دھڑوں کے تمام قیدیوں کو توبہ بنائب ہونے اور علمائے کرام کی ضمانت ملنے پر ہار دیا جائیگا۔

جلسے کے برخاست ہونے سے قبل حاضرین نے ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان میں پنجتون، ناری، ازبک، بلوچ، ترکمان اور تمام نسلی گروہوں کے عمائد اور نمائندے شامل تھے۔ بیعت کرتے اور ملا محمد عمر کو مبارکباد دیتے ہوئے بہت سے افراد کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے کہ مدتوں بعد غزنوی، غوری اور احمد شاہ ابدالی کے اجڑے ہوئے چین میں بہار آئی تھی۔

(ماخوذ از ماہنامہ الطالب، عربی۔ اپریل 1996ء)

حاضرین نے ملا عمر کے ہاتھ پر بالکل اس طرح بیعت کی جیسے اسلام کے سنہرے دور میں خلفاء و سلاطین کی بیعت کی جاتی تھی۔ اس دن سے ”امیر المؤمنین“ کا لقب ان کے نام کا جزو بن گیا۔

ملا محمد عمر کو اب عوام، علمائے کرام اور قبائلی سرداروں کا بھرپور اعتماد حاصل ہو چکا تھا۔ اجلاس کے

اختتام پر انہوں نے 15 صوبوں کے عائد کے اتفاق کے ساتھ یہ فیصلہ سنایا تھا کہ کھٹہ پٹی ربابی حکومت کے خلاف جہاد جاری رہے گا۔ علماء نے بھی اتفاق رائے سے اس جنگ کو ”جہاد“ کا نام دیا۔ قندھار کے ایک گنم جہادی رہنما کا اس طرح قدیم اسلامی طرز پر ”امیر المؤمنین“ بن جانا، دنیا کے لیے حیرت انگیز بات تھی۔ اگر یہ طرز حکومت کامیاب ثابت ہو جاتا تو ”جمہوریت“ کے وہ جال کٹتے چلے جاتے جنہیں مغربی طاقتوں نے اپنے استعماری مقاصد کے تحت عالم اسلام میں پھیلا رکھا ہے۔ افغانستان میں متعین اقوام متحدہ کے سفیر محمود مستری کو طالبان کے اس فیصلے سے اس قدر مایوسی ہوئی کہ ایک ماہ بعد انہوں نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر واپسی اختیار کر لی۔ محمود مستری کے بعد جولائی 1996ء میں جرمن سفارت کار نورٹ ہال کو افغانستان میں اقوام متحدہ کا سفیر مقرر کیا گیا۔

امریکا کی افغانستان میں دوبارہ دلچسپی: امریکا گزشتہ چار سال سے افغانستان کے مسائل سے تقریباً لائق تھا۔ کیونکہ وہاں جاری خانہ جنگی کے بعد اسے شیروں کی کچھار سے کوئی خدشہ نہیں رہا تھا مگر 4 اپریل 1994ء کو جب قندھار میں علماء و عوام کا افغانستان ملاحم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے، امریکا میں افغانستان کی صورت حال پر بڑی سرگرمی سے غور و خوض ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یکدم امریکا کی توجہ اس تباہ حال ملک پر مرکوز ہو گئی ہو۔

صرف چھ دن بعد 10 اپریل 1996ء کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ کونسل کے ارکان چھ سال بعد پہلی بار مسئلہ افغانستان پر سر جوڑ کر بیٹھے۔ اجلاس کا ایجنڈا یہ تھا کہ افغانستان میں قیام امن کے لیے وہاں بین الاقوامی مغربی امداد پر پابندی عائد کی جائے۔ جنوبی ایشیا کے لیے امریکی نمائندہ مسز رابن رائفل یہ چاہتی تھیں اس پابندی کا سہارا لے کر افغانستان کے تمام ہمسایہ ممالک کو وہاں مداخلت سے باز رکھنے پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کے فوراً بعد 19 اپریل کو مسز رابن رائفل پہلے افغانستان اور پھر وسط ایشیائی ممالک کے تین دارالحکومتوں کا طوفانی دورہ کرتی نظر آتی ہیں اور کئی افغان لیڈروں اور شخصیتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر امریکا کو یکدم افغانستان میں قیام امن سے اتنی دلچسپی کیوں کر پیدا ہو گئی؟ اس کی وجہ جاننے کے لیے ہمیں ذرا گہرائی میں جانا ہوگا۔

تیل کا سمندر اور افغانستان: امریکا اور یورپی ممالک کو اپنی صنعتی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے چند عشروں کے اندر اندر توانائی کے نئے ذخائر کی ضرورت تھی۔ ادھر سوویت یونین سے آزادی حاصل کرنے کے بعد آزاد مسلم ریاستوں ازبکستان، قازقستان اور ترکمانستان کے معدنی ذخائر کے بارے میں تازہ ترین تہملکہ خیز رپورٹوں نے مغرب کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ رپورٹوں کے مطابق ان ممالک میں

زیر زمین تیل کے بڑے بڑے سمندر اور گیس کے عظیم ذخائر محفوظ تھے۔ قازقستان میں 85 بلین بیرل، ترکمانستان میں 32 بلین بیرل جبکہ ازبکستان میں ایک بلین بیرل تیل موجود تھا۔ اس کے علاوہ ترکمانستان میں 159 ٹریلین کیوبک فٹ، ازبکستان میں 110 ٹریلین کیوبک فٹ اور قازقستان میں 88 ٹریلین کیوبک فٹ گیس مدفون تھی۔ وسطی ایشیائی ریاستیں اپنی غربت کی وجہ سے خود یہ دولت استعمال اور برآمد کرنے سے قاصر تھیں لہذا اسے فروخت کر کے اپنے مالی کمزوریوں پر قابو پانا چاہتی تھیں۔ 1994ء میں ارجنٹائن کی تیل کمپنی بریداس نے جسے ترکمانستان میں تیل اور گیس کی تلاش کی اجازت حاصل تھی، منصوبہ بنایا کہ ایک 1200 میل طویل پائپ لائن ڈالی جائے جو افغانستان اور پاکستان کے راستے بحر ہند تک پہنچے جس سے مغربی ممالک کو گیس فراہم ہوگی۔ اس کے بعد 1995ء میں امریکی تیل کمپنی ”یونوکال“ نے بھی ایسا ہی ایک منصوبہ پیش کیا جسے امریکی حکومت کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

امریکا نہیں چاہتا تھا کہ ارجنٹائن کی کمپنی اس کام میں سبقت لے جائے۔ وہ یونوکال کے لیے راستہ صاف کرنے کا خواہش مند تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ پائپ لائن کے مجوزہ تمام راستوں میں سے مختصر ترین راستہ جو افغانستان سے گزرتا تھا، خانہ جنگی کے باعث محفوظ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 1995ء میں امریکی حکومت افغانستان میں قیام امن کے لیے کسی قدر فکر مند ہو گئی تھی۔ مگر امریکا یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ قیام امن کی صورت میں وہاں کوئی اسلام پسند حکومت قائم ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے مفادات بے دین عناصر پر مشتمل ایک کٹھ پتلی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے ہی سے پورے ہو سکتے تھے۔ انہی دنوں طالبان کا ظہور ہوا جو پکے بنیاد پرست تھے۔ امریکا یقیناً ان پر احمد شاہ مسعود، ربانی اور دوسرے دھڑوں کو ترجیح دیتا تھا مگر 1995ء میں افغانستان کے نصف رقبے پر طالبان کے قبضے نے امریکا کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کہیں مستقبل قریب میں اسے بادل خواستہ ایسا کوئی معاہدہ طالبان سے کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ یہ احتمال امریکا کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ وہ ایسا سنہرا موقع بنیاد پرست طالبان کو نہیں دینا چاہتا تھا جن کے ہاں اصولوں پر لچک کا دور دور تک کوئی نام نشان نہیں تھا۔

اب جب 1996ء میں ملائیم عمر شورو کی طریقے کے مطابق امیر المومنین بے توار امریکا پر یہ مزید واضح ہو گیا کہ طالبان کو مروجہ سیاست کے جھیلوں میں الجھا کر مفادات کا غلام بنانا اور ان سے مطلب برآری کی امید رکھنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ اس نے فوری طور پر دوسرے دھڑوں کو غالب کرنے اور تیل کی دولت ہتھیلانے کے لیے انہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی افغانستان میں قیام امن کے نام پر امریکی نمایندگان کو متحرک کر دیا گیا۔ سلامتی کونسل کا اجلاس بھی اس سلسلے میں تھا اور اس کے

فوراً بعد رابن رائیل کا کابل، تاشقند اور اشک آباد کا دورہ بھی اسی مقصد کے لیے تھا۔ یاد رہے کہ اس موقع پر رابن رائیل نے کابل میں یہ معنی خیز بیان دیا تھا کہ اگر افغانستان کو سیاسی استحکام حاصل نہ ہوا تو اس ملک کی اقتصادی بحالی کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ رابن رائیل کا مدعا یہ تھا کہ قیام امن اور سیاسی استحکام کے بعد ہی پائپ لائن منصوبے کا آغاز ہو سکے گا جس سے افغانستان کو اپنی تعمیر نو کے لیے خلیفہ رقم میسر آئے گی۔ اگر اس نے یہ موقع کھو دیا تو پائپ لائن متبادل راستے سے گزاری جائے گی اور افغانستان کی اقتصادی بحالی اور تعمیر نو کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ امریکا چاہتا تھا کہ اس سفارت کاری کے ذریعے ایک طرف تو افغان متحاب دھڑوں کو متفق کر کے افغانستان میں متبادل حکومت قائم کی جائے اور دوسری طرف وسط ایشیا کی ریاستوں کو اپنی تیل کمپنیوں ”یونوکال“ اور اس متبادل حکومت افغانستان سے معاہدے پر تیار کیا جائے۔ رابن رائیل نے اس دورے میں خود طالبان سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ دوسرے امریکی سفیر جو اس موقع پر افغانستان آئے تھے، انہوں نے بھی قندھار سے زیادہ کابل پر توجہ دی حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے طالبان کو اعتماد میں لیا جاتا کیونکہ پائپ لائن کا اکثر مجوزہ راستہ انہی کے علاقوں سے گزرتا تھا۔ امریکی نمائندوں کا کابل اختتامیہ اور دیگر دھڑوں کو طالبان پر ترجیح دینا واضح کرتا ہے کہ امریکا شروع سے طالبان کو اپنا حریف اور ان کے مخالفین کو قاتل اعتماد دوست تصور کرتا تھا۔

چین اور امریکا طالبان کے مخالف اتحاد بنانے میں کوشاں: ادھر قندھار میں ملا محمد عمر کی امارت کا اعلان ہوا اور ادھر چین نے جو طالبان کے اسلامی انقلاب سے شدید خطرہ محسوس کر رہا تھا، افغانستان اور وسط ایشیا میں اسلامی تحریکوں کے غلبے کا راستہ روکنے کے لیے اپریل 1996ء میں ”شنگھائی 5“ کے نام سے ایک اتحادی قائم کر لیا جس میں روس، تاجکستان اور وسط ایشیا کے دیگر ممالک شامل ہو گئے۔ امریکا پہلے ہی طالبان مخالفین کو گلے لگانے پر آمادہ تھا۔ اس نے طالبان کے سوا تمام گروہوں کے سربراہوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ کئی لیڈروں نے خود واشنگٹن جا کر امریکی قیادت سے ساز باز کی۔ ملا محمد عمر کے امیر المؤمنین بننے کے صرف ایک مہینے بعد 11 مارچ 1996ء کو رشید دہم واشنگٹن میں امریکی افسران سے ملاقات کرنا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے افغان لیڈروں یا ان کے سفیروں نے 25 جون کو امریکی ارکان کانگریس سے ملاقاتیں کیں۔ اس گلے جوڑ کے نتیجے میں 26 جون کو ایک بار پھر کابل میں نیا حکومتی ڈھانچا وجود میں آیا۔ اس بار بھی برہان الدین ربانی صدر اور حکمت یار وزیر اعظم تھے۔ البتہ نئی بات یہ تھی کہ حکمت یار 15 برس میں پہلی بار کابل میں داخل ہوئے اور ان کے 9 رفقاء کار ربانی کی کابینہ میں شامل ہو گئے۔ عوام کو شک تھا کہ یہ نئی حکومت خفیہ طور پر

امریکا کی پروردہ ہے۔ اس کامیابی کے فوراً بعد صدر ربانی نے جلال آباد جا کر وہاں کی شورشی کو بھی کابل حکومت میں شمولیت کی دعوت دی جو قبول کر لی گئی۔

طالبان کی یلغار کے نئے زاویے: یہ اگست 1996ء کے ایام تھے۔ طالبان کے دارالحکومت قندھار میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ ملا محمد عمر اور ان کے رفقاء طویل مشوروں میں مصروف تھے۔ طالبان کے لیے اب آگے بڑھنا ناگزیر تھا۔ ان کی یلغار جسے سیلاب سے تشبیہ دی جاتی تھی تقریباً ایک سال سے رکی ہوئی تھی۔ ستمبر 1995ء میں ہرات پر قبضے کے بعد سے ان کے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔ جو مہرین سال گزشتہ کابل کو طالبان کے لیے ترنوالہ قرار دیتے تھے، اب برملا کہتے تھے کہ طالبان تحریک اپنی طبعی وسعت کی حد تک پھیل چکی ہے۔ یہ پختونوں کی تحریک ہے جسے مزید فتوحات حاصل نہیں ہوں گی۔ اس وقت کابل انتظامیہ سے حزب اسلامی، دوستم کی جنبش ملی اور حزب وحدت کے اشتراک کے بعد گویا طالبان کے تمام مخالف ایک صف میں تھے اور مشترکہ خطرے سے مدافعت کے لیے یک جان ہو چکے تھے۔ دوستم نے جو 11 اپریل کو واشنگٹن میں امریکی افسران سے ملا تھا، اس مہینے (اگست 1996ء میں) کابل کے شمال میں شاہراہ سالانگ کو کھول دیا تھا اور یوں مدتوں بعد کابل کا شمالی افغانستان سے زمینی راستہ بحال ہو گیا تھا۔ طالبان یہ سب کچھ نہ صرف دیکھ رہے تھے بلکہ کابل پر آخری ضرب لگانے میں مزید تاخیر نہ کرنے کا بھی فیصلہ کر چکے تھے۔



مآخذ و مراجع

بیتسوال باب

فتح کابل اور سانحہ مزار شریف

جلال آباد مسخر ہو گیا: اگست 1996ء کے آخری عشرے میں طالبان کی افواج جلال آباد کی طرف بڑھنے لگیں۔ جلال آباد کی شوروی کے سربراہ حاجی عبدالقدیر کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ طالبان کابل کی بجائے جلال آباد کو زیادہ اہمیت دیں گے۔ مگر طالبان کے سربراہ ملا محمد عمر کی عسکری منصوبہ بندی یہی تھی کہ پہلے جلال آباد پر قبضہ کیا جائے اور اس کے بعد کابل پر کئی اطراف سے یلغار کی جائے۔

10 ستمبر 1996ء کو طالبان ننگر ہار کے دو اضلاع پر قابض ہو چکے تھے۔ حاجی عبدالقدیر نے طالبان سے مقابلہ نامکن خیال کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی اور پاکستان میں پناہ لے لی۔ تاہم اس کے نائب، گورنر محمود نے طالبان سے شدید جنگ جاری رہی۔ طالبان کے حوصلے بلند تھے۔ انہیں مقامی عوام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس لیے وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ 11 ستمبر کو وہ جلال آباد کے باہر کھڑے تھے، گورنر محمود نے شکست سامنے دیکھی تو جان بچانے کی خاطر پاکستان جانے والی شاہراہ پر بھاگ نکلا مگر طالبان نے تعاقب کر کے اسے اس کے چھ محافظوں سمیت قتل کر دیا۔ غروب آفتاب سے پہلے طالبان کے فاتح دستے مابور جان کی زیر قیادت جلال آباد میں داخل ہو رہے تھے۔ ناقابلِ تسخیر جلال آباد طالبان کے سامنے سرنگوں ہو چکا تھا۔

جلال آباد میں طالبان پہلی بار عرب مجاہدین کے عالمی شہرت یافتہ لیڈر شیخ اسامہ بن لادن سے ملے۔ اسامہ بن لادن کچھ دنوں پہلے ہی صومالیہ سے افغانستان پہنچ کر جلال آباد میں قیام پذیر تھے۔ ان کے اس سے پہلے طالبان سے کوئی روابط نہیں تھے۔ جلال آباد کی فتح کے بعد طالبان نے ان کا بھرپور اعزاز و اکرام کیا اور انہیں ہر قسم کے مطلوبہ تعاون اور تحفظ کا یقین دلایا۔ شیخ اسامہ بھی طالبان سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کے بارے میں ان کے سابقہ خدشات دور ہو گئے۔

ننگر ہار اور کنڑ کی فتح: طالبان نے کابل کی طرف بڑھنے سے پہلے ایک بار پھر گرد و پیش پر گرفت

مضبوط کرنا ضروری سمجھا۔ تین مشرقی صوبے ننگر ہار، کنڑ اور پغمان اب تک ان کی عملداری سے باہر تھے۔ طالبان نے اس مہم میں زیادہ وقت صرف نہیں کیا۔ ایک ہفتے کے اندر یہ تینوں صوبے ان کے قبضے میں آ گئے۔ کنڑ میں علمائے اہل حدیث کی سرکردگی میں قائم اسلامی حکومت جس کے بانی مولانا جمیل الرحمن کو کچھ مدت قبل پراسرار انداز میں شہید کر دیا گیا تھا، طالبان کی آمد پر تحلیل ہو گئی اور کنڑ طالبان کی عملداری میں شامل ہو گیا۔ غرض کنڑ، ننگر ہار اور پغمان کے عوام کی حمایت کے باعث طالبان بہت جلد ان علاقوں کی مہم سے فارغ ہو گئے۔

سروبی کی طرف: اب ان کا یقینی ہدف کابل تھا۔ فلک بوس پہاڑوں میں گھرا ہوا افغان حکمرانوں کا یہ دار الحکومت ہمیشہ فاتحین کی اولوالعزیز کا امتحان لیتا آیا ہے۔ اب یہی امتحان طالبان کو درپیش تھا جو ہر قیمت اسے فتح کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ 24 ستمبر 1996ء کو طالبان "سروبی" کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پہاڑوں کی آغوش میں واقع یہ شہر کابل کی تحصیل ہے۔ یہ دفاعی اعتبار سے اتنا محفوظ ہے کہ یہاں عموماً ہوائی حملے بھی ناکام رہتے ہیں۔ اگر طالبان جلال آباد پر قابض نہ ہو چکے ہوتے تو سروبی پر حملہ کرنا تقریباً ناممکن تھا مگر اب طالبان جلال آباد سے سروبی پر عقب سے حملہ کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود یہ مہم نہایت خطرناک تھی۔ سروبی کی بل کھاتی شاہراہ جو دونوں طرف سے پہاڑی دیواروں میں گھری ہوئی ہے کسی بھی حملہ آور کا حوصلہ توڑنے کے لیے کافی ہے۔ اس شاہراہ پر بڑی سے بڑی فوج کو چند سو موٹر چرن افراد کی مدد سے پسپا کیا جاسکتا ہے۔ حزب اسلامی نے گزشتہ سال چہار آ سیاب سے پسپائی کے بعد اپنی تمام طاقت اور اسلحہ سروبی میں جمع کر لیا تھا۔ یہاں اس کی پوزیشن بے حد مضبوط تھی۔ پھر سروبی سے لے کر پل چرخی تک تمام موڑے اور چوکیاں حزب اسلامی کے اس مرکز کو مزید تحفظ فراہم کرتی تھیں۔ اس لیے کسی کو توقع نہیں تھی کہ طالبان آسانی سے سروبی کی دفاعی لائن عبور کر سکیں گے۔

طالبان سربراہ کی حکمت عملی: مگر طالبان سربراہ ملا محمد عمر کی جنگی حکمت عملی حیران کن تھی۔ وہ وائرلیس پر مسلسل اپنی افواج کو ہدایات دے رہے تھے۔ 24 ستمبر کو جب طالبان سروبی کے لیے پایہ رکاب ہوئے تو افواج کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ایک طرف سے ہرات کے گورنر ملا عبدالرزاق اپنی فوج کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے جس کے ہراول دستہ کی کمان نامور طالبان کمانڈر ملا بورجان کے ہاتھ میں تھی اور دوسری سمت سے، ملا فضل بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اُدھر حزب اسلامی کے جنگجو سروبی کے فارغ کے لیے پوری طرح کمر بستہ تھے۔

ملا بورجان کی شہادت: ملا بورجان جب ہراول دستے کے ساتھ سروبی کی سرنگ نما شاہراہ کے دہانے

میں داخل ہوئے تو ہر طرف سے گولوں، بموں اور گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ حریف بلندی پر تھا اور طالبان نشیب میں کھلی سڑک پر..... جہاں چھپ کر مورچہ زن ہونا ناممکن تھا مگر ملا بور جان نے طالبان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی۔ پریچ پہاڑی شاہراہ کے ایک موڑ پر ملا بور جان جو سب سے آگے جا رہے تھے جوابی حملے کی زد میں آ کر شدید زخمی ہو گئے۔ اس حالت میں بھی انہوں نے طالبان سے کہا: ”میری پروا نہ کریں..... آگے بڑھتے جائیں۔“

چند لمحوں بعد ملا بور جان نے دم توڑ دیا۔ ملا عبدالرزاق فوراً وہاں پہنچے، نقش کو کپڑے سے ڈھانکا اور شاہراہ کے کنارے ڈال دیا۔ بعد میں یہی جگہ ان کا مقبرہ بن گئی۔ اس مقام کو ”ریشمین مکتے“ کہا جاتا ہے۔

34 سالہ ملا بور جان طالبان کے نہایت مقبول، تجربہ کار اور ہر دلعزیز کمانڈر تھے۔ ان کی قیادت میں طالبان نے بڑے بڑے معرکوں میں شاندار فتوحات حاصل کی تھیں۔ وہ سترہ سال کی عمر میں جہاد افغانستان میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کی تمام زندگی معرکوں میں گزر گئی۔ ان کی شہادت کی خبر کو چھپایا گیا کیوں کہ اس سے حریف کی ہمت بلند ہو جاتی جبکہ طالبان بد دل ہو سکتے تھے۔

سروبی کی اس تنگ اور پریچ گھاٹی میں جان کی قربانی دے کر ملا بور جان نے فتح کابل کی بنیاد رکھ دی۔ ان کی کمان میں پیش قدمی کرنے والے طالبان اپنے قائد کے نقش قدم پر دوڑتے رہے، گرتی لاشوں اور زخمیوں کی پروا کیے بغیر وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ طالبان کی اس محیر العقول بے جگری نے حریف پر حد درجے دہشت طاری کر دی۔ اس دوران حزب اسلامی کے کمانڈروں کو یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ملا فضل کی قیادت میں ایک اور لشکر بھی سروبی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حزب کے کمانڈروں کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر طالبان اس طرح آگے بڑھتے رہے تو کچھ دیر بعد ان کے لیے کوئی جگہ فراہم نہیں رہے گی۔ اس صورت حال میں کئی کمانڈروں نے ہتھیار ڈال دیے اور طالبان سے جا ملے جبکہ بقیہ فوری طور پر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

سروبی فتح ہو گیا: اس شام دنیا بھر کے نشریاتی ادارے خبریں نشر کر رہے تھے کہ طالبان سروبی پر قبضہ کر چکے ہیں اور حزب اسلامی کی فوجیں پسپا ہو کر کابل کی طرف چلی گئی ہیں۔ گزشتہ سال جب حزب اسلامی نے اسی طرح طالبان کے مقابلے میں اپنے مضبوط مراکز لوگر اور چہار آسیاب کو خالی کر دیا تھا تو تب اس پسپائی کی کچھ توجیہات قابل فہم تھیں مثلاً حزب اسلامی نے اس طرح اپنی طاقت کو سروبی میں مجتمع اور محفوظ کر لیا ہے مگر سروبی سے حزب اسلامی کی پسپائی کو شکست فاش کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حزب اسلامی کے کئی کمانڈر طالبان سے جا ملے تھے۔ جس کے باعث

بانی کمانڈروں کے لیے دیرینک لڑنا ممکن نہیں رہا تھا۔

25 ستمبر 1996ء کو جب ملا عبدالرزاق اور ملا فضل اپنی افواج کے ساتھ دو طرفہ یلغار کرتے ہوئے سروبی میں جمع ہوئے تو یہ علاقہ حزب اسلامی کے جنگجوؤں سے خالی ہو چکا تھا۔ اب طالبان کمانڈروں کی چابھیں کامل پر مرکوز تھیں جو سروبی سے صرف 45 میل دور تھا۔ طالبان نے کامل کی دہلیز عبور کر لی تھی۔ اب وہ کئی اطراف سے دارالحکومت پر بھرپور حملہ کر سکتے تھے۔ ربانی انتظامیہ حوصلہ ہار چکی تھی، احمد شاہ مسعود کی عسکری مہارت دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ آخری اُمید کے طور پر اس نے شمالی افغانستان کے آمر رشید دوستم سے رابطہ کر کے کمک طلب کی۔ رشید دوستم نے مسعود کو مشورہ دیا: ”آپ سر دست کامل کو خالی کر دیں۔ میں بعد میں آپ کے شانہ بشانہ لڑوں گا۔۔۔۔۔ لیکن اگر آپ نے کامل میں ڈٹے رہنے کا فیصلہ کیا تو میں کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔“

ربانی انتظامیہ کا اجلاس، انخلا کا فیصلہ: اسی دن 25 ستمبر کو صدر ربانی کی صدارت میں اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا۔ وزیراعظم حکمت یار سمیت بڑے بڑے طالبان مخالف لیڈر سر جوڑ کر بیٹھے مگر انہیں دارالحکومت کو بچانے کی کوئی صورت سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا کھیل کی تمام گولیاں طالبان کے پاس ہیں۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ فوری طور پر کامل کو خالی کر دیا جائے، افواج اور گولہ بارود کے ذخائر محفوظ علاقوں میں منتقل کر دیے جائیں، بعد میں طالبان کو جنگ یا مذاکرات کے ذریعے رام کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

ربانی اور مسعود کا کامل سے فرار: کامل انتظامیہ طالبان سے اس حد تک مرعوب ہو چکی تھی کہ اس نے شہر کا دفاع کرنے کا خیال بالکل ترک کر دیا اور فیصلے کے فوراً بعد اپنی افواج، خزانہ اور اسلحے کے ذخائر شمالی علاقوں کی طرف منتقل کرنا شروع کر دیے۔ 25 ستمبر کی شام کو یہ کارروائی شروع ہوئی اور نہ صرف رات بھر بلکہ اگلی صبح سے دوپہر تک پوری سرعت سے جاری رہی۔ احمد شاہ مسعود نے فوجیوں کے چھوٹے چھوٹے دستے مختلف مقامات پر صرف اس لیے تعینات کر دیے تھے تاکہ وہ طالبان کی ناقابل مزاحمت یلغار کی رفتار سے گزرنے کی کوشش کریں اور اس دوران انخلاء کا عمل مکمل ہو جائے۔

سروبی سے پل چرخی تک: ادھر طالبان سروبی میں دم لینے کے بجائے نہایت برق رفتاری سے کامل کے لیے پیش قدمی شروع کر چکے تھے۔ مشرق سے آنے والی افواج ایک بار پھر ملا فضل اور ملا عبدالرزاق کی کمان میں، دو حصوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ راستوں سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سروبی کی فتح کے بعد کامل کا مشرق بالکل کھلا تھا۔ اس لیے اب آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ طالبان کی فوج کا ایک حصہ سروبی سے شمال میں بگرام ایرپورٹ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا تاکہ حریف کو فضائی قوت سے محروم کر دے۔ ایک اور

فوج جنوب سے کابل پر حملہ آور تھی مگر یہاں راستہ مختصر ہونے کے باوجود آگے بڑھنا خاصا مشکل تھا کیونکہ بہترین دفاعی مورچے حریف کے پاس تھے اور جگہ جگہ بارودی سرنگوں کے جال بچے تھے۔ ملا فضل اور ملا عبدالرزاق کی افواج الگ الگ راستوں سے ہوتے ہوئے دو پہر تک پل چرخی پہنچ کر باہم مل گئیں۔ ملا محمد عمر دائر لیس پر پل پل کی خبریں لے رہے تھے اور براہ راست ہدایات دے رہے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ اصل حملہ پل چرخی کی طرف سے ہو جبکہ بقیہ اطراف سے صرف دباؤ بڑھانے کے لیے حملے کیے جائیں۔

ربانی کا جھوٹا بیان: ملا عبدالرزاق پل چرخی سے طالبان کی قیادت کرتے ہوئے آگے بڑھے تو ایک ساتھی نے کہا: ”کیوں فیصلہ کن حملہ رات کو کیا جائے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ کابل کو دن کے اُجالے میں فتح کرنا بے حد مشکل ہے۔“

مگر حوصلہ مند کمانڈر نے اسے اطمینان دلایا کہ اللہ کی مدد دھرت سے سب کچھ دن کی روشنی میں ہو جائے گا۔ جب کابل کا ایوان صدر چار پانچ کلومیٹر دور رہ گیا تو ملا عبدالرزاق نے ریڈیو آن کر کے بی بی سی سروس سننا شروع کی۔ صدر ربانی اور وزیراعظم حکمت یار انٹرویو دے رہے تھے کہ ہم کابل میں موجود ہیں اور خون کے آخری قطرے تک کابل کا دفاع کریں گے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ دونوں لیڈر کب کے دارالحکومت سے فرار ہو چکے تھے۔

طالبان کابل میں: لشکر طالبان جو ملا عبدالرزاق کے بارہ تیرہ سو افراد پر مشتمل تھا، دن کے تقریباً ایک بجے فاتحانہ انداز میں، کئی اطراف سے کابل میں داخل ہوا۔ شہر میں کسی قسم کی مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ احمد شاہ مسعود کے متعین کردہ مختصر دستے گولہ بارود کے بچے کچھ ذخائر تباہ کرنے کے بعد شمال کی طرف فرار ہو چکے تھے۔ یہ 26 ستمبر 1996ء کا واقعہ ہے۔ طالبان کی اس شاندار فتح کے بارے میں لندن کے ”نئی گراف“ اخبار کے نمائندے احمد رشید لکھتے ہیں: ”طالبان کی فتح ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ حکومت یا اپوزیشن میں سے کسی نے اتنے بڑے عرصہ جنگ میں، اس سرعت رفتار سے اتنی پیچیدہ نوعیت کی جنگی چالیں کبھی نہیں چلی تھیں۔“

نجیب پر راہ فرار مسدود: طالبان کے کئی جو شیلے نو جوان قندھار سے عہد کر کے چلے آئے تھے کہ وہ کابل میں داخل ہوتے ہی ہزاروں افغان مسلمانوں کے قاتل سابق صدر نجیب کو تلاش کریں گے اور اگر وہ مل گیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ 1992ء سے نجیب اللہ کابل میں اقوام متحدہ کی عمارت میں مقیم تھا۔ طالبان کے کابل میں داخلے کے وقت بھی وہ وہیں تھا۔ یہ بظاہر بڑی عجیب بات تھی کیونکہ اس کے پاس فرار ہونے کا خاصا وقت تھا۔ وہ احمد شاہ مسعود اور ربانی کی طرح آرام سے کسی محفوظ جگہ پہنچ سکتا تھا۔ مگر اللہ کی لاشی

بے آواز ہے۔ قدرت کی گرفت سے کسی کوراہ فرار نہیں مل سکتی۔ نجیب اللہ کے فرار کے انتظامات مکمل تھے۔ سروبی پر طالبان کا قبضہ ہوتے ہی نجیب نے اسلام آباد میں اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر فون کر کے اقوام متحدہ کے نمائندے ”فورٹ ہال“ سے اجیل کی تھی کہ اسے، اس کے بھائی شاہ پور احمد اور سیکرٹری کو کاہل سے باہر لے جانے کا انتظام کر دیا جائے۔ اس اجیل کے جواب میں طالبان کے کاہل میں داخلے سے چند گھنٹے پہلے اقوام متحدہ کے نمائندے بن سیوان نے نجیب کو بحفاظت شہر سے لے جانے کی تیاریاں کر لی تھیں مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر آخری لمحات تک نجیب کو لینے کوئی گاڑی اور سیکورٹی نہ پہنچ سکی۔ اس موقع پر احمد شاہ مسعود نے نجیب کو پیش کش کی کہ وہ اس کے تاجک سپاہیوں کے ساتھ شہر سے نکل چلے مگر نجیب کو جو نلا پختون تھا، تاجکوں کے ساتھ جانا خطرناک لگا۔ اسے انجانے خدشات نے گھیر لیا۔ درحقیقت خدائی ارادہ اور قسمت کا فیصلہ اس کے قدموں کی زنجیر بن گیا تھا، اس نے تاجکوں کے ساتھ نکلنے سے انکار کر دیا۔ تاجکوں سے زیادہ اسے ان تین محافظوں پر بھروسہ تھا جو اقوام متحدہ نے اس کے لیے مقرر کر رکھے تھے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ طالبان شہر میں داخل ہو گئے۔ فائرنگ کی آوازیں کرتیوں محافظ نجیب کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ چند منٹ بعد طالبان کا ایک کمانڈر 35 افراد کے ساتھ اقوام متحدہ کے دفتر کے باہر پہنچ گیا۔ یہ طالبان کا پہلا دستہ تھا جو کاہل میں داخل ہوا تھا۔

نجیب کا عبرتناک انجام: کمانڈر نے افسر اعلیٰ ملا عبدالرزاق سے وائس پریس پر بات کی اور نجیب کو تلاش کرنے کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر وہ دفتر میں داخل ہو گیا جہاں 50 سالہ نجیب تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کمانڈر نے ملا عبدالرزاق کو نجیب کی موجودگی کی اطلاع دے کر پوچھا کہ اب کیا حکم ہے؟ جواب ملا: ”قتل کر دیا جائے۔“

آنا فانا چند طالبان اندر گھسے اور نجیب کو گھسیٹے ہوئے باہر لے آئے۔ یہاں اسے لائیں اور گھونے مارنے کے بعد گولیوں سے بھون دیا گیا۔ کمانڈر نے ملا عبدالرزاق سے دوبارہ رابطہ کر کے لاش کو عبرت کے لیے ”ام لٹکانے کی اجازت“ آگئی۔ اثبات میں جواب ملنے پر نجیب کا لاش ترقی چوراہے ”آریانہ چوک“ پر ٹریڈ: کنٹرول: کے کھمبے سے لٹکا دیا گیا۔ اس کے بھائی کا بھی یہی انجام ہوا۔ دونوں کی لاشیں لٹکانے کے بعد ان کی جیبوں میں افغان نوٹ بھر دیے گئے۔ یہ وہی نوٹ تھے جن کے لیے ان ملت فروشوں نے افغان قوم کو ان کے مذہب سے برگشتہ کرنے اور سودیت یونین کا غلام بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے رحمی سے تڑپا تڑپا کر مارنے والا ”خاد“ کا سر براہ آج اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا۔ طالبان دن کے ڈیڑھ بجے اقوام متحدہ کے دفتر پہنچے تھے۔ آدھے گھنٹے کے

اندروہ نجیب اللہ کو چوک پر لٹکا چکے تھے۔ 2 بجے ملا عبدالرزاق نے طالبان سربراہ کو وائزلیس پر فتح کا بل کی خوشخبری دی۔ ملا محمد عمر نے جواباً کہا: ”آپ سب کو مبارک ہو کہ اتنا عظیم کارنامہ انجام دیا۔“

کابل میں اسلام نافذ، مکمل امن و امان، عام معافی: کابل کی فتح کے فوراً بعد طالبان نے یہاں خالص اسلامی احکام کا نفاذ کر دیا۔ شرعی حدود و قصاص کے قوانین لاگو کر دیے گئے۔ ٹی وی اسٹیشن بند کر دیا گیا۔ ”ریڈیو کابل“ کو ”ریڈیو صدائے شریعت“ کا نام دے کر موسیقی اور بے مقصد پروگراموں کو ختم کر دیا گیا۔ جسم فردوشی، سینما، ڈس انشینا، عورتوں کے بے پردہ گھومنے، گانے بجانے، رقص و سرود اور اخلاق باختگی کا محرک بننے والے تمام عوامل پر پابندی لگا دی گئی۔

کابل کی فتح بلاشبہ ایک مثالی فتح تھی۔ اتنے بڑے معرکے میں خون ریزی برائے نام ہی ہوئی۔ طالبان کے صرف 15، 16 جوان کام آئے جبکہ حریف افواج فرار ہو گئی تھیں۔ طالبان نے شہر میں داخل ہونے کے بعد بھرے پڑے بازاروں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ کسی دکان یا ریڑھی سے ایک دانہ تک نہیں لوٹا۔ نجیب کو اسلام دشمنی اور مسلمانوں کا بے دریغ خون بہانے کی جو اورائے عدالت سزا ملی، سو ملی، مگر اس کے علاوہ طالبان نے کسی شہری کو زور و کوب تک نہ کیا۔ کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ حالانکہ سپاہی فتوحات کا جشن عموماً اس طرح منایا کرتے ہیں کہ چند دنوں تک مفتوحین کی عزت و آبرو اور جان و مال کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ خود طالبان کے مخالفین کا اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہی طریقہ رہا مگر طالبان کی فتح مکمل طور پر پُر امن تھی۔ طالبان سربراہ نے اعلان کر دیا کہ کابل کے تمام باشندوں کو چاہے ان کا ماضی کیسا ہی ہو، عام معافی دی جاتی ہے۔ اس اعلان نے عوام کو بالکل مطمئن کر دیا اور 24 گھنٹے کے اندر اندر کابل کی تمام روٹیں لوٹ آئیں۔

اغیار کی گواہی: مغربی میڈیا کے نمائندے ان دنوں بڑی تعداد میں کابل پہنچ چکے تھے۔ وہاں مقامی لوگوں کا اطمینان و سکون دیکھ کر انہیں حیرت کے ساتھ ساتھ مایوسی بھی ہوئی۔ وہ طالبان کے مظالم کے فرضی افسانے گھڑنے وہاں آئے تھے مگر ایسا کوئی ثبوت ان کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ نامور برطانوی مصنفہ ”پیٹر مارسڈن“ نے اس زمانے میں افغانستان کا دورہ کیا اور پھر اپنی مشہور کتاب ”TALBAN“ (طالبان) تحریر کی۔ اس کتاب میں طالبان پر ناروا الزامات عائد کرنے کے باوجود وہ تسلیم کرتی ہیں کہ طالبان امن و سلامتی کی علامت بن گئے تھے۔ وہ کابل کی فتح کے بارے میں تحریر کرتی ہیں:

”اس مرحلے پر کابل کے لوگ دارالحکومت کے محاصرے کے مزید طویل ہونے سے ہراساں تھے۔ بہت سے لوگ اپنی ضرورت کی بنیادی اشیاء بھی فروخت کر چکے تھے اور انتہائی غربت کی

حدود کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس لیے جب طالبان وہاں پہنچے تو لوگوں کو کافی سکون ملا اور اُمید پیدا ہوئی کہ امن بحال ہوگا اور مقامی معیشت کی بہتری کے امکانات پیدا ہوں گے۔ یہ بھی یاد رہے کہ لوگوں کے درمیان پائے جانے والے اس خیال سے ربانی اور مسعود بھی آگاہ تھے اور شاید کابل کے آخری ایجنٹ تک نہ لڑنے کے فیصلے میں یہی ایک عنصر کارفرما تھا۔“ (یعنی انہیں عوامی حمایت سے محرومی نے اخلا پر مجبور کر دیا تھا۔)

طالبان کی شرافت کا اعتراف کرتے ہوئے پیٹر مارٹنسن نے لکھا ہے:

”یہ حقیقت ہے کہ طالبان کسی علاقے پر قابض ہونے کی صورت میں لوٹ مار، زنا بالجبر یا بلا جواز تباہی نہیں کرتے تھے۔“

مغربی میڈیا کا شرمناک کردار: مگر اکثر مغربی نامہ نگاروں کو سچ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ان میں سے اکثر طالبان کے بارے میں حتی الامکان جھوٹی باتیں پھیلاتے رہے اور جن کا خمیر اس پر آمادہ نہ ہوا وہ بھی حقائق واضح کرنے کی بجائے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ پاکستانی صحافی اور پندرہ روزہ ”جہاد کشمیر“ کے نامہ نگار حسن احمد ان دنوں کابل میں گئے تھے، وہ لکھتے ہیں:

”کابل میں عام لوگوں میں طالبان کے بارے میں اطمینان پایا جاتا ہے سوائے چند اقدامات کے جن میں نجیب اللہ کو گولی مارنا اور اس کی لاش کی بے حرمتی کرنا بھی شامل تھا۔ (چونکہ کابل کے باشندوں کی خاصی تعداد کمیونسٹوں پر مشتمل تھی اس لیے وہ لوگ طالبان کی اس حرکت سے ناراض تھے۔ یہی رد عمل پاکستان سمیت دنیا بھر کے کمیونسٹوں اور ماڈرن مسلمانوں کا تھا) مگر مغربی صحافی حقیقت کے بالکل برعکس رپورٹنگ کرتے ہیں۔ مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ اتنے جدید دور میں اتنی صفائی سے کیسے جھوٹ بولا جاسکتا ہے؟ مغربی صحافی کہہ رہے تھے لوگوں کو مارا جا رہا ہے۔ خواتین کو گھسیٹا جا رہا ہے..... مگر مجھے اس کے شواہد نہیں ملے۔ انہوں نے طالبان کے وزراء کی پریس کانفرنسوں میں بھی ایسے سوالات کیے جن کی تردید ہوئی مگر مغربی پریس والوں کا رویہ معاندانہ ہی نہیں جانبدارانہ بھی ہے۔ ایک انگریز صحافی ”مسٹر ایکس“ میرے ساتھ جرمن کلب میں مقیم تھا۔ وہ میرے ساتھ مارا مارا پھرتا رہا۔ پریس کانفرنسوں میں بھی ساتھ گیا۔ لوگوں نے اسے کہا کہ کابل میں امن ہے اور ہم امن چاہتے ہیں۔ خواتین پر پابندیوں پر بھی عوام میں کوئی احتجاج نظر نہ آیا۔ تو ایکس نے مایوس ہو کر مجھ سے کہا: ”اب تم ہی بتاؤ میں کیا رپورٹ کروں؟ اس میں میرے لیے کیا ہے؟“ میں نے کہا: ”تم صحافی ہو۔ تم نے جو سنا اور دیکھا ہے، وہ رپورٹ

کرو۔ صحافی دیانت داری کا تقاضا تو یہی ہے۔“ اس پر وہ بولا: ”نہیں بھائی! میں یہاں اس لیے نہیں آیا تھا۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ لوگوں سے معلوم کروں کہ وہ طالبان سے کتنی نفرت کرتے ہیں؟ طالبان بنیاد پرست اور انتہا پسند ہیں اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر (میرے پاس لکھنے کو) کچھ نہیں۔“

قارئین! اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ طالبان کے بارے میں مغربی میڈیا شروع سے کس قدر متعصبانہ رپورٹنگ کر رہا تھا۔

دارالحکومت قندھار ہی رہا: کامل کا انتظام سنبھالنے کے لیے ایک چھوٹی شوری قائم کر دی گئی۔ اس کے سربراہ ملامحمد ربانی تھے جن کا مرتبہ وزیراعظم کا ساتھ تھا۔ ملا غوث وزیر خارجہ اور ملا امیر خان متقی وزیر اطلاعات مقرر ہوئے۔ عام خیال یہ تھا کہ فتح کامل پر طالبان اور طالبان سربراہ ملامحمد عمر تاجخی جشن سرت منائیں گے مگر طالبان سربراہ کا تبصرہ صرف اتنا تھا: ”کامل بھی دیگر صوبوں کی طرح ایک صوبہ ہے، باقی صوبوں کی طرح وہاں بھی شریعت نافذ کریں گے۔“

یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر کامل فتح ہونے کے 24 گھنٹے کے اندر اندر وہاں اسلامی نظام نافذ ہو گیا۔ کامل فتح ہو گیا مگر قندھار کے بورنیہ نشین حکمران نے وہاں کا دورہ نہ کیا۔ دارالحکومت بدستور قندھار ہی رہا حالانکہ مصرین گمان کر رہے تھے کہ ملامحمد عمر فوراً بڑے طمطراق سے افغانوں کے روایتی دارالحکومت کو اپنا مرکز بنائیں گے۔ کئی دنوں بعد رفقہ نے درخواست کی: ”کامل کو آکر دیکھیں تو سہمی..... کیا شہر ہے جہاں ساہا سال اقتدار کی جنگ ہوتی رہی۔“ مگر اس کے باوجود طالبان سربراہ کامل کا دورہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ ہاں کچھ دنوں بعد جب کامل پر احمد شاہ مسعود نے حملہ کیا تب وہ اپنے رفقہ کے کہنے پر اگلے مورچوں کے مجاہدین کی ہمت بڑھانے کے لیے پہلی بار کامل گئے اور محاذ پر کچھ وقت گزار کر سیدہ حاتمہ ہارواہی ہو گئے۔ ساتھیوں کی فرمائش کے باوجود انہوں نے کامل شہر اور قصر صدارت وغیرہ کی سیر کرنا گوارا نہ کیا۔

رشید دوستم سے یالا: کامل پر قبضے کے بعد ایک ہفتے کے اندر اندر طالبان کی افواج شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے جبل السراج تک پہنچ گئی تھیں جبکہ احمد شاہ مسعود شاہراہ سالانگ تک پیچھے ہٹتے ہٹتے وادی پنج شیر میں داخل ہو گیا تھا۔ طالبان اس کے تعاقب میں رہے مگر وہ وادی پنج شیر میں داخل نہ ہو سکے۔ جب وہ سالانگ شاہراہ کے گرد و افواج میں مختلف دیہاتوں پر قبضہ کرتے ہوئے دڑہ سالانگ تک پہنچے تو دڑے پر قابض رشید دوستم کی افواج نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس وقت تک یہ واضح

نہیں تھا کہ رشید دوستم اب کس کا ساتھ دے گا۔ طالبان رہنما ملا محمد ربانی نے دوستم کو غیر جانبدار بنانے کے لیے 8 اکتوبر کو اس سے گفت و شنید کی جو ناکام رہی۔ دراصل دوستم شمال کی بے تاج بادشاہت کا دعوے دار تھا اور یہ حیثیت طالبان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔

دوستم اور احمد شاہ مسعود کا مشترکہ حملہ: جب دوستم کو یقین ہو گیا کہ طالبان سے اسے اپنے اغراض حاصل نہیں ہوں گی تو اس نے احمد شاہ مسعود اور ربانی سے اتحاد برقرار رکھنے کو ترجیح دی۔ 10 اکتوبر کو اس نے اہم ایک اجلاس میں شرکت کی جس میں احمد شاہ مسعود، برہان الدین ربانی اور کریم خللی موجود تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ طالبان سے مزاحمت کے لیے سب مل کر لڑیں گے۔ اس مقصد کے لیے ایک ”سپریم کونسل“ قائم کر دی گئی اور طالبان مخالف قوتیں ایک بار پھر شانہ بٹانہ کھڑی ہو گئیں۔ عسکری قیادت اب بھی احمد شاہ مسعود کے ہاتھ میں تھی جو پنج شیر کی فلک بوس چوٹیوں سے طالبان کو کاٹل اور دروازہ سالانگ کے درمیان تیزی سے پھیلنا دیکھ رہا تھا۔

مسعود نے ان کی یہ کمزوری فوراً نوٹ کی کہ اگرچہ طالبان اس طرح زیادہ سے زیادہ رقبے پر قابض ہو رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ ان کی قوت بکھرتی جا رہی ہے اور ان کا کوئی مورچہ زیادہ مضبوط نہیں رہا ہے۔ مسعود کے پاس پندرہ بیس ہزار تجربہ کار جنگجو تھے۔ ان کی مدد سے اس نے 12 اکتوبر 1996ء کو سالانگ شاہراہ کے ساتھ ساتھ طالبان کے دفاعی خطوط پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ طالبان اس کی تاب نہ لائے اور درجنوں لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹنے چلے گئے۔ مسعودی ملیشیا نے آگے بڑھتے بڑھتے 18 اکتوبر کو بگرام ایرپورٹ پر دوبارہ قابض ہو کر کاٹل پر اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ احمد شاہ مسعود کی توپیں بگرام ایرپورٹ سے کاٹل ایرپورٹ کو نشانہ بنارہی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ زمینی پیش قدمی کر کے طالبان کو مسلسل پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ آخر کار طالبان کاٹل شہر کے شمال میں واقع پہاڑوں پر آ گئے۔ یہاں انہوں نے مضبوط مورچہ بندی کر لی۔ انہیں پورا پورا اعزاز تھا کہ اگر وہ یہاں سے پیچھے ہٹے تو کاٹل کو احمد شاہ مسعود کے قبضے میں جانے سے نہیں بچایا جاسکتا۔ اس لیے کہ ان پہاڑوں کے بعد کاٹل تک کوئی قدرتی دفاعی آڑ موجود نہیں تھی۔

کاٹل کے دفاع کی جنگ: کاٹل کے شمال میں نومبر اور دسمبر کی سردی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ سالانہ یا سے چلنے والی برف ریز ہوا میں جب پامیر کی چوٹیوں سے بل کھاتی ہوئی ہندوکش کے دامن میں آتی ہیں تو رنگوں میں لبو جمنے لگتا ہے۔ مگر اس موسم میں بھی کاٹل کا یہ خونی معرکہ پوری شدت سے لڑا جاتا رہا۔ مسعودی افواج کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ ہر وقت کاٹل کے سرنگوں ہونے کا دھڑکا لگتا رہتا تھا۔ اس

دورانِ کامل اور گرد و نواح میں چھپے سینکڑوں افراد نے طالبان کے خلاف بغاوت بھی کی مگر طالبان نے یہ کوشش ناکام بنادی۔

ان دنوں دستِ کم فضائی بمباری اور مسعود کی توپوں کی گولہ باری کے باعث ہزاروں شہری کامل سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ کامل کے دفاع کو محفوظ بنانے کے لیے سرحد پار سے سینکڑوں پُر جوش نوجوان بھی طالبان سے آگے نکلے۔ تجربہ کار افراد کم تھے۔

مولانا حقانی کی امدادی فوج کی آمد: طالبان کو اصل تقویت اس وقت ملی جب خوست سے مولانا جلال الدین حقانی کے چندہ مجاہدین کے دستے کامل پہنچے۔ یہ پینتیس سے پچاس سال تک کی عمر کے جہاں دیدہ سپاہیوں کی جماعت تھی جو روس کے خلاف جہاد میں شریک رہی تھی۔ ان کے پاس پرانی وضع کی تھری ناٹ تھری رائفلیں تھیں۔ وہ شاہراہ پر مارچ کرتے ہوئے سیدھا طالبان کے مورچوں تک آئے اور حملہ آوروں کے خلاف متہ توڑ کارروائی شروع کر دی۔ تین ماہ تک جاری یہ خونریز لڑائی جنوری 1997ء کے اواخر میں اس طرح ختم ہوئی کہ میدان مکمل طور پر طالبان کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شاہراہ سالانگ کے گرد و نواح اور بگرام ایرپورٹ سمیت اس تمام علاقے پر دوبارہ قابض ہو گئے جو احمد شاہ مسعود نے لڑائی کے آغاز میں ان سے چھینا تھا۔

ہرات کے دفاع کا معرکہ: اس معرکے کے دنوں میں مغربی افغانستان میں بھی ایک ہولناک جنگ لڑی گئی۔ کامل کی فتح کے فوراً بعد ایران نے اپنے مہرے اسماعیل خان تورون کو دو ہزار جنگجوؤں اور اسلحے کے بے پناہ ذخائر کے ساتھ مغربی صوبے ”بادغیس“ پہنچا دیا تھا کہ وہ ہرات پر قبضہ کر لے۔ طالبان نومبر اور دسمبر 1996ء میں کامل کے ساتھ ساتھ ہرات اور اپنے دیگر مغربی صوبوں کا دفاع بھی کرتے رہے۔ بادغیس کی سرحدیں دو ماہ تک میدانِ جنگ بنی رہیں۔ افغانستان کا سابق کیونسٹ حکمران ببرک کارمل اسی ماہ دسمبر میں بحالتِ جلاوطنی ماسکو میں راسی عدم ہوا۔ بہر حال اوسم سرما گزرتے گزرتے مخالفین کا دم خم جواب دے گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ طالبان ایک ایسی چٹان ہیں جسے پاش پاش کرنا آسان نہیں۔

معرکہ کامل جو ستمبر 1996ء میں شروع ہوا تھا، صحیح معنوں میں جنوری 1997ء میں اس وقت اختتام پذیر ہوا جب شیخ شیریں اور جوزجانی ملیشیا کیں کامل پر دوبارہ قبضے سے مایوس ہو کر اپنے آبائی علاقوں کی طرف پسپا ہو گئیں۔ طالبان جو ستمبر 1996ء میں چندہ صوبوں کے حاکم تھے، اب 22 صوبوں میں اسلامی احکام نافذ کر چکے تھے۔

پاکستان میں سیاسی تبدیلی: اواخر نومبر 1996ء میں پاکستان کے صدر فاروق لغاری نے بے نظیر بھٹو کی

حکومت توڑ دی تھی اور 1997ء میں پاکستان میں ازسرنو انتخابات ہوئے جن میں ایک بار پھر مسلم لیگ کے قائد میاں نواز شریف بھاری اکثریت سے کامیاب ہو کر ملک کے وزیراعظم بن گئے تھے۔ بے نظیر حکومت نے بھی طالبان سے اچھے روابط رکھے تھے مگر نواز شریف سے طالبان کو نسبتاً زیادہ بہتر توقعات تھیں۔

طالبان سے مسلم دنیا کی بے اعتنائی: بلاشبہ طالبان اب اس کے اہل تھے کہ اقوام متحدہ اور عالمی برادری انہیں افغانستان کا جائز حکمران تسلیم کر لیتی مگر یہودی میڈیا کے سحر میں گرفتار دنیا طالبان کی فتوحات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ صرف پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے فتح کاہل کے بعد طالبان حکومت کو تسلیم کیا تھا، تین سال بعد عیشیانی مجاہدین کی حکومت نے بھی طالبان سے برادرانہ تعلقات قائم کر لیے تھے، مگر اقوام متحدہ اور اس کی تقلید میں اکثر مسلم ممالک طالبان حکومت کو ماننے اور اس سے سفارتی تعلقات استوار کرنے میں پس و پیش سے کام لیتے رہے۔ افغانستان کے ہمسایہ ممالک روس، ترکمانستان، تاجکستان اور ازبکستان کا رویہ تو معاندانہ تھا۔ فتح کاہل کے فوراً بعد وہ طالبان حکومت کو دھمکیاں دینے لگے تھے کہ وہ شمالی افغانستان کی طرف مزید نہ بڑھیں ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سرعام طالبان مخالف قوتوں کو عسکری و مالی امداد فراہم کرنے کا اعلان کر رہے تھے اور دنیا اس ”دخل در مقولات“ پر خاموش تھی۔

رابن رافیل کو منہ توڑ جواب: 27 جنوری 1997ء کو جنوبی ایشیائی امور کی امریکی عہدیدار رابن رافیل نے ایک بار پھر طالبان حکومت کو ناقابل تسلیم قرار دیتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں کوئی قانونی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے ہم طالبان حکومت کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس موقف کے جواب میں 23 مئی کو طالبان کے وزیراعظم امیر خان متقی نے کاہل میں اقوام متحدہ کے سفیر سے دو بدو گفت و شنید کی اور کہا کہ اقوام متحدہ کے قوانین کے مطابق چار قسم کی حکومتیں قابل قبول ہیں:

① انقلابی

② شورائی

③ جمہوری

④ ہر وہ حکومت جسے 60 فیصد عوام کی حمایت حاصل ہو۔

طالبان چاروں لحاظ سے قابل تسلیم حکومت ہیں کیونکہ

① یہ ایسی انقلابی حکومت ہے جو نہایت مختصر مدت میں ملک میں انقلاب لائی ہے۔

② یہ ایسی شورائی حکومت ہے جس میں ہر صوبے اور علاقے کے علماء اور کماڈروں کو شامل کیا گیا ہے۔

۷ یہ جمہوری حکومت بھی ہے کیونکہ اسے مقبوضہ صوبوں کے عوام کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔

۸ 60 فیصد کی جگہ 80 فیصد عوام طالبان کے حامی ہیں۔

لامتی کے ان زبردست دلائل کے سامنے اقوام متحدہ کے سفیر کو کوئی جواب نہ سوجھ سکا۔

1997ء کے اوائل کے کچھ اہم واقعات: اس سے پہلے کہ ہم طالبان دور حکومت کے سب سے

بڑے سانحے کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے اپنی سوچ کو یکسو کریں، مناسب ہوگا کہ اس سال کے شروع

کے چند اہم واقعات کا سرسری جائزہ لے لیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ان دنوں حالات کا رخ کیا تھا؟

✽ فروری کے مہینے میں کنڑ میں کچھ مخالف عناصر نے طالبان کے خلاف بغاوت برپا کرنے کی کوشش

کی جو ناکام ہوئی۔

✽ اس دوران احمد شاہ مسعود اور حزب اسلامی میں ایک بار پھر چپقلش شروع ہو گئی۔ یکم مارچ کو حزب

اسلامی کے ترجمان نے الزام لگایا کہ احمد شاہ مسعود نے حکمت یار کو قتل کرنے کی سازش کی ہے۔

احمد شاہ مسعود کی جانب سے الزام کی تردید کی گئی۔

✽ مارچ میں طالبان نے کابل یونیورسٹی کھول دی۔ وہاں تعلیمی سرگرمیاں زور و شور سے شروع ہو گئیں

جس سے یہ پروپیگنڈا غلط ثابت ہو گیا کہ طالبان عصری تعلیمی اداروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

✽ مارچ کے دوران اسلام آباد میں آئی سی کا اجلاس ہوا جس میں طالبان کو بطور مندوب شرکت کی

دعوت دی گئی۔ چنانچہ طالبان کے نمائندے اس میں مہمان کے طور پر شریک ہوئے۔ چوں کہ

اقوام متحدہ نے ابھی تک طالبان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس لیے آئی سی میں بھی افغانستان کی نشست

پر طالبان کی بجائے صدر بانی ہی کے نمائندے براجمان تھے۔

✽ مئی میں جلال آباد کے سابق گورنر حاجی عبدالقدیر کو حکومت پاکستان نے ملک سے بے دخل کر دیا۔

✽ عرب نژاد مجاہد شیخ اسامہ جو افغان مجاہدین کی باہمی جنگوں کے دوران افغانستان سے سوڈان چلے گئے

تھے، چند ماہ قبل دوبارہ افغانستان آ گئے تھے۔ وہ صومالیہ میں امریکی فوج کے خلاف کارروائیوں میں

مزا حمت کاروں کو مدد دینے کے الزام میں امریکا کو مطلوب تھے۔ خود مسعودی حکومت کے نزدیک بھی

وہ قاتل عتاب تھے۔

✽ مئی کے مہینے میں میڈیا نے بعض ایسی رپورٹوں کی تشہیر کی جن میں کہا گیا تھا کہ طالبان شیخ اسامہ کو سعودی

حکومت کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ طالبان ذرائع نے ان میڈیا رپورٹوں کی تردید کی۔

✽ مئی کے مہینے میں جلال آباد کا بڑا اسلحہ ڈپو ایک دھماکے سے تباہ ہو گیا۔ 50 افراد جاں بحق اور 300

✽ 12 مئی کو کوسٹ میں 60 ہزار افغان مہاجرین نے ایک اجتماع میں ملائیم عمر کی غائبانہ بیعت کی۔
✽ انہی دنوں اسامہ بن لادن کا یہ بیان منظر عام پر آیا کہ امریکا ہیروؤں کے عالمی کاروبار پر قبضہ کرنے کی ننگ دو میں ہے۔

✽ بی بی سی کے نمائندے رحیم اللہ یوسف زئی نے طالبان سربراہ سے ملاقات کے بعد ان کی ترغیب پر ڈاڑھی رکھ لی۔

✽ مئی کے مہینے میں دڑا سالانگ پر طالبان اور دوستم ملیشیا کے درمیان جھڑپیں جاری تھیں اور دوستم کی فوج کو پسپائی ہو رہی تھی۔ یہ تھیں 1997ء کے ابتدائی ساڑھے چار ماہ کی چند جھلکیاں.....
آئیے اب دل تھام کر سانحہ مزار شریف کا ذکر کرتے ہیں۔

طالبان کے خلاف خفیہ سازش کا تانا بانا: طالبان کا افغانستان کے اتنے بڑے رقبے پر چودہ صدیاں قبل والا خالص اسلام نافذ کر دینا اسلام دشمن طاقتوں کو کسی طرح ہضم نہیں ہو سکتا تھا اس لیے موسم بہار میں وہ شمالی افغانستان میں سازشوں کا ایک نیا جال بٹینے لگیں۔ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ طالبان کو صرف طاقت سے شکست نہیں دی جاسکتی اس لیے اب طاقت سے زیادہ دھوکے اور مکاری سے کام لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس نئے کھیل کا سب سے بڑا پشت پناہ ایران تھا۔ اس کا بنیادی مہر اجزل رشید دوستم کا دست راست جنرل عبدالملک تھا۔ جنرل عبدالملک کا آبائی علاقہ شیرخان تھا۔ اس کے بھائی گل محمد عرف گلو پہلوان اور رؤف پہلوان بھی قاریاب کے اہم کمانڈر شمار ہوتے تھے۔ کچھ عرصے ان کا تعلق جمعیت اسلامی سے رہا۔ 1992ء میں نجیب انتظامیہ کے خاتمے کے بعد عبدالملک نے دوستم کے ساتھ "جنش ملی اسلامی" کی داغ بیل ڈالی اس طرح یہ کمانڈر مجاہدین کی حکومت سے الگ ایک آزاد طاقت بن گئے جس کا سربراہ دوستم تھا جبکہ عبدالملک خارجہ امور کا ذمہ دار تھا۔ جب طالبان کو عروج ملا تو ان دنوں دوستم اور عبدالملک کے باہمی اعتماد میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جون 1996ء میں ایک قاتلانہ حملے میں عبدالملک کا بھائی رؤف پہلوان اپنے 15 محافظوں سمیت مارا گیا۔ عبدالملک نے اس کا الزام دوستم پر لگایا۔ اس دن کے بعد دونوں میں کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ 1997ء کے موسم گرما میں عبدالملک نے اچانک دوستم کا ساتھ چھوڑ کر طالبان کی طرف دست تعاون بڑھا دیا۔ 19 مئی 1997ء کو اس نے دوستم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور طالبان سے مدد مانگی۔ تین بڑے ازبک کمانڈر جنرل روزی، جنرل غفار اور اس کا بھائی گل محمد اس کے ہم نوا تھے۔

مزار شریف: فتح کابل کے بعد شمالی افغانستان خصوصاً اس کا سب سے بڑا شہر مزار شریف طالبان کی نظروں میں تھا۔ یہ شہر بلخ کے جنوب مشرق میں متبادل شہر کی حیثیت سے گزشتہ صدی عیسوی میں ابھرا ہے۔ پہلے بلخ قدیم شاہراہ ریشم پر تجارتی قافلوں کی آماجگاہ تھا۔ مگر مزار شریف کی رونقوں نے بلخ کو اس طرح وھندلا دیا ہے کہ وہ ایک پسماندہ قصبہ بن کر رہ گیا ہے۔ مزار شریف کی وجہ تسمیہ، وجہ شہرت اور وجہ آبادی وہ مزار ہے جو شہر کے وسط میں بڑی آن بان سے قائم ہے۔ مزار کے قدیم مجادروں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہاں حضرت علیؑ مدفون ہیں۔ حالانکہ اس بات کا بے حقیقت ہونا سب کو معلوم ہے مگر افغانستان کے حکمران اور امراء محض اپنی ”خوش عقیدگی“ کا ہر کرنے کے لیے اس مزار کی آرائش میں دل کھول کر حصہ لیتے رہے۔ کیونست نظریات رکھنے والے جنرل دوستم نے بھی اس مزار پر سونے کی تختیوں پر کلمہ طیبہ لکھوا کر اپنے ”حاجی دین مبین“ ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

اس مزار کی وجہ سے یہاں ازبکوں اور تاجکوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ہزارہ شیعہ بھی آباد چلے آ رہے ہیں۔ یہ شہر پاکستان، ایران، افغانستان اور وسط ایشیا کے لیے تجارت اور اسمگلنگ کا مرکز ہے اور اسی تجارت کے محاصل یہاں کے کمانڈروں کا بڑا ذریعہ آمدن ہیں۔ دوستم نے ان دنوں یہاں بلخ ایر لائنز کا آغاز بھی کر دیا تھا۔

طالبان اور جنرل عبدالملک کے مذاکرات: طالبان موسم بہار میں شمالی افغانستان پر فیصلہ کن حملے کے لیے تیار تھے۔ ممی میں دوست کے بڑے اسلحہ ڈپو سے 36 ہزار توپ کے گولے شمالی محاذ پر پہنچا دیے گئے۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر ایرانی حکومت شور مچا رہی تھی کہ اقوام متحدہ مداخلت کر کے طالبان کو شمالی افغانستان پر حملے سے باز رکھے۔ ادھر جنرل عبدالملک نے دوستم سے علیحدگی کا اعلان کر کے طالبان کو شمالی افغانستان پر بھرپور چڑھائی کا بہترین موقع فراہم کر دیا تھا۔ ملا عمر کے نمائندے ملا عبدالرزاق نے فوری طور پر بادشیس پہنچ کر ”درد مخباز“ میں عبدالملک سے ملاقات کی۔ عبدالملک نے کہا کہ وہ اسلام کے نفاذ میں مخلص ہے اور چاہتا ہے کہ دوستم جیسے کیونست سے اہل وطن کو نجات ملے اور ایک مستحکم مرکزی حکومت قائم ہو جائے۔ اس گفت و شنید کے بعد فوری طور پر قاریاب، شبرخان اور پھر مزار شریف پر حملے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ ہر صوبے کے انتظام کے لیے چھ رکنی کونسل اور حفاظت کے لیے دو دوسو افراد بھی تیار کر لیے گئے۔ عبدالملک کے ساتھ خاصی عجلت میں ایک معاہدہ بھی طے کر لیا گیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ طالبان قیادت کا وفادار رہے گا اور طالبان اسے کوئی بڑا عہدہ دیں گے۔ عبدالملک نے طالبان کو یقین دلایا کہ وہ مزار شریف تک آسانی سے یلغار کر سکتے ہیں۔ تاہم اس نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ کہیں دوستم

تبیہواں باب

اپنے حامی پڑوسی ملک ازبکستان سے فوج لے کر نہ آجائے۔ ملا عبدالرزاق نے عبدالملک کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں، طالبان نے چند سو افراد کے ساتھ ہی کامل فتح کیا تھا۔

مزار شریف پر دو طرفہ یلغار: طالبان قیادت نے آٹا کا نقشہ جنگ ترتیب دیا۔ 20 مئی کو دو اطراف سے طالبان کے لشکروں نے شمال کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ایک لشکر ہرات سے نکل کر قار یاب، سرپل اور شبرغان کو فتح کرتے ہوئے مغرب سے مزار شریف کا محاصرہ کرنے جا رہا تھا جبکہ دوسرے لشکر کو جو کہ کامل سے روانہ ہوا تھا بلخ، خان اور بامیان پر قبضہ کرتے ہوئے مزار شریف پہنچنے کا ہدف دیا گیا تھا۔

قار یاب فتح: اسماعیل تور دون اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر فتح ہو گیا۔ 100 کیونسٹ جنرل اور 1000 سپاہی گرفتار ہوئے۔ ہرات کا مفرد سابق حاکم اسماعیل خان تور دون ان دنوں حکومت ایران کے ایمام پریشی افغانستان کا دورہ کر کے سازشوں کے جال میں رہا تھا۔ جب طالبان نے قار یاب پر حملہ کیا تو وہ وہیں تھا۔ اسے بھاگنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ طالبان کے سپہ سالار عبدالرزاق نے اسے گرفتار کر کے قندھار جیل بھیج دیا۔ وہاں ایک انٹرویو میں اس نے اعتراف کیا کہ شمالی افغانستان میں بد امنی اور سازشوں کا ذمہ دار ایران ہے۔ اس نے الزام لگایا کہ اس کی وہ تمام دولت بھی ایران نے ضبط کر لی ہے جو وہ ہرات سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ قار یاب اور سرپل پر قبضے کے ساتھ ہی کامل سے روانہ ہونے والا لشکر بلخ، خان اور بامیان کے دہانے تک پہنچ کر بامیان کے اہم دفاعی نقاط پر قبضہ کر چکا تھا۔

دو ستم جلا وطن: جنرل دو ستم طالبان کی یلغار سے گھبرا کر ازبکستان فرار ہو گیا۔ سرحد عبور کر کے "ترنہ" پہنچنے کے لیے اسے خود اپنے ہی سپاہیوں کو ڈالروں کی رشوت دینا پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگجو سردار اب ہمیشہ کے لیے افغانستان کی سیاست سے خارج ہو گیا ہے۔ جنرل دو ستم 1955ء میں شبرغان کے ایک مصافحاتی دیہات میں پیدا ہوا تھا۔ ایک غریب گھرانے کا یہ فرد 1978ء تک کیتھو میں کام کرتا تھا۔ کیونسٹ انقلاب کے بعد وہ فوج میں شامل ہوا۔ ایک مدت تک وہ دریائے آمو کی بندرگاہ حیرتان پر مامور اس علاقے میں شامل رہا جو سوویت یونین سے افغانستان بھیجے جانے والے سامان کی بحفاظت ترسیل کا ذمہ دار تھا۔ بعد میں وہ ترقی کر کے اس دستانے کا فرسبن گیا۔

1989ء میں روسی فوج کے انخلاء کے بعد دو ستم شمال کا ایک بڑا کمانڈر بن کر ابھرا جو نیم خود مختار اور نجیب اللہ کا وقار تھا۔ اس نے ازبکوں کی نہایت سخت کوش اور تشدد پسند پلشیا ترتیب دی جسے "جوز جانی لیشیا" کہا جاتا تھا۔ یہ فوج نجیب کے اشارے پر مجاہدین کے خلاف لڑتی رہی۔ مگر 1992ء میں

مجاہدین کو کامل پر حملے کے لیے تیار دیکھتے ہی اس نے نجیب سے علیحدگی اختیار کر لی اور مزار شریف کو مرکز بنا کر چھ صوبوں کا خود مختار حکمران بن بیٹھا۔

طالبان کے عروج کے ساتھ دوسم مزار شریف کی رونقوں کو بڑھاتا چلا گیا کیونکہ طالبان کے نظام سے برگشتہ سینکڑوں شرابی، اسمگلر، فاحشہ عورتیں، رقا صائیں، گلوکار، سازندے اور میراثی مزار شریف میں پناہ لے چکے تھے۔ دوسم نے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور اپنی محفلوں کو مزید دو آتشہ کیا مگر اب دوسم جلا وطن ہو کر ازبکستان اور پھر ترکی میں پناہ لے رہا تھا جبکہ مزار شریف میں طالبان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

طالبان مزار شریف میں: 25 مئی کو طالبان فاتحانہ انداز میں کسی کشت و خون کے بغیر مزار شریف میں داخل ہو گئے۔ طالبان کی باقاعدہ فوج جو شہر پر قبضہ کرنے آئی تھی، بہت مختصر تھی۔ البتہ شمال کے سب سے بڑے شہر کی فتح میں شرکت کرنے اور وہاں اسلامی نظام کے نفاذ کا دلکش منظر دیکھنے کے لیے ہزاروں طلبہ، مجاہدین، علماء اور دین دار افراد طالبان کے ساتھ ساتھ مزار شریف پہنچنا شروع ہو گئے، ان میں خاصی تعداد پاکستانیوں کی بھی تھی۔ یہ لوگ اور خود طالبان کے باقاعدہ سپاہی بھی پہلی بار شمالی افغانستان آئے تھے۔ وہ اہل شمال کی طبیعت اور مزاج سے واقف تھے۔ انہیں شہر کے راستوں، اہم ناگوں اور دفاعی نقاط کا بھی علم نہیں تھا۔ دوست نمادشمن جنرل عبدالملک نے بھی طالبان کو جان بوجھ کر اہم دفاعی خطوط سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

طالبان کی بہت بڑی تعداد غیر مسلح تھی۔ جو مسلح تھے ان میں تجربہ کار افراد کم تھے۔ اکثر کم عمر نوجوان تھے۔ انہیں قطعاً اعزاز نہیں تھا کہ کتنی بڑی تباہی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے؟

ناریاب کی طرح مزار شریف کی فتح کے فوراً بعد یہاں بھی شریعت کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ شراب خانے، سینما اور ویڈیو سینٹر بند کر دیے گئے۔ کیونسٹ اور ماڈرن طبقے کی عورتیں جو سر عام اپنے اعضاء کی نمائش کرتی پھرتی تھیں، پردے کی پابند کر دی گئیں۔ شہر کے تمام مسلح افراد سے اسلحہ جمع کیا جانے لگا۔

جنرل عبدالملک کا فریب: ملا محمد عمر نے ملا عبدالرزاق کو مزار شریف اور شمال نو مفتوحہ صوبوں کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ جنرل عبدالملک اب تک ملا عبدالرزاق کے ساتھ تھا۔ اس نے مزار شریف کی فتح پر مستحی خیر انداز میں مسکراتے ہوئے انہیں مبارکباد دی اور کہا: ”اب میں طالبان بن گیا ہوں۔“

ملا عبدالرزاق نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی نظر آرہی ہے۔ پھر اس نے ملا عبدالرزاق سے فرمائش کی کہ اس کے لیے آریانا ایرلائن کا طیارہ منگوایا جائے تاکہ وہ خود قندھار جا کر

طالبان سربراہ کو مبارکباد پیش کرے۔ ملا عبدالرزاق مان گئے اور قدہار سے ایک خصوصی طیارہ مزار شریف طلب کر لیا۔ جو طیارہ آیا اس میں طالبان کے مزید چند اہم عہدے دار ملا فوٹ اور مولوی احسان اللہ احسان بھی مزار شریف آگئے۔ مگر اس کے بعد نامعلوم کیا ہوا؟ عبدالملک قدہار جانے سے پس پیش کرنے لگا۔ وہ کوئی معقول وجہ نہ بتا سکا بس اتنا کہا کہ چند خاص مہمان آگئے ہیں اس لیے کچھ دنوں بعد ہی قدہار جاؤں گا۔

بغوات کے شعلے: طالبان کے مزار شریف فتح کرنے کے تین دن بعد تک وہاں شرعی احکام نافذ کرنے اور افغانستان و پاکستان سے لوگوں کے جوق در جوق مزار شریف پہنچنے کی خبریں آتی رہیں مگر اس کے بعد 28 مئی 1997ء کی شام کو حالات اچانک تبدیل ہو گئے۔ اس رات بی بی سی نے خبر نشر کی کہ مزار شریف سے طالبان کو نکال دیا گیا ہے۔ اگلے دن تک انواہوں کی عجیب فضا قائم رہی۔ تاہم 29 مئی کی شام تک مزار شریف سے طالبان کے انخلاء کی تصدیق ہو گئی۔ ہوا یہ تھا کہ 28 مئی کو طالبان مزار شریف میں آباد ہزارہ قبیلے سے ہتھیار جمع کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ایران کی تیار کردہ سازش کے مطابق ہتھیار دینے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ اسلحہ جمع کرنے کے لیے آنے والے طلبہ کی ٹولی پر حملہ کر دیا۔ جس سے تین طلبہ شہید ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں جگہ جگہ ہزارہ جات، دوستم اور عبدالملک کے آدمی مورچے بنا بنا کر طالبان پر گولیاں برسانے لگے۔

طالبان کی اکثریت شہر کے راستوں سے نادانف تھی۔ وہ اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ وہ سڑکوں سے گزرتے تو مکانات کی چھتوں اور کھڑکیوں سے ان پر گولیوں کی بارش ہونے لگتی۔ بہت سے طالبان اپنی پک اپ گاڑیاں بند گلیوں میں لے گئے اور نتیجتاً ہر طرف سے گھر گئے۔ ہزارہ جات کی عورتیں تک طالبان پر ان حملوں میں پورے جوش و خروش سے شامل تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے سینکڑوں ساتھی شہید ہو گئے۔

طالبان راہنماؤں کی گرفتاری: جنرل عبدالملک اس دن بھی طالبان کمانڈروں کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے رویے سے ذرا بھی یہ اعزاز نہ ہونے دیا کہ اس کے کیا عزائم ہیں؟ اس دن جب ہزارہ جات نے اسلحہ دینے سے انکار کر کے طالبان پر حملہ کیا تو فوری طور پر ملا عبدالرزاق کو اطلاع دی گئی۔ اس وقت ان کے 12 بچے تھے۔ ملا عبدالرزاق نے وائرلیس پر یہ تشویش ناک خبر سن کر عبدالملک کو اطلاع دی۔ اس نے بھی یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس واقعے پر بڑی حیرت ہوئی ہو۔ اس کے بعد دو وقفے وقفے سے ملا عبدالرزاق اور دوسرے طالبان کمانڈروں کو وائرلیسوں پر شہر کے مختلف حصوں سے اسی قسم کی اطلاعات

ملتی رہیں۔ شام کے چار بجے تک طالبان اور مزار شریف کے مسلح گروہوں میں جگہ جگہ باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ ملا عبدالرزاق وائرلیس پر اس انتہائی گھمبیر صورت حال میں طالبان کی کمان کر رہے تھے۔ ان کا حکم تھا جہاں سے فائرنگ ہو طالبان وہاں متواتر جواب دیں۔

شام کے سائے پھیلنے لگے تو عبدالملک نے ملا عبدالرزاق سے کہا:

”جنش ملی، حزب وحدت اور حزب اسلامی نے ہمارے خلاف مشترکہ محاذ بنالیا ہے۔ اب ہمیں باقاعدہ جنگ کرنا ہوگی۔“

یہ کہہ کر عبدالملک انہیں نقشہ جنگ اور دفاعی مورچے تیار کرنے کے بہانے اپنے ساتھ قلعہ جنگلی لے گیا۔ وہاں ملا عبدالرزاق سے الگ ہو کر وہ وائرلیس پر جنش ملی کے سپاہیوں کے حوصلے بڑھاتا رہا اور انہیں کہتا رہا کہ طالبان جہاں ملیں انہیں ختم کر ڈالو۔ ملا عبدالرزاق نے ساری رات بے چین اور اصل حالات سے بے خبری میں گزاری۔ صبح کے وقت جب کہ بغاوت کی کامیابی اور طالبان کی شکست واضح ہوگئی تھی، عبدالملک کے افسران نے انہیں گرفتار کر لیا۔ پہلے انہیں شیرخان اور پھر قاریاب کے ہسپتال فیض آباد کی جیل میں بھیج دیا گیا۔

ملا عبدالرزاق کے بعد طالبان کی عالی شوریٰ کے رکن ملا صادق، ایرفورس کے نگران کمانڈر جیلانی اور افغان نصابیہ کے سربراہ ملا اختر منصور بھی اسی جیل میں لائے گئے۔ ایک موقع پر احمد شاہ مسعود نے اپنے دست راست جنرل فہیم کو بھیج کر عبدالملک سے ان طالبان راہنماؤں کا لاکھوں ڈالر میں سودا کرنے کی کوشش کی مگر عبدالملک بڑے سیاسی مفادات اور سودے بازیوں کے لیے ان گرفتار شدہ راہنماؤں کو کارڈ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا اس لیے اس نے احمد شاہ مسعود کی پیش کش کو مسترد کر دیا۔ طالبان کے ایک اور اہم راہنما وزیر خارجہ ملا نوح بھی گرفتار کر لیے گئے تھے جبکہ مرکزی بینک کے گورنر مولوی احسان اللہ احسان اور دس سے زائد بڑے بڑے عہدے دار اس قتل عام میں شہید کر دیے گئے۔

عبدالملک شمال کا نیا حکمران: 30 مئی تک یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ جنرل عبدالملک نے طالبان کو فتح دلانے کے بہانے، شمالی افغانستان پر قبضے کا گھناؤنا منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو چکا ہے۔ عبدالملک کی افواج نے مزار شریف کے علاوہ تخار، قاریاب، شیرخان، جوزجان اور سرانے پل پر بھی آنا نانا قبضہ کر لیا تھا۔ اب ان تمام علاقوں پر ان کے قابض ہو جانے کی وجہ سے طالبان کے لیے مغرب کی طرف راہ فرار بالکل بند ہوگئی۔ وہ جگہ جگہ ان دشمنوں کے گھیرے میں آتے چلے گئے جو صرف پانچ دن پہلے دوستی کا نقاب اوڑھ کر انہیں اس جال میں لائے تھے۔

ہزاروں طالبان عبدالملک اور اس کے اتحادی حزب وحدت کے ہزارہ جات کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ پاکستان سے مزار شریف جانے والے سینکڑوں افراد بھی شہید، گرفتار یا لاپتہ ہوئے جن میں جامعہ بنوری ٹاؤن کے استاد وحدیث حضرت مولانا فضل محمد کے بھائی مولوی جان محمد بھی شامل تھے جو ایک صحافی کے طور پر وہاں گئے تھے۔

قتل عام کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ اگست کے وسط میں شبرغان میں 28 طلبہ قیدیوں کو شہید کیا گیا جن میں جمعیت علمائے اسلام جن کے امیر مولانا عبدالحمید بھی تھے۔

عبدالملک کے جنگجوؤں کو پہلی بار اتنی مطلق العنانی حاصل ہوئی تھی۔ انہوں نے مزار شریف میں ناقابل بیان تباہی مچائی۔ جو ملا اسے لوٹ لیا۔ سرکاری گوداموں اور عمارتوں کا تمام ساز و سامان لپیٹ ڈالا۔ حد تو یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے دفاتر اور ایجنسیاں بھی ان کی لوٹ مار سے محفوظ نہ رہیں اور ان کا علمہ شہر سے نکل بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ جہاں تک گرفتار کیے جانے والے طالبان سے ان کے رویے کا تعلق ہے وہ اتنا بھیاں تک تھا کہ الفاظ اس کی پوری وضاحت سے قاصر ہیں۔ ہزاروں طالبان، حفاظ قرآن، قراء اور علمائے دین کو دشت لیلیٰ اور دوسرے بیابان علاقوں میں بڑی بڑی اجتماعی قبریں کھود کر زندہ دفن کر دیا گیا۔ یہ قبریں بعد میں دریافت ہوتی رہیں۔ طالبان نے اگلے برس مزار شریف فتح کر کے مدفون شہداء کی تعداد کا تخمینہ لگا یا تو وہ آٹھ ہزار سے متجاوز تھے۔

طالبان قیادت کا غم: مزار شریف میں طالبان کے خلاف بغاوت، ان کا قتل عام اور گرفتاریاں..... یہ ایسی روح فرسا خبریں تھیں جن سے طالبان قیادت کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا۔ مجاہد کمانڈر اور علمائے کرام مہبوت رہ گئے۔ دینی مدارس میں سوگ کا سماں تھا۔ طالبان کے امیر ملا محمد عمر اس سانحے کی خبریں سن کر سراپا حزن و غم بن گئے۔ ان کے رفقاء بتاتے ہیں کہ تین دن تک ایک لقمہ ان کے حلق سے نیچے نہ اتر سکا۔ وہ اس دکھ کے سبب بیمار پڑ گئے۔ ادھر احمد شاہ مسعود نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے زبردست جنگی چالیں چلیں۔ اس نے فوراً اپنی افواج کو آگے بڑھا کر درہ سالانگ کے جنوب میں جبل السراج تک کا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ یوں مزار شریف میں شکست کھانے والے ہزاروں طالبان کا اپنے مرکز سے زمینی رابطہ بالکل کٹ گیا۔ اس سے قبل ان کے مختلف گروہ قتل عام اور گرفتاری سے بچ بچا کر جنوب کی طرف بڑھتے آرہے تھے تاکہ شاہراہ سالانگ کے ذریعے کابل پہنچ جائیں۔ انہیں یہ بھی امید تھی کہ کابل سے طالبان کی تازہ دم افواج ان کے کمک کے لیے آجائیں گی۔ مگر مسعود کی جنگی چال نے یہ سب سچھ ناممکن بنا دیا۔ اس نے کابل کے ارد گرد طوفانی حملے جاری رکھے اور

شمال مشرقی افغانستان کے کئی چھوٹے چھوٹے شہر اور عسکری لحاظ سے کئی اہم مورچے طالبان سے چھین لیے۔۔۔۔۔ ان علاقوں میں بھی سینکڑوں طالبان شہید اور گرفتار ہوئے۔

مختلف محاذوں سے طالبان کی پسپائی: ادھر طالبان کی وہ فوج بھی جو میان کوئٹہ کرنے کے لیے درہ شریک پہنچ چکی تھی، مزار شریف کی شکست کے بعد پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ ہزارہ جات کے حوصلے بلند ہو گئے۔ وہ طالبان کا محاصرہ توڑ کر ارد گرد پھیل گئے۔ جلد ہی کریم خیل نے انہیں منظم کر کے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کر دیا تاکہ کامل کا محاصرہ کر سکے۔ راستے میں وہ پشتونوں کے ہر دیہات کو اجازت اور آبادی کو تہ تیغ کرنا چلا آیا۔ ہزاروں دیہاتی اس کے خوف سے مشرقی علاقوں کی طرف بھاگ نکلے۔

نفیر عام اور مقابلے کی تیاری: طالبان کو پہلی بار اتنی بڑی شکست کا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ ان حالات میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے نفیر عام کا اعلان کر دیا جس کے بعد قندھار کے بازار بند ہو گئے اور ہزاروں افراد شمالی صوبوں کی بغاوت پر قابو پانے کے لیے رضا کارانہ طور پر تیار ہو گئے۔ پاکستان کے دینی مدارس اور سرحدی قبائل سے بھی سینکڑوں نوجوان قندھار اور کامل پہنچ گئے۔ یوں 30 ہزار سپاہیوں کا لشکر مرتب ہوا مگر اس لشکر کو زیادہ توجہ کامل کے محاذ پر دینا پڑی کیونکہ طالبان مخالف گروہوں نے اسے کمان کی طرح گھیر لیا تھا اور کامل کے سقوط کا خطرہ سر پر تھا جبکہ شمال میں گھرنے والے طالبان کو کمک پہنچانے کا کوئی زمینی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

طالبان، پل خمری میں: جو طالبان مزار شریف کے قتل عام اور گرفتاریوں سے بچ نکلے تھے، انہوں نے پیچھے ہٹ کر پل خمری میں مورچے بنالے تھے جو مزار شریف کی فتح سے چند دن پہلے ہی ان کے قبضے میں آیا تھا۔ پل خمری کے علاوہ قندوز، تخار اور سمگان بھی اب تک طالبان یا ان کے حامی کمانڈروں کے پاس تھے۔ طالبان مخالف گروہوں نے پل خمری پر دو ہفتے تک لگاتار حملے کیے تاکہ طالبان کو وہاں سے بے دخل کر دیں مگر تین اطراف سے گھرے ہوئے ان مجاہدوں نے بھرپور مقابلہ کیا اور حریف افواج کو پل خمری سے دور رکھا۔

ضرب مؤمن کی رپورٹ کے مطابق ان دو ہفتوں میں طالبان مخالف گروہوں نے پل خمری پر 10 بڑے حملے کیے جن میں ان کے 500 افراد ہلاک ہوئے۔ طالبان کو توقع تھی کہ کامل سے طالبان کی تازہ دم کمک سالانگ شاہراہ کو کھول دے گی اور انہیں محفوظ عقبہ میسر آجائے مگر جب کامل کے گرد مخالفین کا گھیراؤ سخت ہو گیا اور پل خمری کا مستقبل بخدوش نظر آنے لگا تو طالبان نے قندوز کی طرف نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے ان کے مسلح دستوں نے بغلان پر قبضہ کیا اور پھر شمال کی طرف بڑھتے ہوئے رات کی

تاریخی میں قندوز پر قبضہ کر لیا۔ یہ مشکل 16 جون 1997ء کا واقعہ ہے۔ قندوز پر قبضہ کرنے میں طالبان کو مقامی عوام اور کمانڈروں کا پورا تعاون حاصل رہا۔ خاص طور پر قندوز کے مشہور کمانڈر اور رئیس ارباب ہاشم نے اس موقع پر طالبان کا جس طرح ساتھ دیا، اسے طالبان تحریک کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

خونریز لڑائیاں: اس دوران طالبان کے خلاف جاری جنگ کو مکمل فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے افغانستان کے بدخواہ، ہمسایہ ممالک پوری طرح سرگرم تھے۔ روس کے تعاون سے شمالی افغانستان کے تمام طالبان مخالف دھڑوں کو منظم کیا جا رہا تھا۔ اس مہم میں آغا خانی راہنما جعفر نادری کا کردار سب سے نمایاں تھا جس کو افغانستان میں ایک خود مختار اسماعیلی ریاست کے قیام کی امید دلائی گئی تھی۔ مزار شریف سے طالبان کے بے دخل کیے جانے کو ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ طالبان مخالف تمام دھڑے نادرن الائنس (شمالی اتحاد) کے نام سے ایک نئے اتحاد میں ڈھل گئے اور شمالی افغانستان میں اس اتحاد کی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔ نادرن الائنس کے جنگجوؤں نے جن کی بڑی تعداد کیونسٹوں پر مشتمل تھی طالبان کو قندوز سے نکالنے کے لیے ایک بڑا حملہ کیا مگر قندوز میں محصور طالبان نے بھرپور دفاع قائم کر کے یہ حملہ پسپا کر دیا۔ اس جنگ میں 500 کیونسٹ گرفتار اور اتنے ہی ہلاک ہوئے۔

قندھار اور کابل میں شمال کے طالبان کی مدد کے لیے تازہ دم دستے مرتب ہوتے رہے۔ تقریباً ہر روز کابل سے طیارے پرواز کرتے اور قندوز ایرپورٹ پر اترتے۔ اس طرح قندوز کے محصور طالبان کو خوراک، اسلحہ اور افراد کی کمی نہ ہونے پائی۔ جلد ہی ان کے قدم اتنے مضبوط ہو گئے کہ وہ تجارت اور بدخشیاں پر حملے کی تیاری کرنے لگے۔

ادھر بادغیس سے طالبان کا لشکر فاریاب کی طرف بڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ طالبان نے 8 جولائی کو فضا کی حملہ کر کے فاریاب چھاؤنی تباہ کر دی اور زمینی حملے میں ضلع غور مارچ فتح کر لیا مگر اس دوران کابل کی طرف احمد شاہ مسعود کی مسلسل پیش قدمی نے طالبان کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

کابل اور قندوز کی جنگ: جولائی 1997ء کے دوسرے عشرے میں احمد شاہ مسعود کی افواج چار یکار اور پھر گرام ہوائی اڈے پر بھی قابض ہو گئیں۔ کابل کی شمالی وادیوں میں ہفتوں خونریز جنگ جاری رہی۔ اس میں فریقین کے سینکڑوں افراد کام آئے۔ کابل کے شمال مشرق دیہاتوں میں آباد ڈیڑھ لاکھ سے زائد افراد جن کی اکثریت تاجک تھی اس جنگ زدہ علاقے سے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔

احمد شاہ مسعود کی فوجیں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہیں حتیٰ کہ وہ کابل سے صرف 20 کلومیٹر کے فاصلے

پر پہنچ گئیں۔ اس موقع پر مولانا جلال الدین حقانی نے، جواب کامل میں طالبان کے وزیر بھی تھے، ایک بار پھر اپنی تجربہ کار فوج کے ساتھ کامل کے محاذ کو سنبھالا اور نہ صرف احمد شاہ مسعود کی فوج کو مزید آگے بڑھنے سے روک لیا بلکہ چاریکار کے 5 نوآموزی گاؤں واپس لے لیے۔ ادھر قندوز کے محاذ پر بھی طالبان کو ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ طالبان مقامی پختون کمانڈروں کی مدد سے قندوز کا محاصرہ توڑتے ہوئے مزار شریف کی طرف بڑھنے لگے۔

طالبان قندوز کی ہمت: 9 جولائی 1997ء کو انہوں نے مزار شریف کے مشرق میں ”دڑہ یرگنک“ پر قبضہ کر کے مخالفین کو سرا سیدہ کر دیا اور رسد کے بڑے ذخیرے کو لوٹ لیا۔ مزار شریف کا کنٹرول اس وقت عبدالملک کی فوج کے ہاتھ میں تھا۔ اس صورت حال سے وہ لوگ حواس باختہ ہو گئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مفرد جزل و دستم کے وفاداروں نے عبدالملک کے خلاف بغاوت کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 15 جولائی کو قندوز کے طالبان نے شمال کی طرف ہلہ بول کر دشت ارچی اور دریائے آمو کے کنارے واقع ضلع ”امام صاحب“ پر قبضہ کر لیا۔

سیاف طالبان کے حامی: انہی دنوں مشہور جہادی راہنما پروفیسر عبدالرب رسول سیاف 18 گاڑیوں پر مشتمل قافلہ بدخشاں میں شمالی اتحاد کے ہاتھوں لوٹا گیا جس کے بعد پروفیسر سیاف نے طالبان کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ طالبان کو ایک خوشی یہ بھی ملی کہ جبل السراج کے محاذ پر گرفتار ہونے والے ان کے کمانڈر ملا خان محمد، احمد شاہ مسعود کی جیل توڑ کر ان کے پاس واپس پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

طالبان قندوز کی یلغار: قندوز کے طالبان محصور دکھائی دینے کے باوجود مشرق، مغرب اور شمال میں آزادانہ کارروائیاں کر رہے تھے۔ 22 جولائی کو انہوں نے طالقان ایرپورٹ پر حملہ کیا۔ فریقین میں زبردست کشمکش دیکھنے میں آئی، اس دوران طالبان کے نشانہ بازوں نے طالقان سے اڑنے والا مسود کا ایک طیارہ مار گرایا۔ مہینے کے اواخر میں قندوز کے طالبان نے بدخشاں کے دو قلعے فتح کر لیے۔ جبکہ وسطی افغانستان میں تعینات طالبان نے غور بند پر حزب وحدت کا ایک بڑا حملہ ناکام بنا دیا۔ احمد شاہ مسعود نے کامل پر قبضے کی مہم بہتر بنانے کے لیے چاریکار اور بگرام ایرپورٹ کے محاذ جزل بابا خان اور جزل آصف دلاور کے حوالے کر دیے۔

شمال میں ایک نئی حکومت: ماہ اگست میں بھی یہ معرکے جاری رہے مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اور سفارتی میدانوں میں بھی فریقین کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ اگست کے پہلے ہفتے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کوئی عنان نے افغانستان کے لیے لخزار براہی کو نیا نمائندہ مقرر کر دیا۔ لخدار براہی 16

اگست 1997ء کو مختار ب افغان لیڈروں سے گفت و شنید کے لیے اسلام آباد آئے مگر انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ادھر برہان الدین ربانی نے اپنی صدارت چکی رکھتے ہوئے شمال کے کیونسٹ گروہوں کے ساتھ ایک نیا حکومتی ڈھانچہ تشکیل دے دیا جس میں حکمت یار کی بجائے عبدالرحیم غفور زئی کو وزیراعظم مقرر کیا گیا عبدالرحیم غفور زئی بڑا شاطر، تجربہ کار اور سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر کیونسٹ تھا۔ اس کا شمالی حکومت کا وزیراعظم بننا مستقبل میں طالبان کے لیے پریشان کن ہو سکتا تھا۔ اس نئے حکومتی ڈھانچے کے وجود میں آنے ہی احمد شاہ مسعود نے عالمی سطح پر اپنی ساکھ بہتر بنانے کے لیے میڈیا مہم تیز کر دی۔ اس نے وائس آف امریکا کو اسٹریڈیو دیتے ہوئے اعلان کیا کہ کابل پر قبضہ کر کے ہم خواتین کو آزادی دے دیں گے۔ ان دنوں کابل میں غیر ملکی صحافیوں کی نقل و حرکت نہ صرف بڑھ گئی تھی بلکہ کئی صحافی مشکوک حرکات میں ملوث پائے گئے تھے۔

طالبان کی صحافیوں پر پابندی: ان مشکوک سرگرمیوں کی وجہ سے طالبان حکومت نے نگلی سلامتی کے پیش نظر صحافیوں پر درج ذیل پابندیاں عائد کر دیں:

① ہر صحافی کو قندھار سے خصوصی اجازت نامہ لینا لازمی ہوگا۔

② صحافی کابل کے مخصوص ہوٹل میں قیام کریں گے۔

③ زیر استعمال گاڑی کا نمبر اور مالک کا پتہ درج کروائیں گے۔

④ طالبان کے ایک نمائندے کو ہمراہ رکھیں گے۔

⑤ ویڈیو کیمرہ اور ٹی وی سیٹ استعمال نہیں کریں گے۔

⑥ جاندار کی تصویر نہیں اُتاریں گے۔

دنیا بھر کے صحافیوں نے طالبان کی ان پابندیوں کا برا مانایا اور اسے آزادی اظہار رائے کے منافی قرار دیا۔

شمال کا نیا وزیراعظم ہلاک: اگست کے وسط میں ایک عجیب حادثہ رونما ہوا۔ شمالی حکومت کا نیا وزیراعظم عبدالرحیم غفور زئی ایک فضائی حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس کے ساتھ برہان الدین ربانی کے شیر خاص کے علاوہ کئی اہم فوجی و سیاسی شخصیات بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ شروع میں یوں لگا جیسے طیارے کی تباہی ایک سوچی سمجھی کارروائی کا نتیجہ ہوگی مگر بعد میں خود شمالی اتحاد کے ذرائع نے تصدیق کی کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ طیارہ لینڈنگ کے دوران پائلٹ سے بے قابو ہو کر ایک کھائی میں جا گر تھا۔

طالبان قندوز سمزگان پر قابض: تین ماہ کی مہر آ زماجنگ اور زبردست جانی نقصان برداشت کرنے

کے بعد طالبان کے لیے فتوحات کے دروازے ایک بار پھر کھلنے لگے۔ طالبان کے وزیر اطلاعات ملا امیر خان متقی تین ماہ کا پرصوبت سفر کر کے قندوز سے بخیریت قندھار پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ تجربہ 1997ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔

اس کے چند دن بعد قندوز کے طالبان حیرت انگیز رفتار کے ساتھ قندوز سے نکلے اور سمگان کے اہم شہر ”شاہرقان“ (خلم) پر قابض ہو گئے۔ انہیں اس پیش قدمی کا موقع خود شمالی اتحاد کی شرارت نے مہیا کیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ 7 ستمبر تک طالبان مزید آگے بڑھنے کی کسی منصوبہ بندی کے بغیر قندوز کے باہر ”دوہ“ یرکنک“ پر واقع اپنے مورچوں میں آرام کر رہے تھے۔ اچانک انہیں اطلاع ملی کہ شمالی اتحاد کی فوجیں سمگان پر قبضے کی کوشش کر رہی ہیں اور سمگان کا گورنر مجید خان جو حزب اسلامی سے تعلق رکھتا تھا، ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔ طالبان اس جنگ کی خبریں لیتے رہے۔ چار دن کی مسلسل جنگ کے بعد شمالی اتحاد نے سمگان کے شہر ”خلم“ پر قبضہ کر لیا اور کمانڈر مجید خان فرار ہو گیا۔

اس فتح کے بعد شمالی اتحاد کی فوج کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور اس نے اپنی چھاؤنی سے جو خلم سے 40 کلومیٹر دور شاہ باغ علی کے مقام پر تھی، قندوز کی طرف کوچ کر دیا تاکہ طالبان کو بھی قندوز سے بے دخل کر دیں مگر قندوز کے طالبان نے کمر کس کر مقابلہ کیا اور چند گھنٹے تک گھمسان کی جنگ کے بعد شمالی اتحاد کی افواج اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹی چلی گئیں اور قندوز کے طالبان آگے بڑھتے بڑھتے سمگان ایرپورٹ تک پہنچ گئے جہاں نماز ظہر ادا کر کے انہوں نے خلم شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ شام تک خلم شہر طالبان کے پاس آ گیا تھا۔ خلم سالانگ شاہراہ کا اہم دفاعی نقطہ ہے۔ پروان، کاپیسا، پل خرمی اور سمگان کے مرکز ایک کے راستے یہاں آ کر ملتے ہیں۔ یہاں قبضے کے بعد سالانگ شاہراہ پر واقع ان تمام شہروں کا رابطہ مزار شریف سے کٹ گیا جو مخالفین کے قبضے میں تھے۔

حیرتان بندرگاہ طالبان نے خلم میں مورچے مضبوط کرتے ہی مزار شریف کی طرف کوچ کیا۔ شہر کا گرد و نواح سے رابطہ منقطع کرنے کے لیے انہوں نے پیر 9 ستمبر کی شام حیرتان دوراہے پر قبضہ کر لیا جو مزار شریف سے صرف 15 کلومیٹر دور ہے۔ اس کے بعد وہ دریائے آمو کی طرف بڑھتے رہے اور رات کی تاریکی میں حیرتان بندرگاہ پر قابض ہو گئے جو دریائے آمو کے کنارے وسط ایشیا اور افغانستان کے درمیان اہم تجارتی مرکز کے طور پر مشہور ہے۔

طالبان کے قتل عام کا سب سے بڑا ذمہ دار عبدالملک اس صورت حال سے ایسا بدحواس ہوا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور اپنے آبائی علاقے فاریاب جا کر دم لیا۔ اس کی غیر

موجودگی میں مزار شریف پر ایک بار پھر حزب وحدت کے بے رحم جنگجو قابض ہو گئے اور شہر میں لوٹ مار کا بازار پھر گرم ہو گیا۔ ادھر طالبان نے مزار شریف کے ایرپورٹ پر قبضہ کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دن میں دوبارہ شہر پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر طالبان اب پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ انہوں نے شہر کے ارد گرد تمام بستیاں اور شاہراہوں میں مورچہ بندی جاری رکھی۔ محاصرہ سخت اور طویل ہوتا چلا گیا۔ مزار شریف کے ارد گرد تمام مقامی کمانڈر طالبان سے جا ملے تھے۔

دو ستم کی واپسی، طالبان کی پسپائی: بظاہر حالات طالبان کے حق میں نظر آتے تھے مگر اس پردے میں ایک طوفان کے آثار جنم لے رہے تھے۔ حزب وحدت اور دو ستم کے گروہوں کو بھرپور امداد ملنے لگی تھی۔ وہ طالبان سے جا ملنے والے کمانڈروں کو خفیہ طور پر خرید رہے تھے۔ حزب وحدت (ظلی گروپ) کے رہنماؤں استاد محقق وغیرہ نے دو ستم کے ساتھ اتحاد کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی واپسی کے لیے زمین ہموار کرنے میں کامیاب ہوتے جا رہے تھے۔ اس مہم کے نتیجے میں اکتوبر کے وسط میں دو ستم اچانک شمالی افغانستان میں نمودار ہو گیا۔ اس نے قلعہ جنگی میں قیام کیا اور فوراً یہ اعلان نشر کیا کہ وہ آدھ گھنٹہ قبل وطن واپس آ پہنچا ہے۔ طالبان سربراہ ملا محمد عمر کو جوں ہی یہ خبر ملی انہوں نے فوری طور پر طالبان کو مزار شریف کا محاصرہ اٹھا کر پسپائی کا حکم دے دیا۔ تاخیر کی صورت میں خطرہ تھا کہ طالبان خود باغی کمانڈروں کے گھیرے میں آ جاتے۔ طالبان نے پہلے حیرتان بندرگاہ خالی کی۔ اس کے فوراً بعد 20 روز سے مزار شریف کو گھیرے ہوئے طالبان سپاہی بھی تند دوز کی طرف پسپا ہو گئے۔ یہ اکتوبر 1997ء کے دوسرے عشرے کا واقعہ ہے۔

دو ستم کی آمد سے مزار شریف اور گرد و نواح کے ازبک کمانڈروں نے ایک بار پھر اس کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی۔ انہوں نے مزار شریف میں خوب لوٹ مار کر کے قلعہ کا جشن منایا۔ اقوام متحدہ کی ایجنسیوں کے دفاتر اور رہائشی اداروں کے مراکز بھی لوٹ لیے۔ ان کا عملہ ازبکوں کے خوف سے شہر چھوڑ کر فرار ہو گیا تاہم مزار شریف پر عملاً ہزارہ جات کا قبضہ برقرار رہا۔ مزار شریف سے طالبان کی دوبارہ پسپائی نے طالبان مخالف گروہوں کے حوصلے بلند کر دیے تھے اور طالبان کے خلاف جاری سازشوں کی کامیابیاں واضح ہو گئیں۔ شمالی اتحاد کے جنگجو کمانڈروں نے باہمی اختلافات دور کرنے کی ضرورت بھی محسوس کر لی۔ شمالی اتحاد کا نیا خاکہ: اکتوبر 1997ء کے آخری عشرے میں برہان الدین ربانی کی زیر صدارت تمام جنگجو کمانڈروں کا اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ مزار شریف پر جنرل عبدالملک کے نائب جنرل فوزی، شہر خان پر جنرل دو ستم، سرمل پر کمانڈر عبدالغفار اور قاریاب پر جنرل عبدالملک کی حکومت ہوگی۔ دو ستم کو خوش کرنے کے لیے ربانی نے اسے اپنے نائب کا عہدہ بھی دے دیا۔ دو ستم مزار شریف سے دستبردار

ہونے کو کبھی تیار نہ ہوتا مگر فی الحال اس کے اذہم دستے منظم نہیں تھے اس لیے اس نے مزار شریف پر جہز فوری کا اقتدار بادل غواستہ تسلیم کر لیا ویسے بھی جہز فوری کا مزار شریف میں اثر بہت کم رہ گیا تھا۔ وہاں کی اصل طاقت اب ہزارہ جات اور حزب وحدت تھے۔ حزب وحدت نے دوستم کی واپسی میں خاص تعاون کیا تھا اس لیے دوستم ان کے خلاف زبان کھول کر بد مزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ اس نے عبدالملک کے خلاف خوب بیانات دیے اور طالبان کے قتل عام میں اس کے جرائم کی تفصیلات میڈیا کو بتائیں۔

طالبان پر شمالی اتحاد کے مظالم: بمصرین کے مطابق دوستم اس طرح طالبان کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دشت لیلیٰ میں طالبان کی اجتماعی قبروں کی تلاش میں اقوام متحدہ کے تفتیش کار کنوں کو مدد دی۔ سانحہ مزار شریف کو 5 ماہ گزر چکے تھے اور اب مختلف ذرائع سے اس سانحہ کی روح فرساتفصیلات سامنے آنے لگی تھیں۔ ان ذرائع کے مطابق اس سانحے میں ہزاروں طالبان گرفتار ہوئے تھے۔ ان کی اکثریت کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا جبکہ باقی ماندہ قید خانوں میں بدترین اذیتیں برداشت کرتے رہے۔

سب سے پہلے ان مظالم کی خبریں ہفت روزہ ”ضرب مومن“ نے شائع کیں اور 21 نومبر 1997ء کی اشاعت میں یہ تہلکہ خیز انکشاف کیا کہ جوز جان اور شیرخان کے گرد و نواح میں کم از کم دو ہزار طالبان مدفون ہیں جنہیں 120 اجتماعی قبروں اور 9 کنوؤں میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔

بعد میں قتل عام سے بچ نکلنے والے چند خوش قسمت طلبہ نے مزید روح فرساتفصیلات کیے۔ انہوں نے بتایا کہ قتل کرنے سے پہلے طالبان کو اتنی دیر تک بھوکا پیاسا رکھا گیا کہ ان میں سے کئی نقاہت کی وجہ سے ایڑیاں گزر گزر کر دم توڑ گئے۔ اس کے بعد ان کو گروہوں کی شکل میں ٹرکوں پر لا دیا گیا، کنٹینروں میں ٹھونسا کیا اور پھر انہیں دشت لیلیٰ اور دوسرے ویران علاقوں میں لے جایا گیا۔ یہاں بڑے بڑے گڑھے اور کنوئیں پہلے سے کھود لیے گئے تھے۔ طالبان کو جن کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے، دھکے دے دے کر ان گڑھوں میں گرادیایا گیا۔ مزاحمت کرنے والے طالبان کو باہر ہی گولیوں سے بھون دیا گیا۔ پھر انہیں بھی کنوؤں میں پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد دیر تک اعداد و سند فارنگ کی گئی جس سے کنوؤں میں گرے ہوئے قیدی سرخ بھل کی طرح تر پنے لگے۔ اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ دہشتیوں سے قیدیوں کے پرچے اڑا دیے گئے۔ آخر میں تمام کنوؤں کو بلند وزروں کے ذریعے پاٹ دیا گیا۔ طالبان کا یہ بیہانہ قتل عام جون 1997ء میں ہزارہ جات اور عبدالملک کی ملیشیا کے ہاتھوں ہوا۔ اگلے سال اگست 1998ء میں جینوا میں انسانی حقوق کمیشن کے ترجمان جان ولز نے یہاں تحقیقات

کے بعد اجتماعی قتل عام کی تصدیق کی اور بتایا کہ شیرخان کے نزدیک دشت لیلیٰ اور مزار شریف اور حیرتان کے مابین وسیع صحرا میں کئی بڑی بڑی اجتماعی قبریں ہیں جن میں صرف دشت لیلیٰ کے مدفنوں میں دو ہزار سے زائد لاشیں ملی ہیں۔ اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے پیک چونگ ہیرن نے بھی اس کی تصدیق کی۔ عبدالملک کے ایک وفادار افسر سلیم صابر نے ان جرائم کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ طالبان کو ایسے کنٹینروں میں بند کر کے صحرا تک لے جایا جاتا تھا جن میں ہوا کا بالکل گزر نہیں ہوتا تھا۔ بہت سے طالبان دم گھٹنے اور تپش کی وجہ سے جاں بحق ہوئے۔ کنٹینروں کی گرمی کی وجہ سے ان کی کھال جسوں سے اتر چکی تھی۔ عبدالملک کی درندہ صفت فوج اور ہزارہ جات نے نہ صرف طالبان کا قتل عام کیا تھا بلکہ انہوں نے مزار شریف کے گرد و نواح میں کئی ماہ تک ایسی آبادیوں میں خون کی ندیاں بہائیں جن کے بارے میں انہیں شک تھا کہ یہاں طالبان کی حمایت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ ستمبر 1997ء مزار شریف ہوئی اڈے کے قریب فیض آباد نامی چھوٹا سا گاؤں ان کی خون آشامی کی بھیئت چڑھا۔ یہاں 150 افراد جن میں بچوں اور بچیوں کی اکثریت تھی، اس الزام میں قتل کر دیے گئے کہ وہ طالبان کے حامی ہیں۔

قیدی طالبان سے بے رحمانہ سلوک: طالبان کے جو افراد قیدی بنا لیے گئے تھے، ان کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جا رہا تھا۔ انہیں تنگ دتار یک کوٹھڑیوں میں بند رکھا۔ اربا تھا اور سخت جبری مشقت لی جا رہی تھی۔ انہیں کوڑوں سے پیٹنا، لاتوں اور کونوں کا نشانہ بنانا، روزانہ بجلی کے پچاس پچاس جھکے دینا، گرم لوہے سے داغ دینا عام معمول تھا۔ کھانے کے لیے برائے نام غذا دی جاتی۔ یہ قیدی طبی سہولتوں سے محروم تھے اور ان کے زخم گھٹنے سڑتے رہتے تھے۔ احمد شاہ مسعودان میں سے بہت سے طالبان کو اپنی ہوئی انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے بچ شیر لے گیا تھا۔ بچ شیر جیل میں پہلے سے بہت سے طالبان قید تھے۔ ان پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، انہیں سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بچ شیر میں قید کاٹنے والے ایک طالب علم کا بیان ہے کہ ان کی ہیر کیں گندگی و غلاظت کا ڈھیر تھیں۔ صرف ان میں رہنمائی آدمی کا جینا دھبہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ انہیں ہر وقت سخت اور غلیظ گالیاں دی جاتیں۔ سخت جسمانی تشدد کیا جاتا۔ پورے چھ مہینے انہیں روٹی تک نہیں دی گئی۔ کھانے کے لیے اور کھاس پھوس اور درختوں کے پتے ان کے آگے ڈال دیے جاتے تھے۔ پاکستان کی جہادی تنظیموں نے ان کے لیے خور و نوش کا سامان اور کچھ رقم بھیجی تو ”بچ شیر کی مجاہد“ اسے شیر مادر سمجھ کر ہضم کر گئے۔

ضرب مؤمن نے 5 دسمبر 1997ء کی اشاعت میں ایک لرزا دینے والی خبر شائع کی جس کے مطابق بچ شیر کی جیل میں قید ایک حافظ قرآن طالب علم کی زبان کاٹ دی گئی۔ اس سہمانہ سزا سے پہلے وہ

طالب علم چیخ چیخ کر فریاد کرتا رہا کہ چاہے کوئی بھی سزا دی جائے اسے قبول ہے مگر زبان نہ کاٹی جائے
کیونکہ اس نے چھ سال کی محنت سے قرآن مجید حفظ کیا ہے اور یہ زبان تلاوت میں مصروف رہتی ہے۔ مگر
چیخ شیری افسران پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔



مآخذ و مراجع

- ❖ طالبان جہاد اللہ۔ فہمی ہویدی
- ❖ ہفت روزہ تکبیر: جلد 1996، 1997ء
- ❖ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 1، 2
- ❖ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد

تشیسواں باب

فتح مزار شریف و بامیان

1998ء کا آغاز: نیا سال شروع ہوا تو طالبان ایک بار پھر شمال پر فوج کشی کے لیے تازہ دم نظر آئے۔ جنوری 1998ء کے پہلے ہفتے میں انہوں نے دو ستم کے علاقے پر حملہ کر کے ”قیصار“ سمیت 50 کلومیٹر کا علاقہ چھین لیا۔ ادھر طالبان مخالفین نے زیر زمین سرگرمیاں شروع کر رکھی تھیں۔ سروبی میں مقامی کمانڈروں میں اڑھائی لاکھ ڈالر تقسیم کیے گئے تاکہ وہ بغاوت کر دیں۔ قندھار میں طالبان کے مرد آہن ملا داد اللہ کے قتل کی سازش تیار تھی۔ ایک دن چند مسلح افراد راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے مگر ملا داد اللہ کی گاڑی سے پہلے وہاں سے ایک اور گاڑی گزری۔ گھات میں چھپے مسلح افراد نے غلط فہمی سے اس کو نشانہ بنا ڈالا حالانکہ یہ گاڑی ان کے اپنے کمانڈر ملا نقیب کی تھی جو ربانی کا سابق کمانڈر تھا۔ کچھ دیر بعد ملا داد اللہ وہاں سے گزرے تو تباہ شدہ گاڑی سے زخموں کو نکال کر خود ہسپتال پہنچا آئے۔ انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کا اصل ہدف وہی تھے۔

اپنی تنظیم بہتر بنانے کے لیے ان دنوں طالبان نے ایک اہم نوعیت کا فیصلہ کیا۔ اب تک وہ رضا کاروں اور مجاہدین کے گروہوں کے اعزاز میں لڑتے تھے۔ باقاعدہ فوجی نظم و نسق سے بہت دور تھے مگر اب ”قومی فوج“ یا ”طالبان مسلح افواج“ بنانے کا اعلان کیا گیا۔ تاہم وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ کوئی ”جدید“ یا ”مرتب فوج“ نہ بن سکی۔

شعبہ امر بالمعروف کا قیام: فروری کے آغاز میں ایک اور اہم شعبہ قائم کیا گیا۔ اسے ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ کا نام دیا گیا۔ اس کے عہدے داروں کی ذمہ داری تھی کہ وہ معاشرے سے گناہوں، شرعی محرمات اور اخلاقی برائیوں کا خاتمہ کریں اور لوگوں کو نیکی کی تلقین کریں۔ اس شعبے کے عہدے داروں کو گورنروں تک سے باز پرس کے اختیارات حاصل تھے۔ ”امر بالمعروف ونہی عن المنکر“ نے ملک میں برائیوں کے ازالے کے لیے بھرپور کام کیا۔

تہذیب و ادب

طالبان دیرے دیرے شمالی اتحاد کی سرحدوں پر حملے کر کے ان کی دفاعی قوت کا اندازہ کرتے رہے۔ قندوز کے علاوہ غور بند میں بھی طالبان کی خاصی تعداد تک محاصرے میں تھی۔ ان کے مسائل کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ جنوری 1998ء میں غور بند کے محصور طالبان کو 240 ٹن کنڈم پہنچائی گئی تھی۔ یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ ساتھ ساتھ ادھر ادھر حملے بھی ہو رہے تھے۔ فروری کے دوران قیصار (فاریاب) میں رشید دوستم طالبان کی مارٹر توپ کی زد میں آکر شدید زخمی ہو گیا اور اسے علاج کے لیے بیرون ملک لے جایا گیا۔ طالبان کوئی بڑا حملہ کرنے میں تامل کرتے رہے۔ دراصل شمال میں اتحادی آپس میں ٹکرا رہے تھے اور طالبان ان کی ٹوٹ پھوٹ کا عمل جاری رہنے دینا چاہتے تھے۔

شمالی اتحاد کی باہمی لڑائیاں: مارچ کے آخری عشرے میں شمالی اتحاد کی خانہ جنگی عروج پر پہنچ گئی۔ اب لڑائی حزب وحدت اور دوستم کے درمیان ہو رہی تھی۔ دوستم نے حزب وحدت کے 70 افراد گرفتار کر کے انہیں زندہ دریائے آمو میں پھینک دیا۔ جواب میں حزب وحدت نے دوستم کے 100 اہلکار قتل کر دیے۔ اس کے بعد مزار شریف کے گرد و نواح میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ ازبک اور ہزارہ جات ایک دوسرے پر پلٹا پڑے۔ حزب وحدت نے اپنا غصہ مزار شریف پر نکالا اور شہر کے بازاروں، گوداموں اور سرکاری عمارتوں کو لوٹ لیا۔ دوستم نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے حیرتان کو لوٹ لیا۔ یوں نظر آنے لگا جیسے شمال میں صرف ڈاکوؤں کا راج ہے۔ فساد یو این او کے دفاتر پر حملے کرتے رہے۔ شاہراہوں اور تاجروں کو لوٹا تو روز کا معمول تھا ہی، حاجیوں کے قافلوں کو بھی نہ بخشا گیا۔ اس صورت حال میں اسلام آباد میں مقیم طالبان کے قائم مقام سفیر مولانا طیب آغا نے بجا طور پر اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا کہ شمالی اتحاد ڈاکوؤں کا گروہ ہے اس لیے اقوام متحدہ کو فوری طور پر اس کی رکنیت منسوخ کر دینا چاہیے۔

اسامہ بن لادن افغانستان میں: ہم ذکر کر رہے ہیں 1998ء کا اور یہ وہ سال ہے جس میں شیخ اسامہ بن لادن امریکا کے سب سے بڑے مخالف کی صورت میں عالمی آفتی پر ابھرے اور اس کے بعد وہ میڈیا کا اہم ترین موضوع بن گئے۔ افغانستان کی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ اسامہ بن لادن 1957ء میں سعودی عرب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد بن لادن سعودی عرب کے نامور تاجر تھے۔ اسامہ بن لادن کا بچپن مدینہ منورہ میں گزرا۔ جدہ کی درس گاہوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی سے بزنس مینجمنٹ اور اقتصادیات کی اسناد پائیں۔ برطانیہ سے انجینئرنگ میں گریجویشن کیا۔ تعلیم کا سلسلہ تھا تو خاندانی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ محمد بن لادن فوت ہوئے تو اسامہ بن لادن کو ورثے میں 25 کروڑ ڈالر ملے جس سے انہوں نے بن لادن کمپنی قائم کی۔

سول انجینئرنگ کے فن میں انہیں کمال حاصل تھا، ان کی تعمیری کمپنی کا دائرہ پوری دنیا میں پھیل گیا۔ افغانستان پر روس کے یلغار کے فوراً بعد شیخ اسامہ نے جہاد میں حصہ لیا۔ وہ 1979ء کے دوران 22 سال کی عمر میں روسیوں کے خلاف لڑے۔ اپنی فنی مہارت کو کام میں لا کر انہوں نے مجاہدین کے لیے پاک افغان سرحدی علاقوں میں ایسے زمین دوز ٹینکر اور موٹر پچے تعمیر کیے جو ہوائی حملوں سے بالکل محفوظ تھے۔ ان عمارتوں کی تعمیر میں کسی قدر مہارت سے کام لیا گیا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے ہم کو سفید کی خفیہ عمارت کی مثال دیتے ہیں جو استاد سیاف کے مرکز کے قریب ہزاروں فٹ بلند سلسلہ کوہ کو اندر سے کھوکھلا کر کے بنائی گئی تھی۔ اس عمارت میں رہائشی کمروں، اسلحہ خانوں، خوراک کے گوداموں اور بارکنگ کے علاوہ سو بستروں کا جدید ترین ہسپتال بھی تھا۔ عمارت کی مرکزی سرنگ کی بلندی 200 فٹ تھی۔ اس سے نکلنے والی ذیلی سرنگیں پورے پہاڑی سلسلے میں پھیل گئی تھیں جن میں ایک ساتھ کئی گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ یہ حیرت انگیز منصوبہ بن لادن نے صرف ایک سال میں مکمل کیا تھا۔

1989ء میں سعودیت یونین افغانستان سے نکل گیا اور جہاد فتح سے ہمسکار ہوا مگر بن لادن کا سفر جاری رہا۔ وہ شیخ عبداللہ عزام شہید کے گرویدہ تھے اور ان کے افکار کو کردار سے بے حد متاثر تھے۔ وہ جہاد کو پوری دنیا میں زعمہ کرنا چاہتے تھے۔ 1989ء میں شیخ عزائم کی شہادت کے بعد بن لادن ہی عرب مجاہدین کے عالمی قائد کے طور پر سامنے آئے۔ ان دنوں افغان مجاہدین کے گروپوں میں سیاسی چپقلش بہت بڑھ گئی تھی اس لیے اسامہ بن لادن اس صورت حال سے اکتا کر واپس سعودی عرب آگئے اور شہداء کے ہزاروں خاندانوں کی کفالت کے منصوبے پر کام شروع کر دیا۔ 1990ء میں کویت پر عراق کے حملے کے بعد شیخ اسامہ سعودی وزیر دفاع شہزادہ ناف بن سلطان سے ملے اور ڈیزرٹ اسٹارم آپریشن کے لیے اپنی خدمات پیش کیں مگر ساتھ ہی شرط عائد کی کہ امریکا کو مداخلت کا موقع نہ دیا جائے۔ سعودی حکمرانوں نے اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے امریکا کو خوش آمدید کہا جس کے نتائج وہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ چونکہ سعودی شہزادے ناف بن سلطان نے امریکا کو جزیرہ العرب میں مداخلت کا موقع دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا اس لیے شیخ اسامہ نے ایک ملاقات میں ناف پر اسلام سے غداری کا الزام لگایا۔ اس پر سعودی حکومت نے اسامہ بن لادن کو "نا پسندیدہ شخصیت" قرار دیا۔ یہ 1992ء کا واقعہ ہے۔

اسامہ بن لادن سوڈان میں: اس دوران سوڈان میں "حسن ترابی" اسلامی انقلاب کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ شیخ اسامہ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ 1994ء میں سعودی حکومت نے اسامہ بن لادن کی مسلسل تنقید سے برا فروختہ ہو کر انہیں جلا وطن کر دیا۔ اس وقت انہیں سوڈان ہجرت کر جانا بہتر نظر

آیا۔ چنانچہ وہاں منتقل ہو کر انہوں نے عرب اور افغان مجاہدوں کا ایک منصوبہ کر دیا۔ 1993ء میں یہیں سے انہوں نے صومالیہ میں مداخلت کرنے والی امریکی فوجوں کے خلاف کارروائیوں کی قیادت کی۔ میکاویشو (صومالیہ) میں 18 امریکی فوجی مارے گئے اور امریکا صومالیہ سے نکل گیا۔ اب اس نے اسامہ بن لادن کو اپنا سخت ترین حریف تصور کر لیا۔

اپریل 1996ء میں امریکی صدر بل کلنٹن نے دہشت گردی کے خلاف قانون کی منظوری دے کر بن لادن کمپنی کے 300 ملین ڈالر ضبط کر لیے۔ اس دوران طالبان کا تلپور ہو چکا تھا اور افغانستان کے مشرقی اور جنوبی علاقوں کا امن وامان بحال ہو رہا تھا۔ ان حالات میں شیخ اسامہ مئی 1996ء میں دوبارہ افغانستان آ گئے۔ ان کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ وہ طالبان قیادت سے بالکل ناواقف تھے اس لیے ان پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ سیدھا جلال آباد ایرپورٹ پر اترے اور کئی ماہ تک جلال آباد میں علاقائی شورٹی کی امان میں رہے جس کا سربراہ حاجی عبدالقدیر تھا۔

اس دوران امریکا کی جانب سے شیخ اسامہ کو حوالے کر دینے کے مطالبات شروع ہو گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگست 1996ء میں شیخ اسامہ نے امریکا کے خلاف جہاد کا آغاز کرنے کا اعلان کیا تھا۔ امریکا کے نزدیک اسامہ کو گرفتار کرنا ضروری تھا۔ یہ کام ان دنوں زیادہ مشکل نہ تھا کیونکہ افغانستان کے مقامی کمانڈروں میں سے درجنوں کمانڈر خود مختار تھے اور ان کی وفاداریاں ڈالروں کے عوض کبھی تھیں۔ اسامہ بن لادن صرف مقامی مجاہد رہنماؤں کے بھروسے پر محفوظ تھے ورنہ درحقیقت ربانی کو طالبان سے مقابلہ کے لیے امریکا کی مزید حمایت کی ضرورت تھی۔ اسے خوش کرنے کے لیے ربانی حکومت اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے امریکا سے اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ قرین قیاس ہے کہ جلال آباد کے گورنر حاجی عبدالقدیر کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہوگا۔ بہر صورت اسامہ بن لادن کو اس سازش کا قطعاً علم نہ تھا ورنہ وہ افغانستان سے نکلنے یا طالبان کے علاقے میں پناہ لینے کی کوشش ضرور کرتے۔ تاہم اس سے قبل کہ اسامہ بن لادن پر ہاتھ ڈالا جاتا، طالبان نے اچانک جلال آباد فتح کر لیا اور شیخ کی گرفتاری کا امریکی منصوبہ احوارہ گیا۔ یہ ستمبر 1996ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔

طالبان اور بن لادن: طالبان نے شیخ اسامہ بن لادن کو معزز مہمان کی حیثیت دے کر ہر ممکنہ سہولت فراہم کی۔ ادھر ہی آئی اے نے اسامہ بن لادن کی گرفتاری کو اپنا ہدف بنالیا۔ 1997ء کے شروع میں ہی آئی اے کے کمانڈروں نے پاکستانی اہلکاروں اور افغان باشندوں کی مدد سے شیخ کے خلاف ایک خفیہ آپریشن کیا مگر وہ انہیں اغوا نہ کر سکے۔ اس کے بعد اسامہ بن لادن امریکا کے خلاف مسلسل بیانات

دیتے رہے۔ 23 فروری 1998ء کو حکومت میں واقع القاعدہ کے مرکز سے ایک اعلامیہ جاری ہوا جس میں یہود و نصاریٰ کے خلاف اعلان جہاد کیا گیا اور کہا گیا کہ امریکا عالم اسلام کے مقامات مقدسہ پر تاجریں اور مسلمانوں کے وسائل کا غاصب ہے اس لیے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف جہاد فرض ہے۔ 14 مارچ 1998ء کو قندھار کے گورنر ملا حسن رحمانی نے امریکا کے مطالبے کے جواب میں کہا کہ ہم اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر امریکا کے حوالے نہیں کر سکتے۔ اگلے ماہ میڈیا پر یہ خبریں گشت کرنے لگیں کہ اسامہ کی گرفتاری کے لیے امریکی کمانڈرز پاکستان پہنچ گئے ہیں اور سرحدوں کے آس پاس ان کی نقل و حرکت جاری ہے۔

پاکستان کا ایٹمی دھماکا: یہ دن پاکستان پر بھی سخت دباؤ کے تھے۔ بھارت نے ایٹمی دھماکے کر کے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی۔ پاکستانی وزیراعظم میاں نواز شریف پر جوابی دھماکے نہ کرنے کے لیے امریکی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ تاہم پاکستان نے خطرہ مول لیتے ہوئے 28 مئی 1998ء کو ایٹمی دھماکے کر دیے اس طرح پہلی اسلامی ایٹمی طاقت ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔ طالبان نے اس اقدام کا خیر مقدم کیا۔ 15 جون کو طالبان کے وزیر اطلاعات ملا امیر خان متقی نے پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کی حمایت کرتے ہوئے میڈیا پر کہا کہ اگر ایٹمی دھماکے کرنا جرم ہے تو اسرائیل کو امریکانے ایٹمی صلاحیت کیوں فراہم کی؟ جون 1998ء میں شمالی اتحاد کے علاقے تخار میں ہولناک زلزلہ آیا۔ 5 ہزار افراد جاں بحق ہو گئے۔ طالبان نے شمالی اتحاد سے اختلافات بھلا کر متاثرین کو امداد کی پیش کش کی۔ تاہم یہ پیش کش شکوک و شبہات کی نذر ہو گئی۔

طالبان کا قاریاب پر حملہ: جون 1998ء کے وسط میں طالبان دو ستم کے علاقوں پر حملے کے لیے تیار تھے۔ دو ستم کو زیادہ خطرہ یہ تھا کہ طالبان دشت لیلیٰ کے مختصر صحرائی راستے سے گزر کر ”شبرغان“ پر بھی حملہ کر سکتے تھے مگر طالبان نے خلاف توقع ایک غیر معروف راستے سے ہوتے ہوئے قاریاب کے ضلع ”اندخوی“ پر جو دولت آباد سے 70 کلومیٹر دور تھا، حملہ کر دیا۔ یہی راستہ آگے شبرغان کو بھی جاتا تھا۔ طالبان جمعہ 26 جولائی 1998ء کو اندخوی پر قابض ہو گئے۔ ہتھے کو وہ دن بھر مقامی لوگوں سے اسلحہ جمع کرتے رہے اور سورج ڈھلتے ہی شبرغان کی طرف یلغار کر دی۔ تاریکی پھیلنے سے قبل شبرغان کے دفاع کا خطہ اول ٹوٹ چکا تھا اور ازبک سپاہی شبرغان سے فرار ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے مگر طالبان شبرغان سے 25 کلومیٹر دور رک گئے اور حالات کا جائزہ لینے لگے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رک گئے اور ان کا اگلا حملہ کہاں سے ہو گا؟

ایک دن نماز فجر ادا کرتے ہی طالبان نے شبرغان جانے والی شاہراہ کو چھوڑ دیا اور ایک کپے فیر معروف راستے پر پھل دیے جو کہ ”خواجه دو کوہ“ سے گزرتا ہے۔ یہ راستہ جو آگے جا کر مزار شریف شبرغان شاہراہ سے مل جاتا ہے، طالبان کے قبضے میں آ گیا۔ اس طرح تین شہر، تنگپ، فیض آباد اور موئی آباد دونوں طرف سے طالبان کے محاصرے میں آ گئے۔ یہ جمعرات 9 جولائی 1998ء کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد عام حملہ شروع ہوا جس میں 250 کیونٹ مارے گئے اور بڑی تعداد میں گرفتار ہوئے۔ مذکورہ تینوں شہر طالبان کے قبضے میں آ گئے۔

”میمنہ“ پر قبضہ: اتوار 12 جولائی کو طالبان نے ناریاب کے دارالحکومت ”میمنہ“ پر حملہ کیا۔ یہاں جہل دوستم کے چنیہ جنگجوؤں کی بڑی تعداد موجود تھی جنہیں طالبان کے خلاف ایک بڑے حملے کے لیے تیار کیا گیا تھا مگر اس سے پہلے ہی طالبان نے انہیں جالیا۔ ”میمنہ“ کی فتح میں گیارہ سوازیب سپاہی گرفتار ہوئے۔ ایک ہیلی کاپٹر، سینکڑوں روسی گائیڈ میزائل، 108 ٹینک، 250 کپ آپ گاڑیاں اور 50 بکتر بند گاڑیاں مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگیں۔ میمنہ کے پہاڑوں میں ایرانی اسلحے کے 20 بڑے گودام دریافت ہوئے جن میں موجود اسلحہ ختم کرنے کے لیے ٹرالروں اور کنٹینروں کے کئی قافلے کئی دن تک معروف رہے۔

شبرغان کی فتح: طالبان خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے شبرغان مزار شریف شاہراہ پر آ گئے۔ اب وہ ان دونوں شہروں کے بیچ میں تھے۔ اگر دشمن تیار ہوتا تو انہیں دونوں طرف سے گھیر سکتا تھا مگر طالبان کی نقل و حرکت پوشیدہ رہی۔ یکم اگست 1998ء کو جب وہ یکا یک مزار شریف کی طرف سے شبرغان پر حملہ آور ہوئے تو شبرغان کی دوستم لیشیا کے چھکے چھوٹ گئے۔ دوستم سب سے پہلے فرار ہو کر ازبکستان میں پناہ گزین ہوا اور وہاں سے ترکی چلا گیا۔ اس کے بھاگتے ہی ازبک کمانڈروں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے اور شبرغان کی خاص مزاحمت کے بغیر سرنگوں ہو گیا۔

طالبان نے یہاں دم نہ لیا اور فوراً سرپل پر چڑھائی کر دی۔ پہلے وہاں چہل میلے کے پانچ میزائل کپے بعد دیگرے داغے۔ کوئی جواب نہ آیا تو طالبان آگے بڑھتے چلے گئے۔ شبرغان کی فتح کے ایک گھنٹے بعد ”سرپل“ بھی فتح ہو چکا تھا۔ دودن کے اندر اندر شبرغان سمیت جوزجان کا پورا صوبہ طالبان کے کنٹرول میں آ گیا۔ دوستم کے ہزاروں سپاہی فرار ہو گئے۔ بعد میں ان کی اکثریت نے کوئی جائے پناہ نہ ملنے پر طالبان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں 10 بلین (گیارہ کھرب) کعب میٹرکس کے قدرتی ذخائر اور 365 کلومیٹر طویل گیس لائن بھی طالبان کے قبضے میں آ گئی۔

مزار شریف پر براہ راست حملے کی تیاری: اب طالبان مزار شریف کے چاروں طرف مورچے مضبوط کر چکے تھے۔ اس کے باوجود احتیاط کے طور پر انہوں نے اپنے جاسوس بلخ اور مزار شریف کے دیگر اضلاع میں بھیج کر حالات معلوم کیے جن کے مطابق چار اضلاع میں طالبان کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ ان مقامی باشندوں کے ذریعے فتح مزار میں حاکم مکہ رکاوٹوں کو دور کرنے یا کچلنے کی حکمت عملی واضح کی جاتی رہی۔ تین چار دن اس تک دود میں گزرے۔

جمعہ ۱ اگست کا دن طالبان کے لیے کئی اہم کامیاں لایا۔

✽ طالبان کا ایک دستہ سہل کے ضلع ”ٹینک چارک“ پر قبضہ کر کے مزار شریف سے بامیان جانے والے راستے کے قریب تر آ گیا۔ جس کی وجہ سے مزار شریف کے جنگجوؤں کو خطرہ لاحق ہو گیا کہ وہ پیچھے بھی گھیرے میں آ سکتے ہیں اور شکست کھانے کے بعد بامیان کی طرف راہ فرار بھی بند ہو سکتی ہے۔

✽ دولت آباد میں اچانک کیونسٹوں نے طالبان کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ طالبان نے جوابی حملے کے لیے پہلی بار شبرخان ایرپورٹ استعمال کیا اور فضائی حملے کر کے دولت آباد کے کیونسٹوں کو ازبکستان کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

✽ حزب وحدت کے جنگجوؤں نے مزار شریف سے نکل کر بلخ پر حملہ کر دیا جہاں طالبان کے حامی کمانڈروں کا غلبہ تھا۔ طالبان کے چند گروپوں نے خفیہ راستوں سے کارروائیاں کر کے یہ حملہ ناکام بنادیا۔

✽ طالبان کمانڈر ملا محمد فضل مزار شریف پر فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے 5 ہزار طالبان سپاہیوں کے ساتھ بلخ پہنچ گئے۔

✽ شام کو بارش کی وجہ سے مزار شریف کے گرد صحرائی علاقے میں ریت جم گئی تھی جس سے طالبان کے پیادہ دستوں کے لیے نقل و حرکت آسان ہو گئی۔

ملا فضل کی حکمت عملی: ہفتہ 8 اگست کی صبح طالبان مزار شریف پر یلغار کے لیے تیار تھے۔ اسی دن طالبان کی توجہ مزار سے ہٹانے کے لیے جہل روزی نے ازبکوں کو منظم کر کے دولت آباد پر حملہ کر دیا۔

تاہم وہاں قہیمات طالبان نے مقامی لوگوں کی مدد سے یہ حملہ ناکام بنادیا۔ جہل روزی کئی ٹینک اور 13 ہزار لیئر تیل سے لدے ہوئے ٹینکر چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ طالبان مزار شریف پر حملے کے لیے پوری طرح

چوکس رہے۔ بلخ کے مقامی مجاہدین نے طالبان کو مزار شریف پر حملے کے لیے تمام راستے سمجھا دیے تھے اور ان کے تین ہزار رضا کار طالبان کے ساتھ اس یلغار میں شریک تھے۔

طالبان مزار شریف کے شمال، مغرب اور مشرق میں موجود تھے۔ صرف جنوبی راستہ ان کے قبضے میں

نہیں تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ مزار کے جنوبی پہاڑی دروں پر بھی کنٹرول حاصل کر لیں اور پھر مغرب، شمال اور جنوب سے بیک وقت حملہ کریں۔ مزار شریف کے دفاع کے لیے اب صرف حزب وحدت کے ہزارہ جنگجو رہ گئے تھے۔ گرد و نواح سے ازبکوں کی طاقت کا صفایا ہو گیا تھا۔ مزار شریف کی شہری آبادی کا بڑا حصہ جنگ کے خوف سے محفوظ مقامات کی طرف نقل مکانی کر گیا تھا جن میں اکثریت ازبکوں اور تاجکوں کی تھی۔ البتہ ہزار جات اب بھی شہر میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کی بستیوں اور آبادیوں میں روانی نظر آتی تھی۔ یہ لوگ شہر کے گرد خندقیں کھود کر زبردست دفاعی تیاریاں کر رہے تھے۔

مزار شریف سرنگوں ہو گیا: ہفتہ 18 اگست 1998ء کی صبح طالبان کی ہائی کمان نے فوج کو مزار شریف پر فیصلہ کن حملے کا حکم دے دیا۔ صبح 8 بجے طالبان کے دستے مزار شریف کی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ہزارہ جات خندقوں اور مورچوں سے گولوں اور گولیوں کی بارش کر رہے تھے۔ مگر طالبان رکنے میں نہ آئے۔ ان کے سپہ سالار ملا محمد فضل بذات خود گولیوں کی برسات میں گھس گئے۔ پیچھے پیچھے طالبان بھی لپکتے آرہے تھے۔ ان کے پیادہ دستوں نے نہایت سرعت سے یلغار کی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی دہلیز پر پہنچ گئے۔

طالبان نے فضا کی طاقت بھی استعمال کی اور حریف کے ٹھکانوں پر شدید بمباری کی۔ اس کے علاوہ توپ خانے سے ٹینک اور دو میلے کر جتے رہے، راکٹ داغے جاتے رہے، بکتر بند گاڑیاں آگے بڑھتی رہیں، مشین گنوں کے دھانے کھلے رہے۔ صبح 10 بجے طالبان مزاحمت کی ہر چٹان کو توڑتے پھوڑتے شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ جو مسلح آدمی یا ہزارہ جات میں سے جو شخص ان کے سامنے آیا مارا گیا۔ ہزارہ جات کے بہت سے مسلح افراد گھروں کی کھڑکیوں اور چھتوں پر مورچے بنا کر طالبان پر فائرنگ کرتے رہے مگر جلد ہی ان کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ دو گھنٹے کی خونریزی کے بعد شہر مکمل طور پر طالبان کے قبضے میں آ گیا۔ اس کارروائی میں طالبان کے تیس افراد کام آئے جبکہ حزب وحدت کے جو افراد شہر میں رہ گئے تھے ان میں سے سو دو سو کے سوا سب مارے گئے۔ اس سے قبل ان کی ایک بڑی تعداد بامیان کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ طالبان نے مزار شریف میں قید اپنے 118 ساتھی رہا کر لیے جبکہ 31 طالبان قیدیوں کو ہزارہ جات اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

مزار کے مفرورین کا تعاقب: عام حالات میں شاید طالبان مفرورین کا تعاقب نہ کرتے مگر انہیں یقین تھا کہ حزب وحدت کے جنگجو بامیان سے اڑسرو نو منظم ہو کر مزار شریف پر چڑھائی کریں گے چنانچہ مفرورین کا پوری سرعت سے تعاقب کیا گیا جس میں طالبان کے پیادہ دستوں کے علاوہ فضائیہ نے بھی حصہ لیا۔ مفرورین کی خاصی تعداد طالبان کی گولہ باری اور بمباری کی زد میں آ کر ہلاک ہو گئی مگر بہت

سے افراد ذہ صوف تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں انہوں نے شاہراہ کا پل اڑا کر زمینی تعاقب ناممکن بنادیا اور بامیان کی طرف نکل گئے۔ اس کارروائی میں طالبان کی فضائیہ کی عمدہ کارکردگی پر ملاحظہ عمر کی جانب سے پائلٹوں کو خصوصی انعامات دیے گئے۔

طالبان مزار شریف میں: ادھر مزار شریف میں طالبان نے شہر کی تمام سڑکوں، چوکیوں اور عسکری مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد فوج کیسٹوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا، جگہ جگہ آویزاں خمینی اور مزار کی تصاویر کو جلادیا۔ شہر میں ایک ٹی وی اسٹیشن بھی تھا جو ایران نے حال ہی میں بنوایا تھا۔ برہان الدین ربانی نے صرف تین ہفتے پہلے اس کا افتتاح کیا تھا۔ اس پر روزانہ تین گھنٹے تک ایرانی نشریات چلا کرتی تھیں، طالبان نے اسے بند کر دیا۔ مزار شریف سے جو اسلحہ طالبان کے ہاتھ لگا اس میں روسی ساخت کے کیمارہ اسلکمیزائل بھی شامل تھے۔ حزب وحدت کے قیدیوں کو شہر خان جیل بھیج دیا گیا۔ ان میں 45 ایرانی ٹرک ڈرائیور بھی شامل تھے جو ایرانی سرحد سے حزب وحدت کے لیے ہتھیار لاتے ہوئے راستے میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔

ایرانی سفارت کاروں کا قتل: مزار شریف پر قبضہ کے دوران طالبان کو ایک سنگین مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کے ایک کمانڈر نے ایرانی تفصیل خانے میں گھس کر وہاں موجود ایرانی سفارت کاروں کو قتل کر ڈالا۔ اس واقعے پر ایران نے زبردست احتجاج کیا اور ساری دنیا نے اس کا ساتھ دیا۔ طالبان شروع میں ایرانی سفارت کاروں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کرتے رہے۔ ان کے ترجمان کا کہنا تھا کہ شاید وہ لوگ طالبان کے حملے سے قبل خوفزدہ ہو کر کہیں فرار ہو گئے تھے۔ مگر جب بیرونی دباؤ حد سے بڑھ گیا تو طالبان حکومت نے تسلیم کیا کہ ایرانی سفارت کار مزار شریف کی جنگ کا نشانہ بن گئے تھے۔ تاہم ان کا قتل طالبان کے ایک کمانڈر دوست محمد نے از خود کیا تھا، طالبان قیادت کا یہ حکم نہیں تھا۔ ایرانی سفارت کاروں کے قتل پر افغانستان اور ایران کے تعلقات آئندہ ہفتوں میں اتنے کشیدہ ہو گئے کہ دونوں ملکوں میں جنگ چھڑ جانے کے خطرات پیدا ہو گئے اور سرحدوں پر دونوں ملکوں کی فوجیں چوکس ہو گئیں۔

طالبان کا طالقان پر قبضہ: مزار شریف فتح کرنے کے بعد طالبان نے کسی وقفے کے بغیر اسی دن طالقان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ 10 گھنٹے بعد وہ طالقان پر بھی قبضہ کر چکے تھے۔ احمد شاہ مسعود آخر تک طالقان میں تھا مگر طالبان کی اچانک یلغار سے وہ ششدر رہ گیا۔ اسے افراتفری میں طالقان سے فرار ہو کر ”بچ شیر“ جانا پڑا۔ ادھر گلبدین حکمت یار اور برہان الدین ربانی مزار شریف سے فرار ہو کر بدخشاں پہنچ چکے تھے جبکہ حزب وحدت کے لیڈر استاد تھقن نے بامیان میں پناہ لے لی تھی۔ اس

پسپائی کے دوران حزب وحدت کے جنگجو مزار سے بامیان تک مختلف شہروں میں پھیل گئے تھے۔ انہوں نے سالانگ شاہراہ کے کئی اہم نقاط پر قبضہ بھی کر لیا تھا۔

قتیبہ بن مسلم رحمہ اللہ کے نقوش قدم پر: طالبان حزب وحدت کا قضیہ نمٹانے کے لیے جلد از جلد بامیان پر دھاوا بولنا چاہتے تھے مگر اس سے قبل سالانگ شاہراہ کو مکمل طور پر حزب وحدت سے داہیں لیرا ضروری تھا۔ چنانچہ طالبان نے اگلا ہدف ”خلم“ کو قرار دیا جو مزار شریف سے 60 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ کئی گھنٹوں کی جنگ کے بعد طالبان نے ”خلم“ پر قبضہ کر لیا اور حزب وحدت کے جنگجو فرار ہو کر جنوب میں نئے مورچے بنانے لگے۔ انہوں نے ”خلم“ سے 15 کلومیٹر دور ”دڑہ صیاد“ کو کنٹینر دلوں سے بند کر کے بارودی دھماکے کر دیے جس سے شاہراہ بالکل مسدود ہو گئی۔

اسی شب بی بی سی نے حزب وحدت کے ترجمان کا انٹرویو نشر کیا جس نے دعویٰ کیا کہ سمنگان میں طالبان کے حامی کمانڈروں کو بھگا دیا گیا ہے اور صوبے کے مرکز ”ایک“ پر حزب وحدت کا کنٹرول ہو چکا ہے۔ دیگر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ان علاقوں میں حزب وحدت طالبان کے حامیوں کا بے دریغ قتل عام کر رہی ہے۔ ادھر شاہراہ سالانگ بند ہو جانے کے بعد طالبان کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ کنٹینر دلوں کو ہٹانے اور لمبے اٹھانے میں اب تک کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ یہ نہایت دشوار گزار مقام تھا۔ سمنگان کی طرف بڑھنے کے لیے کوئی قبائل راستہ دور دور تک موجود نہ تھا۔ کتب تاریخ کے مطابق 91ھ میں فارخ خراسان قتیبہ بن مسلم باہلی سمنگان فتح کرنے کے لیے اسی راستے سے گزرے تھے۔ اس وقت بھی حریف فوج نے اس دڑے کو بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے قتیبہ بن مسلم رحمہ اللہ کی پیش قدمی خاصے دنوں تک رک رہی تھی۔ تیرہ سو سال کے بعد طالبان بھی اس جگہ آ کر رکنے پر مجبور ہو گئے تھے مگر ان کے پاس انتظار کا وقت نہیں تھا۔ ان حالات میں طالبان کے کمانڈروں وزیر داخلہ ملاخیر اللہ خیر خواہ اور سپہ سالار ملا فضل نے ایک عجیب منصوبہ ترتیب دیکر راتوں رات اس پر عمل کر ڈالا، انہوں نے دیکھا کہ سیدہ حاسنہ جاری رکھنا کئی دنوں تک ممکن نہیں تو ایک نہایت طویل اور چکر دار راستہ تجویز کیا جو کئی صوبوں سے گزر کر حزب وحدت کے مورچوں کی پشت پر جا کھٹکا تھا اگرچہ اس طرح تیس چالیس کلومیٹر کی جگہ اڑھائی تین سو کلومیٹر طویل سفر کرنا پڑتا مگر طالبان نے مزید تاخیر اور انتظار کی بجائے اس پر عمل کرنا ضروری سمجھا۔

طالبان کی حیرت انگیز جنگی چال: ان کی فوج کا کچھ حصہ نمائشی طور پر وہاں رکا رہا جبکہ بڑا حصہ خلم سے جنوب کی طرف آگے بڑھنے کی بجائے مشرق میں قندوز کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس فوج کی قیادت ملا فضل کر رہے تھے۔ 7 گھنٹوں میں یہ فوج قندوز پہنچی۔ قندوز سے اس نے صحرا کا دشوار گزار راستہ

اختیار کیا اور بغلان پہنچ کر جنوب کی طرف مڑ گئی۔ یہاں سے اس نے ایک غیر معروف کچے راستے پر پیش قدمی کی۔ 25، 26 گھنٹوں کے مسلسل سفر کی وجہ سے طالبان بھوک اور پیاس سے بے حال ہو رہے تھے۔ تاہم وہ سمسگان کے مرکز ”ایبک“ کے قریب پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

”ایبک“ اور ”پل خرمی“ کے درمیان ”اباطک“ کے مقام پر طالبان کی چند ٹولیاں موجود تھیں جبکہ اس جگہ سے 35 میل دور ”ایبک“ شہر کی فوج سے بالکل خالی تھا کیوں کہ حزب وحدت کے تمام جنگجو طالبان کو روکنے کے لیے درزہ میاد کی طرف چلے گئے تھے۔ انہیں پشت سے کسی حملے کا خیال تک نہیں تھا۔

ملا فضل کے قتلے ماندے مگر پرجوش لشکر نے ”ایبک“ کو ایک گولہ داغے بغیر اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد یہ لشکر حزب وحدت پر بڑا حملہ کرنے آگے روانہ ہوا جہاں درے پر حزب وحدت کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے جبکہ غلم میں موجود طالبان کی تھوڑی سی فوج ان پر ہلکی پھلکی گولہ باری کر رہی تھی تاکہ وہ پشت سے بالکل غافل رہیں۔ ملا فضل کا لشکر جب درے کے قریب پہنچا تو حزب وحدت کے اکثر جنگجو بے فکر ہو کر آرام کر رہے تھے۔ بہت سے سپاہی قریب بیٹے دریا میں تیر رہے تھے۔ طالبان کا یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گئے۔ کسی کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکا۔ بہت سے مارے گئے جبکہ باقی ماندہ تمام افراد گرفتار ہو گئے۔ اس طرح مزار شریف سے لے کر غلم، ایک اور سمسگان تک کا پورا علاقہ طالبان کے کنٹرول میں آ گیا۔ شاہراہ سالانگ بھی اب ان کے قبضے میں تھی۔

درزہ کیان کی پراسرار دنیا: افغانستان میں غیر ملکی سازشوں کا ایک اور اہم مرکز ”درزہ کیان“ تھا۔ یہ گزشتہ 800 برس سے اسماعیلی فرقہ (آغا خانوں) کا مرکز تھا۔ یہ جماعت دراصل حسن بن صباح کے ”باطنی گروہ“ سے تعلق رکھتی ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے اواخر میں حسن بن صباح نے شمالی ایران کے کوہستانی علاقے ”قزوین“ میں ”الموت“ نامی پہاڑ کی چوٹی پر ایک ناقابل تحریف قلعے کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ اس قلعے کو ”آشیانہ عقاب“ بھی کہا جاتا تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے خنجر بردار فدائیوں کے ذریعے پوری دنیا کو اتنا دہشت زدہ کیا کہ بہت سی حکومتیں اسے خراج دیتی تھیں۔ اس کے جانشینوں نے مزید ڈیڑھ صدی تک اس سلسلے کو قائم رکھا۔ آخر کار ساتویں صدی ہجری میں ہلاکو خان کے ہاتھوں ”الموت“ کا قلعہ تباہ اور باطنی گروہ ختم ہوا۔ اس جماعت کے باقی ماندہ افراد ادھر ادھر بکھر گئے۔

ان کے کچھ لوگ افغانستان کے درزہ کیان میں آکر آباد ہو گئے۔ رفتہ رفتہ یہ جگہ ان کا نیا مرکز بن گئی۔ ”الموت“ کی یاد میں یہاں بھی جگہ جگہ عقاب کی تصاویر، مجسمے اور علامات نمایاں تھیں۔ منصور نادری اس مرکز کا سربراہ تھا۔ وہ طالبان مخالف گروہوں اور کمانڈروں کو معاشی امداد دینے میں سب سے آگے آگے

تھا۔ صرف ان تین مہینوں میں اس نے طالبان مخالف کمانڈروں میں 5 کروڑ تقسیم کیے تھے۔ طالبان کے حملے کے پچھلے پش نظر اس نے فرانس سے رابطے تیز کر دیے تھے جہاں آغا خانی جماعت کے پیٹروائے اعظم ”آغا خان“ کی سکونت ہے۔ طالبان کو دڑہ کیان کے قریب دیکھ کر آغا خان کے حکم کے مطابق دنیا بھر کی تمام آغا خانی عبادت گاہوں میں ”ستارہ“ نامی خاص عبادت شروع کر دی گئی جو عموماً سات دن تک کی جاتی ہے مگر اس نازک وقت میں یہ ایک تسلسل سے کی جاتی رہی۔

طالبان کی منصور نادری کو دھمکی: فتح مزار شریف کے تین دن بعد طالبان ہل خری تک پہنچ گئے۔ منصور نادری کا بیٹا سید نادری جو یہاں کا کنٹرول سنبھالے ہوا تھا، فرار ہو گیا۔ 11 اگست کو طالبان نے ہل خری پر قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی انہوں نے منصور نادری کو دھمکی دی کہ وہ دس دن کے اندر اندر دڑہ کیان کو خالی کر دے۔

منصور نادری نے فوراً آغا خان سے رابطہ کیا۔ جواب میں آغا خان نے اسے اطمینان دلایا اور خاص مدد کا وعدہ کیا۔ تاہم کئی دنوں تک خاموشی چھائی رہی۔ جب طالبان کی دی ہوئی ڈیڈ لائن میں صرف ایک دن رہ گیا، تب اچانک امریکا نے شمال مشرقی افغانستان پر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ کروڑ میزائلوں سے کیا گیا تھا۔ اس کا خاص نشانہ خوست میں اسامہ بن لادن کے عسکری تربیتی کیمپ تھے۔ 20 اگست 1998 کو کی جانے والی اس کارروائی میں 20 افراد شہید اور 30 زخمی ہوئے جن میں زیادہ تر افغان اور پاکستانی تھے۔ امریکا دنیا کو یہ باور کرانے لگا کہ اس نے جوابی کارروائی کی ہے۔ 17 اگست 1998ء کو کینیڈا اور حترانیہ میں امریکی سفارت خانوں کو بموں سے اڑا دیا گیا تھا جس میں 224 افراد ہلاک اور 500 کے لگ بھگ زخمی ہوئے تھے۔ امریکا کا کہنا تھا کہ یہ کارروائیاں اسامہ بن لادن نے کروائی تھیں جن کا جواب دینا ناگزیر تھا۔ تاہم طالبان حکومت اور عوام نے امریکی الزام کو مسترد کر دیا۔ ملک بھر میں امریکا کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اپنے بیان میں کہا کہ امریکی صدر بل کلنٹن نے واسٹ ہاؤس کے شرمناک اسکیڈل سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لیے یہ کارروائی کی ہے۔ (واضح رہے کہ ان دنوں صدر کلنٹن کو ”مونیکا لونسکی“ نامی ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات رکھنے کی وجہ سے عالمی سطح پر شدید نفرت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔)

دڑہ کیان طالبان کے قبضے میں: خوست کے معسکر پر امریکی حملے سے طالبان مخالف قوتوں کو اطمینان ہو گیا کہ طالبان اب امریکا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے اور امریکا کا دباؤ ڈال کر دڑہ کیان پر ان کا حملہ بھی رکوا دے گا۔ حملے کی خبر سن کر منصور نادری بے حد خوش تھا۔ دڑہ کیان میں جشن منایا گیا اور منصور نادری نے فون کر کے آغا خان کا ”خصوصی مدد“ پر شکریہ ادا کیا۔ رات بھر وہ شراب کے جام

لڑھا جاتا اور اپنے پالتو کتے سے کھینٹا رہا۔ مگر سچ دم طالبان کی یلغار کی خبر نے اس کا نشہ ہرن کر دیا۔ طالبان کی بارگاہِ توپ کا ایک گولہ سیدھا اس طاقت ور سیٹلائٹ فون سسٹم کو آ کر کرا جس سے ہاروی فرانس میں آغا خان سے رابطہ کیا کرتا تھا۔ انجامِ اتریب دیکھ کر اس نے راہِ فرار اختیار کرنے میں عافیت جانی۔ دو دن بعد طالبان درہ کیان میں داخل ہو گئے۔ وادی کی خوبصورت مہارتوں کی رعنائی اور عقاب کی شکل والا محل دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ پہاڑ پر چڑھنے والی ترین نمائندگی بھی ایک نئی چیز تھی۔ یہاں سے اسلحے کے اتنے زیادہ انبار برآمد ہوئے کہ صرف ایک ڈپوکو 500 کارکن تین دن تک ٹرکوں میں لادتے رہے۔ عقاب کی شکل والا محل توپوں سے اُڑا دیا گیا۔

تجار بھی طالبان کے ہاتھ میں: شمال میں بھی طالبان کی فتوحات جاری تھیں۔ انہوں نے طالقان کے مرکزِ تجارت پر حملہ کیا اور آٹا کا شہر پر قبضہ کر لیا۔ مسود نے وہاں مشہور کر رکھا تھا کہ طالبان شہر پر قبضہ کر کے محروموں کو باغیاں بنا دیں گے۔ اس خوف سے ہزاروں لوگ طالبان کے آنے کی خبر سن کر بھاگ نکلے تھے مگر بعد میں جب انہیں طالبان کی طرف سے مکمل تحفظ کا یقین ہوا تو وہ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔

اسامہ کی حوالگی: ملا عمر اور سعودی شہزادہ: کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کی تباہی کے بعد امریکا نے سعودی عرب اور پاکستان پر دباؤ بڑھا دیا کہ وہ طالبان کو رضامند کر کے اسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ چنانچہ 19 اگست 1998ء کو سعودی عرب کے ملکہ خدیجہ اطلاعات کے سربراہ شہزادہ ترکی الغیصل اور پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل محمود احمد، ملا محمد عمر سے قندھار میں ان کی رہائش گاہ پر ملے۔

یہ دونوں ملا محمد عمر پر دباؤ ڈالتے رہے کہ اسامہ کو ملک بدر یا حکومتِ سعودیہ کے حوالے کر دیا جائے۔ جب طالبان سربراہ نے اسامہ کو ملک بدر کرنے یا سعودی عرب کے حوالے کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ اسامہ کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے سعودی اور افغان علماء کی ایک کونسل تشکیل دی جاسکتی ہے تو شہزادہ ترکی کو غصہ آ گیا اور انہوں نے ملا محمد عمر کو اسامہ بن لادن کے جرائم کی سنگینی بتانا شروع کی مثلاً یہ کہ وہ سعودی شاہی خاندان کا مخالف ہے اور امریکی افواج کو وہاں سے نکلانے کے نام پر عرب نوجوانوں کو بھڑکا رہا ہے۔ ملا محمد عمر نے صبرِ تحمل سے کام لیتے ہوئے شہزادے کو سمجھایا کہ امریکی افواج کی سرزمینِ عرب میں موجود کی واقعی ناقابلِ برداشت چیز ہے اور نئی سعودی نسل اس کے خلاف ہے۔

طالبان سربراہ نے شہزادے کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اور دنیا کے تمام مسلمان مل کر ان کی مدد کریں گے اور ان کے ملک کو امریکی تسلط سے آزاد کرائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کے پاس

اسامہ بن لادن کا تحریری وعدہ ہے کہ وہ افغانستان کی سرزمین سے کسی تشدد آمیز کارروائی میں حصہ لے کر طالبان کا اعتماد پاش پاش نہیں کرے گا۔ مگر ملا محمد عمر کی ان سنجیدہ باتوں کے جواب میں شہزادے نے مزید برافروختہ ہو کر ان پر سعودی شاعری خاندان کی بے عزتی کا الزام عائد کر دیا اور گفتگو منقطع کر کے واپس چلے گئے۔ آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل بھی خاموشی سے لوٹ آئے اور یہ بات چیت لاعا حاصل رہی۔ اس کے بعد سعودی عرب سے طالبان کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور پاکستان سے بھی روابط میں اعتماد کا فقدان دیکھنے میں آیا۔

ہزارہ جات: ہزارہ شیعوں کا مرکز بامیان اب طالبان کی زد میں تھا۔ یہ مقام وسطی افغانستان میں کوہ بابا کے بلند و بالا پہاڑوں اور نہایت پر پیچ درڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اس لیے تاریخ عالم میں بہت کم فاتح یہاں تک پہنچنے کی ہمت کر سکے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں چنگیز خان بامیان کا محاصرہ کرنے اور اسے فتح کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ اس زمانے میں یہاں جس نسل کے مسلمان آباد تھے وہ سب تاتاریوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہو گئے تھے۔ بعد کی صدیوں میں یہاں فاتح تاتاریوں اور مفتوح تاجک اور ترک باشندوں کے درمیان ازدواجی سلسلے شروع ہوئے تو ایک نئی نسل وجود میں آئی جو ہزارہ جات کہلائی۔ ان کے چہرے جسم، نیچے نقوش اور قدرے پست قد و قامت سے بھی اس کا اعزازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 1893ء میں امیر عبدالرحمن نے یہ علاقہ فتح کیا تھا۔ اس سے قبل کئی صدیوں تک یہ لوگ آزاد رہے تھے۔ طالبان نے ایک سال سے بامیان کو جانے والے کئی راستے بند کر رکھے تھے جس سے محاصرے کی شکل پیدا ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود فضائی راستے سے ایرانی طیارے ہر قسم کی رسد لا رہے تھے۔ ایران نے یہاں ایک بڑا رن وے بھی تعمیر کرا دیا تھا۔ اب طالبان کو بامیان کے دروازے پر دیکھ کر ایران سب سے زیادہ دوا دیا کر رہا تھا۔ اس نے اپنی فوج کا ایک حصہ افغانستان کی سرحد پر لاکھڑا کیا تھا تاکہ طالبان پر دباؤ ڈال کر انہیں بامیان پر لشکر کشی سے باز رکھے مگر طالبان نے کسی قسم کے دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ستمبر 1998ء کے آغاز میں بامیان پر ہلا بول دیا۔

بامیان پر قبضہ: طالبان دنیا کا ایک مشکل ترین دفاعی مقام ”درہ شبر“ عبور کر کے اتوار 12 ستمبر کو بامیان میں داخل ہو گئے۔ 13 ستمبر 1998ء کو بامیان مکمل طور پر ان کے قبضے میں آ گیا۔ اس سے قبل شیعہ لیڈر کریم ظلی اور حزب وحدت کے دوسرے کمانڈر ہزاروں جنگجوؤں اور مقامی باشندوں کے ساتھ پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔ کریم ظلی نے آخری لمحات میں احمد شاہ مسعود سے درخواست کی تھی کہ وہ بامیان کے دفاع میں اس کی مدد کرے مگر مسعود نے صاف انکار کر دیا۔ بامیان پر طالبان کے قبضے کو

ایک تاریخ ساز فتح کہا جاتا ہے۔

کابل سائنس اکیڈمی کے سربراہ محمد حسین کے بقول ”اسلامی تاریخ کی چودہ صدیوں میں طالبان وہ پہلے مسلمان حکمران ہیں جنہوں نے اس مقام کو بزور قوت فتح کیا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم درہ شبر تک آئے تھے اور جزیہ لے کر واپس چلے گئے تھے۔ کوئی فاتح اس درے سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ تو فتنی صرف طالبان کو ملی۔“

بامیان سے طالبان کو بہت بڑی مقدار میں ایرانی اسلحہ ہاتھ لگا۔ راکٹ، مشین گن اور کلاشن کوف کی گریس بند بیٹیوں کے انبار تھے جو کئی ڈپوز میں محفوظ تھے۔ 4 ہیلی کاپٹر اور 30 ٹینک بھی ملے۔ گزشتہ چار سال سے یہ مقام ایران کی سازشوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہاں دن وے تعمیر کرا کے ایران نے مسلسل پروازوں کے ذریعے ملک اور اسلحہ بھیجنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، روزانہ دس تا پندرہ پروازیں آتی تھیں۔

قیدیوں پر مظالم: بامیان کی جیل میں طالبان کے 98 قیدی محبوس تھے جنہیں ہزارہ جات مزار شریف سے فرار ہوتے ہوئے ساتھ لے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ قیدی احمد شاہ مسعود کے حوالے کر دیے گئے تھے جنہیں وہاں سے ایران لے جایا گیا تھا۔ طالبان کے بامیان پر حملے کے وقت باقی ماندہ قیدیوں کے بارے میں کریم غللی نے فرار ہونے سے قبل حکم دیا تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ حزب وحدت کے جنگجوؤں نے دسٹی بموں، راکٹوں اور رائفلوں سے ان کو ٹھٹھریوں پر ہلے بول دیا جن میں طالبان بند تھے۔ یہ 14x10 فٹ کے کمرے تھے جن میں قیدی بری طرح ٹھونسنے لگے تھے۔ اندھا دھند فارنگ، راکٹ باری اور دسٹی بموں کے پھٹنے سے 28 قیدی موقع پر شہید ہو گئے جبکہ تقریباً باقی تمام قیدی بری طرح زخمی ہوئے۔ اکا دکا ہی مجزانہ طور پر محفوظ رہے۔

حزب وحدت کے جنگجو یہ دیکھے بغیر کہ قیدیوں کا کیا انجام ہوا، طالبان کی آمد کے پیش نظر بھاگ نکلے۔ چھ گھنٹے بعد طالبان وہاں پہنچے تو ایک طالب علم جیل کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس نے اپنے پیٹھے ہونے کرتے سے سفید پرچم بنا کر لہرایا تاکہ طالبان حملہ نہ کر بیٹھیں۔ زخمی قیدیوں نے حزب وحدت کے مظالم کی جو تفصیل بیان کیں، وہ نہایت لرزہ خیز تھیں۔ قیدیوں کو گرم سلاخوں سے داغا جاتا تھا حتیٰ کہ ان کا گوشت جھڑ جاتا تھا۔ بعض قیدیوں کو گاڑی تلے کچل کر ہلاک کیا گیا۔ کئی قیدیوں کی داڑھیاں بال بال کر کے نوح ڈالی گئیں۔ اذیت ناک سزائے موت کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ دو تیز دھار خنجروں کے رستے زمین میں گاڑ کر قیدی کو ان کی نوک پر پیٹ کے بل لٹا دیا جاتا۔ ایک اور ہیمانہ انداز یہ تھا کہ ٹانگیں رموں کے ذریعے دو گاڑیوں سے باہر کر گاڑیاں مخالف سمت چلائی جاتیں جن سے جسم دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ ذہنی اذیتوں کی بھی انتہا کر دی گئی تھی۔ خلفائے خلافت کے اسمائے گرامی زمین پر لکھ کر

انہیں جوتوں سے روندنا جاتا۔ ناپاکی سے ان مقدس شخصیات کے ناموں کو آلودہ کیا جاتا۔ (نعوذ باللہ)

ایرانی فوج کا افغان سرحد پر اجتماع: بامیان پر طالبان کے قبضے سے افغانستان میں ایران فوج حزب وحدت کا عسکری و سیاسی اثر درسوخ ختم ہو کر رہ گیا۔ ایران جو صدیوں سے افغانستان کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کا عادی تھا، اسے برداشت نہ کر سکا۔ وہ ہر حال میں افغانستان میں اپنے نمایندوں کو مضبوط تر دیکھنا چاہتا تھا۔ ایران کی قومی اسمبلی میں افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کی قرارداد منظور ہوئی اور اکتوبر 1998ء میں دو لاکھ ایرانی فوج افغانستان کی سرحدوں پر امنڈ آئی۔ طالبان نے اس صورت حال کا نہایت پامردی سے سامنا کیا۔ 2 لاکھ ایرانی فوج کے مقابلے میں وہ صرف پانچ ہزار افراد کھڑے کر سکے مگر ساتھ ہی انہوں نے ایران کو خبردار کیا کہ جنگ کی صورت میں وہ ایران کے اندر گھس جائیں گے، طالبان کی بے خون دیکھ کر حکومت ایران یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

صلح و صفائی: اب سلامتی کونسل بھی دونوں ملکوں میں بیچ بچاؤ کے لیے متحرک ہو گئی۔ اس کے نمائندے لہذا براہمی نے طالبان سربراہ ملا محمد عمر سے ملاقات کی اور آخر کار معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھ گیا۔ طالبان نے گرفتار شدہ ایرانی ترک ڈرائیور اور فوجی افسران رہا کر دیے۔ مقتول ایرانی سفارت کاروں کی لاشیں واپس کر دیں۔ ایران نے اپنی افواج پیچھے ہٹا لیں۔

فتوحات کا دھارا ختم گیا: بامیان کی فتح طالبان کے سات سالہ دور حکومت میں فتوحات کا نقطہ عروج تھا۔ اس فتح کے ساتھ طالبان احمد شاہ مسعود کے زیر قبضہ شمال مشرق کے تھوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر پورے افغانستان کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے تھے۔ ملک کا 90 فیصد رقبہ ان کے پاس تھا۔ طورخم سے لے کر مزار شریف تک اور اپہین بولدک سے دریائے آمونک کے وسیع و عریض علاقے میں کوئی مزاحمتی قوت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حزب اسلامی، جمعیت اسلامی، جنبش ملی، حزب وحدت اور آغانی عناصر سمیت تمام مخالفین کا قلع قمع ہو گیا تھا۔ بلاشبہ ان دونوں طالبان کی سطوت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی عجیب حقیقت تھی کہ طالبان کی فتوحات کا دھارا یہاں پہنچ کر ایسا تنہا کہ پھر کسی طرح آگے بڑھنے میں نہ آیا۔ 1995ء سے شروع ہونے والی حیرت ناک کامیابیوں کی کہانی یہاں آ کر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد طالبان کو پیچھے تو ہٹنا پڑا مگر آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔

احمد شاہ مسعود کے جارحانہ حملے: بامیان پر طالبان کے تسلط کے ساتھ افغانستان میں طاقت کا توازن یکدم بدل گیا۔ اب طالبان کے مد مقابل کوئی نہ تھا سوائے احمد شاہ مسعود کے جو پنج شیر سے لے کر غار

ہیں کہ وہ ہندوکش کی چوٹیوں پر مورچے بنا کر طالبان کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ وہ اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ جارحانہ حملوں کی بھی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ بلاشبہ وہ نہایت زیرک، ماہر فن، اور کہنہ مشق کمانڈر تھا۔ اس نے تین اطراف سے طالبان کے سخت ترین محاصرے میں رہنے کے باوجود ہتھیار نہ ڈالے اور فتحیہ سمیت اپنے بچے کچھے تمام علاقے کا بڑی کامیابی سے دفاع کیا۔ طالبان سر توڑ کوشش کے باوجود آخر تک اس پر قابو نہ پاسکے۔

لاحاصل لڑائیاں: اکتوبر 1998ء میں جبکہ طالبان ایران سے جنگ کی تیاری میں مشغول تھے، احمد شاہ مسعود نے شمال مشرقی وادیوں میں نئی جنگ چھیڑ کر کاپیسا، پروان اور ننگر ہاراد بیک سمیت طالبان سے کئی اضلاع واپس لے لیے۔ ان میں تاجکستان اور ازبکستان کی سرحدوں سے ملتا ہوا علاقہ بھی شامل تھا۔ یہ علاقہ دوبارہ ہاتھ آ جانے سے احمد شاہ مسعود کے لیے کمک ورسد کا راستہ کھل گیا اور طالبان کا محاصرہ بے اثر ہو گیا۔ افغانستان میں طالبان کے مخالف کمانڈر اب احمد شاہ مسعود کے گرد جمع ہو گئے تھے کیونکہ اس کے سوا کوئی اور بڑا لیڈر باقی نہیں رہا تھا جو طالبان سے مقابلے کی ہمت کر سکتا۔ ان کمانڈروں نے 7 دسمبر 1998ء کو اتفاق رائے سے احمد شاہ مسعود کو طالبان مخالف گروپوں کا سربراہ منتخب کر لیا۔ اگست 1999ء میں طالبان نے کابل کے شمال مشرقی اضلاع مسعود سے دوبارہ چھین لیے اور فتحیہ کے قریب پہنچ گئے مگر چند دنوں بعد انہیں اگلے قدموں پیچھے ہٹنا پڑا اور تاجکوں کی بغاوت کے خوف سے وہ ایک بار پھر کابل کی طرف پسپا ہو گئے۔ اس کے بعد ستمبر 1999ء سے لے کر ستمبر 2001ء تک طالبان اور احمد شاہ مسعود کے زیر کمان جنگجوؤں میں وقتاً فوقتاً خوریز جنگیں ہوتی رہیں مگر کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہو سکی، کبھی طالبان ان کی دو چار چوکیوں پر قبضہ کر لیتے اور کبھی وہ طالبان کو کچھ بچے دھکیل دیتے، دوسالوں میں طالبان اور احمد شاہ مسعود کی پوزیشن تقریباً جوں کی توں رہی۔



مآخذ و مراجع

چوتھی سوال باب

طالبان کے خلاف عالمی سازشیں

1999ء کے اہم واقعات: اپنی فتوحات کے نقطہ عروج پر پہنچنے اور ملک کے 90 فیصد سے زائد رقبے پر چودہ سو سال قبل کے اسلامی احکام نافذ کرنے کے بعد طالبان دنیا بھر میں ایک مسلم بنیاد پرست حکومت کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے۔ غیر انہیں تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے جبکہ پوری دنیا میں کفریہ طاقتوں سے نہرو آزما اسلامی تحریکیں اور مجاہدین ان کو ایک قابل تقلید مثال کے طور پر قبول کرتے جا رہے تھے۔ یہ طالبان کی حکومت کا چوتھا سال تھا۔ اس میں طالبان کے اثر و رسوخ میں نہ صرف علاقائی بلکہ عالمی طور پر بھی اضافہ ہوا تاہم ان کے خلاف زیر زمین سازشیں بھی پروان چڑھتی رہیں۔

وردک کا زلزلہ: سال کے آغاز میں جب برف باری زوروں پر تھی طالبان کو ایک سنگین مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ وسط فروری 1999ء کے دن تھے کہ صوبہ کابل کے علاقے ”وردک“ میں ہولناک زلزلے سے درجنوں دیہات تہ و بالا ہو گئے۔ سات ہزار مکانات بلبے کا ڈھیر بن گئے۔ طالبان حکومت پہلے ہی مالی طور پر کمزور تھی تاہم اس نے پوری تندہی سے متاثرین کی از سر نو آباد کاری کا کام شروع کر دیا۔ حکومت پاکستان نے امدادی کاموں کے لیے 10 کروڑ روپے کا عطیہ دیا جبکہ پاکستانی عوام نے بھی دل کھول کر مدد کی۔

بامیان پر حزب وحدت کا قبضہ: مارچ 1999ء کے اواخر میں ”میسنہ“ کے علاقے میں ایرانی اسلحے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ڈپو دریافت ہوا جس میں ایرانی G-3 رائفل کی 72 لاکھ گولیاں اور D-C توپ کے 6 ہزار گولے تھے۔ اب تک دریافت ہونے والے ذخائر میں یہ ایرانی اسلحہ کا سب سے بڑا ذخیرہ تھا۔ طالبان کو اتنا احساس تو تھا کہ بامیان کی فتح کے بعد بھی حزب وحدت اور ایران احمد شاہ مسعود کی ملی بھگت سے کسی نئے آپریشن کی تیاری میں مصروف ہیں۔ مگر وہ ان کے منصوبوں کی تفصیل سے واقف نہ تھے۔ ایران اور احمد شاہ مسعود میں گہرے تعلقات استوار ہونے کا پتا اس سے بھی چلتا ہے کہ کچھ مدت قبل احمد

شاہ مسعود نے پنج شیر جبل میں قید 85 طالبان کو تاجکستان کے راستے ایران بھیج دیا تھا۔ ان قیدیوں میں بامیان جیل کے 15 طالبان قیدی بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ ان کو چھ ماہ تک ایرانی جیل خانے میں رکھا گیا۔ اب مارچ 1999ء کے وسط میں ایران نے اچانک یہ قیدی دوبارہ احمد شاہ مسعود کے سپرد کر دیے تھے۔ ان انکشافات کے باوجود یہ جاننا مشکل تھا کہ اندر کیا کچھڑی پک رہی ہے؟ حقیقت یہ تھی کہ مسعود اور کریم خلیلی ایک نئی جنگ کی منصوبہ بندی کر چکے تھے۔ جس کے لیے طالبان بروقت مناسب پیش بندی نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 21 اپریل 1999ء کو حزب وحدت کے جنگجو اچانک پہاڑوں سے نیچے اترے اور دیکھتے ہی دیکھتے بامیان پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ انہوں نے حسب عادت ارد گرد کی شاہراہوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ بہت سے مسافروں کو قتل کر دیا گیا۔ ان کی زد سے بچ نکل کر آنے والے ایک ڈرائیور نے صحافیوں کو بتایا کہ اس کے سامنے پانچ گاڑیوں کو مسافروں سمیت جلادیا گیا۔ کئی افراد کے سروں میں مینیں ٹھونگی جا رہی تھیں۔

بعد میں گھیر کر مارنا: بامیان پر از سر نو قبضہ کر لیتا حزب وحدت کی بہت بڑی کامیابی تھی مگر یہ خوشی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی کیونکہ جلد ہی کابل سے ملا فضل اور ملا برادر کی کمان میں تازہ دم طالبان بامیان کے قریب آن پہنچے۔ جب انہوں نے حزب وحدت کو پسپا کر کے بامیان جانے والے راستے کی ایک اہم چوکی ”آق رباط“ پر قبضہ کیا تو کریم خلیلی نے احمد شاہ مسعود سے رابطہ کر کے مشورہ طلب کیا۔ مسعود نے اپنی جنگی مہارت کے دعوے میں اس موقع پر ایک عجیب مشورہ دیا۔ اس نے کہا: ”طالبان کو ”آق رباط“ سے آگے آنے دو۔ بعد میں گھیر کر مارنا۔“ طالبان کمانڈر ملا فضل جب آق رباط پر قبضہ مستحکم کرنے کے بعد آگے بڑھے تو کریم خلیلی مسعود کی حکمت عملی پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے ہوئے انہیں کھلی پیش قدمی کا موقع دیتا رہا۔ جب طالبان بامیان کے قریب تک گھائیوں میں پہنچے تو کریم خلیل نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی مگر اسے معلوم نہ تھا کہ طالبان کا دوسرا لشکر ملا برادر کی قیادت میں دوسری سمت سے آزادانہ نقل و حرکت کر رہا ہے۔ جب ملا برادر نے دوسری طرف سے حزب وحدت پر حملہ کیا تو طالبان کو گھیرنے کی منصوبہ بندی خاک میں مل گئی۔ کریم خلیلی اپنی ملیشیا کے ساتھ فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اتوار 10 مئی 1999ء کو دن بارہ بجے طالبان بامیان پر دوبارہ قبضہ کر چکے تھے۔

قدحار کی علماء و مشائخ کا نفرنس: اس سال طالبان قیادت نے ملکی و غیر ملکی علماء و مشائخ اور دینی جماعتوں کے سربراہوں سے روابط مزید بہتر اور پختہ بنانے پر بھی توجہ دی جس کی بنا پر عالم اسلام کے ایک بڑے حلقے میں ان کے لیے نضا ہموار ہوئی۔ اس سلسلے میں قدحار کی ”علماء و مشائخ کا نفرنس“ خاص

اہمیت رکھتی ہے۔ جولائی 1999ء کے اواخر میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں 20 ہزار سے زائد علمائے کرام، مشائخ تصوف اور دینی راہنماؤں نے شرکت کی اور طالبان سے یکجہتی کا اظہار کیا۔

ملا محمد عمر پر قاتلانہ حملہ: طالبان حکومت کو ہر لحاظ سے اپنے مقاصد کے خلاف پاکر مغربی طاقتوں نے افغانستان میں موجود اپنے گماشتوں کو براہ راست طالبان قیادت کو قتل کرنے کا ہدف دے دیا۔ جنگی مہمات میں کروڑوں ڈالر جھونکنے کی بہ نسبت یہ ہدف حاصل کرنا آسان تھا کیونکہ نہ صرف طالبان کے قائدین اور جرنیل بلکہ سربراہ مملکت ملا محمد عمر بھی کسی خاص سکیورٹی کے بغیر رہتے تھے۔ منصوبے کے مطابق ایک دن پانچ ہزار کلوگرام بارود سے لدا ہوا ٹرک ملا محمد عمر کی رہائش گاہ کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ کسی نے اس ٹرک کو روکنے یا چیک کرنے کی کوشش نہ کی۔ جب یہ دھماکا خیز مواد پھٹا تو ہر طرف آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ خوفناک دھماکا میلوں دور تک سنا گیا۔ ارد گرد کے راہ گیر، طالبان کے کئی کارکن اور ملا عمر کے اہل خاندان میں سے کئی افراد اس کی لپیٹ میں آکر جاں بحق ہو گئے۔ البتہ ملا محمد عمر خود معجزانہ طور پر محفوظ رہے۔ حملے کی تحقیقات کے بعد طالبان کی تفتیشی ٹیم نے بتایا کہ اس میں بیرونی طاقتیں ملوث تھیں۔ ماہرین کی رپورٹ کے مطابق دھماکے میں ایٹمی مواد بھی استعمال کیا گیا تھا۔ یہ اگست 1999ء کے آخری ہفتے کا واقعہ ہے۔

میاں نواز شریف کا تختہ الٹ دیا گیا: مغربی طاقتوں کو طالبان کے ہاں اسامہ بن لادن کے تربیتی کیمپوں سے تشویش تھی تو حکومت پاکستان کو بھی شکایت تھی کہ پاکستان کے کئی مطلوبہ ملزم افغانستان میں پناہ لیے ہوئے ہیں جو شیعہ سنی دہشت گردی میں ملوث ہیں۔ اکتوبر 1999ء کے آغاز میں پاکستان کے وزیراعظم میاں نواز شریف کا لہجہ اس بارے میں نہایت سخت ہو گیا۔ انہوں نے طالبان پر یہ الزام عائد کیا کہ پاکستان میں دہشت گردی کرنے والے مجرم ان کی حدود میں عسکری تربیت لے رہے ہیں۔ میاں نواز شریف نے طالبان حکومت پر زور دیا کہ وہ دہشت گردی ختم کرنے میں ان سے تعاون کریں۔ طالبان سربراہ نے جواب میں ان الزامات کو مسترد کرتے ہوئے یہ یقین دلایا کہ وہ ہر قسم کی دہشت گردی کے خلاف ہیں اور اس بارے میں ہر ممکنہ تعاون کے لیے تیار ہیں۔ ہو سکتا تھا کہ اس بارے میں دونوں حکومتوں میں مزید لے دے ہوتی مگر اچانک 12 اکتوبر 1999ء کو پاکستان کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل پرویز مشرف نے میاں محمد نواز شریف کا تختہ الٹ دیا اور خود ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ پرویز مشرف شروع میں طالبان کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنے کے خواہاں نظر آئے اور نواز شریف کے آخری ایام میں دونوں حکومتوں کے درمیان کشیدگی کا جو ماحول پیدا ہونے جا رہا تھا وہ ختم ہو گیا۔

طالبان اور دنیا کے مظلوم مسلمان: اس سال عالم اسلام کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر مظالم کے نئے سلسلے شروع ہوئے۔ طالبان حکومت نے ہر موقع پر مظلوم مسلمانوں کی بھرپور حمایت کی۔ مئی میں سریا کی دہشت گرد فوج نے کوسوو پر یلغار کی تو طالبان نے سرب درندگی کی کھل کر مذمت کی۔ اسی ماہ کشمیر کا میدان کارزار اس قدر گرم ہوا کہ پاکستان اور بھارت جون میں کارگل کے محاذ پر ایک دوسرے سے کمرانے لگے۔ کشمیری مجاہدین کی اس گرم جوشی میں طالبان حکومت کی اخلاقی مدد کا بھی ہاتھ تھا۔ دسمبر 1999ء میں روس نے چیچنیا پر فوج کشی شروع کی جس کا چیچن مجاہدین نے بڑی پامردی سے جواب دیا۔ یہ جنگ اگلے سال کے وسط تک بڑے شد و مد سے جاری رہی۔ بے سرو سامان طالبان نے اس موقع پر چیچنیا کی جس طرح مدد کی اس کی مثال عالم اسلام کا کوئی اور ملک پیش نہ کر سکا۔

انڈین ایر لائن کا طیارہ اغوا: دسمبر 1999ء کے آخری ہفتے میں طالبان کو ایک نہایت کڑے امتحان سے گزرنے پڑا۔ چند ہائی جیکرز انڈین ایر لائن کا طیارہ اغوا کر کے اسے قندھار لے آئے۔ انہوں نے مسافروں کی جان کے بدلے ان کشمیری مجاہد لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کیا جو بھارت کی جیل میں تھے۔ ان میں سرفہرست جرگہ الانصار کے لیڈر مولانا محمد مسعود اظہر تھے۔ طالبان ایک طرف کشمیر کی تحریک جہاد کے حامی ہونے کے ناتے ہائی جیکرز سے ہمدردی رکھتے تھے تو دوسری طرف بھارت کا خیال رکھنے پر بھی مجبور تھے جسے پوری دنیا کی اخلاقی ہمدردی حاصل تھی۔ بہر کیف طالبان نے معاملے کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھالا جس کے نتیجے میں مولانا مسعود اظہر اور مشتاق زرگر جیسے نامور مجاہد لیڈر بھارتی جیلوں سے رہا ہو کر پاکستان آ گئے اور انڈین ایر لائن کے مسافر بحیرہ عافیت اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔

اگر آدھا افغانستان تباہ ہو جائے: اس سال بھی اسامہ بن لادن کی سپردگی کے بارے میں افغانستان پر سعودی عرب اور امریکا کا دباؤ رہا۔ مگر طالبان سربراہ کا موقف بے لچک تھا۔ انہوں نے اکتوبر میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا:

”اسامہ بن لادن کو حوالے کرنا اسلام کارکن ترک کرنے کے مترادف ہوگا۔ اسامہ مسلمان ہے۔ مجاہد

ہے اور مہمان ہے۔ اگر آدھا افغانستان تباہ ہو جائے تب بھی اسے کسی کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔“

انہوں نے مذاکرات کی پیش کش قبول کرتے ہوئے کہا کہ اگر سعودی عرب اور افغانستان کے چند نمایندہ علماء مل کر اسامہ بن لادن کے مستقبل کا فیصلہ کریں تو انہیں قبول ہوگا۔ طالبان نے اس مسئلے پر عالمی دباؤ کی وجہ سے اپنی ناقابل برداشت مشکلات کے پیش نظر نومبر 1999ء میں اسامہ بن لادن کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے از خود افغانستان چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف نکل جائیں تاکہ

افغانستان پر امریکا کے دباؤ کا جواز ہی ختم ہو جائے۔ شیخ اسامہ بھی اس پر تیار ہو گئے۔ میڈیا میں یہ ظاہر بھی کر دیا گیا کہ اسامہ بن لادن افغانستان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

مزید بات چیت نہیں ہوگی: مگر امریکی حکومت نے ایسی کسی صورت حال کو ناقابل فہم بات اور حیلہ جوئی قرار دیتے ہوئے اصرار کیا کہ طالبان بہر صورت اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کر دیں۔ امریکا کے اس اصرار کے جواب میں ملا محمد عمر کا نہایت سخت رد عمل سامنے آیا۔ انہوں نے نومبر 1999ء میں اپنے جوابی بیان میں کہا:

”امریکا کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اب اس موضوع پر مزید بات چیت نہیں ہوگی۔ عالمی دباؤ کے باوجود ہم اسامہ بن لادن کو ملک سے نکالیں گے نہ کسی کے حوالے کریں گے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسلام کے لیے اپنے سروں کو قربان کر دیں۔“

2000ء اور 2001ء کے حالات

طالبان امارت اور حکومت شیشان: شیشان (چچینا) کی جنگ اگلے برس (2000ء میں) بھی جاری رہی۔ اس دوران 2000ء جنوری کے اواخر میں شیشان کی تحریک آزادی کے بانی اور سابق صدر سلیم خان اندرابیوف ملا محمد عمر سے ملاقات کے لیے قندھار آئے۔ ان کے ساتھ شیشان کے نامور کمانڈر شامل بسایوف کے سیاسی مشیر ”مولادی اودیو کوف“ بھی تھے۔ اس تاریخی ملاقات کے بعد افغانستان نے تمام دنیا کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے شیشان کو ایک آزاد مسلم ریاست کے طور پر قبول کر کے اسے کامل میں اپنا سفارتخانہ کھولنے کی اجازت دے دی حالانکہ اب تک عالم اسلام کے کسی ملک نے آٹھ برس گزرنے کے باوجود شیشان کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنے ہمت نہیں کی تھی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ شیشان کے رہنمایان آزادی پختہ فکر مسلمان اور خالص اسلامی نظام کے نفاذ کے قائل تھے، اس لیے عالمی طاقتوں کے نزدیک وہ بھی دہشت گرد اور معتبوب تھے۔

افغان طیارے کا اغوا: فروری 2000ء کے پہلے ہفتے میں طالبان کو اس وقت ایک غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب افغانستان کی آریانا ایرلائن کا ایک طیارہ اغوا کر کے برطانیہ لے جایا گیا۔ ہائی جیکروں کا تعلق احمد شاہ مسعود کے گروہ سے تھا۔ طالبان سربراہ نے ہائی جیکروں کے مطالبات کو مسترد کر دیا۔ اس کے باوجود حیرت انگیز طور پر معاملہ حل ہو گیا اور مسافر بغیریت رہا ہو کر وطن واپس آ گئے۔

اسامہ بن لادن کے حوالے سے مغربی محاذ قدرے خاموش تھا۔ درحقیقت اب افغانستان کی دشمن

طاقتیں گفت و شنید یا دھمکیوں کی بجائے عملی اقدامات شروع کرنے جاری تھیں۔ اس وقت تک پاکستان کے نئے حکمران پرویز مشرف ان کے ساتھ نہیں تھے۔ پرویز مشرف نے جو اس وقت تک ”چیف ایگزیکٹو“ کہلاتے تھے، 15 مارچ کو اسامہ کے حوالے سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں طالبان پر اسامہ کی گرفتاری کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈال سکتا کیونکہ وہ آزاد اور خود مختار حکمران ہیں۔ اس سال طالبان مخالف لابی کو ایک کامیابی اس وقت ملی جب مارچ کے اواخر میں طالبان کا مشہور مخالف کمانڈر اسماعیل خان تورون جوہرات کا سابق گورنر تھا، جیل سے فرار ہو گیا۔

طالبان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ارد گرد کوئی ہمسایہ ان کا حامی نہ تھا۔ ان کے بے شمار مسائل کے حل کے لیے کوئی ایک ملک بھی معاون نہ تھا۔ پاکستانی عوام ان سے محبت اور ہمدردی رکھتے تھے مگر حکومت کاروبہ محتاط تھا۔ اس کے مقابلے میں افغانستان کی دیگر ہمسایہ ریاستیں خصوصاً ایران، تاجکستان اور ازبکستان طالبان کے مخالف گروہوں کے مددگار تھیں۔ امریکا کے علاوہ دنیا کی دو بڑی طاقتیں چین اور روس طالبان کو مشرق اور شمال میں گھیرے ہوئے تھیں اور دونوں طالبان کو خطرہ گردانتی تھیں۔

ملا محمد عمر مجاہد کا انتخاب: طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے ان طاقتوں کی افغانستان میں دخل اندازی کے جواب میں 8 مئی 2000ء کو ایک انتخابی بیان جاری کیا جس میں تاجکستان اور ازبکستان کو افغان دشمنی سے باز رہنے کی تلقین کی گئی۔

بہر صورت طالبان کے گرد کئی طرح کی محاصرہ بندی کا آغاز ہو گیا تھا۔ مئی کے مہینے میں اقوام متحدہ نے مفلوک الحال اور قحط زدہ افغانستان پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ افغان عوام کو موت کے منہ میں دھکیلنے اور طالبان حکومت کو مالی بوجھ تلے دب کر ختم کر دینے کی مذموم کوشش تھی۔ ملا محمد عمر نے 20 مئی کو اقوام متحدہ کے اس ناروا فیصلے پر احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اقوام متحدہ اس غیر منصفانہ فیصلے پر نظر ثانی کرے ورنہ حالات کی ذمہ داری اس پر ہوگی۔ تاہم عالمی امن کے نام نہاد ٹھیکے دار اس یہودی ادارے پر کوئی اثر ہونا تھا نہ ہوا۔

شنگھائی کانفرنس: چین چار سال پہلے ہی شنگھائی 5 کے نام سے ایک اتحاد قائم کر کے روس، تاجکستان اور وسط ایشیا کے دیگر ممالک کو طالبان کے اسلامی انقلاب کے مقابلے میں ابھار چکا تھا۔ ان اتحادیوں نے 7 جولائی 2000ء کو تاجکستان کے دارالحکومت ”دوشنبہ“ میں ”شنگھائی کانفرنس“ کا انعقاد کیا۔ چین، روس، تاجکستان، قازقستان، کرغیزستان اور ازبکستان کے حکمرانوں نے کانفرنس کی قرارداد میں منکور کیا کہ خطے میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور انتہا پسندی پر قابو پانے کی کوشش کی جائے گی اور

سرحد پار سے آنے والی دہشت گردی کی لہر کو روکنے کے لیے ایک مشترکہ مرکز قائم کیا جائے گا۔“ شگھانی 5“ کے شرکاء نے اعلان کیا کہ خطے کو مذہبی انتہا پسندی، علیحدگی پسندی اور عالمی دہشت گردی سے خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ ان ممالک نے الزام عائد کیا کہ کابل (یعنی طالبان حکومت) مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے اور خطے میں دہشت گردی کے فروغ کا ذمہ دار وہی ہے۔

اس کانفرنس کی دوسری قرارداد میں شیشان پر روس کے ظالمانہ قبضے کو سرہا گیا اور اسے روس کا داخلی معاملہ قرار دے کر اس کی تصویب کی گئی۔

افغانستان میں پوست کی کاشت ختم: دنیا طالبان کے ساتھ جو سلوک کر رہی تھی وہ کسی طرح بھی قرین انصاف نہ تھا۔ خصوصاً اقوام متحدہ کا اقتصادی پابندیاں عائد کرنا تو کھلم کھلا ظلم تھا جس کے جواب میں طالبان کسی بھی انتہاء تک جاسکے تھے، مگر طالبان نے نہ صرف صبر و تحمل سے کام لیا بلکہ دنیا کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔ اس سلسلے میں طالبان سربراہ نے یکم اگست 2000ء کو یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ افغانستان کے کسی حصے میں بھی پوست (افیون) کی کاشت نہیں کی جائے گی۔

افغانستان دنیا بھر میں افیون کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز تھا، مگر طالبان سربراہ نے اپنے اقتصادی مسائل میں شدید اضافے کو بھی برداشت کرتے ہوئے افیون کی کاشت پر پابندی لگا کر دنیا کو نشیات سے پاک کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی۔ افسوس کہ اہل مغرب کو طالبان حکومت کے اس کارنامے پر شکر یہ کے دو لفظ کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی اور وہ طالبان کا اس قدر مثبت رویہ دیکھنے کے باوجود انہیں عالمی امن و امان سبوتاژ کرنے کا ملزم گردانتے رہے۔

اسلامی تحریکیں اور طالبان: طالبان حکومت پاکستان سے بہر صورت اچھے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔ کشمیر کا خاذاں دنوں گرم تھا۔ اس مسئلے پر پاکستان کی سب سے زیادہ حمایت کرنے والا ملک افغانستان ہی تھا۔ 25 اگست 2000ء کو طالبان سربراہ نے ایک بیان میں واضح طور پر کہا کہ آزادی کشمیری مسلمانوں کا بنیادی حق ہے۔ ستمبر کے اواخر میں اسرائیل نے بیت المقدس، غزہ، بیت اللحم اور مغربی اردن میں فلسطینیوں کے خون کی عداں بہانا شروع کر دیں۔ حماس نے اس موقع پر اسرائیل کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ یہ جنگ چار پانچ ماہ تک جاری رہی اور طالبان ہر مرحلے میں حماس کی اخلاقی حمایت کرتے رہے۔

ستمبر میں طالبان کی افواج نے ایک بار پھر احمد شاہ مسعود کے خلاف پیش قدمی میں کچھ کامیا بیاں حاصل کیں۔ یکم ستمبر 2000ء کو وہ طالقان پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد وہ تھار کی طرف بڑھنے لگے۔

25 ستمبر کو انہوں نے فرخار کی دلیز ”چال“ پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح وادی پنجشیر میں احمد شاہ مسعود کے لیے سخت خطرات پیدا ہو گئے۔ 20 دسمبر 2000ء کو افغانستان میں کام کرنے والے 74 بیرونی امدادی اداروں نے اقوام متحدہ کے حکم پر اپنی سرگرمیاں بند کر کے واپسی اختیار کر لی۔ بے کس اور مصیبت زدہ افغان عوام کے خلاف اقوام متحدہ کا یہ دوسرا بڑا ظالمانہ اقدام تھا۔

صدر بش کا اقتدار: 2001ء کا آغاز ہوا تو طالبان حکومت بظاہر مستحکم تھی مگر درحقیقت ہولناک خطرات اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ امریکا میں نئے صدر جارج واکر بش نے اقتدار سنبھال لیا تھا اور اسکے ساتھ ہی یہودی وہ اسلام مخالف سازشیں عروج پر پہنچ گئی تھیں جن کا سلسلہ گزشتہ برس شروع ہو چکا تھا۔ بعض میڈیا رپورٹوں میں کیے جانے والے انکشافات کے مطابق اکتوبر 2000ء میں عالمی طاقتوں اور اس خطے میں ان کے ہمدرد مالک نے طالبان کے خاتمے کے لیے ایک مربوط پروگرام طے کر لیا تھا جس میں واحد اسلامی ایٹمی طاقت اور طالبان کے تنہا حامی ملک پاکستان کو نہتا کرنا بھی تھا۔ اس پروگرام میں امریکا اور روس کے ساتھ بھارت اور ایران بھی شریک تھے۔ طالبان ان خطرات سے واقف تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ آج نہیں تو کل یہ طاقتیں ان پر چڑھائی ضرور کریں گی تاہم وہ خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پالیسی پر نہ صرف گامزن رہے بلکہ ان کے رویے میں بھی مزید شدت پیدا ہو گئی۔

مشنری سرگرمیوں کا انسداد: اس سال طالبان حکومت نے اسلامی شریعت کے ان تمام احکام کو نافذ کرنے کی طرف توجہ دی جن میں ازراہ مصلحت تاخیر کی جاتی رہی تھی۔ 5 جنوری 2001ء کو طالبان سربراہ نے امدادی کاموں کی آڑ میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے والی این جی اوز کے مفسر اثرات کی روک تھام کے لیے یہ فرمان جاری کیا کہ اسلام سے برگشتہ ہونے والے کو شرعی سزا کے مطابق قتل کیا جائے گا اور اسلامی عقائد کے خلاف تبلیغی اثر پھرنے کی اشاعت یا اس میں تعاون کی سزا 5 سال قید ہوگی۔ اس حکم کے نفاذ سے این جی اوز کی ارتدادی سرگرمیاں بند ہو گئیں۔

طالبان کی خارجہ پالیسی پر اٹھنے والے سوالات کے جواب میں ملا محمد عمر نے 15 فروری کو اپنے بیان میں کہا: ”افغانستان کی پالیسی کا عالمی قوانین سے کوئی تضاد نہیں، مگر بعض مغربی قوتیں ہماری دینی دلیکی روایات کو برداشت نہیں کر سکتیں۔“ اُسامہ بن لادن کے مسئلے پر انہوں نے ایک بار پھر اپنے موقف کا اعادہ کرتے ہوئے امریکا کو موروثی الزام ٹھہرایا اور کہا: ”امریکا اُسامہ بن لادن پر شک کرتا ہے اور صرف اکی بنیاد پر وہ اسی کی حوالگی کا مطالبہ کرنا اپنا حق سمجھتا ہے جبکہ خود امریکا نے 8 ہزار طلبہ کے قتل کے مجرم جنرل مالک کو اپنی آغوش میں پناہ دے رکھی ہے۔“

طالبان نے افغانستان کو کیا دیا؟ 2001ء میں طالبان اپنی حکومت کے ساتویں سال سے گزر رہے تھے۔ یہی ان کی حکومت کے خاتمے کا سال ثابت ہوا، مگر اس سے قبل کہ ہم طالبان حکومت کے سقوط کا مرحلے وار جائزہ لیں، ہمیں ایک خاص سوال پر غور کرنا چاہیے جو بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یہ کہ آخر طالبان کے سات سالہ اقتدار میں عوام کو کیا ملا۔ طالبان نے اپنے دور حکومت میں افغانستان کو کیا دیا؟ یہ سوال اس لیے اہم ہے کہ آج دنیا طالبان کو انسانی حقوق کا غاصب اور افغانستان کی تباہی کا ذمہ دار قرار دیتی ہے، مگر حقائق کیا ہیں؟ آئیے غیر جانبداری سے موازنہ کرتے ہیں۔

امن و امان، جینے کا حق اور عدل و انصاف: طالبان سے قبل افغان عوام دیگر حقوق تو کجا زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم تھے..... کسی شخص کی جان محفوظ نہ تھی۔ مسلح افراد کسی کو بھی قتل کر سکتے تھے اور کوئی عدالت باز پرس کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔ طالبان نے برسوں سے جاری اس خونی کھیل کو ختم کیا۔ لوگوں کو زندہ رہنے کا حق دیا جو ”بنیادی حقوق“ میں سے سب سے بڑا حق ہے۔ لوگ عدل و انصاف کو خواب و خیال سمجھنے لگے تھے۔ طالبان نے مثالی عدل قائم کر کے دکھایا جس میں امیر و وزیر تک کی تخصیص نہ تھی۔ ہر شخص چاہے وہ طالبان کا مخالف ہی کیوں نہ ہو، یہ گواہی دے گا کہ طالبان کے ہاں مفت، فوری اور یقینی انصاف ملتا تھا۔ ایسی مثال پوری دنیا میں کہیں اور پیش نہیں کی جاسکتی۔

عدالتوں تک عوام کی رسائی کو آسان بنانے کے لیے طالبان نے کئی اہم اقدامات کیے۔ کسی بھی زیر سماعت مقدمے سے متعلقہ افراد کی عدالتوں تک آمد و رفت کا خرچہ حکومت نے اپنے ذمے لے لیا۔ مقدمے کے دوران انہیں عدالت کے قریب رہائش اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی تو طالبان حکومت یہ سہولت بھی مہیا کرتی تھی۔

مدنی اور مدنی علیہ کوچ کے سامنے براہ راست بات چیت کی اجازت تھی۔ اسی طرح غریب لوگ دکاندار کی بھاری فیسوں سے بچ جاتے تھے۔ بیج یا قاضی قرآن و سنت اور فقہ حنفی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ افسران، وزراء، حتیٰ کہ سربراہ مملکت بھی قانون سے بالاتر نہ تھا۔ عدل و انصاف میں امیر و غریب کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ بعض اوقات خود طالبان البکاروں کو کڑی سزائیں دی گئیں حتیٰ کہ ان کو قصاص میں قتل کرنے کی مثالیں بھی سامنے آئیں۔ سرکاری ادارے تک عوام کے حقوق کے لیے عدالت میں جबाہ تھے۔ اگست 1997ء کا وہ مقدمہ نہایت دلچسپ تھا جس میں ایک معذور شخص نے وزارت دفاع کی ایک عمارت پر اپنا حق ثابت کرنے کیلئے کابل کی عدالت شرعیہ سے رجوع کیا اور آخر کار مقدمہ جیت گیا۔ عدلیہ نے اپنے فیصلے میں وزارت دفاع کے ذمہ داروں کو حکم دیا کہ وہ عمارت فوری طور پر اس شخص کو دے دی جائے۔

خوف خدا اور شرعی سزائیں: یہ اسلامی نظام عدل اور حدود و قصاص کی شرعی سزاؤں کے احیاء کی برکت تھی کہ لوگوں میں بھی خوف خدا اور فکر آخرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ چوری، زنا اور شراب نوشی جیسے اخلاقی جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔ قرونِ اولیٰ کی طرح ایسے مناظر بھی سامنے آئے کہ مجرم خود عدالت میں پیش ہو کر شرعی سزا کے خواہش مند ہوئے تاکہ ان کا گناہ معاف ہو جائے۔ 10 مئی 2001ء کو افغانستان کی سپریم کورٹ میں ایک کنوارے نوجوان نے زنا کا چار بار اقرار کر کے شرعی حد جاری کرنے کی درخواست کی۔ اسے عدالت کے احاطے میں لوگوں کے سامنے سوڑے مارے گئے۔ سزا پانے کے بعد نوجوان کے چہرے سے مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ بلاشبہ اس کا ایمان قابل رشک تھا۔ اس نے حضرت ماعزؓ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ یہ اسلامی نظام عدل ہی کی تو برکات تھیں۔

قومی مرکزیت: طالبان سے پہلے افغانستان بکھرے ٹکڑے ہو چکا تھا۔ طالبان نے اس کو از سر نو ایک وحدت عطا کی جس سے مغربی طاقتوں کے ارمانوں پر اوس پر گئی۔ طالبان نے افغان عوام کو ایک مضبوط مرکزی حکومت کے تحت متحد کر دیا اور ملک کے ایک مختصر سے حصے کو چھوڑ کر تقریباً 95 فیصد رقبے کو ملک دشمن طاقتوں کی سازشوں کے جال سے آزاد کرایا۔ حالانکہ یہ کام بظاہر ناممکن نظر آتا تھا۔ حکمت یار، ربانی اور احمد شاہ مسعود اس ہدف کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے تھے۔

اسلحہ پھیر کی روک تھام: طالبان سے پہلے اسلحہ اتنا عام تھا کہ ہر گلی اور محلے میں الگ الگ مسلح گروہوں کی اجارہ داری تھی۔ خود سر کمانڈروں کے پاس توپیں، ٹینک، ہیلی کاپٹر تھے کہ جنگی جہاز تک موجود تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں انہیں غیر مسلح کرنے میں ناکام رہی تھیں کیوں ہر طاقت ایک گروہ کو نہتا کرنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ دوسرے گروہ کو نوازتی جاتی تھی۔ 1992ء میں اقوام متحدہ نے تین بلین ڈالر کے بدلے افغان کمانڈروں سے یہ ہتھیار جمع کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ طالبان نے یہ ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔ عوام نے ان پر اعتماد کر کے خود ہتھیار جمع کرائے اور سرکش کمانڈروں کو طالبان نے اللہ کی مدد و نصرت سے مختصر سے عرصے میں زیر کر کے دکھا دیا۔

منشیات کی پیداوار بند: طالبان سے پہلے افغانستان افیون کی پیداوار اور اسمگلنگ کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دنیا بھر میں 75 فیصد افیون کی کاشت یہیں ہوتی تھی۔ اقوام متحدہ بھرپور کوشش کے باوجود افغانستان سے افیون کی اسمگلنگ رکوانے میں ناکام رہی۔ اس کا ذیلی ادارہ ”یونائیٹڈ نیشن ڈرگ پروگرام“ اپنے 700 ماہرین پر کروڑوں ڈالر خرچ کر کے اس ہدف کے قریب بھی نہ پہنچ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ خود امریکی سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا ایک گروہ اس اسمگلنگ کے ذریعے دولت کماتا تھا۔

طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے صرف ایک انتہائی حکم جاری کر کے ملک بھر میں افیون کی کاشت کا خاتمہ کر دیا جس سے دنیا بھر کے منشیات کے اسمگلر ششدر رہ گئے اور اقوام متحدہ کے ادارے یو اینڈ نیشن ڈرگ پروگرام کے 700 ماہرین بے کار قرار دے کر فارغ کر دیے گئے۔

اس ادارے کے سربراہ برنارڈ یف نے تصدیق کی کہ طالبان کی جانب سے اس پابندی کے بعد اس سال افیون کی پیداوار صرف فیصد رہی، مگر یہودی لابی کے زیر اثر میڈیا اس کا رتا سے کو چھپانے یا نظر انداز کرانے میں کامیاب رہا۔ دنیا نے طالبان کی اس حیران کن خدمت پر انہیں کسی ہمدردی، عزت یا ستائش کے قابل نہیں سمجھا جو صریحاً بے انصافی تھی۔

طالبان ٹیکسوں سے نجات: عرصہ دراز سے افغانستان میں عوام کی کمائی کا خاصا حصہ حکومتی ٹیکسوں پر صرف ہو جاتا تھا۔ طالبان سے پہلے کے پُر آشوب زمانے میں تو جبری بھتوں اور بچاٹکوں کے ٹیکسوں نے لوگوں کی کمر توڑ دی تھی۔ طالبان نے عوام سے تمام ٹیکس اٹھا لیے۔ یہ دنیا کی واحد حکومت تھی جہاں عوام پر کوئی سرکاری ٹیکس نہیں تھا۔ مالدار لوگ زکوٰۃ و عشر ادا کرنے کے پابند تھے جو شرعی فریضہ ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ ان کا اپنا تھا۔ سرکاری کارکن، نجی ملازم، مزدور، دکاندار حتیٰ کہ پھیری اور خانچے والے کی بھی سو فیصد کمائی اسی کی جیب میں جاتی تھی۔ حکومت ان سے کچھ بھی نہیں لیتی تھی۔ کئی علاقوں میں طالبان نے بجلی تک مفت دے رکھی تھی۔ خصوصاً غریبوں کو بجلی کے بلوں سے تقریباً ہر جگہ مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

آب پاشی اور زرعی ترقی: طالبان سے قبل ملک کا زرعی نظام تباہ ہو چکا تھا۔ طالبان نے اس جانب خاص توجہ دی۔ جگہ جگہ نہریں نکلوائیں، پرانی نہروں کی صفائی کی، ٹیوب ویل لگوائے۔ صرف جن سے قد حار تک کئی ہزار ٹیوب ویل نظر آتے تھے جبکہ طالبان سے قبل یہاں دھول اُڑ رہی تھی۔ عوام کو صاف پانی میا کرنے کے لیے ہزاروں کنوئیں کھودے گئے۔ صرف کابل میں نئے کھودے جانے والے کنوئوں کی تعداد 1999ء کے آغاز میں بارہ سو سے زائد ہو چکی تھی۔

نومبر 1998ء میں طالبان نے دریائے ہلمند سے لشکر گاہ تک وسیع صحرا کا سینہ چپر کر 10 کلومیٹر لمبی اور 6 میٹر چوڑی نہر کی کھدائی کا کام مکمل کر دیا۔ لشکر گاہ کو آب رسانی کا یہ کارنامہ نہایت حیرت انگیز تھا۔ دسمبر 1998ء میں گجکی ڈیم کے بجلی گھر سے لشکر گاہ کو بجلی کی فراہمی شروع ہو گئی۔ یہ 18 کروڑ کا منصوبہ صرف 40 لاکھ میں مکمل کیا گیا۔ صوبہ نیمروز کے عوام کھانا پانی پیتے تھے۔ طالبان نے صرف 6 ماہ میں 4 کلومیٹر طویل نہر کھود کر صوبے کو پیٹھے پانی کی فراہمی ممکن بنائی۔ یہ کام دسمبر 1998ء میں مکمل ہوا۔ دسمبر 1997ء میں طالبان حکومت نے غور اور بادغیس میں سینکڑوں میل پر پھیلے ہوئے پتے کے جنگلات

نئی مد پر طویل مدت کے لیے لیز پر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے فرموں سے ٹینڈر طلب کر لیے گئے۔ جنگلات کمپنیوں کے سپرد کر دیے گئے۔ اس طرح قومی خزانے کو خطیر آمدن ملنے لگی۔ اسی ماہ جلال آباد ڈیم کی مرمت کا کام مکمل کر کے اسے از سر نو فعال کر دیا گیا اور اس سے 70 ہزار ایکڑ زری زمین سیراب ہونے لگی۔ برسوں سے ملک میں گندم کی پیداوار اتنی کم چلی آ رہی تھی کہ ہر حکومت، پاکستان سے گندم درآمد کرنے پر مجبور تھی۔ طالبان حکومت کی زری اصلاحات کی بدولت 2000ء میں افغانستان گندم کی پیداوار میں خود کفیل ہو گیا۔ صرف ہلند میں پیدا ہونے والی گندم کا تخمینہ 62 ہزار ٹن تک جا پہنچا۔ پست کی کاشت پر پابندی کے بعد پوست کے کھیتوں کی جگہ بھی گندم کی فصلیں لہلہاتی نظر آنے لگیں۔

مواصلات کا نظام بحال: افغانستان میں مواصلات کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ طالبان نے اسے بحال کیا۔ اکتوبر 1997ء میں بیرونی دنیا سے مواصلاتی رابطے کا نظام شروع کرنے کے لیے سویڈن کی کمپنی ”پان ایشین“ کو ٹھیک سپرد کیا۔ 6 ملین ڈالر کی لاگت سے طے پانے والے اس منصوبے نے دنیا بھر سے افغانستان کا مواصلاتی رابطہ قائم کر دیا۔

اعزادون ملک بھی ٹیلی فون کا نظام بہتر بنایا گیا۔ مارچ 1998ء تک کابل میں 21 ہزار، ہرات میں 17 سو، جلال آباد میں 14 سو اور قندوز میں ایک ہزار مقامی فون بحال کر دیے گئے تھے۔
دینی و عصری تعلیم: طالبان سے قبل ملک میں تعلیمی سرگرمیاں تقریباً بند ہو چکی تھیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو بے دین اساتذہ نے صرف ملحدانہ عقائد کی تبلیغ کا مرکز بنایا ہوا تھا۔ بد معاش قسم کے طلبہ نے وہاں شریف طلبہ کا گزرنا دو بھر کر دیا تھا۔ طالبان نے تعلیم گاہوں کو ان خرافات سے پاک کر کے صاف ستھرا ماحول دیا اور انہیں اپنے اصل اہداف پر گامزن کر دیا۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر اسکول اور مکاتب کھول دیے جن کی تعداد کئی ہزار تھی۔ عصری تعلیم گاہیں اتنی آباد ہوئیں کہ صرف کابل یونیورسٹی میں طلبہ کی تعداد 18 ہزار تک پہنچ گئی۔

طالبان نے ملک میں دینی علوم کی اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی۔ جامعہ مدارس اور مکاتب کھولے۔ نومبر 1997ء میں طالبان سربراہ کی نگرانی میں قندہار میں جامعہ عمر کے نام سے ایک بڑی اسلامی درس گاہ کے قیام کا اعلان ہوا۔ طے ہوا کہ اس درس گاہ کو ایک ہزار طلبہ کی اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنایا جائے گا۔ ایک سادہ سی عمارت میں اس درس گاہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا گیا جبکہ شاعر عمارت کا تعمیراتی کام وسائل کی قلت کے باعث قدرے سستی سے چلتا رہا۔ تاہم تعلیمی سرگرمیاں بھرپور انداز میں جاری رہیں۔ طالبان دور میں ملک بھر میں دینی تعلیم کا اس قدر چرچا ہوا کہ دینی مکاتب کے لیے قرآن مجید اور

چونکہ وہاں باب

دینی مدارس کے لیے حدیث کی کتب کی ضروریات پوری کرنے کا خرچ کئی ارب روپے تک جا پہنچا تھا۔
انہرمؤذنیں کے وظائف: طالبان نے پہلی بار ائمہ مساجد اور مؤذنین حضرات کی کفالت کی طرف
توجہ دی۔ یہ اُمت کا انتہائی قابل احترام طبقہ صدیوں سے بے قدری کا نشانہ بن چلا آیا ہے۔ طالبان
نے ان کی تنخواہیں سرکاری خرچ پر مقرر کیں۔ صرف جلال آباد میں 335 ائمہ حضرات اور مؤذنین کو
تنخواہیں دی جا رہی تھیں۔

سڑکوں کی مرمت، کابل ماسٹر پلان: اٹھارہ برس کی جنگوں نے ملک کی سڑکوں کے نیچے ادھر دیے
تھے۔ سڑکوں کی تعمیر نو کے لیے اربوں ڈالر درکار تھے۔ طالبان بیرونی طاقتوں اور عالمی اداروں کی
پرفریب شرائط پر کے جال میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے وہ ان منصوبوں کے لیے قرضے
حاصل نہ کر سکے تاہم انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت مٹی کی بھرائی کر کے اکثر جگہوں پر سڑکوں کو دوبارہ
اس حد تک درست کر دیا کہ گاڑیاں گزر سکیں۔ کابل شہر میں سڑکوں کی استرکاری کا کام شروع کیا جو
فروری 1999ء میں مکمل ہوا۔ اس کے بعد طالبان کابل کی سابقہ خوبصورتی کو بحال کرنے کے لیے
مستعد ہوئے جس کے نتیجے میں جدید منصوبہ بندی کے ساتھ جولائی 2001ء میں کابل کی تعمیر نو کے لیے
”ماسٹر پلان“ کی منظوری دے دی گئی۔ اگر طالبان کو چند سال مزید مل جاتے تو ایک بار پھر کابل دنیا
کے حسین ترین شہروں میں شامل ہو جاتا۔ طالبان دور میں شاہراہیں یقیناً خوبصورت اور چمکے نہیں تھیں مگر
ان کا امن و امان مثالی تھا۔ لوٹ مار کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ شاہراہوں پر جگہ جگہ مساجد تعمیر کرائی گئیں اور
کنویں کھودے گئے تھے تاکہ مسافر رو کو نماز اور دیگر ضروریات کے لیے دقت نہ ہو۔

سود کا خاتمہ: معیشت کا سودی نظام درحقیقت اقتصادی ترقی کے لیے زہر قاتل ہے۔ طالبان نے ملک
سے سودی کاروبار کا خاتمہ کر دیا۔ بینکاری کا تمام نظام سود کی لعنت سے پاک کر دیا اور اسلام کے سادہ،
ٹھوس اور نافع انسانیت اقتصادی نظام کو اپنایا گیا۔

صنعتی ترقی: طالبان نے ملک میں صنعت و حرفت کو از سر نو زندہ کیا، پرانی فیکٹریوں کو بحال کیا، نئے
کارخانے کھولے اور توانائی کے کئی منصوبوں کا آغاز کیا۔ رقم کی کمی کی وجہ سے وہ کئی منصوبوں میں بیرونی
کمپنیوں سے مدد لے سکے مگر جب انہوں نے اپنی مدد آپ کے تحت وہ منصوبے خود شروع کیے
تو حیرت انگیز طور پر کم خرچ بالائین کا مصداق سامنے آیا۔ فروری 1998ء میں طالبان نے قندھار
سے 400 کلومیٹر دور ایک بجلی گھر سے قندھار شہر تک بجلی کی فراہمی کا منصوبہ مکمل کر لیا۔ اس طرح قندھار
اور گردنو اوج کے علاقے روشنی سے جگمگا اٹھے۔ یاد رہے کہ ظاہر شاہ کے دور میں امریکا نے اس منصوبے

کا آغاز کیا تھا، مگر امریکی انجینئروں نے بھاری اخراجات وصول کر کے بھی طویل مدت تک منصوبے کو تکمیل تک نہ پہنچایا۔ طالبان نے اس کو از سر نو شروع کرنے کے لیے ایک بیرونی کمپنی سے بات چیت کی تو اس سے نے 50 ملین ڈالر کا خرچہ بتایا جو طالبان کے لیے بہت مہنگا تھا۔ تب انہوں نے مقامی ہنرمندوں کی مدد سے یہ کام شروع کیا اور مطلوبہ وقت سے بھی بہت پہلے صرف چھ ماہ بائیس دن میں اسے مکمل کر لیا۔ خرچہ بھی 50 ملین ڈالر کی بجائے صرف 20 ملین ڈالر ہوا۔

ملک میں صنعتیں ٹھپ ہو چکی تھیں۔ کارخانے بند پڑے تھے۔ طالبان حکومت نے انہیں بحال کیا۔ مارچ 1999ء میں انہوں نے 102 نئے صنعتی منصوبوں کی منظوری دی جن میں دواخانے، ماچس، تعمیراتی سامان، کارٹن، پلاسٹک کی اشیاء وغیرہ کی تیاری شامل تھیں۔ اس طرح ملک میں کئی نئی صنعتوں کا اجراء ہوا اور ہزاروں افراد کو روزگار میسر آیا۔ کابل میں پلاسٹک کے سامان کے کئی کارخانے کام کرنے لگے۔ جلال آباد میں ماربل کے کارخانوں کی سرگرمیاں از سر نو شروع ہو گئیں۔ جلال آباد کی ٹیکسٹائل میل جو عرصہ دراز سے بند پڑی تھی طالبان نے خطیر رقم خرچ کر کے جنوری 1999ء میں بحال کر دی۔ اس کا عہدہ کپڑا جلد ہی ملک کے کونے کونے میں فروخت ہونے لگا۔ ہرات اور مزار شریف میں آئل ریفائنری کا آغاز بھی طالبان کا کارنامہ ہے۔

روسی یلغار سے قبل افغانستان کھاد کی پیداوار کا بڑا مرکز تھا، مگر مدت دراز سے کھاد کی پیداوار بہت کم ہو گئی تھی۔ طالبان نے حکومت کے دور میں کھاد کا ایک بڑا پلانٹ از سر نو فعال کر دیا گیا جس سے یومیہ 5 ہزار پوری کھاد کی پیداوار ملنے لگی۔ شبرغان، مزار شریف اور قندوز کی ٹیکسٹائل ملوں کو بھی بحال کر دیا گیا۔ ملک کے صنعتی شہروں میں صنعتی زون رہائشی علاقوں سے ملے ہوئے تھے جن کے باعث شہریوں کو مختلف تکالیف کا سامنا کرنا تھا۔ طالبان نے جب صنعتی سرگرمیاں بحال کیں تو ساتھ ہی اس مسئلے کا حل نکالنے کے لیے بھی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ سب سے پہلے جولائی 2001ء میں انہوں نے جلال آباد کے انڈسٹریل زون کے لیے 1525 ایکڑ زمین مختص کرنے کا اعلان کیا۔ شہری آبادی کے تمام کارخانے وہاں منتقل کرنے کے علاوہ اس جگہ کئی نئے کارخانے تعمیر کرنے کا بھی فیصلہ ہوا۔

افغان ہلال احمر: غریب عوام کی رفاہی خدمات کے لیے ملاح محمد عمر مجاہد نے ایک مستقل فلاحی ادارہ ”افغان ہلال احمر“ قائم کیا جس کے دفاتر پورے افغانستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس ادارے کی سرگرمیوں سے ہزاروں لوگ مستفید ہو رہے تھے۔ غیر ملکی امداد سے محرومی کے باوجود طالبان ”افغان ہلال احمر“ کو بڑی سرگرمی سے چلا رہے تھے۔ جولائی 1998ء میں سامنے آنے والی رپورٹ کے

مطابق افغان ہلال احمر نے ایک سال میں ایک ہزار ایک سو 69 ہنگام اور ایک ہزار دو سو 80 معذور افراد کو امداد فراہم کی۔ ڈاکٹر ملا احمد اللہ کے بیان کے مطابق جون 1997ء سے جون 1998ء تک ایک سال میں صرف بلند کے علاقے میں 50 ہزار مریضوں کا مفت علاج کیا گیا۔

طالبان کی کوششوں سے درجنوں ہسپتال جو بند تھے، کھل گئے تھے اور کئی نئے ہسپتال قائم کیے گئے تھے۔ اکثر ہسپتالوں میں یومیہ دودو تین تین سو مریضوں کا علاج ہو رہا تھا۔ قندھار کا ”مستشفى عمر“ نامی ہسپتال اس کی زعمہ مثال ہے۔

نظریاتی اور اصلاحی بگاڑ کی روک تھام: طالبان نے عوام کے عقائد و نظریات بگاڑنے والے عوامل کی بھی روک تھام کی۔ عیسائی مشنریوں پر پابندی لگائی۔ جعلی عالموں اور مجاوروں کے بھیس میں بہت سے ٹھگ اور غیر ملکی ایجنٹ مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث تھے۔ طالبان نے ان کا پوریا بستر گول کر دیا۔ اس سلسلے کی ایک دلچسپ مثال بلوچستان کے سرحد کے قریب افغان حدود میں ”سانپوں والی سرکار“ کا مزار ہے۔ یہاں مزار کے گنبد پر سانپ کا 300 سال قدیم مجسمہ نصب تھا۔ مزار کے مجاوروں نے دو سانپ پالے ہوئے تھے جنہیں لوگ مشکل کشا اور حاجت روا تصور کرتے تھے۔ مزار کے سامنے مندروں کی طرح گھنٹیاں نصب تھیں۔ گویا یہ اسلام کے لبادے میں ہندوانہ عقائد کا پرچار ہو رہا تھا۔ طالبان نے سانپ کا مجسمہ مسمار کر دیا اور مجاوروں کو بھگا دیا۔ اندر موجود دونوں سانپوں کو بھی مار ڈالا۔ اس طرح شرک کی یہ دکان بند ہو گئی۔

قندھار کی عید گاہ: طالبان بڑی بڑی عمارتیں تو تعمیر نہ کرا سکے مگر قندھار میں دس لاکھ افراد کی منجانبش رکھنے والی دنیا کی سب سے بڑی عید گاہ تیار کرائی جس کے قبلہ رخ پر دنیا کا سب سے بڑا گنبد طالبان کے ذوق تعمیرات کا گواہ ہے۔

طالبان نے اپنے ہم وطنوں کو مال و دولت سے نہال تو نہیں کیا، ان پر عیش و عشرت کے دروازے تو نہیں کھولے مگر انہیں اچھے اخلاق و کردار کا نہایت گراں قدر رحمہ دیا۔ انہوں نے بے حد سادہ زندگی اپنا کر لوگوں کو ایک ایسا عملی نمونہ دیا جس کی مثالیں صرف قرونِ اولیٰ میں نظر آتی ہیں۔ طالبان قیادت کی درویشانہ زندگی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ عید الفطر کے دن بھی گورنر قندھار ملا حسن رحمانی کے بچے نئے کپڑوں میں نظر نہیں آتے۔ طالبان کے قائدین کا نقطہ نظر یہ تھا کہ خود بھوکا رہ کر عوام کو سیر کیا جائے اور جو شے عوام کی دسترس میں نہ ہو حکمران بھی اسے اپنے لیے روانہ سمجھیں۔ بلاشبہ یہ دور فاروقی اور دور عمر بن عبدالعزیز کی جھلکیاں تھیں جو عمر ثالث کے دور میں ایک بار پھر نظر آئیں۔ افغان قوم کو ان

فائدہ مستحکمانوں سے جو روشن نمونہ ملا اس پر دنیا کی کرداروں نے تہمتیں قربان کی جاسکتی ہیں۔
 تجارتی روئیں بحال: افغانستان میں بد امنی نے تجارت پر بڑے منفی اثرات مرتب کیے تھے اور
 تاجروں نے اس ملک کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ طالبان نے شاہراہوں کو محفوظ کر کے تاجروں کو ہر طرح
 کی سہولیات دیں۔ یوں تجارتی شاہراہیں آباد ہو گئیں۔

18 اکتوبر 1997ء کو طالبان سربراہ نے وزارت صنعت و تجارت کو حکم دیا کہ پاکستانی تاجروں سے
 مکمل تعاون کیا جائے۔ اعلان کیا گیا کہ ”ہر مسلمان تاجر، وسط ایشیا یا افغانستان سے ہر جائز تجارت
 کر سکتا ہے۔ تاجروں کے لیے اسپین بولڈک اور تورغند (سرحد ترکمانستان) میں گوداموں کا اور
 ہرات و قندھار میں رہائش کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ راستے کا تحفظ اور ٹرانسپورٹ کا انتظام افغان حکومت
 کے ذمے ہوگا۔“

اپریل 1998ء میں طالبان حکومت نے ”افغان انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ“ کو بحال کر دیا۔ ملک بھر میں
 اس ادارے کی شاخیں کھول دی گئیں۔ اس ادارے کی خدمات کی بے حد مانگ موجود تھی۔ ایک
 پاکستانی کمپنی نے فوراً سالانہ 10 لاکھ ٹن سامان کی بار برداری کا معاہدہ کر لیا۔ اس طرح دونوں ملکوں میں
 تجارت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ طالبان نے عوام کو سہولت دینے کے لیے ایک حیرت انگیز کام یہ کیا
 کہ افغانستان آنے والی تمام درآمدات پر محصول (کسٹم) معاف کر دیا۔ چنانچہ افغان عوام کو دنیا بھر کی
 اشیائے نہایت سستے داموں ملنے لگیں۔ پاکستان کی زرعی اجناس خصوصاً پھل اور سبزیاں افغانستان میں
 ہاتھوں ہاتھ خریدی جانے لگیں۔ آلو اور پیاز صرف 5 روپے کلو فروخت ہو رہے تھے۔

طالبان کی ملکی و عوامی خدمات کا یہ ایک مختصر سا تذکرہ ہے۔ اس پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے
 کہ طالبان صرف فاتح اور کشور کشا ہی نہیں بلکہ جہاں دار بھی تھے۔ انہوں نے نہایت محدود وسائل کے
 ساتھ اپنے دور حکمرانی میں برسوں سے تباہ حال ملک کو از سر نو آباد کرنے اور عوام کو بنیادی سہولیات بہم
 پہنچانے کی جو کوششیں کی تھیں ان کو فراموش کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔

طالبان حکومت کا ڈھانچا: طالبان حکومت کا ڈھانچا اور نظام بڑا سادہ تھا۔ اسے ہم بڑی حد تک قدیم دور
 کے مسلم سلاطین اور خلفاء کے طرز حکومت سے مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ مغربی جمہوریت سے اسے کوئی تعلق نہ
 تھا۔ طالبان حکومت کے سربراہ ملا محمد عمر مجاہد تھے۔ ملا محمد ربانی نائب سربراہ مملکت تھے۔ حکومتی ڈھانچے کے
 اہم ستون تین مرکزی ادارے تھے جنہیں ریاست الوزراء، عسکری شوریٰ اور مرکزی شوریٰ کہا جاتا تھا۔

ریاست الوزراء 16 وزراء پر مشتمل ادارہ تھا۔ اس میں ملا عبید اللہ وزیر دفاع، ملا نور الدین تریابی

وزیر انصاف، مولانا جلال الدین حقانی وزیر قباکی امور و سرحدات، ملا محمد عباس وزیر صحت، ملا میر خان متقی وزیر اطلاعات و ثقافت، قاری دین محمد وزیر منصوبہ بندی، ملا احمد اللہ وزیر مواصلات، ملا احمد جان وزیر معدنیات و صنعت، مولوی کلام الدین وزیر برائے مذہبی پولیس اور دیگر وزراء شامل تھے۔ اس ادارے کو ”کابل شوروی کی کابینہ“ بھی کہا جاتا تھا۔

”عسکری شوروی“ طالبان کا سب سے اعلیٰ عسکری ادارہ تھا۔ اس میں ملا محمد عمر کمانڈر انچیف، ملا محمد حسن بلٹری چیف آف آرمی اسٹاف اور ملا رحمت اللہ خوند چیف آف آرمی اسٹاف تھے۔ ملا محمد فضل بری افواج کے سربراہ و نائب وزیر دفاع تھے، جبکہ ملا جہ خان، ملا محمد یونس اور تین دیگر کمانڈر بھی عسکری شوروی میں شامل تھے۔

”مرکزی شوروی“ طالبان حکومت کا سب سے اعلیٰ سطحی ادارہ تھا۔ اس میں ملا محمد حسن رحمانی، ملا محمد فضل، مولانا عبدالستار ستانی (چیف جسٹس آف افغانستان) ملا محمد غوث، ملا خیر الدین خیر خواہ (وزیر داخلہ) ملا احسان اللہ احسان (گورنر اسٹیٹ بینک) اور ملا عبدالجلیل (وزیر خارجہ) شامل تھے۔

ریاست الوزراء (کابل شوروی) اور عسکری شوروی اپنی سفارشات مرکزی شوروی کو پیش کرتی تھیں۔ ملا محمد عمر مرکزی شوروی سے شورے کے بعد تمام سیاسی، عسکری اور اقتصادی مسائل کا فیصلہ خود کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ”شعبہ امر بالعروف ونہی عن المنکر“ بھی نہایت با اختیار ادارہ تھا۔ اس کے سربراہ مولوی کلام الدین تھے۔ یہ ادارہ براہ راست سربراہ حکومت ملا محمد عمر سے احکام لیا کرتا تھا۔ اس کے ضابطوں اور احکام کے اعلانات ریڈیو کابل سے مسلسل نشر ہوتے رہتے تھے۔

تیل کا کھیل، وسط ایشیا سے افغانستان تک: طالبان کی مشکلات اور عالمی سطح پر ان کے خلاف پھیلانے گئے جال کا صحیح تجزیہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک ہم تیل کے اس کھیل سے وقفہ نہ ہوں جو 1990ء کی دہائی میں وسط ایشیا میں کھیلا جا رہا تھا اور جس میں امریکا اور روس سمیت کئی بڑی طاقتیں شریک تھیں۔ بات یہ تھی کہ روس سے آزاد ہونے والی ریاستوں میں معدنی وسائل کے بے پناہ ذخائر تھے۔ بحیرہ خزر (کیمپین سی) سے لے کر وسط ایشیا (آذربائیجان، ترکمانستان، ازبکستان اور قزاقستان) تک کا علاقہ تیل اور گیس کے عظیم الشان خزانوں سے بھرپور ہے۔ اس خطے میں تیل کے ذخائر کا تخمینہ 150 بلین بیرل سے زائد ہے جو کہ امریکا کے اپنے تیل کے کل ذخائر سے سات گنا ہے۔ لہذا وجہ ہے مغربی تیل کمپنیاں اس خطے پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تاب تھیں۔

1990ء کی دہائی میں ان کمپنیوں نے یکے بعد دیگرے قازقستان، آذربائیجان اور پھر ترکمانستان سے معاہدے کیے۔ قازقستان میں 58 بلین بیرل تیل، آذربائیجان میں 27 بلین بیرل تیل اور ترکمانستان

میں 32 بلین بیرل تیل موجود ہے۔ جہاں تک گیس کا تعلق ہے وہ افغانستان میں 88، آذربائیجان اور تاجکستان میں سے ہر ایک کے پاس 35 اور ازبکستان میں 10 ٹریلین کیوبک فٹ ہے۔ اس سلسلے میں ترکمانستان سب سے آگے ہے جس کے پاس 159 ٹریلین کیوبک فٹ گیس کا عظیم ذخیرہ ہے۔

ترکمانستان اپنی آمدن کا بیشتر حصہ قدرتی گیس فروخت کر کے ہی حاصل کرتا تھا، مگر اس کے باوجود پیداوار زیادہ تھی اور گاہک کم۔ ملک کی معیشت بہتر کرنے کے لیے ترکمانستان نئے خریداروں کی تلاش میں تھا۔ یہی کیفیت وسط ایشیا کے دوسرے ممالک کی تھی۔ چنانچہ مغربی کمپنیوں سے ان کے معاہدے ہوئے اور وسط ایشیا کا تیل اور گیس دوسرے ملکوں تک لے جانے کے لیے ہزاروں کلومیٹر طویل پائپ لائنوں کے کئی نقشوں پر غور ہونے لگا۔ ترکمانستان سے تیل اور گیس کے ذخائر بحر ہند تک لانے کے لیے افغانستان اور بلوچستان (پاکستان) سے بہتر کوئی اور روٹ نہیں ہو سکتا تھا اس لیے افغانستان تیل کے عالمی یو پار یوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت حاصل کر گیا۔

اس سلسلے میں پہلا منصوبہ ارغچان کی کمپنی برید اس نے بنایا۔ اس نے 1994ء میں یہ منصوبہ پیش کیا کہ ترکمانستان سے افغانستان کے راستے ہندوستان تک گیس پائپ لائن بچھائی جائے۔ چونکہ یہ منصوبہ ”کم خرچ بالائین“ کا مصداق تھا اس لیے اگلے برس (1995ء میں) ایک امریکی کمپنی یونوکال نے بھی اس منصوبے کو اپنانے کی کوشش شروع کر دی۔ یونوکال کو امریکی حکومت کی پوری سرپرستی حاصل تھی۔ بڑے بڑے امریکی سیاست دان اس کے حصہ دار تھے۔ دو برس تک اس کے لیے تیاری ہوتی رہی مگر افغانستان میں خانہ جنگی کے سبب اس پر عملدرآمد کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔ تیل کمپنیاں حیران تھیں کہ آخر وہ کس کمانڈر سے جا کر بات کریں۔ ہرادی میں ایک الگ گروہ کی حکومت تھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس منصوبے کا آغاز ممکن نہ تھا۔ تاہم طالبان کی فتوحات کے پیش نظر تیل کمپنیوں کو یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ افغانستان میں امن قائم ہو جائے گا اور پائپ لائن منصوبے پر کام شروع کیا جاسکے گا۔

امریکی کمپنیوں کی طالبان سے بات چیت: اگر اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ افغانستان میں قیام امن امریکی مفادات کے لیے بہتر تھا اور خود امریکا کو بھی اس کا احساس تھا۔ دوسرے لفظوں میں طالبان حکومت کا استحکام اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سازگار ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ طالبان کی اہل اسلام پسندی اور بے چلک پالیسیاں مغرب اور امریکا کے لیے باعث اضطراب تھیں۔ وہ افغانستان سمیت، تمام عالم اسلام کو جن ”ملاؤں“ سے دور رکھنا چاہتے تھے، اب وہی ان کی مجبوری بنتے جا رہے تھے۔

آج اگر اس دور کے حالات کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ امریکا طالبان اور ان کی پالیسیوں سے سخت نفرت کرنے کے باوجود تیل اور گیس کے لالچ میں ان سے اس قسم کا تعاون چاہتا تھا جیسا کہ سعودی حکمرانوں اور مغربی طاقتوں کے مابین چلا آیا ہے۔ سعودی عرب میں حدود و قصاص اور اسلامی احکام کے نفاذ کو امریکا نے بادل غواستہ قبول کر کے اس لیے اپنے دوست کی حیثیت دی کہ اس کے ذریعے تیل کی دولت حاصل کرنا امریکا کی مجبوری تھی۔

کچھ ایسا ہی معاملہ طالبان کے ساتھ بھی تھا۔ وہ ایک طرف ملا اور مجاہد ہونے کے ناتے معتب اور قابل نفرت تھے تو دوسری طرف پائپ لائن منصوبے کے بہترین راستے کے مالک ہونے کے باعث مغربی دنیا ان کے تعاون کی محتاج تھی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا اور دوسری مغربی طاقتوں نے طالبان کو عروج پاتا دیکھ کر ان سے روابط پیدا کرنا شروع کر دیے تھے۔ دراصل انہیں اُمید تھی کہ وہ طالبان کو جلد ہی رام کر کے اس حد تک لچکدار بنادیں گے کہ وہ حدود و قصاص اور شرعی احکام کے نفاذ کے باوجود سیاسی طور پر مغربی طاقتوں کے لیے بے ضرر ثابت ہوں گے۔ وہ ان کے صدیوں پر محیط منصوبوں کے لیے توانائی مہیا کریں گے، ان کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہوں گے اور دیگر مسلم ملکوں کی طرح امریکا کے مددگاروں کی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وہ خطرہ جو امریکا و یورپ کو ”جہادیوں“ اور علمائے اسلام سے لاحق ہے، جلد دور ہو جائے گا۔ کچھ اس قسم کی اُمیدوں اور غدشوں کے مابین لٹکتے ہوئے امریکا نے تیل کمپنیوں کی وساطت سے طالبان سے گفت و شنید کا آغاز کیا تھا۔

تیل کمپنیوں کا طالبان سے رابطہ کب ہوا: طالبان کے ساتھ تیل کمپنیوں کے تعلقات کا آغاز 1996ء کے وسط میں ہوا تھا اور جب طالبان نے کامل فتح کیا تو ان روابط میں تیزی آگئی۔ امریکا نے تیل کمپنیوں کے ذریعے طالبان سے گفت و شنید شروع کی، قحط زدہ افغانستان کے محافظ طالبان کے لیے یہ پیش کش بڑی پرکشش تھی۔ انہیں ان کمپنیوں کو اپنے ملک سے پائپ لائنوں کو گزارنے کی اجازت دینے پر بیٹھے بٹھائے اتنی خطیر رائلٹی مل سکتی تھی جس سے ملک کا نقشہ بدلا جاسکتا تھا۔ چنانچہ طالبان نے بھی اس منصوبے میں دلچسپی لینا شروع کر دی، مگر ان کا انداز باوقار تھا۔

طالبان برید اس کے ہیڈ کوارٹر میں: مغربی کمپنیوں نے طالبان کو رام کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن شروع کر دیے۔ برید اس نے پہل کی اور 1997ء کے آغاز میں طالبان کو اپنے ملک کے دورے کی دعوت دی جس کے نتیجے میں فروری 1997ء میں طالبان کا وفد اجٹائن کے دارالحکومت ہیونس آئرس میں برید اس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ اس دن طالبان کے احترام میں کمپنی کی تمام خاتون

سکریٹریوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا جسم زیادہ سے زیادہ ڈھانپ کر رکھیں کیونکہ طالبان عریانیت سے نفرت کرتے ہیں۔ اس دوران طالبان کا ایک اور وفد واشنگٹن پہنچ کر یونوکال کے منتظمین سے تبادلہ خیال کر رہا تھا۔ طالبان نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس وقت کوئی فیصلہ نہ کیا اور حالات کا جائزہ لے کر واپس آ گئے۔ ان روابط کا اتنا فائدہ ہوا کہ مارچ 1997ء میں بریڈاس نے کابل میں اپنا دفتر کھول لیا اور طالبان حکام سے ان کے رابطے تیز تر ہو گئے۔ جلد ہی بات بننے لگی اور کئی ہفتوں کی گفت و شنید کے بعد 150 صفحات پر مشتمل معاہدے کا مسودہ تیار ہو گیا، مگر اس پر دستخط باقی تھے۔

یونوکال کو کھرا جواب: امریکا اور اس کے زیر اثر پاکستان کی خواہش تھی کہ طالبان یونوکال سے معاہدہ کریں چنانچہ ستمبر 1997ء میں طالبان کے وزیر صنعت ملا احمد جان دوسری بار ارجنٹائن کے دورے پر روانہ ہونے لگے تو پاکستان نے طالبان پر دباؤ ڈالا کہ وہ یونوکال سے بھی مذاکرات کریں۔ طالبان کو یونوکال سے کوئی عائد نہیں تھا مگر وہ اس کے سر پرست امریکی سیاست دانوں کے رویے سے متفرق تھے۔ وہ برابر کی سطح پر سودے بازی کے لیے تیار تھے مگر امریکا انہیں خیرات لینے والا بھکاری تصور کر رہا تھا۔ چنانچہ اگست 1997ء میں امریکا نے موقف اختیار کیا کہ پائپ لائن معاہدہ تب کیا جائے گا جب اسامہ بن لادن کو امریکا کے حوالے کر دیا جائے اور افغانستان میں جہادی تربیت گاہیں بند کر دی جائیں۔ طالبان کے نائب امیر ملا محمد ربانی نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا تھا اور اصولی موقف اختیار کرتے ہوئے کہا تھا: ”معاہدے کی ضرورت آپ کو ہے۔ ضرورت مند کو شرائط عائد کرنے کا کیا حق ہے؟“

اکتوبر کے اواخر میں افغانستان، پاکستان اور ترکمانستان گیس پائپ لائن کے لیے ایک مجلس کی تشکیل میں متفق ہو گئے۔ طالبان کے سفیر مولوی شہاب الدین نے ترکمانستان کا دورہ کیا اور وہاں پر بیان دیا کہ ازبک کمپنی سمیت نصف درجن سے زائد کمپنیاں امیدوار ہیں، ان میں سے جو ہماری شرائط پر پوری اترے گی اسے کام کا موقع دیں گے۔ ادھر پاکستان کے اصرار پر نومبر 1997ء میں طالبان کے ایک اور وفد نے ملا محمد غوث کی قیادت میں امریکا کا بھی دورہ کیا اور یونوکال سے دوبارہ بات چیت کی۔ اب تک یہ واضح نہیں ہو سکا تھا کہ طالبان کس کے گلے میں ہار ڈالیں گے۔ جلد ہی ان طاقتوں کو اندازہ ہو گیا کہ طالبان ان کی توقعات سے کہیں زیادہ اٹل اور بے چلک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار جال ڈالنے کے بعد آخر میں امریکا طالبان سے مستقل طور پر بیزار اور ناامید ہو گیا۔

بات چیت ختم: دسمبر 1997ء سے لے کر فروری 1998ء تک افغانستان میں برف باری کی وجہ سے یہ معاملات رکے رہے۔ پھر موسم بہار میں طالبان کی مخالف گروہوں سے جنگ چھڑ گئی۔ تاہم مغربی کمپنیوں کو

امید تھی کہ طالبان جلد ہی جنگ سے فارغ ہو کر زیادہ مستحکم اعزاز میں تیل کے عالمی کھیل کا حصہ بن سکیں گے مگر سات اگست 1998ء کو کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں کو نامعلوم افراد نے بموں سے اڑا دیا جس کا الزام اسامہ بن لادن پر لگادیا گیا اور امریکا نے القاعدہ کو سزا دینے کے عنوان سے 20 اگست کو بحیرہ عرب میں کھڑے اپنے بحری بیڑے سے افغانستان میں القاعدہ کے معسکر پر کروڑوں میزائل داغ دیے۔ اس طرح دونوں ملکوں میں تعلقات کشیدہ تر ہو گئے اور یونو کال نے قذافی سے اپنا عملہ واپس بلالیا۔ امریکا کا موقف تھا کہ اسامہ بن لادن کی موجودگی میں کوئی مغربی کمپنی افغانستان میں پائپ لائن تعمیر نہیں کر سکتی۔ قصہ تو ختم ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود پاکستان پائپ لائن کے معاملے کو دوسرے اعزاز میں حل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپریل 1999ء میں حکومت پاکستان نے اسلام آباد میں ترکمانستان اور افغانستان کے نمائندوں کو جمع کر کے گیس پائپ لائن کے لیے نئے معاون اور سرپرست تلاش کرنے کی کوشش کی مگر مغربی کمپنیاں افغانستان میں قدم رکھتے ہوئے گھبرائی تھیں۔ کلنٹن انتظامیہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا طالبان سے عداوت رک کر گیس لائن منصوبے کو فرغانہ کیساتھ شروع کیا جائے یا اپنی آن بان قائم رکھنے کے لیے افغانستان میں کوئی کٹھ پتلی حکومت قائم کرنے پر سرمایہ کاری کی جائے۔

بل کلنٹن اس سوال کے جواب میں متذبذب رہا مگر جب 20 جنوری 2001ء کو تیل کے عالمی بیوپاری جارج ڈبلیو بش نے امریکا کے نئے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھالا تو وہ تیل کے دھاروں کا رخ امریکا کی طرف کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ کلنٹن انتظامیہ جن اہداف کو دیر سے دھیرے دھیرے حاصل کرنا چاہتی تھی جو شیلا اور من چلائش انہیں ایک ہی جست میں سر کر لینے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کی حریصانہ نگاہیں بحیرہ خزر سے قزاقستان تک زیر زمین تیل کے مستلطم سمندر پر جمی تھیں۔ اس کے سامنے توانائی کا وہ بحران بھی تھا جو امریکا کو چند عشروں بعد مفلوج کر سکتا تھا جبکہ بش پوری دنیا کو امریکی شکنجے میں لینے کا خواہاں تھا۔ اس کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ جلد از جلد افغانستان کو تیل اور گیس کے ذخائر کی گزرگاہ بنائے، چاہے سودے بازی کر کے، چاہے خون کی ندیاں بہا کر۔

بامیان کے بت: جوں جوں دنیا طالبان سے رشتے ناتے توڑتی گئی، طالبان بھی ان کی خوشی یا ناراضی سے بے پروا ہوتے گئے۔ شاید انہیں بھی اندازہ تھا کہ ان کی حکومت جلد ختم کر دی جائے گی اس لیے وہ اس سے پہلے پہلے اپنا ہر ارمان پورا کر لینا چاہتے تھے۔ فروری 2001ء کے وسط میں طالبان مخالف طاقت حزب وحدت نے ایک بار پھر بامیان پر قبضہ کر کے طالبان کو وہاں سے نکال دیا۔ تاہم ایک ہفتے بعد 20 فروری کو طالبان نے دوبارہ بامیان کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس موقع پر طالبان قیادت نے فیصلہ

کیا کہ اب بامیان کے دو ہزار سال قدیم بتوں کو تباہ کر دینا چاہیے جو بدھ مت کے کروڑوں پیروکاروں کے نزدیک سب سے بڑے معبود کا درجہ رکھتے ہیں۔

یہ بت پہاڑوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بت 177 فٹ اور دوسرا 120 فٹ بلند تھا۔ ان کی تعمیر میں کانگریڈ مٹی اور خاص قسم کے پتھر استعمال کیے گئے تھے جن کی وجہ سے یہ نہایت ٹھوس اور مضبوط تھے۔ کتب تاریخ کے مطابق یہ دیوبکر بت بدھ مت کے پیروکار حکمران "کنشک" کے حکم سے بنائے گئے تھے۔ ان کی تعمیر کا زمانہ 120ء سے 160ء تک بتایا جاتا ہے۔ کنشک کا تعلق کوشانی خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے دور میں بدھ راہبوں نے بامیان کے پہاڑوں میں شہد کی مکینوں کے چھتوں جیسے غار بنائے تھے جن میں وہ یکسوئی سے پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ بامیان پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی عیسوی تک بدھ مت کا مرکز رہا۔ مشہور چینی سیاح "آفا شین" نے پانچویں صدی عیسوی میں ان بتوں کا معائنہ کیا تھا۔ ایک اور چینی سیاح "ہوان تسینگ" نے 630ء میں ان بتوں کا مشاہدہ کیا اور بتایا کہ یہ مجسمے سونے اور قیمتی جواہر سے مرصع تھے۔

اس کے چند عشروں بعد سرزمین عرب سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قافلے اسلام کی مشعل لیے افغانستان پہنچے۔ اس وقت بامیان کی بدھ حکومت نے جزیہ دے کر صلح کر لی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بامیان میں داخل ہوئے بغیر واپس چلے گئے۔ اگلی صدی میں بامیان کی حکومت ایک بدھ شہزادی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اپنے خاندان اور رعایا سمیت مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ ان فومسلموں نے کدالوں اور تھوڑوں سے از خود یہ بت توڑنے کی کوشش کی مگر وہ ان پہاڑ نما مجسموں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں حاکم خراسان یعقوب بن لیث صفاری بھی انہیں توڑنے میں ناکام رہا اور ان میں جڑے ہوئے قیمتی پتھر نکال کر واپس چلا گیا۔ بارود کا زمانہ آیا تو سترہویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب عالمگیر نے افغانستان فتح کرنے کے بعد پہلی بار توپوں کے ذریعے انہیں تباہ کرنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی عیسوی میں امیر عبدالرحمن کی ملکہ کے حکم سے انہیں ایک بار پھر گولہ باری کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کارروائیوں سے ان بتوں کو نقصان تو ضرور پہنچا مگر انہیں منہدم نہ کیا جاسکا۔

بتوں کو توڑنے کا فیصلہ: طالبان امارت اسلامی شروع سے اسلامی شعائر کو زعمہ اور کفریہ آثار کو سرزمین اسلام سے مٹانے کا تہیہ کیے ہوئے تھی، اس لیے بامیان کے بتوں کو بہر صورت ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ حکومتی سطح پر اس فیصلے سے قبل سپریم کورٹ اور مرکزی دارالافتاء سے استفتاء کیا گیا کہ آیا ان بتوں اور مجسموں کو توڑا جائے یا باقی رکھا جائے؟ دونوں اداروں نے جواب دیا کہ اسلامی شریعت کی رو سے

تمام بتوں اور مجسموں کو توڑنا ضروری ہے۔ چنانچہ 28 فروری 2001ء کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر مجاہد نے ملک بھر میں موجود تمام مجسموں اور بتوں کو ختم کر دینے کا حکم دے دیا۔ ملا محمد عمر نے کہا: ”معبود حقیقی صرف اللہ ہے۔ ناحق معبودوں کو اس لیے ختم کر رہے ہیں کہ مستقبل میں کوئی ان کی پوجا نہ کرے۔“

طالبان سربراہ کے اس اعلان سے دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی کہ افغانستان کا قومی ورثہ تباہ ہو جائے گا، دنیا اس کی ثقافت سے محروم ہو جائے گی۔ بدھ مت ملکوں جاپان، تھائی لینڈ، سری لنکا نے آسمان سر پر اٹھایا مگر طالبان نے پروا نہ کی۔ ملا محمد عمر نے عید الاضحیٰ کے خطبے میں بیابانگ دہلی کہا:

”یہ بت ہمارے تاریخی ورثے کا صرف ایک فیصد حصہ ہیں۔ باقی ننانوے فیصد حصہ اب بھی بدستور باقی ہے جو ہماری ثقافتی تاریخ اور فخر کے لیے کافی ہے۔ یہ بت شرعی حکم کی بنا پر توڑے جا رہے ہیں۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زائد پیغمبروں نے اس شرک کا مقابلہ کیا تھا۔“

بت فروش نہیں بت شکن: جاپان سمیت کئی ممالک نے طالبان کو بت نہ توڑنے کی شرط پر بھاری مالی امداد کی پیش کش بھی کی مگر ملا محمد عمر نے سلطان محمود غزنوی کے انداز میں جواب دیا: ”ہم بت فروش نہیں بت شکن کہلوانا پسند کریں گے۔“ اس اعلان کے بعد یکم مارچ 2001ء کو سینکڑوں طالبان ٹینکوں، گولہ بارود کی بھاری کھیپ اور راکٹ لانچروں سمیت بامیان کے بتوں کے سامنے پہنچ گئے۔ اس ہم کی نگرانی ملک کے وزیر دفاع ملا عبید اللہ، سرپل کے گورنر ملا عبدالمنان خٹکی اور ملا شہزادہ کر رہے تھے۔ دونوں بتوں کو بارود کا لباس پہنا دیا گیا جس کی مقدار 1250 من تھی۔ اس کے علاوہ 200 ٹینک شکن بارودی سرنگیں اور ایک ہزار کلو گرام اور پانچ سو کلو گرام کے ایسے 42 بڑے بم بھی نصب کیے گئے جو چیٹ طیاروں سے گرائے جاتے ہیں۔ یہ منصوبہ بندی قندھار سے آئے ہوئے بارود کے ماہر ملا لعل محمد نے کی تھی۔

جب بارودی دھماکا کیا گیا تو زلزلہ سا آگیا۔ سرخ شعلوں، دھوئیں کے بادلوں اور گرد و غبار کے مرغولوں نے فضا کو ڈھانپ لیا۔ دور دور تک پتھروں کے ٹکڑے ادلوں کی طرح برسنے لگے۔ مطلع صاف ہوا تو دونوں بتوں کے سراور چہرے غائب ہو چکے تھے۔ بڑے بت کا زیر ناف حصہ بھی تباہ ہو گیا تھا۔ اسی روز کاہل اور غزنی کے عجائب گھروں کے بتوں کو بھی توڑ پھوڑ دیا گیا۔ ملا محمد عمر نے اس نیک کام میں تاخیر کے کفارے اور عمل کی تکمیل کے شکرانے کے طور پر 100 گائیں ذبح کرا کے ان کا گوشت غریبوں میں تقسیم کرایا۔ بت شکنی کے اس تاریخی واقعے کے ساتھ ہی ملک بھر میں جاری کئی ماہ کی خشک سالی دور ہو گئی۔ موسلا دھار بارشوں کی صورت میں ابر کرم برس پڑا اور کچھ ہی دنوں میں ہر طرف ہری بھری فصلیں پہلنے لگیں۔

اسلام پر کھجوتا نہیں ہو سکتا: بامیان کے بتوں کی تباہی کا یہ واقعہ عالمی طاقتوں کو طالبان کے خلاف مزید

قتل کرنے کا سبب بنا۔ 15 مارچ 2001ء کو برطانوی جیوز انٹرنیشنل سیکورٹی رپورٹ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ بٹل انتظامیہ طالبان حکومت کے خلاف بھرپور آپریشن کے لیے بھارت، ایران اور روس کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے۔ بھارت اور روس تاجکستان اور ازبکستان کے ہوائی اڈوں سے احمد شاہ مسعود اور رشید دوستم کو عسکری سامان، فوجی مشین، ہیلی کاپٹر اور مواصلاتی آلات فراہم کر رہے ہیں۔ مالی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں دن بدن بڑھتی گئی مگر طالبان اپنی جگہ اٹل تھے۔ پاکستان کی جمعیت علمائے اسلام نے 14 اپریل 2001ء کو پشاور میں عالمی دیوبند کانفرنس منعقد کی تو اس میں طالبان سربراہ کے نمائندے نے اپنے امیر کا یہ پیغام پڑھ کر سنایا: ”عالمی طاقتیں ہمارے خلاف یکجا ہو چکی ہیں مگر اسلام پر کوئی ہجمو نہیں ہو سکتا۔“ ملا عمر کے پیغام میں اس طرف اشارہ تھا کہ نئے امریکی صدر بٹل کی نگاہیں وسط ایشیا کی معدنی دولت پر مرکوز ہیں اور وہ اس پر قبضے کے لیے افغانستان کو فتح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

ملا محمد ربانی کی وفات: 12 اپریل 2001ء کا دن طالبان کے لیے نہایت غم انگیز تھا۔ ملک کی چھ رکنی مرکزی وزارت کونسل ”ریاست الوزراء“ کے سربراہ ملا محمد ربانی وفات پا گئے تھے۔ وہ ملا محمد عمر کے سب سے قریبی ساتھی تھے۔ 1960ء میں پیدا ہوئے، 20 سال کی عمر میں روس کے خلاف جہاد میں شریک ہو گئے اور مولانا یونس خالص کی تنظیم میں نائب کمانڈر کے طور پر ان گنت کارنامے انجام دیے۔ وہ ”حاجی معاون“ کے لقب سے مشہور تھے۔ ملا محمد عمر کے ساتھ طالبان تحریک کو منظم کرنے میں ان کا مرکزی کردار تھا۔ جلال آباد اور کابل کی فتح میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ آخر تک ملک کے سب سے بڑے حکومتی ادارے ریاست الوزراء کے سربراہ رہے۔ ان کی حیثیت وزیر اعظم کی سی تھی۔ ان کی وفات سے طالبان قیادت ایک شدید صدمے سے دوچار ہوئی۔

اگرچہ ان دنوں ملک میں عموماً طور پر امن و امان تھا مگر باغیوں کی سازشیں جاری تھیں، جن کے طشت الزام ہونے پر طالبان کو بار بار حرکت میں آنا پڑتا تھا۔ ہر دو تین ہفتوں میں ایسا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوتا رہتا تھا۔ مئی 2001ء میں ایک غیر معمولی جنگ برپا ہوئی۔ دوستم نے ساز باز کر کے سرپل، مزار اور شبرغان پر قبضے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ وہ اپنے گروہ کے ساتھ یک دم چال کے قریب نمودار ہوا اور طالبان پلوٹ پڑا۔ تاہم طالبان نے بھرپور انداز میں دفاع کیا۔ ان کے جوابی حملوں میں دوستم کے چار بڑے کمانڈر مارے گئے اور وہ فرار ہو کر سرحدی قصبے بندر آئی خانم میں روپوش ہو گیا۔ اسی طرح اس کا مزار شریف پر از سر نو تسلط کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ 12 مئی 2001ء کا ہے۔

شرعی یا بندیاں اور اقتصادی یا بندیاں: طالبان حکومت نفاذ شریعت کے مراحل کی تکمیل کی طرف

گامزن رہی۔ ۲۶ جولائی کو ملامحمد عمر نے غیر شرعی اشیاء کی درآمد پر پابندی عائد کر دی۔ ان اشیاء میں دُش
اٹینا، پروجیکٹر، آلات موسیقی، کیرم بورڈ، خطرناک، الکحل مشروبات، تصاویر، پٹاٹے، نمکس، ٹائی اور سورکا
گوشت وغیرہ کو شامل کیا گیا تھا۔

ادھر اقوام متحدہ کے موقف میں بھی روز بروز سختی آتی جا رہی تھی۔ اگست کے آغاز میں اقوام متحدہ نے
20 ماہرین کی ٹیم پاکستان بھیجنے کا اعلان کیا۔ ان ماہرین کا کام یہ تھا کہ وہ دیکھیں کہ طالبان کے خلاف
سلامتی کونسل کی منظور شدہ قرارداد میں عائد کردہ پابندیوں کی تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں؟ اس قرارداد کی ایک
شق یہ بھی تھی کہ پڑوسی ممالک طالبان کو اسلحہ فراہم نہیں کریں گے۔ امریکا کو شک تھا کہ پاکستان طالبان کو
اسلحہ دیتا ہے یا اس کی فراہمی میں تعاون کرتا ہے۔

امریکا چاہتا تھا کہ طالبان کو نہتہ کر دیا جائے اور ان کے مخالفین کو طاقت ور بنا کر مارت اسلامیہ کا خاتمہ
کر دیا جائے۔ اس مقصد کے تحت اگست 2001ء کے دوسرے عشرے میں امریکا اور اس کے اشتراک
سے طالبان مخالف گروہوں کو بھرپور امداد دے کر طالبان کے خلاف ”آپریشن ورتھ پلٹنا“ کا آغاز کیا جس
کے تحت دو ستم اور احمد شاہ مسعود کے جنگجوؤں کو بالترتیب قاریاب، شیرخان، پلچ، مزار شریف، سمنگان اور
کابل پر قبضہ کرنا تھا۔ مگر طالبان نے بھرپور مزاحمت کرتے ہوئے اس سازش کو قبل از وقت ناکام بنا دیا اور
باغیوں کے 25 سرغنے اور 400 کارکن گرفتار کر لیے۔ دو ستم حسب معمول فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔



مآخذ و مراجع

- ❦ طالبان جند اللہ نہیں ہویدی
- ❦ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 3، 4
- ❦ طالبان اور تیل کا کھیل۔ احمد رشید (نمائندہ ٹیلی گراف)
- ❦ ہفت روزہ تکبیر: جلد 1999ء، 2000ء، 2001ء
- ❦ ماہنامہ مارت اسلامی افغانستان جلد 1422ء
- ❦ قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ 1999ء

پینتیسواں باب

گیارہ ستمبر، امریکا کی افغانستان پر یلغار

احمد شاہ مسعود کا قتل: ستمبر 2001ء کا مہینہ ایک گھمبیر خاموشی کے ساتھ شروع ہوا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ سکوت کی اس تہہ میں کتنا بڑا زلزلہ اگلڑا یاں لے رہا ہے۔ طالبان معمول کے مطابق ملکی امور انجام دے رہے تھے۔ شاید سب ہی آنے والے وقت سے بے خبر تھے۔ کچھ دنوں پہلے مشنری سرگرمیوں میں ملوث این جی اوز کے کئی مرد و خواتین کارکنوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ان کے قبضے سے 100 کے لگ بھگ سی ڈیز بھی برآمد ہوئی تھیں۔ طالبان کہہ رہے تھے کہ ان سی ڈیز میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کو تو بین آمیز انداز میں دکھایا گیا تھا اس لیے گرفتار شدگان پر تو بین عیسیٰ علیہ السلام کا مقدمہ بھی چلے گا۔ دنیا والوں کے لیے یہ خبر کوئی عجیب نہ تھی۔ طالبان کئی برس سے ایسے اقدامات کرتے آ رہے تھے۔ عجیب خبر تو وہ تھی جو 10 ستمبر کو سنی گئی۔ شمالی اتحاد کے سربراہ احمد شاہ مسعود کو دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل دو عرب مجاہد تھے جو صحافیوں کے بھیس میں احمد شاہ مسعود سے ملے تھے۔ انتہائی سخت تلاشی کے باوجود ان سے وہ بم برآمد نہ کیا جاسکا جو ویڈیو کیمرے میں نصب تھا۔ انٹرویو لیتے ہوئے انہوں نے کمرہ احمد شاہ مسعود کے چہرے کے بال مقابل لاکر بم دھماکا کر دیا۔ وادی پنجشیر کا وہ نامور کمانڈر جسے بڑی بڑی فوج زیر نہ کر سکی، دیکھتے ہی دیکھتے دو عربوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس خبر سے شمالی اتحاد کی صفوں میں جگمگ مچ گئی۔ احمد شاہ مسعود کے مقبوضات جو پنج شیر سے طالقان تک پھیلے ہوئے تھے، اب طالبان کے دم دم پر تھے۔ طالبان نے موقع غنیمت جان کر طالقان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ منگل 11 ستمبر 2001ء کی صبح طالبان طالقان کے دروازے پر تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے نین دن میں وہ افغانستان کے بقیہ 10 فیصد حصے پر بھی قبضہ کر لیں گے مگر.....

ورلڈ ٹریڈ سینٹر زمین بوس: اسی دن امریکا کے مقامی وقت کے مطابق صبح 8 بج کر 48 منٹ پر ایک مسافر طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے جنوبی ٹاور سے جا اٹھا۔ جس سے ہر طرف کھرام مچ گیا۔ اس افراتفری

کے عالم میں فوج کر تین منٹ پر ایک اور طیارہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے شمالی ٹاور میں گھس گیا۔ ہر طرف آگ اور دھواں کے بادل چھا گئے۔ یہ ایک سو دس منزلہ کوہ پیکر عمارت دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گئی۔ ہزاروں لوگ اس کی زد میں آ کر ہلاک اور زخمی ہو گئے۔

9 بج کر 38 منٹ پر ایک اور مسافر طیارہ امریکا کی وزارتِ دفاع کے مرکز پینٹاگون پر آن گرا جس سے 29 ایکڑ پر مشتمل ہیڈ کوارٹر کی 5 منزلیں بالکل تباہ ہو گئیں۔ یہاں زیادہ تر ہلاک ہونے والے فوجی افسران تھے۔

یہ امریکا کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا جس نے نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ایک ایسا دور جس میں ہر طرف ہلاکتیں، بربادیاں اور تباہیاں نظر آتی ہیں..... اور اس کا انجام تاحال نظروں سے اوجھل ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹاگون کی تباہی کے بعد پورے امریکا میں ہنگامی حالت نافذ کر دی گئی۔ تمام ہوائی اڈے بند کر دیے گئے۔ واٹس ہاؤس خالی کر لیا گیا۔ صدر بش دن بھر روپوش رہے۔ شام کو وہ منظر عام پر نمودار ہوئے اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے کسی ثبوت اور کسی تحقیق کے بغیر نہایت جذباتی انداز میں مسلمانوں کو اس حملے کا مجرم قرار دیا، اسامہ بن لادن کو ملین و تشفیج کا نشانہ بنایا، اپنے دشمنوں کے خلاف ہر سرحد سے ماوراء جنگ جھپٹرنے کا اعلان کیا اور اسے صلیبی جنگ کا نام دیا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ بش ہر قیمت پر جنگ جھپٹرنا چاہتا ہے۔ ستمبر کے بقیہ ایام ایک بڑی جنگ کی تیاری میں گزرے۔ اس دوران امریکا اپنے گرد زیادہ سے زیادہ اتحادی جمع کرتا رہا۔ صدر بش نے طالبان حکومت کو دھمکی دی کہ اسامہ بن لادن کو فوراً امریکا کے حوالے کر دیا جائے ورنہ افغانستان کو تیس تیس کر دیا جائے گا۔

پرویز مشرف کا کردار: ادھر پاکستان کے صدر پرویز مشرف نے امریکا کا ایک فون سن کر ہی اس کے اتحادی کے طور پر اس جنگ میں شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ افغان پالیسی پر یہ یوٹرن لیتے ہوئے انہوں نے اپنی کابینہ سے مشاورت کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ پرویز مشرف نے اس موقع پر امریکی ایجنٹ کا کردار ادا کرتے ہوئے ایک طرفہ طور پر طالبان حکومت پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ امریکا کا مطالبہ مان کر اسامہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ پرویز مشرف نے اپنی سوانح حیات میں تحریر کیا ہے کہ 11 ستمبر کے بعد طالبان اور افغانستان کے خلاف امریکا کے غیظ و غضب سے بچنے کا واحد راستہ یہ تھا کہ اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کو افغانستان سے نکال دیا جائے۔

حکومت پاکستان نے اس مقصد کے لیے اعلیٰ فوجی افسران اور مقتدر علما کرام کا ایک وفد بھی

قدحار روانہ کیا۔ یہ حکومت پاکستان کی جانب سے اسامہ بن لادن کے مسئلے پر ملا محمد عمر سے دوسری اعلیٰ سطحی بات چیت تھی۔ (پہلی بات چیت 1998ء میں شہزادہ ترکی الفیصل کی موجودگی میں ہوئی تھی)۔ چونکہ وفد میں پاکستان کے بڑے بڑے علماء شریک تھے اس لیے اُمید کی جاسکتی تھی کہ طالبان سربراہ کو اپنے رویے میں چلک لانے پر آمادہ کر لیا جائے گا۔ ملا محمد عمر وفد کے ارکان کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے اور آخر میں انہوں نے بڑے ٹھوس لہجے میں اعلان کیا کہ وہ اپنے مہمان اور مسلمان بھائی اسامہ بن لادن کو کسی قیمت پر دشمنوں کے حوالے نہیں کریں گے چاہے اس کے لیے انہیں اپنی حکومت اور اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔

طالبان کو تنہا چھوڑنے کا قطعی فیصلہ: اس وفد کی ناکام واپسی کے بعد حکومت پاکستان نے طالبان کو تنہا چھوڑ دینے کا قطعی فیصلہ کر لیا کیونکہ جو چیز ملا محمد عمر اور طالبان کے نزدیک غیرت، عزت اور حمیت تھی وہ پرویز مشرف کی دانست میں پاگل پن اور جنون تھا۔ ان دنوں پاکستانی قوم کو اس جنگ میں افغانستان سے لاطعلق رکھنے بلکہ امریکا کی صف میں شامل کرنے کے لیے حکومتی سطح پر میڈیا کا زبردست استعمال کیا گیا۔ ہر جگہ ”سب سے پہلے پاکستان“ کا نعرہ نمایاں کیا گیا اور اپنے قریب ترین مسلم ہمسایہ ملک کو معصیت کی سخت ترین گھڑی میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ 16 ستمبر تک یہ بات واضح ہو گئی کہ پرویز مشرف نے امریکی مطالبات کو من و عن قبول کر لیا ہے جن میں امریکی فوج کو افغانستان پر حملے کرنے کے لیے راہداری اور اڈے فراہم کرنا بھی شامل تھے۔ تب اسلام آباد میں طالبان کے سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے پہلی بار سخت زبان استعمال کرتے ہوئے کہا کہ ہم امریکا کو فوجی اڈے فراہم کرنے والے ملک پر حملہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ طالبان کو ان کی طرف سے بادی کے مہیب شعلے رقص کرتے نظر آ رہے تھے مگر ان حالات میں بھی ان کی استقامت میں فرق نہ آیا تھا۔

ملا محمد عمر کی جرات مندانہ بیانات: ملا محمد عمر نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی اور صدر ریش کے اعلان جنگ کے بعد کئی تاریخ ساز بیانات دیے تھے۔ اپنے پہلے بیان میں جو 14 ستمبر کو شائع ہوا، انہوں نے کہا:

”عالم کفر اسلامی نظام کو مٹانے کے لیے متحد ہو گیا ہے۔ افغان مجاہد اور عوام قربانیوں کے لیے تیار ہو جائیں۔ نمازوں میں قنوت نازلہ کا اہتمام کیا جائے۔“

22 ستمبر کو انہوں نے امریکا کو متنبہ کرتے ہوئے کہا:

”میرے یا اسامہ کے قتل سے امریکا بحران سے نہیں نکل سکتا۔ اگر وہ دہشت گردی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے تو اپنی افواج جزیہ عرب سے نکال لے، مسئلہ فلسطین پر جانبداری ترک کر دے اور

اسلامی قوانین میں مداخلت چھوڑ دے۔“

مگر اس خیر خواہانہ نصیحت کے جواب میں امریکا اپنے لائشکر کی تیاری میں جتا رہا۔ نہ صرف نیٹو کے 19 ممالک اس کے ساتھ تھے بلکہ پوری دنیا اس کے ہر کام میں تھی۔ یہ دن زبردست نفسیاتی جنگ کے تھے۔ ایک اعصاب شکن مرحلہ تھا جس سے دنیا دھڑکتے دل کے ساتھ گزر رہی تھی۔ کیا امریکا افغانستان پر حملہ کرے گا؟ کیا یہ محض دھمکیاں ہیں؟ اگر حملہ ہوا تو طالبان مداخلت کر پائیں گے؟ ہر شخص اس ادیبز بن میں غلطیاں تھا۔ تاہم ستمبر کے اواخر تک امریکا کی جنگی تیاریاں اس نہج پر پہنچ گئیں کہ حملے کا خطرہ صاف سامنے نظر آنے لگا۔ اس مرحلے پر طالبان سربراہ نے مقابلے کا چیلنج قبول کرتے ہوئے کہا: ”امریکا نے حملہ کیا تو گوریلا جنگ شروع کریں گے۔ امریکا کے آگے جھک کر اسلام کو بچا نہیں کریں گے۔“

صلیبی جنگ کا آغاز: آخر کار 7 اکتوبر 2001ء کو امریکا نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ یہ اتوار اور پیر کی درمیانی شب تھی۔ رات کے 9 بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے کہ افغانستان کے شہروں کا کابل، قندھار، جلال آباد، ہزار شریف اور ہرات پر کروڑ میزائل برسے گئے۔ اس پہلے حملے میں امریکا اور برطانیہ کی افواج شامل تھیں۔ بی باون، بی ٹی اور C-130 طیاروں نے کابل ایر پورٹ اور قندھار میں طالبان کے کمانڈ میں اور بجلی گھر پر بمباری کی۔

اس کارروائی کے ساتھ ہی امریکا میں صدر بش نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ مہم دہشت گردی کے خاتمے تک جاری رہے گی۔ برطانیہ کے علاوہ کینیڈا، آسٹریلیا، جرمنی اور فرانس اس کارروائی میں ہمارے ساتھ ہیں جبکہ 40 ممالک خفیہ معلومات اور دیگر حوالوں سے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہمارا مقصد دہشت گردوں کا نیٹ ورک تباہ کرنا ہے۔ دہشت گردوں کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے گا۔ یہ جنگ وسیع ہوگی اور جو حکومت بھی بے گناہ لوگوں کے قاتلوں کو پناہ دے گی اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ اس جنگ میں امریکا جتنے گناہ نام کام ہوگا اور نہ ہی کوئی غلطی کی جائے گی۔“

امریکا کے حملے کے ساتھ ہی پنج شیر میں محصور شمالی اتحاد کے جنگجو بھی منظم انداز میں حرکت میں آ گئے اور انہوں نے طالبان کے علاقوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

طالبان قیادت اور اسامہ محفوظ: امریکا کا سب سے بڑا ہدف اسامہ بن لادن اور طالبان قیادت تھی لیکن تین دن تک مسلسل حملوں کے باوجود امریکا یہ ہدف حاصل نہ کر سکا اور شہری آبادی اس کے حملوں کا نشانہ بنتی رہی۔

9 اکتوبر کو اسلام آباد میں طالبان کے سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے انکشاف کیا کہ ملا محمد عمر خیریت سے ہیں۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جس طرح افغان قوم نے روس کے خلاف جہاد میں 20 لاکھ جانوں کی قربانی دی تھی، اسی طرح ہم مزید 20 لاکھ جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

10 اکتوبر کو صبح 8 بجے سے رات 12 بجے تک..... مسلسل 16 گھنٹے..... قندھار پر ہولناک بمباری کی گئی۔ قندھار ہوائی اڈے، ملا محمد عمر کی رہائش گاہ اور عرب مجاہدین کے محلے کو نشانہ بنایا گیا۔ دن بھر قندھار دھوئیں کے بادلوں میں چھپا رہا۔ درجنوں شہری اس ہیوانہ کارروائی میں شہید ہو گئے۔ قندھار کے ہسپتال زخموں سے بھر گئے۔

11 اکتوبر کو جلال آباد کے نواحی گاؤں کڑم کو شدید بمباری کر کے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہاں کم از کم 200 افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔

چوں کہ بمباری کرتے وقت امریکا کے طیارے طالبان کی توپوں کی پہنچ سے بہت بلند پرواز کرتے تھے اس لیے طالبان انہیں نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ ان مصائب کے باوجود طالبان کے حوصلے بلند تھے اور ان کو دیکھ کر عوام بھی جذبہ جہاد سے معمور ہو رہے تھے۔ برطانوی اخبار ”گارڈین“ نے اس کیفیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ جنگ اسامہ نے پہلے ہی جیت لی ہے کیونکہ انہوں نے پوری دنیا کو کفر اور ایمان میں تقسیم کر دیا ہے۔

امریکا کا جارج ٹیوش، برطانیہ کا ٹونی بلیر، اٹلی کا برلوسکی، فرانس کا شیراک، روس کا پوٹن اور پاکستان کا جنرل پرویز مشرف تو پہلے ہی اس جنگ میں اسلام کے قلعے کو ڈھانے کے لیے پیش پیش تھے، مگر جنگ کے دو تین دن گزرنے پر تاجکستان کے صدر علی رحمانوف نے بھی امریکا کو اپنے ہوائی اڈے پیش کر دیے۔ ایران بھی امریکا کی مدد کر رہا تھا۔

افغان عوام کے جوش اور بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ وہ بموں کے گرتے ہی ان کے ٹکڑے جمع کرنے کے لیے لپکتے تھے۔ امریکی فوجیوں کے اسلحے اور لباس کے زرخ بھی ملے ہو گئے تھے۔ بازاروں میں امریکی فوجی کی ٹوپی 500 ڈالر، پینٹ شرٹ 1200 ڈالر، کمانڈو جیکٹ 1000 ڈالر، جوتے 500 ڈالر اور گھڑی 300 ڈالر میں بکنے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بمباری سے ہزاروں گھرانے تباہ ہو چکے تھے۔ متاثرین کی خاصی تعداد ہجرت کر کے پاکستان کی سرحد کی طرف آ رہی تھی مگر حکومت پاکستان نے سرحد بند کر دی تھی جس کی وجہ سے یہ بے خانماں افراد مزید مشکلات کا شکار ہو گئے تھے۔

پاکستان کا کردار: جنگ کے ان ابتدائی دنوں میں طالبان نے امریکا کو ایک بار پھر پیش کش کی کہ

اسامہ بن لادن پر افغانستان میں مقدمہ چلایا جاسکتا ہے، امریکا حملے بند کر کے مذاکرات کرے مگر امریکا طاقت کے نشے میں اندھا دور بہرا ہو چکا تھا۔ اس کے رد عمل میں 12 اکتوبر کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا بیان نشر ہوا کہ ہم امریکیوں سے انتقام لیں گے۔ انہوں نے ادا آئی سی کے بزدلانہ کردار اور 45 سے زائد مسلم ممالک کی اس جنگ میں افغان عوام کے خلاف شرکت پر انفسوس کا اظہار بھی کیا۔ سب سے عجیب کردار پاکستان کا تھا جو اس صلیبی جنگ میں امریکا کے فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ امریکی طیارے بحیرہ عرب میں کھڑے اپنے بحری بیڑے سے پرواز کرتے اور پاکستانی حدود سے گزر کر افغانستان پر بمباری کرتے تھے۔ جنگ کے آغاز ہی میں جیکب آباد کے شہباز ایریس پر امریکا کے سینکڑوں کمانڈوز، گمن شپ ملی کاپڑ، بی باؤن اور سی 130 طیارے اتر چکے تھے۔ حکومت پاکستان کئی دنوں تک غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے عوام کو یقین دلاتی رہی کہ ہماری سرزمین افغانستان پر حملوں کے لیے استعمال ہوئی ہے نہ آئندہ ہوگی۔ مگر 12 اکتوبر کے قومی اخبارات میں جیکب آباد میں 14 سو امریکی کمانڈوز کی آمد اور پسی میں مزید دستوں کے اترنے کی اطلاعات شائع ہو ہی گئیں۔

اتحاد کے عہدید بیان کو مضبوط کرنے کے لیے 16 اکتوبر کو امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے اسلام آباد آکر جنرل پرویز مشرف سے ملاقات کی۔ جنرل پرویز نے امریکی وزیر خارجہ کو یقین دلایا کہ پاکستان امریکا کو حساس معلومات اور لاجسٹک سپورٹ مہیا کرتا رہے گا اور پاکستان کی فضائی حدود امریکی طیاروں کے لیے کھلی رہیں گی۔ پاکستان کی اس وفاداری کے جواب میں امریکی حکومت نے 30 کروڑ ڈالر کا قرضہ فراہم کرنے، اس کے اتحادی جاپان نے اپنا 5 ارب ڈالر کا قرضہ معاف کرنے اور برطانیہ نے یورپ سے مراعات دلوانے کا امکان ظاہر کیا۔

پاکستانی عوام کا جذبہ: ان دنوں حکومت پاکستان اور عوام کے رویے میں کھلا تضاد نظر آتا تھا۔ عوام کی اکثریت افغانستان کے مسلمانوں سے گہری ہمدردی رکھتی تھی۔ انہوں نے مصیبت زدہ افغانوں کی مدد کے لیے دل کھول کر امداد فراہم کی۔ شہروں سے نقد رقم، غذائی اجناس اور دیگر اشیاء کے بڑے بڑے ذخائر افغانستان پہنچ رہے تھے جن سے ان مصیبت زدگان کی کسی قدر خشک شوقی ہو رہی تھی۔ صوبہ سرحد کے عوام اس مہم میں سب سے آگے تھے۔ صرف باجوڑ سے طالبان کے لیے 40 کلو سوٹا بھیجا گیا۔ عورتوں نے اپنے زیورات نکال کر ایثار و قربان کی یہ عظیم مثال پیش کی تھی۔

سرزمین پاکستان پر امریکی افواج کی موجودگی سے عوام خصوصاً دینی طبقہ اس قدر ناالاں تھا کہ بغاوت کی سی فضا پیدا ہونے لگی تھی۔ عوام یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ امریکی دہشت گردی میں ہم کیوں شامل کیے

بارہے جس 14 اکتوبر کو جمعیت علمائے اسلام کے کارکنوں نے احتجاجاً جیکب آباد ایریس کا گھیراؤ کر لیا اور یہ علاقہ میدان جنگ بن گیا۔ اس جھڑپ میں جمعیت علمائے اسلام کے چھ کارکن اور چار سرکاری اہلکار جاں بحق ہو گئے۔

کراچی میں لانگ مارچ: 26 اکتوبر کو کراچی میں افغانستان پر امریکی حملے کے خلاف عظیم الشان مارچ ہوا۔ ڈیڑھ لاکھ افراد نے ایم اے جناح روڈ پر احتجاج کر کے امریکا سے اپنی نفرت اور افغان بھائیوں سے دلی یگانگت کا ثبوت دیا۔ پاکستان کے نامور علماء اور مفتیان کرام نے امریکی حملے کو صلیبی جنگ قرار دیا۔ حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی کا یہ فتویٰ 15 اکتوبر کے ضربِ موسن میں شائع ہوا تھا کہ افغانستان پر صلیبی حملے کا دفاع فرض عین ہو چکا ہے۔ مفتی نظام الدین شامزئی نے بھی امریکا کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا اور ہزاروں افراد طالبان کے شانہ بشانہ امریکا کے خلاف لانے کے لیے سرحدوں کا رخ کر رہے تھے۔ دس دن تک افغانستان کے طول و عرض پر مسلسل بمباری کے بعد 17 اکتوبر کو امریکا نے پہلی بار اپنے کمانڈرز زمین پر اُتارنے کی کوشش کی مگر طالبان نے یہ کوشش ناکام بنا دی۔ قندھار کے نواح میں پہلی کا پٹرز کے ذریعے اُترنے والے کمانڈرز طالبان کے راکٹ لانچروں کی زد میں آکر پسپا ہو گئے۔ اسی دن طالبان سربراہ نے میزائلوں کی بارش کے دوران وائرلیس پر 31 موبیوں کے طالبان سے خطاب کر کے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔

ہتھیاروں کی جنگ کے ساتھ ساتھ طالبان کے خلاف زیر زمین سازشیں بھی جاری تھیں۔ درجنوں امریکی ایجنٹ ڈالروں کی بھاری کھپ کے ساتھ مزار شریف، قندھار اور کابل میں سرگرم ہو چکے تھے اور طالبان کے خلاف فضا ہموار کر کے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پختون علاقوں میں طالبان کے خلاف سازش کا سرغنہ ایک سابق مجاہد کمانڈر عبدالحق تھا۔ وہ معروف کمانڈر حاجی عبدالقدیر کا بھائی تھا اور ایک مدت سے پاکستان کے افغان پناہ گزین کیپسوں میں طالبان مخالف جنگجوؤں کو جمع کرنے کا کام کر رہا تھا۔ صدر بش کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس کا رابطہ وائٹ ہاؤس سے ہوا۔ بش انتظامیہ کے اعلیٰ اہلکاروں نے 2001ء کے موسمِ گرما میں عبدالحق کی ملاقات احمد شاہ مسعود سے کرائی اور طے پایا کہ اگست میں عبدالحق جنوبی افغانستان کے پختون کمانڈروں کو مجتمع کر کے طالبان کے خلاف بڑے پیمانے پر بغاوت کرائے گا اور ادھر شمال سے احمد شاہ مسعود یلغار کر دے گا۔ مگر اس بغاوت کی تیاری میں تاخیر ہوتی چلی گئی اور 11 ستمبر کے واقعے کے بعد امریکا خود افغانستان پر حملہ آور ہو گیا۔

اس دوران عبدالحق بغاوت کے لیے تیاری مکمل کر چکا تھا، تاہم طالبان کے جاسوس بروقت اس تک

پہنچ گئے۔ عبدالحق اپنے 8 سرکردہ ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گیا۔ اسے بچانے کے لیے امریکی ہیلی کاپٹروں نے حملہ کیا مگر طالبان نے انہیں پسپا کر دیا۔ مجلس شورٰی کے علماء کے فتوے کے مطابق 26 اکتوبر کو عبدالحق اور اس کے 8 ساتھیوں کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ دانشکون نامنظر نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ طالبان نے جاسوسی کا مضبوط جال پھیلایا ہوا ہے جس کے باعث کسی بھی اجنبی کا ان میں داخل ہونا بے حد مشکل ہے۔

مہلک اور ممنوع ہموں کا استعمال: جنگ کے تیسرے مہینے میں امریکا نے طالبان اور افغان عوام کے خلاف بین الاقوامی طور پر ممنوع انتہائی مہلک کلسٹر ہموں کا استعمال شروع کر دیا۔ ایک کلسٹر بم میں 202 تباہ کن بم ہوتے ہیں جو بھی تک تباہی پھیلاتے ہیں۔ ہیومن رائٹس واچ نے کلسٹر ہموں کے استعمال پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس سے افغان شہریوں کو شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں لہذا ان کا استعمال بند کیا جائے۔ عالم اسلام میں یہ تشویش بھی پھیل چکی تھی کہ امریکا اب کامل، قدحدار اور مزار شریف پر ایٹمی حملہ کر دے گا۔ یہ خبریں بھی ملی تھیں کہ امریکا نے نیوٹرون بم وسط ایشیا میں منکوا لیے ہیں۔ امریکی طیارے طالبان کو پہاڑی پناہ گاہوں اور غاروں سے نکالنے کے لیے یورینیم کے ممنوعہ کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کر رہے تھے۔ ماہرین ماحولیات نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ کیمیائی بمباری سے افغان سرزمین بخر ہو جائے گی۔ انہی دنوں اسامہ بن لادن نے امریکا کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ کیمیائی یا ایٹمی حملے کا جواب اسی انداز میں دیا جائے گا۔

شاہراہ ریشم بند: ادھر پاکستان میں سرحد اور ہزارہ کے عوام نے افغانستان کے خلاف پاکستان کی سرزمین کے مسلسل استعمال سے مشتعل ہو کر شاہراہ ریشم بند کر دی تھی۔ وہ چلاس اور تانگیر پرتابش ہو کر مقامی انتقامیہ کو بے دخل کر چکے تھے۔ حکومت پاکستان نے یہ صورت حال دیکھ کر وہاں فوج بھیج دی۔ فوج اور قبائل کو ککراؤ سے بچانے کے لیے پاکستان کے اکابر علماء بیچ میں آ گئے۔ 30 اکتوبر کو شاہراہ ریشم کھول دی گئی اور یوں ایک خونریز تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا۔

نومبر کے آغاز کے ساتھ افغانستان کے کوہ و دامن میں شمال کی برف خیز ہوا میں بل کھانے لگیں، موسم کی یہ شدت جنگ کی گرمی پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ طالبان اب بھی اپنی زمین کے ایک ایک انچ کی حفاظت کر رہے تھے۔ امریکا کے ہیلی کاپٹر تباہ ہو رہے تھے، مکائد و زور اور جاسوس جگہ جگہ پکڑے جا رہے تھے۔ طالبان کے دعوے کے مطابق اب تک 100 امریکی فوجی ہلاک کیے جا چکے تھے۔ جن سے اسپین بولدک میں داخل ہونے والے ایک امریکی جاسوس میجر مظہر الہوب کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔

برطانوی صحافی خاتون ایوان ریڈلی بھی پکڑی گئی تھیں۔

3 نومبر کو طالبان دو ہیلی کاپٹروں کے علاوہ ایک طیارہ گرانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ ایک ہیلی کاپٹر سے جیک آباد کے نقشے برآمد ہوئے جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ حملے جیک آباد سے ہو رہے ہیں۔ امریکی طیارے اب بھی نہایت بلندی سے بمباری کر رہے تھے۔ امریکی وزارت دفاع اعتراف کر چکی تھی کہ ہم زمینی جنگ نہیں سکے البتہ شمالی اتحاد یہ ہم انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ اب امریکا کی حکمت عملی یہ تھی کہ قندھار یا کابل کو فتح کرنے کے بجائے پہلے شمال میں طالبان کے مورچوں کو تھس نہس کیا جائے اور شمالی اتحاد کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا جائے۔ اس طرح مزار شریف اور قندوز سے طالبان کا منایا کرنے کے بعد کابل اور قندھار کا رخ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اب امریکا نے کھسٹربوں کے علاوہ آگ کا آتش فشاں بھڑکانے والے نیام بم اور پہاڑوں کو مٹی بنادینے والے جموٹے ایٹم بم (ایزی کٹر بم) بھی استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ایسے بم بھی پھینکے جا رہے تھے جو فضا سے آسمان ختم کر کے جانداروں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ قندھار کے طالبان کو رکمانڈر ملا اختر عثمانی کے بیان کے مطابق امریکی طیارے ایسے بم استعمال کر رہے تھے جن کے پھٹنے کے بعد مجاہدین کے کان، ناک اور منہ سے خون جاری ہو جاتا تھا اور وہ تڑپ تڑپ کر شہید ہو جاتے تھے۔ غرضیکہ ایٹم بم کے سوا امریکا نے ہر طرح کا ممنوع اسلحہ طالبان کے خلاف جھونک ڈالا۔

اس کے علاوہ امریکی ڈاروں کا سیلاب طالبان کے حامی پختون کمانڈروں کی وفاداریوں کو بہائے لے جا رہا تھا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ بغلان میں شبیر سالانگی اور شاہراہ سالانگ کے دیگر نقاط پر کئی دوسرے کمانڈروں نے بغاوت کر کے کابل سے مزار شریف کی مرکزی ہوائی لائن مسدود کر دی۔ اس کے ساتھ ساتھ شمال میں طالبان کے سب سے بڑی فوجی مورچے "تخار" کاکابل سے زمینی رابطہ دشوار تر ہو گیا۔ قندوز کے طالبان تقریباً محصور ہو گئے کیونکہ ان دونوں چھاؤنیوں کے لیے طالبان کی سپلائی لائن بغلان سے گزرتی تھی۔ غرض اس طرح کابل یا قندھار سے تخار قندوز اور مزار شریف تک کٹک پہنچنا ممکن نہ رہا اور شمال میں طالبان محاصرے کی کیفیت میں آنے لگے۔

برکمر ریڈلی کی مگوایی: طالبان کے خلاف یہ کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے امریکا اور اس کے اتحادیوں نے کس کس طرح لوگوں کو خرید لیا ہوگا اور کس حد تک گھناؤنی اور ناپاک سازشیں کی ہوں گی، شاید ہم اس کا تصور نہ کر سکیں۔ البتہ ایک حد تک اندازہ لگانے کے لیے ہمیں برطانوی خاتون صحافی ایوان ریڈلی کی سرگزشت پڑھنی چاہیے۔

ریڈی 11 ستمبر کے واقعے کے کچھ دنوں بعد افغانستان کے حالات معلوم کرنے کے لیے ویزے کے بغیر سرحد عبور کر گئی تھیں۔ طالبان نے شک کی بنا پر انہیں گرفتار کر لیا اور چند دنوں تک نہایت عزت و احترام کے ساتھ حراست میں رکھا۔ اس واقعے سے برطانوی حکومت نے ایک مذموم مقصد حاصل کرنا چاہا۔ برطانیہ کے خفیہ اداروں نے کوشش کی کہ طالبان کو ریڈی کے یہودی جاسوس ہونے کا یقین دلادیا جائے تاکہ وہ اسے قتل کر دیں اور اتحادیوں کو دنیا میں یہ بات پھیلانے کا موقع مل جائے کہ طالبان صحافیوں کو بھی قتل کر رہے ہیں۔ چنانچہ طالبان کو ایسے جعلی ثبوت کئی ذرائع سے مہیا کیے گئے جن سے ریڈی کا یہودی جاسوس ہونا ثابت ہوتا تھا۔ مگر طالبان مشتعل ہوئے بغیر ریڈی سے تفتیش کرتے رہے اور جلد ہی سمجھ گئے کہ ریڈی بے گناہ ہے۔ اپنی ایمانی فراست کی بدولت انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ انہیں ریڈی کے قتل پر اکسانے کی سازش ہو رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ریڈی کو آزاد کر دیا اور وہ باعزت طور پر برطانیہ واپس آ گئی۔

طالبان کے حسن سلوک نے اسے اسلام اور قرآن مجید کے مطالعے کی طرف راغب کیا اور ایک سال تک حق کی تلاش میں غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اسلام قبول کر کے اپنا نام ”مریم“ رکھ لیا۔ اسلام قبول کرنے سے کئی ماہ قبل ریڈی نے اپنی کتاب ”طالبان کی قیدی“ تحریر کی تھی جس میں ایک طرف طالبان کے حسن سلوک، دلیری اور اصول پسندی کی تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ طالبان کو ان کے خلاف جعلی ثبوت فراہم کرنے والے خود برطانوی اور اتحادی اہلکار تھے جو استعماری منصوبوں کی تکمیل کے لیے اپنے معزز اور بے گناہ شہری کو موت کی بھیٹ چڑھانے سے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کر رہے تھے۔ مریم ریڈی کی یہ گواہی اس جنگ میں حق و باطل کا واضح فیصلہ کر دیتی ہے۔

مزار شریف سے انخلا: 7 نومبر 2001ء تک طالبان مزار شریف پر امریکا اور شمالی اتحاد کے شدید ترین حملوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے، مگر یہاں غداروں کی کئی نہیں تھی۔ مقامی کمانڈروں کے جاسوس طالبان میں کھل مل گئے تھے۔ وہ طالبان کے مورچوں اور خفیہ پناہ گاہوں کا کھوج لگا کر اپنے کمانڈروں کو بتاتے جو سیٹلائٹ فون پر امریکی افسران کو یہ معلومات مہیا کرتے۔ ان درست معلومات کے مطابق 8 نومبر کو امریکا نے مزار شریف کے گرد طالبان کے مورچوں پر 15، 15 ہزار پونڈ کے ڈیزل بم گرانے شروع کیے جس سے طالبان کا زبردست جانی نقصان ہونے لگا۔

طالبان کو یہ اطلاعات بھی ملی تھیں کہ کابل اور مزار شریف کے درمیانی شاہراہیں مقامی کمانڈروں کی بغاوت کے باعث مسدود ہو چکی ہیں۔ خود قندھار کے گرد اسپین بولڈک اور دیگر علاقوں میں بغاوت کی

نیاریاں زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ ایسے میں طالبان کا شمال میں ٹھہر کر مزاحمت کرنا بے سود تھا۔ انہوں نے قندھار میں اپنی اعلیٰ قیادت سے دائر لہیں پر رابطہ کیا اور ملا محمد عمر کے حکم کے مطابق جمعہ 22 شعبان، 9 نومبر 2001 کو یکدم مزار شریف خالی کر دیا۔

وہ رات کی تاریکی میں مزار شریف سے نکلے، پسپائی اس تیزی سے ہوئی تھی کہ بہت سے طالبان شہر میں سو رہ گئے جن کی اکثریت کا تعلق پاکستان سے تھا۔ شمالی اتحاد کے جنگجو فاتحانہ کردار کے ساتھ مزار شریف میں داخل ہوئے۔ رشید دوستم اور کمانڈر عطا ان کی قیادت کر رہے تھے۔ وہ پیچھے رہ جانے والے طالبان کو بڑی بے رحمی سے قتل کرنے لگے۔

پاکستانیوں کا قتل عام: شمالی اتحاد کے 6 ہزار مسلح افراد نے مزار شریف میں جگہ جگہ پوزیشنیں سنبھال لیں۔ چار سال بعد شہر کی فضاؤں میں موسیقی کی تانیں گونجتی سنائی دیں۔ پس منظر میں ان زخمیوں کی چیخ و پکار بھی تھی جنہیں شمالی اتحاد کے جنگجو اذیتیں دے دے کر قتل کر رہے تھے۔ پاکستان مردہ باد کے نعرے بھی سنائی دے رہے تھے۔

سلطانہ رضیہ اسکول میں 700 سے زائد پاکستانی مجاہدین نے پناہ لے رکھی تھی۔ شمالی اتحاد کی فاتح فوج نے پہلے امریکی طیاروں کے ذریعے اسکول پر اندھا دھند بمباری کروائی اور اس کے بعد زخمی جنگ میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے اسکول کو گھیر لیا۔ اندر محصور درجنوں افراد شہید ہو چکے تھے، بیسیوں زخمی تھے۔ بھوک پیاس سے سب بے حال تھے۔ ان میں سے سو کے قریب افراد نے جان کی امان کے وعدے پر ہتھیار ڈال دیے اور گرفتاری دینے کے لیے عمارت سے باہر نکلے، مگر شمالی اتحاد کے سو ماؤں نے یکدم فائر کھول کر ان کی اکثریت کو شہید کر دیا۔ ان میں سے کچھ ارد گرد کے خالی مکانات اور گلیوں کی طرف بھاگ نکلے، مگر حملہ آوروں نے ان کا تعاقب کیا اور جن جن کو مار ڈالا۔ سلطانہ رضیہ اسکول کے ارد گرد کی گلیوں اور مکانات سے ریڈ کر اس کے عملے کو ایسے 80 پاکستانیوں کی لاشیں ملیں۔ اس صورت حال میں باقی محصور پاکستانیوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ شمالی اتحاد کے جنگجو جب ان پر قابو نہ پاسکے تو پیر 12 نومبر کی سہ پہر کو اسکول کے گرد بیٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دی۔

رات بھر اسکول الاؤ بن رہا۔ اگلے دن جب شمال کے فوجی اسکول میں داخل ہوئے تو انہیں 400 جلی ہوئی لاشیں ملیں جن پر انہوں نے اپنی فتح کا جشن منایا۔ ان لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ برہنہ کر کے ان کی تصاویر اتاری گئیں۔ جب یہ تصاویر میڈیا پر آئیں تو ہر درد مند پاکستانی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

ملا محمد عمر نے مزار شریف کے سقوط کے بعد ریڈیو صدائے شریعت سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا

کے فتح حق کی ہوگی، اسلامی نظام کے دفاع کے لیے ہم سب کچھ قربان کر دیں گے۔

بامیان سے پسپائی: مزار شریف میں طالبان کی شکست کے اثرات دور دور تک پڑے۔ سرکان میں طالبان درہ صوف سے شمالی اتحاد کے حملوں اور امریکی بمباری کی زد میں تھے۔ ان کے قدم بھی اکھڑنے لگے۔ ادھر کامل سے بامیان کی سپلائی لائن کے راستے پر طالبان کے حامی کمانڈر ملار بانی نے بھی مزار شریف پر شمالی اتحاد کے قبضے کی اطلاع ملتے ہی بغاوت کر دی۔ اس طرح طالبان کی وہ واحد سپلائی لائن جو اب تک محفوظ تھی، ہاتھ سے نکل گئی۔ حزب وحدت کے جنگجوؤں نے یہ خبر سنتے ہی ایرانی اسلحے کے بل بوتے پر بامیان کو زبردست حملوں کا نشانہ بنالیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ طالبان کو بامیان خالی کر کے پسپا ہونا پڑا۔

قدوز شمالی افغانستان کے ان اکا دکا علاقوں میں سے ایک ہے جہاں کے لوگ بلا کے دلیر اور مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ یہ صوبہ شمالی افغانستان میں طالبان کا سب سے مضبوط مرکز شمار ہوتا تھا۔ یہاں کی آبادی دل و جان سے طالبان کے ساتھ تھی۔ امریکا سے جنگ کے ان ہولناک دنوں میں قدوز میں طالبان کی باقاعدہ فوج بہت کم تھی۔ زیادہ تر طالبان مزار شریف اور تخار میں تھے۔ اس کے باوجود قدوز میں ان کا کنٹرول بہت مضبوط تھا۔ آبادی کی حمایت حاصل ہونے کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں یہاں القاعدہ سے وابستہ مجاہدین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ قدوز کا دفاع عملاً انہی کے ہاتھ میں تھا۔ یہ مجاہدین کئی روز سے قدوز پر حملوں کا بھرپور دفاع کر رہے تھے۔

القاعدہ مجاہدین کا قدوز سے انخلا: اسامہ بن لادن کے ایک قریبی ساتھی ابو مصعب نے جو قدوز کی اس جنگ میں شریک تھے، میڈیا پر کئی ماہ بعد یہ حیرت انگیز انکشاف کر کے تہلکہ مچا دیا کہ قدوز کی جنگ کی قیادت خود اسامہ بن لادن کر رہے تھے۔ امریکی افواج انہیں قذحار اور کامل میں تلاش کر رہی تھیں جبکہ قدوز ایرپورٹ پر کھلے آسمان تلے اپنا کوارٹر بنا کر ”محمد واد اللہ“ کے فرضی نام سے مجاہدین کی کمان کر رہے تھے اور وائرلیس پر انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

کئی دن کی جنگ کے بعد القاعدہ کے ان مجاہدین کے پاس اسلحے کے ذخائر کم پڑنے لگے۔ زخموں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جمعرات 8 نومبر کو جب انہیں اطلاع ملی کہ طالبان سربراہ نے طالبان کو مزار شریف سے انخلا کا حکم دے دیا ہے اور اب طالبان ایک طویل المیاد گوریلا جنگ شروع کرنے کے لیے جنوب کو مرکز بنا کر وہاں سمنے کی حکمت عملی اپنانے لگے ہیں تو قدوز کے القاعدہ مجاہدین نے بھی مقامی طالبان کمانڈروں سے مشورے کے بعد فوری طور پر انخلا کا فیصلہ کر لیا۔ اب تک شمالی اتحاد نے قدوز کا محاصرہ مکمل نہیں کیا تھا۔ کئی راستے کھلے ہوئے تھے۔ ویسے بھی شمالی اتحاد اور امریکیوں کی توجہ شاہراہوں پر تھی جبکہ القاعدہ کے سپاہی

کابل تک کے کئی خفیہ راستوں سے واقف تھے۔ مشکل یہ تھی کہ خاصے مجاہدین زخمی اور بیمار تھے۔ وہ یہیں مورچہ بند ہو کر لڑنا چاہتے تھے تاکہ سفر کی صعوبت سے محفوظ رہیں۔ ان کی تعداد 600 تھی۔ ان میں سے 210 پاکستانی، 90 ازبک، 13 عرب اور 107 افغان تھے۔ انہیں یقین تھا وہ خاصے دنوں تک دشمن کو الجھائے رکھیں گے اور پھر محاصرہ توڑ کر کابل یا قندھار پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ ان 6 سو مجاہدین کو قندوز میں چھوڑ کر القاعدہ کی بقیہ فوج کوئی غیر معروف راستوں سے ہو کر قندوز سے کابل کی طرف روانہ ہو گئی۔

ابو مصعب کے دعوے کے مطابق اس قافلے کی سب سے پہلی گاڑی کے پیچھے شیخ اسامہ بن لادن کی گاڑی تھی۔ اس قافلے کے شرکاء کی تعداد 1460 تھی۔ ان میں 400 افغان اور پاکستانی مجاہدین تھے جبکہ اکثریت عربوں اور ازبکوں کی تھی۔ یہ قافلہ تین دن تک مسلسل سفر میں رہا۔ راستے میں اکا دکا جہزبوں اور بارودی سرنگوں کے پھٹنے کے واقعات میں ان کے 6 افراد شہید ہوئے جبکہ باقی سب بحفاظت قندھار کے نواح میں طالبان کے خفیہ ہیڈ کوارٹر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ القاعدہ فورسز کے بحفاظت انخلا کا یہ واقعہ نہایت حیرت انگیز ہے کیونکہ ان دنوں امریکی طیاروں نے زمین پر طالبان اور مجاہدین کی نقل و حرکت ناممکن بنا رکھی تھی۔ گائیڈڈ میزائل آنا فانا گاڑیوں کے قاتلوں کو تباہ کر دیتے تھے۔ اس لیے اگر یہ واقعہ سچ ہے تو اسے ایک کرامت ہی کہا جاسکتا ہے۔

طالبان سے ازبک مجاہدوں کا انخلا: سخار اور طالبان میں بھی طالبان کے حفاظتی حصار ایک ایک کر کے ٹوٹتے جا رہے تھے۔ دشمن کا دباؤ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ یہاں طالبان کے ساتھ IMU (اسلاک موومنٹ آف ازبکستان) کے کئی ہزار نہایت لڑاکا جانا بھی تھے۔ اگر طالبان فتح کی طرف گامزن ہوتے تو فرخا، شیخ شیر اور بدخشاں کے ساتھ ساتھ ازبکستان کے سرحدی علاقے بھی ان کی زد میں آتے اور ازبک مجاہدین طالبان کی مدد سے سرحد عبور کر کے تاجکستان اور ازبکستان کے ایک بڑے رقبے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے، مگر اب حالات خلاف تصور حد تک بگڑ گئے تھے۔ طالبان گھیرے میں آتے جا رہے تھے۔ خطرہ یہ تھا کہ شمالی اتحاد فتح پانے کے بعد ازبک مجاہدین کے ساتھ سب سے زیادہ سخت سلوک کرے گا کیوں کہ شمالی اتحاد کے کمانڈر ازبک مجاہدین سے سخت متنفر تھے اور موقع ملنے پر ان سے ہولناک انتقام لینے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔ اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے طالبان سربراہ ملامحمد عمر نے ان ازبک مجاہدین کو فوری انخلا کا حکم دے دیا جس کے بعد یہ مجاہدین تاول درہ کے راستے طالبان سے ازبکستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ طالبان انہیں آخر تک خصوصی کور فراہم کرتے رہے۔ ان کی بحفاظت پہنائی کے بعد باقی طالبان بھی طالبان سے قندوز کی طرف روانگی کی تیاری کرنے لگے کیونکہ ان کے سب

سے بڑے مورچے "دڑہ بنگی" سے تشریف ناک خبریں آ رہی تھیں اور مزار شریف بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ مزار شریف اور تخار کے طالبان بھی قندوز میں: مزار شریف سے پسپا ہونے والے طالبان کی تعداد 2600 تھی۔ ان میں سے 86 افراد راستے میں امریکی بمباری کی زد میں آ کر شہید ہو گئے، جبکہ بقیہ 2240 بحفاظت قریبی صوبے قندوز پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں 713 پاکستانی، عرب اور ازبک مجاہدین تھے۔ باقی افغان طالبان تھے۔ مئی 1997ء کے سانحہ مزار شریف کے بعد بھی قندوز مفروز طالبان کی پناہ گاہ بننا تھا۔ اب طالبان ایک بار پھر اسے مورچہ بنانے پر مجبور تھے مگر اب حالات پہلے کی نسبت زیادہ سنگین تھے۔

ادھر قندوز کے مشرق میں تخار کے اہم ترین مورچے دڑہ بنگی میں بھی طالبان امریکی طیاروں کی اندھا دھند بمباری اور شمالی اتحاد کے شدید حملوں کا سامنا کر رہے تھے اور اب ان کی مزاحمت کا دم ٹوٹ رہا تھا۔ ہفتہ 10 نومبر کو دڑہ بنگی پر بڑی کڑی کڑیوں کی بارش کے بعد طالبان کے درجنوں افراد شہید اور کئی مورچے تہ و بالا ہو گئے۔ طالبان مجبوراً دڑہ بنگی کو خالی کر کے پیچھے ہٹنے لگے۔ شمالی اتحاد کا کمانڈر داؤد خان ان کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ پسپائی انہیں قندوز تک لے آئی۔ اس طرح مزار شریف، تخار اور طالقان کے محاذوں پر پہلے ہوئے تمام طالبان قندوز میں محصور ہونے پر مجبور ہو گئے۔ شمالی اتحاد نے آناٹا طالبان کے چھوڑے ہوئے تمام علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اب قندوز کے مشرق میں طالقان، مغرب میں مزار شریف اور جنوب میں سالانگ شاہراہ پر اس کا قبضہ تھا۔ قندوز میں جمع ہونے والے لگ بھگ پندرہ ہزار طالبان کے لیے جن میں 5 ہزار افراد غیر افغان تھے، راہ فرار مسدود ہو گئی تھی۔ ان میں آخر دم تک لڑنے کی قسمیں کھانے والے وہ بیمار اور مجروح مجاہدین بھی تھے، جو القاعدہ فورسز کے ساتھ انخلاء سے رہ گئے تھے۔ ان میں جذبہ جہاد سے معمور پاکستانی بھی تھے اور ہزاروں میل کا سفر کر کے کفر و ایمان کے معرکوں میں کودنے والے چین بھی۔ طالبان کے نائب وزیر دفاع کمانڈر ملافعل اب ان سب کی قیادت کر رہے تھے۔

شمالی اتحاد کا ٹل کی ولیمز پر: مزار شریف اور تخار پر قبضے اور شمال کے طالبان کو ملک کے دیگر حصوں سے منقطع کرنے کے بعد شمالی اتحاد کا لشکر بے اماں دندناتا ہوا کابل کی طرف بڑھنے لگا۔ پیر 12 نومبر 2001ء (25 شعبان 1421ھ) سہ پہر کے وقت اس نے کابل سے 28 میل شمال میں اپنے مورچوں سے کابل کی طرف پیش قدمی شروع کی تو اسے کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ طالبان کے مورچوں پر امریکی طیاروں کی اندھا دھند بمباری نے ان کا راستہ بڑی حد تک صاف کر دیا تھا۔ شام شمالی اتحاد کا لشکر قرہ باغ پہنچ چکا تھا۔

کابل میں تعینات 8 ہزار طالبان کو جوئی قرہ باغ پر شمالی اتحاد کے قبضے کی خبر ملی، انہوں نے کابل خالی کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ حکم ان کی اعلیٰ قیادت نے دیا تھا جو قندھار یا اس کے آس پاس تھی تاکہ طالبان کی قوت بھی محفوظ رہے اور کابل کے شہری بھی جنگ کے شعلوں سے مداموں رہیں، دیگر طالبان کابل میں مزید کئی ہفتے مزاحمت کر سکتے تھے کیونکہ قندھار تک تمام صوبوں میں ان کی حمایت کا عنصر غالب تھا۔ کابل بھی ہاتھ سے نکل گیا: پیر اور منگل کی درمیان شب طالبان کابل خالی کرتے رہے۔ بجلی کا نظام تباہ ہونے کی وجہ سے شہر مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ فضا میں ایک مہیب سناٹا تھا جسے امریکی کنشپ بلی کاپڑوں کی گڑگڑاہٹ توڑ دیتی تھی۔ یہ بلی کاپڑرات بھر بجلی پر دوا کر کے طالبان کے متوقع مورچوں پر راکٹ داغنے رہے۔

طالبان کی بڑی تعداد سینکڑوں گاڑیوں پر سوار ہو کر میدان شہر، گردیز، لوگر اور غزنی کی طرف نکل گئی۔ جبکہ عرب مجاہدین کی بڑی تعداد صوبہ ننگر ہار کے مرکز جلال آباد اور تورابوڑا کے پہاڑوں کی طرف چلی گئی جہاں غاروں میں القاعدہ کا محفوظ کیپ تھا۔ طالبان نے شہر خالی کرتے وقت توپیں، ٹینک اور بھاری ہتھیار وہیں چھوڑ دیے تھے۔ کابل میں افغان حکومت کا خزانہ جو کئی ٹن سونے پر مشتمل تھا، جوں کا توں رہنے دیا گیا۔ حالانکہ طالبان چاہتے تو اسے آسانی سے ہمراہ لے جاسکتے تھے۔

شمالی اتحاد کے کابل میں مظالم: منگل کی صبح طلوع آفتاب کے ساتھ شمالی اتحاد کے جنگجو کابل کے سامنے پہنچ گئے۔ ان کی قیادت جنرل گل حیدر کر رہا تھا۔ اپنے مغربی سرپرستوں کے کہنے پر وہ کئی گھنٹے وہاں رکا رہا۔ اتنے میں کمانڈر بم اللہ خان ایک اور فوج کے ساتھ آن پہنچا۔ مغربی صحافی بھی بڑی تعداد میں آگئے۔ اب دوبارہ پیش قدمی شروع ہوئی۔ انہیں راستے میں کئی جگہ زخمی طالبان اور پاکستانی مجاہد بڑے نظر آئے جو زخموں کی شدت کی وجہ سے فرار نہیں ہو سکے تھے۔ شمالی اتحاد کے فوجی بے دریغ انہیں گولیوں سے چھلکی کرتے چلے گئے۔ کئی زخموں کے گہرے زخموں میں تنکینیں بھونک کر انہیں شدید اذیت کے ساتھ قتل کیا گیا۔ ہفت روزہ ٹائم نے طالبان کے ایک مجاہد کی شہادت کی بڑی دردناک تصویر شائع کی جو کابل جانے والی سڑک کے کنارے نہایت شدید زخمی حالت میں ایک کھائی میں چمپا ہوا تھا۔ شمالی اتحاد کے سپاہی جب وہاں سے گزرے تو اسے دیکھ کر طیش سے بھر گئے۔ وہ اسے گھسیٹے ہوئے سڑک پر لائے اور لاتوں سے اس قدر روندنا کہ اس کی شناخت مشکل ہو گئی۔ پھر ایک سپاہی نے اس کے کپڑے اتار کر اسے برہنہ کر دیا۔ دوسرے نے اس پر گولیوں کی بارش کر دی۔ پھر سب نے اس کی لاش پر خوشی کے نعرے لگائے اور رقص کیا۔

کابل کی سڑکوں پر ایسے واقعات کئی جگہ پیش آئے۔ درجنوں طالبان اسی طرح بے دردی سے شہید کیے گئے۔ اگلے دو تین دنوں تک ان کی سخی شدہ لاشوں کی تصاویر پاکستان سمیت دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوتی رہیں۔ زبردستی ڈاڑھیاں موڑنے اور برقعے اتارنے کے واقعات بھی پیش آئے۔ ہر شخص یہ دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ اب افغانستان پر وہ سرکش طاقتیں قابض ہو چکی ہیں جن کے پاس انسانیت نامی کوئی شے نہیں۔

درندگی کا برہنہ رقص: شمالی اتحاد کے کابل پر قبضے کے ساتھ ہی وہ امن وامان رخصت ہو گیا جو طالبان دور میں یہاں نظر آتا تھا۔ لیروں اور ڈاکوؤں کی چاندی ہو گئی۔ وہ جگہ جگہ لوٹ مار کرنے لگے۔ کوئی انہیں روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ طالبان کے حامی عام شہریوں کو بڑی تعداد میں قتل کیا جا رہا تھا۔ مزار شریف کی طرح کابل میں بھی شمالی اتحاد کے ہاتھ لگنے والے کئی پاکستانی اور عرب مجاہد ایسے تھے جو بے خبری میں پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ رات کو حسب معمول سوئے، صبح بیدار ہوئے تو طالبان جا چکے تھے۔ ایسے تین عرب اور تین پاکستانی مجاہد کابل میں علی الصبح سڑک پر گھومتے ہوئے شمالی اتحاد کے زرنے میں آ گئے۔ خود کو گولیوں کی زد میں دیکھ انہوں نے پوزیشن سنبھال لی۔ کچھ دیر مقابلہ کرنے کے بعد آخراں میں ان سے تین شہید ہو گئے۔ تین سخت زخمی حالت میں گرفتار ہو گئے۔ شمالی اتحاد کے ایک عالم نے خیر نکال کر ان میں سے ایک کی آنکھوں میں گھونپ ڈیا اور آنکھیں باہر نکال کر اپنے اہلیسی کارنامے پر قہقہہ لگایا۔ پھر ان تینوں زخموں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔

شمالی اتحاد کے یہ مظالم دیکھ کر ایک امریکی صحافی یہ تحریر کرنے پر مجبور ہو گیا:

”شمالی اتحاد نے صابرہ اور شتیلا کی یاد تازہ کر دی جہاں لبنان کے عیسائیوں نے فلسطینی پناہ

گزیںوں کا قتل عام کیا تھا۔“ (روزنامہ جنگ: 15 نومبر 2001ء)

ستوطہ کابل کا یہ دلگداز واقعہ منگل 13 نومبر 2001ء (26 شعبان 1421ھ) کی صبح پیش آیا۔ یہ

تاریخ افغانستان کا ایک حسرت ناک دن تھا جس میں غیر ملکی طاقتیں مقامی باشندوں کی مدد سے ایک بار پھر افغانستان کے مرکز پر قابض ہو گئیں۔

طالبان کی حکمت عملی: طالبان نے اپنی اکثر افرادی قوت کو کابل سے بحفاظت نکال کر مشرقی اور جنوبی صوبوں میں محفوظ کر لیا تھا۔ طالبان کی اعلیٰ قیادت نے کابل سے اپنی افواج کے انخلاء کے وقت تمام شہروں کو چھوڑ دینے اور حکومتی ذمہ داریوں سے دستبردار ہو کر پہاڑوں اور جنگلوں میں ایک طویل گوریلا جنگ کے لیے خود کو منظم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دراصل اب صوبوں اور شہروں پر قبضے کی بات

تاؤی درجے میں چلی گئی تھی۔ اصل اہمیت اپنی طاقت کو محفوظ رکھنے کی تھی۔ شہروں کا نظم و نسق سنبھالنے ہوئے ایسا ممکن نہیں تھا۔ اگر دیکھا جائے تو اس وقت تک افغانستان کا نصف سے زائد حصہ طالبان کے پاس ہی تھا۔ خصوصاً مشرقی اور جنوبی علاقوں پر ان کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ غزنی، گردیز، جلال آباد، پکتیکا، خوست وغیرہ میں طالبان مزید کئی ماہ تک آسانی سے امریکی حملوں کا مقابلہ کر سکتے تھے کیونکہ یہاں شمالی اتحاد کا کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا، مگر طالبان نے فوری طور پر تمام شہروں کی حکومت چھوڑ کر امریکا اور اس کے افغان اتحادیوں کو سیاست بازی میں الجھا دیا۔ امریکا نے شمالی اتحاد کو پابند کیا تھا کہ وہ کابل میں اس وقت تک داخل نہیں ہوگا جب تک ایک عبوری حکومت تشکیل نہ دے دی جائے مگر شمالی اتحاد اسے نظر انداز کر کے بڑی ہٹ دھرمی کے ساتھ کابل میں گھس گیا اس طرح امریکا اور شمالی اتحاد کا باہمی اعتماد شروع ہی میں متزلزل ہونے لگا۔

طالبان نے دوسرا کام یہ کیا کہ کابل سے نکل کر وہ کہیں نہر کے بلکہ زیادہ تر صوبوں کا انتظام پرانے مجاہدین یا اچھی شہرت کے غیر طالبان کمانڈروں کے حوالے کرتے چلے گئے۔ انہوں نے جلال آباد سمیت تین مشرقی صوبوں کے مستقبل کا فیصلہ نامور مجاہد کمانڈر مولانا محمد یونس خالص کے ہاتھ میں دے دیا جنہوں نے طالبان کے حامی اور مخالف طبقات کے درمیان ایک قابل قبول شخصیت مولوی معلم کو جلال آباد کا حاکم بنادیا۔ خوست کا انتظام علماء کی ایک مجلس شورائی کے تحت مولانا عبداللہ علم شرعی کے حوالے کر دیا گیا۔ گردیز اور لوگر کمانڈر عبدالرحمن حقانی کے اور وردگ مقامی شورائی کے سپرد کر دیے گئے۔ غزنی کمانڈر خیال محمد کے ماتحت کر دیا گیا۔

یہ نئے صوبے دار طالبان میں سے نہیں تھے مگر شمالی اتحاد سے ان کی دوستی بھی نہیں تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ یہ کمانڈر اپنے علاقوں کو شمالی اتحاد کے قبضے میں نہیں جانے دیں گے۔ اس طرح طالبان نے افغانستان میں کسی نئے حکومتی سیٹ اپ کے وجود میں آنے تک شمالی اتحاد کی ریشہ دوانیوں سے یکسو ہو کر خود کو منظم کرنے اور ایک نئی طویل گوریلا جنگ کی منصوبہ بندی کرنے کی مہلت حاصل کر لی تھی۔ اب وہ جنوب میں جمع ہو رہے تھے۔ صرف قندھار اور گردو نواح کے تین صوبے ارزگان، زابل اور ہلمند اب تک ان کے قبضے میں تھے، مگر عنقریب وہ یہاں کی حکومت بھی دوسروں کے سپرد کر کے خود منظر عام سے غائب ہونے والے تھے۔

جلال آباد طالبان کے بعد: طالبان دور میں جلال آباد کے بازار رات گئے تک کھلے رہتے تھے، مگر اب سرشام یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ 13 نومبر سے 17 نومبر تک شہر کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ 80 سالہ مولوی محمد یونس خالص اور ان کے نائب مولوی معلم سخت آزمائش میں پڑ گئے تھے۔ 17 نومبر کو

ایک مشہور کمانڈر حضرت علی اپنے گروہ کو لے کر شہر میں گھس گیا اور ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر جلال آباد کا سابق گورنر حاجی عبدالقدیر بھی اپنے مسلح افراد کے ساتھ جلال آباد میں داخل ہو گیا اور دونوں گروہوں کے درمیان سخت تناؤ کی کیفیت میں حکومت سازی کی گفتگو شروع ہوئی۔

پاکستان سے جلال آباد جانے والے صحافیوں کے مطابق جلال آباد کے عوام سخت خوف و ہراس کی کیفیت میں تھے۔ انہیں طالبان سے کچھ نئی پابندیوں کے سوا کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بر ملا طالبان کی تعریف کر رہے تھے مگر موجودہ گروہ بندی سے ان کی زندگیاں داؤ پر لگ رہی تھیں۔ جلال آباد کے گورنر ہاؤس میں نئی حکومت تشکیل دینے کے لیے مشاورت جاری تھی۔ نئی حکومت کو اپنی حمایت کا یقین دلانے والوں میں جلال آباد کے سکھ باشندوں کا وفد بھی شامل تھا۔ ان کے قائد گور لکھ سنگھ نے اپنے بیان میں کہا کہ طالبان خدا پرست اور بھلے لوگ تھے۔ ان کی وجہ سے سکھوں کو کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ چند دنوں بعد حضرت علی اور حاجی عبدالقدیر نے مشترکہ طور پر جلال آباد کا انتظام سنبھال لیا۔

ان دنوں جلال آباد کے قریب واقع تورابوڑا کے پہاڑوں میں عرب مجاہدین کی موجودگی کے باعث اسامہ بن لادن کے وہاں پناہ لینے کا شک ظاہر کیا جا رہا تھا۔ حضرت علی اور حاجی عبدالقدیر نے اپنی پہلی پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ وہ بہت جلد تورابوڑا میں چھپے ہوئے اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی شروع کریں گے۔

تورابوڑا کا محاذ: کوہ تورابوڑا مشرقی افغانستان سے صوبہ ننگر ہار کے ضلع ”سرخروڈ“ میں واقع ہے جو جلال آباد سے 56 کلومیٹر دور ہے۔ 1982ء میں حزب اسلامی کے کمانڈر زاہد ابراہیمی نے یہاں مورچے بنائے تھے۔ حکمت یار اور مولانا یونس خالص کے مجاہدین یہاں سے روسی افواج پر حملے کیا کرتے تھے۔ پھر عرب مجاہدین نے ان غاروں، سرنگوں اور زمین دوز مورچوں کو اپنا مسکن بنالیا۔ یہاں تعمیراتی کام حیرت انگیز تھا۔ خفیہ مورچوں، بتکروں اور اسلحے کے ڈپوؤں کے علاوہ یہاں چار مساجد اور آٹھ ہاسٹل (سمہان خانے) بھی تھے۔ یہی نہیں بلکہ سالہا سال تک غذائی خود کفالت کے لیے بڑی کھیت بھی تھے اور پولٹری فارم بھی۔ اسپین غر کے پہاڑی چشموں پر لگائے گئے جزیئر اس کپیکس کو بجلی فراہم کرتے تھے۔ اسامہ بن لادن 1996ء میں افغانستان آئے تو اپنے اہل و عیال سمیت پہلے یہیں رہائش پذیر ہوئے۔ اس کے بعد بھی ان کا یہاں آنا جانا رہا۔ اس لیے امریکا اور شمالی اتحاد کو شک تھا کہ اسامہ بن لادن وہیں روپوش ہیں۔ چنانچہ کابل اور جلال آباد پر قبضے کے کچھ دنوں بعد شمالی اتحاد نے امریکی طیاروں کی مدد سے ماہ رمضان کے آغاز میں تورابوڑا پر حملے شروع کر دیے۔

تقریباً ایک ماہ تک امریکی طیاروں نے یہاں کارپٹ بمباری کی۔ اس وقت یہاں کم از کم تین ہزار عرب، چیچن، پاکستانی اور یورپی مجاہدین مورچہ بند تھے۔ وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ شمالی اتحاد کا ہر زمینی حملہ ناکام ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجاہدین خفیہ راستوں سے آہستہ آہستہ دوسرے علاقوں کی طرف نکلنے لگے۔

مزار شریف اور کامل سے طالبان کی پسپائی کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی بلکہ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ آخر طالبان نے ایک ماہ سے زائد مدت تک اتنی بڑی قوت کا بھرپور مقابلہ کس طرح کیا؟ امریکا نے ساری دنیا کو ان کے خلاف جمع کر لیا تھا۔ 23 ممالک نے اپنے ہزاروں فوجی امریکا کی کمان میں دیے تھے۔ 55 ممالک نے دامے درمے سنے امریکا کی حمایت کی تھی۔ 76 ممالک امریکی طیاروں کی لینڈنگ اور لاجسٹک سپورٹ فراہم کر رہے تھے۔ 89 ممالک نے اپنی فضاؤں کو امریکا کے اختیار میں دے کر امریکی طیاروں کو گزرنے کی اجازت دی تھی۔ کوئی ایک ملک بھی طالبان کے ساتھ نہیں تھا۔ کسی میں اخلاقی حمایت تک کی جرأت نہیں تھی۔ ایسے میں طالبان کا مقابلے کا ارادہ کر لیتا ہی بڑی بات تھی چہ جائیکہ انہوں نے چار ہفتوں سے زائد مدت تک امریکیوں کے ناپاک قدم اپنی سرزمین پر نہ لگنے دیے۔

قندوز میں 15 ہزار طالبان محصور: کامل کے سقوط کے بعد عملاً طالبان کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ اب تک جنہیں یقین تھا کہ امریکا طالبان حکومت کو ختم نہیں کر پائے گا اور دو تین ماہ تک ناکام فضائی حملے کرنے کے بعد ذلیل و خوار ہو کر لوٹ جائے گا وہ محو حیرت تھے کہ یہ کیا ہو گیا؟ طالبان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنی اس افرادی قوت کو بچانا تھا جو قندوز میں محصور تھی اور ایک بار پھر سانحہ مزار شریف جیسے حالات کا سامنا کر رہی تھی۔ اقوام متحدہ اس عظیم انسانی المیے سے جان بوجھ کر لاطعلق بن رہی تھی۔ طالبان کمانڈر ملا داد اللہ اپنی ہائی کمان کی اجازت ملنے پر اقوام متحدہ سے جان کے تحفظ کی یقین دہانی کی شرط پر ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کئی بار کر چکے تھے مگر اقوام متحدہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جب حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ سے محصورین کی مدد کی درخواست کی تو اقوام متحدہ نے صاف کہہ دیا کہ یہ لڑائی شمالی اتحاد اور طالبان کے درمیان ہو رہی ہے۔ اس لیے اقوام متحدہ اس میں فریق نہیں بن سکتی۔ اقوام متحدہ کی مسلم دشمنی کا یہ ایک اور بڑا ثبوت تھا۔

17 نومبر کو ماہ رمضان کا آغاز ہو گیا۔ قندوز میں محصور دس ہزار طالبان اور پانچ ہزار کے لگ بھگ غیر ملکی مجاہدین چاروں طرف سے شمالی اتحاد کے حملوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ وہ دن کو روزے رکھتے اور رات کو تراویح و تہجد پڑھتے تھے۔ افطار کے وقت شہر میں مکمل تاریکی کا راج ہوتا تھا۔ امریکی طیاروں کی

بمباری کے خوف سے کوئی سحری کی تیاری کے لیے بھی چولہا جلانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ طالبان کے نائب وزیر دفاع ملا فضل اخوند، سپہ سالار ملا نور اللہ نوری اور نامور کمانڈر ملا داد اللہ کی موجودگی سے مجاہدین کی ہمت برقرار تھی، مگر سب جانتے تھے کہ وہ بہت زیادہ وقت تک نہیں لڑ سکتے اور ان کا یہاں سے بچ نکلنا کوئی معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ طالبان کے قائدین اب دشمن سے مذاکرات کے بارے میں سوچ رہے تھے کیونکہ کامل کے سقوط کے بعد اب زمینی اور فضائی دونوں راستے بند ہو چکے تھے۔

قلعہ جنگی اور کمانڈر ٹمٹس الحق ناصر: ادھر مزار شریف کے شمال میں واقع قلعہ جنگی ایک نئی کہانی کا موضوع بنے جا رہا تھا۔ یہ قلعہ 1885ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا رقبہ تقریباً نصف کلومیٹر ہے۔ یہ آس پاس کی ریگستانی زمین سے تقریباً 60 فٹ بلند ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ ان دنوں یہاں شمالی اتحاد کے ایک بڑے کمانڈر ٹمٹس الحق ناصر کے گھوڑوں کا اصطبل تھا۔

کمانڈر ٹمٹس الحق ناصر 11 ستمبر سے پہلے میں امریکیوں کے آلہ کار کے طور پر طالبان حکومت کے خلاف بغاوتیں برپا کرنے کے لیے سرگرم تھا۔ پھر امریکی حملے کے بعد جب شمال کے کمانڈروں میں سے عبدالرشید دوستم کو تین لاکھ ڈالروں کا امریکی انعام ملا تو اس میں سے 50 ہزار ڈالر ٹمٹس الحق کے حصے میں آئے۔ اس کی دی ہوئی معلومات سے فائدہ اٹھا کر امریکی طیارے مزار شریف میں طالبان کے مورچوں کو تباہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

اب جبکہ شمال کے بچے کچے تمام طالبان قندوز میں جمع ہو چکے تھے ٹمٹس الحق ناصر کی توجہ بھی قندوز پر مرکوز ہو گئی۔ رشید دوستم نے بھی اس پر زور دیا کہ وہ قندوز کو جلد از جلد طالبان سے آزاد کرانے۔ ٹمٹس الحق جانتا تھا کہ مزار شریف کے برعکس قندوز سے طالبان کو کٹانا زیادہ مشکل ہے کیونکہ شمال کا یہ صوبہ مکمل طور پر طالبان کا حامی تھا۔ ٹمٹس الحق نے مذاکرات کے ذریعے قندوز پر قبضہ کرنے کے بارے میں غور کیا اور آخر کار ایک مقامی کمانڈر امیر جان کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کمانڈر امیر جان پہلے طالبان کا حامی تھا، مگر اب وہ امریکی ڈالروں کے عوض شمالی اتحاد کی صف میں کھڑا ہو گیا تھا۔ ٹمٹس الحق کی ہدایات کے مطابق کمانڈر امیر جان نے قندوز میں طالبان کے قائد ملا فضل سے ملاقات کی اور مذاکرات کی دعوت دی۔ ملا فضل نے وائٹریس کے ذریعے طالبان کی اعلیٰ قیادت سے مذاکرات کی اجازت حاصل کر لی۔ ویسے بھی اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔

چند دنوں کے وقفے کے بعد ملا فضل اور جنرل دوستم نے مذاکرات کے لیے باہمی ملاقات کی۔ اس نشست میں کمانڈر عطاء، کمانڈر محقق اور ایک امریکی آفیسر شامل تھے۔ دوستم کی پیش کش تھی کہ اگر

طالبان قندوز سے نکل جائیں تو وہ انہیں غیر شرط طور پر ہرات تک راہداری کی سہولت مہیا کرے گا جہاں سے ان کے لیے قندھار پہنچنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔ ملا فضل نے اس پیش کش کو پسند کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ غیر ملکی مجاہدین کو بھی طالبان کے ساتھ اس معاہدے میں شامل کیا جائے، مگر دوست نے دو ٹوک لہجے میں کہا: ”غیر ملکی مجاہدین کو ہم امریکا کے حوالے کریں گے۔“

ملا فضل نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور مذاکرات کا عمل رک گیا۔ تاہم دوست نے اپنے مشیروں سے الگ بات چیت کرنے کے بعد یکدم اعلان کیا کہ غیر ملکی مجاہدین بھی طالبان کے ساتھ جاسکتے ہیں۔ یوں باہمی معاہدہ طے پا گیا اور انخلا کے لیے تاریخ طے ہو گئی۔ ملا فضل نے واپس آ کر طالبان کو یہ خوش خبری سنائی۔ یہ معاہدہ جمعہ 23 نومبر بمطابق 8 رمضان کو ہوا تھا۔

ایک ہزار غیر ملکی مجاہدین کی الگ راہ: دوستم کا پہلے غیر ملکی مجاہدین کو معاہدے میں شامل کرنے سے انکار کرنا اور بعد میں بمشکل اس پر رضامند ہو جانا بہت سے لوگوں کے لیے شک و شبہ کا باعث تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ 23، 24 نومبر کی درمیانی شب ایک ہزار غیر ملکی مجاہدین نے اپنا راستہ الگ کر لیا اور چپکے سے قندوز سے نکل کر کسی انجانی منزل کی طرف چل پڑے۔ ملا فضل انہیں سمجھانے کے لیے ان کے پیچھے دوڑے۔ ان میں سے چار سو افراد تو لوٹ آئے باقی 600 نے اپنا سفر جاری رکھا۔ ان کا رخ ہرات کی طرف تھا۔ ملا فضل نے کمانڈر امیر جان کو اس صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ مجاہدین بہر حال معاہدے میں شامل ہیں، بس انہوں نے انخلا میں جلدی کی ہے، لہذا دوستم کو کہا جائے کہ انہیں ہرات تک راہداری دی جائے اور ان کا راستہ نہ روکا جائے۔ ملا فضل کو ڈر تھا کہ کہیں انجانے میں یہ مجاہدین دوستم یا امریکا کی افواج کے سامنے نہ آجائیں اور جنگ شروع نہ ہو جائے۔

چھ سو مجاہدین سے بدعہدی اور گرفتاری: ملا فضل کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ چھ سو مجاہدین کے اس قافلے کو امریکی و برطانوی افواج اور شمالی اتحاد کے جنگجوؤں نے قندوز اور مزار شریف کے درمیان روک لیا۔ انہیں راہداری کی سہولت مہیا کرنے کی بجائے ان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اسلحہ جمع کر کے گرفتاری دے دیں۔ مجاہدین بڑی مشکل سے اس پر آمادہ ہوئے مگر ان کی پہلی شرط یہ تھی کہ ان پر امریکی افسران مسلط نہ کیے جائیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ وہ اپنا اسلحہ کمانڈر امیر جان کے پاس ہی جمع کرائیں گے کیونکہ اس نازک صورت حال میں وہ امیر جان کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اُمید تھی کہ وہ ساتھ تعلقات کا لحاظ کر کے انہیں ہرات تک پہنچا دے گا۔ انہیں گھبرنے والے کمانڈروں نے اس کا وعدہ کر لیا، مگر عین وقت پر دوستم کے جنگجوؤں نے وعدے کی خلاف ورزی کی اور خود مجاہدین

سے اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ ان کی تلاشی لے کر جیسیں تک خالی کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر کئی مجاہد سمجھ گئے کہ ان سے کیا کیا معاہدہ پورا نہیں ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے چپکے چپکے کئی ہتھول اور دقتی بم اپنے پاس چھپا کر رکھ لیے۔ تلاشی کے اس عمل کے دوران رات ہو گئی۔ دشمنوں نے مشورہ کر کے مجاہدین کے اس قافلے کو قلعہ جنگلی روانہ کر دیا۔ دو ستم کوڈر تھا کہ اگر انہیں کھلا چھوڑا گیا تو وہ رات کی تاریکی میں مار دھاڑ کرتے ہوئے فرار ہو سکتے ہیں۔ قلعہ جنگلی میں مجاہدین کو اس طرح ٹھہرایا گیا کہ عملاً ان میں اور قیدیوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ جزل دو ستم کا کمانڈر نادر علی اور حزب وحدت کا کمانڈر اسد اللہ سرور ان سے اسلحہ جمع کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ مجاہدین پر واضح ہو چکا تھا کہ ان کو راستہ نہیں دیا جائے گا بلکہ اسلحہ چھین کر ان کا قتل عام کیا جائے گا۔

177 مجاہدین صحرا میں جاں بحق: ابھی تلاشی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ تلاشی دینے والے ایک مجاہد نے دقتی بم سے دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور قلعے کے مالک شمس الحق کے دو جنگجو اس کی زد میں آکر مارے گئے۔ جوبانی فائرنگ میں مجاہد بھی شہید ہو گیا۔ اب تلاشی کا عمل صبح پر ملتوی کر دیا گیا۔ یہ رات مجاہدین نے قلعے کے تہ خانے میں گزاری۔ اب وہ 600 نہیں 423 تھے۔ ان میں سے 177 مجاہدین کو اب تک قلعے میں نہیں پہنچایا گیا تھا۔ دراصل انہیں صحرا سے قلعے کی طرف لایا جا رہا تھا کہ قلعے میں ہونے والے اس دھماکے کی خبر ہر طرف مشہور ہو گئی، چنانچہ دشمن نے طیش میں آکر ان 177 مجاہدین کو کنٹینرز میں بند کر کے صحرا میں چھوڑ دیا اور وہ وہیں بھوک پیاس اور ذم کشی کے باعث شہید ہو گئے۔

25 نومبر (9 رمضان) کی صبح قیدیوں کی تلاشی اور تفتیش کا عمل دوبارہ شروع ہوا۔ قیدیوں میں امریکا کا ایک نو مسلم نوجوان عبدالحمید (جان واکر) بھی شامل تھا۔ وہ سان فرانسسکو کا رہنے والا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اسے امریکی انفران ”مانک“ اور ”ڈیپ“ کے سامنے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا گیا۔ دونوں اس سے سوال جواب کرنے لگے مگر انہیں بالکل اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کسی امریکی مسلمان سے مخاطب ہیں۔ اس وقت دن کے 11 بج چکے تھے۔ قلعہ جنگلی کا نگران جزل فوزی، ریڈ کر اس کے نمائندے سیمن بروکس سے مل کر قیدیوں کے مستقبل کے بارے میں بریفنگ دینے والا تھا کہ چابک قلعے کے جنوبی حصے سے فائرنگ کی آوازیں آنے لگیں اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

خونریز معرکے کا آغاز: اس کارروائی کی ابتداء خانے میں موجود عرب مجاہدین نے کی تھی۔ انہوں نے تہ خانے کی نگرانی پر تعینات پہرے داروں کو دقتی بم پھینک کر راستے سے ہٹایا تھا اور پھر بھاگتے ہوئے سپاہیوں سے اسلحہ چھین کر قلعے کے جنوبی حصے پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ جلد ہی وہ قلعے کے اسلحہ ڈپو پر بھی

چابض ہو گئے۔ اس ہنگامے کی ابتداء میں تفتیشی افسر مانک، عرب مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا تھا جبکہ جوانی قازمگ میں عبدالحمید (جان واکر) کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو گئی تھی۔ بہر کیف! ایک خوزیز مہر کے کے بعد مجاہدین نے شمالی اتحاد کے سپاہیوں کو قلعے سے پسپا کر دیا اور ظہر کے وقت وہ قلعے کے مرکزی دروازے تک پہنچ گئے۔ اس صورت حال میں امریکی ایئرشل فورسز کے افسران وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی فوج سے رابطہ کر کے فضا سے کھینچا اور قلعے کے جنوبی حصے پر شدید بمباری کی تاکیدی کی، مگر طیاروں کی بمباری سے مجاہدین کو کوئی نقصان نہ پہنچا بلکہ طیارے غلط اہداف کو نشانہ بناتے رہے جس کی زد میں آ کر تین امریکی اور برطانوی کمانڈوز ہلاک اور بیس زخمی ہو گئے۔

آخر طیاروں سے بمباری کا سلسلہ روک کر گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے حملے شروع کیے گئے۔ مجاہدین ہلکے اسلحے کے ذریعے دو دن تک بھرپور مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اسلحے کے ڈپو سے زیادہ مدد نہ لے سکے کیونکہ گن شپ ہیلی کاپٹر جلد ہی اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ امریکی فورسز کے ساتھ ساتھ شمالی اتحاد کے ٹینک بھی قلعے کی دیواروں پر گولے داغ رہے تھے۔ دو روز تک جاری یہ گولہ باری اتنی شدید تھی کہ قلعے کی اکثر دیواریں لمبے کا ڈھیر بن گئیں۔ بدھ 28 نومبر (12 رمضان) کی صبح تک اکثر مجاہدین شہید ہو چکے تھے جبکہ باقی ماندہ زخمی حالت میں تہ خانے میں چھپ گئے تھے۔

اب امریکی ایئرشل فورسز فاتحانہ انداز میں قلعے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے تہ خانے کے دھانے پر آگ لگا دی۔ دھوئیں اور تپش سے گھبرا کر کئی مجاہدین زخمی حالت میں باہر نکل آئے جن میں عبدالحمید بھی شامل تھا۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا، مگر کچھ جانباز اب بھی تہ خانے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ امریکی کسی قیمت پر اندر داخل ہونے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ جمعے کے دن انہوں نے تہ خانے میں پانی چھوڑ دیا۔ شمالی افغانستان میں نومبر کی راتیں بہت سرد ہوتی ہیں، اس لیے خستہ پانی مجاہدین کے جسموں کو شل کیے دے رہا تھا مگر وہ رات بھر اسی پانی میں کھڑے رہے اور از خود گرفتاری نہیں دی۔ آخر ہفتہ یکم دسمبر (15 رمضان) کی صبح جب دشمن کے سپاہیوں نے اندر داخل ہو کر انہیں گرفتار کر لیا تو وہ اس قدر نحیف ہو چکے تھے کہ ان میں پلٹے پھرنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ مجموعی طور پر قلعہ جنگی کے چھ سو مجاہدین میں سے 240 شہید اور 83 گرفتار ہوئے تھے جبکہ 177 کو قلعے میں پہنچانے کی بجائے راستے ہی میں زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔

ہزاروں طالبان قیدی بن گئے: اس دوران 26 نومبر (10 رمضان) کو معاہدے کے مطابق قندوز کے قبیہ ساڑھے چودہ ہزار طالبان کا صوبے سے اخلا شروع ہو گیا تھا۔ انہیں قندوز اور مزار شریف کے درمیان صحرائیں جمع کیا جا رہا تھا۔ سامنے دوستی کی فوجیں تھیں اور فضا میں امریکی طیارے مسلسل پرواز

کر رہے تھے۔ یہاں طالبان کے لیے کہیں چھپنے یا مورچے بنانے کا موقع بھی نہیں تھا۔ دوسم نہیں یقین دلا رہا تھا کہ انہیں بھگالت ہرات پہنچا دیا جائے گا، مگر اس کی نیت میں فتور تھا۔ طالبان کمانڈر ملا داد اللہ یہ خطرہ محسوس ہوتے ہی معاہدے میں شمولیت سے برأت ظاہر کرتے ہوئے رات کی تاریکی میں چپکے سے ایک طرف نکل گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ طالبان کے اور بھی کئی گروپ جن میں سینکڑوں افراد شامل تھے، صحرائیں جمع ہونے سے پہلے اپنے طور پر مختلف راہوں پر نکل گئے تھے۔ ان میں سے کچھ قافلے راستے میں شمالی اتحاد اور حزب وحدت کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ کئی امریکی طیاروں اور کینیڈا میزائلوں کا نشانہ بن گئے۔ 17 گاڑیوں کا ایک قافلہ تو بالکل قلعہ دار کے قریب پہنچ کر امریکی بمباری کا شکار ہوا۔ اس کے باوجود کئی خوش قسمت قافلے خیریت سے قلعہ دار پہنچ گئے۔ نامور کمانڈر ملا داد اللہ بھی ایک ہفتے کے مسلسل سفر کے بعد 4 دسمبر (17 رمضان) کو صحیح سلامت قلعہ دار پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

صحرائیں رہ جانے والے بقیہ طالبان کے ساتھ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ دوسم نے بدترین بدعہدی کا ارتکاب کیا۔ اس نے امریکی فوج کے ساتھ مل کر صحرائیں جمع ہونے والے طالبان کا محاصرہ کر لیا اور اسلحہ جمع کرنے کے بعد انہیں قیدی بنالیا۔ ملا فضل، ملا نور اللہ نوری، ملا شہزادہ اور کئی بڑے طالبان کمانڈر بھی گرفتار شدگان میں شامل تھے۔ میڈیا پر ان قیدیوں کی تعداد آٹھ ہزار بتائی جاتی رہی ہے مگر صحیح تعداد 13 ہزار سے زائد تھی۔ ان میں افغان، پاکستانی، عرب، ازبک، چیچن اور دوسرے ملکوں کے مجاہدین بھی تھے۔

طالبان قیدیوں پر بدترین مظالم: یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ 13 ہزار طالبان قیدیوں نے جان کی امان اور راہداری فراہم کرنے کی یقین دہانی پر ہتھیار ڈالے تھے مگر ان کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس کا تصور کر کے ہی روح کا نپ اٹھتی ہے۔ ان پر امریکی افواج اور شمالی اتحاد کے جنگجوؤں نے جو مظالم کیے، ان کا تذکرہ کرنے کے لیے سینکڑوں صفحات درکار ہیں۔ تاہم ان کی ایک بلکی سی جھلک پیش کی جا رہی ہے تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ دنیا سے دہشت گردی کے خاتمے اور قیام امن و امان کے نام پر شروع کی جانے والی اس جنگ کی حقیقت کیا تھی اور اس کے علمبرداروں کے ہاتھ خود انسانیت کے خون سے کس قدر آلودہ ہیں؟

کینیڈیوں سے شپکتا خون: جن 13 ہزار مجاہدین نے امریکی اور شمالی اتحاد کے افواج کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے، ان میں سے 4400 افراد کو الگ کر کے ہوابد کینیڈیوں میں سوار کر دیا گیا۔ ایسے ایک کینیڈین میں بمشکل ساٹھ ستر افراد کی گنجائش ہوتی ہے، مگر ایک ایک کینیڈین میں دو دو، تین تین سوطا طالبان کو بری طرح ٹھونس دیا گیا اور چودہ کینیڈیوں پر مشتمل یہ قافلہ شہر خان کی طرف روانہ ہوا۔ اگرچہ سخت سردی

کا موسم تھا مگر کنٹینروں میں بند طالبان ہوا کا گزر نہ ہونے کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو گئے۔ پیاس سے ان کی بری حالت ہو گئی۔ دم گھٹنے کی وجہ سے ہر کنٹینر میں کئی کئی طالبان تڑپ تڑپ کر راضی عدم ہو گئے۔ درجنوں افراد سانس بحال نہ رہنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ مظلوم قیدی کنٹینروں کی آہنی دیواروں سے سر ٹکرانے لگے اور پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے لگے کہ انہیں سانس نہیں آ رہا، ہوا کا راستہ دیا جائے۔ فتح کے نشے میں پجور ایک امریکی کمانڈر کو قیدیوں کی تکلیف کا علم ہوا تو فائرنگ کر کے کنٹینروں کی دیوار میں سوراخ بنانے کا حکم دیا۔ فائرنگ سے کنٹینروں میں بند درجنوں طالبان شدید زخمی اور کئی جاں بحق ہو گئے۔ راستے میں مقامی لوگوں اور دوسری گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کنٹینروں سے طالبان کا خون ٹپک ٹپک کر سڑک پر ایک سرخ لکیر بناتا جا رہا ہے۔ جب یہ قافلہ شبرغان پہنچا تو ڈیڑھ سو سے زائد طالبان زخموں اور گھٹن کی وجہ سے اندر ہی دم توڑ چکے تھے۔

صحرا کی قبر: شبرغان پہنچتے ہی امریکی کمانڈر نے حکم دیا کہ ان تمام قیدیوں کو ”دشتِ لیلیٰ“ میں لے جا کر دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ قافلہ ایک بار پھر روانہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے امریکیوں نے پہلے ہی طالبان کے قتل عام اور انہیں دفن کر کے اپنا جرم دنیا کی نظروں سے چھپانے کی تیاری کر رکھی تھی۔ کیونکہ آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد جب یہ ٹرک صحرا میں پہنچے تو وہاں چار چار ایکڑ وسیع اور پانچ پانچ فٹ گہری اجتماعی قبریں پہلے سے تیار تھیں۔ جب قیدیوں کو ٹرکوں سے اُتارا گیا تو ان میں سے بہت سے پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔ اکثر زندہ تھے مگر ان کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ امریکی فوج کا ایک مسلح دستہ آگے بڑھا اور ا قیدیوں کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔ اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کے سر پر گولی داغی گئی تاکہ اس کی موت یقینی ہو جائے۔ پھر ان تڑپتے پھڑکتے چار ہزار چار سو جسموں کو فوری طور پر اجتماعی قبروں میں پھینک کر اوپر بھاری مشینری کی مدد سے مٹی ڈال دی گئی۔ یہ وہ سفاکانہ سلوک تھا جس کا دنیا کے کئی قانون اور کسی تہذیب میں جواز نہیں مل سکتا۔ عالمی قوانین کے علاوہ خود امریکی قانون کے تحت بھی یہ سلوک سنگین جنگی جرائم کے زمرے میں آتا ہے۔

مغربی میڈیا کا اعتراف: تین سے ساڑھے چار ہزار تک طالبان قیدیوں کے اس اجتماعی قتل اور صحرا میں تدفین کے اعد و ہتاکہ واقعے کو خود مغربی صحافیوں نے طشت از با م کیا ہے۔ آئر لینڈ کے ایک صحافی جمی ڈوران نے 12 جون 2003ء کو جرمنی کی پارلیمنٹ میں اس جنگی جرم کے ٹھوس ثبوتوں پر مشتمل ایک ویڈیو فلم پیش کی۔ اس فلم میں مزار شریف اور شبرغان کے قریب دریافت ہونے والی دو ایسی اجتماعی قبریں دکھائی گئی ہیں جن میں ہزاروں طالبان دفن کیے گئے تھے۔ پی ایچ آر (نیشن فار ہیومن

رائس) کے مطابق انہیں دسمبر 2001ء میں دفن کیا گیا تھا اور فردی 2002ء میں یہ قبریں دریافت ہوئیں۔ ویڈیو فلم میں قبروں سے انسانی باقیات ابھرتے واضح دکھائی دے رہی ہیں۔ صحرا میں طالبان کی کھوپڑیاں، ہتھیار، ہڈیاں، کپڑے، جوتے، تسبیحات اور ٹوپیاں جگہ جگہ بکھری نظر آرہی تھیں۔

دو ستم کے مظالم: یہ تو ان شہداء کا ذکر ہے جو امریکیوں کے ظلم کا شکار ہوئے اور جن کی شہادتوں کی گواہی اجتماعی قبروں نے دی اور عالمی میڈیا کے علاوہ اقوام متحدہ نے بھی کسی حد تک سچائی کو تسلیم کیا مگر ان کے علاوہ ہزاروں قیدی ایسے تھے جو دو ستم اور دوسرے سنگ دل کمانڈروں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور ان کی قبروں کا نام و نشان تک نہ ملا۔ ان قیدیوں پر ڈھائے گئے مظالم سن کر ہی رونے لگتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنی آپ بیتی ”گوانتا نامو بے کی کہانی“ میں قلعہ جنگی سے زندہ گرفتار کیے جانے والے دو مجاہدوں محمد یوسف تاجکستانی اور مختار یحیٰی کے بیانات نقل کیے ہیں جن کے مطابق امریکیوں کے ہاتھوں صحرا میں دفن کیے جانے والے ساڑھے چار ہزار طالبان کے علاوہ پانچ سے آٹھ ہزار تک طالبان کو صرف رشید دو ستم نے قتل کیا تھا۔ ملا ضعیف ان چشم دید گواہوں کے حوالے سے لکھتے ہیں: ”دو ستم اور ان کے ساتھی طالبان مجاہدین کو گولی نہ مارتے بلکہ برہنہ کر کے میدان میں پھرایا جاتا، پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر کنٹینروں میں بند کر دیا جاتا اور تالا لگا کر کنٹینر کے نیچے آگ لگا دی جاتی۔ اس طریقے سے دو ستم نے پانچ سے آٹھ ہزار تک طالبان کو جان سے مارا۔ ایک کنٹینر میں 300 طالبان کو ٹھونس ٹھونس کر بند کر دیا جاتا۔“ (گوانتا نامو بے کی کہانی، ص: 47، 48)

ہفت روزہ ضرب مؤمن نے 25 جنوری 2002ء کی اشاعت میں مزار شریف کے نواح میں طالبان قیدیوں کی اجتماعی قبروں کی موجودگی کا انکشاف کرتے ہوئے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ رشید دو ستم بعض طالبان قیدیوں کو ذبح کر کے اور بعض کو زندہ ہی دفن کرتا رہا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہتھیار ڈالنے والے 13 ہزار طالبان میں سے ساڑھے چار ہزار امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ پانچ ہزار سے زائد افراد دو ستم کے مظالم سے شہید ہوئے۔ بقیہ افراد میں سے تین ہزار کے لگ بھگ شبرغان جیل پہنچا دیے گئے۔ اپریل 2002ء میں ان کی تعداد 2770 تھی۔ راصل ان میں سے بہت سے تشدد کی وجہ سے جاں بحق ہوتے رہتے تھے۔

شبرغان جیل کے قیدیوں کے بیان کے مطابق:

”طالبان قیدیوں پر بدترین تشدد کیا جاتا تھا۔ امریکی فوجی ان کے سر مونڈ کر ان پر تیزاب ڈالتے، قیدی تڑپتے تو امریکی قہقہے لگاتے۔ وہ طالبان کی انگلیاں اور زبانیں کاٹتے تھے، ان کی

ڈاڑھیاں موڑتے تھے اور انہیں اس قدر تشدد کا نشانہ بنائے کہ وہ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ یہ سب کچھ وہ صرف اپنا دل بہلانے یا غصہ نکالنے کے لیے کرتے تھے۔ بعض اوقات وہ قیدیوں کو جیل سے نکال کر لے جاتے تھے اور وہ قیدی پھر کبھی واپس نہیں آتے تھے۔“

اس کے بعد چند سو قیدیوں کا حساب رہ جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں ”خطرناک دہشت گرد“ ٹروپ کی حیثیت دے کر گوانتا نامو بے کے ایکسپریس میں لے جایا گیا تھا۔ ان میں طالبان کے نائب وزیر دفاع ملا فضل، ملا شہزادہ اور دیگر کمانڈر شامل تھے۔ قلعہ جنگی کے بیشتر قیدی بھی اس عتوبت خانے میں پہنچائے گئے۔ پاکستان سے گرفتار کیے گئے طالبان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کو بھی آخر میں یہیں بھیج دیا گیا تھا۔

شہید کا جو خون ہے: یہ ان ہزاروں حوصلہ مند، پرجوش اور با اصول مسلمانوں کا انجام تھا جو دنیا سے کفر کی بالادستی ختم کرنے اور اسلام کو ایک زندہ و جاوید دستور حیات کے طور پر سارے عالم پر غالب کرنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر افغانستان کے کہساروں میں جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے موقف اور مشن کو نہیں چھوڑا، دنیا کی تمام طاغوتی طاقتوں کے مشترکہ دباؤ سے ہراساں نہیں ہوئے۔ اپنا ایمان اور ضمیر فروخت نہیں کیا۔ وہ اللہ کے قانون کے مطابق سخت امتحان کی زد میں آئے اور اپنا سب کچھ قربان کر کے اس میں ثابت قدم رہے۔ قوموں کی بھائی بھائیوں کی لوگوں کے دم سے ہوتی ہے۔ اسلام کی سر بلندی انہی مجاہدوں کے خون سے ہوگی۔

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے شہید کا جو خون ہے وہ قوم کی زکوٰۃ ہے طالبان امارت اسلامی کا سقوط: قندوز کے محصور طالبان کی گرفتاری کے بعد بھی قندھار میں طالبان اپنے مرکز میں ڈٹے رہے۔ امریکی طیارے ماہ رمضان کے آغاز سے قندھار پر شدید بمباری کر رہے تھے، مگر طالبان نے شہر کا کنٹرول نہیں چھوڑا تھا۔ کئی بار امریکی چھاتہ بردار فوجیوں نے قندھار کے گرد اترنے کی کوشش کی مگر طالبان نے ان کی ہر کوشش ناکام بنادی۔ یہاں امریکا کے پاس شمالی اتحاد نہیں تھا جو زمینی جنگ میں ان کا ساتھ دیتا۔ 25 نومبر (19 رمضان) کو طالبان نے قندھار سے دور بلندہ میں 24 امریکی چھاتہ بردار ہلاک کر دیے۔ اگلے روز ایسی ہی کارروائی میں 60 چھاتہ بردار مارے گئے۔

اس مزاحمت کے ساتھ ساتھ طالبان اپنی افرادی قوت اور اسلحہ پہاڑوں میں منتقل کرتے رہے۔ لوگ ان حالات سے بے خبر تھے اور جنوبی افغانستان میں طالبان کے قدم جمدے دیکھ کر انہیں اُمید ہو چلی تھی کہ امریکی انوائج پانچ چھ ماہ کی فضائی مہم جوئی کے بعد ناکام لوٹ جائیں گی اور طالبان قندھار سے

نکل کر دوبارہ کامل تازہ مزار شریف اپنے علاقے واپس لے لیں گے۔ مگر ملا محمد عمر اور ان کے رفقاء تو امریکا سے ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے قندھار کو بھی چھوڑ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے قندھار کے نواحی قصبہ شاہ ولی کوٹ میں آباد کرزئی خاندان کے رؤساء کو شہر کا انتظام سپرد کر دیا۔ جمعہ 7 دسمبر کو انہوں نے اس شہر میں آخری بار نماز جمعہ ادا کی اور پھر اسی پنج رات کو ملا محمد عمر قندھار سے کسی نامعلوم مقام کی طرف کوچ کر گئے۔ یہ رمضان 1421ھ کی 22 ویں شب اور دسمبر 2001ء کی 8 تاریخ تھی۔ صبح تک طالبان قندھار خالی کر چکے تھے۔ افغانستان سے طالبان کی حکومت کا ساڑھے سات سالہ باہرکت دور ختم ہو چکا تھا۔ صبح جب یہ خبر میڈیا پر نشر ہوئی تو مسلمان دھک سے رہ گئے۔ کتنے دل دھڑکن بھول گئے اور کتنی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔

صحرا سے لے کے آئے جو تا منزل مراد کر کے ہمیں فلک کے حوالے کہاں مجھے اصل مشن امریکا کی تباہی: طالبان حکومت 3 نومبر 1994ء کو قندھار پر قبضے کے ساتھ وجود میں آئی تھی اور سات سال ایک ماہ چار دن تک قائم رہ کر 7 دسمبر 2001ء کو ختم ہوئی۔ اپنی روپوشی سے قبل جنگ کی ہولناکیوں کے دوران 20 نومبر (4 رمضان) کو ملا محمد عمر نے بی بی سی کی وساطت سے دنیا کو ایک حیرت انگیز پیغام دیا تھا جو آج بھی طالبان تحریک کی روح کو جوان اور ان کے حامیوں کی امیدوں کو روشن رکھ ہوئے ہے، ملا محمد عمر نے کہا تھا:

”ہمارا اصل مشن امریکا کی تباہی ہے۔ عنقریب امریکا تباہ ہونے والا ہے۔ بہت بڑا منصوبہ تیار ہے۔ پیش گوئی یاد رکھیں۔ علاقے حکمت عملی کے تحت چھوڑے گئے ہیں۔ دنیا افغانستان میں جلد تبدیلی دیکھے گی۔ وسیع البیاد حکومت کے نام پر قائم کی جانے والی شری پسندوں کی حکومت میں شمولیت پر موت کو ترجیح دیں گے۔ ہم از سر نو منظم ہو رہے ہیں۔“

ملا عبدالسلام ضعیف کی گرفتاری: 2 جنوری 2002ء کو اسلام آباد میں افغان امارت اسلامی کے سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کو پاکستانی حکام نے حراست میں لے کر امریکی فورسز کے حوالے کر دیا۔ امریکیوں نے انہیں بے لباس کر کے شدید تشدد کا نشانہ بنایا اور بحیرہ عرب میں موجود امریکی بحری بیڑے پر لے جا کر قید کر دیا۔ ان سے ملا محمد عمر، اسامہ بن لادن اور طالبان راہنماؤں کے ٹھکانوں کا پتا پوچھا جاتا رہا۔ کچھ دنوں بعد انہیں گرام ایرپورٹ پر واقع امریکی عقوبت خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں شدید برف باری کے موسم میں انہیں برہنہ کر کے برف پر لٹا دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں پانچ ماہ تک قندھار جیل میں رکھا گیا۔ یہاں بھی بدترین تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ جولائی 2002ء میں انہیں کیوبا کے امریکی عقوبت

خانے گوانتا نامو بے لے جایا گیا جہاں ان سے قتل سینکڑوں طالبان اور القاعدہ مجاہدین کو قید کر کے ناقابل بیان اذیتوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

تورابوڑا کے محاذ کا انجام: تورابوڑا کے مجاہد قندھار سے طالبان کے انخلاء کے بعد دو ہفتے تک امریکی اناج کا مقابلہ کرتے رہے۔ یہ محاذ دسمبر کے دوسرے عشرے کے اختتام پر سرد پڑا۔ تب تک مجاہدین کی بڑی تعداد پسپا یا شہید ہو چکی تھی۔ ان میں سے کچھ موقع پر زخمی حالت میں گرفتار کر لیے گئے جبکہ درجنوں پاکستانی سرحدوں کے قریب سے پکڑے گئے۔ بہت سے مجاہدین کو پاکستان نے پکڑ کر امریکا کے حوالے کیا۔ اسامہ بن لادن کا پھر بھی کچھ پتا نہ چلا۔

ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کامل سے طالبان کے انخلاء کے وقت ایک ہزار رفقاء کے ہمراہ بالاحصار کے راستے مرکزی شاہراہ پر رات 8 تا صبح 3 بجے تک سفر کرتے ہوئے گرد بڑ چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ تاہم ان کے آڈیو اور ویڈیو پیغامات میڈیا پر آتے رہتے ہیں۔

طالبان پر اعتراضات کی حقیقت: افغانستان پر امریکی حملے اور امارات اسلامیہ افغانستان کے سقوط نے اسلام مخالف عناصر کے حوصلے بے حد بڑھا دیے۔ اس تناظر میں میڈیا نے طالبان، اسلامی بنیاد پرستی اور مسلمانوں کو مسلسل تنقید کا نشانہ بنایا جس کے نتیجے میں طالبان کے بارے میں اعتراضات اور الزامات کا ایک انبار لگ گیا۔ سچ اور جھوٹ کی تمیز مشکل ہو گئی۔ اکثر الزامات نہایت فرسودہ تھے، مگر لوگوں نے ان الزامات کو بلا سوچے سمجھے قبول کر لیا اور افغانستان پر امریکی قبضے کے لیے طالبان کو مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ ماڈرن طبقے کے نزدیک تو طالبان پہلے بھی اجڈ، گنوار اور بد تہذیب تھے، اب ان کو یہ کہنے کو موقع بھی مل گیا تھا کہ طالبان نے اپنی ضد اور جہالت کا مزہ چکھا ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو ہمدردی کے لہجے میں طالبان کے ماضی و حال کے نقائص چن چن کر بیان کرتے تھے اور ان کی شکست پر اطمینان فوس کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ طالبان غلطیوں سے مبرانہ تھے، مگر عام طور پر ان کی جن پالیسیوں اور اقدامات کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے وہ اسلام کے مطابق تھیں، اس تنقید کے پس پردہ مسلمانوں کا نہیں، یہودی میڈیا کا ذہن کام کرتا رہا ہے۔ ہاں جو لوگ افغانستان کے طالبان سے براہ راست واقف رہے ہیں وہ حقائق کو خوب جانتے ہیں اور میڈیا کی اس اڑتی ہوئی دھول میں بھی طالبان کی وکالت کرتے رہے ہیں، جیسا کہ پاکستان کے نامور صحافیوں عرفان صدیقی، اور یا مقبول جان، جاوید چودھری اور سلیم صافی کے بہت سے کالم اس کی واضح مثال ہیں۔

آئیے ذرا ایسے چند الزامات کا جائزہ لیتے ہیں جو طالبان افغانستان پر عام طور پر عائد کیے جاتے رہے ہیں۔

دہشت گردی کی سرپرستی: امریکا اور مغربی طاقتیں طالبان حکومت پر دہشت گردوں کی سرپرستی کا الزام بھی عائد کرتی رہیں۔ خاص طور پر انہوں نے اسامہ بن لادن پر دہشت گردی کا الزام توہنے کے بعد طالبان کو ان کی میزبانی کرنے پر شدید تنقید کا نشانہ بنائے رکھا۔ اس الزام تراشی میں کئی حقائق کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اسامہ بن لادن، طالبان کی آمد سے سترہ سال پہلے سے افغانستان میں سرگرم تھے اور اس وقت خود امریکی حکومت انہیں حق کے لیے لڑنے والا، حریت پسند اور مجاہد کہتی تھی، مگر شکست روس کے بعد جب امریکا کے مفادات تبدیل ہو گئے تو یہی لوگ راتوں رات دہشت گرد قرار دیے گئے۔ آخر کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ امریکا دنیا میں کسی آزاد مسلم طاقت کا وجود برداشت نہیں کر سکتا؟ چاہے وہ طاقت صرف ایک چھوٹے گروہ ہی کی کیوں نہ ہو۔

امریکا جن کارروائیوں میں بن لادن کے ملوث ہونے کا الزام عائد کرتا رہا ہے، ان کا کوئی ٹھوس ثبوت کسی عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکا۔ طالبان نے امریکا کو کئی بار پیش کش کی کہ وہ اسامہ کے خلاف ان کی عدالت میں ثبوت فراہم کر دے تو اسامہ کو شریعت اسلامیہ کے مطابق سزا دی جائے گی مگر امریکا نے اس پیش کش کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ اس کی بجائے اس نے اگست 1998ء میں از خود افغانستان میں موجود بن لادن کے تربیتی کیمپ کو کروڑوں میزائلوں کا نشانہ بنایا۔ اب بنظر انصاف دیکھا جائے تو ایسا کر کے امریکا خود دہشت گرد بن گیا۔ اس کے بعد وہ اسامہ بن لادن پر دہشت گردی اور طالبان پر دہشت گردی کی سرپرستی کا الزام کس منہ سے عائد کر سکتا تھا؟

ورلڈ سینٹر پر حملے کے بعد امریکا نے مزید جنوبی انداز کا ثبوت دیا۔ حملے کی تحقیق سے پہلے ہی القاعدہ اور طالبان کو مورد الزام ٹھہرا دیا۔ طالبان سربراہ کی پیش کش کے باوجود مسئلہ مذاکرات سے حل نہ کیا گیا اور اپنے الزام کا ثبوت پیش کیے بغیر افغانستان پر چڑھائی کر دی گئی۔ اب خود ہی غور کر لیا جائے کہ دہشت گرد کون ہے اور اپنے دفاع کے لیے لڑنے والا کون؟

ہر شخص غور کرے کہ اگر کوئی دوسرا ملک اس کے وطن پر یہ کہہ کر حملہ کر دے کہ اس کے اندازے کے مطابق اس کے مطلوب ملزمان یہاں چھپے ہوئے ہیں تو کیا اسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں حملہ آور ملک کے خلاف فوراً اعلان جنگ نہ ہو جائے گا۔ طالبان نے تو پھر بھی خاصی برداشت سے کام لیا۔ 1998ء کے حملے کو وہ چپ چاپ سہہ گئے، امریکا کے خلاف کوئی اعلان جنگ نہیں کیا۔ مگر جب ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کی آڑ میں امریکا نے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ان پر چڑھائی کر دی جس میں بے قصور عورتیں، بوڑھے اور معصوم بچے بھی شہید ہو رہے تھے تو کیا اس کے بعد طالبان اپنا دفاع کیے بغیر رہ سکتے تھے! اس تناظر میں

ہر لڑکا کا اپنی جنگ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کہنا ایک بھیانک مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

خواتین کے حقوق غصب: طالبان کو خواتین کے حقوق کا غاصب کہا جاتا رہا ہے مگر ایسی کوئی مثال اب تک سامنے نہیں آئی جس میں واقعی کسی عورت نے ان پر حقوق کی پامالی کا الزام لگایا ہو۔ طالبان سے قتل دہشت گرد مکرماندروں نے عورتوں کی عصمت درمی کو معمول بنالیا تھا۔ طالبان نے عورت کی عزت و آبرو کا تحفظ یقینی بنایا۔ افغان ماؤں بہنوں کو نہ صرف وہ مقام واپس دلایا جو صدیوں سے اس معاشرے میں ان کی پہچان تھا بلکہ ایسے اقدامات بھی کیے جن کی پہلے کسی کو تو فتنہ نہیں ہوئی تھی۔ افغان قبائل میں عورتوں کی فروخت عام تھی۔ باپ پیسے لے کر لڑکی کسی کو بھی بیچ دیتا کہ وہ نکاح کر لے۔ اس میں لڑکی کی اجازت کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ طالبان نے اس خلاف انسانیت اور غیر شرعی رسم کو ختم کر دیا۔ نکاح میں عورتوں کی مرضی کو لازمی قرار دیا۔ قبائل آپس کی دشمنی ختم کرنے اور صلح صفائی کا معاملہ طے کرنے کے لیے تحفے کے طور پر عورتوں کا تبادلہ کرتے تھے جیسے پرانے بادشاہ باندیوں کا تبادلہ کرتے تھے۔ طالبان نے اس رواج کا خاتمہ کر ڈالا۔ طالبان دور میں عورتوں کے اغوا، آبروریزی یا مجرمانہ حملے کا گراف گر کر صفر پر آ گیا۔ ایسی مثال پوری دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔

عورتیں گھروں میں قید: طالبان پر عورتوں کو گھروں میں مقید کرنے اور زبردستی پردے کا پابند کرانے کا الزام بھی حقیقت سے دور ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے 1996ء میں مکمل پر قبضے اور اس طرح 1998ء میں مزار شریف وغیرہ کی فتح کے بعد عورتوں کو گھروں میں رہنے کے لیے کہا تھا مگر اس کا مطلب انہیں قید کرنا نہیں بلکہ ان کا تحفظ تھا جو فتح کے ابتدائی دنوں میں جنگی ماحول ہونے کے باعث انہیں سڑکوں پر فراہم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بعد میں عورتیں اپنے قدیم طرز کے مطابق پردہ کر کے ضروریات کے لیے باہر نکلتا شروع ہوئیں تو انہیں کہیں نہیں روکا گیا۔

جہاں تک برقعے یا پردے کا تعلق ہے تو اکثر افغان عورتیں طالبان سے پہلے بھی ٹوپی نما برقع اور ہمتی تھیں اور اب بھی اپنی اس روایت پر عمل پیرا ہیں۔ صرف چند فیصد عورتیں برقعے کے بغیر نکلتی ہیں مگر وہ بھی چادر یا دوپٹہ لیتی ہیں، ایسی عورتیں جو سر کھول کر باہر نکلتی ہوں ایک فی صد سے بھی کم ہیں، معاشرے میں انہیں بہت برا سمجھا جاتا ہے اور اس حالت میں کوئی بھی افغان مرد مشتعل ہو کر انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے یا کوئی شیطانی ذہن کا فرد اس سے غلط فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ طالبان نے برائی کا راستہ بند کرنے کے لیے ان بے پردہ عورتوں کو بھی برقعے کی پابندی کی ہدایت کی جسے افغان عوام نے بالکل ناکار نہیں سمجھا کیونکہ یہ ان کے معاشرے کے ایک انفرادیت پسند گروہ کو قومی دھارے میں شامل

کرنے اور انہیں اپنی اسلامی تہذیب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش تھی۔

عصری تعلیم کی مخالفت: طالبان کو عصری تعلیم کا مخالف بتایا جاتا رہا ہے جو کہ حقیقت سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ طالبان نے وقتی طور پر اسکولوں کو اس لیے بند کیا تھا کہ وہاں غیر مفید بلکہ نقصان دہ قسم کے نصاب تعلیم چل رہے تھے۔ کسی صوبے میں ظاہر شاہ کے دور کا، بادشاہی نظام کے ملازم تیار کرنے والا نصاب تھا۔ کسی میں مجاہد تنظیموں کا غلبت میں تیار کردہ نصاب چل رہا تھا۔ اکثر بڑے شہروں کا کل، مزار شریف وغیرہ میں کیونسٹوں کا نظام تعلیم مروج تھا۔

طالبان نے متبادل نصاب تعلیم پیش کرنے تک اسکولوں کی سرگرمیاں بند کر دیں اور جو نئی ملک کے قومی، مذہبی اور تہذیبی نقوش کے ہم آہنگ جدید نصاب مرتب ہوا، انہوں نے فوراً اسکول، کالج وغیرہ کھول کر تعلیمی سرگرمیاں شروع کرادیں۔ اس میں اگر ان کی جانب سے کوئی کمزوری نظر آتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ عصری تعلیم کے مخالف تھے بلکہ اس کی وجہ صرف اور صرف وسائل کی کمی تھی۔ الزام تراشی کرنے والی طاقتیں تعلیمی سلسلے میں امداد اس شرط پر دیتی تھیں کہ نصاب تعلیم کے بارے میں ان کی سفارشات مان جائیں جبکہ طالبان ان کی امداد کے عوض نسل نو کا مستقبل برباد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان رکاوٹوں کے باوجود طالبان نے اکثر اسکولوں اور کالجوں کو فعال کر دیا۔ کامل اور قدحار کی یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز بھی بھرپور انداز میں کام کرنے لگی۔

لڑکیوں کی تعلیم سے محرومی؟ لڑکیوں کو عصری تعلیم سے محروم رکھنے کا الزام بھی اسی طرح بے بنیاد ہے۔ طالبان لڑکیوں کی تعلیم کے نہیں، مخلوط نظام تعلیم کے مخالف تھے۔ انہوں نے اپنے محدود وسائل کے مطابق لڑکیوں کے چند الگ اسکول شروع بھی کر دیے تھے۔ اگر وسائل ہوتے تو یہ سلسلہ پورے ملک میں پھیل سکتا تھا مگر کنگ دہی ان کے کئی منصوبوں کی طرح اس منصوبے کے راستے میں رکاوٹ بنی رہی۔ تاہم کئی تعلیمی اداروں میں لڑکیاں پردے میں جوق درجوق پڑھنے جاری تھیں۔ میڈیکل یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ تھی۔

طالبان لڑکیوں کو قومی دھارے سے الگ کرنے یا عضو معطل بنانے کے قائل نہیں تھے مگر وہ انہیں شوپش بنانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے عورتوں کو اشتہارات اور سینما میں کام کرنے کی اجازت نہیں دی مگر ان کے دور میں وزارت صحت، وزارت داخلہ، وزارت تعلیم اور وزارت سماجی بہبود میں افغان عورتیں بھرپور انداز میں کام کر رہی تھیں۔

تہذیب اور آرٹ کے دشمن: طالبان حکومت کو ہر تہذیب، آرٹ اور ثقافت کا دشمن کہا جاتا ہے مگر یہ

حقیقت خود الزام تراشی کرنے والا مغربی طبقہ فکر بھی جانتا ہے کہ طالبان پرانی تہذیب کے مخالف تھے نہ کہ اس تہذیب و ثقافت کے جو افغان مسلمانوں کی اصل متاع تھی۔ ہر ملک اپنے رسم و رواج، تہذیب و تمدن اور ثقافت کی حفاظت کرنا چاہتا ہے اور اس پر بحث کا اچھا خاصہ حصہ صرف کرتا ہے۔ کیونکہ وطن اور ملک کی وحدت اور شکل و صورت اسی سے پہچانی جاتی ہے۔ طالبان اپنے وطن کو دنیا بھر میں ممتاز کرنے کے لیے اس کی صدیوں پرانی اسلام سے ہم آہنگ ثقافت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا ڈاڑھی، پگڑی اور برقعے وغیرہ کو رواج دینا اور اسلامی شعائر کو عام کرنا اس مصلحت کے تحت تھا۔ اگر سکھ اپنی ڈاڑھی اور پگڑی پر اصرار کر سکتے ہیں، انگریز کوٹ پینٹ کی جکڑ بند یوں کے عاشق ہیں تو افغانستان کا حکمران اپنے عوام کی اسلامی وضع قطع کو برقرار رکھنے کی اجازت کیوں نہیں پاسکتا؟

بامیان کے بتوں کی تباہی: طالبان کی ”تہذیب و ثقافت دشمنی“ میں بامیان کے بتوں کی تباہی کو سب سے بڑے الزام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ دنیا کو یہ الزام دھرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جب طالبان کو دنیا کی حکومتوں نے تسلیم ہی نہیں کیا تو پھر ان سے یہ توقع کیوں رکھی گئی کہ وہ دنیا والوں کی رسموں اور قیود کا احترام کریں گے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عالمی برادری اور اقوام متحدہ بامیان کے بتوں کو بچانے کے لیے دوادویلا کرتی رہی، مگر کشمیر، چیچنیا اور فلسطین میں نہتے مسلمانوں کے قتل عام پر وہ حرکت میں کیوں نہیں آئی۔ کیا پتھر کے بتوں کی حیثیت زعمہ انسانوں سے زیادہ ہے؟

اسلامی ملکوں اور مسلمانوں کو تو خیر دیسے ہی اس بت شکنی پر ناک بھوں چڑھانا زیب نہیں دیتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم ﷺ تک اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے لے کر محمود غزنوی تک بت شکنی کی سنت اس طرح زعمہ و تائبندہ ہے کہ ہر مسلمان کو اس عمل کے دہرانے کا شائق ہونا چاہیے مگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو بت پرست قوموں کے پاس بھی طالبان پر طعنہ زنی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ بت گوتم بدھ کے تھے جس نے خود کبھی اپنے بت بنوانا پسند نہیں کیے۔ اگر گوتم بدھ زعمہ ہوتا تو وہ بھی طالبان کی پیڑھے ٹھونکتا نہ کہ انہیں برا بھلا کہتا۔

پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ یہ بت دو ہزار سال پہلے افغانوں ہی نے تراشے تھے، اب خود انہوں نے ہی توڑ دیے۔ اگر یہ بت جاپانیوں، امریکیوں اور جرمنوں نے بنائے ہوتے تو خیر سوچا جاسکتا تھا کہ ادروں کی چیز توڑی جا رہی ہے۔ یہ تو اپنی چیز کو خود توڑ ڈالا گیا ہے..... لہذا کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے۔ یہاں یہ غلط فہمی دور کر لینی چاہیے کہ طالبان وہ پہلا گروہ ہیں جنہوں نے بامیان کے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان سے قبل کئی مسلم حکمران بت شکنی کی یہ سعادت حاصل

کرنے کی کوشش کر چکے تھے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر سلطان محمود غزنوی، سلطان غوری یا کئی دیگر سلاطین نے بامیان کے بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی تو وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بتوں کا احترام کرتے تھے۔ سبب یہ تھا کہ وہ یعقوب بن لیث صفاری اور دوسرے ہم آرزوؤں کو اس کوشش میں ناکام دیکھ چکے تھے۔ بعد یہ سمجھ چکے تھے کہ مروجہ اوزاروں اور ہتھیاروں (تکوار، کلہاڑی، کدال) وغیرہ سے ان کو توڑنا ممکن نہیں۔ اس لیے چوتھی صدی ہجری سے گیارہویں صدی ہجری تک یہ سلسلہ رکا رہا۔

پھر جب گولہ بارود کا زمانہ آیا تو عالمگیر اور امیر عبدالرحمن جیسے مسلم حکمرانوں نے ایک بار پھر ایسی کوششیں شروع کیں جن کی تکمیل طالبان نے کر دی۔

11 ستمبر اور اسامہ بن لادن کی حفاظت: عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ اگر طالبان اسامہ کو تحفظ نہ دیتے اور 11 ستمبر کا واقعہ پیش نہ آتا تو طالبان حکومت برقرار رہتی اور امریکا کو افغانستان پر چڑھائی کا موقع نہ ملتا۔ مگر غور کیا جائے تو یہ خیال سطحی نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ امریکا اس سے قبل اگست 1998ء میں بھی افغانستان پر حملہ کر چکا تھا اور اس کے بعد بھی زیادہ بڑے اور مؤثر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

اس سلسلے میں امریکی جوائنٹ آف چیف اسٹاف جنرل ہنری شیلٹن کا وہ انٹرویو قابل ذکر ہے جو دسمبر 2000ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس میں جنرل موصوف نے انکشاف کیا تھا کہ امریکا بہت جلد افغانستان پر جوابی حملہ کر سکتا ہے۔ اس سے قبل فروری 2000ء میں امریکا کی جانب سے طالبان کو دہشت گردی دی گئی تھی کہ وہ اسامہ کو اس کے حوالے کر دیں ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ان سب سے بڑھ کر سابق پاکستانی سیکرٹری خارجہ نیاز اے نائیک کا بیان ہمیں اصل حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔

نیاز اے نائیک کا کہنا ہے کہ جولائی 2001ء کے وسط میں امریکی حکام نے انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ بش انتظامیہ طالبان حکومت کے خلاف کارروائی کی تیاری کر رہی ہے۔ نیاز اے نائیک جرمنی کے دارالحکومت برلن میں افغانستان کے حوالے سے منعقد ہونے والے انٹرنیشنل کنفیٹ گروپ کے اجلاس میں شریک تھے۔ اس موقع پر امریکی نمائندوں نے انہیں خبردار کیا کہ اگر طالبان اسامہ بن لادن کو ان کے حوالے نہیں کرتے تو امریکا افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کرے گا اور اسامہ بن لادن اور ملائیم عمر کو قتل یا گرفتار کرنے کے بعد ظاہر شاہ کی نگرانی میں عبوری حکومت قائم کرے گا۔ (نائیک صاحب اگست 2009ء میں پراسرار طور پر قتل کر دیے گئے۔)

ان دنوں برطانوی اور فرانسیسی ذرائع ابلاغ میں ایسی خفیہ رپورٹیں بھی شائع ہوئی تھیں جن میں پیش گوئی کی گئی تھی کہ امریکا ایسی کارروائی اکتوبر کے وسط میں کرے گا اور برف باری کے موسم سے قبل اپنی

مہم مکمل کر لے گا۔ یہ انکشافات اس لیے کیے گئے تھے کہ اتحادی ممالک اس مہم سے قبل اپنے اقتصادی و سیاسی اہداف طے کر لیں اور بعد میں امریکا سے مزاحمت نہ ہوں۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امریکا بہر حال افغانستان پر حملے کے لیے تیار تھا۔ 11 ستمبر کا حادثہ پیش نہ آتا تب بھی وہ حملہ ضرور کرتا۔ یہ تو ممکن تھا کہ یہ حملہ ذرا دیر سے اور زیادہ بھرپور تیاریوں کے ساتھ ہوتا مگر یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ امریکا طالبان کو پھلتا پھولتا دیکھ کر خاموش بیٹھا رہتا۔ اسلام کی عظمت، رفتہ کو زندہ کرنے والے یہ مجاہد جو کہ تل کے راستوں پر بھی قابض تھے، امریکا کو بھلا کہاں برداشت ہو سکتے تھے۔

احکام کی ایک جھلک: آخر میں ہم طالبان امارت اسلامی کے چند اہم اعلانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ آیا وہ کون سے احکام تھے جن کو مغرب و حشیانہ قرار دے رہا تھا۔ یاد رہے کہ یہ احکام مذہبی پولیس (امریا المعروف ونچی عن المنکر) کی طرف سے جاری کیے گئے تھے۔

عورتوں سے متعلق:

✽ خواتین کے لیے اونچی ایڑی کے جوتے یا چلنے میں آواز پیدا کرنے والے جوتے پہننا ممنوع ہے۔
✽ عورتیں اپنے گھروں سے نہ نکلیں۔ اگر نکلتا پڑے تو فیشن ایبل لباس، سرخی پاؤں اور بے جلابی سے بچیں۔ سر تا پاؤں مکمل برقعے میں لپیوس رہیں۔

ہسپتالوں سے متعلق:

✽ عورتیں ہمیشہ لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ اگر مرد ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہو تو کسی قریبی رشتہ دار مرد کے ساتھ جائیں۔

✽ مریضہ کے طبی معائنے کے دوران مریضہ اور معالج دونوں شرعی حجاب پہننے ہوں۔
✽ مرد معالج مریضہ کے متاثرہ حصے کے سوا کسی دوسرے حصے کو نہ دیکھے نہ چھوئے۔
✽ ہسپتالوں میں بیمار خواتین کی انتظار گاہیں مردوں سے الگ اور باپردہ ہوں۔
✽ رات کو ہسپتال کے جن کمروں میں مریض عورتیں ہوں وہاں کوئی مرد ڈاکٹر بغیر طلب کیے داخل نہ ہو۔
✽ خاتون ڈاکٹر سادہ لباس پہنیں۔ فیشن لیبل پہننے، سرخی پاؤں لگانے اور زیب و زینت کی اجازت نہیں۔
✽ میڈیکل شعبے کی عورتیں ڈرائیور کے ساتھ نشست پر نہ بیٹھیں۔
✽ لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں بیمار مردوں کے کمروں میں داخل نہ ہوں۔
✽ ہسپتال کا عملہ وقت مقررہ پر مساجد میں نماز ادا کرے گا۔

ڈرائیوروں سے متعلق: کوئی ڈرائیور فیشتی برقعے میں ملبوس کسی عورت کو کار میں نہیں بٹھائے گا۔ ایسی عورتیں کہیں نظر آئیں تو ان کے گھر تلاش کر کے ان کے خاوندوں کو سزا دی جائے گی۔ اگر عورتیں فیشتی لباس پہنے ہوں اور ان کے مرد رشتہ دار ساتھ نہ ہوں تو بھی ڈرائیور انہیں گاڑی میں نہیں بٹھائے گا۔

موسیقی سے متعلق:

دکانوں، ہوٹلوں، بڑی گاڑیوں، رکشوں میں کیسٹ اور موسیقی منع ہے۔
ڈانسی سے متعلق: اگر کسی نے ڈانسی مونڈی یا (ایک مشقت سے کم) تراشی تو جب تک ڈانسی بڑی نہیں ہو جاتی اسے قید رکھا جائے گا۔

دیگر پابندیاں:

طالبان نے اسلامی شریعت کے مطابق درج ذیل پابندیاں بھی لگائیں۔
کبوتر بازی اور تاش کھیلنا ممنوع قرار دیا۔ چنگ بازی کی ممانعت اور چنگوں کی ادکانیں ختم کرنے کے احکام جاری کیے۔ گاڑیوں، دکانوں، ہوٹلوں اور تمام جگہوں سے تصویروں، مجسموں اور پورٹریٹ ختم کرنے کا حکم دیا۔

جوعے خانے ممنوع قرار دیے گئے۔ جوار یوں کے لیے ایک ماہ قید کی سزا مقرر ہوئی۔
نشر بازوں اور غشیات فروشوں کو قید کرنے اور سزا دینے اور غشیات فروشوں کی دکانیں بند کرانے کا حکم جاری کیا گیا۔

فیشتی بال رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔ مذہبی پولیس نے اعلان کیا کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے ان کے بال کاٹ دیے جائیں گے اور انہی سے بال کاٹنے کی اجرت لے کر حجام کو دی جائے گی۔

آبادی کے قریب بہتی ندیوں کے کنارے نوجوان لڑکیوں کو کپڑے دھونے سے منع کر دیا گیا۔ خلاف ورزی کرنے والیوں کو گھر بھیج کر ان کے شوہر (یا سرپرستوں) کو سزا دے جانے کا اعلان کیا گیا۔

شادی بیاہ پر تاج گانے پر پابندی لگادی گئی۔ خلاف ورزی پر خاندان کے سربراہ کو گرفتار کرنے کا حکم ہوا۔
درزیوں کے لیے عورتوں کا لباس سینے، ان کا ناپ لینے اور دکانوں میں فیشن کے میگزین رکھنا جرم قرار دے دیا گیا۔

جادو گروں کو گرفتار کرنے، توبہ نہ کرنے تک قید میں رکھنے اور جادو کی کتب جلا ڈالنے کا حکم جاری ہوا۔
نماز کی پابندی: اعلان کیا گیا کہ نماز کے وقت گاڑیوں کی آمد و رفت بند ہو جائے گی۔ تمام لوگوں کے لیے مساجد میں جانا لازمی ہوگا۔ نوجوانوں کو نمازوں کے وقت دکانوں میں دیکھا گیا تو قید کر دیا جائے گا۔ کھیل کے

دوران نماز کا وقت ہو جائے تو کھیل روک دیا جائے گا۔ تماشا کی تالیوں کی جگہ اللہ اکبر کا نعرہ بلند کریں گے۔

آخری بات: یہ درست ہے کہ یہ احکام دور جدید کی مادر پدر آزاد تہذیب سے ہٹ کر ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ تمام پابندیاں قرآن وحدیث سے ماخوذ اور چودہ سو سال قبل کے مدنی معاشرے سے ہم آہنگ ہیں۔ ایک اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے اس قسم کی پابندیاں لگانا حکومت وقت کی ذمہ داری بنتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر پابندیاں اس لیے لگائی جا رہی تھیں کہ ان کی خلاف ورزی سے بہت سے فتنے نمودار ہو رہے ہیں۔ موسیقی سے دل میں جو طربیہ یا حزن یہ جذبات ابھرتے ہیں وہ انسان کو کسی اونچے مقصد کا نہیں رہنے دیتے، وہ یامست عاشق بننے لگتا ہے یا دل چھینک اور مایوس مجنوں۔ وہ ایمانی جذبات جو طاوت اور ذکر اللہ سے ابھرتے ہیں، موسیقی کے اثر سے کمزور ہو جاتے ہیں اور دل میں کفر و نفاق غیر محسوس طور پر پنپنے لگتا ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے: گانا بجانا دل میں نفاق کو یوں اگاتا ہے جیسے پانی کھینی کو (مشکوٰۃ) پس اگر قوم کی ذہنی صلاحیتوں کو زنگ آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے موسیقی پر پابندی لگائی جاتی ہے تو اس سے کون سا حق سلب ہوتا ہے، اور اسے وحشیانہ قانون کی معنی میں کہا جا رہا ہے؟

یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ عورتوں کا بے پردہ پھرنا، اونچی ایڑی کی جوتی پہننا، فیشی لباس کا مظاہرہ کرنا اور غیر محرم ڈرائیور کے ساتھ سیٹ پر بیٹھنا مردوں کو تعلقات پر برا بیٹھنے کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہی تعلقات بڑھ کر طرح طرح کے فتنوں کو جنم دیتے ہیں جس سے گھر اور خاندان تباہ ہوتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کا ندی کے کنارے کپڑے دھونا اکثر ادا باش لوگوں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔ عصمت دری کے ان گنت واقعات ایسے ہی مقامات پر پیش آچکے ہیں۔ پس ہر وہ حکمران جو قوم کی بیٹیوں کی عفت وعصمت کو اپنی بیٹی کی عزت کی طرح مانتا ہو، وہ ایسی پابندیاں ضرور لگائے گا جو ان کے جوہر عصمت کی حفاظت میں معاون ہوں۔

یہ درست ہے کہ عوام مذکورہ شرعی احکام میں سے بہت سی چیزوں کے عادی نہیں تھے اس لیے انہیں طالبان کی حکومت میں کسی قدر دشواری محسوس ہوتی تھی اور شرعی پابندیوں کی اہمیت نہ سمجھنے والے بہت سے لوگ طالبان سے ٹالنا بھی تھے مگر اس کے باوجود دیکھا جائے تو ان پابندیوں سے کسی کا کوئی ایسا حق سلب نہیں ہوتا تھا جو اللہ کی شریعت نے اسے انسان ہونے کی حیثیت سے عطا کر رکھا ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ آج کل مسلم دنیا میں بھی کسی بھی حکومت یا ادارے کی کارکردگی کو جانچنے کے لیے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کو معیار بنالیا گیا ہے حالانکہ یہ چارٹر بذات خود بوجہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔ اگر کوئی اس چارٹر کو معیار مان کر دنیا کی حکومتوں کو جانچے

تو یقیناً اسے کئی جگہ طالبان پر بلکہ دورِ خلافت راشدہ اور دورِ نبوت کے نظامِ حکومت پر بھی انگلی اٹھانے کے مواقع مل جائیں گے مگر طالبان کے ہاں معیارِ اقوام متحدہ کا چار ٹرینیں، نہیں، شریعتِ اسلامیہ تھی۔ طالبان حکومت کا مقصد لوگوں کو وہ ”بنیادی حقوق“ دینا نہیں تھا جو یہودیوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والے اس ادارے نے متعارف کرا کے مسلم ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کو آزاد، آزاد خیال مسلمانوں کو بے دین اور اسلام پسند عناصر کو پابند بنانے کی راہیں ہموار کی ہیں۔ بلکہ طالبان حکومت کا منشور خالق کے قانون کے مطابق بندوں کو ایسی راہ پر چلانا تھا جس سے وہ دنیا و عقبیٰ میں فلاح پائیں۔ انہیں خالق کی طرف سے دیے گئے تمام حقوق بھی ملیں اور اس کی رضا مندی بھی۔ دنیا میں بھی وہ اس کی حلال نعمتوں سے مستمتع ہوں اور آخرت میں بھی راحت پائیں۔



مآخذ و مراجع

- ♣ طالبان جند اللہ۔ نبی ہویدی
- ♣ ہفت روزہ ضربِ مؤمن، جلد 4، 5
- ♣ ہفت روزہ بکیر: جلد 2001ء
- ♣ ماہنامہ امارت اسلامی افغانستان جلد 1422ء
- ♣ قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائم۔ 2001ء
- ♣ روزنامہ اسلام کراچی 2001ء
- ♣ طالبان بانیو گمرانی۔ باربرا ایلس

چھٹیوں وال باب

افغانستان، امریکی استعمار کے شکنجے میں

طالبان کے منظر عام سے ہٹنے ہی سابق نام نہاد صدر برہان الدین ربانی نے ایک بار پھر اپنی مہارت کی بحالی کا اعلان کر دیا تھا مگر ان کا یہ دعویٰ ناقابلِ سماعت تھا۔ امریکا افغانستان میں اپنی مرضی کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا جبکہ افغانستان ایک بار پھر مختلف گروپوں اور گروہوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ مزار شریف دو ستم کے پاس تھا۔ پنج شیر سے کابل تک حزب وحدت اور شمالی اتحاد کے کمانڈروں کی اجارہ داری تھی جبکہ پختون کمانڈر جو ان کا اقتدار قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، مشرقی صوبوں میں غالب تھے۔ یہ سب لڑنے مرنے پر تلے تھے مگر امریکا کا خوف بھی ان پر طاری تھا کیونکہ امریکی افواج بدستور افغانستان میں موجود تھیں اور فی الحال ان کا واپس جانے کا کوئی پروگرام نظر نہیں آ رہا تھا گویا اب اصل حکمران امریکا ہی تھا۔ لہذا یہ سب کے سب مستقبل کے سیاسی سیٹ آپ میں زیادہ سے زیادہ حصہ ہانے کے لیے وائٹ ہاؤس کی طرف دیکھنے پر مجبور تھے۔ امریکا یہ چاہتا تھا کہ یہاں جلد از جلد اپنی کٹھ پتلی حکومت تشکیل دے جو اس کے مفادات کی تکمیل کے لیے باندی کی طرح کام کرے۔

بون کا نفرنس: جس دن فکدہ جنگی کے تہ خانے سے طالبان اور عرب مجاہدین کے باقی ماندہ افراد کو گرفتار کیا گیا تھا اسی دن امریکا افغانستان سے ہزاروں میل دور جرمنی کے شہر بون میں افغان لیڈروں کو ملک کے نئے سیاسی سیٹ آپ کا فیصلہ سنانے کے لیے جمع کر چکا تھا۔ ان لیڈروں کو امریکانے بڑی سوچ بچار کے بعد منتخب کیا تھا۔ ان میں سے کچھ کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ جنگجو سردار تھے اور طالبان کے سخت ترین مخالف ہونے کی وجہ سے امریکا کے بہترین مددگار ثابت ہو سکتے تھے۔ کچھ لیڈر ایسے تھے جن کا اثر و رسوخ اب بھی موجود تھا اور ان کے ذریعے لوگوں کی حمایت حاصل کرنا ممکن تھا۔ کچھ سیاست دان امریکا کے پسندیدہ افغان لیڈروں کے حامی ہونے کی وجہ سے بلا لیے گئے تھے۔ مثلاً پروفیسر صفت اللہ مجددی اور میر احمد گیلانی کو اس وجہ سے بلوایا گیا تھا کہ وہ ظاہر شاہ کی حمایت کرتے تھے۔

ان کے برعکس جو لیڈر امریکا کے مستحب تھے انہیں افغان سیاست میں اہم کردار رکھنے کے باوجود ہون کانفرنس سے دور رکھا گیا۔ مثال کے طور پر مولوی محمد نبی محمدی نہایت عالی قدر سیاست دان اور مجاہد تھے مگر چونکہ وہ امریکا مخالف اور طالبان کے حامی تھے، اس لیے انہیں اس کانفرنس میں نمائندگی نہیں دی گئی۔ اس طرح مولانا محمد یونس خالص اور گلبدین حکمت یار کو بھی امریکا مخالف ذہن رکھنے کی وجہ سے مندوبین کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

27 نومبر 2001ء کو شروع ہونے والا یہ اجتماع چھ روز تک جاری رہا۔ کانفرنس کے مندوبین میں شامل افغان لیڈروں کے کئی گروپ تھے۔ ان گروپوں میں شمالی اتحاد کا گروپ اور جلاوطن افغان بادشاہ ظاہر شاہ کا گروپ..... جو امریکا کو زیادہ پسند تھا..... سب سے آگے تھا۔

ظاہر شاہ کے گروپ کے تمام افراد تارک وطن یا جلاوطن پشتون تھے جو ایک طویل مدت سے ملک سے باہر تھے اور مختلف ممالک میں قارغ البالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں حامد کرزئی کی شخصیت سب سے نمایاں تھی جسے امریکا کی پوری آشیر باد حاصل تھی۔ کانفرنس میں شریک افغان لیڈروں، کمانڈروں اور ان کے نمائندوں کو پہلے ہی اجتماعی یا انفرادی ملاقاتوں اور رابطوں کے ذریعے اس نتیجے کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا گیا تھا۔ چون ظاہر شاہ گروپ کے لوگوں کا کئی برس سے افغانستان میں کوئی کردار نہیں تھا اس لیے مذاکرات پر شمالی اتحاد چھایا رہا۔ اس کے نمائندوں یونس قانونی اور ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ نے اپنے تناسب سے کہیں بڑھ کر نائب وزیر اعظم کی نشست سمیت 29 میں سے 14 وزارتیں اپنے لیے منظور کروالیں۔ اس سودے بازی کے بدلے انہوں نے حامد کرزئی کو عبوری حکومت کے وزیر اعظم کے طور پر قبول کرنے کی ہامی بھری۔

سابق صدر برہان الدین ربانی نے حلف برداری کی تقریب پر نہایت خاموشی سے ملک کا اقتدار نئی حکومت کے حوالے کرنے کی رسم انجام دی۔ حامد کرزئی حلف برداری کے بعد برہان الدین ربانی کے بغل گیر ہوئے۔ محروم ہمارا شیدو وستم بھی تقریب میں کھٹ پتلی کی طرح موجود تھا جسے امریکا کے تیار کردہ اس نئے سیٹ اپ میں تقریباً معطل رکھا گیا تھا کیونکہ اس کی روس نوازی امریکا کے لیے شک و شبہ کا باعث تھی۔ حامد کرزئی کو عبوری حکومت کا وزیر اعظم منتخب کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا گیا کہ جلد از جلد لویہ جرگہ طلب کر کے وسیع البیاد حکومت قائم کی جائے گی۔ پختون لیڈروں کو عبوری حکومت میں برائے نام نمائندگی ملی تھی تاہم انہوں نے اتفاق کر لیا تھا۔

نئی عبوری حکومت: ہون کانفرنس میں طے شدہ فیصلوں کے مطابق 22 دسمبر 2001ء کو حامد کرزئی کی

قیادت میں 30 رکنی افغان عبوری حکومت نے حلف اٹھا کر چھ ماہ کے لیے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ وزیر داخلہ یونس قانونی اور وزیر خارجہ عبداللہ عبدالمسیح سمیت گیارہ وزراء تاجک تھے۔ مصطفیٰ کاظمی، سیما شر، جاتی محقق اور سلطان حمید نامی 4 وزراء ہزارہ جات سے تھے۔ صرف 5 وزراء پشتون اور تین ازبک تھے۔

حامد کرزی کی کون؟ حامد کرزی قندھار اور اس کے گرد و نواح میں آباد پنجتون قبیلے پوپلوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ پوپلوی ایک بڑا قبیلہ ہے جس میں ساڑھے 5 پانچ لاکھ سے زائد افراد شامل ہیں۔ اس قبیلے کو ماضی میں افغانستان پر حکمرانی کا موقع ملتا رہا تھا۔ حامد کرزی کی ولادت 24 دسمبر 1957ء کو قندھار کے نواحی گاؤں ”کرز“ میں عبدالاحد کرزی کے ہاں ہوئی جو ظاہر شاہ کی حکومت میں پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ حامد نے قندھار اور کابل کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ 1976ء میں میٹرک کیا۔ کیونسٹوں کے اقتدار کے بعد جب ظاہر شاہ اور داؤد خان کا قبیلہ عتاب کی زد میں آیا تو حامد کرزی ہجرت چلے گئے۔ وہاں 1979ء سے 1983ء تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کا پسندیدہ موضوع ”بین الاقوامی تعلقات“ تھا۔ شملہ یونیورسٹی سے انہوں نے پولیٹیکل سائنس میں پوسٹ گریجویٹ کورس کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد انہوں نے روس سے برسر پیکار پروفیسر صہنت اللہ مجددی کی تنظیم میں محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر کے طور پر کام کر کے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ تنظیم کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کیا کرتے تھے۔ غالباً اسی دور میں ان کے روابط امریکا سے ہوئے۔ 1992ء میں کابل میں مجاہدین کی عبوری حکومت قائم ہوئی تو کرزی نائب وزیر خارجہ کے منصب پر فائز ہوئے مگر پھر مجاہدین کی خانہ جنگی سے بچ آ کر 1994ء میں مستعفی ہو گئے۔

1995ء میں طالبان جنوبی افغانستان پر قابض ہوئے تو حامد کرزی نے شروع میں ان کی حمایت کی مگر وہ طالبان کے پاکستان سے تعلقات اور افغانستان میں غیر ملکی مجاہدین کی موجودگی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ 1996ء میں کابل پر طالبان کے قبضے کے بعد حامد کرزی اقوام متحدہ سے وابستہ ہو گئے۔ 1999ء میں ان کے والد عبدالاحد کرزی پاکستان میں قتل کر دیے گئے۔ کرزی نے اس کا مجرم آئی ایس آئی اور طالبان کو ٹھہرایا۔ تب سے وہ پاکستان اور طالبان کے سخت مخالف بن گئے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ چھ زبانوں: پشتو، فارسی، اردو، ہندی، انگلش اور فرانسیسی پر عبور رکھتے ہیں۔

نئے حکمران حامد کرزی کا خطاب: افغان قوم کے نام اپنے پہلے خطاب میں حامد کرزی نے اعلان کیا کہ ہم ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے مل جل کر کام کریں گے۔ طالبان اور دہشت گردوں کو جلد ملک سے نکال دیا جائے گا۔ مختلف گروپوں کی حد بندیاں ختم کر کے قومی فوج قائم کی جائے گی اور امن و امان کو

یعنی بنایا جائے گا۔ انہوں نے ساڑھے تین ماہ قبل قتل کیے جانے والے تاجک لیڈر احمد شاہ مسعود کو اپنا بھائی قرار دے کر خراج عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ملک میں تعلیمی انقلاب لایا جائے گا اور لوہہ جرمے میں نیا آئین متعارف کرایا جائے گا۔

تقریب سے ایرانی وزیر خارجہ کمال الدین خرازی نے بھی خطاب کیا اور اس دن کو تمام اسلامی دنیا کے لیے نہایت اہم قرار دیا۔ پاکستانی وزیر خارجہ عبدالستار خاموش تماشائی کی طرح چپ چاپ اس تقریب میں شریک رہے۔ یہ بات ظاہر تھی کہ یہ نیا حکومتی سیٹ اپ کسی طرح بھی پاکستان کے حق میں نہیں تھا۔ پاکستان دوست طالبان کی جگہ اب پاکستان دشمن اور بھارت نواز شمالی اتحاد افغانستان پر مسلط ہو گیا تھا۔ اس کے وزراء خصوصاً وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ جی بھر کے پاکستان کے خلاف ذرا اگل رہے تھے۔

پاکستان پر بھارت نواز افغان حکومت کے اثرات: افغانستان میں نئی حکومت کے قیام کا تلخ ذائقہ سب سے پہلے پاکستان ہی کو پکھٹا پڑا۔ طالبان نے بھارت کو افغانستان میں سفارت خانے نہیں کھولنے دیے تھے۔ آخری وقت میں بھارت نے طالبان کو اس پیغام کے ساتھ بھرپور عسکری امداد کی پیش کش کی تھی کہ ہم دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن پاکستان سے لڑیں گے، مگر طالبان نے پاکستان سے زخم کھانے کے باوجود اسلامی اخوت کا پاس کیا تھا۔ ملا محمد عمر نے بھارت کا پیغام دوستی ٹھکرا دیا تھا اور امداد کی پیش کش اس کے منہ پر دے ماری تھی۔

مگر اب بھارت کی دلی مرادیں برآئی تھیں۔ اس کا سفارت خانہ کامل میں کیا کھلا افغانستان میں جگہ جگہ پاکستان کے خلاف دہشت گردی کے تربیتی مراکز قائم ہو گئے۔ پاکستان کی مغربی سرحدیں سات برس بعد پہلی بار بالکل غیر محفوظ ہو گئیں اور افواج پاکستان کی توجہ اور طاقت تقسیم ہو کر مشرقی اور مغربی سرحدوں پر لگ گئی۔ بھارت کے لیے پاکستان کی مشرقی سرحدوں کو روندنے کا یہ بہترین موقع تھا چنانچہ دسمبر 2001ء کے وسط میں..... یعنی طالبان حکومت کے سقوط کے اگلے ہی ہفتے..... مشرقی سرحدوں پر بھارتی افواج کی زبردست نقل و حرکت نے پاکستان میں شدید بے چینی پھیلا دی۔ جنوری 2002ء میں بھارت پوری طرح حملے کے لیے تیار تھا اور پاکستان کی بقا اور سلامتی سخت خطرے میں تھی۔ ایسے میں پاکستان نے افواج مغربی سرحدوں سے ہٹا کر مشرقی سرحدوں پر جمع کرنا شروع کر دیں۔

خاد نئے نام سے فعال: حامد کرزئی کے برسر اقتدار آنے کے بعد آنے والی تبدیلیوں میں سے ایک اہم تبدیلی یہ تھی کہ افغان خفیہ ایجنسی ”خاد“ کو ”ملی امنیہ دولتی“ کا نام دے کر بحال کر دیا گیا۔ اس طرح طالبان کی حمایت اور امریکا کی مخالفت کے الزام میں شہریوں کی پکڑ دھکڑ اور بے قصود لوگوں پر

مظالم کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری تبدیلی یہ تھی کہ افیون کی کاشت پھر شروع ہو گئی۔ سینکڑوں مربع میل کے علاقوں پر پوست کے کھیت لہلہانے لگے۔ خبیثات کے اسمگروں کی عید ہو گئی۔

سابقہ قومی پرچم بحال: طالبان نے اپنے دور میں افغانستان کا قومی پرچم تبدیل کر کے سفید رنگ کا جھنڈا جس پر کلمہ طیبہ درج تھا، متعارف کرایا تھا۔ حامد کرزی نے حکومت سنبھالتے ہی طالبان دور کی ایسی تمام یادگاروں کو تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ تین رنگوں والا سابقہ قومی پرچم جو طالبان سے قبل رائج تھا، دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ نئی افغان حکومت کے قیام کے ساتھ ہی افغان کرنسی کی قیمت راتوں رات کئی گنا بڑھ گئی کیوں کہ امریکی کی مالی امداد مل جانے سے افغانستان میں زرمبادلہ کے نئے ذخائر جمع ہو گئے تھے۔ کرنسی کا لین دین کرنے والے تاجر مالا مال ہو گئے۔

طالبان کے بعد: امریکا افغانستان پر عملاً قبضہ کر چکا تھا اور صدر ربش کی عالمگیر جنگ کا ایک بہت بڑا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ آگے چلنے سے پہلے ہم اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتے چلیں کہ امریکا کی اس مہم جوئی کے بنیادی مقاصد چار تھے:

① مستقبل قریب میں مسلم دنیا کو عسکری، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی طور پر ابھرنے سے روکنا۔ کیونکہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کے آثار دن بدن واضح ہوتے جا رہے تھے۔ امریکا اس خطرے کی روک تھام کرنا چاہتا تھا۔

② اسلامی دنیا کے قدرتی وسائل اور معدنی دولت پر قبضہ جمانا۔ کیونکہ اگر مسلم ممالک بیدار ہو کر از خود ان وسائل سے استفادے کی صلاحیت حاصل کر لیتے تو امریکا اور مغربی ممالک منہ دیکھتے رہ جاتے۔

③ القاعدہ اور طالبان سمیت اپنی عالمگیریت کے راستے میں مزاحم ہر عسکری طاقت کو نیست و نابود کرنا۔

④ وسط ایشیا سے تیل اور گیس کے ذخائر اپنے ہاں منتقل کرنے کے لیے پائپ لائن منصوبوں کو جلد از جلد شروع کرنا۔

طالبان کے سقوط اور عبوری حکومت کے قیام کے بعد چند دن امریکا اور اس کے اتحادیوں کے لیے بڑے آرام اور اطمینان کے تھے۔ وہ خوابوں کی دنیا میں اگلی منازل کے ستاروں پر کندین ڈال رہے تھے تاہم ابھی کچھ خدشات باقی تھے۔ سب سے بڑا خدشہ طالبان اور القاعدہ قیادت سے تھا جن کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ امریکا سب سے پہلے اس طرف سے اطمینان چاہتا تھا۔

طالبان قیادت کی تلاش میں آپریشن: چنانچہ سب سے پہلے بلند کے پہاڑوں میں طالبان سربراہ

ملا محمد عمر کی تلاش شروع ہو گئی۔ مشکل یکم جنوری 2002ء کو قندھار کے نئے گورنر گل آغا کی قیادت میں آپریشن کا آغاز ہوا۔ امریکی فوج بھی 50 ٹینکوں اور درجنوں طیاروں کے ساتھ اس مہم میں شریک تھی۔ جاسوسوں کی اطلاعات یہ تھیں کہ اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر "بغران" کے علاقے میں روپوش ہیں۔ چنانچہ کئی دنوں تک علاقے کا محاصرہ کر کے گھر گھر تلاشی لی گئی۔ مگر ملا محمد عمر عین وقت پر ایک ساتھی کے ہمراہ موٹر سائیکل پر سوار ہو کر دشمنوں کے نرغے سے دور نکل گئے تھے۔ اسامہ بن لادن کا کچھ ہمتہ چلا۔ دینی مدارس کی بندش: کرزئی اور امریکا جانتے تھے کہ طالبان کو دینی مدارس نے جنم دیا تھا اور ان کے مراکز ہوتے ہوئے طالبان کو ختم کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ طالبان کے خلاف آپریشن کا دائرہ کار بڑھانے سے قبل نئی افغان حکومت نے ملک بھر میں ایک ہزار دینی مدارس کو بند کر دیا۔ کچھ اس قسم کی پیش رفت حکومت پاکستان بھی کرنے پر تلی تھی کیونکہ امریکا پاکستان پر مدارس کا کردار محدود کرنے کے لیے مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا۔ تاہم پاکستان میں دینی مدارس کے متحدہ پلیٹ فارم سے حکومتی دباؤ کا نہایت پامردی اور حکمت عملی سے مقابلہ کیا گیا اور مدارس کا کردار حسب سابق بحال رہا۔

گوانتا ناموبے کا عقوبت خانہ: ان دنوں افغانستان سے بہت دور کیوبا کے الگ تھلگ اور ویران جزیرے گوانتا ناموبے میں ایک بہت ناک عقوبت خانہ تیار کیا جا رہا تھا۔ 45 مربع میل کے اس جزیرے سے کسی قیدی کا فرار ہونا ناممکن تھا۔ یہاں نگریت کے فرش اور آہنی سلاخوں والے سینکڑوں پنجرے بنالیے گئے تھے جن میں طالبان اور القاعدہ کے خصوصی قیدیوں کو لانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ قید خانے کا احاطہ 4 میل سے زیادہ وسیع تھا۔ اس کے چاروں طرف کانٹے دار تاروں کی دیوار تھی۔ امریکا سے اس جگہ کا فاصلہ 80 میل کے لگ بھگ ہے۔

کیوبا 19 ویں صدی عیسوی سے امریکا کے زیر تسلط ہے۔ کیوبا کے باشندوں کی تحریک آزادی کے نتیجے میں 1901ء میں امریکی فوج کیوبا سے نکل تو گئی تھی مگر معاہدے کے مطابق یہاں بحری اڈہ بنالیا تھا اور اب 2002ء میں یہاں اسکورے کمپ بھی بنالیا گیا۔ اس کمپ کے قیدیوں کے بارے میں کوئی عدالتی ٹریبونل سماعت نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ امریکا میں رائج شہری حقوق کا یہاں اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

جنوری 2002ء کے اواخر میں القاعدہ اور طالبان کے 353 افراد کو یہاں منتقل کر دیا گیا۔ سخت ترین سردی اور باد و باران کے دوران وہ پنجروں میں کپکپا رہے تھے۔ ان قیدیوں پر تشدد کے وہ طریقے آزمائے جا رہے تھے جن سے دنیا اب تک نا آشنا تھی۔ قیدیوں کے پانچوں حواس معطل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے۔ منہ پر ٹیپ لگا دی گئی تھی۔

ہاک پر ماسک چڑھا دیا گیا تھا۔ آنکھیں اندھے سیاہ شیشوں سے ڈھانپ دی گئی تھیں۔ کانوں پر ساؤنڈ پروف کن نوپ چڑھا دیے گئے تھے۔ اب وہ چل سکتے تھے نہ بول سکتے تھے، نہ دیکھ سکتے تھے نہ سن سکتے تھے اور نہ ہی کچھ سوچ سکتے تھے۔ انہیں دودو گز کے چھوٹے چھوٹے بنجروں میں اکڑوں بٹھا دیا جاتا تھا۔ وہ کئی کئی دن تک اسی ہیئت میں پڑے رہتے تھے۔ یہاں انسانیت کی وہ تذلیل ہو رہی تھی جس پر ہر انسان سبک کر رہ جاتا تھا۔ ”جنیوا کنونشن“ کے مطابق قیدیوں کو جو مراعات حاصل تھیں، گوانتا نامو بے میں ان کو سراسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

القاعدہ اور طالبان کی تنظیم نو: افغانستان کے حالات پر نگاہیں جمائے ہوئے مبصرین جانتے تھے کہ القاعدہ اور طالبان یہاں اب بھی موجود ہیں اور خود کو منظم کر رہے ہیں تاہم اندازہ یہ تھا کہ انہیں منظم ہو کر دفاعی اور مزاحمتی کارروائیاں شروع کرنے میں دو تین سال لگ جائیں گے۔ دراصل مغربی مبصرین یہ گمان کرتے تھے کہ عوام میں طالبان کی جڑیں کمزور ہیں اور وہ گزشتہ سات سال تک زبردستی لوگوں پر مسلط رہے تھے۔ القاعدہ کے بارے میں ان کی رائے اس سے زیادہ بڑی تھی۔ مگر یہ تمام اندازے اور قیاسات جنوری 2002ء کے شروع ہی میں چکنا چور ہو گئے۔

القاعدہ نے تو راپوڑا سے نکلنے کے ایک ماہ کے اندر اندر اپنی کارروائیوں کا از سر نو آغاز کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا اور مغربی مبصرین گنگ ہو گئے۔ سب سے پہلے قذافی رپورٹ پر ایک عرب مجاہد نے اپنا جنگ خود کش حملہ کر کے کئی امریکیوں کو ہلاک کر دیا۔ یہ کارروائی جنوری 2002ء کے پہلے ہفتے میں ہوئی تھی۔ اگلے ہفتے القاعدہ کے اہم راہنما ایمن الظواہری کا میڈیا پر تہلکہ خیز انٹرویو نشر ہوا۔ ایمن الظواہری نے اعلان کیا کہ طالبان اور القاعدہ کے تمام اہم راہنما محفوظ اور خیریت سے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اصل جنگ تو اب شروع ہوئی ہے۔

جنوری 2002ء کے آخری ہفتے میں خواست میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر مار گیا۔ اس میں سوار 25 کمانڈوز ہلاک ہو گئے۔ یہ کارروائیاں اس بات کا ثبوت تھیں کہ امریکی قبضے کے خلاف تحریک مزاحمت کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔

کرزئی کا دورہ پاکستان: امریکا کو شک تھا کہ حکومت پاکستان کرزئی حکومت سے مطمئن نہ ہونے کے باعث طالبان یا القاعدہ کو منظم ہونے میں خفیہ طور پر مدد دے سکتی ہے تاکہ افغانستان میں ایک بھارت نواز حکومت مستحکم نہ ہو سکے۔ امریکا کے نزدیک اس کا حل یہی تھا کہ کرزئی حکومت اور پاکستان میں اعتماد کا رشتہ قائم کیا جائے۔ چنانچہ فروری 2002ء کے وسط میں افغان حکمران حامد کرزئی اور وزیر خارجہ عبداللہ

عبداللہ پاکستان کا دورہ کرتے نظر آئے۔ انہوں نے صدر پرویز مشرف سے ملاقات کی اور نئے رشتوں کی بنیاد ڈالنے پر اتفاق کیا۔ عبداللہ نے پاکستان کے خلاف بیان بازی پر بند امت کا ہر کی۔

حکمت یار کی حکمت عملی: روس کے خلاف جہاد افغانستان کے ایک اہم کردار گلبدین حکمت یار طالبان کے دور حکومت میں ایران منھل ہو گئے تھے اور اب بھی وہیں پناہ گزین تھے۔ حامد کرزی نے پاکستان سے رشتے استوار کرنے کے ساتھ ساتھ گلبدین حکمت یار کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بھی کی۔ گلبدین حکمت یار نے کرزی سے تعاون کی گفت و شنید کے لیے حزب اسلامی کے ترجمان قطب الدین ہلال اور کمانڈر خالد فاروقی کو اپنا نمائندہ بنا کر کابل بھیجا۔ یہ فروری 2002ء کے آخری عشرے کی بات ہے۔ حکمت یار نے تعاون کے لیے دو بنیادی شرائط پیش کی تھیں: (1) غیر ملکی افواج کے انخلاء کی حکمت عملی طے کی جائے۔ (2) ملک میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔ کرزی نے ان دونوں شرائط پر عملدرآمد کو ناممکن بتایا، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ پیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

گل آغا کو ملا عمر کی دھمکی: قندھار میں ان دنوں مجاہدین اور طالبان کی بڑی تعداد قید تھی جن پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ انہیں امریکا کے حوالے کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ قندھار کا نیا گورنر گل آغا مقامی لوگوں کو طالبان کی حمایت کے شیعے میں طرح طرح کی اذیتیں دے رہا تھا۔ مارچ کے پہلے عشرے میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اپنی روپوشی کے بعد پہلا بیان دیا اور وائٹ ہس پر گل آغا کو مخاطب کر کے کہا: ”مجاہدین کو امریکا کے حوالے کرنے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ مجاہدین پر اتنا ظلم کرو جتنا آنے والے وقت میں خود برداشت کر سکو۔“ گل آغا پر اس دھمکی سے ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ سرحد عبور کر کے کوئٹہ اور پھر وہاں سے کسی نامعلوم مقام کی طرف فرار ہو گیا۔ ملا محمد عمر کے اس پیغام سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ طالبان اور ان کی قیادت محفوظ ہے اور جوانی کا رروائیوں کی قوت رکھتی ہے۔

شاہی کوٹ کا معرکہ: طالبان نے موسم بہار تک خود کو ایک بھرپور مزاحمتی قوت میں تبدیل کر لیا۔ ان کی جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ محاذ جنگ کو جنوبی افغانستان سے لے کر مشرقی صوبوں تک پھیلا دیا جائے، دشمن کی خود آک ورسد کے راستے اور سپلائی لائن منقطع کر دی جائے اور شاہراہوں پر قبضہ کر کے اتحادیوں کی نقل و حرکت کو محدود کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہزاروں طالبان کا رکن عام شہریوں کے بھیس میں افغان فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ ان کے خبر اور جاسوس بھی ہر طبقہ زندگی خصوصاً سرکاری اداروں میں کھل مل گئے تھے۔ یہ ان کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہیں ہوا کیونکہ آخر وہ اسی ملک کے باشندے تھے۔ ان تیاریوں کے نتیجے میں مارچ 2002ء کے آغاز میں طالبان نے قندھار میں 500 ٹن ایلے

اور مولہ بارود کا عظیم ذخیرہ تباہ کر دیا۔ اس کے فوراً بعد مشرقی افغانستان کا صوبہ گردیز میدان جنگ بن گیا۔ جہاں طالبان کے تازہ دم دستوں نے امریکی اور اتحادی افواج سے ایک یادگار نگرلی۔

طالبان کی قیادت نامور جہادی لیڈر مولانا نصر اللہ منصور کے جواں سال صاحبزادے کمانڈر سیف اللہ منصور کر رہے تھے۔ طالبان کے علاوہ 120 عرب اور 200 چیچن مجاہدین ان کے ساتھ تھے۔ اس جنگ کا دائرہ شامی کوٹ، زرمت اور کنڈاؤ کے پہاڑوں تک پھیل گیا۔ ابتدا میں امریکا نے افغان سرکاری سپاہیوں اور اپنی بری فضائی افواج کے ساتھ یہاں طالبان کے خلاف ایک بڑا آپریشن شروع کیا جس میں پورا ایک بریگیڈ حصہ لے رہا تھا۔ اسے ”آپریشن اناکوائڈ“ کا نام دیا گیا۔ امریکی بی بادن طیاروں نے طالبان کے ٹھکانوں پر تھر مو بیر کی بم پھینکے جو فضا سے آکسیجن جذب کر کے تمام جانداروں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ تاہم طالبان کی بڑی تعداد اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد کے طفیل محفوظ رہی۔

اس کے بعد جب امریکی فوجوں نے زمینی کارروائی شروع کی تو گھات میں چھپے طالبان نے ان پر حملہ کر دیا۔ امریکیوں کی درجنوں لاشیں گریں اور وہ جان بچا کر بھاگنے لگے۔ جلد ہی انہوں نے پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ دوسرا حملہ کیا۔ اس بار امریکی افواج کے ساتھ آسٹریلیا، کینیڈا، جرمنی، فرانس اور ناروے کی فوجیں بھی شامل تھیں جن کی مجموعی تعداد 6 ہزار سے زائد تھی۔ مجاہدین نے اب بھی ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ وہ دشمن کی سپلائی کاٹنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ امریکی فضائیہ کے مقابلے میں مجاہدین نے پہلی بار میزائل بھی استعمال کیے جن سے وہ ایک بی بادن طیارہ، ایک سی 130 طیارہ، ایک گم طیارہ اور 12 ہیلی کاپٹر گرانے میں کامیاب رہے۔ آخر کار امریکیوں اور اتحادیوں کو اس علاقے سے نکلنے کے لیے مزید ہیلی کاپٹر منگوانا پڑے۔ مجاہدین نے امریکی فوج کے 18 افراد قیدی بھی بنالے۔ دس دن کی خونریز جنگ کے بعد اتحادی نہایت افراتفری کے عالم میں کم از کم 89 لاشیں چھوڑ کر فرار ہوئے۔ (بعض ذرائع 200 لاشیں بتاتے ہیں) ان کے زخمیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ خواست کا ہسپتال زخمیوں سے بھر گیا۔

امریکی فوج اس کے بعد مشرقی اور جنوبی افغانستان میں بالکل نہ ٹک سکی۔ تمام امریکی فوری طور پر قندھار اور خوست اور گردیز سے بگرام کی طرف کوچ کر گئے۔ آپریشن اناکوائڈ کے کمانڈر میجر جنرل فریک بیگن نے ہم کی ناکامی کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ ہم طالبان کی تعداد، قوت اور اسلحے کے بارے میں صحیح معلومات حاصل نہ کر سکنے کے باعث اپنے اہداف حاصل نہ کر سکے۔ امریکا کے لیے شامی کوٹ کے سر کے میں گرفتار ہونے والے 18 امریکی فوجیوں کی بازیابی بہت اہم تھی۔ اس نے طالبان سے

اس بارے میں مذاکرات شروع کر دیے۔ طالبان نے بدلے میں کیوبا میں قید 352 القاعدہ اور طالبان ارکان کی رہائی اور آپریشن اناکوانڈا میں شہید ہونے والے مجاہدین اور شہریوں کا خون بہا ادا کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ امریکا خون بہا ادا کرنے پر تیار ہو گیا جو 5 ملین ڈالر جتا تھا۔ تاہم کیوبا سے 352 قیدیوں کی بجائے اس نے 18 امریکیوں کے بدلے 18 قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادگی ظاہر کی جسے طالبان نے مسترد کر دیا۔

شامی کوٹ کے اس تاریخی معرکے کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ دنیا پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ طالبان ایک زندہ حقیقت ہیں جو نہ صرف اپنے دفاع پر قدرت رکھتے ہیں بلکہ زہنی جنگ میں امریکا اور اس کے اتحادیوں پر بھاری پڑ سکتے ہیں۔ لوگوں کی طالبان سے وابستہ شکستہ امیدیں پھر سے جوان ہونے لگیں۔ افغان عوام کو یہ احساس ہونے لگا کہ امریکی ناقابل شکست نہیں اور ان کے وطن کی حفاظت کرنے والے ابھی زندہ ہیں۔

اپریل کے آخری ہفتے میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ قندھار سے 25 کلومیٹر دور ایک گاؤں میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر مجاہد اچانک نمودار ہوئے۔ لوگوں نے انہیں پہچان لیا اور ان کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ لوگ والہانہ عقیدت کے ساتھ ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ ملا عمر نے گاؤں کے قبرستان میں حال ہی میں شہید ہونے والے ایک مجاہد ملا نیک محمد کی قبر پر دُعا کی اور پھر جس طرح آئے تھے اسی طرح کہساروں کی آغوش میں غائب ہو گئے۔

کابل کی صورت حال: کہساروں اور وادیوں میں طالبان کی نئی صف بندی کے ان دنوں میں کابل، جلال آباد اور قندھار میں خاموشی کا راج تھا۔ یہاں امریکی اور اتحادی فوجوں کا راج چلتا تھا۔ ان کی مرضی کے بغیر عبوری حکومت کا کوئی پرزہ نہیں مل سکتا تھا۔ کابل میں رات 10 بجے سے صبح 6 بجے تک کرفیو لگا رہتا تھا۔ امریکی فوج نے شمالی اتحاد اور کابل پولیس کو پابند کر رکھا تھا کہ ان کے کارکن شہر میں مسلح ہو کر گشت نہیں کر سکتے۔ کرزئی کا قندھاری گرد پ بھی بے دست و پا نظر آتا تھا۔ کابل میں 40 لکھوں کے سفارت خانے کھل گئے۔ یہ اتحادیوں کے لیے اوپن سٹی تھا۔ ڈالر عملی طور پر افغانستان کا سکہ بن چکا تھا۔ شہر میں سہولیات کا عالم یہ تھا کہ اپریل 2002ء میں پورے کابل میں صرف ایک پبلک کال آفس نظر آتا تھا۔ اپریل میں امریکا نے ایک بار پھر مشرقی افغانستان میں فوج بھیجی۔ 1800 سپاہی خواست پہنچ گئے مگر وہ اپنی حفاظت کے لیے زیادہ فکر مند تھے۔ 15 اپریل کو امریکی فوج کے دستے پر ریموٹ بم حملہ ہوا جس میں دس فوجی مارے گئے۔

پاکستان کے مسائل: کابل میں بھارت کا اثر و رسوخ بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ نے افغانستان میں کئی تربیتی مراکز قائم کر لیے تھے جہاں دہشت گردوں کو تربیت دے کر پاکستان بھیجا جانے لگا تھا۔ طالبان کے دور میں بھارت افغانستان میں ایسی مراعات پانے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس موسم گرما تک بھارتی افواج پاکستان کی مشرقی سرحدوں پر جمع رہیں اور پاکستان مغربی سرحدوں سے افواج کم کر کے مشرقی سرحدوں پر لاتا رہا۔ یہ صورت حال امریکا کے لیے ناخوشگوار تھی کیونکہ وہ پاکستانی افواج کو طالبان اور القاعدہ ارکان کی روک تھام کے لیے افغان سرحدوں پر رکھنا چاہتا تھا، چنانچہ صدر بش نے دباؤ ڈال کر بھارت کو حملے سے باز رکھا اور دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں سے پیچھے ہٹ گئیں۔

جنگ کا خطرہ تو کس کیا مگر پاکستان میں ان بھارتی تخریب کاروں کا دائرہ کار بڑھتا چلا گیا جو افغانستان سے تربیت لے کر پاکستان میں بم دھماکے کر رہے تھے اور علیحدگی پسند تحریکوں کو ہوا دے رہے تھے۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں شمالی اتحاد اور دیگر گروہوں کے جنگجو پاکستان میں گھس کر لوٹ مار، اغوا برائے تادان، ہارگٹ کلنگ، رہزنی اور ڈکیتی جیسے جرائم کر کے ملک کے امن و امان کو متدبلا کر رہے تھے۔

”لوہیہ جرگہ“ کی تاریخ: یون کانفرنس کے فیصلے کے تحت عبوری حکومت کو چھ ماہ کے لیے اختیارات دیے گئے تھے۔ طے یہ ہوا تھا کہ چھ ماہ بعد ”لوہیہ جرگہ“ کا انعقاد ہوگا جس میں ایک وسیع اہلیاء حکومت تشکیل دی جائے گی جو ملک میں جمہوریت کی راہ ہموار کرے گی۔ چنانچہ مئی 2002ء میں لوہیہ جرگہ کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دی گئیں۔

یاد رہے کہ لوہیہ جرگہ صدیوں سے افغانستان کی سیاسی روایات کا ایک اہم حصہ رہا ہے جس میں قبائلی سردار جمع ہو کر ملک و قوم کے بڑے بڑے مسائل کے فیصلے اتفاق رائے سے کیا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے 1211ء میں یوسف زئی پشتونوں نے پشاور سے قندھار ہجرت کرنے کا فیصلہ کرنے کے لیے ”لوہیہ جرگہ“ بلایا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ جاری چلا آ رہا ہے۔ دوسرا لوہیہ جرگہ 1413ء میں منعقد ہوا۔ تیسرا 1570ء میں مغلوں کے خلاف پشتونوں کو متحد کرنے کے لیے ہوا۔ چوتھا 1707ء میں میردیس نے ایران کے خلاف مزاحمت کے لیے بلوایا۔ پانچواں لوہیہ جرگہ اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ اس میں احمد شاہ ابدالی نے افغانستان کو باقاعدہ ایک مملکت کی شکل دی تھی۔ چھٹا لوہیہ جرگہ ابدالی کے وارث تیمور شاہ نے 1792ء میں طلب کیا اور پایہ تخت کابل سے قندھار منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساتواں لوہیہ جرگہ 1841ء میں برطانیہ سے جہاد پر اتفاق رائے کے لیے منعقد ہوا۔ آٹھواں لوہیہ جرگہ 1916ء میں حاکم افغانستان امیر حبیب اللہ خان نے پہلی جنگ عظیم میں افغانستان کی خارجہ پالیسی

طے کرنے کے لیے بلوایا۔ نويس، دسویں اور گیارہویں لویہ جرگے کا انعقاد امیر امان اللہ نے 1922ء، 1924ء اور 1928ء میں کروایا۔ ان میں سے پہلے میں نئے آئین کی منظوری دی گئی۔ دوسرے میں سابقہ افغان پالیسیوں کا جائزہ لیا گیا اور تیسرے میں اپنی حکومت کی چار سالہ کارکردگی پر غور کیا گیا۔ بارہواں لویہ جرگہ نئے حکمران نادر شاہ کی بادشاہت کی توثیق کے لیے تھا۔ تیرھویں، چودھویں، پندرھویں اور سولہویں لویہ جرگے کا انعقاد ظاہر شاہ نے کیا تھا۔ ان میں سے پہلا 1941ء میں جرمن شہریوں کے بارے میں فیصلے کے لیے تھا۔ دوسرا 1952ء اور تیسرا 1955ء میں منعقد ہوا جن میں پاکستان سے متصل قبائلی علاقہ جات کے بارے میں بحث کی گئی۔ چوتھا 1964ء میں بلو اکڑ ظاہر شاہ نے اپنی بادشاہت کی توثیق کی۔ سترھواں لویہ جرگہ 1977ء میں دلاؤ دخان نے بادشاہت کے خاتمے کے بعد جمہوری ریاست کے قیام کے لیے بلوایا تھا۔

2002ء کا لویہ جرگہ: اب 2002ء میں اٹھارہواں لویہ جرگہ امریکا کی سرپرستی میں افغانستان میں عالمی طاقتوں کی من پسند حکومت کے قیام کے لیے منعقد کیا جا رہا تھا۔ جوں جوں جرگے کے دن قریب آرہے تھے ملک میں سیاسی جوڑ توڑ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ احمد شاہ مسعود کی وارث سیاسی پارٹی جو ”شورائی نظاڑ“ کے نام سے کام کر رہی تھی توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکی تھی۔ جنرل قاسم فقیم، ڈاکٹر عبداللہ اور یونس قانونی نے جو اس کے اہم ترین رکن تھے، پروفیسر برہان الدین ربانی سے الگ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ برہان الدین ربانی اب بھی صدارت کے امیدوار تھے مگر ان کی دال گھٹی نظر نہیں آتی تھی۔

ظاہر شاہ کی واپسی: حکمرانی کے اہم امیدوار سابق بادشاہ ظاہر شاہ گزشتہ 29 برس سے روم میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ حامد کرزی کی خود انہیں لینے اٹلی گئے۔ 17 مارچ 2002ء کو ظاہر شاہ نے ایک بار پھر افغانستان میں قدم رکھا، مگر یہاں ان کے لیے نفرت کی فضا تھی۔ شمالی اتحاد ظاہر شاہ کو ایک ہل کے لیے برداشت کرنے کا روادار نہیں تھا۔ اس کشیدگی کے پیش نظر ظاہر شاہ کی جان کی حفاظت کے لیے سخت ترین سکیورٹی کا انتظام کیا گیا اور ان کی تمام ملاقاتیں منسوخ کر دی گئیں۔ اس ناسازگار ماحول کے باوجود ظاہر شاہ کو امید تھی کہ لویہ جرگہ کے ذریعے وہ اقتدار کا پیچھی قابو کر لیں گے، کیونکہ مجددی اور گیلانی کے علاوہ ان دونوں حزب اسلامی بھی ان کی حمایت پر آمادہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد اگر امریکا کی نظر کرم ہو جاتی تو دوبارہ حکمران بننا کوئی مشکل نہ تھا۔

جرگہ میں تاخیر کی وجوہ: لویہ جرگہ کے انعقاد میں دیر ہوتی چلی گئی۔ وجہ یہ تھی موسم گرما شروع ہوتے ہی ملک میں جگہ جگہ مقامی کمانڈروں نے ایک دوسرے کے خلاف مورچے بنالے تھے اور مسلح جھڑپیں

شروع ہو گئی تھیں۔ مئی 2002ء کے پہلے عشرے میں شمالی افغانستان میدان جنگ بن گیا۔ رشید دوستم اور کمانڈر عطا کی فوجیں باہم ٹکرانے لگیں۔ اگر اقوام متحدہ وقت کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے بلاتلاخ بیڑج میں کود کر تعفیہ نہ کراتی تو جنگ بہت طول پکڑ سکتی تھی۔ ادھر مشرقی افغانستان میں حامد کرزئی کی طرف سے خوست اور گردیز کا مقرر کردہ سابق گورنر باچا خان ان مقامی کمانڈروں سے برسر پیکار تھا جنہوں نے اسے گورنر ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ باچا خان ایک ظالم دجا بر انسان ہے۔ اس لڑائی میں بے دریغ راکٹ فائر کیے گئے جس سے ایک سو کے قریب بے گناہ شہری جاں بحق ہو گئے۔ یاد رہے کہ باچا خان کو بون کانفرنس میں تشکیل دی گئی حکومت میں خوست کا گورنر مقرر کیا گیا تھا مگر دو ماہ بعد (فروری 2002ء کے اواخر میں) حامد کرزئی نے اسے آئی ایس آئی سے روابط کے الزام میں عہدے سے برطرف کر دیا تھا۔ باچا خان نے برطرفی کے احکام مسترد کر دیے اور علاقے پر حکومت کا دعوے دار رہا جس کے بعد مقامی کمانڈروں سے اس کی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

اٹھارہویں لویہ جرگے کی روداد: آخر کار جون 2002ء کے پہلے عشرے میں افغانستان کا اٹھارہواں لویہ جرگہ منعقد ہوا۔ اس جرگے میں 1575 نمایندگان نے شرکت کی۔ یہ جرگہ دو لحاظ سے منفرد تھا:

① اس کا انعقاد ایک غیر ملکی طاقت کے اشارے پر ہو رہا تھا۔

② پہلی بار خواتین بھی جرگے میں حصہ لے رہی تھیں جن کی تعداد 200 تھی۔

بون کانفرنس کی طرح جرگے کے تمام مندوبین بھی امریکی منصوبہ بندی کے تحت مدعو کیے گئے تھے جن سے توقع تھی کہ وہ امریکا کی من پسند حکومت تشکیل دینے میں پورا تعاون کریں گے۔ اس کے باوجود جرگہ ابتدائی میں اس وقت اختلافات کا شکار ہو گیا جب ظاہر شاہ نے حامد کرزئی کے مقابلے میں دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔ ادھر برہان الدین ربانی بھی دامن میں بہت سی امیدیں لیے کھڑے تھے۔ شمالی اتحاد ظاہر شاہ کو قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا، جبکہ ربانی کو کسی کی بھی حمایت حاصل نہیں تھی۔ جرگے کی ایک نشست میں ایک خاتون رکن ”تاجور کاکز“ نے برہان الدین ربانی پر کھلم کھلا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ وہ کامل چھوڑنے وقت محل کی تمام قیمتی چیزیں، ہیرے جواہرات، قدیم نوادرات حتیٰ کہ صدارتی کرسی تک چُرا کر اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ربانی نے ان الزامات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جرگے کے دوران شمالی اتحاد کی غنڈہ گردی کے کئی مناظر دیکھنے میں آئے۔ شمالی اتحاد کے جنگجو اپنے مخالفین کے گھروں پر بے دریغ حملے کرتے اور ان کے اہل خانہ کو ذلتیں پہنچاتے رہے۔

امریکا ہر صورت میں اپنے منظور نظر حامد کرزئی کو حکمران دیکھنا چاہتا تھا اس لیے امریکی نمائندے زلے

خلیل زاکو کو بیچ میں آنا پڑا۔ اس نے ظاہر شاہ اور برہان الدین ربانی کو ہٹ دھرمی کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا۔ اس دباؤ کے نتیجے میں دونوں امیدوار چپ چاپ دست بردار ہو گئے۔ جرگے کے ارکان نے حامد کرزی کو اتفاق رائے سے 2004ء کے جمہوری انتخابات تک قوم کا نمائندہ حکمران چن لیا۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق اس اتفاق رائے کے لیے جرگے کے ہر رکن کو 20، 20 ہزار امریکی ڈالر دیے گئے تھے۔ عین اس وقت جبکہ حامد کرزی نئی جج جج سے تخت کا بل کے حکمران کے طور پر منتخب ہو رہے تھے۔ القاعدہ کے جانباڑوں نے اسٹینگر میزائل سے امریکا کا ایک جنگی طیارہ (جس کی قیمت 45 ملین ڈالر تھی) مار گرایا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ اصل معرکہ جس قوت کے ساتھ برپا ہے اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

لوہیہ جرگے سے طالبان کے خدشات: طالبان کو ”لوہیہ جرگہ“ سے کئی خدشات لاحق تھے۔ اس جرگے کا تاریخی پس منظر اور افغانوں میں اس کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس میں کیا کیا فیصلہ پوری قوم کا فیصلہ شمار ہوگا جس سے سرتابی کرنے والا قومی دھارے سے کٹ جائے گا۔ اگر امریکی پالیسی سازوں میں حقائق کو سمجھنے اور ان کا سامنا کرنے کی اہلیت ہوتی یا وہ افغانستان کے ذرا بھی ہمدرد ہوتے تو لوہیہ جرگہ کے ذریعے طالبان کی ابھرتی ہوئی مزاحمتی تحریک کو کمزور کیا جاسکتا تھا مگر یہ اس صورت میں ہو سکتا تھا جب لوہیہ جرگہ میں تمام قوموں، گروہوں اور طبقات کو مناسب نمائندگی دی جاتی۔ خصوصاً پشتونوں کو ان کی مردم شماری کے مطابق حکومت سازی میں شامل کیا جاتا۔ مجاہدین اور علمائے دین کو بھی حصہ دیا جاتا۔ مگر امریکا نے جرگے میں صرف اپنے من پسند افراد کو شامل کیا۔ مناسب نمائندگی کا ذرا برابر خیال نہیں رکھا۔ پشتونوں کو نظر انداز کر کے شمالی اتحاد کو حکومت میں غالب حصہ دے دیا۔ ان وجوہ کی بنا پر لوہیہ جرگہ کے فیصلوں کو افغان قوم میں وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو ماضی کے جرگوں کی تھی۔ رائے عامہ نے اسے امریکی جرگہ اور امریکی فارمولہ قرار دیا۔ یوں طالبان کو لاحق وہ شدید خطرہ ٹل گیا جو ان کی تحریک کو سبوتاژ کر سکتا تھا۔

حامد کرزی کی شخصیت: طالبان کے لیے دوسرا بڑا خطرہ خود حامد کرزی کی شخصیت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ امریکا کا انتخاب لا جواب تھا۔ حامد کرزی میں جو خصوصیات تھیں، ان کا ہم البدل تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ کرزی پولوی قبیلے کے فرزند ہیں جو طالبان کے مرکز قندھار اور جنوبی افغانستان میں بھرپور اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ وہ ماضی میں جہادی گروپوں سے بھی وابستہ رہے۔ انہیں نجیب یا کارمل سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی کیونکہ وہ طحہ بیدعتیہ نہیں بلکہ عام افغانوں کی طرح بڑی حد تک روایتی اسلامی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے پر شخصی ڈاڑھی بھی ہے جو کسی نہ کسی درجے میں ان کے روایت پسند ہونے

کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ پشتو، دری اور انگریزی کے علاوہ اُردو، ہندی اور فرنچ زبانوں کے بھی ماہر ہیں۔ انہیں بین الاقوامی تعلقات بنانے کا فن خوب آتا ہے۔ بچتوں ہونے کی حیثیت سے وہ جنوب اور مشرقی صوبوں کے لیے قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے کرزئی عوامی مقبولیت حاصل کر کے طالبان کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔ اس لیے طالبان نے شروع ہی میں کرزئی کو راستے سے ہٹا دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ان کی جانب سے کرزئی کو قتل کرنے کے لیے وقفے وقفے سے خطرناک کارروائیاں ہوتی رہیں۔

طالبان کے علاوہ خود حکومت میں شامل شمالی اتحاد بھی کرزئی کی جان کا دشمن تھا اور وہ بھی کرزئی کو مارنے کے لیے سازشیں تیار کرتا رہتا تھا۔ ہم حامد کرزئی کو دنیا کے ان حکمرانوں میں شمار کر سکتے ہیں جن کے لیے سکیورٹی خطرات سب سے زیادہ تھے۔ تاہم کرزئی کے حفاظتی انتظامات بھی دنیا بھر میں اعلیٰ ترین تھے کیونکہ یہ ذمہ داری خود امریکا کی تھی۔ امریکی ایجنسیاں اور اہلکار کرزئی کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کے منصوبوں کا اکثر بروقت پتا لگا کر ان کی جان بچا لیتے تھے..... مگر یہی امریکا کی نوازشات کرزئی کی سب سے بڑی خامی شمار ہوتی تھیں۔ اس بنا پر وہ عوام میں امریکا نوازشمار ہوتے رہے اور انہیں طالبان جیسا خراج تحسین کبھی نہ مل سکا۔



مآخذ و مراجع

- ♣..... ہفت روزہ ضربِ مؤمن، جلد 5، 6، 7
- ♣..... ہفت روزہ یکسیر، فرامیڈے اسٹیشن، غازی: جلد 2002ء، 2003ء
- ♣..... قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد۔ 2002ء، 2003ء
- ♣..... روزنامہ اسلام کراچی 2002ء، 2003ء

سینیٹرواں باب

طالبان امریکا سے خبر دآزما

افغانستان میں تین سال کے لیے سیاسی سیٹ اپ بنا کر امریکا خاصا مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ افغان عوام اور دنیائے اسلام کی نظروں میں دھول جھونکنے میں کامیاب رہا ہے تاہم اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر کو گرفتار کرنے میں ناکامی امریکیوں کو چین نہیں لینے دیتی تھی۔ امریکی افواج نے اس سختی سے سمجھایا کہ بے قصور افغان عوام کو ہوائی حملوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

جولائی 2002ء کے آغاز میں امریکی بی باؤن طیاروں نے ارزگان میں شادی کی ایک تقریب پر اندھا دھند بمباری کی جس سے دولہا اور دلہن سمیت 400 افراد شہید ہو گئے۔ اس سگندلی پر افغان عوام چیخ اٹھے۔ دنیا بھر کے میڈیا پر نشر ہونے والی اس خبر سے امریکا کا اصل بھیا تک چہرہ سامنے آ گیا۔ ملا محمد عمر نے اس واقعے کے بعد اپنے بیان میں امریکا کو خبردار کرتے ہوئے کہا:

”جنگ کی آگ وائٹ ہاؤس تک ضرور پہنچے گی۔“

انہوں نے اسامہ بن لادن کی تلاش میں امریکا کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

”اسامہ بن لادن خیریت سے ہیں اور ان کی خیریت کا ثابین کر بش کے دل میں چھتی رہے گی۔“

جنگجو سرداروں کی حکومت مخالف کارروائیاں: جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ حامد کرزئی کو یہ جرگہ کے ذریعے تخت کا بل کا حق حاصل کرنے کے باوجود جنگجو کمانڈروں کی حمایت پانے سے محروم ہیں۔ خواست کا گورنر باچا خان کھل کر کہہ رہا تھا کہ لو یہ جرگہ کے ذریعے اقلیت کو 90 فیصد افغانوں پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ اس نے میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: ”حامد کرزئی امریکی ایجنٹ ہے جسے ہٹانا ضروری ہے۔“ جنگجو سرداروں کی باہمی ناچائیاں ٹارگٹ کلنگ کے روپ میں ظاہر ہو رہی تھیں۔ جولائی کے وسط میں نگرہار کے گورنر حاجی عبدالقدیر خان کو سرکاری دفتر سے رہائش گاہ جاتے ہوئے دن دیہاڑے قتل کر دیا گیا۔ اس حملے کا الزام وزیر دفاع جنرل فہیم قاسم پر لگایا جا رہا تھا۔ خود حامد کرزئی کے قتل کے کئی

منصوبے طشت از بام ہو چکے تھے۔

ملک میں امن وامان بدستور ناپید تھا۔ اگست کے آخری ہفتے میں باچا خان نے 6 ہزار جنگجوؤں کے ساتھ جنوبی افغانستان میں بڑے پیمانے پر لوٹ مار شروع کر دی اور کئی شاہراہوں کو بند کر دیا۔ کرزئی نے اسے باغی قرار دیتے ہوئے الٹی میٹم دیا کہ وہ دو ہفتے کے اندر خود کو حکومت کے حوالے کر دے، مگر باچا خان نے کوئی پروا نہ کی۔ وجہ یہ تھی کہ جنوبی اور شرقی افغانستان میں کرزئی کا اثر و رسوخ نہیں تھا۔

ایک سال میں امن وامان کی صورت حال: 22 دسمبر 2002 کو حامد کرزئی کی تخت نشینی کا ایک برس مکمل ہوا۔ اس ایک سال میں ملک بھر میں امن وامان اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کی صورت حال ناگفتہ بہ رہی۔ ایک سال کے دوران کا مل قندھار شاہراہ پر بد امنی کے سینکڑوں واقعات پیش آئے۔ صرف اکتوبر اور نومبر میں یہاں قتل کے 55 اور اغوا کے 250 واقعات رونما ہوئے۔ اس سال بدخشاں میں قتل کی وجہ سے 6 ہزار افراد جاں بحق ہوئے۔ امریکی امداد کے ذخائر سے انہیں کچھ میسر نہ آ سکا۔ پورے بدخشاں میں طبی سہولیات ناپید رہیں۔ مقامی ذرائع کے مطابق صوبے بھر میں ایک کلینک بھی نہیں۔

منشیات کی افزائش: اس سال افغانستان نے اگر کسی میدان میں ترقی کی تو وہ منشیات کی کاشت تھی۔ ملک بھر میں 400 ٹن افیون پیدا ہوئی اور افغانستان اس حوالے سے پہلے نمبر پر آ گیا۔ کرزئی حکومت نے دوران سال افیون کی کاشت پر قابو پانے کے لیے کچھ برائے نام کوششیں کی تھیں، مگر ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا تھا۔ اس بارے میں کرزئی حکومت کی کارکردگی کا اندازہ سال کے آخری ہفتے میں واقع ہونے والے اس تصادم سے لگایا جاسکتا ہے جو کرزئی حکومت کے البکاروں اور کسانوں میں ہوا۔ سرکاری البکار نگر ہمار اور بلخند میں پوست کی فصل تلف کرنے آئے تو کسانوں نے مناسب معاوضے کا مطالبہ کیا جس پر سرکاری فوج نے کسانوں پر حملہ کر دیا۔ تصادم میں 2 کاشت کار جاں بحق اور 8 شدید زخمی ہو گئے۔

ایران کی نئی پالیسی: اس سال ایک اہم تبدیلی افغانستان کے پڑوسی ملک ایران کے رویے میں آئی۔ ایران نے طالبان حکومت کے خاتمے کے لیے امریکی حملے کی بھرپور حمایت کی تھی، مگر امریکا کا تسلط مکمل ہونے کے بعد ایران کو اپنے پڑوس میں امریکی اڈوں کی موجودگی سے اپنی ہٹا کے بارے میں تحفظات لاحق ہونے لگے۔ ایران کے خدشات اس وقت بڑھ گئے جب 2002ء کے موسم خزاں میں امریکا نے ایران کو کمزور کرنے یا اس پر دباؤ بڑھانے کے لیے افغانستان میں ایران مخالف گروپوں کے لیے ترغیبی کیمپ بنانا شروع کیے۔

در اصل امریکا اس خطے میں کئی بڑی تبدیلیوں کا خواہاں تھا۔ وہ شمالی افغانستان کو الگ کرنا چاہتا تھا۔

پاکستان کے صوبہ سرحد کو جدا کر کے افغانستان کے پختون صوبوں میں ملانا چاہتا تھا۔ چین کے صوبے سنکیانگ کی علیحدگی بھی امریکی منصوبے میں شامل تھی اور خود ایران کے صوبہ بلوچستان کو الگ کر کے پاکستان کے بلوچستان کے ساتھ ملانا اور ”گریٹ بلوچستان“ وجود میں لانا بھی امریکی کھیل کا حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایران نے امریکی تسلط کے عواقب کو سمجھنا شروع کر دیا۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے اپنی پالیسی میں خفیہ طور پر تبدیلی کر کے امریکا مخالف قوتوں کے ساتھ بھرپور تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ ایران نے نہ صرف گلبدین حکمت یار بلکہ اسامہ بن لادن کے بیٹے سعد بن لادن کو بھی پناہ فراہم کی، جبکہ یہ دونوں امریکا کے مطلوب افراد کی فہرست میں شامل تھے۔ اگلے قدم کے طور پر ایران نے دسمبر 2002ء میں اپنی سرحدوں پر تربیتی کیمپ قائم کر لیے تاکہ افغانستان میں اثر و رسوخ رکھنے والے گرد و پیش کو عسکری تربیت فراہم کرے۔ حزب وحدت کے علاوہ برہان الدین ربانی اور اسماعیل خان تور دون کے افراد یہاں تربیت حاصل کرنے لگے۔ امریکا کے خلاف مزاحمت میں شرکت کرنے والوں کو بھی یہاں عسکری تربیت دی جا رہی تھی۔

حکمت یار..... آمادہٴ پیکار: 2002ء کے موسم گرما کے دوران ایک اور بڑی تبدیلی بھی رونما ہو چکی تھی۔ ایران میں پناہ گزین افغان راہنما گلبدین حکمت یار نے حالات کے کئی اُتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد بالآخر امریکا کے خلاف مزاحمت میں بھرپور کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حکمت یار لویہ جرگہ سے قتل ظاہر شاہ کی حمایت کی طرف مائل تھے، مگر جرگے کے فیصلے سے یہ حقیقت طشت از بام ہو گئی کہ نئی حکومت خالص امریکا نواز ہے جس میں شمالی اتحاد کے تاجک اور ہزارہ غالب ہیں۔ حامد کرزی کو صرف شوپیں کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے اور پختونوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں حکمت یار نے جولائی 2002ء میں تحریک مزاحمت کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا۔ جولائی کے آخری عشرے میں حکمت یار کے نمائندوں نے باجوڑ میں طالبان کے کچھ راہنماؤں سے ملاقات کر کے آئندہ کی حکمت عملی طے کی۔ اس ملاقات کی اطلاع حکومت پاکستان کو امریکا کی خفیہ ایجنسی نے دی جبکہ حکومت پاکستان ایسی کسی ملاقات سے لاعلمی ظاہر کر رہی تھی۔

افغان عوام ہتھیار اٹھالیں: ستمبر 2002ء کے آغاز میں جبکہ دنیا میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی اور بش کے اعلانِ صلیبی جنگ کو ایک برس مکمل ہونے والا تھا، حکمت یار نے امریکا کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ حزب اسلامی کے سربراہ نے اپنے بیان میں کہا:

”افغان عوام ہتھیار اٹھالیں۔ ہم امریکی افواج پر بھرپور حملے کریں گے۔“

انہوں نے حامد کرزئی سے مصالحت کے امکانات کو مسترد کرتے ہوئے کہا:
 ”حامد کرزئی کی غلام حکومت کی غلامی سے موت بہتر ہے۔“

جلد ہی امریکا سے جہاد کے بارے میں حکمت یار کا آڈیو پیغام اور تحریری فتویٰ بھی نشر ہو گیا۔ اس کے چند دنوں بعد طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا الجزیرہ ٹی وی سے ایک اہم پیغام نشر ہوا جس میں انہوں نے کہا:
 ”دنیا میں جہاں بھی دہشت گردی ہو رہی ہے اس کا ذمہ دار امریکا ہے۔ افغانستان کی آزادی تک جہاد جاری رہے گا۔“

طالبان اور القاعدہ کی نئی حکمت عملی: استعمار کے خلاف افغانوں کی یہ جدوجہد سوویت یونین کے خلاف جہاد سے خاصی مختلف تھی، کیونکہ اُس دور میں امریکا اور روس آمنے سامنے تھے۔ افغانستان کے میدان میں اشتراکیت اور اسلام کے درمیان تصادم کا جو نظارہ دکھائی دے رہا تھا، اس میں سرمایہ دارانہ نظام کا پیشرو اپنے تمام حلیفوں کے ساتھ، اسلام پسندوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ مجاہدین کے لیے پاکستان کے دروازے اور عرب ممالک کے خزانے کھلے تھے مگر طالبان کو ایک بالکل مختلف صورت حال میں جنگ لڑنا پڑ رہی تھی۔ دنیا کا کوئی ملک علانیہ طور پر ان کی حمایت کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خود پاکستان جہاں طالبان کے حامی سب سے زیادہ تھے، ان کے خلاف فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ادا کر رہا تھا۔

طالبان یہ جنگ چاروں طرف سے محصور ہو کر لڑ رہے تھے۔ ان کا اصل سرمایہ ان کا یقین تھا۔ ان کی حقیقی طاقت ان کا ایمان تھا۔ ظاہری اسباب میں ان کا انحصار اسلحے کے ان ذخائر پر تھا جو انہوں نے جنگ سے قبل غاروں میں محفوظ کر لیے تھے۔ دشمن کی فضائیہ اب بھی ان کے بس سے باہر تھی۔ تاہم طالبان اور القاعدہ اس کوشش میں تھے کہ اسلحے کے عالمی بیوپاریوں یا امریکا سے خطرات محسوس کرنے والے ہمسایہ ملکوں سے خفیہ طور پر میزائل حاصل کر لیں۔

افغان وزارت دفاع کے ملٹری انٹیلی جنس رحمت اللہ روند نے ٹائن ایون کی برسی پر خبردار کیا تھا کہ اسامہ بن لادن چین سے زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ خبر درست تھی یا نہیں۔ مگر یہ بات بہر حال طے تھی کہ القاعدہ اور طالبان روز بروز خود کو زیادہ منظم کرتے جا رہے تھے۔ القاعدہ نے اپنا نیٹ ورک اب افغانستان سے باہر پھیلا نا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے سیاسی اور عسکری شعبوں کو پہلی بار الگ الگ ونگز میں تقسیم کر دیا تھا۔ طالبان نے اپنے قابل اعتماد افراد کوئی حکومت میں اہم عہدوں پر لاکر تحریک مزاحمت کو تحفظ دینے کی حکمت عملی اختیار کر لی تھی۔ بظاہر یہ افراد طالبان تحریک سے منحرف شمار ہوتے تھے، مگر حقیقت میں ان کے معاون تھے۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں طالبان حامی

کمانڈر محمد علی نذر پکتیا کا گورنر بننے میں کامیاب ہو گیا۔ طالبان کے سرپرست مولانا جلال الدین حقانی کے دست راست کمانڈر ابراہیم حقانی اپنی طویل روپوشی ختم کر کے منظر عام پر آ گئے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس دوران امریکی اور اتحادی فوجوں نے کمانڈر سیف الرحمن منصور کی تلاش کے نام پر مشرقی افغانستان میں ایک بار پھر سرچ آپریشن شروع کر دیا مگر یہ مہم بھی ناکام ثابت ہوئی۔

حامد کرزئی پر قاتلانہ حملہ: طالبان نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ حامد کرزئی کو کسی صورت میں جیمین سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ستمبر 2002ء کے وسط میں حامد کرزئی اپنے بھائی احمد ولی کی شادی میں شرکت کے لیے قندھار آئے۔ وہ قندھار کے گورنر گل آغا کے ہمراہ گورنر ہاؤس جانے والی شاہراہ سے گزر رہے تھے کہ ان پر نامعلوم افراد نے اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ گل آغا شدید زخمی ہو گیا۔ کئی گولیاں اس کے بازو اور گردن میں پیوست ہو گئیں۔ جبکہ کرزئی کو حیرت انگیز طور پر کوئی گزند نہ پہنچی۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ طالبان نے کیا تھا۔

چهار طرفہ جنگ: افغانستان میں جاری یہ جنگ چار طرفہ تھی۔

① طالبان امریکا، اتحادی افواج اور حامد کرزئی کی کٹھ پتلی حکومت کے خلاف پرجہم جہاد بلند کیے ہوئے تھے۔

② اتحادی ممالک افغانستان میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ مفادات سیٹھنے اور کم سے کم نقصان برداشت کرنے کی کوشش میں جہتا تھے۔

③ کرزئی حکومت میں شامل مختلف سیاسی طبقات اور گروہ اپنے اپنے حلقے کے غلبے کے لیے دست بہ گرمیاں تھے۔

④ مختلف علاقوں اور قبائل کے فوجی کمانڈر اپنے اپنے علاقے کے علاوہ آس پاس کے علاقوں پر بھی قبضے کی ننگ دود میں مصروف تھے۔ ہر کمانڈر چاہتا تھا کہ نہ صرف وہ ارد گرد کے سرداروں پر غالب رہے، بلکہ اس کی طاقت کا حامد کرزئی کو بھی احترام کرنا پڑے۔ کوئی جنگجو سردار خود کو حامد کرزئی سے نچلا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ غرض یہ حالات کچھ ایسے تھے کہ کرزئی کا اپنے لوگوں میں اعتماد ختم ہونے لگا تھا۔ جس کے نتیجے میں نومبر کے آغاز میں کرزئی نے چھ صوبوں کی انتظامی مشینری برطرف کر دی۔

ایش کی فرعونی سوچ: 20 ستمبر 2002ء کو صدر بش نے قومی سلامتی کے حوالے سے ایک پالیسی بیان دیا جس میں کہا گیا کہ امریکا سرد جنگ کے دور کے برعکس اب کسی ملک کو اپنے اوپر عسکری فوقیت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، بلکہ امریکا کو لاحق کسی امکانی خطرے سے بھی پوری قوت سے نمٹنا جائے گا۔ امریکی صدر کا یہ پالیسی بیان واضح کر رہا تھا کہ امریکا اب افغانستان کے علاوہ دیگر خوددار اور نہ

جھکے والے ممالک پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس دوران طالبان کے گورنر حلقے جاری تھے۔ اکتوبر کے آخری عشرے میں انہوں نے مختلف کارروائیوں میں 42 اتحادی فوجی مار ڈالے تھے۔

شمالی اتحاد کے خلاف احتجاج: ادھر شمالی اتحاد کی سخت گیری نے کابل کے شہریوں کا جینا دو بھر کر رکھا تھا۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں کابل یونیورسٹی کے ہزاروں طلبہ نے شمالی اتحاد کی غنڈہ گردی کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ اس موقع پر پولیس کی اندھا دھند فائرنگ سے 7 طلبہ جاں بحق اور 70 زخمی ہو گئے۔ شاید جبر و جور کی حکومت انصاف مانگنے والے عوام کو یہی کچھ دے سکتی تھی۔

پاکستان کی سیاست میں تبدیلی: اکتوبر 2002ء میں پاکستان کے فوجی صدر جنرل پرویز مشرف نے عام انتخابات کا دیرینہ وعدہ پورا کیا جس میں ان کی منظور نظر جماعت قائد مسلم لیگ نے، سادہ اکثریت سے کامیاب ہو کر حکومت بنائی۔ ان انتخابات میں اسلام پسند جماعتوں کے اتحاد متحدہ مجلس عمل نے سرحد اور بلوچستان میں شاندار کامیابی حاصل کر کے نہ صرف دونوں صوبوں میں حکومتیں تشکیل دیں بلکہ قومی اسمبلی میں 60 سے زائد نشستیں حاصل کر کے ایک مضبوط اپوزیشن بھی بنائی۔ اس میں شک نہیں کہ متحدہ مجلس عمل نے پاکستانی عوام کے امریکا مخالف جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکی تسلط کے خاتمے کا نعرہ لگا کر اور اپنے انتخابی نشان کتاب کو ”الکتاب“ قرار دے کر میدان مار لیا تھا۔ اسی لیے مصرین متحدہ مجلس عمل کی کامیابیوں کو طالبان کی کامیابیوں سے جوڑ رہے تھے۔

سردیوں میں گرم محاذ: دسمبر کے سرد ترین مہینے میں امریکی و اتحادی افواج کے خلاف گرما گرم کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ آغاز ماہ میں خواست ایرپورٹ پر ایک مجاہد نے فدائی حملہ کر کے درجنوں امریکیوں کو مار ڈالا۔ دوسرے عشرے میں ننگر ہار کے دیہاتیوں نے امریکی فوج کے ایک دستے پر ہلا بول دیا۔ 3 امریکی ہلاک اور 5 زخمی ہوئے۔ دیہاتی 107 امریکیوں کو درختوں سے باندھ کر بھاگ گئے۔ یہ عوام کی طرف سے امریکی سورماؤں کا روایتی استقبال تھا۔

تیسرے عشرے میں ہلمند، لوگر، پکتیا، جلال آباد اور قندھار میں ہونے والی مختلف کارروائیوں میں 91 امریکی اور اتحادی فوجی ہلاک ہوئے۔ ایک ہیلی کاپٹر بھی تباہ ہوا جس میں 30 امریکی فوجی سوار تھے۔ انہی دنوں کابل کے علاقے پل چرخ میں ایک جرمن ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا گیا جس میں سوار 15 جرمن فوجی اور افسران ہلاک ہو گئے۔

دوران سال امریکی ایجنٹوں کے تحت افغان حکومت کی طرف سے عوام کو مغربی سانچے میں جانے کے اقوامت جاری رہے۔ اس سلسلے کا اہم فیصلہ دسمبر کے اواخر میں وزیر داخلہ تاج محمد وردک

نے کیا جس میں سرکاری دفاتر میں حجاب پر پابندی عائد کر دی گئی اور حکم جاری ہوا کہ آئندہ سے ملازم خواتین بے پردہ رہیں گی۔ کامل کی خواتین نے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کیا مگر بے سود۔

سن 2003ء کے اہم واقعات

ڈیڑھ سال میں 12 سو امریکی ہلاک: نئے سال کے آغاز میں برف باری کے دوران غیر ملکی افواج کی نقل و حرکت بہت محدود ہو گئی تھی۔ تاہم طالبان اس وقت زیادہ متحرک دکھائی دے رہے تھے۔ 20 جنوری 2003ء کو مزار شریف میں نامعلوم افراد کی کارروائی میں 12 امریکی قتل اور 3 شدید زخمی ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شمالی افغانستان میں بھی امریکا مخالف عناصر کی موجودگی ثابت ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر جنوری 2003ء کے دوسرے عشرے میں ملک بھر میں امریکی فوج پر 22 حملے ہوئے جس میں 11 امریکی ہلاک اور 29 زخمی ہوئے۔

25 جنوری کو 400 افراد پر مشتمل امریکی کمانڈوز دستہ طالبان کے خلاف کارروائی کے لیے اسپین بولڈک پہنچا۔ اس کے ساتھ لی بادن، ایف سولہ اور سی 130 طیارے بھی تھے۔ طالبان نے اس دستے کو پہاڑوں میں گھیر لیا۔ یہاں ایک ہولناک معرکہ ہوا جس میں دست بدست لڑائی ہوئی۔ انجام کار امریکی 32 لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

2 فروری کو نیروزا ایرپورٹ پر القاعدہ کے ایک عرب مجاہد نے فدائی حملہ کر کے 10 امریکی ہلاک کر دیے۔ امریکیوں کی جوابی کارروائی میں 5 مجاہد شہید ہو گئے۔ مارچ 2003ء میں منظر عام پر آنے والی ایک میڈیا رپورٹ میں بتایا گیا کہ اکتوبر 2001ء سے اب تک ڈیڑھ سال میں 1200 امریکیوں کی لاشیں خلیجی ممالک منتقل کی جا چکی ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں امریکی فوجی اپانچ ہو چکے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گوریلا جنگ شروع کرنے کے بعد طالبان اور مجاہدین کا جانی نقصان بہت کم ہو رہا تھا۔ شہداء کی لاشیں ان کا حوصلہ مزید بلند کر دیتی تھیں جبکہ دشمن پر انہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔

فروری 2003ء کے پہلے عشرے میں امریکی فوج کے افسران اور طبی ماہرین تورابوزا کے پہاڑوں میں القاعدہ کی باقیات کی تحقیق کرنے گئے اور وہاں مدفون عرب شہداء کی لاشیں تلاش کرتے رہے۔ انہوں نے دیکھا کہ ڈیڑھ سال بعد بھی لاشوں سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر امریکی سوراؤں پر ناقابل بیان دہشت طاری ہو گئی۔

عراق پر امریکی یلغار: 2002ء کے دوران امریکا کو افغانستان کی مہم جوئی سے مطلوبہ نتائج حاصل

بعد نظر آنے لگا تھا اس لیے صدر بش نے پہلے سے طے شدہ عراق پر قبضہ کرنے کے منصوبے کی جلد تکمیل کا فیصلہ کر لیا۔ اب عراق کو زیادہ شدت و دہشت گرد ملک مشہور کیا جانے لگا۔ صدام حسین پر ممنوع کمیائی ہتھیاروں کی تیاری کے الزامات عائد کیے گئے۔ اگرچہ اقوام متحدہ کی ٹیم نے معاینے کے بعد ان الزامات کی تردید کر دی تھی مگر صدر بش نے تل کے ذخائر غصب کرنے کے لیے شروع کیے گئے حماز کو داعی فرات تک پھیلانے کا تہیہ کر لیا تھا۔ امریکی منصوبہ سازوں کو اُمید تھی کہ افغانستان کی بہ نسبت عراق پر قبضہ آسان ہوگا اور وہاں سے فوری طور پر وافر مقدار میں تیل ہتھیایا جاسکے گا۔

چنانچہ 18 مارچ 2003ء کو امریکا نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق پر حملہ کر دیا اور کارپٹ بمباری کے ذریعے بغداد اور دوسرے شہروں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد آخر کار یہاں قبضہ کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا، اس طرح صدام حسین کی حکومت ختم ہو گئی۔ افغانستان پر عراق کی جنگ کے کھرے اثرات پڑے۔ یہاں کے عوام کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ امریکا کی جنگ کسی ایک ملک کے خلاف نہیں بلکہ وہ پورے عالم اسلام کو بریغال بنانے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اس سوچ کے نتیجے میں فطری طور پر طالبان کی حمایت اور امریکا کی کٹھ پتلی کرنزی حکومت کی مخالفت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس جنگ سے القاعدہ کو بھی اپنا نیٹ ورک عرب ممالک میں پھیلانے کا زبردست موقع ملا۔ القاعدہ کے سینکڑوں تربیت یافتہ جوان افغانستان سے نکل کر ایران کے راستے عراق پہنچ گئے۔ ایران میں عرب قبائل کی آبادیاں ایک پٹی کی شکل میں عراق تک چلی گئی ہیں۔ القاعدہ کے مجاہد انہی بستیوں سے گزرتے ہوئے عراق پہنچ جاتے تھے۔ شیخ اسامہ کے معتمد رفقاء جن میں الزرقادی کا نام سب سے مشہور ہے، عراق میں مقامی نوجوانوں کو تربیت دے کر بہت جلد یہاں امریکیوں کے خلاف بھرپور جہاد کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یوں امریکا افغانستان کے ساتھ ساتھ عراق میں بھی سخت ترین مزاحمت کا سامنا کرنے لگا۔

کرنزی کے عہدے داروں کا طالبان سے رابطہ: 2003ء کے موسم بہار کے آغاز میں کرنزی حکومت کے لیے طالبان کے حملوں کا خطرہ بڑھ گیا۔ چند ہفتوں پہلے پختون قبائل نے بھی کرنزی کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہوئے پکتیا اور خوست کی شاہراہیں مسدود کر کے حکومت کے لیے سخت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ ایسے میں انتظامیہ کے ہر افسر کو اپنی جان کا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ اپریل 2003ء کے دوران نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ طالبان کو اعلیٰ حکومتی افسران کی طرف سے باقاعدہ خفیہ پیغامات ملنے لگے کہ وہ جان کی امان کے بدلے ان کا ہر مطالبہ ماننے کے لیے تیار ہیں۔ اس طرح کئی صوبوں میں طالبان کو امریکی اور اتحادی افواج سے لڑنے کے لیے یکسوئی نصیب ہو گئی۔

افغانستان میں انسانی حقوق کی پامالی: سال کے دوران افغانستان میں امریکا کی جانب سے انسانی حقوق کی پامالی کی خبریں میڈیا پر آتی رہیں۔ مئی کے آغاز میں یہ رپورٹ سامنے آئی کہ امریکا پوسٹ کی فصل تلف کرنے کی آڑ میں طیاروں کے ذریعے زہر لے کیسیائی مواد کی بارش کر کے افغانوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں چند دنوں کے اندر 33 بچے، 11 خواتین اور 3 کسان جاں بحق ہو گئے تھے۔ جون میں افغانستان میں سرگرم 80 رفاہی اداروں نے اقوام متحدہ کو ایک کھلے خط میں ملک کی ناقابل بیان صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ بدامنی کے باعث لوگ طالبان کے دور کو یاد کر رہے ہیں۔ یہ خود دشمنی کے گھر سے اہل حق کی چٹائی اور اخلاقی برتری کی گواہی تھی۔

افغانستان میں بھارت کا اثر و رسوخ: افغانستان اس وقت جن قوتوں کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن چکا تھا، ان میں بھارت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بھارت کے شمالی اتحاد سے گہرے روابط تھے اور طالبان سے نفرت اور پاکستان دشمنی دونوں کا مشترکہ منشور تھی۔ اس تعلق اور اعتماد کے نتیجے میں مئی کے دوسرے ہفتے میں شمالی اتحاد نے 189 اضلاع میں پائی جانے والی 24 اقسام کی معدنیات کے بے بہا ذخائر بھارتی ماہرین کے لیے چوٹ کھول دیے۔ ماہرین کے مطابق تھوڑے افغانستان میں 84 ملین ٹن کوئلہ، 120 رارب مکعب میٹر گیس، 108 رارب ٹن لوہا اور 4 ملین ٹن جست موجود ہے۔ اس کے علاوہ بدخشاں اور پنج شیر میں یا قوت، زمر اور لا جور کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ شمالی اتحاد کی نظر کرم سے بھارت کو افغانوں کی اس قومی دولت پر تسلط حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔

شمالی اتحاد کو بدلے میں بھارت سے جو مراعات درکار تھیں، بھارت نے ان کی قسط بھی جاری کر دی اور جون 2003ء کے آغاز میں 94 ملین ڈالر کی امداد افغان حکومت کو دے دی۔

ملک کا نیا آئین: امریکا کے اشارے پر کرنل حکومت گزشتہ ایک سال سے نیا آئین تیار کرنے میں مصروف تھی۔ آخر کار جون 2003ء کے دوسرے ہفتے کے دوران ملک کے نئے آئین کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ آئین 22 صفحات، 9 ابواب اور 110 شقوں پر مشتمل تھا۔ سابقہ آئین کی اسلامی شقیں حذف کر دی گئی تھیں۔ فقہ حنفی کو خارج کر دیا گیا تھا۔ فارسی کو قومی زبان قرار دے دیا گیا تھا۔ مقصد کمیٹی کے تقریباً تمام افراد یورپ اور امریکا کی شہریت رکھنے والے افغان تھے، ان میں تین خواتین بھی شامل تھیں۔

دہشت گردوں سے مذاکرات؟ جس وقت یہ آئین منظور کیا جا رہا تھا، گردیز کے علاقے شای کوٹ میں امریکی اور اتحادی افواج 50 ہیلی کاپٹروں اور درجنوں بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ طالبان کے خلاف ایک بڑے آپریشن میں مصروف تھیں۔ تاہم انہیں مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس معرکے میں 56

صلیبی ہلاک ہوئے۔ اس معرکے میں ناکامی کے بعد امریکا نے طالبان کو تقسیم کرنے کی سازشیں تیز کر دیں۔ جون کے آخری عشرے میں طالبان کے سرپرست اور مشرقی صوبوں کے مجاہد کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کو امریکا کی طرف سے مذاکرات اور صلح جوئی کی پیش کش کی گئی مگر عظیم مجاہد راہنما نے یہ پیش کش ٹھکرا دی اور جواب دیا: ”دہشت گردوں سے مذاکرات کا کیا مطلب۔“

جنرل ڈیوس کا اعتراف: جولائی کے آخری عشرے میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے حامد کرزئی کو ایک تحریری پیغام میں دھمکی دی کہ طالبان اپنی کارروائیاں مزید تیز کریں گے۔ اس پیغام کے فوراً بعد ملک کے مختلف حصوں میں کئی کارروائیوں میں 67 امریکی اور اتحادی سپاہی ہلاک کر دیے گئے۔ کارروائیوں کا زیادہ زور جنوبی افغانستان میں تھا۔ امریکی کرنل جنرل ڈیوس نے انہی دنوں میڈیا کو بیان دیتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ طالبان جنوبی افغانستان سے کسی کو گزرنے نہیں دیتے۔

افغان حکومت کی پاکستانی قبائل کے لیے مراعات: حامد کرزئی پاکستانی مخالف ذہن رکھنے کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ افغانستان میں طالبان کی کامیاب کارروائیوں کے پیچھے آئی ایس آئی کا ہاتھ ہے۔ چنانچہ بھارت کے مشورے پر کرزئی نے پاکستان کے سرحدی قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کی کوششوں کا تدریجاً آغاز کر دیا۔ یہ گویا آئی ایس آئی کی کارروائیوں کا انتقام تھا۔ حامد کرزئی نے پاک افغان سرحدوں پر آباد قبائل کو ایک قرارداد اور ڈیورنڈ لائن کے خاتمے کے مسئلے کو از سر نو اٹھایا۔ جولائی 2003ء کے اواخر میں افغان حکومت نے ڈیورنڈ لائن کے دونوں طرف آباد قبائل کے لیے افغان شناختی کارڈ کے اجراء، تعلیمی سہولیات اور راشن کی فراہمی سمیت کئی پُرکشش مراعات کا اعلان کر دیا۔

نیو افغانستان میں: امریکا افغانستان کی مہم میں پیش آنے والی دشواریوں سے اکتانہ جا رہا تھا۔ اس نئی حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ”نیٹو“ کی افواج کو آگے لانے کا فیصلہ کر لیا۔ ”نیٹو“ یا ناتو تھ الاٹنک ٹریڈ آرگنائزیشن، امریکا، کینیڈا اور کئی یورپی ممالک کا عسکری اتحاد ہے جو 1949ء میں وجود میں آیا۔ ابتدائی اس میں 12 ممالک شامل تھے، تدریجاً ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس وقت نیٹو کے ممبر ممالک کی تعداد 26 ہے۔ اس میں شامل اہم یورپی ممالک فرانس، بلجیم، ڈنمارک، جرمنی، ہنگری، بلغاریہ، برطانیہ، اٹلی، آسٹریا، کسمبرگ، نیوی لینڈ، ناروے، پرتگال، اسپین، یونان، پولینڈ اور ترکی ہیں۔ ان کے علاوہ اسٹونیا، چیک ری پبلک، لیتھوانیا، رومانیہ، سلوواکیا، سلوونیہ اور لیبونیہ بھی اس کے رکن ہیں۔ امریکا اور کینیڈا کو ملا کر یہ تعداد 26 ہو جاتی ہے۔ طے ہوا کہ نیٹو ممالک کے فوجی دستے اگست 2003ء میں کابل آکر بین الاقوامی سکیورٹی فورسز کی کمان سنبھال لیں گے۔ طالبان نے بھی نیٹو کا

استقلال کرنے کی تیاریاں کر لی تھیں۔ نئے افواج کی افغانستان میں تعیناتی کے ضمن مقاصد ہمارے جارہے تھے:

- ① حامد کرزی کی حکومت کو قیام دینا۔
- ② کرزی حکومت کے مخالفین یعنی طالبان کا خاتمہ کرنا۔
- ③ افغانستان کی تعمیر نو کا فریضہ انجام دینا۔

اگست سے لے کر نومبر تک طالبان کی کارروائیوں میں غیر معمولی شدت رہی کیونکہ اگست کے دوسرے عشرے میں نئی دہلی سے افغانستان وارد ہوئے تھے مگر تعیناتی کے پہلے ہی ہفتے میں ان کے 208 فوجی مختلف کارروائیوں میں مارے گئے۔ یہ کارروائیاں ارزگان، بلمند، پکتیا، پکتیکا، گردیز، جلال آباد، ارگون اور غزنی میں ہوئی تھیں۔ اگست کے آخری عشرے میں 11 مارچ کی اور 79 اتحادی سپاہی ہلاک ہوئے جس کے بعد نئی دہلی نے اعتراف کیا کہ طالبان کا مقابلہ آسان نہیں۔

طالبان کی کامیابیاں: ستمبر 2003 تک امریکی فوج پر دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ 11 ہزار امریکی سپاہیوں نے وطن واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ مسلسل معرکوں اور جانی نقصان سے ان کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق 45 مارچ کی فوجی خودکشی کرچکے تھے جبکہ 350 نفسیاتی مرئیض بن کر زیر علاج تھے۔ برف باری تک طالبان نے اپنی کارروائیوں کی رفتار برقرار رکھی۔ اکتوبر کے پہلے عشرے میں مختلف کارروائیوں میں 123 اتحادی ہلاک ہوئے۔ طالبان کو ایک کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ ان کے 41 قیدی سرنگ بنا کر قندھار جیل سے فرار ہو گئے۔ نومبر کے پہلے عشرے میں 103 اتحادی ہلاک ہوئے۔ یہ کارروائیاں کابل، پکتیا، ننگر ہار اور کنڑ میں ہوئی تھیں۔ ان علاقوں میں حزب اسلامی بھی کارروائیوں میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔

کرزی حکومت کی بے بسی: موسم سرما شروع ہونے تک طالبان نے جنوبی افغانستان کو بقیہ ملک سے کاٹ دیا تھا۔ یہاں اکثر صوبوں اور اضلاع میں ان کا حکم چلنے لگا تھا۔ طالبان سربراہ نے شرعی قوانین نافذ کر دیے تھے۔ کرزی انتظامیہ کے افسران یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے مگر ان کا طالبان پر بس نہیں چلتا تھا۔ اس لیے وہ چپ چاپ تھے۔ خود کابل میں کرزی کے اختیارات کم سے کم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شمالی اتحاد نے اپنے حکمران کو نہ صرف دیوی پروگراموں بلکہ سرکاری اقتدار تک میں شرکت سے روک دیا تھا۔ جنرل فیمل، برہان الدین ربانی، پروفسر سیاف اور اسماعیل تورون کرزی کے خلاف متحد ہو گئے تھے۔ کابل میں امریکن یونیورسٹی: افغانستان میں دور رس تبدیلیاں لانے کے لیے امریکا نے دسمبر

2003ء میں "امریکن یونیورسٹی" کے قیام کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ 35/1 ایکڑ زمین پر میچ یونیورسٹی میں داخلہ فیس 5 ہزار ڈالر مقرر ہوئی۔ طے ہوا کہ تمام اساتذہ غیر ملکی ہوں گے اور غیر پشتون طلبہ کو داخلے میں زیادہ کوڑ دیا جائے گا۔ درحقیقت یہ یونیورسٹی افغانوں کی نسل نو میں امریکا کے تازہ دم نظریاتی و فادار پیدا کرنے کے لیے بنائی جا رہی تھی۔

2004ء کے معرکے

ماڈرن دینی مدارس: کابل میں امریکن یونیورسٹی کے منصوبے کے آغاز کے ساتھ ساتھ امریکا نے جنوری 2004ء میں افغانستان میں 200 نئے دینی مدارس کھولنے کا فیصلہ بنالیا۔ طے کیا گیا کہ غیر ملکی اداروں سے سند لینے والے لبرل اساتذہ اور مستشرقین کے ذریعے افغان طلبہ کو قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، تفسیر، عربی لغت، عربی ادب، انشاء اور تقابلی ادیان کی تعلیم دی جائے گی۔ طلبہ کو وہ تمام سہولیات مفت فراہم کی جائیں گی جو پاک و ہند اور افغانستان کے روایتی دینی مدارس میں مفت ملتی ہیں۔ یعنی کھانا، رہائش، تعلیم اور علاج معالجہ۔

اس منصوبے کو کامیاب کرنے کے لیے امریکا نے اسی ماہ افغانستان کے تمام دینی مدارس اور تنظیم خانے بند کرانے کا حکم جاری کر کے اس پر جبراً عمل کرانا شروع کر دیا۔ کنڑ کے جامعہ دارالندوہ اور جامعہ امام بخاری کو امریکی فوج نے خود جا کر بند کر دیا اور 950 طلبہ کو بے دخل کر دیا۔

امریکا کا ایک اور منصوبہ افغانستان میں قومی فوج کا قیام تھا تاکہ لڑائیوں میں زیادہ سے زیادہ جانی نقصان افغانوں ہی کا ہو۔ امریکا 9 ہزار مقامی افراد کو 50 ڈالر ماہانہ تنخواہ کا لالچ دے کر قومی تربیت دے رہا تھا۔ تربیت کے بعد قومی خدمات شروع کرنے کے بعد 70 ڈالر تنخواہ ملے تھے۔ تاہم جنوری 2004ء میں تربیت حاصل کرنے والوں میں سے 3 ہزار افراد فرار ہو گئے جس سے اس منصوبے کی مکمل کامیابی کے امکانات ختم ہو گئے۔ اسی طرح دینی مدارس کا منصوبہ بھی ناکامی سے دو چار ہوا۔ اسی قسم کا ایک منصوبہ امریکا کی خوشنودی کے لیے پرویز مشرف حکومت نے پاکستان میں متعارف کرایا جسے "ماڈل دینی مدارس" کا نام دیا گیا۔ مگر پاکستان میں بھی امریکا کی یہ سازش مکمل طور پر ناکامی سے دو چار ہوئی۔

حکومت یار کا بیان: فروری 2004ء میں طالبان اور حزب اسلامی کے تعلقات میں مزید پتلی محسوس کی گئی۔ گلبدین حکمت یار نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ وہ ملا محمد عمر کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے کہا:

”ہمیں ماضی کے سخت تجربات سے سبق سیکھنا ہوگا۔ اگر ہم نے اتحاد نہ کیا تو تاریخ ہمیں بھی معاف نہیں کرے گی۔“

اس بیان کے بعد طالبان اور حزب اسلامی کے تملوں میں مزید شدت دکھائی دینے لگی۔ فروری کے اواخر میں کزن میں 15 امریکی اور 180 اتحادی فوجی ہلاک ہوئے۔ موسم بہار شروع ہوتے ہی امریکا نے 6 ہزار مزید فوجی افغانستان بھیج دیے جنہوں نے اسامہ بن لادن کی تلاش میں نیا آپریشن شروع کر دیا۔ ادھر ملا محمد عمر نے جنوبی صوبوں میں نامور طالبان کمانڈر ملا داد اللہ کو امریکی و اتحادی افواج پر طوفانی حملوں کا ہدف دے دیا۔ ملا داد اللہ نے مارچ کے دوسرے عشرے کے دوران قندھار کے نواحی علاقے ”میوند“ میں ایک خونریز جنگ لڑ کر 15 اتحادیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس نئے مجموعی طور پر 61 امریکی اور اتحادی ہلاک اور 151 زخمی ہوئے۔ امریکیوں پر اتنا خوف سوار ہوا کہ ان کے ایک ہزار فوجی خوست چھاؤنی سے بھاگ کر کامل چلے گئے۔ طالبان کی دہشت کے علاوہ وہ پیسے کے وبائی مرض کا شکار بھی ہو چکے تھے۔

وانا آپریشن اور کمانڈر نیک محمد: اس خطے میں امریکی منصوبوں کا ایک حصہ پاکستان کو تقسیم کرنا بھی تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پاکستانی فوج اور عوام کو لڑایا جائے۔ دینی مدارس کے طلبہ اور اسلام پسندوں کو فوج کے ہاتھوں مروایا جائے اور سرحدی قبائل کو بغاوت پر آمادہ کر کے ملک کو خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس منصوبے پر عمل کا آغاز 2004ء کے آغاز کے ساتھ ہی ہو چکا تھا۔ ان دنوں پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں خصوصاً جنوبی وزیرستان میں امن وامان کی صورت حال منحوش ہوتی جا رہی تھی۔ پاکستانی فوج امریکا کے دباؤ پر بعض سرداروں کی عسکری طاقت کچلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امریکا کا کہنا تھا کہ ان جنگجو سرداروں نے طالبان کو پناہ دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس سے امریکا فوج کو سخت تشویش لاحق ہے۔

امریکا نے وانا کے علاقے کو ان سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا تھا اور نیک محمد نامی ایک مقامی کمانڈر کو گرفتار کرنے پر زور دیا تھا۔ نیک محمد کی اس علاقے میں خاصی اہمیت تھی۔ اسے گرفتار کرنا آسان نہیں تھا۔ مقامی آبادی کے بے پناہ جانی و مالی نقصانات اور سینکڑوں فوجیوں کے کام آجانے کے بعد آخر کار موسم بہار میں حکومت پاکستان اور قبائلی کمانڈروں میں صلح نامہ ہو گیا کیونکہ حکومت پاکستان نے ان عواقب کو محسوس کر لیا تھا جو مزید خونریزی سے پیدا ہو سکتے تھے۔

مکر موسم گرما میں 23 جون 2004ء کو کمانڈر نیک محمد کو گائیڈڈ میزائل کا نشانہ بنا کر اسے سے ہٹا دیا

گیا۔ اس کے بعد جنوبی وزیرستان میں ایک بار پھر حالات بگڑ گئے۔ وقفے وقفے سے وہاں فوج کا آپریشن جاری رہا۔

افغان فوج کو خنزیر کا گوشت: افغانستان میں امریکی فوج کی زیادتیاں جاری تھیں۔ میڈیا پر خبریں آ رہی تھیں کہ امریکا افغان فوج کو خنزیر کا گوشت کھانے پر مجبور کر رہا ہے۔ امریکی اعلیٰ افسران کا کہنا تھا کہ جو افغان سپاہی انتہا پاک مسلمان ہو کہ شراب، زنا اور دوسرے حرام کاموں سے دور بھاگتا ہو، وہ فوج کی ملازمت کے قابل نہیں ہو سکتا۔ امریکی افغان عوام کو خنزیر، اخلاق لٹریچر، عریاں تصاویر اور فحش مواد کی سی ڈیز بھی مفت دے رہے تھے تاکہ یہ لوگ اپنے دین و ایمان اور اسلامی تشخص سے محروم ہو جائیں۔

جون 2004ء کے اواخر میں ایک دن امریکی فوجی تلاشی کے بہانے بوٹوں سمیت کابل کی مسجد وزیر اکبر خان میں گھس گئے۔ اس سے قبل وہ وزارت داخلہ اور صدارتی محل کے احاطوں میں تعمیر شدہ مساجد کی بھی اسی انداز میں بے حرمتی کر چکے تھے۔ اس قسم کے واقعات سے امریکا مسلمانوں کو دہشت زدہ مایوس اور مآؤف العقول بنادینا چاہتا تھا، مگر افغان عوام رد عمل کے طور پر امریکا کی مخالفت میں اور جری ہوتے گئے۔ تحریک طالبان کو نئے رضا کار ملنے لگے۔

اگست کے آغاز میں طالبان نے ایک کارروائی میں امریکی چنیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا۔ 17 امریکیوں سمیت 46 فوجی ہلاک ہو گئے۔ واقعے کے بعد طالبان ترجمان ملا عبداللطیف حکیمی نے ویب سائٹ پر پیغام نشر کیا کہ ”تباہی امریکا کا مقدر ہے۔“

یہ بات یقینی تھی کہ طالبان میزائل ٹیکنالوجی حاصل کر چکے تھے جس کی مدد سے وہ امریکی ہیلی کاپٹروں کو کامیاب سے گرا رہے تھے اور کبھی کبھار کوئی طیارہ بھی ان کی زد میں آ جاتا تھا۔ اگست کے دوسرے نصف میں خوست، غزنی اور زابل میں طالبان کے حملوں میں 113 اتحادی مارے گئے۔ شکی میں طالبان نے میزائل فائر کر کے ایک ہیلی کاپٹر تباہ کر دیا، اس کے علاوہ مختلف علاقوں میں کئی کارروائیوں میں 56 امریکی ہلاک کر دیے گئے۔

طالبان کی شرعی عدالتیں: 2004ء کے موسم گرما کے دوران طالبان اتنی قوت حاصل کر چکے تھے کہ 8 صوبوں زابل، بلخ، ارزگان، پکتیکا، پکتیا، خوست اور کنڑ میں ان کی شرعی عدالتوں نے کام شروع کر دیا تھا۔ عوام کو مقامی کماڈروں اور کرزئی حکومتوں کے اہلکاروں سے انصاف نہیں ملتا تھا اس لیے وہ طالبان کی شرعی عدالتوں کی طرف جوق درجوق رجوع کر رہے تھے۔ موسم سرما میں طالبان کا ہیبت کابل کے گرد و نواح تک پھیل چکی تھی۔ چنانچہ نومبر 2004ء شروع ہوتے ہی 300 امریکی فوجی لغمان

کو غیر محفوظ تصور کرتے ہوئے قدامت رختل ہو گئے۔ طالبان کو شمالی اتحاد نے بھی اب بادل نخواستہ ایک مؤثر قوت کے طور پر مان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوہر کے دوسرے شہر سے میں افغانان وزیر دفاع جنرل نسیم نے طالبان کے ساتھ اتحاد بنا کر اپنے مخالفین کو بگرام اور سالنگ سرنگ سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا مگر طالبان نے جنرل نسیم کی دعوت صلح کو ٹھکرا دیا اور جواباً کہا کہ ہم فدا رملت سے اتحاد نہیں کر سکتے۔

صدارتی الیکشن: 2004ء کا ایک اہم تفریہ اکتوبر میں ہونے والے افغانستان کے صدارتی انتخابات تھے۔ ملک کی تاریخ میں پہلی بار صدر کے عہدے کے لیے الیکشن لڑا جا رہا تھا۔ حامد کرزئی کو ساحل امریکا کی پوری سرپرستی حاصل تھی اس لیے مخالف دھڑوں کے افراد آسانی سے خریدے گئے تھے۔ الیکشن کے دوران طالبان نے اپنی کارروائیاں زیادہ تیز کر دی تھیں اس لیے پولنگ اسٹیشنوں پر گہما گہمی کم رہی تھی۔ ویسے بھی افغان عوام جانتے تھے کہ ان انتخابات کی حیثیت ایک ڈرامے سے زیادہ نہیں جس کا ہدایت کار امریکا ہے۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق الیکشن کے آخری نفع میں طالبان نے مختلف کارروائیوں میں 108 امریکی و اتحادی سپاہی موت کے گھاٹ اتارے تھے۔ اکتوبر میں ہونے والی سب سے بڑی کارروائی کامل میں کی گئی۔ 23 اکتوبر 2004ء کو کامل میں ایک خودکش بمبار نے حملہ کر کے نئے افواج کے کمانڈر کو ہلاک کر دیا۔ دھماکے کی زد میں آ کر مزید 9 غیر ملکی اور افغان فوجی بھی مارے گئے۔

11 ستمبر کے حملے کا اعتراف: اس دوران امریکا میں بھی صدارتی انتخابات کا دنگل پورے زور و شور سے برپا رہا۔ جارج واکر بش کا مقابلہ سخت جان حریف جان کیری سے تھا۔ انتخابات کی تاریخ 2 نومبر مقرر تھی۔ پولنگ سے چار دن قبل 29 اکتوبر 2004ء کو الجزائرہ نے القاعدہ کے سربراہ اسامہ بن لادن کی نئی ویڈیو ٹیپ جاری کی جس میں شیخ اسامہ نے امریکی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "2001ء سے آج تک امریکی صدر نے امریکیوں کو گمراہ کیا ہے۔"

القاعدہ سربراہ نے اس ویڈیو ٹیپ میں یہ اعلان کر کے دنیا کو حیران کر دیا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملہ القاعدہ ہی نے کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر امریکا دنیا میں ظلم و ستم ڈھانے سے باز نہ آیا تو ہم گیارہ ستمبر 2001ء کی یاد دوبارہ تازہ کر سکتے ہیں۔ 2 نومبر کے انتخابات کے نتائج میں صدر بش کو جان کیری پر برتری حاصل رہی اور بش نے مزید 4 سال کے لیے صدارتی کرسی سنبھال لی۔ اگلے دن 3 نومبر 2004ء کو افغانستان کے صدارتی انتخابات کے نتائج کا اعلان بھی ہو گیا جس کے مطابق حامد کرزئی نے 55 فیصد سے زائد ووٹ حاصل کر کے معرکہ جیت لیا تھا۔ غیر ملکی مبصرین نے الیکشن کو صاف و شفاف اور نتائج کو غیر جانبدارانہ قرار دیا تاہم جو حقیقت تھی وہ سبھی کو معلوم تھی۔

حامد کرزئی، افغان صدر 7 دسمبر 2004ء کو حامد کرزئی نے پانچ سال کی مدت کے لیے افغانستان کے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔ حکومت کی جانب سے عوام کو یہ ڈرامہ چپ چاپ دیکھنے کا پابند کیا گیا تھا، مکی میڈیا مکمل طور پر پابند سلاسل تھا۔ ایک افغان شاعر غلام رسول خوش بخت نے صدارتی الیکشن کی ”شفافیت“ پر ایک طنزیہ نظم لکھ دی تھی جس پر اس کا جین و آرام دو بھر کر دیا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ 20 فروری 2005ء کو اسے القاعدہ کا وفادار قرار دے کر گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے افغانستان میں امریکا کے زیر سایہ جمہوریت کس حد تک عوامی اُستکون کی ترجمان اور ان کے حقوق کی پاسداری تھی؟

حقیقت یہ تھی کہ امریکی حکام افغانستان میں کسی کو بھی القاعدہ سے تعلق کے شبہ میں گرفتار کر لیے تھے۔ 13 اگست کو قندھار کی ایک مسجد سے 27 رکنی تبلیغی جماعت کو بھی اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنی داستان اسارت میں لکھا ہے کہ گوانتانامو بے کے افغان قیدیوں میں موچی، لوہار، چرواہے، صحافی، صراف، دکان دار، ائمہ مساجد حتیٰ کہ امریکا کے اپنے ترجمان تک شامل ہیں۔ امریکیوں کا قبرستان: دوبارہ منتخب ہونے والے امریکی صدر بش کو الیکشن میں کامیابی کے بعد 2004ء خوشگوار سال محسوس ہو رہا تھا مگر اس میں شک نہیں کہ امریکا کے لیے یہ سال بہت برا ثابت ہوا۔ وہ افغانستان اور عراق دونوں جگہ پٹ رہا تھا۔ مغربی صحافیوں نے انکشاف کیا تھا کہ جرمنی کے جنوب مغرب میں قائم امریکی فوجی ہسپتال کے ریکارڈ کے مطابق وہاں افغانستان اور عراق سے 18 ہزار زخمی امریکیوں کو لایا جا چکا ہے۔ ان میں سے ساڑھے 5 ہزار ذہنی مریمیں، 800 بالکل پاگل، 200 ائمہ اور 120 لنگڑے لوگ ہیں۔ صحافیوں کو یہ معلومات جون 2004ء میں خود لینڈ تھل میڈیکل سینٹر کے سربراہ لیفٹیننٹ کرنل رونلڈ بیلز نے میا کی تھیں۔

دسمبر میں امریکی فوجی اخبار Star and Stripes نے انکشاف کیا کہ جرمنی کے ہسپتال میں عراق اور افغانستان سے لائے جانے والے زخمیوں کی تعداد 24 ہزار تک پہنچ چکی ہے گویا صرف 6 ماہ میں 6 ہزار امریکی مزید زخمی ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا اور اتحادیوں کے نقصانات کس حد کو چھو رہے تھے اور مغربی حکومتیں کس طرح غلط اعداد و شمار کے ذریعے اپنی عسکری تباہی کو چھپا رہی تھیں۔

صدر بش کی دوبارہ کامیابی کے بعد یہ امکانات مزید بڑھتے ہو گئے تھے کہ تیل کے عالمی بیوپاریوں کا نولہ عراق اور افغانستان کی جنگ میں مزید ایجنہن جموگے پر تیار ہے گا اور ہزاروں لاکھوں انسان اس آگ میں جھلنے رہیں گے؟ یہ انہی پالیسیوں کا تسلسل تھا کہ صدارتی انتخابات میں بش کی کامیابی کے فوراً

بعد امریکی حکام نے ہرات کے مضافات میں 1700 ایکڑ پر مشتمل وسط ایشیا کے سب سے بڑی عسکری اڈے کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ یہ اڈہ ایرانی سرحد سے صرف 45 کلومیٹر دور تھا جبکہ وسط ایشیا کی سرحدیں بھی نزدیک تھیں۔ مبصرین کا کہنا تھا کہ امریکا اس اڈے سے بیک وقت وسط ایشیا، افغانستان اور ایران کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔

امریکی طیاروں کا شکار: صدر بش کی نئی امنگوں اور امریکا کی ان نت نئی منصوبہ بندیوں اور سازشوں کے باوجود طالبان کے حملے کم ہونے میں نہ آئے۔ دسمبر کی کڑکٹی سردی میں وہ کابل کے ارد گرد متحرک رہے۔ کابل کے قریب پرواز کرتا ایک امریکی جاسوسی طیارہ دسمبر کے پہلے ہفتے میں ان کا نشانہ بن گیا۔ اس کے فوراً بعد کوہ ہندوکش پر چو پرواز ایک امریکی فوجی طیارہ ان کا شکار بنا جس میں سوار 27 مغربی ہلاک ہو گئے۔



مآخذ و مراجع

- ♣ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 7، 8
- ♣ ہفت روزہ بکبیر، فریڈے اسپیٹل، غازی، جلد 2003، 2004،
- ♣ قومی اخبارات - امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جہانگیر 2003، 2004،
- ♣ روزنامہ اسلام کراچی 2003، 2004،

اڑتیسواں باب

محرکہ فتنہ و بقاء

2005ء

تحریک مزاحمت میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں: 2005ء کے آغاز میں کرزئی حکومت، تحریک مزاحمت کے مختلف گردپوں کو امتیازی برتاؤ کے ذریعے الگ الگ کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آئی۔ حامد کرزئی نے 100 انتہائی مطلوب افراد کی فہرست سے گلبدین حکمت یار کا نام نکلا کر حزب اسلامی کے لیے نرم گوشہ رکھنے کا اشارہ دیا۔ انہی دنوں افغان وزیر داخلہ احمد جلالی نے اعلان کیا کہ عرب مجاہدین گرفتاری دے دیں، ان پر افغان قوانین کے تحت مقدمات چلائے جائیں گے، انہیں امریکا کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کی کہ یہ رعایت اسامہ اور ان کے قریبی ساتھیوں کے لیے نہیں ہوگی۔ جنوری کے اواخر میں کرزئی نے جنرل قاسم فہیم سے سرکاری مراعات واپس لے لیں جن میں سرکاری رہائش اور 92 جریب زمین شامل تھی۔ جنرل فہیم کے حامد کرزئی سے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے جس کی وجہ سے افغان صدر نے یہ تادیبی کارروائی کی۔

افغان طیارے کی تباہی: جمہرات 3 فروردی 2005ء کو افغان ایرلائن کا ایک مسافر طیارہ ہرات سے کامل جاتے ہوئے خراب موسم کی وجہ سے ایرپورٹ پر نہ اتر سکا اور سہ پہر کے وقت لاپتا ہو گیا۔ اگلے دن طیارے کی تباہی کی خبر ملی۔ اس میں سوار 104 افراد ہلاک ہو چکے تھے جن میں 14 امریکی شہری، 6 روسی، نیو کے 14 اعلیٰ عہدے دار، 6 ترک انجینئر اور ایک اطالوی باشندہ بھی شامل تھے۔ اتحادی افواج کے لیے یہ ایک بڑا دھچکا تھا۔ اسی ہفتے 5 ہزار افغان فوجی 20 ہفتے کی تربیت مکمل کر کے فرار ہو گئے۔ کرزئی حکومت نے 2007ء تک 45 ہزار فوجی تیار کرنے کا ہدف طے کیا تھا مگر اس قسم کے واقعات کی وجہ سے یہ ہدف پورا ہونا مشکل نظر آ رہا تھا۔ 12 فروردی 2005ء کو ترکی نے افغانستان میں نیو فورسز کی نمان سنبھال لی۔ جنرل اتھم اردافنی کو نیا انچارج مقرر کیا گیا۔

افغانستان کی پہلی خاتون گورنر: 14 فروری 2005ء کو افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون کو گورنر کا عہدہ دیا گیا۔ صدر حامد کرزئی نے نجیب اللہ کی حکومت میں شامل ایک وزیر کی بیوی حبیبہ سربانی کو بامیان کا گورنر مقرر کر کے ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈال دی۔ شمالی افغانستان کے سفاک قافل رشید دوسم کو اب تک نئی حکومت اور انتظامیہ میں کوئی حصہ نہیں دیا گیا تھا۔ تاہم یکم مارچ 2005ء کو حامد کرزئی نے اسے نیا چیف آف آرمی اسٹاف مقرر کر کے ازبکوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پوست کی کاشت میں اس سال مزید اضافہ ہوا۔ حکومت میں شامل شمالی اتحاد کے کمانڈر خود اپنے علاقوں میں پوست کی کاشت کروا رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ نے کسانوں اور زمین داروں کو متبادل ملازمتیں دینے کا وعدہ پورا نہیں کیا اس لیے لوگ پوست کی کاشت پر مجبور ہیں۔

موسم بہار میں افغانستان کے مشرقی اور وسطی علاقوں میں تیز بارشیں ہوئیں۔ 5 مارچ کو غزنی میں ہینڈ ٹوٹنے سے سیلاب آگیا۔ سینکڑوں مکانات تباہ ہو گئے۔ اس حادثے میں 13 افراد جاں بحق اور 2 سلاپتا ہو گئے۔ 31 جولائی 2005ء کو سعودی عرب کے حکمران شاہ فہد بن عبدالعزیز کا انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 82 سال تھی۔ شاہ فہد روس افغان جنگ میں مجاہدین کی بھرپور مالی مدد کرتے رہے تھے اور بعد میں خانہ جنگی کے دور میں بھی انہوں نے یہاں قیام امن کی متواتر کوششیں کی تھیں۔ ان کے بعد شاہ عبداللہ نے سعودی عرب کے نئے حکمران کے طور پر اقتدار سنبھال لیا۔

روس سے تاوان جنگ کا مطالبہ: اگست میں افغان حکومت نے ایک عجیب تنازع کھڑا کر دیا۔ اس نے روس سے 10 ارب ڈالر جنگی ہرجانہ طلب کر لیا۔ سرخ افواج کے اخلا اور سوویت یونین کی شکست وریخت کے چودہ سال بعد افغان حکومت کو اچانک یہ خیال کیسے آگیا کہ وہ روس کی مسلط کردہ جنگ کا ہرجانہ طلب کرے؟۔ مبصرین کے مطابق افغان حکومت یہ مطالبہ امریکا کے ایماء پر کر رہی تھی تاکہ روس کو دباؤ میں رکھا جائے۔ کیونکہ روس افغانستان میں امریکا کے سن پسند گروپوں کے مقابلے میں کیونٹ کمانڈروں اور ازبکوں..... رشید دوسم، کمانڈر عطا وغیرہ..... کی سرپرستی کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ امریکا کو شک تھا کہ روس طالبان کو بھی کرزئی حکومت کے خلاف کارروائیوں کے لیے اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔

بھارتی وزیراعظم افغانستان میں: انہی دنوں بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ نے افغانستان کا دورہ کیا اور 28 اگست کو حامد کرزئی کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف بھارت افغانستان مشترکہ تعاون کے معاہدے پر دستخط کیے۔ من موہن سنگھ جلال آباد جا کر قبائلی سرداروں سے ملاقات اور ننگر ہار پو نیوٹی کے طلبہ سے خطاب کے خواہش مند تھے مگر سکیورٹی خطرات کے سبب یہ طے شدہ پروگرام عین وقت پر منسوخ کر دیے گئے۔

من موہن سنگھ نے دورہ افغانستان میں صدر حامد کرزئی کو بھارتی فوج افغانستان میں تعینات کرنے کی تجویز پیش کی۔ حامد کرزئی نے اس پر غور کرنے کی مہلت طلب کر لی۔ من موہن سنگھ کی واپسی کے بعد حامد کرزئی نے 6 ستمبر کو اپنی کابینہ کا اجلاس بلا کر اس مسئلے پر رائے طلب کی۔ اکثر ارکان نے اس کی شدید مخالفت کی۔ سابق مجاہد لیڈروں نے بھی اسے مسترد کر دیا۔ اس طرح بھارتی لابی کی ایک خطرناک سازش کی راہ مسدود ہو گئی۔ تاہم بھارت نے دوسرے دل بھانے والے طریقوں سے افغانستان میں اثر و رسوخ بڑھانے کی کوششیں جاری رکھیں۔ دسمبر کے مہینے میں بھارت کا افغان تاجروں کے لیے ایک ترقیاتی مرکز کھولنا اس سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

18 ستمبر کو افغانستان میں پارلیمانی الیکشن ہوئے۔ اس دوران پولنگ اسٹیشن پر طالبان کے کئی حملے ہوئے جن میں کئی افراد مارے گئے۔ 9 پولنگ اسٹیشن نذر آتش کر دیے گئے۔ یہ کارروائیاں اس حال میں کی گئی تھیں کہ 40 ہزار افغان سیکورٹی اہلکار اور 30 ہزار اتحادی فوجی پولنگ اسٹیشنوں پر تعینات تھے۔ ملک بھر سے انتخابات کے نتائج سامنے آنے کا عمل 7 اکتوبر کو مکمل ہوا۔ یہ نتائج حامد کرزئی کے لیے قطعاً ناموافق تھے۔ شمالی صوبوں کے علاوہ دارالحکومت کابل میں بھی شمالی اتحاد کے نامزد امیدوار جیت گئے تھے۔ سابق مجاہد لیڈروں نے بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ صوبائی اسمبلیوں میں سابق جہادیوں کو برتری حاصل ہو گئی تھی۔

صدر حامد کرزئی کو پولنگ کے اگلے دن ہی نتائج کا اعزاز ہو گیا تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی پالیسی میں کچھ تبدیلی لاتے ہوئے عوامی مطالبات اور اُمتوں کی ترجمانی پر مشتمل بیانات کے ذریعے اپنی ساکھ کو سہارا دینے کی کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلے کا اہم ترین بیان 20 ستمبر کو دیا گیا جس میں حامد کرزئی نے افغانستان میں پارلیمانی انتخابات کے بعد امریکی آپریشن کی مخالفت کر دی۔ انہوں نے کہا کہ اب حالات کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے اس لیے افغانستان میں غیر ملکی افواج کو کسی بڑے آپریشن کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔

جنگی جرائم کی کمیٹی کا قیام: نئی پارلیمانی حکومت کو اقتدار ختم ہو جانے سے صدر حامد کرزئی کے اختیارات میں مزید کمی آ گئی تھی۔ تاہم مجموعی طور پر اب سیٹ آپ پہلے کی بہ نسبت متوازن تھا۔ حکومت عوام کا دل جیتنے کے لیے کچھ نئے کام کرنا چاہتی تھی۔ 14 دسمبر 2005ء کو افغان کابینہ نے جنگی جرائم میں ملوث افراد کے خلاف کارروائی کی منظوری دیتے ہوئے اعلان کیا کہ 1978ء کے کیونسٹ انقلاب سے 2001ء میں طالبان حکومت کے خاتمے تک کیے جانے والے جنگی جرائم کے مرتکب افراد کی نشان

دہی کی جائے گی اور ان کے خلاف شواہد جمع کرنے کے لیے ایک پانچ رکنی کمیٹی کام کرے گی۔ اس فیصلے کے بعد کمیٹی نے کام شروع کیا اور جنگی جرائم کے مرتکب کئی افراد کی نشان دہی کر کے انہیں شواہد سمیت عدالت میں پیش کیا۔ اس سلسلے کا پہلا اہم مقدمہ ”خاڈ“ کے سابق سربراہ اسد اللہ سردری سے متعلق تھا جسے 26 دسمبر 2005ء کو عدالت میں پیش کر کے اس کے خلاف مقدمے کا آغاز کیا گیا۔

طالبان کی کارروائیوں پر ایک نظر: طالبان کی کارروائیاں اس سال شروع سے آخر تک وقفوں وقفوں سے جاری رہیں۔ حملوں کا زور موسم سرما میں زیادہ ہوا اور خود کش حملوں کو باقاعدہ ایک مہم کے طور پر شروع کر دیا گیا۔ ان کارروائیوں کی ایک جھلک دکھائی جا رہی ہے:

12 جنوری..... مشرقی افغانستان کے صوبہ پکتیکا کے صدر مقام ”شرنہ“ کے ایرپورٹ پر دو امریکی طیارے اترے، امریکی ہلکار اپنے استقبال کے لیے آنے والے افراد کے ساتھ گاڑیوں میں سوار ہو کر ایرپورٹ سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ طالبان نے ان کی ایک گاڑی کو بارودی سرنگ کے دھماکے سے تباہ کر دیا۔ 10 امریکی اور متعدد سرکاری ہلکار مارے گئے۔

25 فروری..... ہلمند میں افغان فوج کے قافلے پر طالبان کے حملے میں 2 کرکٹوں سمیت 9 ہلکار مارے گئے۔

26 جولائی..... طالبان نے ارزگان میں امریکی افغان فوج کے مشترکہ آپریشن میں 50 طالبان کے مارے جانے کے دعوے کو مسترد کرتے ہوئے صرف اپنے 18 افراد کی شہادت کی تصدیق کی۔ طالبان نے دعویٰ کیا کہ حملہ آوروں میں سے 28 افغان فوجی قتل کر دیے گئے۔

29 جولائی..... بگرام میں طالبان نے امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا۔

22 اگست..... زابل میں بم دھماکے سے 5 امریکی ہلاک ہو گئے۔

18 ستمبر..... عین پولنگ کے دن خوست میں 16 امریکی قتل کر دیے گئے۔

25 ستمبر..... زابل میں امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا، 30 افراد مارے گئے۔

28 ستمبر..... کابل میں فوجی کیمپ پر خود کش حملہ ہوا جس میں 15 افغان فوجی اور افسران ہلاک ہو گئے۔

اکتوبر..... میں طالبان کے ترجمان ملا عبداللطیف حکیمی کو سید کے نواح سے گرفتار ہو گئے۔

15 نومبر..... کابل میں 2 خود کش حملے ہوئے جن میں 3 جرمن فوجیوں سمیت 5 افراد مارے گئے۔

16 نومبر..... قندھار میں امریکی فوجی قتلے پر خود کش حملہ ہوا جس میں 4 فوجی مارے گئے۔

18 نومبر قندھار میں 18 افغان فوجی قتل کر دیے گئے۔

20 نومبر طالبان نے نیروز سے ایک بھارتی انجینئر کو اس کے دو افغان ساتھیوں سمیت اغوا کر لیا اور بھارتی تعمیراتی کمپنی کو 48 گھنٹے کے اندر کام بند کر کے افغانستان چھوڑنے کا اہلٹی ملٹم دے دیا۔

یکم دسمبر طالبان نے بادغیس ایرپورٹ پر حملہ کر کے عمارت اور دن دے کو زبردست نقصان پہنچایا۔
3 دسمبر قندھار کے ضلع شاہ ولی کوٹ میں سرکاری گاڑی بم سے آزادی گئی جس سے ضلعی انتظامیہ کا سربراہ 4 افراد سمیت لقمہ اجل بن گیا۔

4 دسمبر کابل میں طالبان نے امریکی ہیلی کاپٹر تباہ کر دیا۔ اس میں سوار تمام افراد مارے گئے۔
6 دسمبر ارزگان میں امریکی فوج نے آپریشن کر کے 22 طالبان کو مارنے کا دعویٰ کیا۔ طالبان نے بتایا کہ صرف ایک طالب شہید ہوا ہے جبکہ 3 امریکی مارے گئے ہیں۔

15 دسمبر کابل میں افغان پارلیمنٹ کے باہر خودکش کار بم دھماکے سے 2 افراد ہلاک اور 6 زخمی ہو گئے۔
28 دسمبر بنگلان میں نیٹو کی گاڑی تباہ کر دی گئی۔ 6 ہلاک ہلاک ہو گئے۔ اس دن پکٹیکا میں طالبان نے ایک خونریز لڑائی کے بعد 150 امریکی موت کے گھاٹ اُتار دیے۔

القاعدہ کے حملے: افغانستان میں ان کارروائیوں کے دوران القاعدہ باہر بھی سرگرم تھی۔ 7 جولائی 2005ء کو لندن میں 7 جگہوں پر ہولناک دھماکے ہوئے جن میں 50 افراد ہلاک اور 700 زخمی ہوئے۔ القاعدہ نے ذمہ داری قبول کرتے ہوئے لندن پر مزید حملوں کی دھمکی بھی دی۔ القاعدہ کے ترجمان نے کہا: ”اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک دیگر ملکوں پر بھی حملے کیے جائیں گے۔ ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک عراق، افغانستان اور فلسطین کے مسلمانوں کی سلامتی یقینی بنائی جائے گی۔“
اس کارروائی کے دو ہفتے بعد 25 جولائی 2005ء کو مصر کے شہر ”شرم الشیخ“ میں ملک کے قومی دن کے موقع پر 3 خودکش دھماکے ہوئے جن میں 90 افراد ہلاک اور 20 زخمی ہوئے۔ القاعدہ نے اس حملے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ 2005ء کی ایک اہم خبر یہ تھی کہ سابق افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف گوانتا نامو بے سے رہا ہو کر نومبر کے دوسرے عشرے میں کابل پہنچ گئے۔

طالبان کے لیے اس سال کا سب سے صدمہ انجینئر واقعہ کا ٹڈی ملا اختر عثمانی کی شہادت تھا جو جاسوس کی سازش کا شکار ہو کر شہید ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ امریکا طالبان میں اپنے خبر شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔

طریقہ کاری یہ تھا کہ جاسوس عین اس جگہ کی نشان دہی کرتا تھا جہاں مطلوبہ لیڈر موجود ہوتا تھا جس کے فوراً بعد دشمن کے طیارے آکر اس پورے علاقے کو کارپٹ بمباری کا نشانہ بنا دیتے تھے۔ ملا اختر عثمانی کی جاسوسی کرنے والا قندھار کا کوئی شخص تھا۔ طالبان نے جلد ہی اسے پہچان لیا۔ وہ قندھار سے غزنی بھاگ کر ملا اختر عثمانی کے بیٹے نے غزنی تک اس کا پیچھا کیا اور اس کے گھر میں گھس کر اسے مار ڈالا۔ ملا اختر عثمانی کی شہادت کے بعد ملا داد اللہ کو جنوبی افغانستان کے عمومی کمانڈر بنایا گیا اور ان کی کارروائیوں نے دشمن کے اوسان خطا کر دیے۔

امریکا اس سال افغانستان میں اپنی افواج کم کرنے اور افغان فوجیوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہا۔ اس کے باوجود امریکی فوجی نشانہ بننے ہی رہے۔ سال کے آخر میں امریکا نے 3 ہزار سپاہی مزید واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ 20 دسمبر کو امریکی وزیر دفاع رمن فیملڈ نے اپنے بیان میں کہا کہ امریکا اب افغانستان میں صرف 16 ہزار سپاہی رکھے گا۔ مجموعی طور پر 2005ء میں افغانستان کے حالات تقریباً جوں کے توں رہے۔ صرف پارلیمانی حکومت قائم ہونے سے کچھ چہرے تبدیل ہو گئے۔ جبکہ جنگوں، پہاڑوں اور دواویوں میں طالبان امریکا اور اس کے اتحادیوں سے بدستور نیروازا تھے۔

2006ء کے حالات

2006ء میں امریکا پاکستان کے سرحدی قبائل کا سروے اس نقطہ نظر سے کرتا رہا کہ کس طرح جنگ کی آگ یہاں تک پھیلانی جائے۔ موسم سرما کے آخری ایام میں سرحد پر امریکی طیارے گولیل ہاک کی پروازیں دیکھی گئیں۔ یہ طیارہ 65 ہزار فٹ بلندی سے 100 میل تک کے علاقے کا سروے کر سکتا ہے۔ اس سال طالبان کی کارروائیاں تیز ہوتی گئیں اور امریکا کو اپنی شکست سامنے نظر آنے لگی۔ 8 مارچ 2006ء کو امریکی خفیہ ادارے کے سربراہ مائیکل مولن نے بگرام میں امریکی فوجیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ طالبان کے حملوں میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ائمہ مساجد کھلم کھلا لوگوں کو درک جہاد دے رہے ہیں اس لیے یہ سال بے حد خطرناک ثابت ہوگا۔ امریکی فوجیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی جھانڈیوں اور بیرکوں تک محدود رہیں۔

ادھر افغان صدر حامد کرزئی نے سال کے شروع ہی سے پاکستان مخالف بیانات دے کر دو طرفہ تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ 14 مارچ کو انہوں نے حزب وحدت کے سابق سربراہ عبداللطیف مزاری کی بری پر ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے پاکستان کو نفاق ڈالنے والا دشمن قرار دے دیا۔ مشرعوں کی یلغار: امریکا افغانستان میں امدادی اور رفاہی کاموں کی آڑ میں عیسائیت کی بھرپور تبلیغ

کر رہا تھا اور ہزاروں مشتری اس مہم میں مصروف تھے۔ ان کے پرکشش جال میں آ کر اب تک 90 ہزار افغان باشندے مرتد ہو چکے تھے۔ طالبان کے دور میں مشنری سرگرمیوں پر پابندی عائد تھی اور مرتد کی شرعی سزا قتل کو قانونی طور پر اپنایا گیا تھا مگر امریکا نے افغانستان کے نئے آئین میں اقوام متحدہ کے چارٹر پر عملدرآمد کو لازمی قرار دلوایا تھا جس کی دفعہ 18 کے تحت کسی شخص کو عقیدے کی بنا پر سزا نہیں دی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ بدقسمت لوگ سزا کے خوف کے بغیر مشنریوں کے ہتھے چڑھ جاتے تھے۔ امریکا کی کوشش اب یہ تھی کہ ان نئے عیسائیوں کو افغانستان میں باقاعدہ اقلیتی حقوق دیے جائیں۔ مارچ 2006ء میں کرنزی حکومت کو اس کے لیے آمادہ کر لیا گیا۔

طالبان کی جانب سے خود کش حملوں کا جو سلسلہ 2005ء میں شروع ہوا تھا، وہ 2006ء میں مزید بڑھ گیا۔ افغان ارکان اسمبلی ان حملوں سے اتنے خوف زدہ تھے کہ انہوں نے مارچ کے اواخر میں سکیورٹی انتظامات بڑھانے اور اس کے لیے ہر رکن کے حفاظتی اخراجات میں 10 ہزار ڈالر کے اضافے کا مطالبہ کر دیا۔

موسم بہار کی آمد طالبان کی جانب سے بڑے حملوں کے آغاز کا نشانہ بنی رہی تھی۔ اس موقع پر 4 اپریل کو برطانوی وزیر دفاع جان ریڈ نے علی الاعلان کہا کہ افغانستان پر طالبان کے دوبارہ قبضے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔

طالبان کی فتوحات کا خطرہ تو اپنی جگہ حقیقت تھا مگر امریکا اس خطرے کو ایک اور مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ افغانستان میں مستقل قیام کر کے چین پر نگاہ رکھنے کی تگ و دو میں تھا۔ افغانستان میں مستقل اڈے بنانے کی منظوری کے لیے امریکی وزیر دفاع رمن فیلڈ نے اپریل 2006ء کے دوسرے ہفتے میں کابل کا دورہ کیا اور حامد کرزئی سے اس معاملے پر مذاکرات کیے۔ حامد کرزئی ذاتی طور پر امریکی افواج کے مستقل قیام کے مخالف تھے اس لیے انہوں نے خود کوئی واضح جواب دینے کے بجائے کہا کہ اس معاملے کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے گی۔ ظاہر ہے امریکا کا اپنی کٹھ پتلی حکومت سے یہ منظوری حاصل کرنا محض رسمی تھا اس لیے افغان پارلیمنٹ میں اس پر بحث اور فیصلے کا انتظار کیے بغیر اسی اوجھن کے قریب افغان علاقے میں ایک بڑے اڈے کے لیے سروے کا کام شروع کر دیا گیا جس کے لیے 123 ماہرین افغانستان بلا لیے گئے۔

گیس یا سپ لائن کا ٹھیکہ: اس کے ساتھ ہی امریکا نے وسط ایشیا کی معدنی دولت کی طرف پہلا قدم بڑھا دیا اور راتوں رات اپنی کمپنی ”نیو کال“ کو ترکمانستان افغانستان گیس پائپ لائن کا ٹھیکہ دلادیا۔

اگرچہ حالات ایسے نظر نہیں آتے تھے کہ منصوبے پر کام شروع کیا جاسکے مگر افغان وزارت اقتصادیات نے 24 اپریل کو اعلان کر دیا کہ منصوبہ اس سال شروع ہو جائے گا۔ جون کے آغاز میں اس منصوبے میں بھارت کی شمولیت کی درخواست بھی منظور کر لی گئی، مگر طالبان کی شدید کاروائیوں کے سبب موسم گرما میں تمام حکومتی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں۔ افسران اور حکام گھروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ منصوبے پر عملدرآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

افغان عوام پر مظالم کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ یکم اپریل 2006ء کو شمالی اتحاد نے بگرام میں لوگوں کی 1250 ایکڑ زمین پر قبضہ کر کے 350 خاندانوں کو بے گھر کر دیا اور وہاں اپنے حامی افراد کو لایا۔ بے گھر افراد کا حرماں نصیب قافلہ ہجرت کر کے پاکستانی علاقے کو ہاٹ آ کر پناہ گزین ہوا۔ 19 اپریل کو خواست میں 5 افغان شہری امریکی بمباری کا نشانہ بن کر شہید ہو گئے۔ 11 مئی کو ملک کے ممتاز عالم دین حبیب اللہ شریعتی کو اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ انہوں نے لویہ جرگہ میں امریکی اڈوں کی مخالفت کی تھی اور ان کی تقریر کے بعد 600 ارکان امریکی اڈوں کے مخالف ہو گئے تھے۔

طالبان کے طوفانی حملے: اس دوران طالبان کی کارروائیاں شروع ہو چکی تھیں۔ 15 اپریل کو انہوں نے امریکی فوجی قافلے پر حملہ کر کے 6 آئل ٹینکر تباہ کر دیے۔ اسی دن قندھار ایئر پورٹ پر بموں سے حملہ کر کے عمارت کو شدید نقصان پہنچایا۔ زابل میں بارودی سرنگ حملہ ہوا جس سے تباہ ہونے والی گاڑی میں 9 افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔ 16 اپریل کو زابل میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا جس میں سوار 12 فوجی مارے گئے۔ 21 اپریل کو زابل کے ضلع ارغنداب میں ایک جھڑپ کے دوران پولیس کمشنر سمیت 11 حکومتی اہلکار ہلاک ہو گئے۔ طالبان نے حریف کے اسلحے اور 5 گاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ 10 مئی کو کنڑ میں چنیوک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں 10 امریکی اہلکار مارے گئے۔

حامد کرزئی، تعاون کے طلب گار: حامد کرزئی کو گزشتہ 4 سال کے تجربات نے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ اپنے محدود اختیارات کے باوجود کسی نہ کسی طرح عوامی نفرت کو کم کریں اور طالبان سے صلہ و صفائی کا راستہ نکالیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے امریکی فوج کو درخواست بھیج کر 30 اپریل کو بگرام جیل سے 86 اور قندھار جیل سے 16 افغان قیدی رہا کروا دیے۔ انہوں نے صدر ہش کو بھی درخواست بھیجی کہ گوانتانامو بے میں قید افغان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے مگر مئی کے آخری عشرے میں انہوں نے یہ درخواست مسترد کر دی۔

ان کے آغاز میں حامد کرزئی نے طالبان اور حزب اسلامی کو مفاہمت کی پیش کش بھی کی تھی جسے

طالبان نے سختی سے مسترد کر دیا۔ حزب اسلامی نے بھی حوصلہ افزا جواب نہ دیا۔ مہینے کے آخری عشرے میں جی پیٹش کس مولانا جلال الدین حقانی کو کی گئی اور ساتھ میں انہیں 2 صوبوں کی گورنری کالاج بھی دیا گیا۔ مولانا جلال الدین حقانی نے اس پیش کش کو رد کرتے ہوئے جواب دیا: ”حامد کرزی کی امریکی فوج کو نکل جانے کے لیے کہیں تو میں ایک لاکھ طالبان کے ساتھ ان کی مدد کے لیے تیار ہوں۔“ اس کے فوراً بعد طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا یہ بیان سامنے آیا: ”افغان حکمران نے اپنا ملک امریکا کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ افغان عوام ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔“ صاف معلوم ہوتا تھا کہ طالبان امریکا کے زیر سایہ افغان حکومت کو کسی قسم کے مذاکرات اور مفاہمت کے قابل نہیں سمجھتے۔

قرآن مجید کی بے حرمتی پر اشتعال: مئی کے مہینے میں ایک اور زلزلہ خیز واقعہ رونما ہوا۔ امریکی فوج گوانتانامو بے کے عقوبت خانے میں کئی بار قرآن مجید کی بے حرمتی کر چکی تھی۔ افغانستان اور عراق میں بھی وہ یہ ظلم ڈھا چکی تھی۔ 8 مئی کو ایسا ہی ایک تازہ واقعہ پیش آیا جس سے اسلامی دنیا خصوصاً افغانستان میں مل جل چکی۔ 13 مئی کو افغان چیف جسٹس فضل ہادی شنواری نے مطالبہ کر دیا کہ امریکا اس گستاخی پر معافی مانگے۔ افغانستان میں پانچ دن تک احتجاجی مظاہرے ہوتے رہے۔ جنہیں روکنے کے لیے سرکاری اہلکاروں کے تشدد اور فائرنگ سے متعدد مظاہرین زخمی ہو گئے۔ 15 مئی کو بدخشاں کے مرکز فیض آباد میں 300 علماء نے ایک کانفرنس میں اعلان کیا کہ امریکا 3 دن کے اندر اندر توہین قرآن مجید کے مرتکبین کو ہمارے حوالے کرے ورنہ جہاد کا اعلان کر دیا جائے گا۔ بلخ میں بھی مظاہرے ہوئے۔ کابل میں نامعلوم افراد نے بھارتی سفارت خانے پر راکٹ داغ دیے۔ یہ رویہ بتا رہا تھا کہ افغان عوام اسلام دشمن طاقتوں کے کجبان ہونے کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور اب ان کے مقابلے میں خود بھی متحد ہو رہے ہیں۔

افغان فوج میں بھرتیوں کی مہم: امریکا کے مظالم اور گستاخیوں کے رد عمل میں تحریک جہاد کو تازہ خون میسر آ رہا تھا۔ دوسری طرف امریکا اور اس کے اتحادیوں میں اپنی مزید افواج کو جنگ کی بجٹی میں جمبو کنے کی ہمت نہیں تھی اس لیے انہوں نے بڑے پیمانے پر افغان باشندوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے مطابق 15 مئی 2006ء کو کرزی حکومت نے طالبان کے دفاع سے لیے ایک لاکھ 20 ہزار افغانوں پر مشتمل ملیشیا فورس تیار کرنے کا اعلان کر دیا۔ اعلیٰے میں بتایا گیا کہ ہر صوبے سے کم از کم 2 ہزار اور زیادہ سے زیادہ 10 ہزار افراد لیے جائیں گے۔ ہر سپاہی کو ساڑھے چار ہزار روپے تنخواہ اور دیگر مراعات دی جائیں گی۔

کرزی حکومت یہ اعلان ایسے وقت میں کر رہی تھی کہ میڈیا پر کابل کی پس ماندگی اور افغان شہریوں کی

کسپیری پر مشتمل ایک چشم کشا سروسے رپورٹ کا چرچا تھا جس کے مطابق کابل میں گزشتہ چار سال کے دوران ہزاروں کی تعداد 5 ہزار سے بڑھ کر 37 ہزار تک پہنچ گئی تھی اور خطرہ تھا کہ یہ تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کر جائے گی۔ دوسری طرف تو بین قرآن کے واقعے کے سبب عوام میں امریکا سے نفرت کے جذبات انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اس لیے کسی کو توقع نہیں تھی کہ فورس کی تشکیل کا یہ منصوبہ کامیاب ہوگا۔ کرنل کی حکومت کی جانب سے ملیشیا فورس کے قیام کے اعلان کے جواب میں 22 مئی کو طالبان کمانڈر ملا داد اللہ نے بیان دیا: ”ہمارے فدائی حملہ آوروں کی تعداد 1200 سے زائد ہے جو ایک اشارے پر جاں نثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔“ انہوں نے کہا: ”ملا محمد عمر آج بھی طالبان کی قیادت کر رہے ہیں۔“ اتنی بڑی تعداد میں فدائی حملہ آوروں کے تیار ہونے کی خبر نے طالبان مخالف حلقے کے بہت سے لوگوں کے قدم بھرتی کے مراکز میں جانے سے روک دیے۔

کابل میں کرفیو: دوسرے 30 مئی کو کابل میں ایک امریکی ڈرائیور نے نشے کی حالت میں 2 راہبوں کو چل دیا جس پر افغان عوام نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ دیکھ کر امریکی فوجی آگے اور احتجاج کے لیے جمع ہونے والے لوگوں پر فائر کھول دیا جس سے 50 افراد جاں بحق اور 140 زخمی ہو گئے۔ اس سانحے سے دارالحکومت میں حالات بے حد کشیدہ ہو گئے اور غیر معینہ مدت کے لیے کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اس قسم کے حالات عوام کو امریکا سے مزید متنفر اور کرنل کی حکومت سے مایوس کرنے کا باعث بن رہے تھے۔

ملا داد اللہ کے حملے اور دھمکی: طالبان نے اس موسم گرما میں ملا داد اللہ کی قیادت میں امریکی، اتحادی اور افغان فوجوں پر تباہ توڑ حملے کرنے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ جون کے آغاز میں طالبان نے افغان سرکاری افواج کو دھمکی دیتے ہوئے اعلان کیا کہ افغان فوجی ایک ہفتے میں ہتھیار ڈال دیں یا ملازمت چھوڑ کر فرار ہو جائیں۔ بصورت دیگر ان کا انجام بہت برا ہوگا۔ طالبان کی اس دھمکی سے دہشت زدہ ہو کر چند دنوں کے اندر اندر 15 ہزار افغان فوجی نوکری چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس طرح یہ اُمید خاک میں مل گئی کہ کرنل کی حکومت کبھی ایک لاکھ 20 ہزار افراد کی فوج تیار کر پائے گی۔

امریکی سفارت خانے کی رپورٹ: 12 جون 2006ء کو کابل کے امریکی سفارت خانے نے واشنگٹن کو ایک رپورٹ ارسال کی جس میں بتایا گیا کہ امریکا کے خلاف افغان عوام کی زبردست نفرت ایک اسلامی انقلاب کی طرف بڑھ رہی ہے۔ عوام آج بھی طالبان سے محبت کرتے ہیں۔ وہ عرب مجاہدین کو حضورؐ کی اولاد سمجھ کر تحفظ دیتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ جنوبی اور مشرقی افغانستان میں طالبان کی بیشتر صوبوں پر حکمرانی ہے جو ہمارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

انہی دنوں امریکا کو عراق کی جنگ میں ایک نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں کے عظیم مجاہد کماٹر الرزقادی شہید کر دیے گئے۔ عراقی مجاہدین نے ابو حمزہ کو الرزقادی کا جانشین مقرر کر دیا۔ اس واقعے کے ردِ عمل میں 13 جون کو طالبان نے بھی اعلان کیا کہ الرزقادی کا بدلہ لینے کے لیے ہم 150 فدائی بمبار عراق بھیجیں گے۔ طالبان کے اس ردِ عمل سے پتا چل رہا تھا کہ عراق اور افغانستان میں لڑنے والوں کے درمیان زبردست تعلق اور گہرا رشتہ موجود ہے۔ الرزقادی کی شہادت کے بعد طالبان نے افغانستان میں بھی اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ ملا محمد عمر نے کماٹر ملا داد اللہ کو امریکیوں کے خلاف جہاد کی کمان سونپ دی تھی۔ ملا داد اللہ طوفانی کارروائیوں سے امریکا اور افغان فوجی دونوں ہی خوفزدہ تھے۔

جولائی میں شائع ہونے والے امریکی میگزین ”نیوز ویک“ نے اپنی اشاعت میں ملا داد اللہ کی کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

”ملا داد اللہ افغانستان کے الرزقادی بن گئے ہیں۔ وہ تیز دھار برجھے کی صورت میں میدانِ کارزار میں اپنے گوریلوں کے سرخیل ثابت ہو رہے ہیں۔ ملا عمر کی طرف سے ملا داد اللہ کو حملوں کے لیے خود مختاری حاصل ہے۔ نوجوان ان کے شانہ بشانہ کارروائیوں میں حصہ لیتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔“

تبصرہ نگار نے اعتراف کیا کہ سقوطِ کابل کے بعد طالبان کی کارروائیوں کی حالیہ لہر شدید تر ہے۔ طالبان کی کارروائیوں کی تیز ترین لہر: آئیے اب ذرا طالبان کی کارروائیوں کی اس تیز ترین لہر پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو مئی 2006ء کے اواخر میں شروع ہو کر موسمِ گرما کے اختتام تک جاری رہی۔

21 مئی کو جنوبی افغانستان میں طالبان اور اتحادیوں کے درمیان کئی دن تک خونریز جنگ ہوئی۔ 22 اتحادی ہلاک اور 89 طالبان شہید ہوئے۔

3 جون کو امریکی ایف 16 طیارہ خوست میں القاعدہ کا نشانہ بن کر تباہ ہو گیا۔

12 جون کو طالبان نے قندھار پولیس کے سربراہ سمیت 13 اہلکار پر غالی بنا لیے۔ دو دن بعد سربراہ سمیت 8 غالی ہلاک کر دیے۔

جون کے وسط میں نیٹو افواج طالبان کے خلاف آپریشن کے لیے ہلندہ پہنچ گئیں۔ 21 جون کو طالبان کی تلاش میں ناکامی پر امریکی فوج نے قندھار کے ضلع میانشین میں اندھا دھند بمباری کر کے 60 شہریوں کو شہید کر دیا۔

29 جون کو کونڑ میں طالبان اور امریکی فوج کے درمیان خونریز جنگ جاری تھی۔ معرکے میں 28

امریکی ہلاک ہوئے جبکہ 10 شہریوں اور 10 مجاہدین نے شہادت پائی۔

9 جولائی کو بگرام ایریس کی امریکی جیل سے القاعدہ کے چار اہم راہنما فرار ہو گئے۔ ان میں سے ایک دوبارہ پکڑا گیا جبکہ باقی ہاتھ نہ آ سکے۔

ترجمانوں کا قحط پڑ گیا: انہی دنوں حامد کرزئی نے طالبان کو زمانے کے لیے بگرام جیل سے 76 طالبان قیدی رہا کر دے دیے مگر طالبان رکنے میں نہ آئے۔ 5 جولائی کو انہوں نے ہلمند میں 7 افغان پولیس اہلکار مار ڈالے۔ اس کے ساتھ ساتھ طالبان نے ایک نئی حکمت عملی اپناتے ہوئے امریکی ترجمانوں کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ 11 جولائی کو قندھار ایرپورٹ کے قریب کاریم دھماکے میں 17 ترجمان بیک وقت مارے گئے۔ اسی ہفتے دیگر صوبوں میں 9 ترجمانوں کو تاک تاک کر نشانہ بنایا گیا۔ امریکی فوج کو پہلے مقامی لوگوں سے گفتگو کے لیے ترجمان بہت مشکل سے ملتے تھے، کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ امریکی افسران عموماً اپنے ترجمانوں سے بدظنی بھی کرتے ہیں۔ اس وقت جہتی تشدد سے بے حال ہونے والے 6 ترجمان ہسپتالوں میں زیر علاج تھے۔ اب طالبان کے ترجمانوں پر حملوں کے باعث لوگ اس ملازمت سے مزید گریز کرنے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ امریکی حکام اور افسران کو ترجمان ملنا مشکل ہو گئے۔

نیو افواج کی جنوبی افغانستان سے پسپائی: نیو افواج نے دو ماہ کی مسلسل ناکام کوششوں کے بعد اگست کے وسط میں ہلمند سے واپسی اختیار کر لی۔ نیو افواج کے کمانڈر ”جنرل ڈیوڈ رچرڈ“ نے اعتراف کیا کہ جنوبی افغانستان میں مزید قیام ممکن نہیں ہے۔ جنرل ڈیوڈ نے صرف جنوبی صوبوں کو کنٹرول کرنے کے لیے 85 ہزار فوجیوں کی تعیناتی کی درخواست دی تھی۔ مصرین کے مطابق یہ اعتراف اور درخواست نیو کی کھلی شکست کی دلیل تھی۔ نیو افواج کی ہلمند سے پسپائی پر ملا داد اللہ نے اعلان کیا: ”ہم افغانستان کی سرزمین نیو پر جنگ کر دیں گے۔“

حقیقت یہ تھی کہ نیو افواج امریکا کا آخری سہارا اور آخری اُمید تھی۔ ان کی پسپائی امریکا کی یقینی شکست کی علامت تھی۔ طالبان کی تحریک جہاد فتح مبین کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اگست کے اواخر میں سامنے آنے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ صرف چھ ماہ میں کابل میں 30 قنداری حملے ہوئے ہیں جن میں 150 اتحادی مارے گئے ہیں۔ رواجی قسم کے 750 حملے ہوئے جس میں 1220 افغان فوجی ہلاک ہوئے۔ امریکا کے 6 ہیلی کاپٹر، ایک مسافر طیارہ، 15 فوجی گاڑیاں اور 25 آئل میگزین تباہ ہوئے۔ 92 مجاہد شہید ہوئے۔ یہ اعداد و شمار صرف کابل اور گردونواح کی کارروائیوں کے ہیں۔ اس

سے ملک بھر کی کارروائیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

طالبان کا نمائندہ ملا عبدالرحیم نے اکتوبر 2006ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ”نیو افواج طالبان کی موجودگی کی خبر سن کر ہی بھاگ جاتی ہیں۔“

انہوں نے کہا کہ طالبان اب تک اپنے سقوط کے وقت ساتھ لیا گیا اسلحہ اور گاڑیاں استعمال کر رہے ہیں۔
طالبان کی فتوحات: ان کارروائیوں کے نتیجے میں موسم گرما کے اختتام سے پہلے پہلے طالبان نے چند شہری آبادیوں کو چھوڑ کر جنوبی افغانستان کا بقیہ علاقہ تقریباً مکمل طور پر آزاد کرالیا۔ یہاں قندھار، بلخ، فراء، نیمروز، زابل اور ارزگان میں باقاعدہ طالبان کے گورنر اور کوشنر کام کرنے لگے۔ شرعی عدالتیں سرگرم ہو گئیں۔ پولیس اور انتظامی جنس کا نظام متحرک ہو گیا۔ کرنڈی انتظامیہ کے امارا اب بھی یہاں موجود تھے، مگر ان کی حیثیت محض تماشائی کی سی تھی۔ ان کی موجودگی کا فائدہ یہ تھا کہ امریکی طیارے مکمل کھلا شہری آبادیوں اور بستیوں کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔

5 ستمبر کو طالبان نے قندھار کے ضلع پنجوائی میں اسٹینگر میزائل فائر کر کے نیو کاہلیارہ ”نمروذ“ مار گرایا جس میں 65 اتحادی ہلاک ہو گئے۔ اسی دن ایک معرکے میں اتحادیوں کی 5 گاڑیاں اور 7 ٹینک تباہ ہوئے۔ اتحادیوں کے طیاروں نے انتقامی طور پر اندھا دھند بمباری کی جس سے 195 شہری شہید ہو گئے۔ ایک اور معرکے میں طالبان نے اتحادیوں کو گھیر لیا۔ انہوں نے فضائی مدد طلب کی تو کمک آنے والے بمبلی کا پٹروں نے اپنی ہی فوج کو نشانہ بنا دیا جس سے 5 اتحادی اور 5 افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔

امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزا رائس نے 12 ستمبر 2006ء کو اپنی پانچ سالہ جنگ اور افغانستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ”حیرت ہے پانچ برس بعد بھی طالبان کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔“
صلح و صفائی پر غور و خوض: سال 2006ء کے اواخر میں یہ واضح نظر آنے لگا کہ طالبان کے مخالفین تشکیلی کے احساس سے بوجھل ہو کر بڑی سنجیدگی سے مذاکرات کی راہ کا سرچرڈ ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے کچھ دنوں پہلے وزیر داخلہ ضرار احمد مقبل کی سرکردگی میں ایک جائزہ کمیشن مقرر کیا تھا تاکہ وہ طالبان کی کامیابیوں اور عوام کی ان سے ہمدردی کی وجوہ معلوم کرے۔ کمیشن نے طالبان کے حامی علاقوں کا جائزہ لینے کے بعد ستمبر 2006ء کے آغاز میں یہ رپورٹ دی کہ غیر ملکی افواج کی بلا جواز کارروائیاں افغان عوام کو مشتعل کر رہی ہیں۔ رپورٹ سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلا تھا کہ لوگ غیر ملکی افواج کے مظالم کے رد میں طالبان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس رپورٹ کے ذریعے حامد کرزئی امریکی حکام پر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اب افغانستان میں آپریشن بند کر کے طالبان سے مذاکرات کرنا ناگزیر ہے۔

ادھر برطانیہ اور کینیڈا کے فوجی کام بھی امریکا پر زور دے رہے تھے کہ طالبان سے کوئی اجازت اس معاہدہ کر کے یہ بھگڑا قسم کیا جائے۔ آخر کار ستمبر 2006ء کے وسط میں امریکا نے کرزئی حکومت کو ہم زبان بناتے ہوئے طالبان کو مذاکرات کی پیشکش کر دی۔ طالبان نے اس بار بھی غیر ملکی افواج کی واپسی کے بغیر مذاکرات کے امکان کو مسترد کر دیا۔ طالبان کی جانب سے ملا داد اللہ نے جواب دیتے ہوئے کہا: ”غیر ملکی افواج کو نکالنے کے لیے آخری فرد تک لڑیں گے۔“

طالبان کے اس دو ٹوک جواب کے باوجود امریکا مذاکرات کا کوئی راستہ ڈھونڈتا رہا۔ پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کا مشورہ بھی اب یہی تھا کہ باعزت صلح کر لی جائے۔ جنرل پرویز مشرف نے 20 ستمبر کو اپنے بیان میں کہا: ”طاقت ہر مسئلے کا حل نہیں ہے۔ افغان حکومت بھی شمالی وزیرستان معاہدے کے ہمارے تجربے سے فائدہ اٹھائے۔“

نیٹو کی تین شرائط: ستمبر کے اواخر میں نیٹو افواج نے طالبان سے سے رابطہ کیا اور انخلاء پر مشروط رضامندی ظاہر کی۔ نیٹو ہائی کمان کی پیشکش اہم شرائط یہ تھیں:

❖ طالبان القاعدہ سے مکمل لاتعلقی اختیار کریں۔

❖ آئندہ القاعدہ کو پناہ نہ دینے کا وعدہ کریں۔

❖ اتحادی افواج کو افغانستان کی تعمیر نو کے لیے یہاں قیام کی اجازت دیں۔

طالبان کے لیے یہ تینوں شرائط ناقابل قبول بلکہ ناقابل سماعت تھیں، اس لیے مذاکرات کی بجائے منڈھے نہ چڑھ سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کا طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالنے کا مقصد صرف جنگ بندی یا مزید تیاری کی سہلت حاصل کرنا تھا۔ وہ افغانستان کو آزاد چھوڑ دینے اور یہاں کا مستقبل مقامی لوگوں کے سپرد کرنے کے لیے مخلص نہیں تھے یہی وجہ تھی طالبان بھی ان سے مذاکرات کے لیے سنجیدہ نہ ہوئے۔

اس جنگ نے ملک کو کیا دیا؟ افغانستان پر غیر ملکی افواج کے اس اجتماع نے ملک کو کیا دیا تھا۔ اقوام متحدہ کا ادارہ انسداد منشیات 2006 کے ماہ ستمبر میں اعلان کرتا ہے: ”اس سال افغانستان میں 59 فی صد سے زائد پوسٹ کاشت کی گئی جس سے افیون کی پیداوار 6100 ٹن تک پہنچ گئی۔“

برطانوی اخبار انڈی پینڈنٹ لکھتا ہے:

”دہشت گردی کی عالمی جنگ میں اب تک ایک لاکھ 80 ہزار افراد ہلاک اور 45 لاکھ افراد بے

گھر ہو چکے ہیں۔“

اخبار ٹیلی گراف 8 اکتوبر کی اشاعت میں بتاتا ہے:

”عراق اور افغان جنگ کے زخمی فوجیوں نے اسکاٹ لینڈ اور عراق کے ہسپتالوں کو بھردیا ہے۔“
13 نومبر کو میڈیا پر آنے والے ایک سروے میں اتحادی ممالک کے عوام نے رائے دی کہ بش نے دنیا کو خطرے میں جھونک دیا ہے۔

کرزئی کی مشکلات: حامد کرزئی کی مشکلات روز افزوں تھیں۔ اگست میں رشید دوستم اور جنرل عبدالملک کی بڑھتی ہوئی طاقت نے انہیں پریشان کر دیا کیونکہ روس نے اپنے ان دونوں مہروں سے تعلقات بحال کر لیے تھے اور انہیں بھرپور عسکری و مالی امداد دینے لگا تھا۔ ان کی پارٹیاں خود مختار ہوتی جا رہی تھیں۔ تنگ آ کر حامد کرزئی نے 21 اگست کو دارنگ دی کر دوستم کی ”جنیش ملی“ اور عبدالملک کی ”آزاد وطن“ پارٹیاں دوامہ کے اعداء غیر مسلح ہو جائیں ورنہ ان پر پابندیاں عائد کر دوں گا مگر ان سر بھروں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ حامد کرزئی نے مجبور ہو کر ستمبر 2006ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اجلاس کے موقع پر صدر بش سے درخواست کی کہ افغانستان اور پاکستان کے اشتراک سے ایک بڑا جرگہ منعقد کر کے طالبان سے مذاکرات کا کوئی راستہ تلاش کیا جائے۔ ستمبر کے آخری عشرے میں حامد کرزئی کو اس وقت مزید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے امریکا کو افغان فوج کے لیے طیارے، ٹینکوں، ہیلی کاپٹر اور دیگر بھاری ہتھیار فراہم کرنے کی تحریری درخواست دی مگر صدر بش نے یہ درخواست سختی سے مسترد کر دی۔

مجددی کی دھمکی: اکتوبر کو صبح اللہ مجددی نے جو کرزئی کے اہم اتحادی اور سینیٹ کے چیئرمین تھے کرزئی کو حکومت سے علیحدگی کی دھمکی دے دی۔ پروفیسر مجددی نے کابل میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب میں کہا: ”حکومت کرپشن میں انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ افغان قوم کے ساتھ بدترین خیانت کی جا رہی ہے۔ غیر ملکی مداخلت اور بد امنی نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں اس قومی جرم میں مزید شامل نہیں رہنا چاہتا۔ اگر دوامہ کے اعداء نا اہل افراد کی برطرنی اور بد عنوان اداروں کی اصلاح نہ کی گئی تو میں حکومت سے تعاون ختم کر دوں گا۔“ مجددی کی یہ دھمکی کرزئی کے لیے غیر معمولی طور پر اہم تھی کیونکہ حامد کرزئی روس سے جہاد کے دور میں مجددی کی تنظیم کے ایک رکن تھے۔

2006ء میں کرزئی طالبان کے حملوں میں بال بال بچے رہے۔ سال کے اوائل میں وہ قندھار میں قبائلی کے جرگے سے خطاب کرتے ہوئے طالبان کے خود کش حملے میں بال بال بچے تھے۔ سال کے دوران ایک موقع پر طالبان نے گردیز میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ اس میں حامد کرزئی بھی سوار ہیں۔ اس حملے میں بھی کرزئی محفوظ رہے۔

صدام حسین کو پھانسی: 2006ء کا اختتام امریکا کی عالم اسلام پر مسلط کردہ جنگ کے ایک تہلکہ خیز واقعے پر ہوا۔ 30 دسمبر 2006ء کو عراق کے دارالحکومت بغداد میں سابق عراقی صدر صدام حسین کو پھانسی دے دی گئی جس سے پورے عالم اسلام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

صدام حسین 28 مارچ 1937ء کو عراق کے شہر کربلا میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالمجید تھا۔ دورانِ تعلیم وہ بعث پارٹی کے سرگرم لیڈر بن گئے۔ 1979ء میں انہوں نے بغاوت کر کے عراق کی حکومت سنبھالی۔ اسی سال ایران میں آیت اللہ خمینی کے زیر قیادت برپا ہونے والے شیعہ انقلاب اور افغانستان پر سوویت یونین کی یلغار نے پورے خطے کا منظر نامہ تبدیل کر دیا۔ عالمی طاقتوں کی بھڑکائی ہوئی آگ میں ایران اور عراق بھی کود گئے اور دونوں ملکوں میں دس سال تک خوریز جنگ جاری رہی۔ روس ایران کا اور امریکا عراق کا پشت پناہ تھا۔ افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے ساتھ ہی عالمی طاقتوں نے ایران عراق جنگ میں ایندھن ڈالنے کا سلسلہ بند کر دیا اور یہ 8 سالہ جنگ اختتام پذیر ہو گئی۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے آثار نمایاں ہوتے ہی امریکانے پوری دنیا کا واحد حکمران بننے کی پالیسی پر عمل شروع کر دیا تھا۔ اس کے لیے وہ غلطی ممالک، ایران اور مشرق وسطیٰ میں قدم جمانا چاہتا تھا۔ چنانچہ صدام حسین کو اگست 1990ء میں کویت پر قبضہ کرنے کا راستہ دکھایا گیا۔ اس کے بعد امریکا عرب دنیا کو صدام سے بچانے کا فریب دے کر اپنے اتحادیوں سمیت خلیج میں آدھکا۔ یہ جنگ فروری 1991ء میں عراق کی شکست پر ختم ہوئی تاہم صدام کی حکومت ختم نہ کی جاسکی۔ امریکا کا اصل چہرہ دیکھنے کے بعد صدام حسین نے بڑی طاقتوں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کر لیا جس کی وجہ سے عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اکتوبر 2001ء میں افغانستان پر حملہ کرنے کے۔ اتھ ہی امریکانے عراق کو بھی اپنی مہم کا اہم ہدف قرار دے دیا تھا۔ چنانچہ مارچ 2003ء میں امریکا اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر یلغار کر کے صدام کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ صدام حسین 13 دسمبر 2003ء کو ایک خفیہ تہ خانے سے گرفتار کر لیے گئے۔ ان پر 140 سے زائد افراد کو 1982ء میں ماورائے عدالت قتل کرنے کا مقدمہ چلتا رہا جس کے نتیجے میں انہیں سزائے موت سنائی گئی۔

سزا کے لیے عین عیدالاضحیٰ کا دن مقرر کر کے امریکانے مسلمانوں کی بے بسی کا بھرپور مذاق اڑایا۔ درحقیقت یہ واقعہ ان بے حییت مسلم حکمرانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا جو امریکا کے مفادات کے محافظ بن کر اپنے مسلمان بھائیوں سے نبڑا کرتے تھے۔ ان کا انجام صدام حسین سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔



ماخذ و مراجع

- ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 8، 9، 10
- ہفت روزہ بکیر، فرامیڈے اسٹیکل، غازی: جلد 2005ء، 2006ء
- قومی اخبارات - امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2005ء، 2006ء
- روزنامہ اسلام کراچی 2005ء، 2006ء

انتالیسواں باب

بش کا آخری راؤنڈ

2007ء کے حالات

افغان مہاجرین کی واپسی کا مسئلہ: افغانستان کے حالات سے پاکستان براہ راست متاثر ہو رہا تھا۔ جزل پرویز شرف کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ آخر پاکستان کب تک لاکھوں افغان مہاجرین کا بوجھ برداشت کرے گا جو اپنے ملک کے حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے پاکستان میں رہائش پذیر ہیں۔ مئی 2006ء کے آغاز میں جزل پرویز نے اقوام متحدہ سے باقاعدہ یہ مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں پاکستان میں قائم افغان مہاجر کیمپ افغانستان میں منتقل کر دے۔ جنوری 2007ء کے وسط میں جزل پرویز نے حکومت پاکستان کے افسران کا اعلیٰ سطحی اجلاس بلا کر یہ فیصلہ کر ڈالا کہ افغان مہاجرین کو اقوام متحدہ کے ذریعے جلد واپس روانہ کر دیا جائے گا، مگر اقوام متحدہ اس میں قرارداد واقعی دلچسپی لیتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اغوا کے واقعات: 2007ء میں طالبان نے خود کش حملوں کے علاوہ اپنے مطالبات کے لیے اہم افراد کو اغوا کرنے کی حکمت عملی بھی اپنائی اور اس میں خاصے کامیاب رہے۔ جنوری 2007ء میں انہوں نے ہلمند میں 52 سالہ اطالوی صحافی ڈینیل ماسٹر وگان کو ایک افغان صحافی اجل نقش بندی اور ڈرائیور سید آغا سمیت اغوا کیا۔ کارروائی ملا دادا اللہ کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ طالبان نے اطالوی صحافی کے بدلے پانچ اہم افراد رہا کر دئے جن میں سابق طالبان ترجمان عبداللطیف حکیمی، ملا دادا اللہ کے بھائی ملا عبدالغفور اور کمانڈر استاد یا سر شامل تھے۔ اطالوی صحافی کو حسب وعدہ رہا کرنے کے بعد ملا دادا اللہ کے حکم پر ڈرائیور سید آغا اور اجل نقش بندی کو قتل کر دیا گیا۔

قلعہ موئی کا قفسیہ: 2007ء کے آغاز میں ہلمند کے علاقے موئی قلعہ نے میڈیا پر بڑی اہمیت اختیار کر لی۔ موئی قلعہ کو ہلمند کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں فراہ اور قندھار کی سڑکوں کے سنگم پر ایک

قدیم قلعہ تھا جسے 220ء میں کوشانی حکمرانوں نے تعمیر کیا تھا۔ یہاں تھیں۔ اصل میں قلعے کا نام کچھ اور تھا مگر اسلامی دور میں یہ موسیٰ قلعہ کہلانے لگا۔ اس علاقے کو خشیات کے گڑھ کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل تھی۔ گزشتہ سال یہاں طالبان اور نیٹو فورسز میں کئی جہزپوں کے بعد آخر کار مقامی سٹل پر جنگ بندی کا ایک معاہدہ ہوا۔ 17 اکتوبر 2006ء کو کیے گئے طالبان اور نیٹو فوج کے باہمی معاہدے میں طے کیا گیا تھا:

① نیٹو فورسز موسیٰ قلعہ سے نکل جائیں گی۔

② طالبان یہاں حملہ نہیں کریں گے۔

③ برطانوی فوج، جس کے پاس اس سال نیٹو فورسز کی کمان تھی، اس علاقے میں صرف ایون کو تلف کرنے کے لیے داخل ہو سکے گی۔

④ وہ عوام کو ایذا نہیں دے گی۔

⑤ فریقین کے انخلاء کے بعد علاقے کا انتظام مقامی عمائد کریں گے۔

معاہدے کے بعد طالبان نے علاقہ خالی کر دیا اور نیٹو افواج بھی وہاں سے چلی گئیں، مگر 2007ء کے آغاز میں 26 جنوری کو نیٹو فورسز نے طیاروں سے بمباری کر کے موسیٰ قلعہ کی آبادی کو شدید نقصان پہنچایا۔ گاؤں کی مسجد بھی شہید ہو گئی۔ اس طرح معاہدہ ٹوٹ گیا اور طالبان نے پیش قدمی کر کے موسیٰ قلعہ کا کنٹرول سنبھال لیا۔ ادھر نیٹو فورسز کی کمان برطانیہ سے امریکی افواج کی طرف منتقل ہو گئی۔ امریکی افسران نے کمان سنبھالتے ہی پورے افغانستان میں طالبان کے خلاف کارروائیاں تیز کر کے اپنی دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔ موسیٰ قلعہ میں بھی تجدید معاہدہ کی بجائے آپریشن کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ طالبان نے رد عمل کے طور پر مزید پیش قدمی کی اور نیٹو کے منہ پر خاک ڈالتے ہوئے 25 فروری کو ”بکواہ“ پر بھی قبضہ کر لیا۔

شمالی اتحاد کا کرزئی کے خلاف جلوس: ادھر کامل میں شمالی اتحاد نے حامد کرزئی کے خلاف حملاً کھول لیا تھا۔ 23 فروری کو دارالحکومت میں شمالی اتحاد کے حامی عوام نے سڑکوں پر کرزئی کے خلاف کھلا مظاہرہ کیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ مظاہرے کی قیادت کرزئی حکومت کے نائب صدر کریم ظیلی، وزیر دفاع جنرل نجیب اور چیف آف آرمی اسٹاف رشید دوستم کر رہے تھے۔ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ کرزئی کے دیگر اقدامات کو نظر انداز کر کے صرف یہ الزام اٹھا رہے تھے کہ کرزئی سابق مجاہدین کو حکومت سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

نیٹو کی کچھ کامیابیاں: سال کے آغاز میں نیٹو کو کچھ کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں نیٹو افواج نے جنوبی افغانستان کے علاقے ”گرم لیہ“ میں طالبان کے خلاف ایک اور بڑا آپریشن شروع کیا جس میں 13 طالبان شہید ہو گئے اور طالبان کے ترجمان ڈاکٹر حنیف کو گرفتار کر لیا گیا، مگر اتحادی افواج کی ان چھوٹی موٹی کامیابیوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میڈیا پر مغربی ممالک کے بڑے بڑے دانشور اور چوٹی کے مصنفین اعتراف کر رہے تھے کہ امریکا کا قریب یہ جنگ ہارنے والا ہے۔ قندھار، کنڑ، لغمان، بلمند، خوست، پکتیکا، پکتیا، لوگر، زابل، ارزگان اور غزنی میں طالبان نے مضبوط نیٹ ورک قائم کر رکھا تھا۔ سابق مجاہد، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ طالبان سے ملے جا رہے ہیں۔ طالبان کا دوبارہ غلبہ سب کو کھلی آنکھوں سے نظر آ رہا تھا۔ بس امریکا اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

طالبان سے مذاکرات کے لیے جرگہ بلائے کی تجویز: 5 فروری 2007ء کو سابق افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ عالمی برادری طالبان کو اپنے موقف کی وضاحت کا موقع دے۔ اس سے قبل حامد کرزی کی ستمبر 2006ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اجلاس کے موقع پر اس بارے میں صدر بش کو اہم مشورہ دے چکے تھے کہ طالبان سے مفاہمت کے لیے زمین ہموار کرنے کی خاطر افغانستان اور پاکستان کے راہنماؤں پر مشتمل ایک بڑا جرگہ منعقد کیا جائے، بش نے فوری طور پر یہ تجویز جنرل پرویز مشرف کے سامنے رکھی تھی۔ اس کے بعد سے اس بارے میں بات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔

پاک افغان جرگے کا پہلا دور: مارچ 2007ء کے وسط میں حامد کرزی کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز ہو گیا۔ اسلام آباد میں پاک افغان جرگہ کمیشن کا پہلا اجلاس ہوا جس میں دونوں ملکوں کے سربراہوں اور سیاسی راہنماؤں نے اپنے مسائل حل کر حل کرنے پر اتفاق کیا۔ حامد کرزی نے اعلان کیا کہ طالبان کو اقتدار میں شریک کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا ہم ملا عمر کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار ہیں۔ یہ پاک افغان جرگے کا پہلا دور تھا۔

سیاف کے ذریعے طالبان کے خلاف محاذ: موسم سرما میں امریکا نے حامد کرزی کی وساطت سے سابق افغان جہادی لیڈر پروفیسر سیاف کو طالبان کے خلاف کام کرنے کے لیے ہماری مقدار میں اسلحہ اور رقم فراہم کی تھی اور ہدف دیا تھا کہ وہ طالبان کے خلاف بھرپور انداز میں محاذ کھول دیں، مگر تین ماہ گزرنے کے باوجود پروفیسر سیاف اس ہدف میں کوئی ابتدائی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکے تھے جس

سے امریکیوں کو سخت ناراضی ہوئی۔

25 مارچ 2007ء کو امریکی فوج نے یکدم پروفیسر سیاف کے گھر چھاپہ مارا۔ ان پر شک ظاہر کیا گیا کہ وہ امریکا کے مخالف ممالک سے امداد وصول کر رہے ہیں۔ تلاشی کے دوران گھر سے 12 کروڑ روپے اور اسلحے کے ذخائر برآمد ہوئے جسے امریکا نے دوسرے ملکوں کی امداد سے تعبیر کیا۔ سیاف نے اس لاقانونیت پر احتجاج کرنا چاہا تو امریکی افسران نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرادیا کہ ہم افغان حکومت کے پابند نہیں ہیں اور اپنی مرضی سے ہر کارروائی کر سکتے ہیں۔

حزب اسلامی سے کشیدگی ختم کرنے کی کوشش: حامد کرزئی موسم گرما میں پاک افغان جرگہ منعقد ہونے سے قبل ایک بار پھر حزب اسلامی سے روابط بڑھانا چاہتے تھے تاکہ جرگہ نتیجہ خیز بن سکے۔ انارنی جزیل عبدالجبار کرزئی اور حزب اسلامی کے درمیان مذاکرات کے لیے سرگرم ہو گیا مگر اس دوران وہ توہمیں حرکت میں آگئیں جو کرزئی اور حزب اسلامی کے قرب سے خطرہ محسوس کرتی تھیں۔ چنانچہ می میں جوزجان کے گورنر جمعہ خان ہمدرد کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ ادھر بغلان میں سابق گورنر بشیر بغلانی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ ان دونوں کا تعلق حزب اسلامی سے رہا تھا۔ سب سے بڑا واقعہ یہ رونما ہوا کہ می کے دوران حزب اسلامی کے سینئر راہنما اور وزیراعظم استاد عبدالصبور فرید کو پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا۔ جون کے مہینے میں شمالی اتحاد نے 59 چھوٹی چھوٹی تنظیموں کا ایک نیا اتحاد قائم کر لیا۔ مصرین کے مطابق اس کا مقصد کرزئی اور حزب اسلامی کے مابین ممکنہ اتحاد کے خطرات کی روک تھام کرنا تھا۔

ملا داد اللہ کی شہادت: 13 مئی 2007ء کو ملا داد اللہ جاسوسوں کی سازش کا نشانہ بن کر ہو کر شہید ہو گئے۔ طالبان کیلئے یہ واقعہ نہایت افسوس ناک تھا۔ ملا داد اللہ امریکیوں کے اعصاب پر سوار ہو چکے تھے اور ان کی پے در پے کارروائیوں نے دشمنوں کو بدحواس کر دیا تھا اس لیے وہ امریکا اور اتحادیوں کی ہٹلٹ پر تھے۔ ان کے شبے میں درجنوں افراد گرفتار کیے جا چکے تھے۔ جون 2006ء میں ملا داد اللہ کی گرفتاری کی خبر نے میڈیا میں تہلکہ مچا دیا تھا مگر گرفتار کیا گیا شخص جو ایک پاؤں سے معذور تھا، کوئی اور تھا۔ ملا داد اللہ نے جلد ہی میڈیا پر آکر اس خبر کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ دسمبر 2006ء میں ملا داد اللہ امریکیوں کی زرمیں آئے، مگر بال بال بچ گئے۔ تاہم 13 مئی 2007ء کو وہ نیٹو اور افغان فورسز سے ایک خونریز جنگ کے دوران کسی جاسوس کی نشان دہی پر کی جانے والی بمباری کا شکار ہو کر شہادت کی منزل مراد پا گئے۔

ملا داد اللہ کی عمر 39 سال تھی۔ وہ 1969ء میں جنوبی افغانستان کے علاقے ”بجوانی“ میں پیدا ہوئے تھے۔ ملا محمد عمر کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ جہادوں میں بھی ان کے ساتھ رہے اور تحریک طالبان میں

بھی شروع سے شریک تھے۔ 1995ء میں بارودی سرنگ کے ایک دھماکے میں ان کی بائیں ٹانگ کا دم آگنی تھی، تاہم یہ معذوری ان کی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ ملا داد اللہ کی شہادت کے بعد اتحادی افواج نے ان کی لاش اپنے قبضے میں لے کر نامعلوم مقام پر دفنادی تھی۔ طالبان نے ان کی لاش ورہاء کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ افغان پارلیمنٹ کے کئی ارکان نے جن میں پروفیسر مجددی بھی شامل تھے، اس مطالبے کی حمایت کی مگر بے سود۔ تب طالبان نے افغان ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کو قندھار سے انخواہ کر لیا اور اپنے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ آخر کار ملا داد اللہ کی لاش ورہاء کے حوالے کر دی گئی۔ طالبان نے افغان ڈاکٹروں کی ٹیم کو رہا کر دیا۔ اس کے علاوہ دو فرانسیسی انخواہ شدگان کو بھی رہا کر دیا گیا۔

ملا داد اللہ کی شہادت طالبان کے لیے ایسا ہی سانحہ تھی جیسا کہ ملا یور جان کی شہادت یا ملا محمد ربانی کی وفات۔ طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اس سانحے پر بذات خود شہید کے ورہاء سے تعزیت کی اور ملا داد اللہ کے بھائی ملا عبدالغفور کو ان کا نائب مقرر کر دیا۔ ہزاروں جوانوں نے ان کے بیٹے ملا منصور داد اللہ سے خودکش حملوں کے لیے رابطہ کر لیا۔

انتقامی کارروائیاں: اس واقعے کے کچھ دنوں بعد پشاور کے ایک ہوٹل میں خودکش حملے میں چند افراد مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ملا داد اللہ کی جاسوسی کرنے والا خبر یا اس کے قریبی ساتھی اس ہوٹل میں تھے جو دھماکے میں مارے گئے۔ ملا داد اللہ کا انتقام لینے کے لیے طالبان کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ 23 مئی کو پاک افغان سرحد پر اتحادی افواج کے 10 آئل ٹینکرز تباہ کر دیے گئے۔ جون کے ابتدائی دو ہفتوں میں 24 ریوٹ کنٹرول دھماکے کیے گئے۔ طالبان کے خوف سے قندھار میں سرکاری دفاتر سنان ہو گئے۔ ان حالات میں اٹلی، فرانس اور جرمنی نے نیٹو سے علیحدگی کی دھمکی دے دی۔ جون کے وسط میں ان ممالک نے کہا تم امریکا اور برطانیہ کے لیے اپنے فوجی نہیں مردا سکتے۔ ہم جانتے ہیں امریکا ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر وسط ایشیا کے تیل اور گیس پر قبضے کے خواب دیکھ رہا ہے۔

کرزئی پر راکٹوں کی بارش: اتوار 17 جون کو صدر حامد کرزئی غزنی کی ایک سرکاری عمارت میں کسی اجلاس سے خطاب کر رہے تھے کہ اچانک طالبان نے عمارت پر راکٹ برسا دیے۔ حامد کرزئی کو دنیا کی گراں ترین سیکورٹی کمپنی کی خدمات حاصل ہیں جس کی جدید ترین ٹیکنالوجی راکٹ یا میزائل کاؤنٹ موڈ دیتی ہے۔ چنانچہ راکٹ اپنے ہدف سے ہٹ کر دور جا گرے۔ اس طرح کرزئی ایک بار بچرنگ گئے۔ بعض مبصرین کا کہنا ہے طالبان کرزئی کو قتل کرنا نہیں چاہتے، صرف دباؤ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے کرزئی پر حملے اکثر ناکام ہوتے نظر آتے ہیں۔

افغان عوام کا قتل عام: طالبان کے مسلسل حملوں کی روک تھام میں ناکام ہو کر جون کے اواخر میں اتحادیوں نے ایک بار پھر افغان عوام کے قتل عام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جون 2007ء کے آخری ہفتے میں ارزگان، زابل، ہلمند، قندھار، پکتیا، وردگ اور غزنی کے شہریوں پر اندھا دھند بمباری کی گئی جس سے خواتین اور بچوں سمیت 213 افراد شہید ہو گئے۔ ارزگان کے مرکز ترین کوٹ سے 24 کلومیٹر دور ضلع چودہ کی آبادی کو مکمل طور پر فنا کر دیا گیا۔

اس قلم پر حامد کرزئی بھی خاموش نہ رہ سکے۔ ہفتہ 23 جون کو انہوں نے صدارتی محل میں صحافیوں کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ”ہمارے لیے بے گناہ افغانوں کی مزید ہلاکتیں ناقابل برداشت ہیں۔ اگر اتحادی افواج کو یہی کچھ کرنا ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان کے رہنے کا مقصد عوام کا تحفظ ہے نہ کہ ان کی ہلاکت۔“

پاک افغان تعلقات میں بہتری: اسلام آباد میں پاک افغان سربراہوں کی ملاقات کے بعد دوطرفہ تعلقات میں خاصی بہتری نظر آرہی تھی۔ پاکستان افغانستان سے تعاون میں پیش رفت کر رہا تھا۔ اپریل 2007ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان نے افغانستان کو 100 بسیں اور ٹی وی ٹرانسمیٹر تحفے میں دیے تھے۔ پاکستانی حکام نے کچھ عرصے قبل طورخم سے جلال آباد تک 75 کلومیٹر طویل شاہراہ اور جلال آباد شہر کی اندرونی پونے چار کلومیٹر کی سڑکیں تعمیر کروائی تھیں۔ ان کے علاوہ کئی منصوبوں پر کام اور بعض کا سروے جاری تھا۔

حامد کرزئی پاکستان سے مل کر ایک اور اہم کام کروانا چاہتے تھے اور وہ تھا ڈیورنڈ لائن کا خاتمہ۔ وہ ظاہر شاہ کی طرح اس موقف پر اٹل تھے کہ ڈیورنڈ لائن کے پار انک تک کا علاقہ افغانستان کا ہے جو 1897ء کے معاہدے کے مطابق دوبارہ افغانستان کو مل جانا چاہیے۔ 12 مارچ کو انہوں نے جلال آباد یونیورسٹی میں پختون کانگریسی راہنما ”خان عبدالغفار خان“ کی یاد میں ”باجا خان کمپلیکس“ کی تعمیر نو کا اعلان کیا۔ خان عبدالغفار خان بھی ڈیورنڈ لائن کے تصور کو مسترد کرتے تھے۔ حامد کرزئی نے بھی اس موقع پر اپنے خطاب میں ڈیورنڈ لائن کے خاتمے پر اصرار کیا۔

امن جرگے لیے پاک افغان مذاکرات: اس دوران پاک افغان جرگے کے لیے کوششیں جاری تھیں۔ اس کے انعقاد سے قبل افغان حکومت اور امریکا نے طالبان کو تقسیم کرنے کی کوششیں بھی کیں۔ میڈیا پر بعض طالبان لیڈروں کو معتدل اور دوسروں کو سخت گیر موقف کا حامی قرار دینے لگا۔ اس پر ملا عبدالسلام ضعیف نے 12 مارچ کو اپنے بیان میں کہا: ”طالبان کے درمیان روشن خیال اور سخت گیر کی

تفریق نکلے۔ ان کی جگہ غیر ملکی افواج کے خلاف ہے اور وہ سب متحد ہیں۔ ان کی تقسیم کا خیال وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایک سازش ہے جو ناکام رہے گی۔"

3 مئی 2007ء کو کابل میں پاک افغان جرگے کے لیے مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس اجلاس میں طے ہوا کہ جرگے میں 800 افراد کو مدعو کیا جائے گا جن میں سے نصف پاکستان کے اور نصف افغانستان کے ہوں گے۔ آخر کار 9 مارچ 2007ء کو کابل میں پاک افغان امن جرگے کا افتتاح بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ دونوں ملکوں سے 700 کے لگ بھگ ارکان اس میں شرکت کر رہے تھے۔ پاکستانی وفد کی قیادت وفاقی وزیر داخلہ آفتاب شیر پاؤ کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد خان شیرانی، محمود خان اچکزئی اور اسفندیار یار لہی بھی شامل تھے۔ افغانستان کی طرف سے صدر حامد کرزئی کی سرکردگی میں پارلیمنٹ کے اسپیکر یونس تانونی کے علاوہ پروفیسر صغمت اللہ مجددی، برہان الدین ربانی اور عبدالرب رسول سیاف شریک تھے۔

اس چار روزہ اجلاس میں افغانستان سے امریکی فوج کے اخلاء، طالبان اور حزب اسلامی سے مذاکرات اور قیام امن تک مسلم ملکوں کی متبادل افواج کی افغانستان میں تعیناتی پر بحث ہوئی۔ آخر میں طالبان اور حزب اسلامی سے مذاکرات کے لیے 50 رکنی کمیٹی کا انتخاب کیا گیا۔ یاد رہے پاکستان کی جانب سے جنرل پرویز مشرف کا اس جرگے میں شرکت کرنا طے تھا مگر جرگے سے قبل افغان صدر کی جانب سے پاکستان کے خلاف کچھ نازیبا گفتگو اور الزام تراشی کے رد عمل میں جنرل پرویز نے عین وقت پر کابل روانگی کا فیصلہ منسوخ کر دیا تھا۔ چونکہ یہ جرگہ درحقیقت میں امریکا کے ایما پر منعقد ہوا تھا اس لیے اس میں امریکی مفادات کا تحفظ اہم ہدف تھا۔ امریکا کی کوشش یہ تھی کہ جرگے میں طالبان اور حزب اسلامی سے معاملات طے کرنے اور مذاکرات شروع کرنے پر اتفاق ہو جائے مگر القاعدہ کے معاملات کو الگ رکھا جائے۔ چنانچہ یکساں ہوا اور مذاکرات کی گفتگو میں القاعدہ اور غیر ملکی مجاہدین کے مسئلے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ جرگے میں پاک افغان تعلقات کے بارے میں کئی اہم امور پر اتفاق ہوا جو درج ذیل ہیں:

① پاکستان اور افغانستان باہمی معاملات مل جل کر مذاکرات کے ذریعے حل کریں گے۔

② سرحدوں سے دراندازی اور مداخلت کا خاتمہ کیا جائے گا۔

③ دوطرفہ تعلقات میں بہتری لائی جائے گی۔

④ مطلوبہ معلومات کا باہم تبادلہ کیا جائے گا۔

⑤ افغان مجاہدین کی باعزت واپسی جلد ممکن بنائی جائے گی۔ ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی

ہند کی جائے گی۔

① دونوں ملک اپنی سر زمین ایک دوسرے کے خلاف استعمال نہیں ہونے دیں گے۔

جرمے کے نتائج: مبصرین کے مطابق چونکہ جرمے میں شروع سے طالبان کے نمائندوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا اس لیے اس سے مطلوبہ نتائج کا حصول بعید نظر آ رہا تھا۔ جرمے کے اختتام سے ایک گھنٹہ قبل طالبان نے نگرہار میں ایک امریکی گاڑی تباہ کر کے چار فوجیوں کو ہلاک کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ میدان میں اب بھی وہی غالب ہیں۔ اس کے علاوہ طالبان نے کوریا کی ایک مشنری ٹیم کو اغوا کر کے بھی شروع سے میڈیا کی توجہ اپنی طرف مبذول رکھی تھی۔ جرمے کا اہم ترین مقصد طالبان سے مذاکرات کی راہ نکالنا تھا، مگر اس کے لیے جو طریقہ کار اپنایا گیا، وہ بے حد الجھاؤ والا تھا۔ 50 رکنی کمیٹی جس کو طالبان سے بات چیت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اپنا کام شروع نہ کر سکی کیونکہ شمالی اتحاد کو اس کے ارکان کے انتخاب پر اعتراض تھا۔ کرزئی کا طالبان سے مذاکرات کے لیے رابطہ: اس کے باوجود حامد کرزئی نے ستمبر میں اپنے طور پر مذاکرات کی تیاری کر لی، امریکا نے خفیہ طور پر انہیں خبردار کر دیا تھا کہ مذاکرات کی وجہ سے 11 ستمبر کے بعد ہونے والی سیاسی و اقتصادی تبدیلیاں متاثر نہ ہونے پائیں۔ کرزئی کے طالبان سے مذاکرات کی خبر سے شمالی اتحاد میں کھلبلی مچ گئی مگر کرزئی نے پروا نہ کی۔

14 اکتوبر کو حامد کرزئی نے اپنے بیان میں کہا: ”اگر مجھے مذاکرات کے لیے ملامت یا حکمت یار کے پاس جانا پڑا تو میں جاؤں گا۔“ اس کے بعد کرزئی کی طالبان سے بالواسطہ گفت و شنید شروع ہو گئی۔ طالبان نے ایک بار پھر مذاکرات کو 50 ہزار غیر ملکی فوجیوں کے انخلاء سے مشروط کیا۔ کرزئی نے کہا: ”ایسا ہوا تو ملک پھر 1990ء کی دہائی جیسے حالات کا شکار ہو جائے گا۔“ طالبان نے جواب دیا: ”غیر ملکی افواج کی موجودگی میں مذاکرات بے معنی ہوں گے۔“ غیر ملکی مجاہدین کا مسئلہ بھی اس گفت و شنید کی ناکامی کا سبب بنا اور رابطے منقطع ہو گئے۔

اہم پاکستان افغان جرمے میں طے کردہ مذاکراتی کمیٹی کے ذریعے طالبان سے گفتگو کا امکان پھر بھی باقی تھا۔ چونکہ 50 ارکان پر مشتمل اس کمیٹی پر شمالی اتحاد مترشح تھا اس لیے دسمبر کے آغاز میں حامد کرزئی نے شمالی اتحاد کے لیڈر ڈاکٹر عبداللہ عبداللہ کی قیادت میں 25 رکنی نیا امن جرگہ تشکیل دیا جو شمالی اتحاد کے عناصر کے غلبے کی وجہ سے بالکل ناموزوں ثابت ہوا، کیونکہ طالبان پختون لیڈروں سے شاید بات کر لیتے مگر شمالی اتحاد کے لیڈر کی سربراہی میں کسی امن کمیٹی سے مذاکرات ان کے نزدیک وقت کے نیاں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ تھا ڈاکٹر پاکستان افغان جرمے اور طالبان سے مذاکرات کی ناکام کوششوں کا۔

طالبان کی کارروائیاں: اس کے علاوہ 2007ء میں اور بہت سے اہم واقعات پیش آئے۔ میدان جنگ میں حسب سابق طالبان چھائے رہے۔ سب سے دھماکا خیز کارروائی اس وقت ہوئی جب مارچ کے آغاز میں نائب امریکی صدر ڈک چینی نے اپنی افواج کو حوصلہ دینے کے لیے افغانستان کا دورہ کیا۔ منگل 6 مارچ کو وہ بگرام ایر بیس کے امریکی فوجی اڈے سے حائل کرزئی کے صدارتی محل جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ عین اسی وقت ایک فذائی حملہ ورن گنت رکاؤٹس عبور کرتا ہوا، اڈے کے مرکزی گیٹ تک پہنچ گیا اور سیکورٹی اہلکاروں کے روکنے پر اس نے خود کو دھماکے سے اُڑا دیا جس سے 15 افراد ہلاک اور 27 زخمی ہو گئے۔ ڈک چینی چند لمحوں اور تھوڑے سے فاصلے کے فرق سے بچ گئے۔ اس حملے سے امریکی حکام لرز کر رہ گئے۔ 18 اپریل کو طالبان نے غزنی میں نیو کابلی کا پٹر مار گرایا۔

طالبان نے اس سال ایک اور ہدف کی طرف توجہ دی۔ یعنی وہ اتحادی افواج کو تسلیم سلائی کرنے والے قاتلوں کو ایک تسلسل سے نشانہ بنانے لگے۔ 23 مئی کو پاک افغان سرحد پر اتحادی افواج کے 10 رائل نیٹکوز تباہ کر دیے گئے۔ اس کے بعد ایسی کارروائیاں لگا تار ہونے لگیں۔ 18 جون کو کابل میں افغان پولیس کی وین پر خودکش حملہ ہوا جس میں 22 پولیس انسٹرکٹرسیت 39 افراد مارے گئے جبکہ 52 افراد زخمی ہوئے۔ ذرائع کے مطابق 2001ء سے لے کر اب تک یہ سب سے بڑا دھماکا تھا۔ جو کابل شہر کے عین وسط میں ہوا جس سے دور دور تک کی عمارتیں لرز گئیں۔ طالبان نے ایک بڑی جست یہ لگائی کہ پہلی بار مضبوط بنیادوں پر شمال اور مغربی افغانستان کے امریکا مخالف جہادی کمانڈروں سے رابطے قائم کیے۔ جون کے وسط میں طالبان اور سابق جہادی تنظیموں کے ہزاروں مسلح مجاہدین افغانستان کے شمال اور جنوب مغرب میں امریکا اور اتحادی افواج کے خلاف ”ٹائیگر آپریشن“ کے نام سے ایک مشترکہ ہم کا آغاز کرنے پر متفق ہو گئے۔ آپریشن کی کارروائیوں کے لیے طالبان اور سابق جہادی کمانڈروں نے مشترکہ طور پر ایک جہادی کونسل بھی قائم کر دی جس میں بدخشاں، تخار، قندوز، مزار شریف، بغلان، سرکان، جوزجان، سرپل، ہرات، بادغیس اور کاپیسا کے کمانڈر شامل تھے۔ اس آپریشن کے تحت کی گئی کارروائیوں میں صرف ماہ جون میں 16 اتحادی اور 50 افغان حکومت کے سپاہی کیفر کردار تک پہنچائے گئے۔

ملک کی حالت: زار نے اس دوران افغانستان کی حالت کیا تھی؟ ایک سروے کے مطابق ملک بھر میں صرف 6 فیصد شہریوں کو کچلکی کی سہولت میسر تھی۔ صرف 13 فیصد عوام کو پینے کا صاف پانی میسر تھا۔ 30 فیصد بچے 5 سال کی عمر تک پہنچنے سے قبل مر رہے تھے۔ 42 فیصد خواتین زچگی کے دوران فوت ہو رہی

تھیں۔ بیمار یوں میں خطرناک حد تک اضافے اور طبی سہولیات کی نایابی نے 60 لاکھ افغانوں کو زندگی اور موت کی کھنکھش میں مبتلا کر دیا تھا۔ بے روزگاری کی شرح 75 فیصد سے زائد ہو چکی تھی۔ 6 سال میں ہزاروں افراد کو القاعدہ اور طالبان سے تعلق کے شبے میں مار چکایا گیا تھا۔ ملکی تعمیر و ترقی کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی۔ پارلیمنٹ کے ارکان شرمندگی کی وجہ سے اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں جانے سے کتراتے تھے۔ امریکی و اتحادی افواج ہر قانون سے بالاتر تھیں اور وہ بے گناہ شہریوں پر اندھا دھند بمباری کرتے اپنی ہوس فتح یابی کو تسکین دیتی رہتی تھیں۔

عیسائی مشنریوں کا اغوا: 19 جولائی کو طالبان نے کامل قندھار شاہراہ سے کوریا کے 23 عیسائی مشنریوں کو اغوا کر لیا جس سے دنیا بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ طالبان نے ان کے بدلے اپنے 8 گرفتار شدگان کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ جن کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر عبدالواسع، مولوی عثمان، ضیا احمد، مجیب الرحمن، سیدن، محمود حسین، بلا در خان، انور اللہ۔

ان میں سے پانچ بلی چرخی اور تین بگرام ایر بیس کی امریکی جیل میں تھے۔ طالبان کے اس مطالبے کے جواب میں صدر بش نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔ حامد کرزی بھی یہ دیکھ کر خاموش رہے۔ آخر ڈیڈ لائن ختم ہونے پر طالبان نے دو اغوا شدگان کو قتل کر دیا۔ یہ معاملہ اگست میں پاک افغان جرگے کے دوران میڈیا پر سرفہرست رہا تھا اور طالبان کی قوت کا نشان بن گیا تھا۔ جرگے کے بعد طالبان نے بھیہ اغوا شدگان کو خیرگمالی کے تحت رہا کر دیا۔

اتحادیوں کا گرتا ہوا مورال: آغاز اگست میں اتحادی افواج کے کمانڈر رچرڈ ڈیوڈ نے اعتراف کیا کہ ہم افغانستان میں شکست سے دوچار ہیں۔ اواخر نومبر میں برطانوی اخبارات نے انکشاف کیا کہ گزشتہ 6 ماہ کے دوران 1344 برطانوی افسران فوج سے مستعفی ہو چکے ہیں۔ بمبرین اسے عراق و افغانستان میں مسلسل شکستوں سے عارضی نفسیاتی ٹھکن کا نتیجہ بتاتے تھے۔ مارچ 2007ء میں افغان وزارت دفاع کے ایک اہم عہدے دار کی مرتب کردہ رپورٹ کے مطابق 6 سالہ جنگ میں 2 ہزار امریکی فوجی ہلاک اور 4 ہزار زخمی ہو چکے تھے۔ اکثر زخمی عمر بھر کے لیے اپانچ ہو گئے تھے۔ 17 سو فوجی پاگل ہو چکے تھے۔

امریکا کا پاکستان پر ٹھک: 14 اگست 2007ء کو امریکی حکومت نے پاکستانی حکام پر لرزہ طاری کر دیا۔ امریکا نے طالبان اور پاکستان کے تعلقات کے دستاویزی ثبوت فراہم کیے اور دعویٰ کیا کہ اکثر طالبان لیڈر پاکستان میں پناہ گزین ہیں جنہیں پاکستان نقد رقم اور اسلحہ دے رہا ہے۔ امریکی ماہرین کا

کہنا تھا کہ پاکستان اپنے دفاع کے لیے زمینی وسعت حاصل کرنے کی خاطر طالبان کی فتح کو ضروری سمجھتا ہے اس لیے ان سے خفیہ تعاون کر رہا ہے۔ تاہم پاکستان نے ان الزامات کی پرزور تردید کی۔

طالبان کے لیے ایرانی اسلحہ: ستمبر میں الجزیرہ ٹی وی نے ایک عجیب خبر دی جس میں کہا گیا تھا: "6 ستمبر کو فرہا میں طالبان کے لیے جانے والے ایرانی اسلحے کی بہت بڑی کھپ پکڑی گئی۔ اپریل میں پکڑی جانے والی کھپ کے بعد ایرانی اسلحہ کا یہ سب سے بڑا ذخیرہ ہے جو اتحادی افواج کے ہاتھ آیا ہے۔ اس میں ایرانی، روسی اور چینی ساختہ اینٹی کرافٹ میزائل بھی شامل ہیں۔" برطانوی حکام بھی یہ کہہ چکے تھے کہ طالبان نے ان کے کئی طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو چینی ساختہ H.N-5 میزائل سے نشانہ بنایا ہے۔

تیز تر ہوتی جنگ: 7 اکتوبر کو امریکی حملے کے چھ سال مکمل ہونے کے موقع پر کابل میں فوجی وردی میں ملبوس ایک فدائی نے افغان فوج کی بس میں گھس کر دھماکا کر دیا جس سے 30 فوجی مارے گئے۔ انہی دنوں این جی او سیفٹی آفس نے ایسی کارروائیوں کے تناظر میں رپورٹ دی کہ طالبان کابل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا کہ طالبان کے حملوں میں اس سال 90 فیصد اضافہ ہوا ہے اور اب ہر ماہ 25 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا جا رہا ہے۔ جنوری 2007ء میں ماہانہ حملے 139 تھے جو جولائی 2003ء میں ماہانہ 405 ریکارڈ کیے گئے۔

برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن نے 10 اکتوبر کو امریکا کے لیے اپنے پیغام میں کہا: "افغانستان میں ہم جہز ہیں جیت رہے ہیں مگر جنگ ہار رہے ہیں۔"

نومبر میں صورت حال یہ تھی کہ فرہا کے ضلع بکواہ پر طالبان کے قبضے کو خود کر زئی حکومت نے خفیہ طور پر تسلیم کرتے ہوئے طالبان کے ضلعی کیشنر مولوی عبدالرحمن کو فنڈز جاری کر دیے تھے۔ جنوبی افغانستان میں طالبان کی متوازی شریعت کورٹوں میں عوام کا تاتا بندھا ہوا تھا جو حکومتی اداروں کی رشوت ستانی سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ کئی اضلاع میں طالبان اور کر زئی حکومت میں معاہدہ ہو گیا تھا کہ یہاں غیر ملکی افواج نہیں آئیں گی۔

اس سال طالبان کی ایک اہم کارروائی نومبر کے آغاز میں بغلان کے علاقے شہر کہنہ میں ہوئی۔ جس میں افغان حکومت کے چھ اراکین اسبلی ایک ساتھ قتل ہو گئے۔ ہلاک شدگان میں شمالی اتحاد کے سیاسی مشیر و ہزارہ لیڈر مصطفیٰ کاظمی کے علاوہ نازک میر، سرفراز، حاجی طریف، انجینئر متین اور سیف الرحمن شامل تھے۔

نومبر کے آخری ہفتے میں طالبان کے تین اہم کمانڈر جنہیں 20، 20 سال قید کی سزا سنائی گئی تھی، ہل

چہ نجل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں طالبان شوری کی رکن ملا نقیب کے علاوہ ملا زابی اور ملا عبدالہادی شامل تھے۔ 12 دسمبر 2007ء کو طالبان نے وردگ میں ایک بلی کا پٹر مارگرایا جس میں 130 اتحادی ہلاک ہو گئے۔ اسی مہینے امریکا کے فرنٹ لائن اتحادی جنرل پرویز مشرف نے پاکستانی عوام کے بے پناہ دباؤ پر فوجی وردی اُتار دی۔

تحریف قرآن کا مجرم گرفتار: اس سال کی ایک اہم خبر 13 دسمبر کو طورخم بارڈر پر تحریف قرآن مجید کے مجرم ”بختیار“ کی گرفتاری تھی۔ اس امریکی نژاد افغان مصنف نے قرآن مجید کا عربی عبارت کے بغیر فارسی ترجمہ لکھا تھا جس میں بے پناہ تحریف کی گئی تھی مثلاً شفاعت کا انکار کیا تھا، یسوعیت اور عیسائیت کو برحق مانا گیا تھا۔ ترجمے کا ناشر ”غوث زلمانی“ تھا جو انارنی جنرل کا ترجمان تھا۔ نومبر کے مہینے میں افغان یونیورسٹی کے طلبہ اور عوام نے اس پر زبردست احتجاج کیا تھا اور کامل جلال آباد شاہراہ بند کر دی تھی۔ مظاہرین نے مصنف اور ناشر کو پھانسی دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ آخر کار عوامی دباؤ پر افغان حکومت نے مصنف کو طورخم بارڈر عبور کرتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ اس قسم کی خبروں سے افغان عوام کی دینی غیرت زعمہ ہونے کا واضح ثبوت مل رہا تھا۔

امریکا کو کرزئی کے متبادل کی تلاش: سال کے آخری ایام میں امریکا اور اس کے اتحادی حامد کرزئی کو ہٹانے پر غور کرنے لگے تھے۔ متبادل کے طور پر سابق وزیر داخلہ علی احمد جلالی اور زلمے ظلیل زاد کے نام زیر غور تھے، مگر خاندانی پس منظر کے باعث سابق بادشاہ ظاہر شاہ کے پوتے مصطفی ظاہر کو زیادہ موزوں تصور کیا جا رہا تھا۔ امریکا اور اتحادی ممالک کا کہنا تھا حامد کرزئی طالبان کو شکست دینے اور ملک پر اپنا کنٹرول قائم کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ کرزئی کے بھائی احمد ولی کرزئی پر دشیات کے عالمی اسمگلروں کے ساتھ کام کرنے کا الزام بھی بدنامی کا باعث تھا۔

کرزئی کا طالبان کے لیے پیغام: کرزئی کو بھی ان ارادوں کی بھینک پڑ چکی تھی، اس لیے دسمبر میں انہوں نے خفیہ طور پر ایک بار پھر طالبان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی طرف سے اپنے بھائی احمد ولی کرزئی کو مذاکرات کے لیے نامزد کرتے ہوئے طالبان کو اپنے خفیہ پیغام میں کہا: ”ملک کو اندرونی دبیرونی طور پر شدید خطرات لاحق ہیں۔ شمالی اتحاد اور جنگجو سرداروں سے نجات کے لیے آپ کا تعاون نہایت ضروری ہے۔ امریکی و اتحادی افواج کی مداخلت نے عوام میں شدید نفرت پیدا کر دی ہے۔ ہم ملحد عمر مجاہد سے اس معاملے میں فوری طور پر مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ اس ابتدائی مرحلے میں شمالی اتحاد اور امریکا کو بات چیت سے ہرگز آگاہ نہ کیا جائے۔“

تاہم طالبان نے اس بار بھی غیر ملکی افواج کے غیر مشروط انخلاء کے بغیر مذاکرات کو لا حاصل قرار دے کر مذاکرات پر آمادگی سے انکار کر دیا۔

اقوام متحدہ کی سالانہ رپورٹ برائے افغانستان: اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ کے مطابق 2007ء کے دوران طالبان کی مزاحمت میں حد سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ اس سال مسلح جہزوں میں 850 افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھے جس میں 500 عام شہری تھے۔ اس سال خودکش حملوں کا تناسب بھی بڑھ گیا۔ 2006ء میں 123 خودکش حملے ہوئے تھے جبکہ 2007ء میں ان کی تعداد 160 تک پہنچ گئی۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو اس سال صرف ایک کامیابی حاصل ہو گئی تھی جب دسمبر میں نیو افواج نے ایک بڑا آپریشن کر کے موسیٰ قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح نیو کی کمان یہ کہنے کے قابل ہوئی کہ وہ بھی کچھ کر کے دکھا سکتی ہے۔

ظاہر شاہ کی وفات: اس سال افغانستان کے سابق بادشاہ ظاہر شاہ 93 سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ وہ 15 ماکتوبر 1914ء کو کابل میں بارک زئی شاہی خاندان کے ایک اہم رکن نادر خان کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ نادر شاہ بعد میں افغانستان سپہ سالار اور پھر بادشاہ بنے۔ جب انہیں قتل کر دیا گیا تو 8 نومبر 1933ء کو ظاہر شاہ نے تاج تخت سنبھالا۔ 1973ء میں داؤد خان کی بغاوت کے باعث وہ اقتدار سے محروم ہو کر جلاوطن ہو گئے۔ 2002ء میں وہ لوہہ جڑ کے موقع پر اپنے وطن واپس آ گئے۔ اس موقع پر انہیں ”نادر آف نیشن“ کا خطاب دیا گیا۔ 2004ء میں وہ شدید علیل ہو گئے۔ دہلی میں ان کا علاج ہوا۔ عرب امارات کے ہسپتال میں بھی داخل رہے۔ کچھ افاقہ ہونے پر وطن واپس آ گئے۔ 23 جولائی 2007ء کو کابل کے صدارتی محل میں انہوں نے دنیا سے فانی کو الوداع کہا اور کابل میں دفن ہوئے۔

اگرچہ ظاہر شاہ کے دور میں کمیونسٹوں نے عروج پایا اور افغانستان میں جدت پسندی کو فروغ ملا مگر ظاہر شاہ ذاتی طور پر کمیونسٹوں کے مخالف تھے۔ وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان اور نماز روزے کے پابند تھے۔ اپنے والد کی طرح انہیں بھی اکابر دیوبند سے عقیدت تھی اور دارالعلوم دیوبند سے ان کا نیا زمندانہ تعلق ایک عرصے تک برقرار رہا۔ دارالعلوم کا ایک دروازہ ”باب النظار“ انہی کے نام پر تعمیر کیا گیا ہے۔

2008ء میں طالبان کی کامیابیاں

موسیٰ قلعہ میں علاء عبدالسلام کی تعیناتی: سال 2008ء کا آغاز موسیٰ قلعہ کے قفسے سے ہوا۔ ہر چند کہ نیٹو نے یہاں قبضہ کر لیا تھا مگر اسے برقرار رکھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔ طالبان کے زبردست جوابی حملوں کا خوف ہر آن موجود تھا۔ چنانچہ 4 جنوری 2008ء کو برطانوی اور افغان فوج نے مقامی

عامہ سے مذاکرات کر کے یہاں کا انتظام طالبان کے ایک حامی کشر ملا عبدالسلام کے سپرد کر دیا۔ ملا عبدالسلام ہلند ضلع ”کچ کی“ کے گاؤں ”شادیز“ میں ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی نصیاتی کے بعد قلعہ موئی میں امن وامان قائم ہو گیا۔

برف باری کے موسم میں طالبان کی کارروائیاں تقریباً تھمی رہیں۔ فروری کے وسط میں قندھار میں کتوں کی لڑائی دیکھنے والے مجمع کے درمیان ایک نہایت ہولناک بم دھماکا ہوا۔ موقع پر موجودہ 150 افراد میں سے 80 وہیں موت کے گھاٹ اتر گئے جبکہ سو کے لگ بھگ زخمی ہو گئے۔ اس لرزہ خیز واردات کی ذمہ داری کسی نے قبول نہ کی۔

برطانوی شہزادے ”ہیری“ کی آمد و رفت: برطانوی شہزادے چارلس کے فرزند شہزادہ ہیری ان دنوں اپنی افواج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے افغانستان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا وقت انتہائی سخت سیکورٹی میں چھپاؤنی کے اندر گزارا۔ مارچ کے آغاز میں جبکہ افغانستان میں محاذ گرم ہونے کے دن آرہے تھے، شہزادے نے برطانیہ کے لیے رخت سربانہ لیا۔ وطن پہنچ کر شہزادے نے اقرار کیا کہ محاذ سے جلد واپسی ان کے لیے باعث شرمندگی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ وہ واپس آ کر برطانیہ میں دہشت گردوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ شہزادے کا یہ بیان اس خوف و دہشت کی صحیح عکاسی کرتا ہے جو امریکی اتحاد میں شامل ہر سپاہی افغانستان سے ساتھ لے کر واپس آتا ہے۔

موسم بہار اور کابل میں ہلچل: موسم بہار شروع ہوتے ہی طالبان کے زوردار حملوں نے ملک بھر میں خوف کی ایک لہر دوڑادی۔ 9 ہزار طالبان کابل کے ارد گرد موجود تھے جن میں ایک ہزار خودکش حملہ آور صرف ایک اشارے کے منتظر تھے۔ کابل میں دفاعی تیاریوں کے لیے ہلچل مچ گئی۔ فورسز کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس سال افغان فوج کی تعداد کا ہدف 70 ہزار مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بغیر کابل اور دوسرے بڑے شہروں کی حفاظت ممکن نہیں تھی۔ طالبان نے اب ذرا مختلف قسم کی کارروائیاں بھی شروع کر رکھی تھیں۔ وہ بعض علاقوں میں موبائل فون کمپنیوں کے ٹاوروں کو بھی اڑا رہے تھے۔

ڈنمارک کی فوج پر حملہ: اس سال کے آغاز میں یورپی میڈیانے توہین رسالت پر مبنی خاکے شائع کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں کو شدید ذہنی صدمہ پہنچایا تھا۔ ڈنمارک اور جرمنی ان گستاخانہ حرکات میں پیش پیش تھے۔ طالبان ان سے انتقام لینے کے لیے بے چین تھے۔ مارچ کے وسط میں انہوں نے ڈنمارک کے فوجی قافلے پر حملے کا موقع ڈھونڈ نکالا۔ یہ قافلہ ہلند کے ضلع گریٹک میں گشت کے دوران ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ طالبان نے خودکش حملہ کر دیا۔ ڈنمارک کے چار فوجی مارے گئے جبکہ متعدد زخمی ہوئے۔

حاجی عبدالکبیر کا قتل: اگلے ہفتے طالبان نے سروبی میں اتحادیوں کا جاسوس طیارہ مار گرایا۔ مقامی مخالفین کو بھی نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ سابق جہادی لیڈر اور موجودہ حکومت نواز کمانڈر حاجی عبدالکبیر کو انہی دنوں گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔

اسی ہفتے طالبان کے خلاف ایک بڑا آپریشن ہوا۔ افغان وزارت دفاع کے مطابق اس کارروائی میں طالبان کمانڈر ملا ہاشم سمیت 45 طالبان قتل کر دیے گئے۔

بھارتی انجینئر نشانہ بن گئے: اپریل کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے مختلف کارروائیوں میں 6 امریکی اور 13 رینیو کے فوجی ہلاک کر دیے۔ اسی ہفتے انہوں نے نیروز میں بھارتی انجینئروں کے ایک قافلے پر حملہ کر کے دو انجینئروں کو مار ڈالا۔ پاک افغان سرحد پر تعینات افغان سکیورٹی فورسز پر بھی حملہ ہوا جس میں 15 سپاہی ہلاک اور 24 زخمی ہوئے۔

حامد کرزنی پر قاتلانہ حملہ: 26 اپریل کو کابل میں کیونسٹوں کے خلاف فتح کی 16 ویں سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ نیشنل اسٹڈیم کو تقریب کے لیے خصوصی طور پر سجایا گیا تھا۔ طالبان کے ممکنہ حملے کے خطرے کے پیش نظر سخت ترین حفاظتی انتظامات کر لیے گئے تھے۔ تقریب طے شدہ پروگرام کے مطابق جاری تھی۔ حامد کرزنی فوجی پریڈ کے محابنے کے بعد اسٹیج پر امریکی سفیر کے ساتھ براجمان تھے۔ افغانستان کا قومی ترانہ لگایا جا رہا تھا کہ چانک فائرنگ اور دھماکوں سے ہر طرف جھگڑا مچ گئی۔ حملہ طالبان نے کیا تھا۔ حامد کرزنی اور امریکی سفیر جو گولیوں کا اصل ہدف تھے، بال بال بچ گئے، جبکہ اسٹیج پر موجود ایک رکن قومی اسمبلی مارا گیا۔ 11 مافراد شدید زخمی ہوئے۔ اس کارروائی سے کرزنی انتظامیہ پر طالبان کا دباؤ کئی گنا بڑھ گیا۔

ارگون میں نیٹو کا کنٹرل ہلاک: مئی کے دوسرے ہفتے میں پکیتی کا کے علاقے ارگون میں طالبان اور نیٹو افواج کے مابین ایک خونریز معرکہ ہوا۔ طالبان نے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔ نیٹو کا علاقائی انچارج کنٹرل مائیک ان کے حملے میں ہلاک ہو گیا۔ 7 مزید اتحادی بھی مارے گئے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کے مطابق 13 طالبان بھی اس لڑائی میں کام آ گئے۔ مئی کے اختتام پر طالبان نے موٹی قلعہ پر حملے شروع کر دیے۔ 500 طالبان نے ایک بڑی کارروائی میں اتحادیوں کی آٹھ چیک پوسٹیں تباہ کر دیں۔ جون کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے ہلمند میں ایک خودکش حملہ کر کے 3 برطانوی فوجی مار ڈالے۔ قندھار میں امریکی ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنا کر تباہ کر دیا گیا۔ اس میں سوار دو امریکی فوجیوں کی ہلاکت کی تصدیق ہو گئی۔

قندھار جیل سے سینکڑوں قیدی آزاد کرا لیے: حامد کرزنی پر حملے کے بعد اس سال طالبان کی سب سے بڑی کارروائی 20 جون کو ہوئی جس میں انہوں نے قندھار جیل کو توڑ کر اپنے سینکڑوں ساتھیوں کو آزاد

کر لیا۔ یہ ایک حیرت انگیز کارروائی تھی، کیونکہ قندھار میں امریکی اور نیٹو افواج کی بہت بڑی تعداد تعینات تھی۔ جیل پر سخت ترین پہرہ تھا کہ قریب ہی اتحادی فوجیوں کا ڈھ تھا۔ دشمنوں کے اتنے سخت انتظامات کے درمیان راستہ بنانے کے لیے ان کی توجہ منتشر کرنا ضروری تھی چنانچہ طالبان نے حملے سے پہلے جاسوسوں کے ذریعے قندھار کے گورنر کو یہ خبر پہنچادی کہ طالبان آج گورنر ہاؤس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس اطلاع سے حفاظتی انتظامات کا رخ گورنر ہاؤس کی طرف ہو گیا اور طالبان کے لیے کام آسان ہو گیا۔

منصوبے کے مطابق طالبان کے ایک گروپ نے قندھار شہر سے جیل کی طرف آنے والے راستے پر تعینات فوجیوں پر حملہ کیا تا کہ یہاں قبضہ کر کے جیل کے پہرے داروں کو ملک ملنے کے امکانات کم کیے جاسکیں۔ طالبان کے دوسرے گروپ نے جیل کے صدر دروازے کی طرف فائرنگ شروع کی جس سے جیل کے پہرے دار ادھر جمع ہونے لگے اور ان کی توجہ بٹ گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر طالبان نے بارود سے لدا ہوا ٹرک صدر دروازے کی طرف روانہ کر دیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ خودکش حملہ آور ٹرک کو پھانک کے ساتھ کھڑا کر کے بارود سے اڑا دے گا جس سے پھانک تباہ ہو جائے گا اور طالبان کا دوسرا گروپ فائرنگ کرتا ہوا اندر چلا جائے گا، مگر جب خودکش حملہ آور نے پھانک کے سامنے پہنچ کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے کنٹرول ٹین دبا دیا تو دھماکا نہ ہوا۔ کئی باری کوشش کے باوجود جب بارود نہ پھٹا تو وہ ٹرک سے نیچے اتر گیا اور تیزی سے پیچھے آ کر طالبان کو اطلاع دی۔ سب نے فوری طور پر ٹرک کو نشانہ بنا کر اندھا دھند فائرنگ کی۔ پھر ایک راکٹ داغا گیا جس سے بارود کا ذخیرہ ایک ہولناک دھماکے ساتھ پھٹ گیا اور ایک فلک بوس شعلے نے پوری جیل کو روشنی کا لباس پہنا دیا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ اندر موجود تمام پہرے دار جو فائرنگ کا جواب دینے کے لیے یہاں جمع ہو گئے تھے، ہلاک ہو گئے۔

طالبان نے اسی دن علی الصبح جاسوسوں کے ذریعے قیدیوں کو ایک پستول پہنچا کر منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی چند قیدیوں نے پستول سے ہیرک کا تالا توڑ دیا تھا اور پہرے داروں کی افراتفری سے فائدہ اٹھا کر چند منٹ میں تمام قیدیوں کو بیرکوں سے باہر نکال لیا تھا۔ حملہ آور طالبان نے اس دوران میزائل مار کر جیل کی دیواریں بھی توڑ ڈالی تھیں۔ اس لیے تمام قیدی آسانی سے باہر نکل آئے۔ ان میں سے چار سو طالبان اور 750 عام شہری تھے۔ اتحادی افواج کے پینچے سے پہلے تمام قیدی حملہ آوروں کے ساتھ محفوظ پناہ گاہوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جلد ہی ان آزاد طالبان نے ارغنداب اور ضلع مالہ پر قبضہ کر لیا۔ انہیں پکڑنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔ ان کارروائیوں میں 17 امریکی مارے گئے۔ اس صورت حال سے مرکزی حکومت کی بے بسی اور اتحادیوں

کی ناکامی کھل کر سامنے آگئی۔ یاد رہے قندھار جیل پر یہ حملہ عین اس وقت ہوا تھا جب پیرس میں دنیا بھر سے سینکڑوں مندوبین جمع ہو کر افغان مسئلہ حل کرنے پر بحث کر رہے تھے اور حامد کرزی عالمی برادری کی طرف سے افغانستان کے لیے 120 ارب ڈالر کا امدادی پیکیج منظور ہو جانے پر مسرور ہو رہے تھے۔

کابل میں بھارتی سفارت خانے پر حملہ: جولائی کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے ایک بار پھر دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے کابل میں بھارتی سفارت خانے کے دروازے پر بارود سے لمبی کارنگراتے ہوئے خودکش حملہ کیا جس میں بھارت کے دفاعی اتاشی اور سینئر سفارت کار سمیت چار افسران اور دیگر 137 افراد مارے گئے۔

13 جولائی کو طالبان نے کنڑ میں صبح ساڑھے چار بجے امریکی فوجی اڈے پر ”آر پی“ گنوں سے حملہ کیا۔ دن بھر لڑائی جاری رہی جس میں 20 امریکی ہلاک ہوئے۔ امریکیوں کی ہلاکت کی یہ سب سے بڑی کارروائی تھی۔ اس سے قبل 2005ء میں امریکی ہیلی کاپٹر پر کیے گئے حملے میں 16 امریکی ہلاک ہوئے تھے۔

اسی ہفتے گریٹک میں طالبان نے 20 افغان فوجی بھی مار دیے جبکہ اتحادی فورسز نے 9 افغان فوجیوں کو شک کی بنیاد پر بمباری کر کے مار ڈالا۔

فرانسیسیوں کی شامت: اگست کے پہلے ہفتے میں طالبان نے پاک افغان سرحد کے قریب مشرقی افغانستان میں 5 نیو اہلکار قتل کر دیے اور پندرہ دن قبل اغوا کیے گئے فرانسیسی امدادی کارکن کو رہا کر دیا۔ 20 اگست کو قندھار میں سڑک کنارے بم پھٹنے سے 3 کینیڈین فوجی ہلاک ہو گئے۔

اگست کا سب سے بڑا واقعہ طالبان کے فرانسیسی فوج سے جھڑپ تھی۔ یہ واقعہ مہینے کے تیسرے ہفتے کے دوران پیش آیا جس میں فرانس کے 10 فوجی مارے گئے۔ فرانس میں اس خبر سے صف ماتم بچھ گئی اور قومی سطح پر اس کا سوگ منایا گیا۔ فرانسیسی صدر سرکوزی کو اپنی تمام مصروفیات ترک کر کے اپنے سپاہیوں کی تعزیت اور حوصلہ افزائی کے لیے افغانستان کا ہنگامی دورہ کرنا پڑا۔

ٹارگٹ کلنگ اور اغوا کی کارروائیاں: 11 نومبر بروز منگل کو طالبان نے قندھار میں صوبائی انٹیلی جنس کے سربراہ حبیب اللہ غزنوی کو گولیوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ حملہ آور موٹر سائیکلوں پر سوار تھے۔ قندھار اور گرد و نواح میں ٹارگٹ کلنگ کے لیے طالبان نے عموماً موٹر سائیکل سوار نشانہ بازوں کے ساتھ حملے کرنے کا طریقہ اپنایا تھا۔

نومبر کے دوسرے ہفتے میں طالبان نے ہلمند اور قندھار میں مختلف جھڑپوں میں 18 اتحادی و افغان

نوبی ہلاک اور 4 ٹینک تباہ کر دیے۔ کابل کے گرد و نواح میں 63 اتحادی مارے گئے جبکہ 9 ٹینک تباہ ہوئے۔ اسی ماہ کابل میں 13 غیر ملکی مندوب اور ڈی ایچ ایل کمپنی کے تین کارکن قتل کر دیے گئے جبکہ ایک فرانسسی اور ایک کینیڈین صحافی کو اغوا کے بعد تادان کے بدلے رہا کر دیا گیا۔ 16 دسمبر کو طالبان نے غزنی کے کشترب عبدالرحیم دیش والا کو قتل کر ڈالا۔

نیٹو کی رسد پر حوصلہ شکن حملہ: 2008ء میں طالبان کی طوفانی کارروائیوں نے ایک اور نیا منظر دکھایا۔ وہ پاکستانی سرحدوں پر نیٹو اور امریکی افواج کی رسد کے قاتلوں کو تباہ کرنے لگے۔ 2007ء میں ایسے حملے صرف افغانستان کی حدود میں ہوتے رہے تھے، مگر 2008ء میں پشاور، خیبر ایجنسی اور کوئٹہ چمن شاہراہ پر کھل کر ایسی کارروائیاں ہوتی رہیں، حملہ آور قاتلوں کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد ہر بار صاف بچ نکلنے میں کامیاب رہے۔ ایسی پہلی بڑی کارروائی مارچ کے آخری ہفتے میں ہوئی جب طورخم بارڈر پر اتحادیوں کے 60 آئل ٹینکر جلادے گئے۔ دسمبر کے آغاز میں پشاور میں 22 کنٹینر سوخت کر دیے گئے۔ سال کی آخری اور سب سے تہلکہ خیز کارروائی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں ہوئی جب پشاور میں تین سو نا معلوم افراد نے حملہ کر کے نیٹو کے 200 کنٹینر تباہ کر ڈالے۔

نیٹو نے اس قسم کی کارروائیوں سے گھبرا کر روس سے راہداری پانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ روس نے آمادگی بھی ظاہر کر دی، مگر اس کی عملی شکل نہ بن سکی۔ ایسی کارروائیوں کو روکنے کے لیے پاکستان، افغانستان اور امریکانے باہمی مشاورت سے اپریل کے آغاز میں پاک افغان سرحد پر نگرانی و جاسوسی کے مشترکہ مراکز کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں مارچ کے اواخر میں سی آئی اے کے ڈائریکٹر مائیکل ہیڈن کا یہ بیان منظر عام پر آیا کہ 18 ماہ سے شدت پسندوں نے پاک افغان سرحد پر محفوظ پناہ گاہیں بنائی ہیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ القاعدہ اب مغربی وضع قطع رکھنے والے افراد کو تربیت دے کر اپنے اہداف کے لیے تیار کر رہی ہے جن کو شاخت کرنا بے حد مشکل ہے۔

رسد کے نئے راستے کی تلاش: ان حالات کے پیش نظر نیٹو نے افغانستان کے لیے وسط ایشیا سے رسد کا نیا راستہ کھولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ روس کی آمادگی کے بعد قازقستان اور ازبکستان کو بھی منایا گیا۔ دسمبر میں نئے راستے کی تیاری کے لیے ناگزیر تعمیراتی کام تیزی سے شروع کر دیا گیا۔ یہ بے حد ضروری تھا کیونکہ پاکستانی حکام نے کنٹینروں پر پے در پے حملوں کو روکنے میں ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد سال کے اواخر میں طورخم بارڈر بند کر دیا تھا اور وہاں سرحد پر نیٹو اور امریکی افواج کی رسد کے ایک ہزار کنٹینروں کی قطار کھڑی تھی۔ پاکستان سے رسد کے اخراجات اور کرایوں میں اب 90 فیصد اضافہ ہو گیا

تھا کیونکہ کوئی ٹرانسپورٹ یا ڈرائیور مشکل ہی سے ادھر کا رخ کرنے پر آمادہ ہوتا تھا۔

خیبر ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے صدر نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

”نیو افواج افغانستان میں سیکورٹی صورت حال کو کنٹرول نہیں کر سکتی تو بھلا ہمیں ایف سی اور

پاکستانی اہلکار کیسے تحفظ دے سکتے ہیں، اس لیے ہم اس معاملے میں بے بس ہیں۔“

رسمد کو محفوظ بنانے کا معاملہ اس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ انہی دنوں امریکا کی جوائنٹ آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین ایڈمرل مولن نے اعلان کیا امریکا مزید 30 ہزار فوجی افغانستان بھیج کر انہیں پاک افغان سرحد پر قیادت کرے گا۔ طالبان کی فتوحات کا اعتراف سال کے آخر میں سامنے آنے والی عالمی تھنک ٹینک کی ایک رپورٹ سے ہوتا ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ گزشتہ سال طالبان افغانستان کے 54 فیصد اور اب 72 فیصد رقبے پر قابض ہیں۔

بے گناہ شہریوں پر اندھا دھند بمباری: طالبان کی کارروائیوں سے براہِ فروختہ ہو کر امریکی اور اتحادی افواج نے موسم گرما میں ایک بار پھر عام افغان شہریوں کے قتل عام پر کمر باندھ لی تھی۔ یہ سلسلہ سال کے اختتام تک جاری رہا۔ جولائی کے آخری ہفتے میں امریکی طیاروں نے ہرات کے علاقے شین ڈنڈ کی شہری آبادی پر اندھا دھند بمباری کی جس سے 50 بچوں اور 19 عورتوں سمیت 108 افراد شہید ہو گئے۔ امریکی یلغار کے بعد مغربی افغانستان میں شہری آبادی کے قتل عام کا یہ سب سے بڑا واقعہ تھا۔

اگست کے دوسرے ہفتے میں اتحادیوں کی بمباری سے 53 خواتین، بچے اور مرد جاں بحق ہوئے۔ نومبر کے دوسرے ہفتے میں قندھار میں شادی کی ایک تقریب پر امریکی طیاروں نے بم برساتے جس سے بچوں اور عورتوں سمیت 40 افراد شہید ہو گئے۔ دسمبر کے وسط میں امریکی طیاروں نے کابل کے نواح میں ایک گاؤں پر بمباری کر کے چھ واہوں کے آٹھ گھرتباہ کر دیے۔ اس حملے میں 7 بچوں سمیت 25 افراد شہید ہو گئے۔

قیدیوں پر کتے چھوڑ دیے: امریکا اور اتحادیوں کے مظالم صرف بمباری تک محدود نہیں تھے بلکہ جیلوں میں قیدیوں پر انسانیت سوز مظالم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اگست کے دوسرے ہفتے میں پکتیکا سے طالبان کی مدد کے شبہ پر حراست میں لیے گئے افراد پر امریکی اہلکاروں نے کتے چھوڑ دیے، جس سے وہ قیدی شدید زخمی ہو گئے۔ اتحادی افواج کے ترجمان لیفٹیننٹ ناٹن جیری نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہا: ”ہمیں جہاں بھی ضرورت ہوگی، ہم کتے استعمال کریں گے۔“

صحافی جاوید احمد پر مظالم: اکتوبر کے اواخر میں بگرام جیل سے ایک قیدی جاوید احمد کو رہا کیا گیا۔ یہ بے

پاک صحافی قندھار کا رہنے والا تھا۔ اسے ملکی حالات پر بے لاگ تبصروں کے جرم میں قید کر کے بدترین ذہنی و نفسیاتی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جاوید احمد کو سرگرمی کے دھوکے سے الٹی جی تھی۔ جب امریکیوں کو یہ معلوم ہوا تو اسے سزا دینے کا نیا طریقہ اختیار کیا۔ ایک ساتھ کئی کئی سپاہی اس کے گرد بیٹھ کر سرگرمی نوٹی کرتے اور اس پر دھوکے کے سرغولے چھوڑتے۔ رہائی کے بعد جاوید احمد نے بگرام جیل میں امریکیوں کے سفاکانہ طرز عمل کا کچا چٹھا کھولا۔ اس نے بتایا کہ جیل میں 700 سے زائد افراد نہایت اذیت ناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جن میں افغانستان کے علاوہ عراق، ازبکستان، جنوبی افریقہ اور دیگر ممالک کے افراد بھی ہیں۔ اس نے انکشاف کیا کہ 25 سے زائد قیدی پاکستانی ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں۔

ڈاکٹر عافیہ صدیقی جیل میں: جاوید احمد کی رہائی سے قبل پاکستانی شہری ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بگرام جیل میں موجودگی کا راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو پانچ سال قبل (2003ء میں) کراچی سے ان کے دو بچوں سمیت اغوا کیا گیا تھا۔ اب تک وہ لاپتہ تھیں۔ اس سال بگرام جیل سے رہا ہونے والے بعض قیدیوں نے بتایا کہ وہ جیل میں ایک خاتون قیدی کی لرزہ خیز چٹین سننے رہے ہیں، جو غالباً پاکستانی ہیں اور بگرام جیل میں قید واحد عورت ہے۔ اس انکشاف پر میڈیا کے باہت لوگ حرکت میں آ گئے۔ برطانوی صحافی مریم ریڈی اور پاکستانی صحافی اشتیاق بیگ ایک مہم کے طور پر اس خاتون کی رہائی کے لیے سرگرم عمل ہوئے۔ جلد ہی تصدیق ہو گئی کہ وہ خاتون واقعی ڈاکٹر عافیہ صدیقی ہیں۔ امریکی حکام نے حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے اسی ماہ ڈاکٹر عافیہ کو امریکا منتقل کر دیا جہاں ان پر القاعدہ سے تعلقات اور امریکی فوجیوں پر حملے جھوٹے کے الزام میں مقدمہ چلا کر 86 برس کی قید سزا دی گئی۔ پاکستانی عوام کے احتجاج، ایسٹیلوں اور شدید دباؤ کے باوجود پاکستانی حکام نے اپنی قابل فخر شہری کو آزاد کرانے میں کوئی دل چسپی نہیں لی۔

افغانستان کے خزانوں پر ڈاکہ زنی: امریکیوں اور اتحادیوں کے افغانوں پر ظلم و تشدد کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر اس سرزمین کی دولت لوٹنے کا کھیل بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ ملکی نوادرات، قیمتی پتھر اور معدنیات اپنے ہاں منتقل کر رہے تھے۔ ماہ جون میں ناروے واپس جانے والے ایک سپاہی سے سینکڑوں قیمتی اشرفیاں، نایاب پتھر اور قدیم برتن برآمد ہوئے جس سے میڈیا کو اس لوٹ مار کا کچھ علم ہوا۔ انہی دنوں باسیلاز کے باشندوں نے انکشاف کیا ان کے ہاں جاپانیوں کی آمد بکثرت ہو رہی ہے جو فراہمی آب و صحت منصوبہ پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ جب کوئی کنواں کھودنا شروع کرتے ہیں تو ایک خاص گہرائی تک کھدائی کے بعد علاقے کے لوگوں کا قریب پچھلے ممنوع قرار دیے جاتے ہیں۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ انہوں

نے ایک بار چھپ چھپا کر دیکھا تو جاپانی ٹیم کنویں کی تہہ سے اشرفیاں، قیمتی جواہر اور نایاب چیزیں نکال رہی تھی۔ یہ ہیں اتحادیوں کے کارنامے جو افغانستان کی تعمیر نو اور عوامی فلاح و بہبود کی آڑ میں دونوں ہاتھوں سے ملکی دولت اور صدیوں کی امالیں لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔ میڈیا رپورٹوں کے مطابق لوگر میں کرواٹ کی 20 بڑی کانوں سے بڑی مقدار میں پتھر باہر نکل گیا جا رہا ہے۔ مغربی دنیا نے ہلند میں یورینیم کے وسیع ذخائر کا کھوج بھی لگا لیا ہے۔ ان ذخائر کو گرام ایرٹیس کے ذریعے باہر پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت اس وقت منکشف ہوئی جب اس یورینیم کی شراکت داری میں امریکا اور برطانیہ میں تنازع ہو گیا اور کامل کے دو جریڈوں ”پیام مجاہد“ اور ”جنگہ اطلاع رسانی“ نے عوام کو اس سے باخبر کیا۔

بش اور پرویز مشرف کو چھ اقتدار سے باہر: 2008ء اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ صلیبی جنگ کا آغاز کرنے والے صدر جارج ڈاکو بش اور اس کے فرٹ لائن اتحادی صدر پرویز مشرف دونوں کو اپنے عوام کی شدید نفرت کا سامنا کرنے کے بعد اقتدار سے باہر ہونا پڑا۔ پرویز مشرف، وردی پہلے ہی اُتار چکے تھے۔ 18 فروری 2008ء کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی جیت گئی تھی اور یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بن گئے تھے۔ زبردست عوامی دباؤ کے علاوہ فوجی قیادت کی وارننگ پر آخر کار 18 اگست کو پرویز مشرف صدارت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کی جگہ صدارتی انتخابات کے بعد آنجنہانی بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری نے 10 ستمبر 2008ء کو صدر کا منصب سنبھال لیا۔

صدر جارج بش نے دسمبر میں ہونے والے عام انتخابات میں سیاہ فام حریف بارک اوباما سے شکست کھائی اور 8 سال بعد ایوان اقتدار سے باہر ہو گئے۔ بارک اوباما امریکا کے پہلے صدر ہیں جن کا نسلی تعلق ایک سیاہ فام مسلم خاندان سے ہے اس لیے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ بش کی پالیسیوں میں بڑی تبدیلی لائیں گے مگر یہ توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ اوباما نے فتح کے بعد اپنی کاہنہ کا اعلان کیا تو رابرٹ گیٹس کو وزیر دفاع اور ہیلری کلنٹن کو وزیر خارجہ مقرر کیا جن کا تعصب اور اسلام دشمنی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

عراقی صحافی نے بش کو جوتوں کا تحفہ دیا: واٹس ہاؤس چھوڑنے سے پہلے صدر بش نے عراق اور افغانستان سے اپنی عسکری مہمات کا خرانچ تحسین حاصل کرنا ضروری سمجھا اور دسمبر 2008ء کے وسط میں اچانک بغداد پہنچ گئے۔ 14 دسمبر کو یہاں وہ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے کہ ایک صحافی خطرناک انداز میں ان کے بعد دیگرے ان پر اپنے دونوں جوتے پھینک کر پوری قوم کی طرف سے ان کی پالیسیوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار کیا۔ اس تذلیل کے بعد صدر بش کا بل پینچ گئے اور کامل میں حامد کرزئی سے مل کر پریس کانفرنس کی۔ صدر بش نے کہا کہ قیام امن کے لیے ہمیں طویل جدوجہد کرنا

ہوگی۔ اگر پاکستان سے لوگ آکر حملے کرتے رہیں گے تو افغانستان میں کامیابی مشکل ہو جائے گی۔ وطن واپس پہنچ کر صدر رٹش نے ایک بیان میں اپنے 8 سالہ دور اقتدار پر تبصرہ کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ ان کی پالیسیوں نے امریکا کو دہشت گردوں سے محفوظ بنا دیا ہے۔ انہوں نے فخریہ اعزاز میں کہا کہ وہ دہشت گردوں کے خلاف پاکستان اور سعودی عرب سمیت 90 ملکوں کا عظیم اتحاد چھوڑے جا رہے ہیں۔

افغانستان میں بڑے فوجی اڈوں کی تعمیر کا منصوبہ: صدر رٹش کا لہجہ بتا رہا تھا کہ انہوں نے عراق اور افغانستان جاری جنگ سے پیدا شدہ ملکی و بین الاقوامی مسائل اور عالمی بحران سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ چند دنوں بعد آنے والی امریکی جوائنٹ فورسز کمانڈر کی ایک رپورٹ نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ امریکا اپنی غلطیوں کو دہرانے پر مصر ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ امریکا اسلامی دنیا سے عسکریت پسندی ختم کرنے کے لیے 25 سال تک جنگ جاری رکھنے کی طویل منصوبہ بندی کر چکا ہے۔ اس مقصد کے لیے افغانستان میں مستقل فوجی ڈھانچہ بنایا جا رہا ہے جس کے تحت تین بڑے فوجی اڈے تعمیر کیے جائیں گے۔ ایک اڈہ قندھار میں ہوگا جس پر 500 ملین ڈالر لاگت آئے گی۔ ان تین اڈوں کے علاوہ تین علاقوں میں فوجی بستیاں آباد کی جائیں گی جن میں سے ہر بستی پر 300 ملین ڈالر صرف ہوں گے۔

ملا محمد عمر نے مذاکرات کا امکان مسترد کر دیا: امریکا کی یہ تیاریاں چیچ چیچ کر بتا رہی تھیں کہ حامد کرزی کی اور سعودی و پاکستانی شخصیات کے ذریعے گاہے گاہے طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالنا ایک کمزور خیال کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے 28 دسمبر کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر مجاہد نے ایک طویل عرصے کی خاموشی کے بعد بیانگ ویل اعلان کیا:

”افغان حکومت اور سعودی عرب سے طالبان کے مذاکرات کی باتیں بے بنیاد ہیں۔ ہم نے سعودی عرب اور ایران سمیت کسی بھی جگہ کرزی حکومت سے کسی نوعیت کی کوئی گفت و شنید نہیں کی۔“

ملا محمد عمر کا یہ بیان اس تناظر میں بھی تھا کہ بعض عناصر یہ پرچار کر رہے تھے طالبان بھی مذاکرات پر آمادہ ہیں اور سعودی عرب یا ایران میں ان کے نمائندوں نے صلح کی ابتدائی گفتگو شروع کر دی ہے۔ ظاہر ہے ایسی افواہوں کا مقصد طالبان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

انتخابات میں شرکت کے لیے حکمت یار کی شرائط: افغان صدر حامد کرزی کی پوزیشن حسب سابق کمزور رہی۔ وہ عام انتخابات کے لیے جس عوامی حمایت کے خواہاں تھے وہ انہیں حاصل نہ ہو سکی۔ حکمت یار نے فروری کے وسط میں انتخابات میں شرکت کے لیے آمادگی ظاہر کر دی تھی مگر ان کی دو شرائط تھیں:

① غیر ملکی افواج واپس چلی جائیں۔

① کرزئی استعفیٰ دے دیں۔

ظاہر ہے کرزئی استعفیٰ دینے کا تصور نہیں کر سکتے تھے اور غیر ملکی افواج کو واپس کرنا ان کے بس سے باہر تھا، پھر بھی کرزئی کی کوشش یہ تھی وہ طالبان اور حکمت یار کو مٹالیں۔ کرزئی حکومت کے رکن ایوان بالا مولانا ارسلان خان رحمانی جو افغان جہاد کے نامور لیڈر اور مجاہدین کے وزیر اوقاف بھی رہے، سال بھر اس سلسلے میں پیش رفت لیے اسلام آباد اور کابل کے درمیان متحرک رہے۔ اگست کے آغاز میں انہوں نے ایک صحافی کو بتایا کہ اقوام متحدہ کے نمائندے نے بھی انہیں کرزئی اور طالبان کے درمیان ٹیل کا کردار ادا کرنے کی ترغیب دی ہے۔

جون کے وسط میں امریکی سفیر ولیم وڈ نے بھی افغان حکومت کی طالبان سے مذاکرات کی کوششوں کی حمایت کرتے ہوئے کہا یہ افغانستان کا داخلی معاملہ ہے۔ تاہم طالبان قیادت صلح کی کوششوں کے پس پردہ پُر فریب ہتھکنڈوں سے محتاط تھی، اس لیے اس نے مذاکرات کی پیش کش کا کوئی مثبت جواب نہ دیا اور ایسی کوششوں کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ طالبان کی کارروائیاں کرزئی حکومت کے لیے مسلسل مشکلات بڑھاتی رہیں۔ افغان فورسز نہ صرف بے بس تھیں بلکہ بکثرت سپاہی طالبان سے ملتے جا رہے تھے۔ نومبر میں بیک وقت 11 سو فوجی منحرف ہو کر طالبان میں شامل ہو گئے جس سے افغان فوج پر بڑا منفی اثر پڑا۔



مآخذ و مراجع

- ﷲ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 10، 11، 12
- ﷲ ہفت روزہ بکبیر، فرائڈے آپٹیکل، غازی، جلد 2007ء، 2008ء
- ﷲ قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرائد 2007ء، 2008ء
- ﷲ روزنامہ اسلام کراچی 2007ء، 2008ء
- ﷲ ذاتی یادداشتیں
- ﷲ زبانی روایات

چالیسواں باب

اوباما اور افغانستان

2009ء کے حالات

اوباما کی صدارت: سال 2009ء امریکا میں نئے صدر اوباما کے اقتدار کا سورج طلوع ہوتے دیکھ رہا تھا۔ 20 جنوری کو وائٹ ہاؤس میں اوباما کی تقریب حلف برداری کا انعقاد ہوا جبکہ دنیا میں بد امنی، قتل و غارت اور ہولناک جنگوں کا افسوس ناک سلسلہ شروع کرنے والا بے رحم انسان جاری واکر بش پوری دنیا بلکہ اپنے ہم وطنوں کی بھی لعنت ملامت کا پیشکارہ لادے وائٹ ہاؤس سے رخصت ہو گیا۔ اوباما نے اقتدار سنبھالنے کے بعد بنیادی طور پر صدر بش کی جارحانہ اور استعماری سوچ پر مبنی پالیسیوں کو جاری رکھا البتہ طریقہ کار میں کچھ ترمیم کر دی۔ القاعدہ کے سینئر اہمیا ایمن الظواہری نے اپریل 2009ء کے وسط میں جاری ہونے والی ویڈیو ٹیپ میں اوباما کی پالیسیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

”اوباما انتظامیہ بش کی پالیسیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ وہ امریکا کے شخص میں کوئی تبدیلی نہیں لایا۔ امریکا بدستور افغانستان، عراق اور فلسطین میں مسلمانوں کا قتل عام کر رہا ہے۔“

اوباما کی حکمت عملی: اوباما نے اقتدار سنبھالتے ہی پہلا بڑا فیصلہ یہ کیا کہ عراق میں جنگ ختم کر کے افواج کو چھادنیوں میں محدود کر دیا جائے اور ملک کا کنٹرول مقامی فورسز کو سونپ دیا جائے۔ اس تجویز پر صدر بش کے دور میں تقریباً اتفاق ہو گیا تھا۔ اوباما نے اسے عملی شکل دے دی اور سال 2009ء کے دوران عراق میں امریکی افواج کا کردار تقریباً ختم ہو گیا۔

اوباما کی اس پالیسی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ عراق سے جان چھڑا کر پوری توجہ افغان محاذ پر دی جائے اور وہاں افواج کی تعداد بڑھادی جائے۔ چنانچہ اس سال افغانستان میں امریکی و اتحادی افواج کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ جنوری میں اقتدار سنبھالتے ہی اوباما نے 17 ہزار مزید فوجی افغانستان روانہ کرنے کا اعلان کیا اور مارچ کے پہلے عشرے میں اس سے متعلقہ بل پر دستخط کر دیے۔ افواج کا نظم و نسق

بہتر بنانے کیلئے کمی میں امریکی وزارت دفاع نے جنرل میک کرین کو ہٹا کر جنرل میک کرٹل کو افغانستان میں نیٹو فورسز اور امریکی افواج کا کمانڈر بنا دیا۔ اس دوران 17 ہزار میں سے 12 ہزار امریکی سپاہی افغانستان پہنچ گئے مگر جون میں آپریشن خنجر کی ناکامی نے اس تعداد کو بھی ناکافی ثابت کر دکھایا۔

جنرل میک کرٹل کا اصرار: اگست میں جنرل میک کرٹل نے بلجیم میں ہونے والے امریکا کے اعلیٰ فوجی حکام کے غیر رسمی اجلاس کے دوران آگاہ کیا کہ امریکا کو 2010ء تک مزید 27 ہزار سپاہی افغانستان میں تعینات کرنا ہوں گے۔ اکتوبر تک یہ ضرورت مزید بڑھ گئی اور جنرل میک کرٹل نے مطالبہ کیا کہ افغانستان میں فوجی حکمت عملی یکسر بدلنا ہوگی۔ میک نے درخواست کی کہ نیٹو افواج میں مزید 40 ہزار افراد کا اضافہ ناگزیر ہے۔ جبکہ زمینی حقائق کے لحاظ سے نیٹو کا افغانستان میں مزید افراد فراہم کرنا آسان نہیں تھا۔ نیٹو کا اہم رکن اٹلی اپنی افواج افغانستان سے نکالنے کے لیے پر تبول رہا تھا۔ برطانیہ پہلے ہی مایوسی کا شکار تھا۔ تبصر کے اواخر میں ایک برطانوی اخبار نے افغان جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

”اعصاب شکن افغان جنگ فنڈز کی کمی اور ہلاکتوں میں اضافے کے باعث تباہ کن اور ناکام ثابت ہوگی اور مرنے والے فوجیوں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔“

حقیقت یہ تھی کہ امریکا کا معاشی تباہی کے باوجود جنگ پر اصرار دیکھ کر بڑے بڑے دانشوروں کو امریکا کی شکست در بخت سامنے نظر آ رہی تھی۔

اوباما کو نوٹیل پراسر: اس سال صدر اوباما کے لیے اگر کوئی خوشی کا موقع تھا تو وہ صرف یہ کہ انہیں اکتوبر میں امن کے حوالے سے ”نوٹیل پراسر“ سے نوازا گیا جس پر دنیا بھر کے سربراہوں نے انہیں مبارک باد دی جبکہ میڈیا پر نامور صحافیوں اور دانشوروں نے اسے حیرت انگیز قرار دیا کیونکہ اوباما کے آنے کے بعد دنیا کو امن کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی، ان سے وابستہ تمام توقعات سراب ثابت ہوئی تھیں۔ طالبان ترجمان نے اوباما کو نوٹیل پراسر ملنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ”یہ انتہائی غیر معقول فیصلہ ہے۔ اوباما کو امن کا نہیں، تشدد کا نوٹیل پراسر دیا گیا ہے۔“

سچ تو یہ ہے کہ یہ جھوٹا اعزاز افغان جنگ میں شکست کے اس ناسور کو مندرل نہیں کر سکتا تھا جو امریکی قیادت کو ترپائے دے رہا تھا۔ امریکی صدر اوباما نے 14 ستمبر کو ڈی جیمیل سی این بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بارے میں اپنی پریشانی کا اعتراف کیا اور کہا: ”میں ہر وقت افغان جنگ میں درپیش مشکلات کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔“

ساتھ ہی انہوں نے یہ کہا کہ اگر ڈرون حملے کامیاب رہے تو افغانستان سے فوج واپس نہ بلانے کی

کوئی وجہ نہیں ہوگی۔

امریکی قیادت مخمضے کا شکار: ستمبر سے نومبر کے اواخر تک صدر اوباما، امریکی افواج کے سینئر افسران اور نیٹو کے اعلیٰ عہدیداروں کے بیانات سے صاف پتا چلتا تھا کہ امریکی قیادت افغان مسئلے پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی۔ جون سے نومبر کے اختتام تک مختلف مواقع پر صدر اوباما اپنے مشیروں اور فوجی قیادت کے ساتھ طویل مشاورتوں میں مصروف رہے۔ اس دوران بار بار ان کا عندیہ تبدیل ہوتا نظر آتا رہا۔ امریکی فوجی ہائی کمان کا موقف بھی کسی ایک رخ پر نہیں تھا۔ درحقیقت اوباما انتظامیہ 8 سال سے جاری افغان جنگ کی نئی حکمت عملی طے کرنے میں شدید اختلافات کا شکار تھی۔

جنرل میک کرشل اور صدر اوباما کی مایوسی: جنرل میک کرشل جلد از جلد مزید 40 ہزار سپاہیوں کا انتظام کرانے پر مصرتھے، مگر 13 اکتوبر کو کوپن ہیگن میں صدر اوباما سے 25 منٹ طویل ملاقات کے بعد انہیں اندازہ ہوا کہ صدر کی قوت فیصلہ جواب دے چکی ہے۔ اس کے بعد کرشل اور اوباما کے تعلقات کشیدہ ہو گئے اور کرشل کا جوش بھی مایوسی میں بدلنے لگا۔ صرف پانچ دن بعد وہ واشنگٹن میں ایک انٹرویو کے دوران یہ کہتے نظر آئے کہ طالبان سے بات چیت کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ امریکی فوج کو ایک تیل سے مشابہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مزاحمت کاروں کا ہر زخم اس تیل کو کمزور کر رہا ہے۔ میک نے دعویٰ کیا کہ اگر ہم طالبان زگارا فراہم کر دیں تو 60 فیصد مسائل ویسے ہی حل ہو جائیں گے۔

میک کرشل کے اس بیان کے اگلے روز 9 اکتوبر کو صدر اوباما نے وائٹ ہاؤس میں ایک اجلاس کی صدارت کی جس میں طالبان سے مذاکرات کی منظوری کا عندیہ ظاہر کیا گیا۔ اجلاس کے بعد امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے کہا کہ امریکا طالبان کا سیاسی کردار قبول کرنے پر آمادہ ہے کیونکہ مسئلے کا فوجی حل ممکن نہیں رہا۔ نئی پالیسی مگر؟ صدر اوباما نے افغان پالیسی کے بارے میں مشاورت جاری رکھی۔ اس سلسلے کی چوتھی میٹنگ میں گرما گرم بحث کے بعد طالبان کے خاتمے کا ہدف ترک کرنے، پاکستان میں ڈرون حملوں کو دمست دینے اور القاعدہ کو شکست دینے پر اتفاق کیا گیا۔ ادھر امریکا کے بعض اتحادی جنگ کو محدود کرنے یا پسپائی کی مخالفت کر رہے تھے۔ برطانوی چیف آف جنرل اسٹاف ڈیوڈ رچرڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ افغانستان سے انخلاء کی صورت میں برطانیہ کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ڈیوڈ رچرڈ اُمید ظاہر کر رہے تھے کہ جنگ اب بھی جیتی جاسکتی ہے۔ البتہ فتح میں کچھ سال مزید لگ سکتے ہیں۔ 27 اکتوبر کو صدر اوباما نے ایک بار پھر متذبذب انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں مزید فوج بھیجنے میں جلدی نہیں کریں گے، مگر اس بیان کے بعد صدر اوباما کی پالیسی کا رخ بدلتا نظر آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

جیسے وہ جنگ جاری رکھنے پر اصرار کرنے والے مشیروں کی رائے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکتوبر کے آخری ایام میں امریکا نے سی آئی اے کی وساطت سے طالبان کے ساتھ خفیہ مذاکرات کی بھی کوشش کی اور امریکی نمائندے جنوبی افغانستان میں طالبان کے نمائندے ملا برادر سے ملے۔ امریکا یہ ضمانت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ القاعدہ امریکا کی واپسی کے بعد مغربی ممالک یا امریکا میں کوئی انتقامی کارروائی نہ کرے، مگر ان مذاکرات کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آیا۔ جس کے بعد ابامانے مزید فوج افغانستان بھیجنے پر غور شروع کر دیا۔ نومبر کے آخری عشرے میں امریکی حکام اگلے سال افغانستان میں مزید فوج تعینات کرنے پر متفق نظر آنے لگے لیکن خود فوج کا مطالبہ تھا کہ ہمیں واپسی کا نام فریم پہلے دیا جائے۔

آخر کار 2 دسمبر کو بوقت نصف شب امریکی صدر نے نئی افغان پالیسی کا اعلان کر دیا جس کے مطابق مزید 30 ہزار فوجی افغانستان بھیجنے اور 18 ماہ بعد 2011ء میں انخلا شروع کرنے کا مژدہ سنایا گیا۔ ابامانے یہ بھی کہا کہ وہ مسلم دنیا سے محاذ آرائی ختم کرنا چاہتے ہیں۔

19 دسمبر کو امریکی ٹی وی چینل ”اے بی سی“ کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر ابامانے کہا: ”افغانستان میں مزید فوج بھیجنے کا فیصلہ آسان نہیں تھا۔ اپنے بہادر فوجیوں اور ان کے اہل خانہ کے بارے میں سوچ کر رات کی نیند اڑ جاتی ہے۔“ امریکی صدر کا مزید فوج بھیجنے کے ساتھ ساتھ واپسی کا نام فریم دینا اور افغان مسئلے سے راتوں کی نیند حرام ہونے کا اعتراف کرنا اس بات کا واضح اعلان تھا کہ سپر پاور امریکا مسلمانوں کی قوت ایمانی کے سامنے صفر پاور بن چکا ہے۔

کھسیانی ملی کھسیانو چے: امریکی اور اتحادی سوراہا اپنی شکست کی اصل وجہ چھپانے اور شرمندگی سے بچنے کے لیے جس قسم کے جھوٹ گھڑ رہے تھے ان کا اندازہ امریکی فوج کے سربراہ جنرل میک کرسٹل کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے کہا طالبان کا ساتھ دینے والے بہت سے نوجوان معاشی مجبوروں کی خاطر لڑتے ہیں اور طالبان جنگجو امریکی فوجیوں سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔ یاد رہے کہ موصوف نے کچھ ہی مدت پہلے ارشاد فرمایا تھا: ”طالبان کو ہم روزگار فراہم کر دیں تو 60 فیصد مسائل حل ہو جائیں گے۔“ سوال یہ ہے کہ اگر طالبان کی تنخواہیں امریکی فوجیوں سے زائد ہیں تو وہ روزگار کے لیے بھلا امریکا کے محتاج کیوں ہوں گے؟

امریکا کے لیے ایک پریشانی یہ بھی تھی کہ عراق سے افغانستان تک پھیلی ہوئی اس کی فوج کے لیے معالجین کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، ڈاکٹروں کی ہزاروں اسامیاں خالی پڑی تھیں۔ امریکی جراثیمک رپورٹوں کے مطابق ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر عدد سے زیادہ کام کی وجہ سے خود زہنی مرلیض بننے جا رہے تھے۔

امریکی فوجیوں کی خود کشیوں کا ریکارڈ: 2009ء کے اختتام پر میڈیا پر آنے والی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ اس سال امریکی فوج میں خود کشیوں کی شرح گزشتہ تمام سالوں سے زیادہ رہی۔ 160 حاضر سروس سپاہیوں نے خود کشی کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس سے قبل 2008ء میں 140 فوجیوں نے خود کشی تھی جبکہ 2007ء میں یہ تعداد 115 تھی۔ خود کشی کرنے والوں میں سے ایک تہائی نا تجربہ کار فوجی ایسے تھے جو اس سے قبل کسی محاذ پر تعینات نہیں کیے گئے تھے۔

2009ء افغانستان میں امریکی مظالم: امریکا اور اس کے اتحادیوں نے افغانستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی، بین الاقوامی قوانین کی پامالی اور افغان شہریوں پر مظالم کا سلسلہ اس سال بھی جاری رکھا۔ جنوری کے آخری عشرے میں کابل کے نواحی ضلع لغمان میں اتحادی طیاروں کی بمباری سے 15 افراد جاں بحق ہو گئے۔ لغمان کی صوبائی کونسل نے تصدیق کی کہ مرنے والے عام شہری تھے۔ جولائی کے تیسرے ہفتے میں پکتیا کے ضلع کزواڑ کے بارڈر سے ایک امریکی فوجی کو اغوا کر لیا گیا جس کے بعد امریکی فوج نے آ کر علاقے میں گولی چلا دی جس سے 10 سے زائد بچے اور عورتیں شہید ہو گئیں۔

جراثیمی اور ممنوعہ کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال: اکتوبر کے آغاز میں سامنے آنے والا ایک میڈیا رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ امریکی فوج نے طالبان کے خلاف جراثیمی ہتھیار استعمال کیے ہیں۔ فوج، زمل، ارزگان، ہلمند اور قندھار میں ان بین الاقوامی طور پر ممنوع ہتھیاروں کے تجربات کرتی رہی ہے اور جب یہ بات مشہور ہوئی تو اسے چند فوجیوں کی ذاتی حرکت قرار دے دیا گیا اور ان فوجیوں پر بھی مقدمہ چلانے کے بجائے انہیں چپکے سے وطن واپس بھیج دیا گیا۔ یاد رہے اس سے قبل مئی میں نیٹو کمانڈر ”ڈیوڈ میک نین“ کے ترجمان جنرل گرگری جو لین نے بھی اعتراف کیا تھا کہ امریکی افواج افغانستان میں سفید فاسفورس بم استعمال کر رہی ہیں جو بین الاقوامی طور پر ممنوع ہیں۔

گوانتانامو بے میں مشق ستم جاری رہی: گوانتانامو بے کی طرح اس سال بگرام جیل کے قیدیوں پر بھی امریکی فوج کے لرزہ خیز تشدد کی رپورٹیں میڈیا پر آئیں جن سے امریکا کی اصل تہذیب کا نہایت مکروہ چہرہ سامنے آتا ہے۔ رپورٹوں میں بتایا گیا کہ قیدیوں پر کتے چھوڑ کر انہیں بدترین طریقے سے زخمی کیا جاتا ہے۔ ناقابل برداشت مار پیٹ اور غلیظ گالیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بجائے پانی میں ڈوبا جاتا ہے۔ تپتے موسم گرما میں ان پر کھولتا ہوا پانی انڈیا جاتا ہے۔ انہیں کئی کئی دن سونے نہیں دیا جاتا۔ بعض اوقات انہیں مادر زاد برہنہ کر کے آبرو باختہ مغربی عورتوں کے سامنے کھڑا ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسی ایک رپورٹ جون میں بی بی سی پر بھی نشر ہوئی۔

امریکی صدر اوباما نے انتہائی سنگ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی فوج کے ان سنگین جرائم کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ حالانکہ توقع کی جا رہی تھی کہ اوباما انتظامیہ کم از کم عقوبت خانوں اور زندانوں میں مسلمانوں پر ہونے والے اس بدترین ظلم و تشدد میں کچھ نہ کچھ کی ضرورت کر دے گی جس سے دنیا بھر میں امریکا کی رسوائی ہوئی ہے۔

طالبان کا قتل عام، دوسم اور سی آئی اے: وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امریکی افواج، افسران اور انتظامیہ کے جنگی جرائم کی مزید تفصیلات سامنے آتی جا رہی تھیں۔ جولائی کے وسط میں نیویارک ٹائمز نے کئی بار اٹھائے جانے والے اس سوال کا جواب تلاش کیا کہ دسمبر 2001ء میں دوسم کے ہاتھوں ہزاروں طالبان کے قتل کی تحقیقات کیوں نہیں کی گئیں؟ اخبار نے انکشاف کیا کہ دوسم کے ان ناقابل معافی جنگی جرائم کی تحقیقات خود امریکا نے رکوائی تھیں کیونکہ دوسم سی آئی اے کا عطیہ خوار ملازم رہا ہے۔

نیٹو کی حالت زار، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن

اٹلی ہو گئیں سب تدبیریں: امریکا کی دست راست نیٹو کے تمام حربے بھی ناکامی سے دوچار ہو رہے تھے۔ 2009ء میں نیٹو نے طالبان کے روپ میں جنگجو میدان میں اتارنے کا تجربہ بھی کیا مگر اس سے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ سال کے آخری مہینوں میں نیٹو کی اعلیٰ کمان اور ماتحت افواج کے کمانڈروں میں کشاکش بھی بڑھ گئی۔ کمانڈر مزید تازہ دم فوجیوں کا مطالبہ کر رہے تھے جبکہ اعلیٰ کمان اس کی تحمل نہیں تھی۔ 16 اکتوبر کو ایساف کمانڈر میجر جنرل مارٹ دی کروک کا یہ مطالبہ میڈیا پر سامنے آیا جس میں کہا گیا تھا کہ جنوبی افغانستان اور ہلمند کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کے لیے کم از کم دو بریگیڈ مزید فوج یعنی 10 سے 15 ہزار سپاہیوں کی فوری ضرورت ہے۔ اس مطالبے کے جواب میں فرانس کے صدر سرکوزی نے فرانسیسی جریدے ”لی فگارڈ“ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہم اس جنگ زدہ ملک میں مزید ایک فوجی بھی نہیں بھیجیں گے۔

نیٹو کی ساکھ ختم: انہی دنوں کینیڈا کے ایک سابق فوجی جنرل رک بلیئر نے اپنی کتاب ”اے سولجر فٹ بلیس بیوروکریٹس اینڈ دی پولیٹیکس آف وار“ میں پیش گوئی کی نیٹو کو ایک بڑا دھچکا لگنے والا ہے۔ اگر نیٹو افغانستان میں کامیاب نہ ہوئی تو اس کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ جنرل رک بلیئر جس نے افغان جنگ کے ابتدائی سالوں میں ایساف افواج کی کمان بھی کی تھی، دعویٰ کیا کہ نیٹو اپنی ساکھ کو بچا رہا ہے۔ اکتوبر میں نیٹو کے میکرٹری جنرل اینڈرسن فوگ راسون نے افغان جنگ میں درپیش مشکلات کا ذکر

کرتے ہوئے کہا: ”امریکا کے اتحادی اس جنگ میں شرکت کی بڑی بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔ اگر ہم جنگ ہارے تو یہ ملک دوبارہ دہشت گردوں کا مسکن بن جائے گا۔“

افغان مسئلے کے بارے میں نیٹو کی ہائی کمان کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اکتوبر کے آغاز میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے اجلاس میں نیٹو افواج کو افغانستان میں مزید ایک سال کے لیے سرگرم رکھنے کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس کے صرف ایک ماہ بعد نیٹو کے سربراہ ایڈمرل رن فوگ نے برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن سے مشورے کے بعد اعلان کر دیا کہ آئندہ سال ہم اختیارات، افغان فورسز کو سونپ دیں گے۔ کیونکہ اس ملک سے نکل جانا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔ یہ اعلان 14 نومبر کے قومی اخبارات میں شامل ہوا تھا۔

موصوف نے ایک جرمن ہفت روزے کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ افغانستان کے حالات اور جیلینجر کے بارے میں ان کا اندازہ غلط تھا۔ انہوں نے ساتھ ہی اُمید ظاہر کی کہ اگر نیٹو ممالک مزید فوج بھیجنے پر آمادہ ہوں تو کامیابی مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کے طے جملے بیانات وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے ہی دے رہے تھے۔

نیٹو سربراہ دسمبر کے آخری ہفتے افغانستان کے دورے پر بھی گئے، یہاں انہوں نے ایک بار پھر قلابازی کھائی اور 23 دسمبر کو کابل میں صدر حامد کرزئی کے ساتھ پریس کانفرنس میں کہا کہ ہم افغان کی ڈیڈ لائن نہیں دے سکتے اور جب تک افغان فورسز ملکی دفاع کے قابل نہ ہوں ہم افغانستان میں رہیں گے۔ ان بیانات اور اطلاعات کے تضاد سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ نیٹو سربراہ کی قوت فیصلہ سلب ہو چکی تھی۔

34 میں سے 33 صوبے طالبان کے یاس: افغانستان میں نیٹو افواج کی ناکامی کا اندازہ خود نیٹو کے ایساف کمانڈر کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جو دسمبر 2009ء کے اواخر میں عالمی میڈیا پر نشر ہوا جس میں وہائی دی گئی تھی کہ طالبان نے افغانستان کے 34 صوبوں میں سے 33 صوبوں میں متوازی حکومتیں قائم کر لی ہیں۔ وہ ہر روز طاقتور اور ہم کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے قبل 20 اکتوبر کو پاکستان کے سابق حکمران پرویز مشرف نے نیویارک سے یہ بیان دیا کہ طالبان افغانستان کے 90 فیصد علاقے پر قابض ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طالبان کو تسلیم نہ کرنا امریکا کی غلطی تھی۔

رسمد پر حملے جاری رہے: 2009ء میں بھی امریکا اور نیٹو کے لیے پاکستان سے رسمد کا راستہ محفوظ نہ بنایا جاسکا۔ یہاں قاتلوں پر مسلسل حملے ہوتے رہے۔ فروری میں لنڈی کوتل میں نیٹو کے درجنوں کنشیز اور آکسل ہینکرز جلادینے گئے۔ مارچ کے وسط میں پشاور میں نیٹو کے قاتلے پر ایک بار پھر بڑا حملہ ہوا۔

پاک افغان اڈے پر کھڑے 34 فزکوں کو نامعلوم حملہ آوروں نے رات کی تاریکی میں راکٹوں کا نشانہ بنا ڈالا۔ 34 فزکوں کے ساتھ ساتھ 20 بکتر بند گاڑیاں بھی جو حفاظت کے لیے ساتھ تھیں، تباہ ہو گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مارچ کے اواخر میں نیٹو کے لیے سپلائی مکمل طور پر بند ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ کیونکہ تین ماہ سے پاکستان والا روٹ حملوں کی زد میں تھا۔ اوپر سے کرغیزستان نے بھی اپنی سرزمین پر امریکی اڈہ بند کر دیا تھا۔ اپریل میں تاجکستان نیٹو کو رسد کے لیے راہداری مہیا کرنے پر آمادہ ہو گیا جس کے بعد امریکا نے جون میں روس سے کیے گئے معاہدے کے تحت وسط ایشیا سے سپلائی لائن کھولنے کی تیاری مکمل کر لی مگر شمالی افغانستان میں رسد کے قافلوں پر طالبان کے حملوں کی منصوبہ بندی نے زمینی روٹ سے اس کوشش کو بھی خطرناک بنا دیا۔

ادبا ماروس سے مدد لینے پر مجبور: امریکی صدر ادبا مارنے اس صورت حال میں انتہائی مجبوری کا قدم اٹھاتے ہوئے روس کے صدر کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور دونوں حکمرانوں نے جوہری اسلحے کی تخفیف کے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ ساتھ ہی روسی صدر نے امریکی و اتحادی افواج کی رسد کے لیے روس سے روزانہ 12 پروازوں کو افغانستان جانے کی منظوری دے دی۔ اس طرح ایک حد تک سامان رسد جانے کی گنجائش نکلی آئی، مگر امریکی و اتحادی افواج کی ضروریات اتنی زیادہ تھیں کہ زمینی راستہ استعمال کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ افواج کی تعداد میں اس سال مسلسل اضافہ کیا جا رہا تھا۔ سپاہیوں کی ہلاکت، رسد میں کمی اور وسائل کی کم یابی کی وجہ سے اگست کے آخری عشرے میں نیٹو کمانڈروں نے مشترکہ طور پر مطالبہ کیا کہ مزید وسائل اور مزید سپاہی فراہم کیے جائیں ورنہ افغانستان میں کامیابی مشکل ہے۔

کنٹینر تباہ ہوتے رہے: ستمبر کے آغاز میں ایسے قافلوں پر پھر ایک بڑا حملہ ہوا جس میں نیٹو کے 25 آئل ٹینکروں اور کنٹینر تباہ ہو گئے۔ یہ حملہ جن بارڈر پر ہوا تھا۔ بم ایک آئل ٹینکر میں نصب کیا گیا تھا۔ دھماکے کے بعد شعلوں نے پورے قافلے کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اکتوبر کے دوسرے عشرے میں پشاور میں نیٹو کے ٹرینٹل پر چند نامعلوم افراد نے حملہ کیا۔ وہ سیکورٹی گارڈز سے اسلحہ چھین کر اندر داخل ہوئے اور کنٹینروں کو آگ لگا دی جس سے 10 گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔ 8 نومبر کو جنوبی افغانستان میں نیٹو فزکوں کی رسد کے قافلے پر حملہ کر کے 2 آئل ٹینکر تباہ کر دیے گئے۔

امریکا کی ڈیوتی معیشت 2009ء میں: امریکا کے معاشی مسائل اس سال بھی روز افزوں رہے۔ نومبر سے دسمبر کے وسط تک صرف ڈیڑھ ماہ میں اس کے 11 بینک دیوالیہ ہو چکے تھے۔ اوسطاً ہر ماہ 11 بینک دیوالیہ ہوتے رہے جن کی مجموعی تعداد سال کے آخر تک 130 سے زائد ہو چکی تھی۔ امریکا میں بے

روزگاری کی شرح بھی ناقابل یقین حدود کو چھو رہی تھی۔ 2 کروڑ 60 لاکھ افراد بے روزگار ہو کر مارے مارے پھر رہے تھے۔ صرف اکتوبر 2009ء میں 2 لاکھ افراد کو ملازمتوں سے جواب دیا گیا۔ امریکا کی معاشی تباہی کے اسباب میں اس کی عالمگیر جنگ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ ایک رپورٹ کے مطابق 2001ء سے 2009ء کے اختتام تک امریکا افغانستان اور عراق کے محاذوں پر دس کھرب یعنی ایک ٹریلین ڈالر جھونک چکا تھا، مگر وہ نتائج سے اب بھی کوسوں دور کھڑا تھا۔

کرزئی حکومت کے مسائل

2008ء کے اواخر میں حامد کرزئی اور امریکی حکام کے درمیان فاصلے بڑھ گئے تھے اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ امریکا اب ان کی جگہ کسی اور شخص کو استعمال کرنے والا ہے۔ یہ اشارے واضح تھے کہ امریکا کے نزدیک افغان جنگ میں کرزئی کی حکومت کی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ 2009ء کے شروع ہی میں حامد کرزئی کو بڑا جھکا اس وقت لگا جب 20 جنوری کو دوائٹ ہاؤس میں ہونے والی صدر اوباما کی تقریب حلف برداری میں انہیں مدعو نہ کیا گیا۔ افغان صدر نے اس کے رد عمل میں اپنی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا امریکی حملوں میں افغان شہریوں کی ہلاکت ناقابل برداشت ہے۔

کرزئی، روس اور بھارت سے دوستی، میڈیا کا طنز: حامد کرزئی کے لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ وہ امریکا سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں۔ ماہ فروری میں ان کے بیانات اور اقدامات سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ روس سے دوستی بڑھا کر امریکا کو بے اعتنائی کا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ حامد کرزئی کے اس بدلتے ہوئے رجحان پر افغان میڈیا نے زبردست طنز کیا۔ روزنامہ ”ہشت صبح“ نے اپنے ادارے میں لکھا کہ حامد کرزئی امریکی سگارا کوری ماحس سے جلانا چاہتے ہیں۔ روزنامہ ”پیان“ نے لکھا حامد کرزئی نے چند ماہ سے مغربی دوستوں سے مایوس ہو کر روس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا ہے جس سے ان کی سیاسی ناچنگی ظاہر ہوتی ہے۔

حامد کرزئی جنوری کے دوسرے ہفتے میں بھارت یا تبرا بھی کر آئے تھے۔ حالانکہ اس سفر میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دہلی میں صدر بھارت اور وزیر خارجہ سے ملاقات میں حسب معمول دہشت گردی کے خاتمے کے لیے اتحاد و اتفاق کے عہد و پیمان کی تجدید کی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کرزئی اپنے کیریئر کو بچانے کے لیے خطے میں نئے دوستوں کی تلاش اور پرانے دوستوں سے تعلقات میں مزید پھٹکی کے لیے نہایت شد و مد سے کوشش کر رہے ہیں۔

کرپٹ افغان حکومت: انہی دنوں نیٹو کے سیکرٹری جنرل جاپ ڈی صوب شینر نے امریکی اخبار میں شائع کردہ اپنے آرٹیکل میں کہا کہ افغان حکومت نا اہل ہے۔ ملک کی تباہی کی وہ بھی اتنی ہی ذمہ دار ہے جتنا کہ طالبان۔ بنیادی مسئلہ طالبان نہیں حکومتی بد انتظامی ہے۔ افغان حکومت طالبان پر الزام لگاتی ہے، مگر وہ خود کرپشن کے طاعون کا شکار ہے۔

اس قسم کے تبصروں کے جواب میں حامد کرزئی نے بھی نیٹو کو آڈے ہاتھوں لیا اور کہا کہ نیٹو کے خود سرانہ اور غیر ضروری آپریشنوں کی وجہ سے طالبان کی حمایت اور ان کی مقصد دانہ سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ حامد کرزئی نے امریکی صدر ادباما کی جانب سے افغانستان میں مزید افواج کی تعیناتی کی بھی مخالفت شروع کر دی۔

انتخابات کی تاریخ: فروری 2009ء کے اواخر میں افغان پارلیمنٹ میں مزید امریکی فوج کی تعیناتی کا مسئلہ زیر بحث آیا، اکثریت نے ملک میں مزید 30 ہزار امریکی فوجیوں کی تعیناتی کو ناقابل قبول قرار دیا۔ افغان صدر اور پارلیمنٹ کے لیے یہ اظہار جرأت اس لیے ضروری تھا کہ اب قوم کو اعتماد میں لینے کا وقت آچکا تھا۔ مارچ میں الیکشن سرپر تھے اور کرزئی حکومت کو جیسے تیسے عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھیں۔ تاہم انہی دنوں طالبان کی کارروائیوں کا ایک طوفان آگیا اور الیکشن کروانا ممکن نہ رہا۔ اس کے باوجود امریکا کا اصرار تھا کہ الیکشن چاہے نمائش ہی سہی، ضرور کروائے جائیں۔ چنانچہ امریکی دباؤ پر اگست 2009ء میں انتخابات کا انعقاد طے کر لیا گیا۔

20 اگست 2009ء کے عام انتخابات: آخر کار 20 اگست کو امریکی اور اتحادی افواج کے سخت حفاظتی نرغے میں افغانستان کے عام انتخابات ہوئے۔ اس بار طالبان نے انتخابی عمل کو سبوتاژ کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ اس سے قبل افغان حکومت کی جانب سے انتخابات کے دوران عارضی جنگ بندی کی پیش کش کا انہوں نے مثبت جواب دیا۔ شاید طالبان نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انتخابی عمل کو روکنے سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ نتائج تو بالادست استعماری طاقت کے پروگرام کے مطابق ہی سامنے آتے ہیں، البتہ پولنگ روکنے کے لیے کیے گئے حملوں سے الٹا خود حملہ آوروں کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔

کرزئی نے دنگل جیت لیا: انتخابات میں حامد کرزئی کا اصل مقابلہ سابق وزیر خارجہ عبداللہ عبداللہ اور سابق وزیر خزانہ اشرف غنی سے تھا۔ ان کے علاوہ 30 دیگر امیدوار بھی تھے۔ حیرت انگیز طور پر حامد کرزئی نے اس بار بھی دنگل جیت لیا، جبکہ چند ماہ سے امریکا سے ان کے تعلقات کارو کھاپن سب کو یقین دلارہا تھا کہ اس بار وہ چاروں شانے چت گریں گے۔ اس طرح 2009ء افغان صدر حامد کرزئی کے

لیے خوش قسمتی کا سال ثابت ہوا کیونکہ سال بھر انتخابات میں شکست کا خوف محسوس کرنے کے باوجود وہ بالآخر انتخابات جیت کر دوبارہ صدر بن گئے حالانکہ ان کی کامیابی کے امکانات بظاہر معدوم تھے۔ مبصرین کے مطابق آخری وقت میں امریکی انتظامیہ اور صدر کرزئی کے درمیان کچھ ایسے معاملات طے پا گئے تھے جن پر امریکا کو شدید اصرار اور کرزئی کو مسلسل انکار تھا جن میں سرفہرست ملک میں امریکی اڈوں کا قیام تھا۔ کرزئی نے جب یہ دیکھ لیا کہ امریکا کی ضد کے آگے انکار کا نتیجہ اقتدار سے محرومی کی شکل میں ملے گا تو وہ نرم پڑ گئے تاہم یہ طے کر لیا گیا کہ ان معاملات کو اس طرح تدریجاً آگے بڑھایا جائے گا کہ عوام اپنی حکومت سے بے اعتماد نہ ہونے پائیں۔ ان نازک معاملات کے طے پا جانے کے بعد امریکا سمجھ گیا کہ اب کرزئی کی جگہ کسی نئی قیادت کو سامنے لانا سودمند نہیں ہوگا کیونکہ کرزئی طالبان سے بات چیت آگے بڑھانے میں بھی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہر چند کہ امریکا نے انخلاء کا حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا مگر آئندہ ایک دو سالوں میں وہ ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو سکتا تھا۔ ان پہلوؤں کے پیش نظر رکھتے ہوئے کرزئی کو باقی رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

دھاندلی کا اعتراف: گزشتہ انتخابات کی طرح اس بار بھی پولنگ کے عمل میں زبردست دھاندلی دیکھنے میں آئی تھی۔ عبداللہ عبداللہ تو یہ روٹا روٹی رہے تھے، خود حامد کرزئی کو اعتراف کرنا پڑا کہ صدارتی الیکشن میں فراڈ ہوا ہے۔ 26 اکتوبر کو انہوں نے امریکی ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ میں تسلیم کرتا ہوں الیکشن کے پہلے راولڈ میں فراڈ ہوا ہے تاہم یہ الیکشن اتنا برا بھی نہیں تھا جتنے ان کے مخالفین دعوے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صدارتی الیکشن کا دوسرا راولڈ ضرور ہوگا۔ ان کے اور عبداللہ عبداللہ کے درمیان دوبارہ صدارتی الیکشن ضرور ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو یہ جمہوریت کی بے عزتی ہوگی۔

توہین قرآن یا کہ، کرزئی کے خلاف نعرے: 19 اکتوبر کو صوبہ جلال آباد کے علاقے خواجگان میں امریکی فوجیوں کے ہاتھوں قرآن مجید کے نذر آتش کیے جانے کا انفسوس ناک سانحہ پیش آیا۔ جس پر اگلے روز جلال آباد میں ہزاروں لوگوں نے احتجاجی مظاہرہ کیا اور کابل جلال آباد شاہراہ بند کر دی۔ مظاہرین امریکی جھنڈے کو آگ لگا کر قرآن پاک کے دشمنوں سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے او باما اور کرزئی کے خلاف زبردست نعرے بازی کی۔

امریکا نواز کابینہ کی تشکیل: 19 دسمبر کو حامد کرزئی نے افغان پارلیمنٹ کی 25 رکنی نئی کابینہ کا اعلان کیا جس میں امریکا نواز افراد کو اہم وزارتیں دی گئیں۔ حنیف اتمار کو وزارت داخلہ اور عبدالرحیم وردگ کو وزارت دفاع کا قلمدان سپرد کر دیا گیا۔ معدنی وسائل کی وزارت ابراہیم عادل کو دی گئی جن پر 20 ملین

ڈالر کی بدعنوانی کا الزام عائد تھا۔ کابینہ کے اعلان کے رد عمل میں جنوبی اور مشرقی افغانستان میں قبائلی عمائد کے جرمے منعقد ہوئے جن میں کابینہ کو مسترد کرتے ہوئے صدر حامد کرزئی کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

طالبان کی کارروائیاں: اب ذکر ہو جائے 2009ء میں طالبان کی کارروائیوں کا۔ یہ سال شروع ہوا تو طالبان کی کارروائیاں موسم سرما کی انتہائی شدت میں بھی جاری تھیں۔ برف باری کے دوران بھی ان میں کمی نہ آئی۔ 10 جنوری کو خواست میں ایک جھڑپ کے دوران 12 اتحادی فوجی ہلاک اور ایک ٹینک تباہ ہوا۔ کاپیسہ میں طالبان کے حملے میں 4 فرانسیسی سپاہی مارے گئے۔ 17 جنوری کو کابل کے قریب امریکی ہلیکاپٹر طالبان کے میزائل کا نشانہ بن گیا۔ کنڑ میں راکٹ سے چیپوک امریکی ہیلی کاپٹر مارا گیا۔ ہرات میں بھی ایک ہیلی کاپٹر تباہ کیا گیا جس میں سوار بارہ افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔ فروری کے پہلے عشرے میں طالبان نے جلال آباد کے امریکی بیس کیمپ پر ایک بڑا حملہ کیا جس میں 11 امریکی ہلاک اور تین گاڑیاں تباہ ہو گئیں۔ فروری کے اختتام پر شائع ہونے والے ایک تجزیے میں کہا گیا کہ طالبان کے حملے سال گزشتہ کی یہ نسبت تین گنا تیز نظر آ رہے ہیں، کیونکہ 2008ء کے ابتدائی دو مہینوں میں 9 امریکی ہلاک ہوئے تھے، جبکہ اس سال اتنے وقت میں 28 امریکی مارے جا چکے ہیں۔

مارچ کے آغاز میں ہلمند میں طالبان نے خود کش حملہ کر کے 17 برطانوی فوجیوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ موسم بہار کے معرکے: مارچ میں افغانستان میں عام انتخابات طے تھے۔ طالبان قیادت نے ایک طرف امریکی انتظامیہ کی تبدیلی اور دوسری طرف ملک میں انتخابات سے آنے والی تبدیلیوں کے پیش نظر افغانستان پر کنٹرول کی نئی حکمت عملی ترتیب دی جس کے مطابق 14 صوبوں میں طالبان کے تمام متوازی گورنر اور کمشنر تبدیل کر دیے گئے۔ مارچ کے آخری عشرے میں طالبان کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ کنڑ میں ایک خون ریز جھڑپ کے دوران 31 امریکی ہلاک ہو گئے۔ ہلمند کے علاقے گریٹک میں 22 اتحادی مارے گئے۔

آہ بہار کے تہوار جشن نوروز کے دن افغانستان کے مختلف علاقوں میں امریکی، اتحادی اور کچھ چلی افغان حکومت کے اہم اہداف پر بم دھماکے اور خود کش حملے ہوئے جن میں نیٹو کے 5 فوجیوں سمیت 30 افراد مارے گئے۔ شاہ ولی کوٹ میں سڑک کے کنارے نصب بم پھٹنے سے 4 کینیڈین سپاہی ہلاک ہو گئے۔ نیٹو کمانڈر میک کینن نے طالبان کی ان کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ طالبان حقیقی قوت رکھتے ہیں۔

انہی دنوں جلال آباد میں پولیس چیک پوسٹ پر حملہ ہوا جس میں خود کش حملہ آور نے دھماکا خیز مواد

سے لدی ہوئی کار چیک پوسٹ سے نگرادی، اس کارروائی میں 6 ہلاک مارے گئے۔ مجموعی طور پر مارچ کے آخری عشرے کی کارروائیوں میں امریکا اس کے اتحادیوں اور افغان حکومت کے 81 ہلاک رقمہ اجل بنے۔ موسم بہار میں طالبان کے تابز توڑ حملوں کی وجہ سے ملک میں عام انتخابات نہ ہو سکے اور ان کا وقت موسم گرما تک مؤخر کر دیا گیا۔

طالبان اور امریکی اسلحہ: طالبان ان کارروائیوں میں اب امریکی اسلحہ بھی استعمال کر رہے تھے جس کا انکشاف مئی کے آخری عشرے میں نیویارک ٹائمز نے کیا۔ جریدے نے دعویٰ کیا کہ طالبان امریکا کا اسلحہ امریکا ہی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ اس ماہ پاکستانی ہفت روزہ بکیر نے ایک رپورٹ میں انکشاف کیا ارزگان (ہلمند) میں کچھ طالبان کو گرفتار کیا گیا ہے جن سے امریکی اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ تفتیش سے پتا چلا ہے کہ افغان فوج کے ہلاک ہونے کی وجہ سے امریکی اسلحہ طالبان کو فروخت کر دیتے ہیں۔ تاہم افغان حکومت نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے: ”یہ وہ اسلحہ ہے جو 2008ء میں 40 کنٹینروں میں اسپین بولڈک سے براستہ قندھار، کابل جا رہا تھا۔ طالبان نے اسپین بولڈک میں اس قافلے پر حملہ کر کے 40 کنٹینروں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس اسلحے میں M-16 سے لیزر گنیں تک شامل تھیں۔ جو اسلحہ یا آلات زیادہ پیچیدہ تھے اور طالبان ان کا استعمال نہ سمجھ سکے، وہ انہوں نے ایک فوجی ریاست کو فروخت کر دیے۔“

طالبان نیٹ ورک وسیع: اس موسم گرما میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے عظیم کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی کو حزب اسلامی سے اشتراک عمل کا ہدف سوچ دیا۔ سراج الدین حقانی اور حزب اسلامی کے کمانڈروں میں اس بابت ملاقاتیں ہوئیں جس کے بعد طالبان اور حزب اسلامی میں امریکا اور اتحادیوں کے خلاف مشترکہ حملوں کی ترتیب طے پا گئی۔ 20 مئی کو طالبان نے ایک فوجی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار 15 فوجی ہلاک ہو گئے۔ یکم جون کو وردک میں ریموٹ کنٹرول بم دھماکے سے اتحادیوں کا ٹینک تباہ ہو گیا۔ 14 اتحادی سپاہی بھی اس حملے میں مارے گئے۔ اسی ہفتے 8 جرمن فوجیوں سمیت 32 امریکی و اتحادی سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ اگلے ہفتے خوست میں 12 خودکش حملے ہوئے جن میں درجنوں اتحادی فوجی مارے گئے۔

جون کے آخری عشرے میں امریکی جریدے ”وال اسٹریٹ جرنل“ نے انکشاف کیا کہ طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے اپنے جنگجوؤں کا کنٹرول براہ راست خود سنبھال لیا ہے جبکہ اس سے پہلے مقامی کارروائیوں کا اختیار مقامی کمانڈروں کے پاس تھا۔ جریدے نے دعویٰ کیا کہ ملا محمد عمر نے براہ راست کنٹرول سنبھالنے کے بعد امریکی و اتحادی افواج پر حملے تیز کرنے کا حکم دے دیا ہے اور خوست میں اس ماہ 12 خودکش حملے انہی کے حکم

پر ہوئے ہیں۔ ان دنوں امریکا نے روس سے معاہدے کے بعد وسط ایشیا کے راستے افواج کو روس کی فراہمی کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ طالبان نے جواب میں شمالی افغانستان میں بھی حملوں کی پیش بندی کر لی۔

میک کرشل کی کمان میں خنجر آپریشن: اس دوران امریکی صدر او باما کے دستخط کردہ بل کے مطابق 17 ہزار میں سے دو ہزار تازہ دم امریکی فوجی افغانستان پہنچ چکے تھے۔ او باما نے انتہائی تجربہ کار، ماہر اور عیار اعلیٰ فوجی آفیسر میک کرشل کو افغانستان میں اپنی افواج کی کمان سونپ دی تھی۔ میک کرشل کو خصوصی کارروائیوں (ایکٹل آپریشن) کا جادوگر اور قوی ہیر و سمجھا جاتا ہے۔ عراق میں نامور مجاہد کماٹز ابو مصعب الزرقاوی کو شہید کرنے اور صدر صدام حسین کو گرفتار کرنے والے گروپ کا انچارج بھی شخص تھا۔ میک کرشل نے افغانستان آتے ہی افواج کو از سر نو مرتب کیا اور پہلی بار ایک نئے انداز سے طالبان کے خلاف ایک بہت بڑا آپریشن شروع کیا جسے ”خنجر آپریشن“ کا نام دیا گیا۔ اس آپریشن کے لیے نیو کے 10 ہزار سپاہی چنے گئے تھے۔ پہلے مرحلے میں 4 ہزار امریکی میرٹز، دو ہزار افغان فوجی اور برطانوی رائل فورسز (شہابی فوج) کے 600 منتخب سپاہی حصہ لے رہے تھے۔ ادھر طالبان نے حملہ آوروں کو بھرپور جواب دینے کی تیاری کر لی تھی۔

جون میں شروع ہونے والا یہ آپریشن جولائی کے آغاز تک جاری رہا۔ امریکی و اتحادی افواج مشرقی و جنوبی افغانستان میں طالبان کو تلاش کرتی رہیں۔ بمصرین کے مطابق ویتنام جنگ کے بعد امریکا کا کسی جگہ یہ سب سے بڑا آپریشن تھا۔ اس آپریشن میں ہلند، زابل اور پکتیکا میدان کارزار بنے رہے۔ طالبان نے روایتی حوصلہ مندی اور جنگی مہارت کے ساتھ امریکی فوج کا سامنا کیا اور اسے ناکوں چنے چبوا دیے۔ وہ ہفتوں کی خوں ریز جھڑپوں میں 115 امریکی و اتحادی سپاہی مارے گئے۔ طالبان نے کانوائے پر حملہ کر کے متعدد گاڑیاں تباہ کر دیں۔ زابل میں ہیلی کاپٹر مارا گیا۔ پکتیکا میں طالبان نے خود پیش قدمی کر کے امریکی اڈے پر بڑا حملہ کیا جس میں 89 امریکی و اتحادی ہلاک ہو گئے۔ برطانوی شہابی افواج کا طالبان نے شاہانہ انداز میں خاطر خواہ استقبال کیا۔ ہلند میں 12 برطانوی فوجی ان کا نشانہ بن گئے۔ برطانوی فوج کا لیفٹیننٹ کرنل بھی مارا گیا۔ عالمی میڈیا کا کہنا تھا کہ 2001ء سے اب تک 184 برطانوی فوجی افغانستان میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ (صحیح اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ ہیں)

انہی دنوں امریکی فوجیوں میں سوائے ملوک کی بیماری پھیل گئی اور ایک ہفتے میں 14 سپاہی شدید بیمار ہو گئے۔ قضائیہ بھی طالبان کی زد میں: 18 جولائی کو طالبان نے ایک عجیب کارنامہ انجام دیا۔ وہ زیادہ تر ہیلی کاپٹر کو نشانہ بناتے تھے، جبکہ جیٹ طیارے اپنی بلند پروازی کے سبب ان کی دسترس سے باہر تھے،

مگر اس دن قندھار کے فوجی اڈے سے برطانیہ کا ایک جیٹ طیارہ معمول کے گشت کے لیے اڑنے لگا تو طالبان اس کی تاک میں تھے۔ اس سے پہلے کہ طیارہ زیادہ بلندی پر جاتا، طالبان نے اسے طیارہ شکن گولے سے مار گرایا۔ اسی ہفتے مختلف مقامات سے مزید دو ہیلی کاپٹروں کے تباہ ہونے کی خبر بھی ملی۔

آپریشن خنجر کی ناکامی: طالبان کے ان خوفناک حملوں کے بعد امریکا اور برطانیہ کو آپریشن خنجر بند کرنا پڑا۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ میٹس نے ٹھکے ہارے لہجے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ امریکی فوج اور امریکی عوام افغان جنگ سے تھک چکے ہیں۔ برطانوی فوج کی ہائی کمان نے ہلمند میں مار کھانے والی افواج کو چھڈ ڈنیوں میں واپس بلا کر یہ مضحکہ خیز بیان جاری کیا کہ آپریشن مکمل ہو گیا ہے، اب ہم تعمیر نو پر توجہ دیں گے۔ برطانوی نمائندے نے کہا: ”ہلمند میں مزید کارروائی اتنی اہم نہیں رہی بلکہ یہاں سے زیادہ خطرہ پاکستان میں ہے۔“

اس بیان کے پیچھے یہ اشارہ مضمر تھا کہ طالبان قیادت پاکستان میں پناہ گزین ہے لہذا وہاں حملے کرنا زیادہ اہم ہے۔ اس کے جواب میں طالبان کمانڈر ملا عبدالغنی برادر کا بیان میڈیا پر آیا جس میں کہا گیا ہے کہ ملا محمد عمر سمیت تمام طالبان قیادت افغانستان میں ہے اور ہماری کارروائیاں اپنے ملک تک ہی محدود ہیں۔ ملا عبدالغنی اس تاثر کی تردید کرنا چاہتے تھے کہ افغانستان کے طالبان پاکستان میں بم دھماکوں اور خودکش حملوں میں ملوث یا معاون ہیں۔

ستمبر کے پہلے ہفتے میں طالبان نے مختلف کارروائیوں میں 38 اتحادی فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔ ننگر ہار میں دو اور کاپیسا میں تین ٹینک بھی تباہ کر دیے۔ کٹر میں ایک ہیلی کاپٹر مار گرایا۔ قندھار میں بارودی سرنگ کے دھماکے سے 6 کینیڈین فوجی ہلاک ہو گئے۔

قتدوز میں 98 شہری شہید: اس ہفتے طالبان کو ایک نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ قندوز میں چند طالبان نے اتحادیوں کے ایک آئل ٹینکر کو اغوا کر لیا۔ وہ اسے قندوز کی بستی علی آباد لے آئے اور اس سے تیل نکالنے لگے۔ علاقے کے لوگ بھی یہ تماشا دیکھنے جمع ہو گئے۔ اچانک فضا میں امریکی طیارے نمودار ہوئے جو جدید آلات کی مدد سے آئل ٹینکر کا کھوج لگا چکے تھے۔ ان طیاروں نے آتے ہی اندھا دھند بمباری کی جس سے موقع پر جمع ہونے والے 98 عام شہری اور کئی طالبان شہید ہو گئے۔

ملا محمد عمر کا اہم بیان: 20 ستمبر کو طالبان سربراہ ملا محمد عمر نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی کے بعد امریکا کی طرف سے صلیبی جنگ کے اعلان کے 8 سال مکمل ہونے پر ایک اہم بیان جاری کیا جس میں انہوں نے اعلان کیا: ”غیر ملکی افواج کے انخلا تک جنگ جاری رہے گی۔“ انہوں نے کہا: ”ہم نے برطانوی

راج کے خلاف 80 سال جنگ لڑ کر فتح حاصل کی تھی۔“

نورستان میں اتحادیوں کی بدترین پسیائی: اکتوبر کے آغاز میں اتحادی افواج اور افغان فوج نے ہلمند اور نورستان میں طالبان کے خلاف ایک اور بڑا آپریشن شروع کیا۔ 7 اکتوبر کے قومی اخبارات کی سرخیوں کے مطابق اس آپریشن میں اتحادیوں کی جانب سے بڑے پیمانے پر طالبان کی ہلاکتوں کا دعویٰ کیا جا رہا تھا، جبکہ افغان وزارت دفاع نے 10 افغان فوجیوں کی ہلاکت کی تصدیق کی تھی۔ طالبان نے اس آپریشن کا جواب نورستان میں دیا اور وہاں قائم کی گئی امریکی افواج کی 8 چیک پوسٹوں پر ایک بارگی طوفانی حملہ کیا۔ اس کارروائی میں 300 سے زائد طالبان حصہ لے رہے تھے۔ دن کے وقت شروع ہونے والی یہ لڑائی رات 11 بجے تک جاری رہی۔ جس میں 40 امریکی اور 35 افغان فوجی مارے گئے۔ 90 افغان فوجی حملے کے بعد لاپتہ ہو گئے جبکہ امریکی فوج علاقے سے فرار ہو گئی۔ طالبان نے ان کی ایک گاڑی اور اسلحے کے بڑے ذخیرے پر قبضہ کر لیا۔ بمصرین اسے طالبان کی اس سال کی سب سے بڑی کارروائی قرار دے رہے ہیں۔

بھارتی سفارت خانے پر حملہ: 8 اکتوبر کو طالبان نے کابل میں بھارتی سفارت خانے کے قریب خودکش حملہ کر کے امریکا کے اتحادیوں کو ایک اور اعصاب شکن پیغام دیا۔ حملہ آور کار میں سوار تھا۔ اس نے صبح 8 بج کر 40 منٹ پر بھارتی سفارت خانے کے احاطے میں کارپارک کی اور دھماکا کر دیا جس سے تین بھارتی البکاروں سمیت 80 افراد زخمی اور 17 ہلاک ہو گئے۔ اقوام متحدہ سمیت کئی اداروں کی گاڑیاں اور قرب و جوار کی عمارتیں تباہ ہو گئیں۔

طالبان اور القاعدہ کی تکنیک: 11 اکتوبر کو طالبان نے قندوز میں نیٹو کے بغیر پائلٹ جاسوسی طیارے کو کامیابی سے نشانہ بنایا۔ اس قسم کی کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ دنوں بعد پیناگون نے اعتراف کیا کہ افغانستان میں مزاحمت کارڈرون طیاروں کی لائیو ویڈیو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ویڈیو فوٹیج حاصل کرنے کے لیے انٹرنیٹ سے ویڈیو اسکا کی گریب جیسا کمپیوٹر پروگرام خرید لیا ہے۔ پیناگون کے مطابق یہ ہیکنگ اس لیے ممکن ہوئی ہے کہ ڈرون طیاروں کا مواصلاتی لنک غیر محفوظ تھا جسے آپ گریڈ کر کے اب محفوظ بنایا جا رہا ہے۔

یاد رہے مذکورہ سوئٹ ویز انٹرنیٹ سے فقط 25 ڈالر کے عوض خریدا جاسکتا ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے ارکان بڑی بڑی مہمات کو اس طرح نہایت ارزاں ٹیکنالوجی کے ذریعے سر کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ امریکا کے خلاف کارروائیوں کے ابتدائی سالوں میں ساٹھ ستر روپے کے خرچ سے سادہ

ریموٹ کنٹرول سسٹم بنایا جاتا تھا، جس میں چھ سات سو روپے کا بارود لگا کر ایک بارودی سرنگ تیار کر لی جاتی تھی۔ چند سو روپے کی ایسی بارودی سرنگوں کے ذریعے طالبان امریکی و اتحادی افواج کی ان جدید ترین گاڑیوں کو تباہ کرتے رہے جن میں سے ہر گاڑی اپنے ساز و سامان اور اسلحہ و آلات سمیت تین کروڑ روپے کی لاگت تک پہنچ جاتی تھی جبکہ جانی نقصان اس کے علاوہ تھا۔

2005ء میں امریکا نے طالبان کے اس سادہ ریموٹ کا توڑ تیار کر لیا۔ امریکی و اتحادی افواج کے گزرنے سے قبل تیز الیکٹرونک لہریں چھوڑی جاتیں جو راستے میں نصب بارودی سرنگ کو قبل از وقت پھاڑ کر تفلے کو محفوظ کر دیتیں۔ طالبان کے انجینئروں نے دن رات کی دماغ سوزی اور تجربات کے بعد اس کا حل بھی نکال لیا اور سادہ ریموٹ کو جدت دے کر اسے الیکٹرونک لہروں سے محفوظ بنادیا۔ اس طرح اتحادیوں کی گاڑیاں ایک بار پھر ریموٹ کے ذریعے تباہ کی جانے لگیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس جدید تکنیک میں ریموٹ پر صرف پندرہ بیس روپے کا مزید خرچ آیا تھا۔

2008ء میں امریکا نے نئے آلات کے ذریعے طالبان کے اس نئے ریموٹ سسٹم کو تباہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی جس کے بعد طالبان ریموٹ بم حملوں کو چھوڑ کر اپنے جانی نقصان میں اضافے کا خطرہ برداشت کرتے ہوئے براہ راست حملے کر کے قاتلوں کو تباہ کرنے لگے۔

ایک سال بعد 2009ء میں طالبان کے انجینئروں نے نئے ریموٹ سسٹم تیار کر لیے جو دوبارہ ریموٹ حملوں میں کامیابی سے استعمال ہونے لگے۔ 2009ء کے اخیر میں مغربی میڈیا کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ طالبان اب سڑک کے کنارے بم حملوں کے لیے ایسے بم استعمال کر سکتے ہیں جنہیں لکڑی کے بند ڈبوں میں نصب کیا گیا ہوتا ہے اس لیے انہیں جدید ترین لہروں کے لیے ذریعے جام کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ بم اور ریموٹ سسٹم کو تلاش کرنے والے جدید ترین امریکی آلات ان کا سراغ نہیں لگا پاتے۔

مزید کارروائیاں: 16 اور 17 اکتوبر کو فرامہ اور دیگر صوبوں میں 4 امریکیوں سمیت 6 اتحادی فوجی ہلاک ہوئے۔ 18 اکتوبر کو قندھار میں ایک ہیلی کاپٹر تباہ کیا گیا۔ اس روز کاٹل، قندھار شاہراہ پر غزنی کے قریب ایک بڑے حملے میں 15 امریکی ہلاک ہوئے جبکہ 20 گاڑیاں اور ٹینک تباہ کیے گئے۔ 26 اکتوبر کو طالبان نے بادغیس میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار 25 امریکی مارے گئے۔ اسی دن جنوبی افغانستان میں مزید دو ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے جسے طالبان نے اپنی کارروائی قرار دیا جبکہ امریکی و اتحادی حکام کے مطابق یہ دو ہیلی کاپٹر آپس میں ٹکرا کر تباہ ہوئے تھے۔ 28 اکتوبر کو تین طالبان جانبازوں نے کابل میں ایک گیسٹ ہاؤس کو دودھ گھسنے تک اپنے قبضے میں لیے رکھا اور اس دوران

6 غیر ملکی عہدے داروں کو قتل کر دیا۔ جو ابلی حملے میں تینوں طالبان بھی نشانہ بن گئے۔

19 نومبر کو افغانستان کے مختلف علاقوں میں جہزپوں اور بم دھماکوں میں 4 غیر ملکی فوجی ہلاک ہوئے جن کا تعلق برطانیہ، ڈنمارک اور امریکا سے تھا۔ اگلے ہفتے جنوبی افغانستان میں مختلف واقعات میں 5 امریکی فوجی مارے گئے۔ ان میں سے تین فوجی ایک بم دھماکے میں اور دو طالبان کی فائرنگ کا نشانہ بن کر ہلاک ہوئے۔ 2 دسمبر کو طالبان ترجمان نے امریکی صدر کی جانب سے مزید 30 ہزار فوجیوں کی تعیناتی پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا:

”اس سے طالبان کا عزم مزید پختہ ہوگا اور مجاہدین کی تعداد میں بھی اور اضافہ ہوگا۔“

ترجمان نے کہا: ”ادباً امریکی فوجیوں کی لاشیں اٹھانے کے لیے تیار رہیں۔“

دسمبر کے وسط میں طالبان نے ایک گرفتار امریکی فوجی کے بدلے اپنے 10 کمانڈر رہا کرالیے۔ اس امریکی فوجی کو 5 ماہ قبل طالبان نے اس وقت اغوا کیا تھا جب وہ نشے میں دھت حالت میں اپنے کیمپ سے باہر نکل رہا تھا۔

23 دسمبر کو حزب اسلامی نے کابیسہ میں 5 اور طالبان نے وردگ میں 18 اتحادی فوجیوں کی ہلاکت کا دعویٰ کیا۔ 28 دسمبر کو طالبان کی مختلف کارروائیوں میں 12 اتحادی اور 18 طالبان مارے گئے۔

نیٹو کے ایک اعلیٰ اہلکار نے آفیسر نے اپنا نام خفیہ رکھتے ہوئے صحافیوں کو بتایا کہ افغانستان کے 34 میں سے 33 صوبوں پر طالبان کا کنٹرول ہے اور انہوں نے متوازی حکومت قائم کر کے باقاعدہ گورنر بھی مقرر کیے ہوئے ہیں۔ آفیسر کے مطابق ملا محمد عمر نے افغان حکومت کے سقوط کے امکان کے پیش نظر کابینہ بھی تشکیل دے دی ہے۔ آفیسر نے مزید کہا کہ طالبان کو اپنے اخراجات کے لیے سالانہ 10 سے 20 کروڑ ڈالر کی ضرورت ہوتی ہے جو خلیات، ٹیکس اور دیگر ذرائع سے پوری کی جاتی ہے۔ 20 دسمبر کو طالبان نے مختلف جہزپوں میں 7 اتحادی فوجیوں کو ہلاک کیا۔ نگرہار میں اتحادیوں کا ایک ٹینک تباہ ہوا جبکہ حزب اسلامی سے جہزپ میں 4 اتحادی فوجیوں کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔

سی آئی اے کے افسران کا شمار: 2009ء کا اختتام امریکی استعمار کے چہرے پر ایک زنائے دار طمانچہ رسید کر گیا۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کے افسران ان دنوں اس خوش فہمی میں مبتلا تھے وہ ایک تاریخی کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔ ان کا ایک ایجنٹ افغانستان میں روپوش القاعدہ کی قیادت کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ ایجنٹ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر اور اردن کا شہری تھا۔ اس کا نسلی تعلق فلسطین سے تھا۔ خلیل البلادی نامی اس ایجنٹ کو ایک سال قبل اردن کی خفیہ سروس نے القاعدہ سے

ہمدردی کے شیعے میں گرفتار کیا تھا۔ دورانِ حراست اُردن کی خفیہ پولیس نے اسے اپنا ایجنٹ بنالیا تھا اور مکمل اعتماد کرنے کے بعد اسے سی آئی اے کی جانب سے افغانستان بھیج دیا گیا تھا۔

خلیل البلا دی کا مشن القاعدہ کے نائب سربراہ اور شیخ اسامہ کے دست راست ڈاکٹر ایمن الظواہری کا کھوج لگانا تھا۔ خلیل البلا دی سال بھر کی محنت شاقہ کے بعد اپنے ہدف کو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دسمبر کے آخری ہفتے کے دوران اپنے رابطہ کاروں کو اطلاع دی کہ اس نے اپنا مشن مکمل کر لیا ہے۔ چنانچہ اسے خوست میں واقع سی آئی اے کے اڈے میں طلب کر لیا گیا۔ یہ اڈہ اس لحاظ سے بے حد اہم تھا کہ یہاں سے سرحد پار ڈرون حملوں کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اسے سی آئی اے کے آپریشنسٹن کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ بدھ 30 دسمبر کی شام کو خلیل البلا دی خوست پہنچ گیا۔ سی آئی اے کے افسران القاعدہ کی روپوش قیادت خصوصاً ایمن الظواہری کے بارے میں مصدقہ اطلاعات حاصل کرنے کے لیے بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے، مگر خلیل البلا دی انہیں معلومات فراہم کرنے نہیں، موت کا جام پلانے جا رہا تھا۔ وہ خود کش حملے کی تیاری کر کے آیا تھا اور بارود بھری جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔

سی آئی اے سینٹر میں اس کے داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ہولناک دھماکا ہوا اور پورا علاقہ لرز گیا۔ سی آئی اے سینٹر سے اٹھنے والے شعلے دور دور تک دکھائی دیے۔ اس خود کش حملے میں افغانستان میں سرگرم سی آئی اے کی ٹیم کی سربراہ اپنے 7 افسران اور ایجنٹوں سمیت ماری گئی جبکہ 4 کینیڈین فوجی بھی ہلاک ہو گئے۔ اس واقعے سے امریکی ایوانوں میں ماتم برپا ہو گیا۔ میڈیا کے مطابق گزشتہ 27 برسوں میں یہ امریکی خفیہ ایجنٹوں پر ہونے والا سب سے بڑا حملہ تھا۔ واشنگٹن پوسٹ نے اس کا رد وائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ حملہ آوروں ڈبل ایجنٹ تھا۔

چند دنوں بعد خلیل البلا دی کی حملے سے قتل ریکارڈ کرائی گئی ویڈیو منظر عام پر آگئی جس میں اس نے کہا: ”میرا خود کش حملہ مسلمانوں کے دشمنوں امریکی سی آئی اے اور اُردنی انٹیلی جنس کے لیے پیغام ہے کہ کسی مجاہد کو خیریدہ نہیں جاسکتا۔ اُردن اور امریکا کے خفیہ اداروں نے مجاہدین کی جاسوسی کے لیے مجھے کئی ملین ڈالر پیش کیے مگر میں نے مجاہدین کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ میرا حملہ امریکی ڈرون ٹیم سے بدلہ لینے کی کارروائیوں کی کڑی کا پہلا حصہ ہے اور یہ ڈاکٹر عافیہ صدیقی پر مظالم کا بھی بدلہ ہے۔“

پنیا گون کی رپورٹ کے مطابق مجموعی طور پر اس سال طالبان نے امریکی فوج پر 10200 حملے کیے۔ مذاکرات کی بانسری: ایک طرف امریکا جنگ میں پوری قوت جھونکتا چلا جا رہا تھا اور بے قصور انسانوں پر ہر گداز مظالم ڈھا رہا تھا تو دوسری طرف مذاکرات کی بانسری بھی بجا رہا تھا۔ مارچ کے پہلے عشرے

میں امریکی صدر اوباما نے نیویارک ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ معتدل طالبان سے مذاکرات کا امکان موجود ہے۔ 30 ہزار مزید افواج کی تعیناتی کی حتیٰ منظوری دینے کے بعد 22 مارچ کو صدر اوباما نے ایک بیان میں کہا کہ افغانستان کے مسئلے کا حل صرف فوجی کارروائی سے ممکن نہیں۔ ”معتدل طالبان“ پر مذاکرات کا جال ڈالنے کے لیے امریکا سعودی عرب اور پاکستان سے کام لیتا چاہتا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کوشش جنوری 2009ء کے وسط میں ہوئی جب سعودی انٹیلی جنس چیف شہزادہ مقرن کاہل پہنچے اور صدارتی محل میں افغان صدر سابق مجاہد لیڈروں اور وزراء سے ملاقات کی جس میں طالبان اور حزب اسلامی سے مذاکرات کے امکانات اور طریقہ کار پر بحث کی گئی۔

مئی میں امریکا نے یہی مہم زیادہ پُرکاری کے ساتھ شروع کی۔ اس بار سعودی عرب کو ہدف دیا گیا کہ وہ طالبان کو مذاکرات پر آمادہ کرے، جبکہ افغان صدر حامد کرزئی کے علاوہ ترکی اور ایران کو حزب اسلامی، پروفیسر سیاف اور دیگر سابق جہادیوں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کا کام سونپا گیا۔ اس طرح اگر طالبان آمادہ مذاکرات نہ ہوتے تب بھی امکان تھا کہ حزب اسلامی کو ان سے الگ کرنے میں کامیابی ہو جائے گی۔ طالبان جھانے میں نہ آئے تاہم یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ طالبان نے مذاکرات میں دلچسپی لی نہ حزب اسلامی اس جھانے میں آئی۔ ملا عبدالسلام ضعیف نے پریس کو بتایا کہ ملا محمد عمر سے صلح کے بارے میں براہ راست ایسے کوئی مذاکرات نہیں ہو سکے۔ اس سے قبل اپریل میں سابق طالبان راہنما مولوی وکیل احمد متوکل نے اپنے بیان میں امکان ظاہر کیا تھا کہ اگر غیر ملکی طاقتیں افغانستان چھوڑ دیں تو طالبان مذاکرات کے لیے تیار ہوں گے۔

اگست کے آغاز میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نمائندہ برائے افغانستان کائی ریڈر نے اپنے بیان میں امریکی حکومت کو متوجہ کرتے ہوئے کہا:

”افغانستان میں قیام امن کے لیے طالبان قیادت سے مذاکرات کرنا ہوں گے۔ یہ مذاکرات چھوٹے مرتبے کے طالبان سے نہیں، بلکہ اعلیٰ قیادت سے کیے جائیں۔ اس کے بغیر مذاکرات بے نتیجہ ہوں گے۔ مذاکرات اگر جلدی طور پر کیے گئے تو نتائج بھی جلدی نکلیں گے۔“

طالبان سربراہ ملا محمد عمر کسی بھی موقع پر مذاکرات کے حق میں ہلکے اختیار کرتے نظر نہ آئے۔ ستمبر کےواخر میں امریکا کی صلیبی جنگ کے اعلان کو آٹھ سال پورے ہونے پر انہوں نے مذاکرات کے امکانات کو ایک بار پھر مسترد کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ غیر ملکی افواج کے انخلا تک جنگ جاری رہے گی۔

نومبر میں امریکا نے سی آئی اے کے توسط سے طالبان کے نمائندے ملا برادر سے ملاقات کی اور

مذاکرات کا ڈول ڈالا، مگر یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ملائحد عمر نے مذاکرات کو ایک بہانہ قرار دے کر ٹھکرا دیا۔ 130 اکتوبر، وائٹ ہاؤس میں اہم اجلاس: معروف امریکن صحافی باب وڈورڈ (BOBWOOD WARD) اپنی تازہ تصنیف ”Obama's wars“ میں ایک دلچسپ مجلس مشاورت کا ذکر کرتا ہے، ملاحظہ ہو:

”130 اکتوبر کو او بامانے وائٹ ہاؤس میں تمام چیف اسٹاف کو طلب کیا، افغانستان میں موجود جنرل پیٹریاس، جنرل مانگ مولن اور جنرل میک کرٹل کو جان بوجھ کر اس اجلاس میں شریک نہ کیا گیا۔ او بامانے کہا: افغانستان کی جنگ پورے امریکا کی جنگ ہے، مجھے اس کے حل کا ایک ہی طریقہ گھما پھرا کر تین طرح پیش کیا جا رہا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھے الگ الگ تین حل بتائے جائیں جن میں سے میں ایک کو چن سکوں۔

میرین کمانڈر جیمز کوائے نے کہا: میرین فلاحی کارکن نہیں ہوتے کہ آپ ان سے تعمیر نو کا کام لیں، ان کا کام قتل کرنا ہے۔ ان کو اسی کی تربیت دی جاتی ہے۔ خدا دشمن کی مدد کر رہا ہے۔ ہم عمر بھر بھی افغانستان میں لڑتے رہیں تو کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا۔ واحد راستہ یہ ہے کہ افغان فوج کی تربیت کر کے ملک ان کے حوالے کریں اور عراق کی طرح یہاں سے بھی واپسی کا فیصلہ کریں۔ عراق کے جنگ کے آزمودہ کار جنرل کیسی نے کہا: طالبان کو شکست دینا طویل وقت چاہتا ہے مگر ان کو منتشر کرنے میں کم وقت لگے گا۔

سب نے خوش ہو کر کہا: ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ طالبان اتنے منتشر ہو جائیں کہ دوبارہ حکومت نہ بنا سکیں۔

کیسی نے کہا: میک کرٹل طالبان کو شکست دینے کی بات کرتے ہیں جو ناممکن ہے۔ ایسا ہوتا تو اسرائیل غزہ میں حماس کو شکست دے چکا ہوتا۔ مگر حماس کی طرح طالبان کو بھی عوامی مقبولیت حاصل ہے۔ اس لیے طالبان کو کمزور کرنے کے ساتھ منتشر کیا جائے اور پھر معاملات افغان فورسز کے سپرد کر دیے جائیں۔

اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا اور اجلاس برخاست ہو گیا۔“

2009: پاکستان کے لیے خطرات: او باما کی پالیسی کا ایک بڑا ہدف یہ تھا کہ پاکستان کے خلاف جاری خفیہ جنگ کا دائرہ وسیع کر دیا جائے، افغان جنگ کو تدریجاً پاکستان کی طرف منتقل کر دیا جائے، قبائل اور پاکستانی افواج کو باہم لڑا دیا جائے اور پاکستان کو جنگ زدہ خطہ ثابت کر کے اس کے ایشی

ہتھیاروں کو اپنی نگرانی میں لینے کا دیرینہ منصوبہ جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔ اس ہدف کے تحت فردری کے اواخر میں ادبامانے پاکستان کے قبائلی علاقوں پر ڈرون حملے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ ادھری آئی اے، راور کئی ممالک کی خفیہ ایجنسیاں پاک افغان سرحدی علاقوں میں پوری طرح متحرک ہو گئیں۔ یہ انکشاف فردری کے آخری عشرے میں پاکستانی فوج کے ایک ذمہ دار افسر نے کیا۔

سرحدات پاکستان پر ڈرون حملوں میں اضافہ: ڈرون حملوں کے بڑھ جانے سے جنوبی وزیرستان سے کرم ایجنسی اور باجوڑ تک تمام سرحدی علاقہ امریکی حملوں کی آماجگاہ بن گیا۔ مارچ کے آغاز میں جنوبی وزیرستان میں ڈرون حملے سے 12 افراد شہید ہو گئے۔ ساتھ ہی امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے بیان دیا کہ قبائلی علاقے امریکا سمیت پاکستان کے لیے خطرہ بن چکے ہیں، یہاں القاعدہ، طالبان، جلال الدین خٹانی اور حکمت یار نے ٹھکانے بنائے ہوئے ہیں اور یہ مل کر یہاں سے مشترکہ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے نے بھی اعلان کیا کہ القاعدہ کے خلاف پاکستان کی حدود میں حملے جاری رہیں گے۔ مارچ کے پہلے عشرے میں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے بھی دعویٰ کیا کہ افغانستان میں بیرونی خطرات کا منبع پاکستان میں ہے۔ مارچ کے آخری عشرے میں امریکی سفیر برائے پاکستان و افغانستان رچرڈ ہالبروک نے اپنے بیان میں کوئٹہ کو طالبان قیادت کا ہیڈ کوارٹر قرار دے دیا۔ مارچ کے اواخر میں شمالی و جنوبی وزیرستان پر مزید ڈرون حملے ہوئے، 24 گھنٹوں میں دوبارہ میزائل بھی پھینکے گئے جن سے 12 افراد شہید ہو گئے۔ اپریل کے پہلے عشرے میں شمالی وزیرستان کے علاقے اورکزئی ایجنسی میں شادی کی تقریب پر ڈرون حملہ ہوا جس سے بچوں اور عورتوں سمیت 25 افراد جاں بحق ہو گئے ہیں۔ ڈرون حملوں کے ساتھ اس قسم کے بیانات پر جمعیت علمائے اسلام پاکستان کے سربراہ مولانا فضل الرحمن نے اپریل کے آغاز میں نہایت برحیل تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ امریکا پاکستان میں داخل ہونے کے لیے مختلف حیلے بہانے تلاش کر رہا ہے۔

نظام عدل ریگولیشن: اپریل میں حکومت پاکستان نے سوات میں حالات کو سنبھالنے کے لیے بظاہر ایک اہم پیش رفت کی اور مولانا صوفی محمد کوٹا لٹ بنا کر نظام عدل ریگولیشن کی منظوری دے دی۔ صدر آصف زرداری نے معاہدے پر دستخط بھی کر دیے۔ پورے ملک میں اس معاہدے پر خوشیاں منائی گئیں۔ پاکستانی طالبان کے سربراہ مولانا فضل اللہ اور ان کے نائب حاجی مسلم خان نے حکومت کو یقین دلایا کہ اب طالبان ہتھیار رکھ دیں گے مگر معاہدے پر اس انداز میں عمل نہ ہو سکا اور چند دنوں بعد فوج اور پاکستانی طالبان میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ حکومت پاکستان کا کہنا تھا کہ طالبان غیر مسلح نہیں ہوئے

تھے بلکہ ان کے بعض گروپوں نے بونیر پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ ہی مارگلہ عبور کر کے اسلام آباد تک ان کی رسائی کا خدشہ تھا۔

بہر کیف پاکستانی افواج نے ممی کے آغاز میں سوات کو خالی کرا کے وہاں بہت بڑا آپریشن شروع کر دیا۔ اس سانحے کے نتیجے میں سینکڑوں افراد جاں بحق، ہزاروں زخمی اور 35 لاکھ بے گھر ہو گئے اور پاکستان ایک زبردست بحران کے دور میں داخل ہو گیا۔ فوج اور قبائلی جنگجو سخت ترین حریف بن کر آمنے سامنے آ گئے اور پورے ملک میں بم دھماکوں اور خودکش حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

امریکی اتحادی بننے کا انعام! امریکی محکمہ خارجہ نے انہی دنوں اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ 2007ء اور 2008ء میں پوری دنیا میں دہشت گردی کے واقعات میں 18 فیصد کمی ہوئی جبکہ پاکستان میں دہشت گردی 200 فیصد تک بڑھ گئی ہے۔ یہ پاکستان کو افغانستان کی جنگ میں امریکا کا اتحادی بننے کا انعام مل رہا تھا۔ اس کے باوجود اباما کا پاکستان میں جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ مغربی میڈیا کی ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ صدر اباما پاکستان میں حملوں کے لیے اپنی افواج کو ویسے ہی وسیع اختیارات دینا چاہتے ہیں، جیسا کہ افغانستان میں برسرِ پیکار امریکی فوجوں کو حاصل ہیں۔ جون کے آخر میں جنوبی وزیرستان پر ایک اور بڑا ڈرون حملہ ہوا جس میں 100 افراد شہید ہو گئے۔ ہنگو میں مدرسے پر ڈرون حملہ ہوا جس میں نامور عالم دین اور محدثِ زمان حضرت مولانا محمد امین اور کرنی شہید ہو گئے اور نادر و نایاب کتب پر مشتمل ان کی انمول لائبریری بھی تودہ خاک بن گئی۔

جلال آباد کا ڈرون ایئیرٹیس: اگست کے وسط میں سی آئی اے نے پاک افغان سرحد پر القاعدہ کے مبینہ ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کے لیے جلال آباد میں نیا ڈرون ایئرٹیس تیار کر لیا۔ اس سے پہلے بلوچستان کے تلمی ایئرٹیس کو استعمال کر کے وزیرستان پر ڈرون حملے کیے جا رہے تھے۔ اب جلال آباد کے اس نئے ڈرون ایئرٹیس سے خواست، پکتیا اور پکتیکا میں القاعدہ، طالبان اور مولانا جلال الدین حقانی کے مجاہدین کے ٹھکانوں پر بھی ڈرون حملوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

بلیک وائر کی پاکستان آمد: ادھر پاکستان کو پوری طرح اپنے ٹکٹے میں لینے کے لیے امریکی غنڈوں کی بدنام زمانہ فورس ”بلیک وائر“ پاکستان پہنچ چکی تھی۔ اگست میں میڈیا پر چرچا ہوا کہ بلیک وائر کے ارکان اسلام آباد میں 200 مکانات کرائے پر لے کر رہائش پذیر ہیں جس سے پورے ملک میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ امریکا نے اسلام آباد میں 56/1 ایکڑ پر اپنے سفارت خانے کی نئی قلعہ نما عمارت تعمیر کرنا شروع کر دی۔

جنوبی وزیرستان آپریشن: پاکستانی افواج نے جولائی میں سوات آپریشن مکمل کر لیا تھا جس کے بعد امریکی دباؤ پر اگست میں جنوبی وزیرستان میں بیت اللہ محمود کے خلاف بڑی کارروائی کی تیاری شروع کر دی گئی۔ اگست کے اواخر میں بیت اللہ محمود کے ڈرون حملوں کا نشانہ بننے کی افواہ پھیلی جو بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ حکومت پاکستان نے اسے دہشت گردی کے خلاف اپنی بڑی کامیابی قرار دیا۔ تاہم امریکا کے مطالبات اس سے کہیں آگے کے تھے۔

کونسل پر امریکا کی نظر: ستمبر کے اواخر میں امریکا نے کھل کر یہ کہہ دیا کہ طالبان قیادت کو مسئلہ میں موجود ہے اس لیے وہ کسی بھی وقت اپنے کمانڈرز کے ذریعے کونسل پر حملہ کر سکتا ہے۔ برطانوی جریدے ”سٹدے ٹائمز“ نے امریکی حکام کے حوالے سے ایک انٹیلی جنس رپورٹ میں الزام عائد کیا کہ آئی ایس آئی ملاحصر اور طالبان قیادت کو محفوظ ٹھکانہ فراہم کیے ہوئے ہے۔ یکم اکتوبر کو پاکستان میں امریکا کے ڈپٹی چیف آف مشن ”جیرالڈ فیئر اسٹین“ نے دعویٰ کیا کہ ملاحصر کونسل سے طالبان کی قیادت کر رہے ہیں۔

کیری لوگر مل: اکتوبر کے آغاز میں پاکستان کو مستقل طور پر امریکی شکنجے میں لینے کے لیے ”کیری لوگر مل“ سامنے آیا جسے پاکستانی عوام نے بیک آواز مسترد کر دیا۔ پارلیمنٹ میں بحث کے دوران بھی اسے ملکی خود مختاری کا سودا کہہ کر شدید ترین تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم حکمران پارٹی کے لیے مل کی شرائط کے بدلے سالانہ 5.1 ارب ڈالر کی امداد بڑی پُرکشش تھی چنانچہ عوام اور عوامی نمائندوں سے بالا بالا مل میں پیش کردہ شرائط کے مطابق معاہدہ کر لینے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ مل دراصل پاکستان کو بغیر لڑے پوری طرح فتح کرنے کا معاہدہ تھا۔ امریکا کی توجہ اب اس بات پر مرکوز تھی کہ افغانستان سے پہلے پاکستان کو پوری طرح قابو میں کیا جائے، یہاں کے ایٹمی ہتھیاروں کو بے ضرور بنایا جائے، یہاں کے دینی مراکز کو حریت فکر سے عاری کیا جائے اور قبائل کے آزاد منش مسلمانوں کو مکمل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے۔ اس کے بعد ہی افغانستان یا کوئی اور ملک قابو میں آ سکتا ہے۔ ”سب سے پہلے پاکستان“ کی اس نئی پالیسی کو نائب امریکی صدر جو بائیڈن نے اختراع کیا تھا۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق اس نئی پالیسی کے آجانے کے بعد پاکستان براہ راست امریکا کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے اور افغانستان کا مسئلہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ 16 دسمبر کو امریکی نائب صدر جو بائیڈن نے طالبان کے خلاف پاکستان کی کارروائیوں کی تحریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ پاکستان ابھی بہت کچھ نہیں کر رہا۔ پاکستان کے مغربی علاقوں میں موجود دہشت گرد امریکا کے لیے خطرہ ہیں۔

ملا طور جان کا بیان: 8 نومبر کو افغان کمانڈر عبدالمتان عرف ملا طور جان نے ایک نجی ٹی وی چینل کو

انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہم امریکا سے اس لیے لڑ رہے ہیں کہ اس نے ہمارے ملک پر یلغار کی ہے۔ ہم انہیں بھگا کر دم لیں گے۔ ملاطورتان نے کہا ہمارا پاکستانی طالبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم صرف امریکا اور غیر ملکیوں سے لڑ رہے ہیں۔

بھارت کے مورچے افغانستان میں: ادھر پاکستان قبائلی علاقے کی جنگ میں الجھا ہوا تھا اور ادھر بھارت افغانستان میں قدم بھاتا چلا جا رہا تھا۔ مئی کے وسط میں بھارت نے افغانستان کے خفیہ اداروں کو تربیت فراہم کرنے سے متعلق چار معاہدوں پر دستخط کر دیے۔ یہ مذاکرات دہلی میں ہوئے تھے جن میں امریکی اور برطانوی سفیروں کے علاوہ موساد کا نمائندہ بھی شامل تھا۔ پاکستان نے بھی افغانستان میں بھارت کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو کم کرنے کی کوشش شروع کر دی، انہی دنوں اسلام آباد میں شہری علاقائی اقتصادی تعاون کانفرنس (ایکا) کا انعقاد ہوا جس کے اختتام پر جاری کیے گئے اعلامیے میں پاکستان نے افغانستان میں تجارت، توانائی، مواصلات میں سرمایہ کاری کرنے، جنسیت ترقیاتی پروگراموں سے لائن بچھانے اور ایک ہزار افغان طلبہ کو اسکا لرشپ پیش کرنے کا اعلان کیا۔

پاکستان کی جانب سے اس قسم کے اقدامات کے باوجود افغانستان میں بھارتی اثر و رسوخ کا توڑ نہ کیا جاسکا۔ اکتوبر کے آغاز میں اتحادی افواج کے ایک سابق کمانڈر ”ملٹ برڈن“ نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا افغانستان میں بھارتی اثر و رسوخ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور یہ ملک بھارتی چھاؤنی کا روپ دھارتا جا رہا ہے۔

ملٹ برڈن کا یہ تاثر چند دنوں بعد بالکل درست ثابت ہوا۔ بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کی زیر صدارت قومی سلامتی و دفاعی کمیٹی کے مشترکہ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ چند ماہ بعد 2010ء میں بھارتی فوج افغانستان میں اپنی سرگرمیاں شروع کر دے گی۔ انہی دنوں جنوبی وزیرستان کے ایک قبائلی راہنما نے سرحد پار پاکستان کے خلاف سرگرمیوں پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ افغانستان میں پاکستان کی سلامتی کے خلاف غیر ملکی ایجنسیوں کے 17 مراکز کام کر رہے ہیں۔

نئی امریکی پالیسی سے پاکستان متاثر: نومبر میں جبکہ امریکی قیادت افغان مسئلے پر اپنی نئی پالیسی مرتب کرنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھی تھی، پاکستانی حکام کو شدید تشویش لاحق ہو گئی کہ کہیں نئی امریکی پالیسی میں پاکستان کے مفادات کو نظر انداز نہ کر دیا جائے، چنانچہ 23 نومبر کو پاکستان کے آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی نے مطالبہ کیا کہ امریکا نئی افغان پالیسی پر پاکستان کو اعتماد میں لے، مگر ہوا دعویٰ جس کا خدشہ تھا۔ 2 دسمبر کو صدر اوباما کی طرف سے امریکا کی نئی افغان پالیسی کا اعلان ہوا جس میں نہ صرف پاکستان

کے مفادات کو نظر انداز کیا گیا بلکہ بار بار پاکستان کو دہشت گردی کا مرکز قرار دیا گیا اور اپنی ناکامی کا ملبہ پاکستان پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے رد عمل میں 3 دسمبر کو پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے امریکی الزامات اور اسامہ بن لادن کی پاکستان موجودگی کی تردید کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ امریکا افغان پالیسی کی وضاحت کرے۔ تاہم امریکا نے کسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ 8 دسمبر کو امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے نہایت سخت لہجے میں مطالبہ کیا کہ پاکستان طالبان کے خلاف کارروائی تیز کرے ورنہ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔

2009ء میں پاکستان کے نقصانات: مجموعی طور پر 2009ء میں پاکستان میں 44 ڈرون حملے ہوئے جن میں 700 افراد جاں بحق ہو گئے۔ ایک تجزیے کے مطابق ان میں سے 90 فیصد عام شہری تھے۔ اوسطاً 800 شہری شہید ہوئے۔ یعنی ایک ایک القاعدہ یا طالبان لیڈر کے ساتھ 140 عام شہری بھی نشانہ بنتے چلے گئے۔ ڈرون حملوں کے علاوہ ملک میں سال میں 91 دھماکے ہوئے جن میں 1482 افراد جاں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بدنام زمانہ نجی امریکی دہشت گرد تنظیم ”بلیک وائر“ پاکستان میں گھس چکی تھی اور دہشت گردی کو ہوا دے رہی تھی۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے خود جنوری 2010ء میں پاکستان کے دورے کے موقع پر اعتراف کیا کہ بلیک وائر نجی حیثیت میں پاکستان میں کام کر رہی ہے۔

پاکستان کا دو ٹوک جواب: دسمبر 2009ء کے وسط میں پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل اشفاق کیانی اور امریکی نمائندے جنرل پیٹریاس کے درمیان ایک اہم ملاقات ہوئی۔ امریکا دباؤ ڈال رہا تھا کہ پاکستان جنوبی وزیرستان کی طرح شمالی وزیرستان میں بھی آپریشن کرے اور حقانی گروپ کے خلاف کارروائیاں کرے جو افغانستان میں طالبان کے شانہ بشانہ امریکی و اتحادی افواج کا ناظرہ بند کیے ہوئے ہے۔ اس ملاقات میں امریکا نے واضح الفاظ میں دھمکی بھی دی اگر پاکستان نے امریکا کے حسب مشاورت کارروائیاں نہ کیں تو کوئٹہ شہر پر ڈرون حملے شروع کر دیے جائیں گے۔ تاہم پاکستانی سپہ سالار اعلیٰ نے مزید امریکی دباؤ قبول کرنے اور کارروائیوں کا دائرہ کار بڑھانے سے انکار کر دیا۔ پاکستان کی جانب سے پہلی بار ایک جرأت مندانہ موقف نے امریکا کی مایوسی میں اضافہ کر دیا۔



مآخذ و مراجع

- ❦ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 12، 13
- ❦ ہفت روزہ تکبیر، فرانسٹے اسٹیل، غازی: جلد 2009ء
- ❦ قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جہاں 2009ء
- ❦ طالبان کی ویب سائٹ (<http://shahamat.info>)
- ❦ روزنامہ اسلام کراچی 2009ء
- ❦ ذاتی یادداشتیں
- ❦ زبانی روایات

اکتالیسواں باب

امن مذاکرات اور شدید معرکے

18 جنوری، کابل کا معرکہ: طالبان کے بھرپور حملوں کا سلسلہ 2010ء میں بھی جاری رہا۔ 18 جنوری 2010ء کی صبح سوا دس بجے کابل میں صدر حامد کرزئی کی کابینہ کی تقریب حلف برداری جاری تھی کہ 20 طالبان نے شہر میں داخل ہو کر اپنی قوت کی دھاک جمادی۔ انہوں نے ایوانِ صدر کی انتظامی عمارت، وزارتِ دفاع، وزارتِ انصاف، وزارتِ کان کنی، مرکزی بینک اور سیرینا ہوٹل سمیت 20 عمارتوں کو نشانہ بنایا۔ حلف برداری کی تقریب درہم برہم اور 8 عمارتیں نذر آتش ہو گئیں۔ چار گھنٹے تک شہر میدانِ جنگ بنا رہا۔ اس جھڑپ میں سیکیورٹی فورسز کے 14 مارفرا قتل اور 71 زخمی ہوئے۔ جوانی کارروائی میں 9 طالبان شہید ہو گئے۔

کابل دھماکا، راکے افسرانِ ہلاک: 26 فروری بروز جمعہ کی صبح ساڑھے چھ بجے طالبان نے کابل میں کاریم دھماکا کر کے ایک ہولناک کارروائی شروع کی۔ انہوں نے ایک ہوٹل اور تین گیسٹ ہاؤسز کو نشانہ بنایا، فائرنگ کے ساتھ پانچ خودکش بمباروں نے اپنے ہدف پر حملے کیے جس سے سترہ افراد ہلاک ہو گئے جن میں بھارتی خفیہ ایجنسی راکے چار اعلیٰ افسران، دو بھارتی میجر، اطالوی وزیراعظم کا ایک مشیر اور ایک فرانسیسی شہری بھی تھے۔ پانچ مہینوں کے اندر کابل میں طالبان کا یہ پانچواں بڑا حملہ تھا۔ اس واقعے سے عالمی سطح پر خوف و ہراس پھیل گیا۔

امریکا اور اتحادی فورسز کے متفرق نقصانات: 9 مارچ کو خوست کے ضلع علی شیر میں اتحادیوں کے فوجی اڈے پر خودکش حملہ ہوا جس میں دو افراد ہلاک ہو گئے۔

♣ 13 مارچ کو قندھار میں حامد کرزئی کے سوتیلے بھائی ولی کرزئی کے گھر اور پولیس ہیڈ کوارٹر سمیت متعدد مقامات پر خودکش دھماکے ہوئے جن میں 35 افراد ہلاک ہو گئے۔

♣ 12 اپریل کو قندوز میں جرمنی کے فوجی قافلے پر طالبان نے حملہ کر کے دو ٹینک تباہ اور 28 فوجیوں کو ہلاک کر دیا۔

❖ 19 اپریل کو طالبان نے زائل میں جدید ترین امریکی طیارہ سی وی 22 مار گرایا جس میں سوار چار ہلاک ہوا۔

❖ 5 مئی کو طالبان نے پانچ خودکش بمباروں کے ساتھ نیمروز میں ایک بڑا حملہ کیا۔ طالبان اور مقامی فورسز میں زبردست جھڑپ ہوئی جس کے بعد طالبان نے کئی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔

❖ 7 جون کو قندھار میں پولیس مراکز پر دو خودکش حملوں میں نیٹو کے دس فوجیوں سمیت 12 افراد ہلاک ہو گئے۔ غزنی میں کانوائے پر حملے میں پانچ افغان ہلاک مارے گئے۔

❖ 9 جون کو طالبان نے ہلمند میں نیٹو کا چینیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار چار افراد ہلاک ہو گئے۔

❖ 22 جون کو ارزگان میں نیٹو ہیلی کاپٹر تباہ ہوا جس میں آسٹریلیا کے کمانڈر سمیت 14 فوجی مارے گئے۔ یہ ہیلی کاپٹر مجوزہ آپریشن قندھار کے لیے کمک لے کر جا رہا تھا۔ آسٹریلیا اور برطانیہ کے وزرائے اعظم نے اعتراف کیا کہ وہ اس جنگ میں شرکت کی بھاری قیمت چکا رہے ہیں۔

❖ 30 جون کو صبح آٹھ بجے طالبان فوجیوں نے جلال آباد ایر پورٹ پر حملہ کر کے 15 امریکیوں کو مار ڈالا۔ مجموعی طور پر جون کے مہینے میں 115 امریکی اور نیٹو فوجی مارے گئے۔

❖ 22 جولائی کو ازبک (ہلمند) میں طالبان نے چینیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا، 6 امریکی ہلاک ہو گئے۔

❖ برطانوی اخبار دی گارڈین کے مطابق جولائی کے مہینے میں مجموعی طور پر ملک بھر میں 100 امریکی مارے گئے۔

❖ 26 اگست کو قندھار میں طالبان کے حملے میں 8 سیکورٹی اہل کار ہلاک ہو گئے۔

❖ 30 اگست کو لندن کے اخبار ٹیلی گراف نے خبر دی کہ افغانستان میں تین دنوں میں 27 امریکی مارے گئے۔ اگست خونی مہینہ ثابت ہوا۔

❖ 21 ستمبر کو طالبان نے زائل کے ضلع دیچوپان میں امریکی ہیلی کاپٹر مار گرایا، 9 فوجی ہلاک ہو گئے۔

❖ 15 اکتوبر کو قندھار میں دھماکے ہوئے، 4 نیٹو فوجیوں سمیت 8 افراد ہلاک ہو گئے۔

❖ 12 اکتوبر کو کنٹر میں چینیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا، 26 نیٹو فوجی ہلاک ہو گئے، اسی روز کابل میں ایک کارگو طیارہ حادثاتی طور پر تباہ ہوا۔

❖ 12 اکتوبر کو ننگر ہار سردی چیک پوسٹ پر طالبان کے حملے میں 15 افغان فوجی ہلاک ہو گئے۔

❖ انہی دنوں غیر ملکی تنظیموں کو مشورے دینے والی تنظیم این جی او سیفٹی آفس نے امدادی کارکنوں کو طالبان کے زیر کنٹرول علاقوں میں ان سے اجازت لے کر جانے کا مشورہ دے دیا۔

2 نومبر کو کنڑ اور قندھار میں 17 امریکی مردار ہوئے، جاسوس طیارہ تباہ ہوا، نیٹو نے 22 طالبان کی ہلاکت کا دعویٰ کیا۔

❖ 12 دسمبر کو قندھار میں فوجی اڈے پر خودکش حملے میں 16 امریکی ہلاک ہو گئے۔

❖ 19 دسمبر کو کابل، جلال آباد اور قندوز میں طالبان کے حملوں میں 17 اتحادی ہلاک ہو گئے۔

مذکورہ سطور میں کارروائیوں کی صرف ایک جھلک دکھائی گئی ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق 2010ء میں 700 سے زائد اتحادی ہلاک ہوئے مگر دوسری طرف خود پسینا گون کی رپورٹ کے مطابق اس سال مجموعی طور پر طالبان کے اٹھارہ ہزار حملے ہوئے جبکہ گزشتہ سال یہ تعداد دس ہزار دو سو تھی۔ اس رپورٹ میں ہلاک شدگان کی تعداد ظاہر نہیں کی گئی مگر اٹھارہ ہزار کی تعداد کو دیکھتے ہوئے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ اتحادیوں کے جانی نقصانات اس سے کئی گنا زیادہ ہیں جو عالمی ذرائع ابلاغ پر نشر ہوتے ہیں۔ امریکا، اتحادیوں اور افغان فورسز کے مظالم اور نقصانات: 30 جنوری کو وردک کے ضلع سید آباد میں ایک افغان نژاد امریکی مترجم نے فائرنگ کر کے تین امریکی سپاہیوں کو ہلاک کر دیا اور جوابی فائرنگ میں خود بھی قتل ہو گیا۔

❖ 26 اگست کو قندھار میں ایک ڈرون گر کر تباہ ہو گیا۔

❖ 13 جولائی کو ہلمند کے مرکز لشکر گاہ میں برطانوی فورسز گھر گھر کی تلاشی لے رہی تھیں، اس دوران افغان فورسز کے ایک اہل کار نے انہیں متنبہ کیا کہ وہ تلاشی میں چادر اور چادر یواری کے تقدس کا لحاظ رکھیں، برطانوی فوجیوں نے جب اس کی کوئی پروا نہ کی تو اس نے فائرنگ کر کے تین انگریز فوجیوں کو ہلاک اور چھ کو زخمی کر دیا اور خود فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

❖ 23 نومبر کو وردک میں ایک امریکی ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا۔

❖ 29 نومبر کو ایک افغان پولیس آفیسر نے فائرنگ کر کے 6 امریکی مار دیے، جوابی فائرنگ میں خود شہید ہو گیا۔

نیٹو کے مظالم: 16 اپریل کو نیٹو نے ہلمند میں بمباری سے دو خواتین سمیت آٹھ افراد کو شہید کر ڈالا۔

❖ 24 جولائی کو ہلمند کے گاؤں رگی میں امریکی بمباری سے عورتوں اور بچوں سمیت 60 شہری شہید ہو گئے جو طالبان اور اتحادیوں کی لڑائی میں شدت آنے کی وجہ سے نقل مکانی کر رہے تھے، انہیں سفید پرچم دکھانے کے باوجود نشانہ بنایا گیا۔

❖ 2 ستمبر، تخار میں نیٹو نے انتخابی ریلی پر بمباری کر کے 12 افراد کو شہید کر دیا۔ انتخابی امیدوار

عبدالوحید خراسانی بھی زخمی ہو گئے۔

25 اکتوبر ہلند بگرام مسجد پرنیو کی بمباری کی گئی۔ کئی مکانات بھی تباہ ہوئے اور بچوں اور خواتین سمیت 150 افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

افغان عوام کے مظاہرے: 10 جولائی کو کابل میں اتحادی افواج کے ہاتھوں مقامی افراد کی ہلاکتوں پر ہزاروں افراد نے احتجاج کیا۔ بلخ میں مقامی شہریوں نے امریکیوں کے انخلاء اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مظاہرہ کیا۔

امریکی ملعون پادری ٹیری جوز نے 200 نئے جلانے کا اعلان کیا تھا، اس کے خلاف دنیا بھر میں مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر سب سے شدید احتجاج افغان مسلمانوں نے کیا۔

7 ستمبر کو افغانستان میں قرآن کو جلانے کے امریکی پادری کے منصوبے کے خلاف احتجاج میں ارکان پارلیمنٹ سمیت سینکڑوں افراد نے دھرنا دیا اور امریکی قافلے پر پتھر اڑا کیا۔

9 ستمبر کو اوباما نے ملعون پادری سے منصوبہ ترک کرنے کی درخواست کر دی اور وجہ یہ بتائی کہ ایسی حرکات سے القاعدہ میں بھرتیاں تیز ہو جائیں گی۔

10 ستمبر کو پورے افغانستان میں توہین قرآن پر احتجاج ہوا۔ کرزئی نے پادری کے اعلان کو اسلام کی توہین قرار دیا۔ بدخشان کے صدر مقام فیض آباد میں نماز عید الفطر کے بعد قرآن مجید کی توہین پر احتجاج کے لیے ہزاروں مظاہرین جمع ہوئے، تب ان پرنیو چھاؤنی کے جرمن فوجیوں نے فائر کھول دیا جس سے ایک شخص شہید اور چار زخمی ہو گئے۔

امریکا کی کارروائیاں، سازشیں اور نا کامیاں

آپریشن مشترک: فروری میں امریکی فوج نے نیو کے ساتھ ہلند میں آپریشن مشترک شروع کیا مگر نا کام ہو کر پسپا ہو گئی جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

فروری 2010ء کا دوسرا عشرہ شروع ہوتے ہی جنوبی افغانستان کے صوبے ہلند میں طالبان اور اتحادی افواج کے درمیان ایک سخت ترین معرکہ لڑا گیا۔ مفاہمت کی باتیں کر مٹے کرتے امریکا نے اچانک اپنے چیلے جانوں کی تمام تر مکتد قوت کو ایک نقطے پر جمع کر کے ہلند کے ایک ضلع ناو علی کے ایک چھوٹے سے قصبہ ”مرجہ“ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ افغانستان میں ناو علی جیسے 1365 اضلاع اور مرجہ جیسی ہزاروں بستیاں ہیں۔ امریکا اور اس کے اتحادی اس چھوٹے سے ہدف کو سر کرنے کے لیے شیفتن اور براہام جیسے

65 ٹن وزنی ٹینک، ڈرون طیارے، 60 ہیلی کاپٹر اور چند ہزار سپاہی میدان میں لے آئے۔ اسے ویت نام کی جنگ کے بعد کسی بھی ملک کے خلاف کی جانے والی امریکا کی سب سے بڑی کارروائی شمار کیا جا رہا تھا۔ اس آپریشن کے پیچھے یہ ذہن کار فرما تھا کہ کسی طرح کم از کم کسی ایک علاقے کو طالبان کے قبضے سے نکال کر دکھایا جائے اور یوں امریکی قوم کی خاک آلود ناک اونچی کرنے کو شش کی جائے۔

اس آپریشن کی وجہ سے علاقے سے کم از کم تیس ہزار افراد نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تاہم طالبان اپنے روایتی ایمانی جذبے اور مومنانہ شجاعت کے ساتھ اس بار بھی مقابلے میں ڈٹے رہے۔ انہوں نے اپنے مرکز ”مرجہ“ سے، جو اتحادیوں کا اصل ہدف تھا، آگے بڑھ کر دشمن کی پیش قدمی روک لی۔ گھسان کی لڑائی میں اتحادیوں کا جو نقصان ہوا اسے صحیح طرح میڈیا پر نشر نہیں کیا گیا تاہم خصوصی ذرائع کے مطابق ابتدائی جھڑپوں ہی میں امریکا اور اتحادیوں کے 100 سے زائد سپاہی مارے گئے۔ بچاس سے زائد ٹینک، کئی ہیلی کاپٹر اور ڈرون طیارے تباہ ہو گئے۔ طالبان نے بارودی سرنگوں اور دیسی بموں سے دشمن کی پیش قدمی کا راستہ مسدود کر دیا۔ ان کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ عورتوں نے بھی ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ ایک غیر افغان خاتون نے مرجہ کے بازار میں اتحادی سپاہیوں پر فائر کھول کر 14 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جوابی فائرنگ میں خود بھی شہید ہو گئی۔

اتحادیوں نے تنگ آ کر محصوم شہریوں پر غصہ اتارنا شروع کر دیا اور مرجہ کی آبادی پر اندھا دھند راکٹ باری کر کے ایک ہی خاندان کے نو افراد سمیت بارہ افراد کو شہید کر دیا۔ بہر کیف ہلندہ پران کی یلغار جسے ”آپریشن مشترک“ کا نام دے کر اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ کر لی گئی تھیں، سو فی صد ناکام رہی۔

آپریشن میں مسلسل ناکامی کے بعد 22 فروری کو امریکی فضائیہ نے ارزگان میں شہریوں کی مسافر گاڑیوں پر بمباری کر کے تیس افراد کو شہید کر دیا جس سے پورے افغانستان میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی، حامد کرزئی نے احتجاج کیا جس پر نیٹو اور امریکی افواج کے کمانڈر جنرل میک کرٹل نے زبانی معذرت کو کافی سمجھا۔

آپریشن قندھار: آپریشن مشترک کی شرمناک ناکامی کی خفت مٹانے کے لیے طے کیا گیا کہ کسی طرح افغانستان کے ایک شہر قندھار پر قابو پا کر خود کو فاتح ثابت کیا جائے، چنانچہ مارچ میں بڑے زور و شور سے 23 ہزار سپاہیوں کے ساتھ قندھار اور اس کے مضافات کو طالبان سے پاک کرنے کی مہم کا اعلان کیا گیا مگر طالبان کی جوابی کارروائیوں کے خوف سے یہ مہم ملتوی ہوتی چلی گئی۔ امریکی فوج کے مرکزی کمانڈر جنرل ڈیوڈ بیٹریس کا کہنا تھا کہ اس آپریشن میں سخت مزاحمت کا سامنا ہوگا۔ آپریشن کی تیاریوں میں نو مہینے گزر گئے۔ پہلے بونگوں کو طالبان کے خلاف ابھارنے کی ناکام کوششوں میں کئی ماہ ضائع کیے

گئے، پھر قندھار کے گرد و نواح میں ہزاروں ایکڑ زرعی زمینوں کو بمباری کر کے اور بلندوزر چلا کر ہموار کیا گیا تاکہ طالبان یہاں مورچے نہ بنائیں۔ اس طرح ہزاروں گھرانوں کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا۔ اس کے باوجود امریکا باقاعدہ آپریشن شروع نہیں کر سکا جب کہ طالبان نہ صرف قندھار کے گرد و نواح بلکہ بیچ شہر میں امریکی کمانڈوز، اسپیشل فورسز اور حکومتی اداروں پر مسلسل حملے کر کے اپنی دھاک بٹھاتے رہے۔

امریکا کا دیوالیہ: اس سال بھی امریکا میں کساد بازاری کے اثرات نظر آتے رہے، صرف سال کے ابتدائی چار مہینوں میں پچاس امریکی بینک بند ہوئے۔ اس سال افغانستان میں امریکا کے جنگی اخراجات بڑھتے چلے گئے، عراق جنگ کے مصارف 64 ارب ڈالر تک تھے مگر افغان جنگ کے اخراجات 72 ارب ڈالر سے بھی بڑھ گئے۔ امریکی ذرائع ابلاغ نے اعتراف کیا کہ گیارہ ستمبر 2001ء کے بعد پینٹاگون کا بجٹ دو گنا ہو گیا ہے۔

عراق جنگ ختم: امریکا نے اس سال اگست کے اواخر میں عراق کی جنگ ختم کر دی تاکہ اپنی ساری طاقت افغانستان میں جھونکی جا سکے۔ اس سے قبل اپریل کے آغاز میں عراق سے 41 ہزار گاڑیاں، 30 لاکھ جنگی ساز و سامان اور تیس ہزار سپاہی افغانستان پہنچا دیے گئے تھے۔ ستمبر کے آغاز میں اوبامانے عراق جنگ کے خاتمے کا باضابطہ اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اب ہماری تمام توجہ افغانستان پر ہوگی۔ عراق کی جنگ میں چار ہزار چار سو سپاہی ہلاک اور 34 سو زخمی ہوئے۔ اربوں ڈالر خرچ ہو گئے، اب ملکی معیشت کو مضبوط کیا جائے گا۔ امریکی محکمہ خارجہ کے ترجمان فلپ کراؤل نے اعتراف کیا کہ عراق جنگ میں جو سات سال پانچ ماہ محیط تھی، ایک کھرب ڈالر ضائع ہوئے ہیں۔

میک کرشل کا استعفیٰ: سال کے دوران امریکا کے لیے اس وقت سخت پریشان کن صورتحال پیدا ہو گئی جب افغانستان کے امریکی سپریم کمانڈر میک کرشل نے کھلم کھلا اوباما انتظامیہ کی پالیسیوں سے اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ 22 جون کو اس نے اوباما انتظامیہ پر افغان جنگ میں ناقص حکمت عملی اختیار کرنے کا الزام لگایا۔ میک کرشل کے خیالات کو ایک صحافی مائیکل ہسٹنگ اس کی اجازت سے قلم بند کر کے منظر عام پر لایا، اس رپورٹ کے اہم مندرجات یہ تھے:

✽ امریکی نائب صدر جوزف بائڈن کی افغان پالیسی سے افغانستان انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

✽ افغان جنگ کی موجودہ پالیسی محض وقت اور معیشت کا ضیاع ہے۔

✽ سینیٹر جان کیری اور جان میک مین کا حامد کرزی سے رویہ غیر مناسب ہے۔

افغانستان میں ایک بے گناہ شخص کا قتل دس مزید مجاہد پیدا کر دیتا ہے اس لیے یہاں عراق والی پالیسی نہیں چلے گی۔

واضح رہے کہ میک کرشل خود عراق میں ایک خوں خوار جنرل کے طور پر مشہور تھا، اس نے وہاں جنرل پیٹریاس کی ماتحتی میں جوائنٹ اسپیشل فورسز کمانڈر کی حیثیت سے معصوم شہریوں کا قتل عام کیا تھا۔ عراق میں شیعہ سنی فسادات برپا کرانے اور کرائے کی مقامی فوج متعین کرنے کے بعد امریکا کو خوش فہمی ہو گئی کہ افغانستان میں بھی یہی نسخہ کامیاب ثابت ہوگا، چنانچہ یہی عمل دہرانے کے لیے میک کرشل کو افغانستان میں متعین کر دیا گیا مگر یہاں طالبان کی مزاحمت کا مزہ چکھنے اور کئی ناگوار تجربات سے گزرنے کے بعد اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔

آپریشن مشترک میں ناکامی سے میک کرشل کا رعب داب ختم ہو گیا تھا اور آپریشن قندھار کے مسلسل التواء نے اس کی ساکھ بالکل ہی گرا دی تھی۔ اپنی ناکامیوں کے جواز میں میک کرشل نے برطانیہ کہنا شروع کر دیا کہ یہاں عراق جیسی فریب کاری نہیں چل سکتی، یا تو مزید دو تین گنا فوج تعینات کی جائے اور ہر دس افغانوں پر ایک فوجی مقرر کیا جائے ورنہ جنگ ختم کر کے واپسی کا راستہ ناپنا ہی بہتر ہے۔ مذکورہ رپورٹ میں میک کرشل کے خیالات خلاصہ یہ تھا کہ افغان جنگ مکمل طور پر ناکام جنگ ہے۔ اس نے امریکن انتظامیہ پر فرد آفراڈا طر کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ افغان امریکی سفیر رچرڈ ہالبروک ایک درندہ ہے، میں جس کی ای میل کھولنا نہیں چاہتا، مشیر سلامتی جیمز جوز سخرہ ہے، جو ابھی تک 1985ء کی سرد جنگ کے دور میں جی رہا ہے۔ نائب صدر جوزف بائڈن کون ہے میں نہیں جانتا؟

میک کرشل کے اس بیان پر امریکی صدر دبا مانے سخت رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے واشنگٹن طلب کر لیا اور اس سے استعفیٰ لے کر اس کی جگہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس کو افغان جنگ کا مرکزی کمانڈر مقرر کر دیا۔ 6 جولائی کو امریکی ہوم لینڈ ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر نے دعویٰ کیا کہ ملائکہ کو 27 جون کو کراچی سے گرفتار کیا جا چکا ہے تاہم طالبان نے اس کی پرزور تردید کرتے ہوئے اسے امریکا کی اپنی ناکامیوں کو چھپانے کا ایک شوشہ قرار دیا۔

جولائی کے اوائل میں امریکی فوج کے سربراہ ایڈمرل مائیک مولن نے سیکورٹی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا کہ آپریشن قندھار ناکامی کے خوف سے مؤخر کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ افغان مسئلے کا سیاسی حل ہی ممکن ہے۔

30 اگست کو امریکی اور نیٹو افواج کے سربراہ جنرل ڈیوڈ پیٹریاس نے کہا کہ طالبان کے حملوں کی

تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ نیو کوشد مزاحمت کا سامنا ہے۔

اتحادیوں کی پسپائی: اگست کے آغاز میں ہالینڈ نے اپنی فوج کو جو چار سال سے افغانستان میں تھی واپس بلا لیا، اس مدت میں ہالینڈ کے 24 فوجی ہلاک اور 140 زخمی ہوئے تھے۔

اکتوبر کے اواخر میں جرمنی نے اعلان کیا کہ وہ مئی میں اپنی فوج واپس لے جائے گا۔ کینیڈا اور اٹلی نے بھی 2011ء کے موسم گرما میں انخلاء کا فیصلہ سنا دیا۔

نومبر کے آغاز میں فرانس نے بھی واضح کر دیا کہ وہ اپنی فوج 2011ء میں واپس بلا لے گا۔
 ڈیڑم ائیکشن میں اوباما کی یارٹی کو شکست: 3 نومبر کو امریکی ڈیڑم ائیکشن میں افغانستان سے انخلاء کی حامی اوباما کی جماعت ڈیموکریٹس ہار گئی۔ پش کی پالیسیوں کے مطابق افغان جنگ جاری رکھنے کی حامی ری پبلکن پارٹی نے 230 نشستیں لے کر ایوان زیریں (ایوان نمائندگان) سے ڈیموکریٹس کی اکثریت ختم کر دی جو صرف 178 نشستیں جیت سکی۔ 37 ریاستوں میں سے 24 میں گورنر کے عہدے پر بھی اپوزیشن کامیاب رہی۔

نیو کا اہم اجلاس: 19 نومبر پر نکال کے دارالحکومت لزبن میں نیو کا دورہ اہم اجلاس ہوا جس میں 28 رکن ممالک کے صدور اور وزرائے اعظم کے علاوہ افغانستان اور روس کے نمائندے بھی شامل تھے۔ اس میں افغانستان کے مستقبل کاائحہ عمل طے کیا گیا اور نیو کو سپلائی کے قبالہ راستوں پر غور کیا گیا۔

20 نومبر کو اجلاس کے اختتام پر نیو اور افغان صدر نے اس معاہدے پر دستخط کیے کہ نیو افواج 2014ء تک افغانستان کے تمام علاقوں کا اختیار افغان فورسز کو سونپ دیں گی، البتہ وہ افغان فورسز کی تربیت کرتی رہیں گی۔ یہ اعلان بھی ہوا کہ روس نیو افواج کی سپلائی کے لیے خصوصی رعایتیں دے گا۔ آخر میں نیو سربراہ راسمون فوگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جب تک حالات ٹھیک نہیں ہو جاتے، ہم افغانستان میں رہیں گے۔ یہ سمجھنا دشمن کی بھول ہوگی کہ ہم فرار ہو رہے ہیں، انخلاء کے بعد بھی افغانستان کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

ایک دکاندار امریکی جزیلوں کو بے وقوف بنا گیا: 23 نومبر کو شایع ہونے والی خبروں کے مطابق ایک نامعلوم شخص ملا منصور بن کرامر کی حکام کو مدت تک بے وقوف بناتا رہا۔ میک کرٹل نے اس کی وساطت سے بات چیت کی منظوری دی تھی۔ وہ تین ملاقاتوں میں امدادی کاموں کے نام پر امریکیوں سے خطیر رقم بھور کر لے گیا۔ ایک بار اسے افغان صدر سے ملانے کے لیے خصوصی طیارے میں کابل بھی لایا گیا۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ وہ کوئی کونستہ دکاندار تھا جو اب روپوش ہے۔

ملار یڈیو: نومبر میں افغانستان میں طالبان کے خلاف پروپگنڈے کے لیے امریکا نے مفت ریڈیو سیٹ باغنا شروع کر دیے۔ ابتدائی دنوں میں 15 ہزار ریڈیو تقسیم کیے گئے۔ اس ریڈیو کو ”ملار یڈیو“ کا نام دیا گیا تاکہ مذہب پسند عوام بھی اسے پسند کریں، اس میں خبروں تبصروں اور موسیقی کے ذریعے انتہا پسندی کے خاتمے اور روشن خیالی کی ترغیب دی جا رہی تھی۔

افغانستان کی تقسیم پر غور: نومبر میں امریکا اس منصوبے پر بھی غور کرنے لگا کہ طالبان سے مذاکرات کامیاب نہ ہونے پر کیا کیا جائے گا۔ چونکہ امریکی صدر اوباما نے 2009ء کے اواخر میں افغان پالیسی سے متعلقہ اعلامیے میں جولائی 2011ء میں افغانستان سے انخلاء شروع کرنے کا اعلان کیا تھا جس کا وقت قریب آچکا تھا اور امریکا کے روز افزوں عسکری و معاشی نقصانات بھی اسے زیادہ رکنے کے قابل نہیں چھوڑ رہے تھے، اس لیے امریکا اس پر غور کرنے لگا کہ 2011ء میں شمالی افغانستان کے تین صوبے ازبک و تاجک ملیشیا کے حوالے کر کے انہیں شمالی افغانستان کے نام سے الگ ملک قرار دیے دیا جائے تاکہ اس کے جانے کے بعد بھی کوئی مستحکم امریکہ مخالف حکومت قائم نہ ہو سکے۔

رچرڈ ہالبروک، افغانستان نے دل توڑ دیا: امریکیوں کے لیے سال کی ایک بہت بری خبر، پاکستان و افغان مسائل کے لیے خصوصی سفیر رچرڈ ہالبروک کی موت تھی جو 10 دسمبر کو دل کے دورے کی وجہ سے اپنے دفتر میں چکر اکر گر پڑے اور پھر حالت نازک ہونے پر ہسپتال میں داخل کر دیے گئے جہاں ان کے دل کے دل کے دوا پریشن ہوئے۔ پیر 13 دسمبر کو ہالبروک کا انتقال ہو گیا۔ مرنے سے پہلے واشنگٹن میں اپنے پاکستانی سرجن سے آخری خواہش بیان کرتے ہوئے کہا: ”افغان جنگ روکنا ہوگی۔“

مسئلہ افغانستان پر استنبول کانفرنس: اس سال افغانستان کے ہمسایہ ممالک بھی افغان مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کرانے کے لیے سرگرم دکھائی دیے۔ استنبول میں افغانستان، پاکستان اور ترکی کا سر فریق اجلاس ہوا جس میں ترکی کے صدر عبداللہ گل، صدر پاکستان آصف زرداری اور افغان صدر حامد کرزئی نے شرکت کی۔ 26 جنوری کو اجلاس کے اختتامی اعلامیے میں اعتدال پسند طالبان معاہدتی عمل شروع کرنے پر زور دیا گیا۔ چین سمیت دیگر ہمسایہ ممالک نے بھی افغان حکومت کے طالبان سے مفاہمت کے اعلان کی حمایت کی اور طالبان سے اسلحہ کی کوہ اتھار چھینک کر قومی سیاست میں کردار ادا کریں۔

ادھر افغانستان میں نیٹو اور امریکی افواج کے اعلیٰ کمانڈر میک کرشل نے برطانوی اخبار ”فنانشل ٹائمز“ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا: ”لڑائی بہت ہو چکی اب سیاسی عمل کی ضرورت ہے۔“

انہوں نے اُمید ظاہر کی کہ افغانستان میں 30 ہزار مزید امریکی فوج کے آنے سے طالبان اتنے

کمزور ہو جائیں گے کہ انہیں مذاکرات پر مجبور کیا جائے گا۔ انہوں نے یہ توقع بھی ظاہر کی کہ طالبان ملک کو چلانے میں مدد کر سکتے ہیں۔

لندن کانفرنس: 28 جنوری 2010ء کو طالبان سے مہمانت کے لیے لندن میں ایک نان الائنڈ کانفرنس کا انعقاد: وائس میں 70 ممالک کے نمائندوں نے شرکت کی اور ملے لیا گیا کہ طالبان سے مفاہمت کے لیے جرگہ بلایا جائے گا۔ کانفرنس میں افغانستان کی امداد میں پچاس فیصد اضافے اور طالبان کو صدر حامد کرزئی کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے 500 ملین ڈالر کے فنڈ کے قیام کا اعلان بھی کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ ملک کا کنٹرول نیٹو کی جگہ جلد از جلد افغان فورسز کو دے دیا جائے گا۔ طالبان کے بعض راہنماؤں کے نام اقوام متحدہ کی سرتب کردہ دہشت گردوں کی فہرست سے خارج کرنے اور ان پر عائد پابندیاں ہٹانے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ ان طالبان راہنماؤں میں طالبان کے سابق وزیر خارجہ ملا ذکیل احمد متوکل کے علاوہ عبدالحکیم نسیب، شمس الدین امین زئی، محمد موسیٰ ہوبک اور فضل محمد فیضان کے نام شمار کیے گئے۔ افغان صدر نے سابقہ امدادی رقبوں کے بارے میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ انہیں کچھ علم نہیں کہ اب تک افغانستان میں 24 ارب ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کرنے والے ممالک نے یہ رقم کہاں خرچ کی ہے۔ لندن کانفرنس کے فوراً بعد 2 فروری کو افغان صدر سعودی عرب جاپہنچے، کہا جاتا ہے کہ وہ طالبان کو مذاکرات کے لیے آمادہ کرنے میں شاہ عبداللہ سے مدد لینا چاہتے تھے۔

کرزئی کے حزب اسلامی سے مذاکرات: ادھر 21 فروری کو کرزئی حکومت نے نورستان کا ایک صوبہ بغلان حزب اسلامی کے حوالے کر دیا تا کہ انیسویں لوہیہ جرگہ میں اس کی شرکت کو یقینی بنایا جاسکے۔

حامد کرزئی ایک عرصے حزب اسلامی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے تاکہ اس طرح طالبان پر مذاکرات کے لیے دباؤ ڈالا جاسکے۔ 21 مارچ کو حزب اسلامی کے اعلیٰ اختیاراتی وفد نے انجینئر قطب کی سربراہی میں کابل میں سرکاری حکام اور سابق جہاد یوں سے مذاکرات شروع کر دیے اور پندرہ نکاتی فارمولہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس کے مطابق امریکا سمیت کسی سے بھی بات ہو سکتی ہے۔ اس فارمولے کا بنیادی مقصد غیر ملکی افواج کا انخلاء اور ایک وسیع البیاد حکومت کا قیام تھا۔ حزب کے نمائندوں نے 1996ء کے انخلاء کے بعد پہلی بار شمالی اتحاد کے رہنماؤں سے بھی اس مذاکرات شروع کر دیے تاہم شمالی اتحاد کے رہنما حکمت یار کے فارمولے سے کئی طور پر متفق نہ ہوئے۔ 23 مارچ کو سلامتی کونسل نے بھی ان اس مذاکرات کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

امریکا کو طالبان کے بغیر ہونے والے ان مذاکرات سے اتنی دلچسپی تھی کہ 28 مارچ کو امریکی صدر اوباما

رات کی تاریکی میں اچانک ہی ہگرام ایرٹیس پہنچ گئے، انہوں نے صدر حامد کرزئی اور امریکی فوجی افسران سے ملاقاتیں کیں اور افغان مسئلے کو امریکی سلامتی کے لیے اہم قرار دیا۔ کرزئی کا مطالبہ تھا کہ حکمت یار کا نام امریکا کو مطلوب افراد کی فہرست سے نکالا جائے تاکہ اس مذاکرات آگے بڑھائے جاسکیں۔ اس ملاقات کے فوراً بعد امریکی حکام نے حکمت یار کا نام مطلوب افراد کی فہرست سے نکالنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

یکم اپریل کو کابل کے فرانسیسی سفارت خانے میں حزب اسلامی، کرزئی حکومت اور امریکی نمائندوں میں مذاکرات ہوئے جس میں کرزئی حکومت نے امریکا کو حکمت یار کے بیشتر مطالبات منظور کرنے پر آمادہ کر لیا۔ حزب اسلامی کا کہنا تھا کہ اس کے جنگجوؤں کو افغان فوج یا پولیس میں شامل کر لیا جائے، اس طرح طالبان کے ساتھ مذاکرات ناکام ہونے کی صورت میں ان کو کمزور کیا جاسکتا ہے۔ ان مذاکرات میں فرانسیسی سفیر نے اہم کردار ادا کیا۔ مگر بعد میں بعض وجوہ سے حزب اسلامی کے ساتھ مذاکرات کی یہ پیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور آنے والے دنوں میں حزب اور کرزئی حکومت کے سابقہ فاصلے برقرار نظر آئے۔

لویہ جرگہ: 2 جون 2010ء کو کابل میں انیسویں لویہ جرگے کا انعقاد ہوا۔ جرگے کے شرکاء نے مطالبہ کیا کہ طالبان قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے جس پر کرزئی نے آمادگی ظاہر کر دی۔ کرزئی نے جرگے کے اختتام پر طالبان قیدیوں کی رہائی کا فیصلہ سناتے ہوئے پیش کش کی کہ طالبان اور حزب اسلامی صلح پر رضامند ہوں تو ان کی شرائط پر بھی بات چیت کی جاسکتی ہے۔ ایسا موقع تاریخ میں بار بار نہیں ملتا۔ انہوں نے دعوت دی کہ سابق جہادی ملک کو آباد کرنے کیلئے متحد ہو جائیں۔ اس لویہ جرگے کا طالبان کے ساتھ حزب نے بھی مکمل بائیکاٹ کیا اور اسے عبث قرار دیا۔ طالبان کے ترجمان کے مطابق جرگے کے شرکاء کی فہرست امریکا نے تیار کی تھی۔

بعض ذرائع ابلاغ کے مطابق صدر کرزئی نے عظیم گوریلا کمانڈر مولانا جلال الدین حقانی کے بیٹے سراج الدین حقانی سے بھی رابطے کیے تاکہ ان کو مصالحت پر آمادہ کر کے طالبان سے مذاکرات کی راہ ہموار کی جاسکے۔ جون کے اواخر میں امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے رپورٹ شائع کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ طالبان اور امریکا میں مفاہمت کے لیے پاکستان خفیہ طور پر سرگرم ہو چکا ہے اور آرمی چیف اشفاق کیانی کے علاوہ آئی ایس آئی کے سربراہ احمد شجاع پاشا بھی اس مقصد کے لیے افغانستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ امریکا دباؤ ڈال رہا ہے کہ مذاکرات میں حقانی گروپ کو شامل نہ کیا جائے کیونکہ اس کے مبینہ طور پر القاعدہ سے مستحکم تعلقات ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ حامد کرزئی نے مولانا جلال الدین حقانی کے صاحبزادے مولانا سراج حقانی سے، جن کے ماتحت تمام عرب اور غیر ملکی مجاہدین امریکا سے نبرد آزما ہیں، موسم گرما میں ملاقات کی اور انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ طالبان کو القاعدہ سے الگ کر کے غیر ملکی

مجاہدین کو اپنے وطن واپس جانے پر آمادہ کیا جائے تاکہ اتحادی افواج کے واپس جانے اور وسیع اہلیا و حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہو سکے۔ طالبان کے ترجمان ذبیح اللہ مجاہد نے کرزئی اور سراج الدین حقانی کی ملاقات کو سراہ کر جھوٹ قرار دیتے ہوئے مجاہدین کے اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش قرار دیا۔

عالمی ڈونرز کانفرنس کا بل: 20 جولائی کو کا بل میں عالمی ڈونرز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں چالیس ملکوں کے وزرائے خارجہ اور مندوبین نے شرکت کی۔ افغان صدر نے ملک میں عدم استحکام اور بدعنوانی کا ذمہ دار غیر ملکی سکیورٹی کمیٹیوں کو قرار دیا۔ شرکاء نے طالبان سے مفاہمت کی حمایت کا اعلان کیا۔ کہا گیا کہ 2014ء تک ملک کی سکیورٹی افغان فورسز کے حوالے کر دی جائے گی۔

مصالحی کونسل: 16 اپریل کو پارلیمنٹ کے ارکان کے ساتھ بند کمرے کے ایک اجلاس میں افغان صدر حامد کرزئی نے نہایت سخت لہجہ اپناتے ہوئے کہا کہ اگر امریکا اور مغربی دنیا نے افغانستان میں ناروا مداخلت ختم نہ کی تو وہ بھی سیاست چھوڑ کر طالبان کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ انہوں نے برطانیہ اور دوسرے ملکوں پر افغانستان کے صدارتی انتخابات میں گڑبڑ کرانے کے الزامات بھی عائد کیے۔ اس قسم کے بیانات پر مغربی دنیا اور امریکا میں شدید تشویش پھیل گئی۔ وائٹ ہاؤس نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے یہ بیان بازی بند نہ کی تو ان کا 12 مئی کا مجوزہ دورہ امریکا منسوخ کر دیا جائے گا۔ نیویارک ٹائمز نے 8 جون کی اشاعت میں کہا کہ کرزئی امریکا سے دور اور طالبان سے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور ایران سے بھی روابط بڑھا رہے ہیں۔

12 جولائی کو صدر کرزئی نے مطالبہ کیا کہ طالبان سے فیصلہ کن مذاکرات سے قبل دس بڑے طالبان رہنماؤں کے نام فوری طور پر اقوام متحدہ کی دہشت گردوں کی فہرست سے خارج کیے جائیں۔

مغربی میڈیا ایسی خبروں کو پورے زور و شور سے نشر کر رہا تھا، مقصد یہ تھا کہ افغانستان میں کرزئی کو ذہنی طبعے اور طالبان حامی افراد میں ایک غیور لیڈر کا مقام دلوایا جائے اور کرزئی حکومت کی طرف سے مذاکرات کا شوشہ چھوڑ کر طالبان میں پھوٹ ڈالنے کی کوششوں کو کامیاب کیا جائے۔ آپ 2009ء کے حالات میں پڑھ چکے ہیں کہ 30 اکتوبر کو ادبامہ کی خصوصی مشاورت میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ طالبان کو ختم کرنا ممکن نہیں لہذا ان کو منتشر کر کے کمزور کیا جائے۔ جنوری 2010ء کی لندن کانفرنس میں اسی منصوبے کو 70 ممالک سے قبولیت کی سند دلوائی گئی تھی، اس کے بعد 2010ء کے آخر تک اسی پلان پر عمل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً آخری چھ مہینوں میں مذاکرات کے ڈھونگ کے ذریعے یہ کوششیں انتہا پر نظر آتی ہیں۔ آئیے ان کوششوں کا مزید مطالعہ کریں۔

اکتوبر کے مہینے میں حامد کرزئی نے مقامی سرداروں اور سابق جہادیوں کی ایک مصالحتی کونسل تشکیل دے دی جس کا سربراہ سابق صدر برہان الدین ربانی کو مقرر کیا گیا۔ خبریں پھیل گئیں کہ طالبان اور کرزئی کے درمیان مقامی سرداروں کے توسط سے اور براہ راست بھی روابط میں تیزی آگئی ہے، کئی گرفتار طالبان اور جہادی رہنماؤں کو آزاد کر دیا گیا، جن میں بگرام جیل میں قید بعض اہم افراد بھی شامل تھے۔ یہ خبریں بھی نشر ہوئیں کہ امریکی حکام نے افغان حکومت سے ایسے تمام طالبان رہنماؤں کی فہرست مانگی جن کے القاعدہ سے تعلقات نہیں ہیں تاکہ انہیں اقوام متحدہ کی بلیک لسٹ سے نکالا جاسکے۔ بعض طالبان کو پاسپورٹ بھی جاری کر دیے گئے اور یہ طے کیا گیا کہ اگر طالبان رضامند ہو گئے تو توجہ کے موقع پر سعودی عرب میں شاہ عبداللہ کو ثالث بنا کر مفاہمتی عمل کا باقاعدہ آغاز کیا جائے گا مگر طالبان کی جانب سے نومبر تک محتاط رویہ اختیار برقرار رکھا گیا۔

ذرائع ابلاغ پر نشر ہونے والی 14 اکتوبر کی خبروں کے مطابق طالبان رہنماؤں کو مذاکرات کے لیے کابل تک نقل و حرکت کی اجازت بھی دے دی گئی اور نیٹو نے بعض رہنماؤں کو طیارے سے کابل پہنچایا۔ نومبر کے پہلے عشرے میں کابل میں باچا خان کی یاد میں دو روزہ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کرزئی نے کہا کہ افغانستان میں امن عمل میں پیش رفت ہو رہی ہے۔

ان خبروں میں اگر کچھ صداقت تھی تو اس حد تک کہ بعض سابق طالبان جو اس وقت ملا محمد عمر کے ماتحت نہیں ہیں، بلکہ آزادانہ حیثیت سے کام کر رہے ہیں، کرزئی انتظامیہ سے مل کر مصالحتی عمل کو آگے بڑھانا چاہ رہے تھے۔ ان میں ملا عبدالسلام ضعیف، عبدالحکیم مجاہد، وکیل احمد متوکل اور مولانا رسلان خان رحمانی جو افغان سینٹ کے رکن بھی ہیں، کے نام نمایاں تھے۔ مگر یہ سابق طالبان رہنما ملا محمد عمر کی کمان میں مسلح جہاد کرنے والے طالبان میں اب ایسا اثر درخوش نہیں رکھتے کہ انہیں کسی معاہدے پر آمادہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ طالبان ملا محمد عمری کے کہنے پر صلح کا سوچ سکتے تھے۔

طالبان کی ویب سائٹ (<http://shahamat.info>) پر ملا محمد عمر کی جانب سے اس دوران عید الفطر کے موقع پر ایک اعلان شائع ہوا جس میں طالبان کی کرزئی حکومت یا امریکا سے مذاکرات کی تمام خبروں کو مجاہدین میں انتشار پیدا کرنے کی سازش قرار دیا گیا۔ اس پیغام میں طالبان کی آئندہ حکومت کا منشور بھی پیش کیا گیا۔

چونکہ ممکنہ امریکی انخلاء کے بعد طالبان کے کسی بھی اعزاز میں حکومت میں شریک ہونے سے شالی اتحاد کو سخت تشویش تھی اس لیے اکتوبر کے وسط میں شالی اتحاد طالبان کے مقابلے میں منظم ہونے لگا۔ شالی

لیڈروں نے کرزئی کی جانب سے بعض طالبان سے مذاکرات کو خطرناک گردانا اور ایسی کوششوں کو پشتون تعصب پسندی پر مبنی قرار دیا۔

کرزئی خاندان، سرمایہ بیرون ملک منتقل: نومبر کے وسط میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ امریکا کے ممکنہ انخلاء اور طالبان کے برسرِ اقتدار آنے کے خطرات کے پیشِ نظر کرزئی خاندان نے اپنا سرمایہ بڑے پیمانے پر بیرون ملک منتقل کرنا شروع کر دیا ہے، بینک آف کابل کے صدر محمود کرزئی (برادرِ حامد کرزئی) نے بینک آف کابل سے تین سو ملین ڈالر نکال کر دہلی میں دو محل خرید لیے ہیں جس کی وجہ سے بینک کا دیوالیہ ٹکٹنے کو ہے۔ اسی طرح خاندان کے دیگر افراد بھی سرمایہ خلیجی ملکوں میں منتقل کر رہے ہیں۔

عام انتخابات: افغانستان میں 22 مئی 2010ء کو پارلیمانی انتخابات کا انعقاد ہوتا تھا مگر بدامنی کی وجہ سے جنوری ہی میں اعلان کر دیا گیا کہ انتخابات 18 ستمبر کو ہوں گے۔ 18 ستمبر کو اعلان کے مطابق پارلیمانی انتخابات تو ہوئے مگر اس میں دھاندلی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے۔ طالبان نے اس بار الیکشن میں رکاوٹ ڈالنے کی معمولی کوشش بھی نہ کی۔ پھر بھی عوام کی بہت کم تعداد نے انتخابات میں حصہ لیا، خصوصاً پشتون علاقوں میں ٹرن آؤٹ بہت کم رہا۔ غیر معمولی دھاندلی اور پشتونوں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے ازبک، تاجک اور ہزارہ الیکشن میں چھائے رہے۔ بعد میں بہت سے حکومتی ارکان، سرکاری افسران اور غیر ملکی مبصرین نے دھاندلی کا اعتراف بھی کیا اور دھاندلی کے خلاف کابل میں مظاہرہ بھی ہوا مگر جو ہوتا تھا وہ ہو چکا تھا۔

23 نومبر پارلیمانی انتخابات کے نتائج جاری ہو گئے جن کے مطابق افغانستان کی تاریخ میں پہلی بار پختونوں کو 249 میں سے صرف 100 نشستیں مل سکیں، ازبک، تاجک اور ہزارہ اقلیتیں جیت گئیں۔ پاکستان اور بھارت کی افغانستان میں کش مکش: پاکستان اور بھارت میں افغانستان کے حوالے سے کشمکش جاری رہی، 3 مارچ کو بھارتی حکومت نے افغانستان میں مزید فوج تعینات کرنے کا اعلان کر دیا جس کی افغان صدر سے منظوری بھی لے لی گئی۔ اس کے تیسرے دن 6 مارچ کو پاکستانی آرمی چیف اشفاق کیانی ہنگامی دورے پر کابل گئے اور صدر حامد کرزئی سے ملے اور اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ 10 مارچ کو افغان صدر کرزئی پاکستان کے دورے پر آئے اور صدر زرداری، وزیراعظم گیلانی اور چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اشفاق کیانی سے ملے۔ ملاقات میں پاک افغان جرگے کی تجویز سے اتفاق کیا گیا۔ حامد کرزئی نے یقین دلایا کہ پاکستان کے خلاف اپنی زمین استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ افغان صدر نے ملا برادر کی حوالگی کا مطالبہ بھی کیا جسے پاکستانی حکومت نے مسترد کر دیا۔

26 اپریل کو صدر کرزئی نے بھارت کا دورہ کیا اور بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کو افغانستان میں

بھارتیوں کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی۔ بھارتی وزیراعظم نے کہا کہ کابل دھماکوں کے بعد میں بھارتیوں کی سیکورٹی کے حوالے سے تشویش تھی مگر کرنزی کی یقین دہانی کے بعد ہم اپنے منصوبے مکمل کریں گے اور افغانستان کی تعمیر و ترقی کے لیے کرنزی حکومت سے تعاون جاری رہے گا۔ بھارت کی کوشش تھی کہ افغان فورسز کو بھارت میں تربیت دلانے کا معاہدہ بھی کر لے مگر اس معاملے میں پاکستان آگے نکل گیا اور جنرل اشفاق کیانی نے جولائی میں کرنزی سے افغان افسران کی پاکستان میں تربیت کی منظوری لے لی۔

18 جولائی کو پاکستان نے افغانستان کو بھارت تک تجارتی راہداری کی منظوری دے دی۔ پاک افغان وزرائے تجارت امین خیم اور انوار الحق نے امریکی وزیر خارجہ ہیری کلنٹن کی موجودگی میں اس معاہدے پر دستخط کیے کہ افغانستان کو سمندر تک راستہ دیا جائے گا اور وہ واگہہ بارڈر کے ذریعے بھارت تک سامان لے جاسکے گا، بھارت کو افغانستان ایکسپورٹ کی اجازت نہیں ہوگی، بدلے میں پاکستان کو وسط ایشیا تک رسائی ملے گی۔ بمصرین کے مطابق یہ معاہدہ امریکا کے دباؤ پر ہوا جس کے لیے ہیری کلنٹن نے بذات خود مداخلت کی تھی، تاہم پاکستانی ٹرانسپورٹرز نے افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے معاہدے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس کی آڑ میں بھارتی تاجر ملک پر چھا جائیں گے۔

26 اگست کو حامد کرنزی نے یکدم موڈ بدل کر یہ بیان داغا کہ امریکا پاکستان میں طالبان کے ٹھکانوں کو نشانہ بنائے، سرحد پار پناہ گاہیں ختم کیے بغیر کامیابی نہیں ملے گی۔

28 اگست کو ذرائع ابلاغ پر خبر آئی کہ افغانستان سے 100 پاکستانی قیدی بھارتی جیلوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں، جب کہ پہلے ہی 1300 قیدی منتقل کیے جا چکے ہیں۔ انہیں برین واشنگ کے بعد استعمال کرنے کا منصوبہ طے ہے۔

5 ستمبر کو صدر کرنزی پاکستان آئے اور صدر زرداری سے مل کر پاکستان میں طالبان کے ٹھکانوں کے خلاف مشترکہ کارروائی کا مطالبہ کیا۔ تاہم فوجی قیادت نے کرنزی کے الزامات مسترد کر دیے اور کہا کہ عسکریت پسندوں کے ٹھکانے افغانستان میں ہیں۔

4 دسمبر کو پاکستانی وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کابل کے دورے پر گئے اور اگلے دن کرنزی سے ملاقات کی جس کے بعد ایک مشترکہ اعلامیے میں کہا گیا کہ پاکستان افغان حکومت اور عسکریت پسندوں کے مابین مفاہمت کی حمایت کرتا ہے، اس عمل کا آغاز افغان حکومت کی طرف سے ہوگا اور یہ افغانوں کی اپنی کوشش ہوگی۔

11 دسمبر کو پاکستان، افغانستان اور ترکمانستان کے صدور اور بھارتی وزیر پٹرولیم نے اٹک آباد میں

ساڑھے سات ارب ڈالر کے چار ملکی گیس لائن منصوبے پر دستخط کر دیے۔

پاکستان اور امریکا: اس سال پاکستان اور امریکا کے درمیان بھی دہشت گردی، افغانستان اور طالبان کے حوالے سے کشمکش جاری رہی۔ امریکا ”ڈومور“ کی صدا میں لگا تار رہا۔

7 اپریل 2010ء کو پاکستانی صدر آصف علی زرداری نے مطالبہ کیا کہ امریکا اپنی کارروائیاں افغانستان تک محدود رکھے اور ڈرون ٹیکنالوجی ہمیں دے۔ 21 جنوری 2010ء کو پاک فوج کے ترجمان میجر اطہر عباس نے پاک فوج کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ایک سال تک مزید کوئی نیا محاذ نہیں کھولا جائے گا، جن علاقوں کا کنٹرول حاصل کر لیا ہے وہاں قبضہ مستحکم بنایا جائے گا۔ انہوں نے یہ بیان ایسے وقت جاری کیا جبکہ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس پاکستان کو طالبان کے خلاف کارروائیاں بڑھانے پر آمادہ کرنے کے لیے اسلام آباد آئے ہوئے تھے۔

مارچ کے آغاز میں امریکی فوج نے پہلی بار پاکستان سے متصل افغان سرحد کا کنٹرول سنبھال لیا اور پاک سرحد سے پانچ کلومیٹر دور تین نئے بیس کیمپ قائم کر لیے۔

8 جون کو اسلام آباد کے قریب ترنول کے مقام پر نیٹو رسد کے ٹرینٹل پر حملہ ہوا جس میں چالیس کنٹینر جل گئے اور 7 افراد مارے گئے۔

13 جون کو پاک فوج کے ترجمان میجر اطہر عباس نے مغربی میڈیا پر آنے والی لندن اسکول آف اکنامکس کی اس رپورٹ کی تردید کی جس میں پاک فوج اور آئی ایس آئی پر طالبان کی پشت پناہی جاری رکھنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ افغان طالبان نے بھی لندن اسکول آف اکنامکس کی رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہماری تحریک افغانستان سے ابھری ہے، ہمیں بیرونی مدد درکار نہیں۔

جولائی کے اواخر میں امریکی وزیر خارجہ ہیری کلنٹن نے ایک بار پھر اس الزام کا اعادہ کیا کہ اسامہ بن لادن اور ملا عمر پاکستان میں ہیں، وزیراعظم پاکستان نے جواباً ثبوت کا مطالبہ کر دیا۔ یکم ستمبر امریکی حکومت نے تحریک طالبان پاکستان کو دہشت گرد تنظیم قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ گزشتہ سال دسمبر میں خوست کے سی آئی اے اڈے پر خودکش حملے کے ذریعے سات افسران کی ہلاکت کا منصوبہ حکیم اللہ محموند نے مرتب کیا تھا۔ نیٹو کی رسد بند: 30 ستمبر کو نیٹو کے ایک حملے میں پاکستان کے تین ایف سی ایلکار نشانہ بن گئے جس پر پاکستان نے رسد روک کر فضا سے کوارٹر کر دیا۔

یکم اکتوبر کو پاکستان نے نیٹو سے معافی کا مطالبہ کر دیا۔ طورخم سرحد پر کنٹینروں کی لائن لگ گئی۔ پاک افغان مسائل کے امریکی سفیر رچرڈ ہالبروک نے نیٹو کی رسد بند کرنے پر سنگین نتائج کی دھمکی دے دی۔

13 اکتوبر کو اسلام آباد میں بارہ افراد نے نیٹو ٹینکروں پر حملہ کر کے 28 کو تباہ کر دیا، 16 افراد ہلاک ہو گئے۔ نیٹو حکام شروع میں کہہ رہے تھے کہ پاکستان کے رسد بند کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہمارے پاس متبادل راستے ہیں مگر جلد ہی انہیں دن میں تارے دکھائی دے گئے اور آخر کار نیٹو سربراہ جنرل راس مومن نے خود پاکستان سے معافی مانگی، تاہم طورخم بارڈر سے رسد بدستور بند رہی بلکہ 5 اکتوبر کو چین سرحد بھی بند کر دی گئی۔ تب امریکی سفیر نے بھی معذرت چاہی۔ 16 اکتوبر کو نیٹو رسد پر دو بڑے حملے ہوئے، ایک نوشہرہ میں جی ٹی روڈ پر ہوا جس میں 45 کنٹینر تباہ ہو گئے، دوسرا کوئٹہ میں ہوا جس میں 40 کنٹینر ضائع ہوئے۔ ادھر جنرل پیئر یاس نے بھی معافی مانگ کر رسد کھولنے کی درخواست کی۔ پھر 17 اکتوبر کو امریکی مسلح افواج کے سربراہ مائیک مولن نے کیانی سے خط میں اظہارِ انفسوس کیا۔ رسد پھر بھی بدستور بند رہی اور طورخم کے راستے ساڑھے چھ ہزار کنٹینر راستہ کھلنے کے منتظر رہے۔

واضح رہے کہ صرف یکم جنوری 2008ء سے 30 جون 2010ء تک اڑھائی سال میں پاکستان کے راستے نیٹو کے 24 ہزار 215 کنٹینر افغانستان جا چکے ہیں۔

9 اکتوبر کو حکومت پاکستان نے معافی قبول کر کے رسد بحال کی۔ رسد بند ہونے کے دنوں میں 150 ٹینکر جلے اور درجنوں لوٹے گئے۔ نیٹو کے جاسوسی کے آلات، جدید ترین وائرلیس سسٹم، تاریکی کے چشمے، خطرناک گولہ بارود اور ہتھیار ملک بھر کی باڑہ مارکیٹوں میں فراہم ہونے لگے جس پر پاکستانی حکام کو کڑیک ڈاؤن کی مہم شروع کرنا پڑی۔

10 اکتوبر کو نیٹو نے پاک سرحد پر فوج بڑھادی۔ خواست، پکیتیا، اسپین بولدک میں اضافی دستے لگا دیے۔ اس کے ساتھ امریکا نے ایک بار پھر شمالی وزیرستان میں آپریشن کا مطالبہ بڑھادیا۔ 13 اکتوبر کو امریکی فوجی سربراہ مائیک مولن نے اعلان کیا کہ شمالی وزیرستان دہشت گردی کا مرکز ہے۔ اسامہ اور القاعدہ کا مرکز یہیں ہے۔ شمالی وزیرستان میں پورے سال ڈورن حملے جاری رہے اور سینکڑوں افراد نشانہ بن کر شہید ہوئے۔

15 دسمبر کو امریکا کی سولہ مشلی جنس کیٹیوں نے ایک مشترکہ رپورٹ میں افغان جنگ کی ناکامی کی ذمہ داری پاکستان پر عائد کرتے ہوئے کہا کہ اسلام آباد طالبان کی حمایت ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے، اور پاکستان کے بغیر افغان جنگ نہیں جیت جاسکتی۔

پاکستان سے طالبان لیڈروں کی گرفتاریاں: 2010ء میں طالبان کو کئی بڑے رہنماؤں کی گرفتاریوں کے صدمے برداشت کرنا پڑے۔ فروری کے اوائل ہی میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر کے نائب

اور دست راست ملا عبدالغنی برادر کوئی آئی اے نے پاکستانی ایجنسیوں کے ساتھ مشترکہ آپریشن میں کراچی سے گرفتار کر لیا، جس کے بعد انہیں نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ بعض مبصرین کا کہنا ہے کہ ملا برادر طالبان اور امریکا کے درمیان ممکنہ مذاکرات میں کوئی خاص کردار ادا کرنے جا رہے تھے مگر ان کی گرفتاری سے یہ امکان ختم ہو گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کو مذاکراتی عمل میں شریک کرنے کے حوالے سے ملا محمد عمر سے الگ رائے رکھتے تھے اور برادر راست امریکی حکام سے مذاکرات کرنا چاہتے تھے۔ پاکستانی میڈیا ایران کی گرفتاری کی خبر 16 فروری کو نشر ہوئی۔ امریکی ترجمان نے اسے افغان جنگ کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیا۔

سی آئی اے ملا برادر کو تفتیش کے لیے بگرام ایئر بیس لے جانا چاہتی تھی مگر پاکستانی ایجنسیوں نے انہیں اپنی تحویل میں رکھا۔ حکومت پاکستان کو انہیں امریکا کے حوالے کرنے کے بارے میں تحفظات لاحق تھے۔ پاکستان کے وزیر داخلہ عبدالرحمن ملک نے پہلے بیان دیا کہ ملا برادر سمیت کوئی بھی جنگجو امریکا کے حوالے نہیں کریں گے، ان پر مقدمہ پاکستانی عدالت میں چلے گا۔ مگر بعد میں کہا کہ اگر امریکا نے ملا برادر کو حوالے کرنے کی درخواست کی تو ہم غور کریں گے۔ 26 فروری کو لاہور ہائی کورٹ نے ملا برادر سمیت پانچ گرفتار طالبان رہنماؤں کی بیرون ملک حوالگی پر پابندی عائد کر دی۔ 16 مارچ کو پاکستانی وزیر دفاع احمد مختار نے اعلان کیا کہ ملا برادر پر پاکستان میں بغیر پاسپورٹ داخلے کا مقدمہ چلا جائیگا۔

4 مارچ کو طالبان کے ایک اور اہم ترین کمانڈر مختتم آغا کو کراچی کے علاقے احسن آباد سے گرفتار کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ملا محمد عمر کے داماد ہیں اور طالبان دور میں وزیر خزانہ اور شوروی کے رئیس بھی رہے تھے۔ اس دوران افغانستان میں ملا برادر کی جگہ پہلے ملا عبدالقیوم کو طالبان سربراہ کا نائب مقرر کیا گیا۔ مگر وہ ہفتوں بعد اعلان کیا گیا کہ عبدالرزاق خادم ملا آخر منصور نائب ہوں گے۔

7 مارچ کو القاعدہ کے ایک اہم امریکی خزانہ کمانڈر آدم ندان کو کراچی ہی میں سپرہائی وے کے قریب ایک عمارت سے گرفتار کیا گیا۔

24 مارچ کو کراچی کے علاقے نوری آباد سے ملا محمد عمر کے ایک اور قریبی ساتھی عبدالحی مالک اور القاعدہ کے ایک رہنما کی عزت کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کامیابیوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے امریکی قیادت نے اپنی افواج کے گرتے ہوئے حوصلے بلند کرنے کی پوری کوشش کی۔

روس اور امریکا کے تعلقات: 7 اپریل کو کرغیزستان میں خونریز انقلاب آ گیا، دارالحکومت میں جھڑپوں سے چار سو افراد زخمی ہوئے۔ صدر مملکت قربان بیگ کو فرار ہونا پڑا اور وہاں امریکا کی حمایت یافتہ حکومت کی جگہ دس نواز انقلابیوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ اس انقلاب سے کرغیزستان کے راستے

افغانستان کو امریکی رسد کی سپلائی بھی خطرے میں پڑ گئی۔ بعد میں امریکا نے اس خطرے کے مدارک کے لیے روس سے قریبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ ان تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانستان میں بھی دونوں ممالک نے منشیات کے خلاف مشترکہ آپریشن پر اتفاق کر لیا جس کے بعد اکتوبر کے اواخر میں ننگر ہار میں دونوں ملکوں کے ستر افراد پر مشتمل ٹیم نے ہیلی کاپٹروں کی مدد سے منشیات کے اسمگلروں کے خلاف کارروائیاں کیں۔ روس و امریکا کے اس مشترکہ آپریشن کے نیٹو پر کرنئی نے احتجاج کرتے ہوئے اسے خود مختاری کے خلاف قرار دیا۔

جب نومبر میں نیٹو کا اجلاس ہوا تو روس کو نیٹو کا ممبر نہ ہونے کے باوجود اس میں شریک کیا گیا۔ 2010ء کی متفرق خبریں: اس سال پاکستان میں یکم جنوری کو لگی مروت میں بہت بڑا خودکش دھماکہ ہوا جس کے بعد خودکش دھماکے مسلسل جاری ہے۔ سال بھر میں مجموعی طور پر 33 خودکش حملے ہوئے جن میں 738 افراد قتل ہوئے۔

مارچ کے اوائل میں دو ستم کی نجی جیل اور کابل کی سرکاری جیل میں طبی سہولیات نہ ملنے کی وجہ سے 22 پاکستانیوں کی ہلاکت کی خبر آئی۔ یہ پاکستانی مولانا صوفی محمد کے ہمراہ اکتوبر 2001ء میں افغانستان گئے تھے۔

31 مارچ کو پاکستان میں ایک آئینی مسودے پر دستخط کر دیے گئے جس کے تحت صوبہ سرحد کا نیا نام ”خیبر پختون خواہ“ رکھ دیا گیا۔

30 اپریل کو آئی ایس آئی کے سابق افسر خالد خواجہ کو شمالی افغانستان میں قتل کر دیا گیا۔ وہ امن پروگرام کے لیے وہاں گئے تھے اور کئی روز قتل اغوا کر لیے تھے۔ پاکستانی طالبان کی تنظیم انشیں ٹائیگر نے انہیں امریکا کے لیے جاسوسی اور لال مسجد آپریشن میں مدد کے الزام قتل کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی۔

14، 15 جون کو عالمی ذرائع ابلاغ پر نشر ہونے والی خبروں میں بتایا گیا کہ افغانستان میں 9 کھرب ڈالر کی معدنیات کے ذخائر دریافت کر لیے گئے ہیں، امریکا نے سوویت یونین کے تیار کردہ نقشوں کی مدد سے وہاں سونے، چاندی اور تانبے کے علاوہ تھیم جیسی نایاب دھات کا سراغ لگایا ہے۔ اس مہم میں بینا گون، امریکی جیالوجیکل سروے اور یو ایس ایڈ کے اہلکاروں پر مشتمل ٹیم نے کام کیا ہے۔

10 جولائی کو پکتیا میں پاکستانی بس پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی جس سے 13 مسافر جاں بحق ہو گئے۔ مسافروں کا تعلق کرم ایجنسی سے تھا جو پارہ چنار، گردیز اور جلال آباد کے راستے پشاور جا رہے تھے۔

23 ستمبر امریکی عدالت نے انصاف کا خون کرتے ہوئے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو 86 برس قید کی سزا

سادہ۔ ڈاکٹر عافیہ 1972ء میں پیدا ہوئیں، 1990ء میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا گئیں، بیاجوسی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے تعلیم حاصل کی، 1995ء میں ان کی شادی امجد خان سے ہوئی، جس سے تین بچے مریم، احمد اور سلمان ہوئے۔ 21 اکتوبر 2002ء کو طلاق ہو گئی جس کے بعد وہ کراچی آ گئیں۔ 25 مارچ 2003ء کو انہیں کراچی ایرپورٹ جاتے ہوئے گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا۔ 2008ء میں مگرام ایر بیس کے امریکی مقبوت خانے میں ان کے قید ہونے کا انکشاف ہوا جس پر پاکستانی صحافیوں اور عوام نے احتجاج شروع کیا تو انہیں امریکا پہنچا دیا گیا، ان پر امریکی اہلکاروں پر فائرنگ کے سلسلے میں سات سراسر جھوٹے الزامات عائد کیے گئے، جن کی بنیاد پر عدالت نے کوئی ثبوت دیکھے بغیر انہیں ایسی بے رحمانہ سزائیں جس سے ہر پاکستانی کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ حکومت پاکستان نے عوامی دباؤ کے جواب میں طفل تسلیاں تو دیں مگر عملی طور پر ڈاکٹر عافیہ کی رہائی کے لیے کچھ نہ کیا۔

18 اکتوبر کو تخار کی ایک مسجد میں بم دھماکے سے گورنر قندوز سمیت 20 افراد جاں بحق ہو گئے۔

27 اکتوبر کو روس کے سابق صدر میخائل گورباچوف نے کہا کہ افغانستان میں جنگ جیتنا ناممکن ہے۔ امریکا کے لیے وہاں سے فوج واپس بلانے کے سوا کوئی راستہ نہیں، او با ما کا انخلاء کا فیصلہ درست ہے، اگر فوج واپس نہ بلائی گئی تو افغانستان دوسراویت نام ثابت ہوگا۔

پاکستانی ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر شرمبارک کے مطابق شمالی وزیرستان میں جہاں امریکا پاکستانی فورسز کے ساتھ مل کر طالبان کے مبینہ ٹھکانوں کے خلاف آپریشن کے لیے فوج متعین کر چکا ہے، 273 ارب ڈالر کے سونے اور تانبے کے ذخائر موجود ہیں۔ (ڈان 4 دسمبر 2010ء)

وکی لیکس کے انکشافات: اکتوبر کے مہینے میں مشہور ویب سائٹ وکی لیکس سے ڈھائی لاکھ خفیہ صفحات کے انکشافات شروع کر دیے گئے۔ افغانستان کے خطے سے متعلق چند انکشافات یہ ہیں:

گوانتانامو بے کے قیدیوں کے معاملے میں کویتی وزیر داخلہ نے امریکی سفیر کو مشورہ دیا کہ قیدیوں کو افغانستان لا کر میدان جنگ میں ہلاک کر دیا جائے۔ یہی صدر نے یہ بھی پوچھا کہ قیدیوں کے بدلے میں ہمیں کتنے ڈالر ملیں گے۔

..... امریکا نے افغانستان میں برطانوی فوج کو ناکارہ قرار دیا۔ افغان صدر کا بھی یہی موقف ہے۔

..... کرزئی نے اعتراف کیا کہ آئی ایس آئی طالبان کی مدد نہیں کر رہی۔

..... رچرڈ ہاروک کے خیال میں پاکستانی عوام طالبان سے زیادہ کرپٹ رہنماؤں سے تنگ ہیں۔

..... آسٹریلیا کے سابق وزیر اعظم کیون روڈ افغان جنگ سے بہت خوفزدہ اور نتائج سے مایوس تھے۔

..... بھارت نے امریکا پر واضح کر دیا ہے کہ اس کے افغانستان میں اسٹریٹجک مفادات ہیں اس لیے وہ اس ملک سے نہیں نکلے گا۔

..... حامد کرزئی نے کہا کہ پاکستان کو بار بار یہ ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کہ وہ عظیم اسلامی امارت بننے کا خواب دیکھنا چھوڑ دے۔

..... افغان صدر کے حکم پر اتحادی فورسز کے گرفتار کردہ کئی خطرناک مجرم اور منشیات کے اسمگلر ہا کر دیے گئے جس پر امریکی حکام نے کرزئی کو سرزنش کی۔

وکی لیکس کے انکشافات سے کئی ممالک کے باہمی تعلقات خطرے میں پڑ گئے، خصوصاً امریکا کا اصل چہرہ بالکل بے نقاب ہو گیا۔ تاہم رچرڈ ہالبروک نے کہا کہ وکی لیکس پاک امریکا تعلقات کے درمیان ایک حادثہ ہے، ہم جلد اس کے اثرات سے نکل جائیں گے۔

ملا محمد عمر کا پیغام 2 دسمبر 2010ء کے وسط میں طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا مقامی اخبار کے نام ایک خط آیا جس کے مندرجات کا خلاصہ یہ ہے:

”امریکا افغانستان میں آئے روز جانی نقصانات اٹھا رہا ہے، وہ ہر جگہ محاصرے اور پسپائی کی حالت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آئے روز مذاکرات اور اسن کی باتیں کر رہا ہے۔ کرزئی حکومت کی موجودگی میں عوام کی حالت خراب تر ہوتی جا رہی ہے اور ان کی مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بھوک، فقر و فاقہ اور گھریا رکاز نہ ہونا عام ہے۔ مختلف قسم کے امراض پھیل رہے ہیں اور عوام کی ہلاکتیں ہو رہی ہیں۔ جمہوریت کے نام پر اجتماعی ثقافتی انحراف آسمان سے باتیں کر رہا ہے۔ ملک میں اوپن مارکیٹ نظام کے تحت اشیائے خورد و نوش سمیت تمام اجناس اعلیٰ حکومتی عہدے داروں کے ہاتھ لگ چکی ہیں جو ان کی من مانی قیمت مقرر کرتے ہیں۔ افغانستان کے لاجار خاندان بھیک مانگنے اور گداگری پر مجبور ہیں۔ کرپشن اپنی آخری حدود کو چھو رہی ہے جس کا اعتراف خود کرزئی کے آقا کر رہے ہیں اور وہ یہ مانتے ہیں کہ کرزئی حکومت کرپشن اور بدزدانی میں دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔ افغان حکمران عوام کو لوٹنے اور اپنی جیبوں کو بھرنے کے سوا کوئی کام نہیں کر رہے۔ حکمرانوں کے پاس مغربی ممالک کا شہریت ہے اس لیے انہیں مقامی لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ وہ افغانستان کو اپنا ملک نہیں سمجھتے۔ امریکی چاہتے ہیں کہ افغانوں کو استعمال کر کے چند زر خرید اینجنیئروں کو برقرار رکھا جائے۔ لرزئی حکومت آخری حد تک کٹ پتلی، بے اختیار اور امریکا کے تعاون سے برقرار ہے، امریکا اس حکومت کے ذریعے

خطے میں اپنے قیام کی راہ ہموار کرنا اور اپنے قبضے کو مزید طول دینا چاہتا ہے۔ ایسی فاسد اور جفا کار کھپتلی حکومت کے ساتھ کام کرنے کا کوئی اخلاقی اور دینی جواز نہیں۔ امریکا ایک طرف تو اپنی فوجی کارروائیوں کو وسعت دے رہا ہے اور دوسری طرف مذاکرات کے بے بنیاد اور کھوکھلے نعروں کے ذریعے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ افغان عوام اور عالمی برادری کو امرات اسلامیہ کی قیادت کے متعین تر جہانوں کے سوا کسی قسم کی خبروں، دعووں اور نعروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ خادم اسلام، امیر المؤمنین، ملا محمد عمر مجاہد“

دوسرے اواخر میں طالبان سربراہ کا ایک اور پیغام منظر عام پر آیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

”امریکا اور اتحادیوں کو افغانستان میں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چرچہ ہائبروک کی موت اور میک کرشل سمیت اہم امریکی زعماء کے استغنے اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ موسم گرما میں ہم افغانستان کو نیٹو کے لیے گرما دیں گے اور دنیا نیٹو کی بدترین شکست کے حوالے سے خبریں سنے گی۔ امریکا مختلف حیلے بہانے اختیار کر کے افغانستان سے انخلاء کے لیے پرتول رہا ہے مگر وہ جاتے جاتے بھی اپنے مفادات کے لیے افغانستان کے زخمی عوام کو مزید زخم لگانا چاہتا ہے۔ افغانستان کی جان چھوڑ دے اور جلد از جلد نکل جائے۔ اگر اس نے اپنی پالیسیاں تبدیل نہ کیں تو افغانستان روس کی طرح ایک بار پھر امریکا کا بھی قبرستان ثابت ہوگی۔“



مآخذ و مراجع

- ❦ ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 14
- ❦ ہفت روزہ بکیر، فراہمے اپٹیل، غازی: جلد 2010ء
- ❦ قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جرناک 2010ء
- ❦ طالبان کی ویب سائٹ (<http://shahamat.info>)
- ❦ روزنامہ اسلام کراچی 2010ء
- ❦ ذاتی یادداشتیں
- ❦ زبانی روایات

بیالیسواں باب

2011ء میں

طالبان کی کارروائیاں: 2011ء میں طالبان کی کارروائیاں عروج پر رہیں۔ جنرل پیٹریاس نے اعتراف کیا کہ طالبان کے حملے 75 فیصد بڑھ گئے ہیں۔ امریکی حکام نے افغانستان کے 80 فی صد رقبے پر طالبان کے کنٹرول کا اقرار بھی کیا۔ طالبان کی کارروائیوں اور امریکا کی پسپائیوں کی ایک جھلک یہ ہے:

♣ 7 مارچ کو امریکا نے کنز میں نو برس سے قائم اپنا ڈاڈا خالی کر دیا۔ امریکی کمان نے اس موقع پر مشرقی افغانستان میں اپنی ناکامی کا اقرار کیا۔

♣ 25 اپریل کو طالبان نے سرنگ کے ذریعے قندھار جیل سے 375 قیدی آزاد کر لیے جن میں چار صوبائی سطح کے رہنما اور درجنوں کمانڈر شامل تھے۔ طالبان نے پانچ ماہ میں 320 میٹر طویل سرنگ کھودی تھی، بیرکوں کی چابیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ اس کارروائی سے کرنزی حکومت اور امریکا ششدر رہ گئے۔ سرنگ کے ذریعے قید سے کامیاب فرار کا یہ ایک انوکھا اور تاریخی واقعہ تھا۔

♣ 30 اپریل..... موسم بہار شروع ہوتے ہی طالبان نے آپریشن الہدرا کا اعلان کر دیا۔ عوام کو سرکاری اداروں، فوجی قاتلوں اور فوجی اڈوں سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی۔

♣ 19 مئی..... پکتیکا میں تعمیراتی کمپنی پر طالبان کے حملے میں 36 افراد ہلاک ہو گئے۔

♣ 26 مئی..... پکتیکا میں فرانسیسی ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا۔

♣ 28 مئی..... طالقان کے گورنر ہاؤس میں نیٹو کے جرمن کمانڈر جنرل مارکس نائپ کی میننگ میں ایک حملہ آور گھس گیا، اس نے اعادہ ہند فائرنگ کے بعد فدائی حملہ کر دیا۔ تین جرمن فوجی اور مقامی پولیس چیف جنرل داؤد داؤدی ہلاک ہو گئے جبکہ جرمن کمانڈر زخمی ہو گیا۔

♣ 30 مئی..... ہرات میں طالبان نے اٹلی کے فوجی اڈے پر بارود سے بھری گاڑی سے حملہ کیا۔ 5 اطالوی فوجی ہلاک اور 30 زخمی ہو گئے۔

- ❖ 13 جون..... وردک میں طالبان نے 38 نیوٹیکر نڈرائٹس کر ڈالے۔
- ❖ 28 جون..... کابل میں انٹرکانٹینٹل فائیو اسٹار ہوٹل پر چھ بمبار طالبان نے فدائی حملہ کیا، اس وقت وہاں صوبائی گورنروں کا اجلاس جاری تھا۔ حملے میں 11 افراد مارے گئے۔
- ❖ 13 جولائی..... کاپیسامیں فرانسیسی قافلے پر حملے میں 5 فرنچ سپاہی ہلاک ہو گئے۔
- ❖ 7 اگست..... وردک میں امریکی چنیوک ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں سوار 38 امریکی سپاہی موت کے گھاٹ اتر گئے، ان میں ایبٹ آباد آپریشن میں حصہ لینے والے ”سیل ٹیم 6“ کے 25 ارکان بھی شامل تھے۔
- ❖ 8 اگست..... زرمست (پکتیا) میں ایک امریکن ہیلی کاپٹر تباہ۔ 33 امریکی ہلاک۔
- ❖ 11 ستمبر..... نائن الیون کے دس سال مکمل ہونے پر وردک میں طالبان کا ٹرک فدائی حملہ ہوا، جس میں دس امریکیوں سمیت 67 افراد مارے گئے۔
- ❖ 7 اکتوبر۔ افغان جنگ کے دس سال پورے ہونے پر طالبان نے چار امریکی اڈوں پر دھواں بول دیا۔ متعدد ہلاک و زخمی۔
- ❖ 29 اکتوبر..... طالبان نے کابل کے انتہائی محفوظ گوشے دارالامان میں گھس کر پانچ امریکی فوجیوں اور پندرہ سی آئی اے اہلکاروں کو اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ فوجی بس سے اڑے کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔
- ❖ 21 دسمبر..... غزنی میں نیٹو کے گشتی دستے پر حملہ۔ 5 پولش فوجی ہلاک۔ پولینڈ کا یہ افغانستان میں سب سے بڑا نقصان تھا۔
- ❖ اس سال طالبان نے کابل کے اندر گھس کر خصوصی اہداف کو نشانہ بنا کے اپنی دھاک قائم کر دی۔ ستمبر کے اوائل میں چھہ فدائی طالبان نے جو ہلکی مشین گنوں، راکٹ لانچروں، دتی بموں اور خودکش جیکٹوں سے مسلح تھے، کابل کے برطانوی سفارت خانے میں گھس کر افغان محافظوں کو بے بس کر دیا، اور سفارت خانے پر قابض ہو گئے، اتحادی فوج نے جن میں نیوزی لینڈ کے سپاہی بھی شامل ہو گئے تھے، ان پر جوابی حملہ کیا۔ اس دوران فداہیوں ایک اونچی عمارت پر قابض ہو کر سامنے دکھائی دینے والی امریکی سفارت خانے کی عمارت کو بے دریغ راکٹوں کا نشانہ بنایا اور سات گھنٹے تک مزاحمت کرتے ہوئے متعدد اتحادیوں کو مار گرایا۔ گولہ بارد کی اس بارش میں سفارت خانہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ فدائی حملہ آور شہید ہو گئے جبکہ دیگر 21 افراد ہلاک اور 19 سے زائد زخمی ہوئے۔

اس سال طالبان نے امریکی ایجنٹوں اور حامد کرزئی کے ساتھیوں کو خصوصی طور پر نشانہ بنایا۔ طالبان کے خلاف آپریشن میں برطانوی فوج کا ساتھ دینے کے مرتکب، بلمند کے سابق گورنر جان محمد کو، جولائی کی ایک شام گھر میں مہمانوں کے ساتھ کھانے کے دسترخوان پر قتل کر دیا گیا۔ ساتھ ہی پارلیمنٹ کا رکن، ہاشم پال بھی مارا گیا۔ قندھار کے میئر ایک فدائی حملے میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور قندھار کے ڈائریکٹر جرح واد قاف کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔

اسامہ بن لادن کی شہادت: 2011ء کی سب سے بڑی خبر اور سب سے المناک واقعہ شیخ اسامہ بن لادن کی شہادت تھا۔ یہ ایسی خبر تھی جسے پوری دنیا میں مسلمانوں نے نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ سنا۔ اسامہ کے خلاف کس طرح کارروائی عمل میں لائی گئی، یہ ایک طویل داستان ہے۔ 2010ء اور 2011ء کے اوائل میں ایسا لگتا تھا کہ اسامہ کا مسئلہ امریکا کے لیے اہم نہیں رہا ہے مگر درحقیقت امریکی سی آئی اے اور اس کے ایجنٹ افغانستان اور پاکستان میں اس مقصد کے لیے پوری طرح فعال تھے اور شکاری کتوں کی طرح اپنے ہدف کی ہوسو گھر رہے تھے۔ سی آئی اے پوری دنیا میں اپنا سب سے بڑا نیٹ ورک پاکستان میں قائم کر چکی تھی اور پاکستان میں سی آئی اے کا چیف ریمنڈ ڈیوس جس کا اصل نام مائیکل جارج فرنانڈس تھا انتہائی مشکوک سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ اس کے جنوبی وزیرستان میں بکثرت رابطے تھے۔ وہ متعدد دینی مدارس کا دورہ کر چکا تھا۔ کئی بار اسے ممنوعہ فوجی علاقوں کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ پاکستانی انٹیلی جنس اس پر نظر رکھے ہوئے تھیں مگر اس پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں تھا۔

ادھر سی آئی اے کو کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اسامہ بن لادن سے رابطے میں ہوتا کہ اس کے ذریعے اپنے ہدف تک پہنچا جاسکے۔ ایسا شخص انہیں ابو احمد الکویت کی شکل میں مل گیا تھا جو اسامہ بن لادن کا مستند ساتھی تھا، یہ اصل میں ایک پاکستانی نوجوان تھا۔ اس کا اصل نام ارشد خان تھا۔ سی آئی اے کے ایجنٹ غیر محسوس انداز میں اس کے پیچھے لگے رہے۔ کڑیوں سے کڑیاں ملانے کے بعد آخر کار انہیں پختہ ٹنک ہو گیا کہ اسامہ بن لادن یا القاعدہ کی کوئی اور ہم شخصیت ایبٹ آباد کے علاقے بلال ٹاؤن کی ایک غیر معمولی طور پر مستحکم عمارت میں رہائش پذیر ہے۔ یہ عمارت ارشد خان ہی کی ملکیت تھی۔ کاکول ملٹری اکیڈمی سے صرف نصف کلومیٹر دور واقع اس عمارت کے گرد اٹھارہ فٹ بلند چہار دیواری اور اس کے حفاظتی انتظامات کسی بھی آدمی کو خشک میں ڈال سکتے تھے..... مگر عمارت کے مالکان نے مشہور کر رکھا تھا کہ ان کی کچھ لوگوں سے دشمنیاں ہیں جن سے حفاظت کے لیے عمارت اتنی مضبوط بنوائی گئی ہے۔

سی آئی اے نے اس موقع پر اپنے پاکستانی ایجنٹ ڈاکٹر ٹکھیل سے کام لیا جو حکمہ صحت کا ملازم تھا۔

اس نے علاقے بھر میں دوبار پولیو کے قطرے پلانے کی جعلی مہم چلائی اور اس طرح لیڈی ہیلتھ ورکرز کے ذریعے اس پر اسرار گھر کے مکینوں کے خون کے نمونے حاصل کر لیے جن کے ڈی این اے ٹیسٹ کے بعد سی آئی اے کا شک نقیض میں بدل گیا کہ یہاں بن لادن فیملی موجود ہے۔

یہی وہ دن تھے جب ریمنڈ ڈیوس لاہور میں گرفتار ہو گیا۔ اسے دونو جوانوں فہیم اور فیضان پر شک ہوا تھا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہے ہیں اور شاید اس کے بارے میں بہت کچھ جان چکے ہیں۔ ریمنڈ نے بلا ٹائل فائرنگ کر کے انہیں ختم کر دیا، یہ 27 جنوری کا واقعہ ہے۔ مگر اس کارروائی کے بعد ریمنڈ موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا۔ امریکانے اپنے خاص ایجنٹ کی رہائی کے لیے پاکستان پر زبردست دباؤ ڈالا۔ امریکی صدر اوباما نے کہا کہ ریمنڈ ہمارا سفیر تھا جسے سفارتی استثناء کے تحت رہا کر دیا جائے مگر امریکی حکام اس کی سفارتی حیثیت کا ثبوت پیش نہ کر سکے۔ جلد ہی پاکستانی تحقیقاتی اداروں نے یہ بات اگلوالی کر دیمنڈ سی آئی اے کا چیف ہے۔ ریمنڈ 48 دن حراست میں رہا، اس دوران پاکستانی سرحدوں پر کئی ماہ سے جاری ڈرون حملے، حیرت انگیز طور پر تقریباً رک گئے تھے۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل (ر) حمید گل نے انہی دنوں اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ پاکستان میں ریمنڈ جیسے ایک ہزار سے زائد امریکی جاسوس موجود ہیں۔

امریکی جاسوس کے ہیمانہ اقدام کے خلاف پورے ملک میں احتجاج ہوتا رہا اور اسے سزائے موت دینے کے مطالبے سے ملک کی فضا گونجتی رہی مگر پاکستان امریکی دباؤ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور آخر کار 15 مارچ کی شب ریمنڈ کو رہا کر دیا گیا..... اگلے دن کے اخبارات میں یہ خبر اہل پاکستان کا منہ چڑھا رہی تھی کہ فہیم اور فیضان کے ورثاء کو دیت کی بھاری رقم دے کر ریمنڈ کو چھڑا لیا گیا ہے۔ ریمنڈ آزاد ہوتے ہی افغانستان میں رہتے ہوئے ایک بار پھر اپنی مہم جوئی میں مصروف ہو گیا۔

ڈیڑھ ماہ تک سی آئی اے خاموشی سے آپریشن کی تیاری کرتی رہی اور آخر کار یکم اور 2 مئی کی درمیانی شب دو امریکی ہیلی کاپٹر چالیس فوجیوں کو لے کر اس مکان پر منڈلانے لگے..... رات کی تاریکی میں فائرنگ کی آوازوں نے علاقے میں سنسنی پھیلادی..... مکان کے اندر سے ایک راکٹ فائر ہوا اور ایک امریکی ہیلی کاپٹر شعلوں کا کفن پہنے زمین پر آگرا..... کچھ دیر تک مزاحمت ہوتی رہی..... آخر کار امریکی فوجی اندر داخل ہو گئے..... انہوں نے بڑی تیزی سے اپنی کارروائی مکمل کی..... چالیس منٹ کے اندر اندر وہ کچھ لاشیں لے کر واپس جا رہے تھے..... اس جگہ سے شیخ کی تین بیگمات اور بچے بھی گرفتار بھی کیے گئے جنہیں پاکستانی حکام نے اپنی تحویل میں لے لیا۔

اس کے ساتھ امریکا نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے سب سے زیادہ مطلوب فرد ”شیخ اسامہ بن لادن“ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے..... اور لاش کو بحیرہ عرب میں پھینک دیا گیا ہے۔

صبح تک امریکی حکام کی طرف سے شیخ کی نعش کی تصویر بھی جاری کی گئی جس کا جعلی ہونا اگلے ہی دن ثابت ہو گیا اور خود امریکی حکام نے جعلی تصویر جاری کرنے کا اعتراف بھی کیا۔

ایبٹ آباد آپریشن اور شیخ کے شہید کیے جانے کے امریکی دعوے نے کئی سوالیہ نشان ابھار دیے جن کے تسلی بخش جوابات آج تک نہیں دے جاسکے۔ مثلاً اگر امریکا کو اسامہ بن لادن کا ہتھل گیا تھا تو وہ انہیں زندہ گرفتار کیوں نہ کر سکا؟ جب کہ صدر بش نے نائن الیون کو دعویٰ کیا تھا کہ ہم اپنے دشمنوں کو انصاف کے کٹہرے میں لائیں گے؟ شیخ کی نعش کی تصویر یا فوٹیج کیوں جاری نہیں کی گئی جب کہ اس سے قبل امریکا ہر مطلوب فرد کی فوٹیج جاری کرتا آیا ہے۔ نعش کو آزاد میڈیا اور صحافیوں کے سامنے کیوں نہ پیش کیا گیا تا کہ دنیا کو امریکا کی سچائی کا یقین ہوتا۔

بعض ذرائع سے پتا چلتا ہے کہ شیخ وہیں موجود تھے مگر انہوں نے گرفتاری پر شہادت کو ترجیح دیتے ہوئے فدائی حملہ کر دیا تھا، جس کی وجہ سے خود ان کی لاش قابل شناخت نہ رہی تھی۔ ایسے مجاہد کے شایان شان موت یہی ہو سکتی ہے..... اور اسے لاش نہ دکھانے کی یہ ایک معقول وجہ کہا جاسکتا ہے۔

ایک دوسرا تجزیہ جو قرین قیاس ہے یہ ہے کہ شیخ اس سے پہلے کسی اور مقام پر وفات یا شہادت پا چکے تھے جس کی تصدیق امریکا کو انہی دنوں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سی آئی اے کو یہ معلوم ہو گیا کہ ایبٹ آباد میں شیخ کی ازواج اور بچے موجود ہیں۔ چنانچہ یہ ڈرامہ سیٹ کر دیا گیا تا کہ دنیا پر یہ دھاک جمائی جاسکے کہ اسامہ کو امریکا بھار نے ختم کر کے افغان مہم کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے اور اب افغانستان سے باعزت واپسی کا وقت آ گیا ہے۔

بہر حال یہ بات اپنی جگہ طے تھی کہ 2 مئی کے بعد شیخ اسامہ اس دنیا میں نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلقین، حراست میں لی گئی ان کی بیگمات، قریبی رشتہ داروں اور خود القاعدہ نے ان کی شہادت کی تصدیق کر دی۔

برہان الدین ربانی کا قتل: 20 ستمبر کو سابق افغان صدر اور طالبان سے مصالحتی وفد ”افغان امن کونسل“ کے سربراہ پروفیسر برہان الدین ربانی کو کابل میں امریکن سفارت خانے کے قریب واقع ان کی رہائش گاہ میں قتل کر دیا گیا۔ ان کی عمر 71 سال تھی۔ 23 ستمبر کو ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں اور وزیر اکبر خان کے علاقے میں ان کی آخری آرام گاہ بنی۔ پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی بھی تعزیت

اور آخری رسومات میں شرکت کے لیے کابل پہنچ گئے تھے۔ ربانی کے قتل کا الزام طالبان پر لگایا گیا جبکہ یہ بالکل غلط تھا۔ انہیں شالی اتحاد نے قتل کرایا جس کے پس پردہ امریکی ایما موجود تھا۔ دراصل ربانی، ان آخری سالوں میں امریکی تسلط سے سخت تالاں تھے۔ وہ افغانستان میں امریکا کو اڈے دینے کو زبردستی مجبوتھے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آئندہ حکومت میں طالبان کے کلیدی کردار کو تسلیم کرنے پر راضی تھے اور برملا کہتے تھے کہ انہیں طالبان کے ماتحت رہنا قبول ہے۔ وہ طالبان سے مذاکرت کے بہت بڑے داعی تھے اور اس میں پاکستان کا کردار بھی ضروری سمجھتے تھے۔ ادھر افغان حکومت کا طاقتور عنصر شالی اتحاد طالبان سے مذاکرات کا قائل تھا نہ پاکستان سے کسی تعلق کا، اس کے ساتھ ساتھ امریکا کو بھی افغانستان کی سیاست میں وہی لوگ چاہیے تھے جو امریکن اڈوں کی تجویز قبول کریں۔ چنانچہ ربانی کو بڑی صفائی سے راستے سے ہٹا دیا گیا اور الزام طالبان کے سر منڈھ دیا گیا جس کی طالبان نے شدت سے تردید کی۔

ربانی کی تجویز و تفتیش کے فوراً بعد شالی اتحاد طالبان سے مصحاحی کوشش رکوانے کے لیے سرگرم ہو گیا، اس نے مطالبہ کیا کہ طالبان کا بزور قوت خاتمہ کیا جائے۔

احمد ولی کرزئی کا قتل: 12 جولائی کو افغان صدر حامد کرزئی کے بھائی، قندھار صوبائی اسمبلی کے سربراہ، احمد ولی کرزئی کو قندھار میں رہائش گاہ پر قتل کر دیا گیا۔ انہیں ان کے پیروؤں کو لے افسر سردار محمد نے اس وقت گولیوں کا نشانہ بنادیا جب وہ واش روم سے نکل رہے تھے۔ احمد ولی کرزئی نے مارچ کے وسط میں افغانستان میں مستقل امریکی اڈوں کو قیام امن کے لیے اشد ضروری قرار دیا تھا۔

امن مذاکرات، دورے، عالمی کانفرنسیں: دوران سال مختلف کانفرنسیں، سربراہان مملکت کی ملاقاتیں اور امن مذاکرات کی کوششیں جاری رہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

- ♣ 23 جنوری..... کرزئی نے ماسکو کا دورہ کیا اور روس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی۔
 - ♣ 18 اپریل..... ترکی نے طالبان کو سیاسی دفتر بنا کر دینے کی پیشکش کر دی۔
 - ♣ 16 اپریل..... کابل میں پاکستانی حکام کے افغان صدر کرزئی سے نہایت اہم مذاکرات ہوئے۔
- پاکستان کی جانب سے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے علاوہ عبدالرحمن ملک، جنرل اشفاق کیانی اور آئی ایس آئی چیف احمد شجاع پاشا بھی شریک تھے۔

- ♣ 2 مئی..... پاکستان کا اثر توڑنے کے لیے بھارتی صدر من موہن سنگھ جھٹ پٹ کابل پہنچ گئے۔
- کرزئی سے افغانستان کے لیے 50 کروڑ ڈالر امداد کا وعدہ کیا..... طالبان سے مذاکراتی عمل کی حمایت کی، بشرطیکہ پاکستان کو معاملات سے باہر رکھا جائے۔

✽ یکم جون امریکا ملا محمد عمر سے براہ راست مذاکرات کے لیے سرگرم ہو گیا۔ ان تک رسائی رکھنے والے افراد کو سرگرمی سے تلاش کیا جانے لگا۔ مولوی طیب آغا سے رابطہ کر لیا گیا جو ملا محمد عمر کے متعمد خاص ہیں۔ انہیں قطر میں طالبان دفتر قائم کرنے کی اجازت دے گئی۔

✽ حامد کرزی 10 جون کو دوروزہ دورے پر پاکستان پہنچ گئے۔ وزیر اعظم پاکستان یوسف رضا گیلانی سے ملاقات میں پین بجلی، مواصلات، بینکاری، صحت، تعلیم اور سرحدوں کی مشترکہ نگرانی سے متعلق امور طے پائے اور 23 نکاتی اعلامیہ جاری کیا گیا۔ کرزی پاکستانی سیاست دانوں سے بھی ملاقاتوں کے خواہش مند تھے مگر کوشش کے باوجود نواز شریف اور مولانا فضل الرحمن سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔

✽ 23 جون ادوبامانے افغانستان سے ڈیڑھ سال میں 33 ہزار فوج نکالنے کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی مذاکرات میں پاکستان کے کردار کی ضرورت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

✽ 29 جون کابل میں پاک افغان مصالحتی کمیشن کا پہلا اجلاس ہوا جس میں طالبان سے مفابہتی عمل کی حمایت کی گئی۔

✽ جولائی میں امریکا نے طالبان سے مذاکرات کا ڈول ڈالنے کے لیے 14 طالبان رہنماؤں کے نام بلیک لسٹ سے خارج کر دیے جبکہ 123 نام باقی رکھے گئے۔ خارج کیے جانے والوں میں طالبان کے وزیر مولانا ارسلان خان رحمانی، طالبان کے سعودی عرب کے لیے سفیر حبیب اللہ غازی، فقیر محمد خان، اور سید رحمان حقانی شامل تھے۔

✽ امریکا یہ ضمانت چاہتا تھا کہ انخلاء کے دوران طالبان امریکی افواج اور واپس جانے والی رسد پر حملے نہ کریں۔ دوسری طرف طالبان نے انخلاء کے دوران امریکی فوج اور رسد پر حملے نہ کرنے کی ضمانت کو اس امر سے مشروط کر دیا کہ انخلاء فوری طور پر مکمل ہو، اور پیچھے امریکی اڈے برقرار نہ رکھے جائیں۔ امریکا طالبان کی اس شرط کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے ایک دوسرے رخ پر کام شروع کیا۔ طالبان مزاحمت کاروں میں حقانی گروپ نہایت مؤثر رہا ہے، امریکا نے اسے توڑنے کی کوشش شروع کر دی اور طالبان کو مذاکرات سے نکال کر حقانی گروپ سے بات چیت شروع کرنا چاہی۔ مگر مولانا جلال الدین حقانی کے تربیت یافتہ مجاہدین اس جھانے میں نہ آئے۔ حقانی گروپ کے رہنما مولانا سراج الدین حقانی نے 17 ستمبر کو واضح طور پر اعلان کیا کہ طالبان کے بغیر مذاکرات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

✽ حقانی گروپ کے اس صاف جواب کے بعد امریکا نے میران شاہ سے خواہش تک پھیلے ہوئے حقانی

مجاہدین کو اپنا خاص ہدف بنالیا۔ مغربی میڈیا ”حتانی گروپ“ کی بھی ایک تصویر کشی کرنے لگا۔ ساتھ ہی امریکا نے پاکستان پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ براہ راست حتانی گروپ کے خلاف آپریشن کرے۔

پاکستان یہ مطالبہ قبول نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ حتانی گروپ افغانستان میں طالبان کا بہترین معاون تھا، اس سے لڑنے کا مطلب افغان طالبان سے براہ راست ٹکر لینا تھا، امریکا یہ چاہتا تھا کہ افغانستان سے اپنے پاؤں سمیٹے ہوئے، پاکستان اور طالبان کو لڑنا ہوا چھوڑ جائے۔ پاکستانی حکام اس خطرے کو بھانپ چکے تھے اور امریکا کے بعد تنہا افغان طالبان سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ حتانی گروپ کے خلاف کارروائی کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا۔ 23 ستمبر کو امریکی فوجی سربراہ جنرل مائیک مولن نے پاکستانی چیف جنرل اشفاق کیانی سے ملاقات کی، دونوں میں شدید تناؤ کی کیفیت میں بات چیت ہوئی۔ مائیک مولن کا مطالبہ تھا کہ پاکستان حتانی گروپ سے تعلقات ختم کر دے۔ جنرل کیانی نے ان الزامات کی تردید کی اور واضح کیا کہ ان کا حتانی گروپ سے کوئی تعلق نہیں۔

❖ 14 اکتوبر..... حامد کرزئی نے دہلی میں بھارتی سربراہ من موہن سنگھ کے ساتھ اسٹریٹجک پارٹنرشپ کے معاہدے پر دستخط کیے، طے ہوا کہ افغان فورسز کو بھارتی افسران تربیت دیں گے اور بھارت افغانستان سے معدنی وسائل برآمد کرنے کی ذمہ داری لے گا۔ اس معاہدے کے تین دن بعد سات اکتوبر کو کرزئی نے پاکستان مخالف بیان دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی مدد کے بغیر طالبان انگلی بھی نہیں ہلا سکتے۔ چین کے لیے افغانستان میں بھارتی تسلط ناقابل قبول ہے، اس لیے چین نے اپنی سفارت کاری بروئے کار لاتے ہوئے، 19 اکتوبر کو افغانستان میں طورخم سے مزار شریف تک ریلوے لائن بچھانے کے منصوبے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

❖ تقریباً تین ہفتوں تک امریکا پاکستان پر حتانی گروپ کے حوالے سے دباؤ ڈالتا رہا مگر آئی ایس آئی کے سربراہ احمد شجاع پاشا کے کھرے کھرے اور مدلل جوابات سننے کے بعد امریکی حکام کو چپ لگ گئی۔ احمد شجاع پاشا نے جب امریکی حکام کے حتانی گروپ سے رابطوں کے تصویری ثبوت پیش کیے تو وہ مدافعتاً اعداد اپناتے ہوئے نظر آئے۔ اکتوبر کے اواخر میں امریکی وزیر خارجہ ہیری کلنٹن نے پاکستان کا دورہ کیا اور حتانی گروپ سے مذاکرات کے لیے آئی ایس آئی کی مدد طلب کی۔

❖ ترکی، افغانستان میں امن کے عمل کو آگے بڑھانے خصوصاً بھارت کی جگہ پاکستان کو وہاں اہم کردار دینے کے لیے سنجیدہ تھا۔ ترکی نے یکم اور دو نومبر کو استنبول میں سہ فریقی مذاکرات کی میزبانی کی۔ ترکی کے صدر عبداللہ گل، پاکستان کے صدر آصف زرداری اور افغان صدر حامد کرزئی نے

مذاکرات کے اختتام پر 23 نکاتی اعلامیہ جاری کیا جس میں ایک دوسرے کے معاملات میں عدم مداخلت، برہان الدین ربانی کے قتل کے بارے میں مشترکہ تحقیقات اور افغان فورسز کے پاکستانی افسران سے تربیت لینے کے نکات بھی شامل تھے۔ ترکی نے اس موقع پر افغانستان اور پاکستان میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

نومبر کے وسط میں سارک سربراہی کانفرنس میں کرزئی اور گیلانی ایک بار پھر ملے اور ایک گھنٹے ملاقات کی۔ خطے میں امن و استحکام کے لیے پاک افغان تعاون پر اتفاق کیا گیا۔

بیسواں لویہ جرگہ۔ امریکی اڈوں کی منظوری: امریکا افغانستان میں بہر حال اپنے اڈے برقرار رکھنے اور اس کے لیے افغان سیاسی نمائندوں کی ظاہری حمایت حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا، اس لیے اس نے 19 نومبر 2011ء کو افغانستان کے بیسویں لویہ جرگے کا انعقاد کرایا جس میں شریک افغان عمامد نے بھاری اکثریت سے امریکا سے دس سالہ اسٹریجک معاہدے کی توثیق کردی جو پارلیمنٹ سے منظوری سے مشروط ہوگی۔ امریکا نے فیصلہ اپنے حق میں لینے کے لیے افغان نمائندوں کو فی کس ایک ایک کروڑ ڈالر کی رشوت دی تھی۔ اتنی بھاری قیمت پر افغان عمامد نے قومی حیثیت کا سودا کر لیا۔ پورے اجلاس میں صرف ایک خاتون رکن نے اس معاہدے کی مخالفت کی جسے شرکاء نے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

پاک امریکا تعلقات میں کشیدگی: پاکستان کی آزادانہ خارجہ پالیسی کی طرف پیش رفت سے امریکا کو تشویش لاحق ہو چلی تھی، چنانچہ پاکستان کو متنبہ کرنے کے لیے 26 نومبر کو مہمند ایجنسی کے علاقے سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی طیاروں نے اعدها دھند بمباری کر کے 28 پاکستانی فوجیوں کو شہید کر دیا جن میں ایک میجر اور ایک کیپٹن بھی شامل تھے۔ پاکستان نے نہ صرف اس حملے پر شدید احتجاج کیا بلکہ پہلی بار عملی اقدام اٹھاتے ہوئے نیٹو کی رسد مسدود کردی۔ جنرل کیانی نے حکم جاری کیا کہ آئندہ جارحیت پر فوری جوابی کارروائی کی جائے۔ ساتھ ہی حکومت پاکستان نے امریکن افواج کے زیر استعمال اپناٹمسی ایریس خالی کرانے کا مطالبہ کر دیا چنانچہ 10 دسمبر کو امریکا ٹمسی ایریس سے بے دخل ہو گیا۔ امریکا نے شروع میں ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے سلالہ چیک پوسٹ کے سانحے پر معذرت سے بھی انکار کر دیا۔ امریکی حکام نے ظاہر کیا کہ پاکستان کے عدم تعاون کے باوجود نیٹو رسد پر کوئی منفی اثر نہیں پڑے گا اور متبادل راستے اختیار کر لیے جائیں گے۔

پاکستان سے کشیدگی ہی کے باعث 5 دسمبر کو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام، افغان مسئلے پر جرمنی کے شہر بون میں ہونے والی کانفرنس سے پاکستان کو بالکل باہر رکھا گیا۔ کانفرنس میں 86 ممالک اور 16 عالمی

اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ افغانستان کے مستقبل، طالبان سے مفاہمت اور فوجی اڈوں کے برقرار رہنے پر گفت و شنید ہوئی جو بالکل بے نتیجہ رہی۔ خود جرمن حکام نے اعتراف کیا کہ پاکستان کے بغیر افغان مسئلے پر بحث لا حاصل ہے۔ اس کانفرنس سے ایک دن قبل بون میں ہزاروں افراد نے مارچ کیا جو افغان جنگ بند کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

بہر کیف نیٹو کے ہزاروں کنٹینر کراچی میں رکنے کی وجہ سے امریکی فوج کو رسد میں مشکلات کا سامنا ہوا تو اس نے پاکستان کو منانے کی کوششیں شروع کر دیں اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔ نیٹو رسد بحال کر دی گئی۔

قطر میں طالبان کا سیاسی دفتر: 27 دسمبر کو قطر میں طالبان کے سیاسی دفتر کا باقاعدہ افتتاح کر دیا گیا۔ ساتھ ہی ایف بی آئی نے ملا محمد عمر کا نام اپنے انتہائی مطلوب افراد کی فہرست سے خارج کرنے کا اعلان کیا۔ اسن مذاکرات اور دینی حکومت کی تشکیل کے حوالے سے طالبان سربراہ ملا محمد عمر کا وہ پیغام انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو عید الفطر کے موقع پر جاری کیا گیا، اس میں کہا گیا تھا:

”آئندہ حکومت میں تمام قومیں حصہ دار ہوں گی۔ افغانستان کی آزادی اور اسلامی نظام کے لیے ہر جائز طریقے پر غور ہو سکتا ہے۔ ہمارا موقف ہے کہ مستقبل کے افغانستان میں ایک ایسا حقیقی اسلامی نظام ہو جو ملک کے تمام رہنے والوں کے لیے قابل اعتماد ہو۔ عالمی اور علاقائی ممالک کے ساتھ دو طرفہ تعلقات باہمی احترام، اسلامی اور قومی مفادات کی بنیاد پر استوار ہوں گے۔ ملک سے غربت، بے روزگاری، ناخواندگی اور دیگر اجتماعی اور اقتصادی مسائل کے حل پر خاص توجہ دی جائے گی۔ تمام افغان عوام کو بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب ملک کی خدمت کے لیے استعمال کیا جائے گا۔“

طالبان سربراہ نے تاکید کرتے ہوئے کہا:

”انغواء برائے تاوان کو سختی سے روکا جائے۔ مجاہدین علمی مطالعے، دینی دعوت، وظائف اور عوام کی خدمت کو اپنا شعار بنائیں۔“

افغان عوام: یکم اپریل۔ قرآن مجید کی بے حرمتی کرنے والے ملعون پادری ٹیری جونز کے خلاف افغان عوام نے شدید غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے ملک بھر میں مظاہرے کیے۔ مزار شریف میں مظاہرین اقوام متحدہ کے دفتر کے سامنے پہنچے تو محافظ الہکاروں نے فائر کھول دیا۔ اس پر مظاہرین نے مشتعل ہو کر الہکاروں سے ہتھیار چھین کر انہی کو بھون ڈالا۔ 20 الہکار مارے گئے۔ دو غیر ملکیوں کو زخم کر دیا گیا۔ 12 اپریل۔ قندھار میں اسی قسم کے احتجاجی مظاہرے پر امریکیوں نے فائرنگ کر دی۔ 10 شہری

شہید اور 85 زخمی ہو گئے۔ ملک بھر میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔

19 اپریل۔ کابل میں مشتعل افراد نے پیرل پر حملہ کر کے اسے جزوی طور پر نقصان پہنچایا۔ مل مالکان قرآن مجید کے شہید اور اوق کوری سائل کل کر کے ان سے ٹشو پیپر بنایا کرتے تھے۔ عوامی احتجاج پر کپہنی کے چیف ایگزیکٹو سمیت تین افسران کو گرفتار کر لیا گیا۔

18 مئی۔ نیٹو حملے میں چار شہریوں کی شہادت کے خلاف تھار میں شہریوں نے نیٹو کے اڈے کی طرف احتجاجی مارچ کیا، اس موقع پر نیٹو اہلکاروں کی نازنگ سے مزید 13 آدمی شہید اور 50 زخمی ہو گئے۔

25 مئی۔ نورستان میں نیٹو کی بمباری سے 18، افغان شہری شہید ہو گئے۔

29 مئی۔ ہلند کے ضلع ”نوزادو“ میں نیٹو کی بمباری سے 20 پولیس اہلکار اور 32 شہری جاں بحق ہو گئے جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ مقتولین کے درتاء نے گورنر ہاؤس کے سامنے لاشیں رکھ کر احتجاج کیا اور لشکر گاہ کی مرکزی شاہراہ بند رکھی۔ صدر حامد کرزئی نے اس سانحے پر افسوس ظاہر کرنے کے ساتھ امریکا کو متنبہ کیا کہ آئندہ ایسے واقعات کا اعادہ ہوا تو امریکا سے تمام معاہدے منسوخ کیے جاسکتے ہیں۔ تاہم کرزئی نے امریکی سفیروں سے کوئی باز پرس نہیں کی گویا تنبیہی بیان صرف عوام کو دکھانے کے لیے تھا۔

24 اکتوبر۔ ہزاروں شہریوں نے کابل کی سڑکوں پر مظاہرہ کرتے ہوئے امریکا کے کرزئی حکومت سے اسٹریٹجک معاہدے کی مخالفت کی اور نعرہ بازی کی کہ ہمیں امریکی اڈے قبول نہیں۔ ملک بھر میں اس فیصلے پر شدید احتجاج کیا گیا۔

امریکی اڈے۔ دو اہلکار نے امریکا سے انخلاء کا فیصلہ اس طور پر ہرگز نہیں کیا تھا کہ وہ اس ملک سے لاطلق ہو جائے۔ انخلاء کا فیصلہ صرف امریکا پر بڑھنے والے مالی بوجھ کو کم کرنے کے لیے ہے۔ امریکا کو ہر سال ایک فوجی پرس لاکھ ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ صرف جنوری سے جون 2011ء تک افغانستان میں امریکا کے جنگی اخراجات 113، ارب ڈالر سے متجاوز ہو چکے تھے جبکہ فوج کو مزید 107، ارب ڈالر درکار تھے۔ عراق، افغان جنگ کی وجہ سے امریکا شدید معاشی بحران کا شکار تھا، قرضے 143، کھرب ڈالر سے تجاوز کر گئے تھے۔ اس قدر بھاری اور مستقل اخراجات سے نجات کی صورت یہی تھی کہ علاقوں کا کنٹرول مقامی فورسز کو دے دیا جائے، چنانچہ چھ سات سال کے اندر امریکا افغانستان فورسز کی تشکیل پر 28 ارب ڈالر خرچ کر چکا ہے، یہ خرچہ اس کی اپنی ایک سال کی مہمات کے اخراجات سے بہت کم ہے۔ جولائی 2011ء کے دوران نیٹو نے چھ شہروں، پنج شیر، مزار شریف، ہرات، بامیان، لشکر گاہ (ہلند) اور

مہتر لام (الغمان) کا کنٹرول افغان فورسز کے حوالے کر کے اپنا کچھ بوجھ ہٹا کر لیا ہے۔

دوسرا خرچہ اس نے یہاں اپنے مستقل اڈوں کی تعمیر پر کیا ہے جو حیرت انگیز حد تک وسیع، مستحکم اور مضبوط ہیں۔ یہ اڈے قندھار، بگرام (کابل)، شین ڈنڈ (ہرات)، خوست اور جلال آباد (ننگر ہار) میں ہیں۔ ان کی تعمیر اگرچہ اربوں ڈالروں میں ہوئی ہے مگر فوج کو مسلسل جنگی مہمات میں جھونکنے سے یہ سودا سستا ہے۔

تیسرا خرچہ امریکا نے افغان رہنماؤں کو خرید کر اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے کیا کہ وہ ملک میں دس برس کے لیے امریکی اڈوں کی منظوری دے دیں۔ نومبر میں ہونے والے لویہ جرگے سے قبل اس مقصد کے لیے فی کس ایک ایک کروڑ ڈالر دے دیے گئے، اور مخالفت کرنے والوں کو برہان الدین ربانی کی طرح انجام تک پہنچا دیا گیا۔

جنوری 2011ء کے اوائل میں وکی لیکس کی طرف سے کیا گیا یہ انکشاف بہت جلد حقیقت بننا نظر آ گیا کہ ”افغانستان سے امریکی انخلاء کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔“ اس امر کو پاکستان میں تعینات امریکی سفیر کیمرون منٹر نے بھی تسلیم کیا۔ اپریل کے وسط میں ان کا یہ بیان سامنے آیا کہ امریکا 2014ء کے بعد بھی افغانستان میں رہے گا۔

دراصل امریکا روس کی غلطی نہیں دھراتا چاہتا جو افغانستان کو افراتفری میں خالی کر گیا اور پیچھے چند سال کی کشت و خون کے بعد طالبان جیسے اسلام پسندوں کا غلبہ ہو گیا۔ امریکا کی خواہش ہے کہ اس ملک کی آئندہ حکومتیں آزاد ہونے کے باوجود امریکا کی بالادستی کو کبھی چیلنج نہ کر سکیں۔ اس کے لیے امریکا کا دور رس منصوبہ یہ ہے کہ افغانستان میں تعینات افواج میں سے ایک تہائی کو 2012ء کے اواخر تک اور ایک تہائی کو 2014ء کے اختتام تک واپس بلا لے۔ جبکہ بچیں تیس ہزار فوج مستقل طور پر افغانستان میں زیرِ تعمیر پانچ امریکی اڈوں میں قیام پذیر رہے۔

16 نومبر سے 19 نومبر تک کابل میں جاری رہنے والا ”لویہ جرگہ“ اس لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں شریک ارکان کی اکثریت نے امریکی ڈالروں کے عوض اپنی حیثیت کو فروخت کرتے ہوئے امریکا سے اس اسٹریجک معاہدے کی توثیق کر دی جس کے تحت امریکا اپنے اڈوں میں 2012ء کے بعد مزید دس سال تک افواج ٹھہرا سکے گا۔ امریکا شرکاء کو یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ امریکی فوج کا اڈوں میں موجود رہنا ملک میں امن کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ امریکی حکام نے افغان عوام اور سابقہ جہادیوں کو اس خدشے میں مبتلا کر دیا کہ اگر امریکا نے مکمل انخلاء کیا تو اس کے جاتے ہی طالبان انہیں زیرِ دہر کر ڈالیں گے، پس ایک وسیع البیاد حکومت قائم کی تشکیل و بقاء اور طالبان پر دباؤ

برقرار رکھنا تب ہی ممکن ہوگا جب امریکی فوج زیادہ دور نہ بٹھئی ہو اور اس کے طیارے ضرورت پڑتے ہی سرکشوں کی گوثاٹی کرنے کے لیے تیار ہوں۔

افغانستان کے مستقبل کے ضمن میں پاکستان کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ کا یہ انکشاف بھی قابل ذکر ہے جو انہوں نے جون کے اواخر میں کیا۔ انہوں نے کہا کہ امریکا افغانستان کو تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا منصوبہ ہے کہ ہلندہ سے جنوبی افغانستان کا پورا علاقہ طالبان کو دے دیا جائے۔ شمالی علاقے شمالی اتحاد کے حوالے کر دیے جائیں، جبکہ جلال آباد، کابل، ہرات اور قندھار کو اپنی تحویل میں رکھا جائے۔ ان شہروں کے پاس اس کے تین اہم ترین اڈے (قندھار، بگرام اور شین ڈنڈ) موجود ہیں۔

افغان بچوں کی حالت زار: اس وقت افغانستان میں چھ لاکھ سے زائد بچے بھوک، افلاس اور امراض کے شکنجے میں ہیں۔ ان کو خوراک، لباس، علاج اور تعلیم کی بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہیں۔ غیر ملکی امدادی تنظیموں کو افغان بچوں کے حوالے سے جو فنڈ ملے ہیں وہ 35 ارب ڈالر سے متجاوز ہیں مگر ان میں سے افغان بچوں کو سوائے چند نمائشی چیزوں کے کچھ نہیں ملا۔ 60 ہزار سے زائد بچے صرف کابل میں جبری مشقت تلے دبے ہوئے ہیں، یہ وہ بچے ہیں جو دوسرے جنگ زدہ علاقوں سے جان بچا کر یہاں آئے ہیں۔

امریکی حکومت کے ایک نگران ادارے کی رپورٹ کے مطابق امریکی حکومت نے 2001ء سے اب تک افغانستان کی تعمیر نو کے لیے 55 بلین ڈالر کی رقم دی ہے جس کا کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گئی اور کن کن مصارف میں خرچ ہوئی، امریکی انجینیئروں سے رقم کس نے وصول کی۔ کابل میں بی بی سی کے نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اس رقم کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جنگ زدہ افغانستان میں تین عشروں سے تباہ کاری کا دور دورہ ہے مگر اس کے باوجود آبادی کے بڑھنے کی رفتار برقرار ہے۔ اگرچہ 1979ء سے اب تک بیس لاکھ سے زائد افراد جنگوں کی نذر ہو چکے ہیں جبکہ پچاس لاکھ سے زیادہ نفوس دوسرے ملکوں میں بے ہوئے ہیں، اس کے باوجود افغانستان کی آبادی تیس سال پہلے کی نسبت دو گنا ہو چکی ہے جن میں زیادہ تعداد بچوں اور نوجوانوں کی ہے۔ مگر یہ نسل نوزندگی کی بنیادی سہولتوں سے قطعی محروم ہے جس کی تمام ذمہ داری ان طاقتوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے افغانستان کو اپنے مفادات کی خاطر جنگ کے لالچ میں جھونک رکھا ہے۔



مآخذ و مراجع

- ☆.....ہفت روزہ ضرب مؤمن، جلد 15
- ☆.....ہفت روزہ تکبیر، فریڈرے اسٹیش، غازی: جلد 2011ء
- ☆.....قومی اخبارات۔ امت، روزنامہ جنگ، دیگر روزنامے اور ہفت روزہ جہانگیر 2011ء
- ☆.....طالبان کی ویب سائٹ (<http://shahamat.info>)
- ☆.....روزنامہ اسلام کراچی 2011ء
- ☆.....ذاتی یادداشتیں
- ☆.....زبانی روایات

تینالیسواں باب

افغانستان کا حال و مستقبل

مسلمان عالمی طاقتوں کے مقابلے میں افغانستان کو اپنی آخری اُمید یقین کر کے اس ملک سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ خصوصاً پاکستان اور افغانستان کے مابین اسلامی اخوت و مروت کا جو رشتہ قائم ہے، اسے منقطع کرنا ناممکن ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے حکومتوں کی پالیسیاں بدل جائیں اور حکمران اپنے ذاتی مفادات کے لیے اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے بھائی چارے کی جگہ عداوت کی چنگاریوں کو ہوا دینے لگیں مگر دونوں ملکوں کے عوام اسلام سے والہانہ تعلق اور استعمار سے شدید نفرت کی جو مشترک اقدار رکھتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے ان کے مابین بیگانگی کی دیواریں حائل نہیں کی جاسکتیں۔

گزشتہ ایک عشرے سے افغانستان کے چپے چپے پر عزم و ہمت اور ایثار و قربانی کی حیرت انگیز مثالیں جنم لے رہی ہیں جن سے حملہ آور اقوام کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امریکا طالبان کو جنگ کے ذریعے شکست دینے سے مایوس ہو چکا ہے اور کسی بھی طرح مذاکرات کر کے واپسی کا راستہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اقوام متحدہ سے لے کر حکومت پاکستان اور سعودی عرب تک ہر وہ ملک، ادارہ یا فرد جو طالبان سے مذاکرات میں تعاون کر سکتا، اس وقت امریکا کی مجبوری بن چکا ہے۔

امریکا کی انخلاء سے قبل کی منصوبہ بندیوں: سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذاکرات کا ڈول ڈالا جا رہا ہے تو طالبان امریکا سے مذاکرات ہونے کا انکار کیوں کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے طالبان کے امریکا سے براہ راست مذاکرات ہرگز نہیں ہو رہے بلکہ کرنڈی سرکار اس کا راگ الاپ رہی ہے اور بعض سابق طالبان کرنڈی کے کے توسط سے کچھ بات چیت کر رہے ہیں۔ مگر ان خبروں کو طالبان کی اصل قیادت کی مذاکرات میں دلچسپی کے نام سے مشہور کیا جا رہا ہے تاکہ طالبان کے حامی ہزاروں نوجوان مذاکرات کا حتیٰ رخ سامنے آنے تک جنگ سے احتراز کرنے لگیں اور یوں امریکا کو میدان جنگ میں سانس لینے کا موقع مل جائے اور اس کے اکھڑتے ہوئے قدم جم جائیں۔

طالبان سے موجودہ صورتحال میں امریکا کی بات چیت بہت ہی مشکل ہے۔ اس میں سب سے دشوار مرحلہ غیر ملکی مجاہدین خصوصاً عرب اور القاعدہ کے ارکان کے مستقبل کا ہے جنہیں امریکا ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملے کا مجرم قرار دیتا ہے۔ امریکا انہی کو پناہ دینے کا الزام لگا کر افغانستان پر حملہ آور ہوا تھا اور طالبان نے اپنی روایتی مہمان نوازی اور اسلامی اصولوں کی خاطر انہیں امریکا کے حوالے کرنے سے انکار کیا تھا۔ اب بھی طالبان امریکا کو ایسی کوئی یقین دہانی کرانے کے لیے تیار نہیں کی غیر ملکی افواج کے انخلاء کے بعد القاعدہ اور دوسرے غیر ملکی مجاہدین کو افغانستان میں پناہ گاہیں فراہم نہیں کی جائیں گی جب کہ امریکا ہر قیمت پر یہ یقین دہانی ضرور چاہتا ہے۔ اس یقین دہانی کے بغیر اس کی واپسی کھلی شکست کے مترادف ہوگی اور سپر پاور کا صفر پاؤں ہونا سب عیاں ہو جائے گا۔ امریکا کی آخری کوشش یہی ہے کہ کسی طرح خود کو اس کھلی شکست کے تاثر سے بچالے۔

امریکا جس انخلاء کا اعلان کر رہا ہے اس سے اس کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ آناٹا اپنی افواج کو بالکل نکال لے جائے گا اور افغانستان کے معاملات سے یکسر لاتعلقی ہو جائے گا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ امریکا عراق کی طرز پر افغانستان کا کنٹرول علاقائی نمائندوں کی ایک وسیع اہلبیاد حکومت کو جس میں کچھ سابق طالبان بھی شامل ہوں، دے کر اپنی افواج کو چند بڑی چھاؤنیوں میں محصور کر لے گا جن میں سے ہر چھاؤنی میں کم از کم دس پندرہ ہزار فوج کے طویل عرصے تک قیام کے مکمل اور محفوظ ترین انتظامات ہوں گے، حتیٰ کہ طیاروں کے لیے زبردست زمین رن وے بھی بنالیے گئے ہیں۔ یہ فوج کسی شہر میں تعینات نہیں ہوگی، بلکہ انتظام مکمل طور پر مقامی فورسز اور پولیس کے پاس ہوگا مگر ان اڈوں کی موجودگی سے امریکا افغانستان، پاکستان، ایران، روس اور چین پر اپنا رعب طاری رکھے گا۔ یہ تو امریکا کے منصوبے ہیں، باقی ہوگا وہی جواٹھ کو منظور ہوا۔ اس کی جس نصرت نے امریکا کے سابقہ منصوبوں پر پانی پھیرا ہے، وہ اب بھی اہل حق کے ساتھ ہے۔

مذاکرات اور پاکستان کا کردار: امریکا کی مسلسل ناکامی اور طالبان کی میدان جنگ میں بالادستی خوش آئند ہے اور اس سے ہم امید کر سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں افغانستان استعماری طاقتوں کی گرفت سے آزاد ہو کر امن و امان اور ترقی و خوشحالی کی راہ پر چل نکلے گا، مگر تاریخ کے ہر موڑ کی طرح یہ موڑ بھی اس دور کے اربابِ حل و عقد سے نہایت حزم و احتیاط اور دور اندیشی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس وقت صورت حال کچھ ایسی ہے کہ افغانستان کے مسئلے میں وکیل تمام فیصلہ کن عناصر جن میں طالبان اور پاکستان سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، ایک تھے ہوئے سے پر چل رہے ہیں، جسے عبور کرنے میں چند قدم کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ اگر ان چند قدموں کو احتیاط سے طے کر لیا گیا تو اب تک کی تمام کادشوں اور

قریباًئیں کا کل منزل مراد کی شکل میں مل جائے گا، لیکن خدا نخواستہ اگر یہ آخری چند قدم پوری ہوش مندی سے طے نہ کیے گئے تو خطرہ ہے کشتی ساحل پر ڈوبنے کا المناک منظر نہ دیکھنا پڑ جائے۔

الحمد للہ! ہمیں میدان جنگ میں غیور طالبان کی مکمل فتح اور استعماری طاقتوں کی اس ملک سے جلد واپسی کا اتنا ہی یقین ہے جتنا کل کا سورج طلوع ہونے کا، مگر افغانستان کی تاریخ خصوصاً گزشتہ 20 سال کے واقعات کے پیش نظر ہمیں کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ افغانستان کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے اکثر دوست یہ تصور رکھتے ہیں کہ امریکا کی واپسی کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے طالبان کا وہ سنہرا دور اس آن بان کے ساتھ واپس آجائے گا جو 1996ء میں فتح کابل سے لے کر امارات اسلامیہ کے سقوط تک ان گنت نگاہوں کو تسکین اور قلوب کو روشنی دیتا رہا۔

میں اس سے تو اتفاق کرتا ہوں کہ ان شاء اللہ افغانستان میں ایک آزاد اور آئیندہ اسلامی حکومت ضرور قائم ہوگی مگر یہ توقع غلط پسندانہ ہے کہ یہ منزل آنا فانا حاصل ہو جائے گی۔ حقائق اشارہ کناں ہیں کہ طالبان اور افغانستان میں سرگرم تمام استعمار مخالف اور اسلام پسند عناصر کو اس کے لیے ایک بار پھر سفر کرنا ہوگا۔ اگر حکمت عملی درست، منصوبہ بندی بر محل اور باہمی تنظیم پائیدار رہی تو کوئی بعید نہیں کہ یہ سفر مختصر ثابت ہو، لیکن اگر خدا نخواستہ کسی بھی موقع پر عاقبت نااندیشی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا اور باہمی اعتماد کی گرہیں کھل گئیں تو شدید خدشہ ہے کہ افغانستان 1992ء جیسے حالات کا شکار نہ ہو جائے۔

امریکا بھی اس بات کو سمجھتا ہے اس لیے اس کی پوری کوشش ہے کہ جاتے جاتے افغان مزاحمت کاروں میں پھوٹ ڈال دے۔ اس کے علاوہ تقسیم افغانستان کی کوششیں بھی جاری ہیں، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اگر طالبان کے ساتھ امریکا کے مذاکرات کی کوئی صورت نہ نکلی تو امریکا انخلاء سے قبل شمالی افغانستان کو ایک الگ مملکت بنانے کی پوری کوشش کرے گا جسے ہنگامی بنیاد پر اقوام متحدہ سے منظور دلوادی جائے گی۔ اس سلسلے میں شمالی اتحاد کے کئی رہنما امریکا سے متفق ہیں۔ ظاہر ہے کہ شمالی افغانستان کی یہ الگ مملکت مشرقی افغانستان میں سرگرم طالبان کے لیے ایک مستقل دردِ سر بنی رہے گی۔ خطرہ ہے کہ ایسے واقعات آخری بازی میں طالبان کی کامیابی کا وزن کم نہ کر دیں۔ تادم تحریر طالبان کے امریکا سے براہِ راست مذاکرات شروع نہیں ہوئے البتہ امریکا نے اس بارے میں پہلی بار پاکستان کا کردار تسلیم کر لیا ہے جس کی وجہ سے پاکستان نے ملا برادر سمیت متعدد گرفتار طالبان رہنماؤں کو بڑی خاموشی سے رہا کر دیا ہے۔ حکومت پاکستان کا کہنا ہے کہ اسے نظر انداز کر کے افغانستان میں قیام امن کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ایک ملک کا نہیں، پورے خطے کا مسئلہ ہے۔ امریکا نے پاکستان کے

اس موقف کو مان لیا ہے اور اس بنیاد پر پاکستان، افغانستان میں ایک ذمہ دارانہ کردار ادا کرنے کا موقع ملنے کی یقین دہانی کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حوالے سے بھی امریکا سے منصفانہ کردار ادا کرنے کی توقع رکھتا ہے، تاہم امریکا افغانستان اور کشمیر دونوں مسئلوں میں بھارت کی خواہشات اور توقعات کو بھی مد نظر رکھے ہوئے ہے اس لیے پاکستان کو کوئی پختہ یقین دہانی نہیں کرائی جارہی۔ یہ ایک تاریخی اور زمینی حقیقت ہے کہ بڑی سے بڑی جنگ کا اختتام بھی مذاکرات پر ہوتا ہے۔ طالبان بھی اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں اسی لیے وہ مذاکرات کو کلی طور پر مسترد نہیں کرتے، مگر ان کا مطالبہ یہ ہے کہ پہلے امریکا اپنے اتحادیوں کے ساتھ غیر مشروط طور پر انخلاء کے لیے تیار ہو جائے۔ طالبان کا کہنا ہے کہ وہ صلح پر تب ہی غور کریں گے جب غیر ملکی افواج انخلاء شروع کر دیں گی۔ طالبان کا یہ مطالبہ درست ہے اور آج نہیں تو کل امریکا اور اس کے اتحادیوں کو مذاکرات کی میز پر آنا پڑے گا مگر اس سے قبل امریکا کی پوری کوشش ہے کہ طالبان کے موقف کو اتنا نرم کر دے کہ امریکا کی واپسی، شکست فاش محسوس نہ ہو۔

یہاں صورت حال کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ افغانستان میں برسرِ پیکار بعض گروپ مذاکرات کے اس عمل سے پاکستان کو دور رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے پاکستان مذاکرات کے عمل کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرے گا اور یوں افغانستان کے مفادات محدود ہو سکتے ہیں مگر افغانستان کی گزشتہ 30 برس کی تاریخ بتاتی ہے کہ افغانستان اور پاکستان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان کے مفادات بھی ایک ہیں اور نقصان بھی۔

اگر حکمران اور حکومتیں دونوں ملکوں کے مفادات کو الگ الگ بھی کر لیں تب بھی زمینی حقائق وہی رہیں گے اور ایسی ہر پالیسی جس کی بنیاد ان دونوں ملکوں کی یگانگت، اتحاد اور اتفاق کے خلاف ہو، درحقیقت اپنے پاؤں پر کھڑا مارنے کے مترادف ہوگی۔ ایسی پالیسی اگر کل پاکستان کے ایک فوجی آمر نے ملک پر مسلط کی تھی تو بھی غلط تھی جس کے نقصانات سب پر عیاں ہیں اور اگر ایسی کوئی پالیسی افغانستان کی کوئی آئندہ حکومت تشکیل دیتی ہے تب بھی وہ خود کشی کے مترادف ہوگی۔ دونوں ملکوں کے درباب حل و عقد، سیاست دانوں اور عسکری قائدین کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عالم اسلام میں کم از کم ان دونوں ملکوں کی موت و حیات اور فناء و بقا مشترک ہے۔ ان میں سے کسی ایک کی تباہی دونوں کی تباہی ہے۔ کسی ایک کی شکست دونوں کی شکست ہے۔

پاکستان کی شرفاغر با جغرافیائی منگی اس کی سب سے بڑی عسکری کمزوری ہے جسے دور کرنے کے لیے اسے پشت پر افغانستان کا وسیع میدان درکار ہے۔ ہمارا وطن دنیا کے ان ممالک میں سے ایک ہے جن کا

کوئی صوبہ وسط میں واقع نہیں۔ تمام صوبے کسی نہ کسی سرحد پر واقع ہیں۔ پاکستان کی سرحدوں پر واقع ملکوں میں افغانستان ہی ہے جس پر زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کو بھارتی غفرت سے حفاظت کے لیے ہمہ وقت مشرقی سرحدوں پر توجہ مرکوز رکھنا پڑتی ہے جس کے لیے مغربی سرحدوں پر ایک دوست ملک کا سایہ ہونا ضروری ہے۔

پاکستان کے دو صوبے سرحد اور بلوچستان اور ان کے ساتھ ملحقہ قبائلی علاقے، افغانستان کے ساتھ گہرا نسلی تعلق رکھتے ہیں۔ کسی سرحد کے ذریعے ان کے رشتے ناتے منقطع کرنا محال ہے۔ اس سے بڑھ کر دونوں ملکوں کے کروڑوں عوام کے مابین اسلام کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کی اکثریت حنفی اہل سنت ہے۔ ان کے دینی مدارس کے لاکھوں فضلا باہمی استادی شاگردی کا مقدس تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ملکوں کی تجارت ایک دوسرے پر منحصر ہے۔ پاکستان کے لیے وسط ایشیا کے تمام راستے افغانستان سے گزر کر جاتے ہیں اور افغانستان کو بین الاقوامی تجارت کے لیے پاکستان کی بندرگاہیں استعمال کیے بغیر چارہ کار نہیں۔ یہ ہیں وہ حقائق جنہیں پاکستان نے 1980ء کے عشرے میں مد نظر رکھا اور افغانستان کے ساتھ روسی استعمار کے خلاف جنگ میں بھرپور کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ملک کیونزم کی غلامی سے بچ گئے اور دنیا کی ایک سپر پاور کا جنازہ نکل گیا۔

افغانستان کے مسلمان اس تاریخ کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اگرچہ پاکستان کے گزشتہ فوجی آمر نے ان قربانیوں پر پانی پھیرنے کی پوری کوشش کی، مگر حقائق کو بدلائیں جاسکتا۔ افغانوں اور افغانستان کے لیے آج بھی پاکستان اتنا ہی اہم ہے جتنا کل تھا۔

امریکا چلا گیا تب بھی افغانستان کے چاروں طرف دشمنوں کا گھیراؤ رہے گا۔ حنفی افغان، ایران پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ تاجکستان اور ازبکستان کی اشتراکیت پسند حکومتیں روس کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے ان کے لیے خطرہ بن سکتی ہیں۔ چین بھی ایک غیر مسلم عالمی طاقت ہے جو وسط ایشیا میں کسی بھی اسلامی طاقت کا ابھرنے کا خطرناک سمجھتا ہے اور ماضی قریب میں افغانستان کے اسلام پسندوں کے خلاف شنگھائی 5 کی شکل میں متحرک رہا ہے۔ ایسے میں افغان کے مستقبل کی کسی بھی حکومت کو پاکستان کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اگر وہ پاکستان کو دوست کے طور پر قبول نہیں کرتی تو اسے لائحہ عمل بھارت سے دوستی کا ٹھٹھا پڑے گی جس کی فطرت ”بغل میں چھری منہ میں رام رام“ ہے۔

مستقبل کے خطرات، گریٹ گیٹ: 2000ء میں امریکا کا گریٹ گیٹ وسط ایشیا کے معدنی وسائل پر قبضے، طالبان حکومت کے خاتمے اور چین، پاکستان اور روس کو دباؤ میں رکھنے سے متعلق تھا۔ 2011ء

میں گریٹ گیم کے مہرے کچھ آگے پیچھے ہو گئے مگر اہداف وہی ہیں۔

اب گریٹ گیم کی بساط کچھ اس طرح بھیجی نظر آتی ہے کہ

❖ امریکا خطے میں اپنی افواج اور عسکری مہمات میں کمی کے باوجود اپنے اڈے یہاں باقی رکھے گا۔

❖ اس سلسلے میں بھارت اس کا سب سے بڑا معاون ہوگا۔

❖ امریکا بھارت کو پاکستان اور چین کے مقابلے میں مضبوط کرے گا۔ افغانستان میں بھی بھارت اور

امریکا ایک دوسرے کے مددگار ہوں گے۔

❖ امریکا افغانستان میں بھارت کے اثر و رسوخ میں اضافے کی حمایت کرے گا اور پاکستان کو یہاں

کی سیاست میں بے اثر کر دے گا۔

❖ چونکہ امریکا کو چین کے سپر پاور بننے اور روس کے دوبارہ طاقت پکڑنے اور اس خطے میں بالادستی

حاصل کرنے کا خطرہ ہے اس لیے وہ افغان اڈوں کے ذریعے اس دونوں کو بھی لگام دینے کی

کوشش کرے گا۔

❖ روس اور چین بہر حال بڑے ممالک ہیں اس لیے وہ اپنے مفادات کو آسانی سے ضائع نہیں ہونے

دیں گے، ان کی طرف سے اپنے مفادات کے دفاع کی کوششوں سے اس خطے میں ایک نئی اکھاڑ

پہچھا شروع ہو جائے گی۔

❖ ایران خاموش تماشا کی نہیں بن رہا ہے گا..... بلکہ اپنی تاریخ اور ماضی کی روایات کے عین مطابق وہ

غالب آنے والے فریق کا ساتھی بن کر افغانستان کی سیاست میں دخل رہے گا۔ اس بات کا قوی

امکان ہے وہ ایک بار پھر امریکا کا اتحادی بن جائے..... علانیہ طور پر نہ سہی، خفیہ طور پر ہی۔

❖ گریٹ گیم کا سب سے بڑا نقصان پاکستان کو ہوگا..... افغانستان سے متعلق اس کے مفادات

شدید خطرے میں پڑ جائیں گے..... وہاں بھارت کا اثر و رسوخ پاکستان کو دو طرفہ خطرات میں

دھکیل دے گا..... اور پاکستان خطے میں بے یار و مددگار رہ جائے گا۔

❖ جہاں تک افغانستان کا تعلق ہے، خطرہ ہے کہ یہاں بدامنی کا ایک نیا دور شروع ہوگا جو شاید روس کی

واپسی کے بعد والے سالوں سے مختلف نہ ہو۔

❖ یہ تمام خدشات غلط ثابت ہو سکتے ہیں..... بشرطیکہ افغان طالبان کی جدوجہد جاری رہے اور وہ

جارج افواج کو ملک سے مکمل طور پر بے دخل کرنے اور اپنی آزاد و خود مختار اسلامی حکومت بنانے

میں کامیاب ہو جائیں، پاکستان اور افغانستان میں از سر نو برادرانہ تعلقات کا آغاز ہو..... اور

بھارتی عزائم کے سامنے یہ دونوں ملک مشترکہ پالیسی اپنائیں۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے اور افغان عوام ایک بار پھر اپنے شاندار ماضی کی تصویر ایک حقیقت کی شکل میں اپنے سامنے دیکھیں۔ ان کلمات کا خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر افغانستان کی فیصلہ کن قوتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ پاکستان کو ساتھ لے کر چلیں۔ اسی طرح پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسئلہ افغانستان میں امریکا کے مفادات کی بجائے علاقائی تحفظات کا خیال رکھے۔

مذاکرات کا وہ وقت عن قریب شروع ہونے کو ہے جس میں نہ صرف افغانستان بلکہ اس خطے کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ ایسے میں پاکستان جیسے پڑوسی اسلامی ملک کی حمایت طالبان کے لیے مفید ہوگی نہ کہ مضر۔ مگر یہ بھی شرط ہے کہ حکومت پاکستان اس سلسلے میں مخلصانہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔ اگر پاکستان ہی نے مخلصانہ کردار ادا کرنے کی بجائے، ایجنٹ کارول ادا کیا تو اس خطے کے مسلمانوں کو تباہی سے کوئی طاقت نہیں بچا سکے گی۔

اہل پاکستان کو یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں خود افغانستان کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی کسی بھی حکومت کے لیے (چاہے وہ اسلام پسند ہو یا لبرل) افغانستان میں کسی کمزور حکومت کا بڑا نقصان دہ ہوگا۔ تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ افغانستان میں شمالی اتحاد اور کیونسٹوں سمیت کوئی بھی گروہ حکومت بنائے گا تو وہ پاکستان مخالف بھی ہوگی اور کمزور بھی۔ دوست اور مضبوط حکومت صرف انہی لوگوں کی ہو سکتی ہے جو اسلام پسند افغان عوام کی امیدوں کے مطابق وہاں شرعی نظام کے قیام کا بیڑا اٹھائیں جیسا کہ اس وقت طالبان کا منشور یہی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت پاکستان اپنی افغان پالیسی میں ان پہلوؤں کو مد نظر رکھے گی۔ ہم یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ طالبان پاکستان دوستی کے تاثر کو قائم رکھیں گے اور ایک سابق آمر کی حمایتوں کی وجہ پاکستان اور اپنے وطن کے مفادات کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ اگر دونوں ملکوں میں اعتماد، اتحاد اور اشتراک کا سلسلہ پروان چڑھتا رہا تو اس خطے کے مستقبل کے بارے میں باطل قوتوں کی سازشیں ہمیشہ کے لیے ناکام ہو جائیں گی۔ (ان شاء اللہ)



چوالیسواں باب

کیا افغان بنی اسرائیل ہیں؟.....

افغانوں کے نسب کے بارے میں اٹھنے والے سوالات کو آج کل بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانستان پر برطانوی استعمار کی طرف سے مسلط کی جانے والی جنگوں کے دوران بھی اس سوال کو اچھا لالہ کیا اور یورپین محققین نے اس پر بڑے خود بڑی نایاب تحقیقات بھی فرمائی ہیں جن کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ افغان بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ اس وقت یہودی لابی بھرپور کوشش کر رہی ہے کہ نہ صرف افغانوں کو ان کے یہودی النسل ہونے کا یقین دلایا جائے بلکہ انہیں یہودی مذہب بھی قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر عرض کی جائے گی۔ پہلے ہم مغربی دانشوروں اور یہودی لابی کے ان دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جن کے بل بوتے پر افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اس دعوے کی کوئی مضبوط دلیل نہیں۔

یہ روایت کب اور کیسے مشہور ہوئی: میرے علم کے مطابق گیارہویں صدی ہجری، سترہویں صدی عیسوی میں سب سے پہلے آخوندرویزہ نامی ایک شخص نے ”تذکرۃ الارار والاشرا“ نامی اپنی کتاب میں افغانوں کا نسب بیان کرتے ہوئے یہ ”اکشاف“ کیا تھا کہ افغان حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں کیوں کہ بنی اسرائیل کا ایک بڑا جہاد امجد طاہر تھا جس کے ایک بیٹے کا نام ”افغان“ تھا۔ افغان اس کی اولاد ہیں۔

اس اجمال کے بعد افغانوں کے نسب کے بارے میں ایک اور بے سند مگر مفصل روایت مشہور ہو گئی، جس کا لب لباب درج ذیل ہے:

”بنی اسرائیل کے بادشاہ طاہر کے ایک بیٹے کا نام ”افغنہ“ تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں حکومت کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ افغنہ کی اولاد شام میں سکونت پذیر ہو کر خوب پھلی پھولی۔ جب بخت نصر نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو افغنہ کی اولاد کو غور، کامل، فیر و زکھ اور قندھار

کے آس پاس تکمیل دیا۔ جب حضرت خالد بن ولید q نے اسلام قبول کیا تو ان لوگوں کو مکتوب بھیج کر اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ افغنہ کی اولاد میں سے سب سے بڑا سردار قیس تھا۔ جس کا سلسلہ نسب طالوت سے: وکر ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا تھا۔ وہ قبیلے کے چند سرکردہ افراد کو لے کر حضور { کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور { نے نام پوچھا۔ بنی افغان کے راہنمائے بتایا کہ اس کا نام قیس ہے۔ حضور { نے جواب دیا: ”قیس عبرانی نام ہے چونکہ ہم عرب ہیں، اس لیے آج کے بعد آپ کا عربی نام عبدالرشید ہوگا۔“ عبدالرشید کئی جنگوں میں حضرت خالد بن ولید q کے ہمراہ بہادری سے لڑا اور جب خالد q نے حضور { کو ان کی بہادری کے بارے میں بتایا تو حضور { نے عبدالرشید کو ”بنان“ کا لقب دیا، یہی لفظ بعد میں ”پٹنان“ بن گیا۔ بنان کشتی کے اس شہیر کو کہتے ہیں جس پر کشتی کا انحصار ہوتا ہے۔ حضور { نے عبدالرشید کو بعد میں اپنے ہاں بلایا۔ اس کے حق میں دعائیں اور ایک صحابی اور کئی انصار کے ساتھ دوبارہ غور روانہ کیا تا کہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں۔“

یہ دوسری روایت ہمیں سب سے پہلے نعمت اللہ ہروی کی ”تاریخ خان جہانی“ میں ملتی ہے جو کہ 1022ھ (1613ء) میں لکھی گئی ہے۔ مؤلف اس حدیث سے استدلال کر کے بتاتا ہے کہ تمام افغان قبائل بنی اسرائیل کی نسل سے ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، اور ان میں سے کچھ قبیلوں کو (جو قیس اور اس کے ہم وند لوگوں کی اولاد ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہم کی اولاد ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ غرض تمام علمی ذخائر میں اگر افغانوں کے بنی اسرائیلی ہونے کے بارے میں کچھ ملتا ہے تو وہ یہی روایت ہے۔ ہروی کے بعد بعض دیگر فارسی و پنجتون و ہندوستانی مؤرخین (جیسے حافظ رحمت خان روہیلہ اور قاضی عطاء اللہ خان) بھی اسے نقل کرتے چلے گئے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس میں ایک فی صد شک بھی نہیں رہتا کہ یہ روایت سراسر من گھڑت ہے۔ ظہور اسلام کے بعد ایک ہزار سال تک یہ روایت کہیں پڑھنے یا سننے میں نہیں آئی۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس طویل روایت کا کوئی جزو تک نہیں ملا۔ یہ طے ہے کہ احادیث کے متون کی تدوین کا کام تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تکمیل کو پہنچ گیا تھا لہذا اس کے بعد کوئی ایسی حدیث قبول نہیں کی جاسکتی جو متون حدیث میں موجود نہ ہو۔ خاص طور پر ایسی حالت میں کہ راوی سند بھی بیان نہ کر رہا ہو۔ نعمت اللہ ہروی اور ان جیسے دوسرے مؤرخین نے یہ حدیث نقل کرتے ہوئے سلسلہ اسناد بیان کیا ہے نہ کہی حدیث کی کتاب کا حوالہ دیا ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ اس روایت کا کوئی جزو ذخیرہ حدیث میں موجود نہیں حتیٰ کہ ضعیف اور موضوع احادیث کے ذخائر بھی اس سے خالی ہیں۔ اس کا صاف

مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ایک ہزار سال بعد بعض مخصوص مقاصد کے تحت گھڑی گئی ہے۔ لہذا اسے کسی درجے میں بھی قبول کرنا ممکن نہیں۔

ممکن ہے بعض تاریک خیال کریں کہ کسی چیز کو تاریخ کی حد تک ثابت کرنے کے لیے اس کا حدیث کے معیار پر پورا اترنا ضروری نہیں اس لیے اس روایت کو حدیث نہ سمجھی، صرف تاریخ سمجھ کر مان لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مؤرخین کے ہاں بھی کسی روایت کو تاریخی اعتبار سے قبول کرنے کے لیے اس کا کسی نہ کسی درجے میں ثبوت درکار ہوتا ہے۔ کسی حدیث کو تاریخی مواد کے لیے استعمال کرنے کے لیے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ صحیح یا حسن کے درجے کی ہو، کیوں کہ تاریخ میں کوئی شرعی حکم ثابت نہیں کیا جاتا بلکہ صرف واقعہ نقل کرنا مقصد ہوتا ہے۔ مگر واقعہ کے ثبوت کے لیے بھی حدیث کسی درجے میں تو ثابت ہونی چاہیے چاہے ضعیف ہو۔ اگر کوئی حدیث ثابت ہی نہ ہو بلکہ موضوع (من گھڑت) ہو تو اصول تاریخ کے مطابق اسے تاریخ میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ مؤرخ کا کام حتی الامکان سچے واقعات کو مرتب کرنا ہے نہ کہ جھوٹ کے پلندے تیار کرنا۔ دیانت دار مؤرخ ہمیشہ سچائی کو تلاش کر کے نقل کرنے اور بے سند وغیرہ معتبر چیزوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کا پیش کردہ مواد مستند اور معتبر رہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ نہ صرف محدثین و اصحاب سیر بلکہ گیارہویں صدی ہجری سے قبل کے کسی مؤرخ نے بھی اس روایت کو ذکر نہیں کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ دور نبوت، دور صحابہ رضی اللہ عنہم اور ماقبل از اسلام کے ادوار کا جو بھی تاریخی ریکارڈ تھا (چاہے وہ ثبوت کے لحاظ سے پختہ تھا یا کمزور) وہ ہجرت کے تین چار سو سال بعد تک جمع اور مرتب ہو چکا تھا اور آٹھویں صدی ہجری تک محقق مؤرخین اس میں سے کھرے اور کھوٹے کو الگ الگ بھی کر چکے تھے۔ اس تمام اسلامی تاریخی ریکارڈ میں مذکورہ روایت یا اس روایت کے کسی جزو کا سرے سے کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس میں ذکر کردہ نام عبدالرشید، قیس (قیس)، بتان وغیرہ رجال، انساب، تاریخ اور طبقات کی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔ یہی نہیں آپ شعر و ادب اور اخرا ناموں تک کو چھان ماریں، دنیائے اسلام کا ہزار سالہ کتب خانہ آپ کو اس روایت سے بالکل خالی ملے گا جو نعمت اللہ ہروی صاحب اور ان کے معاصر مؤرخین نقل کر گئے ہیں۔

رہی یہ بات کہ پھر مؤرخ ہروی اور ان کے بعد کچھ حضرات نے اس روایت کو کیوں نقل کیا۔ اس بارے میں ہم وسعت ظرفی سے کام لیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ شاید ابتداء میں نعمت اللہ ہروی جیسے ایک دو مؤرخین سے تسامع ہو گیا اور وہ اس روایت کو حسن ظن کی بناء پر نقل کر گئے۔ پھر بعد میں آنے والے بعض افغان علماء مورخین و دانش ورانہی حضرات پر اعتماد کر کے اسے قبول کرتے گئے۔

اس روایت کی قبولیت میں نفیس انسانی کی کچھ کمزوریوں کا دخل بھی ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ بات کسی بھی افغان بلکہ ہر مسلمان کے لیے پرکشش ہے کہ اس کا یا اس کی قوم کے بعض قبیلوں کا سلسلہ نسب کسی صحابی سے ثابت ہو جائے۔ غالباً اسی لیے بعض افغان مورخین روایت کی سند اور اس کے مندرجات کی ناچنگی کو نظر انداز کر گئے۔

حق بہر حال حق ہوتا ہے جسے قبول کرنا چاہیے۔ اگر واقعی کسی پختہ روایت سے افغانوں کا بنی اسرائیل اور اولاد صحابہ رضی اللہ عنہم ہونا ثابت ہو جائے تو اسے ایک تاریخی سچائی ماننے میں کوئی حرج نہیں، مگر حقیقت یہ ہے جس طرح یہ روایت حدیث کے معیار کے لحاظ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اسی طرح تاریخی لحاظ سے بھی اسے کوئی مؤرخ قبول نہیں کر سکتا۔

یہاں تک تو بات ثبوت اور سند کی تھی جس سے اس روایت کا بالکل بے اصل ہونا واضح ہو چکا ہے۔ اس سے ہٹ کر اب اس روایت کو درایت (عقل و فہم) کی روشنی میں دیکھیں تو آپ کو کسی تردّد کے بغیر اس کا خود ساختہ ہونا معلوم ہو جائے گا۔ روایت میں کئی چیزیں خود اس کا خانہ ساز ہونا واضح کر رہی ہیں۔ ذرا نمبر وار غور فرمائیے۔

❶ یہ روایت بتاتی ہے کہ بخت نصر نے افغنہ کی اولاد کو غور، کابل اور قندھار (یعنی موجودہ افغانستان) کی طرف دھکیل دیا تھا۔

یہ بات تمام تواریخ کے خلاف ہے کیونکہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق روایات اس بارے میں واضح ہیں کہ بخت نصر کے ظلم کا شکار ہونے والے دو ہی قسم کے لوگ تھے۔ بہت سے قتل کر دیے گئے اور باقی ماندہ افراد جن کی مقدار اکثر تواریخ میں 70 ہزار بیان کی گئی ہے، بابل لے جائے گئے تھے۔ وہاں وہ ایک مدت تک جلا وطنی کی زندگی گزارتے رہے اور آخر کار جب فارس کا بادشاہ بابل پر غالب آیا تو انہیں نجات نصیب ہوئی۔

اس موضوع سے متعلق تمام ذخیرہ روایات میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ بخت نصر کے مظالم کا شکار ہونے والے کچھ اسرائیلی غور یا دیگر افغان علاقوں کی طرف دھکیلے گئے ہوں۔

یہ بات عقلاً بھی بعید ہے کہ بخت نصر کی قید سے نجات پانے کے بعد وہ اپنے آبائی علاقے فلسطین کے بجائے غور، کابل اور قندھار کی طرف چلے گئے ہوں کیونکہ اپنے آبائی علاقے میں واپس جانے کا موقع ملنے کے بعد ان کے لیے خراسان میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ فلسطین بابل سے نسبتاً قریب بھی تھا اور سرسبز و شاداب و متمدن بھی۔ سب سے بڑھ کر ان کا وطن مالوف تھا۔ اس کے برعکس خراسان کی

مسافرت ہی تھکا دینے والی اور بے حد تھی۔ وہاں دیبا تہن بھی ہرگز نہ تھا جس کے یہودی عادی تھے۔ پھر ایک اجنبی قوم اور اجنبی ملک کو وہ اپنے وطن پر کیسے ترجیح دے سکتے تھے؟

⑦ اس روایت میں دعویٰ کیا گیا ہے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد ان لوگوں کو مکتوب بھیج کر اسلام لانے کی دعوت دی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ افغنہ کی اولاد کے ساتھ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پہلے سے گہرے دوستانہ تعلقات تھے تبھی انہوں نے سارے عرب قبائل کو چھوڑ کر ہزاروں میل کے فاصلے پر آبادان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور پھر ان کا خط اولاد افغنہ کے ہاں اتنا قابلِ تعظیم اور مؤثر ثابت ہوا کہ وہ لوگ فوراً اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے اور ان کا ایک وفد مدینہ حاضر ہو گیا۔

مگر سیرت نبویہ، میر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تاریخ کی کسی کتاب سے اشارہ تک نہیں ملتا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ یا قریش کے رؤساء کا اس دور میں خراسان (افغانستان) کے لوگوں سے ایسا کوئی دوستانہ تعلق ہو۔ اہل عرب کے تجارتی تعلقات بھی زیادہ سے زیادہ عراق، عجم، فارس یا جنوبی ہند کے ساحل تک محدود تھے۔ ایسے میں ایک اکیلے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے تعلقات ہزاروں میل دور آباد ایک گنہام قوم سے کیسے استوار ہو گئے؟

⑧ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے راج قول کے مطابق صفر سن 8 ہجری میں اسلام قبول کیا تھا۔ (دیکھیے البدایہ والنہایہ جلد 6، ص 404، مطبوعہ دار ہجر) اگر انہوں نے اسلام لاتے ہی خط لکھ دیا ہو تب بھی اس دور میں مدینہ سے غور، کابل یا قندھار بھیجے جانے والے کسی خط کے جواب میں چلنے والا قافلہ ایک ڈیڑھ سال سے پہلے نہیں آسکتا تھا۔ کیونکہ وہ اونٹ، گھوڑے اور خچروں کا دور تھا پس حضرت خالد کا خط پڑھ کر کوئی خراسانی وفد فوراً ہی عرب کی طرف روانہ ہو جاتا تب بھی وہ 9 ہجری سے پہلے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب اسلام قبول کرنے کے لیے وفود کی آمد ہونے لگی تھی، اس سال کو عام الوفود کا نام دیا گیا تھا، اور دربار رسالت میں پل پل کے حالات کو یاد کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک بات محفوظ کی جا رہی تھی۔ خاص طور پر اسلام قبول کرنے کے لیے آنے والے وفود کے حالات کو تو بڑے اہتمام کے ساتھ ذخیرہ حدیث و سیرت کا حصہ بنایا گیا ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اتنا اہم وفد اتنے زیادہ فاصلے سے حاضر ہوتا اور دو چار صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کا ذکر نہ کرتے۔ لیکن آپ کتب سیرت میں سن 9ھ اور 10ھ کے تمام حالات اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی مہمات کی تفصیل بھی کھنجال ڈالے۔ آپ کو کہیں اولاد افغنہ یا قیس کا ذکر نہیں ملے گا۔

⑨ روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ قول منسوب کرنا کہ ”قیس عبرانی نام ہے“ اور اس

وجہ سے نام تبدیل کر کے ”عبدالرشید“ رکھ دینا انتہائی غیر معقول ہے۔

آپ لغات میں دیکھ کر معلوم کر سکتے ہیں ”قیس“ عبرانی نہیں، عربی لفظ ہے۔ اس کا معنی ”دانت کا جڑ سے گرنا“ ہے۔ عرب میں قدیم زمانے سے یہ نام رکھا جا رہا تھا۔ جملہ انساب العرب ج 1، ص: 21 میں عدی بن کعب کی والدہ حبیبہ کا نسب یوں بیان کیا گیا ہے: ”بنت بجلتہ بن سعد بن قیس“۔ اسے عبرانی کہنا روایت گھڑنے والے کی جہالت کا ثبوت ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ”قیس“ کو اس کے معنی کی وجہ سے تبدیل کر دیا جاتا مگر عربی نام کو عبرانی سمجھ کر تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض مصادر میں افغانوں کے جدا مجدا کا نام ”قیس“ آیا ہے۔ اس کا عبرانی نہ ہونا اور بھی واضح ہے، عربوں میں قیس عام نام تھا، اس لیے اسے عبرانی کہہ کر عبدالرشید سے تبدیل کرنے کی کہانی کا من گھڑت ہونا اور بھی زیادہ واضح ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قیس اور قیس نامی حضرات موجود تھے۔ قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت موجود ہے کہ جب انہوں نے اسلام قبول کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بیری کے بتوں سے ملے پانی سے غسل کا حکم دیا۔ (العرفۃ والتاریخ، ص: 421، جلد 1) اسی طرح قیس بن سعد، قیس بن عاصم، قیس بن مخرمہ اور قیس بن نعمان رضی اللہ عنہم بھی مشہور صحابہ ہیں۔ (تقریب التہذیب ج 2، ص: 24) اگر یہ نام غلط یا نامناسب ہوتے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں تبدیل کر دیتے۔ علاوہ ازیں ”عبدالرشید“ نام دور نبوت سے موجودہ دور تک عربوں میں کبھی مروج نہیں رہا۔ اگرچہ یہ عربی ضرور ہے، مگر عرب شخصیات میں آپ کو ”عبدالرشید“ نام کا کوئی آدمی مشکل سے ملے گا۔

⑤ روایت میں ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرشید کو اس کی بہادری کی وجہ سے ”بتان“ کا لقب دیا۔ حالانکہ احادیث و سیرت کے پورے ذخیرے میں کہیں بھی یہ لفظ مذکور نہیں۔ اسی روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ”بتان کشتی کے اس شہتیر کو کہتے ہیں جس پر کشتی کا انحصار ہوتا ہے یہی ”بتان“ آگے چل کر پٹھان بنا۔“

اس لغوی تحقیق کا حال جاننے کے لیے پہلے آپ عربی کی تمام لغات اٹھا کر ”بتان“ کا لفظ تلاش کریں (کیونکہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کوئی لقب دیا ہوگا تو عربی زبان ہی میں دیا ہوگا۔ ہر وی صاحب کے نزدیک بھی ”بتان“ عربی لفظ ہے، جو بگڑ کر ”پٹھان“ بن گیا)

جب آپ لفظ ”بتان“ کا کھوج لگائیں تو آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ لفظ عربی لغت میں سرے سے موجود ہی نہیں (جیسا کہ سیرت، حدیث اور عربی ادب کا پورا ریکارڈ بھی اس لفظ سے خالی ہے)۔

معلوم ہوا کہ یہ کہنا ”بتان کشتی کے اس تشہیر کو کہتے ہیں جس پر کشتی کا انحصار ہوتا ہے“ سراسر گپ بازی ہے۔ جو لفظ ہی بے اصل ہے اس کے معانی بیان کرنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

تاریخین ایہ بات ملحوظ رکھیں کہ ہم اس سے انکار نہیں کر رہے کہ پختونوں کا جدا جدا قبیض، قیس یا عبدالرشید ہائی کوئی شخص ہوگا۔ اس کے علاوہ نعمت اللہ ہروی اور دیگر پختون تاریخ نگاروں نے اپنی قوم کا جو شجرہ نسب بیان کیا ہے جو غور غشت وغیرہ سے ہو کر قیس (عبدالرشید) تک جا پہنچتا ہے، ہم اس سے بھی انکار نہیں کر رہے۔ نہ اس پر تنقید کی کوئی معقول وجہ ہمارے سامنے ہے۔ ہم تو اس جعلی روایت کی تردید کر رہے ہیں جو نہ معلوم کس نے، کیوں اور کب گھڑی ہے اور جس میں بنی اسرائیل کے کچھ گروہوں کے افغانستان میں آباد ہونے اور ان کے ایک فرد ”قیس“ کے صحابی بن کر ”بتان“ کا لقب پانے کا ذکر ہے۔ یہ روایت اور اس سے ثابت کی گئی ہر بات سراسر من گھڑت ہے جس کے شواہد تفصیلاً آپ کے سامنے آچکے ہیں۔

یہ روایت کب اور کیسے مشہور ہوئی: اب اصل بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ جعلی روایت افغانوں میں کب اور کیسے مشہور ہوئی اور اس کی تشہیر کے اسباب کیا تھے؟ جہاں تک راقم کی تلاش و جستجو ساتھ دیتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت اگر نعمت اللہ ہروی نے خود اختراع نہیں کی تو ممکن ہے کسی معاصر داستان گو سے سنی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے والی روایت کے گھڑے جانے کا زمانہ نعمت اللہ ہروی کے دور سے کچھ پہلے کا ہو۔

بہر کیف! روایت جس نے اور جب بھی گھڑی ہو، اس کا فرضی ہونا یقینی ہے اور یہ بھی طے ہے کہ اس روایت اور اس سے ثابت کیے گئے دعوؤں کی شہرت کا زمانہ زیادہ سے زیادہ دو تین سو سال پرانا ہے۔ اس تشہیر میں سب سے بڑا حصہ ان مستشرقین کا ہے جو مغربی استعمار کے لیے اسلامی ممالک میں اقتدار کی راہیں ہموار کر رہے تھے اور اسی خاطر علمی سرگرمیوں (علمی سازشوں) میں منہمک تھے۔ اس سلسلے میں کچھ روایات تو خود گھڑی گئیں اور کچھ روایات جو نعمت اللہ ہروی کی تاریخ خان جہانی جیسی ساہتہ کمزور تاریخی و ادبی کتابوں میں مل گئیں انہیں خوب شہرت دی گئی۔ ایسے غیر مستند دلائل، کمزور ترین قیاسات اور ناقابل التفات قرائن کو جوڑ جاڑ کر مستشرقین اور ان کے لیے کام کرنے والے مسلمان دانشوروں نے باقاعدہ ایک مہم چلا کر افغان قوم کو بنی اسرائیل مشہور کر دیا۔

شاید عام حالات میں افغان خود کو کبھی بنی اسرائیل کہلوانا پسند نہ کرتے، مگر ”بتان والی روایت“ انہیں بنی اسرائیلی ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ رضی اللہ عنہم کی اولاد بھی ثابت کر رہی تھی اس لیے بعض افغان مؤرخین اور فضلاء نے اس روایت کو دلچسپ اور مفید مطلب سمجھ کر آگے نقل کرنا شروع کر دیا، دوسرے لفظوں میں

ایسی روایات ان کے ہاں قبول ہو گئیں اور گزشتہ ڈیڑھ صدی کے دوران افغانوں کے پڑھ لکھے طبقے کی اچھی خاصی تعداد خود کو بنی اسرائیل گمان کرنے لگی جبکہ اس بات کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں۔
دانشورانِ فرنگ اور ان کی لگام تھامنے والے مستشرقین کس طرح افغانوں کو یہودی النسل ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

سرولم جوز نے جو کہ بنگال میں برطانیہ کی شاہی ایٹین سوسائٹی کا چیئر مین تھا اپنے ایک تبصرے میں لکھا: ”اسرائیل کے دس قبیلے سرگردانی کے عالم میں ایک وطن ’اُسریت‘ میں چلے گئے تھے۔ فارسی زبان کی سب معتبر تاریخیں بتاتی ہیں کہ پشتون یہودی النسل ہیں اور خود افغان بھی یہی کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے افغانوں کے قبائل (آج بھی) یہودی ہیں۔ اگرچہ افغانوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی اصلیت اور نسب چھپانے کی بہت کوشش کی ہے۔“

سرولم جوز کا یہ پورا تبصرہ جو کہ ”ایشیائی تحقیقات ج: 2، ص: 67“ پر موجود ہے، جھوٹی علمیت بگھارنے کی ایک مستحکم خیر کوشش اور افغانوں پر باطناً یہودی ہونے کی تہمت لگانے کے حوا کچھ نہیں۔
بیشتر قدیم معتبر کتب تاریخ افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے کے ذکر سے خالی ہیں۔ ہاں تذکرۃ الابرار اور تاریخ خان جہانی (نعت اللہ ہروی) اور اسی پائے کی چند کتب نے اس بے سند روایت کو نقل کیا ہے۔ اسی دور میں تاریخ ہندو خراسان پر ایک مستند کتاب ”آئین اکبری“ تحریر کی گئی جو ابوالفضل کی تصنیف ہے اور ہر دور میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس میں افغانوں کے نسب کے بارے میں صرف یہ تحریر ہے:

”پشتونوں کا خیال ہے ان کا مجد امجد ’افغان‘ تھا جس کے تین بیٹے سزبن، غور غشت اور اوبتن تھے۔“ پھر ابوالفضل مشہور پشتون قبائل کا ذکر کر کے لکھتا ہے کہ ان سب کا نسب انہی تین افراد سے جاملتا ہے۔ (ص: 406، 407)

اگر پشتونوں یا افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے کی کوئی معتبر روایت ہوتی تو ابوالفضل ضرور اسے نقل کرتا۔ سرولم جوز کا یہ دعویٰ بھی بڑی گپ ہے کہ افغان خود اپنے آپ کو یہودی النسل کہتے ہیں کیونکہ سترہویں صدی عیسوی سے قبل کسی افغان مؤرخ، عالم یا قائد کا کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس میں افغانوں کی نسبت یہودی طرف کی گئی ہو اور اس تحقیق کے تو کیا کہنے کہ اسلام لانے کے بعد افغان اپنی اصلیت اور نسب چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ اگر وہ واقعی یہودی النسل ہوتے تو انہیں نسب چھپانے کی کیا ضرورت تھی! یہودی نسل سے ہونا کوئی گناہ تو نہیں کہ اسے چھپایا جاتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین سے

دور حاضر تک کتنے ہی مشاہیر اسلام ایسے ہیں جو یہودیت سے اسلام کی طرف آئے۔ کسی نے نسب چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اسلام میں ویسے بھی نسب تبدیل کرنا اور اپنی نسبت کسی اور قبیلے کی طرف کرنا حرام ہے، پھر افغان بھلا ایسا کیوں کرتے؟ اگر وہ بنی اسرائیلی ہوتے تو ہمیشہ اپنا نسب نمایاں رکھتے، مگر اصل بات یہ ہے کہ ان کا یہودی النسل ہونا محض ایک پروپیگنڈا ہے جسے مستشرقین ہوا دیتے آئے ہیں اور ان کی نام نہاد تحقیقات کو عقیدت کی نگاہ سے بڑھ کر سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ افغان خود کو بنی اسرائیل تصور کر بیٹھے اور اس غلط نظریے کو آگے پھیلاتے چلے گئے۔

الیکزنڈر برزکی تحقیقات: ولیم جوزف کی طرح ایک اور انگریز آفیسر الیکزنڈر برنس نے بھی افغانوں کو یہودی النسل قرار دینے کے لیے زبردست کام کیا۔ یہ شخص افغانستان پر برطانیہ کا تسلط قائم کرنے کے لیے سرگرم تھا۔ اس نے امیر دوست محمد خان کے عہد حکومت میں 1832ء کے دوران افغانستان میں برطانیہ کی سفارتی مہم میں حصہ لیا اور واپسی پر اپنی کتاب "The Travel to Bukhara" (سفر بخارا) میں لکھا:

"افغانوں کے چہرے یہودیوں جیسے ہیں۔ وہ خود بھی یہ مانتے ہیں وہ یہودی النسل ہیں۔"

(جلد: 1، صفحہ: 162)

برنس نے اپنی دوسری تصنیف "کابل" میں افغانوں کے بنی اسرائیل ہونے کی دلیل یہ پیش کی کہ امیر دوست محمد خان نے پٹھانوں اور یہودیوں میں مماثلت کو تسلیم کیا اور کہا کہ ہم بھی یہودیوں کی طرح بیٹی کو میراث میں حصہ نہیں دیتے لہذا ہم کیوں یہودی نہ ہوں گے۔ (صفحہ: 109)

برنس کی یہ دونوں دلیلیں انتہائی کمزور ہیں۔ افغانوں کے چہروں کا یہودیوں جیسا ہونا کسی بھی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کی آنکھوں کی رنگت اور ناک نقشے میں واضح فرق ہے۔ ہاں! گوری رنگت اور ڈاڑھی موٹچھوں میں مماثلت مانی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی تک یہودی عموماً ڈاڑھی رکھا کرتے تھے، مگر اب یہ مماثلت کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیوں کہ اب اکثر یہودی کلین شیو ہوتے ہیں۔ صرف ان کے کٹڑی ہی لوگ ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہود خود کئی نسلوں کا آمیزہ ہیں۔ ان میں گورے، کالے، سانولے، سرخ نیز ایشین، یورپین اور افریقن ہر قسم انسل کے لوگ نظر آتے ہیں۔

سب سے ہم بات یہ ہے کہ اگر صرف ظاہری شباهت سے تو قوموں کے نسب کا فیصلہ کر دیا جائے تو انساب گورکھ دھندابن جائیں گے کیوں کہ دنیا کی ہر قوم میں دوسری اقوام کی کچھ مشابہت مل جائے گی۔ آج ترکی میں بھی اکثر لوگ قزق قطع کے لحاظ سے یورپی معلوم ہوتے ہیں تو کیا انہیں فرنج، برٹش اور

جرمنوں کی اولاد قرار دے دیا جائے گا۔ عربوں کے چہرے پٹھانوں سے بہت ملتے جلتے ہیں تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ عرب پٹھانوں کی اولاد ہیں۔

جہاں تک امیر دوست محمد خان کے خود کو یہودی ماننے کا تعلق ہے تو یہ برنس کی ذاتی روایت ہے جس پر کس طرح اعتبار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ برنس مسلمانوں خاص کر افغانوں کا سخت دشمن تھا اور ان کو گمراہ کرنے کے لیے بڑے سے بڑا جھوٹ بول سکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی برنس (برنز) ہے جو شاہ شجاع کو کھ پتلی حاکم کے طور پر دوست محمد خان کی جگہ تخت کا بل پر بٹھانے میں پیش پیش رہا اور انجام کار اپنی سازشوں کے بدلے میں مجاہد افغانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

کہتے ہیں کہ ”جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔“ یہ بات برنس کی تحقیقات پر بالکل صادق آتی ہے۔ اس نے پیچھے ایک مثال دی تھی کہ افغان خود کو یہودی النسل مانتے ہیں مگر ”The Travel to Bukhara“ میں ایک مقام پر وہ خود اپنی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”افغان یہودیوں کے ساتھ شدید تعصب رکھتے ہیں اور کسی واضح دلیل کے بغیر خود کو بنی اسرائیل ماننے پر تیار نہیں ہوتے۔“ (جلد 1، صفحہ: 164)

ذرا آگے چل کر ”مدعی ست گواہ چست“ کا مصداق بنتے ہوئے لکھتا ہے:

”چونکہ بنی اسرائیل کے بعض قبائل مشرق کی طرف آئے تھے اس لیے ہم کیوں تسلیم نہ کریں کہ افغان انہی کی اولاد ہیں مگر اسلام لے آئے ہیں۔“ (صفحہ: 164)

مطلب یہ کہ افغان خود کو اپنے آپ کو یہودی النسل نہیں مانتے مگر ہم ان کا نسب بنی اسرائیل سے جوڑ کر ہر ممکن تحقیق کی دنیا میں ایسے بے بنیاد قیاسات اور متضاد بیانات کی جو حیثیت ہو سکتی ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔
والٹر بیلو کی فریب کاری: ایک اور انگریز مورخ ”ہنری والٹر بیلو“ نے افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کے لیے عجیب دلیل دی ہے، اس نے فارسی کی مشہور تاریخی کتاب طبقات ناصری کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم زمانے میں غور میں بنی اسرائیل نامی قوم آباد تھی جس کے ہمسایہ ملکوں سے تجارتی تعلقات تھے۔
 ہنری والٹر بیلو کا یہ حوالہ سراسر کذب بیانی ہے۔ طبقات ناصری میں صرف اتنا لکھا ہے کہ غور میں ایک یہودی تھا جس نے ہارون الرشید سے غور میں کچھ یہودیوں کو آباد کرنے کی اجازت حاصل کی تھی۔

(دیکھئے طبقات ناصری: 1/313)

اس میں کہیں بھی غور میں بنی اسرائیل کے آباد ہونے کا ذکر نہیں۔ ہنری والٹر ہی بتا سکتے تھے کہ طبقات ناصری کی عبارت سے قدیم زمانے میں غور میں قوم بنی اسرائیل کا آباد ہونا اور پوری افغان قوم کا

اس کی اولاد ہونا کسی طرح ثابت ہو سکتا ہے۔

جارج روز کا نظریہ: ایک مغربی محقق جارج روز نے افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کے لیے کئی کتابیں لکھی ہیں اور اس سلسلے میں عجیب و غریب دلائل دیے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتا ہے کہ اگر پٹھان یہودی النسل نہ ہوتے تو خود کو کبھی بنی اسرائیل نہ کہتے، اس لیے کہ افغان دوسرے مسلمانوں کی طرح یہودیوں سے بہت نفرت کرتے ہیں۔ (رکی قبائل اور مشرقی سلاطین: 31)

جارج روز کی یہ دلیل اس مسئلے پر بحث کرنے والے دوسرے مغربی محققین کے خلاف ہے جو کہتے ہیں کہ افغان اپنا یہودی ہونا چھپاتے ہیں۔ اب سوچئے کہ ان میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا!!!

جارج روز نے لکھا ہے کہ:

”بنی اسرائیل کے دس قبائل لاپتا ہو کر اپنے وطن سے دور چلے گئے تھے۔ یہ دس قبائل افغانستان پہنچ گئے تھے اور پٹھان انہی کی اولاد ہیں۔“

اپنے اس دعوے کی دلیل کے طور پر جارج روز نے مستشرقین کی عادت کے مطابق ہر طرح کی رطب و یابس روایات اور خرافات کو جمع کر دیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی کوئی دلیل مفید مطلب نہیں ثابت ہوئی۔ اصل یہودی روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلے تو ان کے ساتھ اولاد یعقوب کے بارہ قبائل تھے جن کے نام بنیامین، روڈین، یہودا، لاوی، جان اشیر، زیبولون، ساعر، یوسف، نفتالی، دان اور شمعون تھے۔ ان میں سے بنیامین اور یہودا فلسطین کے جنوبی علاقوں میں آباد ہو گئے اور وہی اب تک باقی ہیں۔ دیگر دس قبائل جو شمالی فلسطین میں سکونت پذیر تھے ادھر ادھر بکھر گئے اور دوسرے ملکوں میں جا کر لاپتا ہو گئے۔ انہیں ”دس لاپتا قبائل“ کہا جاتا ہے۔ مستشرقین کی کوشش ہے کہ افغانوں کا نسب انہی لاپتا قبائل سے جوڑ دیا جائے۔

مذکورہ مستشرقین کے علاوہ درجنوں مغربی دانشوروں نے اس مسئلے پر تحقیقات کا ایک انبار لگایا ہے جن میں ولیم مور کرافٹ، چارلس مین اور ہنری رادرٹی قابل ذکر ہیں۔ ولیم مور نے بھی پٹھانوں کی ظاہری شبہات کو ان کے یہودی النسل ہونے کی علامت قرار دیا اور چارلس مین نے ”درہ خیبر“ کو مدینہ منورہ میں یہودیوں کی بستی ”خیبر“ سے جوڑ کر اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ دنیا میں درجنوں شہر، دیہات اور مقامات ایسے ہیں جن کے ناموں کا تلفظ یکساں ہے، مگر دونوں الگ الگ زبانوں کے الفاظ اور الگ معنوں میں ہیں۔

ایک اور دلیل: یہودیوں کے انسائیکلو پیڈیا ”دائرة المعارف الیہودیہ“ میں کہا گیا ہے کہ یہودیوں کی

عبادت گاہوں کے گھنڈرات کامل میں موجود ہیں جو بخت نصر کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

(صفحہ: 224)

اس بارے میں اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ یہودی اپنی تہذیب کو قدیم ترین تہذیب ثابت کرنے کے لیے اپنے اثرات و باقیات کو دنیا کے کونے کونے میں ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ علاقوں کو اپنی تہذیب کا مرکز اور اپنا وطن قرار دے کر وہاں تسلط حاصل کرنے یا کم از کم وہاں تہذیبی و ثقافتی سرگرمیاں شروع کرنے کا بہانہ تلاش کر لیتے ہیں۔ چونکہ آثار قدیمہ اور تاریخ سمیت علوم و فنون کے اکثر شعبوں میں یہودی سب سے آگے ہیں، اس لیے ان کی تحقیقات کو کوئی مسترد بھی نہیں کر پاتا۔ تاہم ان کی سازش فطرت کے پیش نظر کسی کو آنکھیں بند کر کے ان کے انکشافات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

مدعی لاکھ یہ بھاری ہے گواہی تیری: دلچسپ بات یہ ہے خود یورپیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو افغانوں کے یہودی ہونے کی تحقیقات کو کھلی جعل سازی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً اسٹیورٹ الفنسٹن نے اپنی تصنیف Kingdom Of Kalavi میں صفحہ 156 سے 160 تک ان تمام روایات کی مدلل تردید کی ہے جن سے پشتونوں کو بنی اسرائیل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

”افغانوں اور یہودیوں کے درمیان بہت سی مشابہتیں پیش کی جاتی ہیں مگر ایسی مشابہتیں مختلف اقوام کی معاشرت میں عام مل جاتی ہیں۔ اگر یہ بات قوموں کے ایک ہونے کی دلیل ہو تو تاتاری، عرب، جرمن اور روسیوں کو بھی ایک مانا جائے۔“

اس طرح ایک اور نامور مستشرق برنارڈ ڈرون نے اپنی کتاب ”History of Afghans“ میں لکھا ہے کہ افغانوں کا یہودیوں کے ہم شکل ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ یہودی النسل ہوں ورنہ کشمیریوں کا بھی یہودی ہونا لازم آئے گا کیونکہ ان کی شکلیں بھی ایسی ہی ہیں۔

ڈرون نے اس نظریے کی بھی تردید کی ہے کہ پٹمان فلسطین سے آئے ہیں اور اس پر زور دیا ہے کہ یہ قوم شروع سے یہاں آباد چلی آئی ہے، کسی دوسرے ملک سے یہاں منتقل نہیں ہوئی۔

(صفحہ: 65 تا 80)

افغان اور بنو اسحاق: افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے والے بعض حضرات نے علامات قیامت سے متعلق ان احادیث سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک بنو اسحاق کے سر ہزار افراد جہاد کے لیے قسطنطنیہ پر پلغار نہ کر دیں۔

(مسلم حدیث نمبر 2920، متدرک حاکم حدیث نمبر 8606)

استدلال کے تحت کہا جاتا ہے کہ دیگر روایات کے مطابق قریب قیامت کے مجاہدین میں اہل خراسان یعنی افغانوں کی شرکت یقینی ہے، قسطنطنیہ کے یہ مجاہدین بھی جنہیں بنو احق کہا گیا ہے، قرین قیاس ہے کہ افغان ہوں گے، انہیں بنو احق اسی لیے کہا گیا کہ افغان بنو اسرائیل ہیں۔

مگر غور کیا جائے تو یہ استدلال امکان درامکان پر مبنی ہے سو نہایت کمزور ہے۔ یہ محض ایک امکان ہے کہ قسطنطنیہ کے جہاد میں افغان شریک ہوں گے۔ احادیث میں اس کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ یہ بھی محض ایک امکان ہے کہ اس جہاد میں شریک بنو احق، اسرائیلی نسل کے ہوں۔ وہ کسی اور نسل کے بھی ہو سکتے ہیں۔

اگر امکان کے طور پر مان لیا جائے کہ افغان قسطنطنیہ کے جہاد میں شریک ہوں گے، تب بھی یہ امکان ختم نہیں ہو جاتا کہ اس جہاد میں دوسری قومیں بھی شریک ہوں اور بنو احق سے وہ دوسرے لوگ مراد ہوں۔ یہ محض ایک امکان ہی ہے کہ جن بنو احق کی بات کی جا رہی ہے، وہ افغان ہوں گے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ قریب قیامت کی احادیث میں جہاں بنو احق کا ذکر آیا ہے وہاں اس بارے میں محدثین کے مختلف اقوال ہیں کہ یہ بنو احق کون ہوں گے؟ محدثین کا ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں بنو احق سے مراد بنو اسماعیل یعنی اہل عرب مراد ہیں۔ (ارج، شرح مسلم)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بنو احق سے یورپی اقوام مراد لی ہیں۔ وہ اس بارے میں فرماتے ہیں: ”اس (بنو احق) کے جہاد قسطنطنیہ میں شریک ہونے والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل روم (اہل یورپ) آخری زمانے میں اسلام لے آئیں گے، اور غالباً قسطنطنیہ کی فتح انہی میں سے ایک جماعت کے ہاتھوں ہوگی جیسا کہ حدیث ”انہ یغزوہا سبعون الفاً من بنی احق“ بتا رہی ہے۔ رومی (یورپی) حمیس بن احق بن ابراہیم کی اولاد ہیں، اس طرح وہ بنی اسرائیل کے چچا زاد ہیں جو یعقوب بن احق کی اولاد ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ آخری زمانے میں رومی (یورپی) بنی اسرائیل سے بہتر ثابت ہوں گے“ (النهاية فی الفتن والملاحم، ج: 1 ص: 30)

علمائے انساب میں سے علامہ نویری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بنو احق یا اسحاق بن جعفر بن طیار رحمہ اللہ کی اولاد کو کہا جاتا ہے۔ (النهاية الارب، ج: 2 ص: 360)

ایک قول یہ ہے کہ بنو احق سے مراد بنو ابوبکر صدیق رحمہ اللہ ہیں جن کی آبادی مصر میں صعید کے علاقے اشمونین میں ہے۔ (النهاية الارب، ج: 1 ص: 14)

تاریخ و تمدن اور لغت کے ماہر علامہ مقریزی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بنو احق وہ عرب قبیلہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رحمہ اللہ کے پڑپوتے طلحہ بن عبد اللہ کی اولاد سے ہے۔ طلحہ بن عبد اللہ سے تمیم قبیلہ چلے ہیں،

بنو اسحق، بنو قصدا اور بنو محمد (الیمان والاعراب بارض مصر من الاعراب، ج: 1، ص: 9)

علمائے لغت میں سے علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ بنو اسحق سے ”علوی“ مراد ہوتے ہیں۔

(تاج العروس، ج: 6، ص: 378)

پانچویں صدی ہجری کے ایک ممتاز مورخ ابو نعیم الاصفہانی لکھتے ہیں کہ اہل فارس (ایرانی) اولاد اسحق سے ہیں۔ (تاریخ اصفہان، ج: 1، ص: 9)

تاریکین اہل اثنیٰ اقوال، امکانات اور احتمالات کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ محض قیاس کی بناء پر افغانوں کو بنو اسحق اور بنو اسحق کو بنی اسرائیل قرار دے دیا جائے۔

خلاصہ بحث: اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ افغانوں کے اسرائیلی ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ آخر ان کا نسب کہاں جا کر ملتا ہے تو اتنا جان لینا کافی ہے کہ وہ بھی باقی سب کی طرح آدم و نوح علیہما السلام کی اولاد ہیں، بعض قبائل میں ہزار ہا بڑے ہزار سال کے انساب ضرور محفوظ ہو سکتے ہیں مگر اس سے آگے حتیٰ طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلے میں پیش کی جانے والی تمام تحقیقات قیاس آرائیوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں افغانوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی اکثر اقوام ہزار دو ہزار سال پہلے کی تاریخ میں اپنے حسب و نسب اور آباد اجداد کی تلاش میں یقینی طور پر کچھ نہیں بتا سکتیں۔ محققین کو نامک ٹوٹیوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم ادوار میں وہ ذرائع علم مفقود تھے جن کے ذریعے ایسی معلومات کو محفوظ کیا جاسکتا۔ قوموں کی تاریخ لکھنے کا کوئی مستقل رواج نہ تھا۔ حسب نسب عموماً زبانی یاد رکھے جاتے تھے مگر اس کا رواج بھی تمام قوموں میں نہیں تھا۔ ہاں عرب اس ذوق میں ممتاز تھے اور اپنے شجرہائے انساب زبانی یاد رکھا کرتے تھے۔ اس لیے عربوں کے انساب اسلام سے کئی صدیوں قبل تک محفوظ مانے جاتے ہیں، مگر ایک حد تک جانے کے بعد خود عربوں کا نسب بھی ترتیب وار محفوظ نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ محققین کے نزدیک صحیح احادیث کی بنا پر عربوں کے سب سے معزز قبیلہ قریش کا نسب بھی عدنان سے اوپر محفوظ نہیں ہے۔ تو کسی اور قوم کے بارے میں کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ اس کے تین چار ہزار سال قبل تک کے آباد اجداد کا ریکارڈ محفوظ ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ افغانوں کے حسب و نسب کی تلاش اور ان کے قدیم آباد اجداد کی کھوج درحقیقت کوئی ایسا مقصد نہیں تھا جس کو اتنی اہمیت دی جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ دس بارہ صدیوں تک افغانوں کے انساب محفوظ ہیں اور تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ افغانوں کے بیشتر قبائل پچیس تیس پشتوں تک اپنے آباد اجداد کے نامور بزرگوں سے واقف ہیں۔ نسب کی درستی، پہچان اور شرافت

کے لیے اتنا بہت کافی ہے۔ پھر یہ شرف کیا کم ہے کہ انہی افغانوں میں شہاب الدین غوری، احمد شاہ ابدالی، محمود غزنوی جیسے نامور فاتحین اور ابراہیم بن ادہم، شیعہ لجنی، امام ابو داؤد دجستانی اور امام بیہقی رحمہ اللہ جیسے بزرگوں نے جنم لیا حتیٰ کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے آباؤ اجداد بھی اسی سرزمین سے اٹھ کر عراق گئے تھے۔ ان شرافتوں کے ہوتے ہوئے افغانوں کو ہرگز ضرورت نہیں رہتی کہ وہ ماقبل از اسلام کے دور میں اپنے آباؤ اجداد کی جستجو میں سرکھپائیں۔ ظاہر ہے کوئی مسلمان خاندان جاہلیت کے دور میں اپنے کسی جد امجد کو دریافت کر بھی لے تو اسے کوئی مطلب حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ کوئی مسلمان اپنے جاہل اور بے دین آباؤ اجداد پر فخر نہیں کر سکتا۔ اسلام نے جھوٹے تفاخر کے یہ تمام بت توڑ دیے ہیں اور اسلام کو گلے لگانے والے افغان اسلام کی اس تعلیم سے خوب واقف ہیں۔

یہ پروپیگنڈا کیوں کیا گیا؟ اتنی بحث کے باوجود یہ بات اب تک واضح نہیں ہو سکی کہ آخرا افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دینے میں دانشوران فریب کو کیا مفاد نظر آیا اور اس لائینی بحث پر اتنا زور کیوں دیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں کوئی یقینی بات پختہ ثبوتوں کے ساتھ ہی کہی جاسکتی ہے جو دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم قرائن اور اشارات سے ایسا محسوس ہوتا رہا کہ شاید یہ خود یہودیوں کی ایک سازش ہو جس کے لیے مستشرقین سے کام لیا گیا ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط تک مستشرقین، احادیث کا اکثر ذخیرہ کھجال چکے تھے اور یہ بات یقینی سے کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے وہ احادیث پڑھ لی تھیں جن میں خراسان سے مہدی کے امدادی لشکر کے چلنے اور اس کی معاونت سے دجال کی فوج کی شکست کا ذکر ہے۔ استعمار کے ہر کاروں اور یہودی مستشرقین کو ان احادیث کی بنا پر یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہوگا کہ مستقبل میں خراسان (افغانستان) کے جری مسلمان ان کے سب سے بڑے حریف بن کر سامنے آ سکتے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ انہوں نے بنی ہند کے طور پر پہلے سے یہ تیاری شروع کر دی کہ افغانوں کے دلوں میں یہود کے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیا جائے۔ اس کا ایک ممکنہ طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ افغانوں کو جو کہ اپنے نسب کے بارے میں بے حد حساس ہوتے ہیں یہ یقین دلادیا جائے کہ نسلادہ خود بنی اسرائیلی ہیں۔

اس ہدف کو سامنے رکھ کر مستشرقین نے اپنے طریقہ واردات کے مطابق وہ رطب و یابس مواد تلاش کرنا شروع کیا جس سے ان کے مذکورہ موقف کی تائید ہوتی ہو اور نعمت اللہ ہروی جیسے مؤرخین کی عہادتیں ان کے کام آگئی ہوں۔

بظاہر ان مستشرقین کی اکثریت یورپ کے عیسائیوں پر مشتمل ہے مگر عین ممکن ہے کہ ان کی خاصی تعداد باطنائی یہودی ہو یا ان میں سے بہت سوں کو یہودی لابی نے دولت کے ذریعے اپنے مقاصد کے لیے

استعمال کیا ہو۔ دورِ حاضر میں یہودی جس طرح افغانوں کو یہودی النسل ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس سے اس تاثر کو مزید تقویت ملتی ہے کہ ماضی میں بھی یہ واقعات یہودیوں کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی۔

القدس العربی کا انکشاف: اب قارئین اس بات کا ثبوت ملاحظہ فرمائیں کہ واقعی افغانوں کے نسب کو امریکی یہودی سازش کے تحت تبدیل کیا جا رہا ہے، یہ محض ہمارا دعویٰ نہیں حقیقت ہے۔

عربی جریدہ القدس العربی اپنی 11 جنوری 2010ء کی اشاعت میں انکشاف کرتا ہے:

”اسرائیل افغانستان کے پشتون قبائل میں بڑے پیمانے پر اس خیال کو تقویت دے رہا ہے کہ وہ یہودی کی اولاد ہیں، اس طرح افغانوں کو یہودیت قبول کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس دعوت کے پیچھے ماڈی فوائڈ، پرکشش مراعات اور بیرونی دنیا میں رہائش اور معاش کی ترغیب بھی شامل ہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں اب تک بہت سے افغان یہودی بن چکے ہیں اور ان میں سے کئی اسرائیل نقل مکانی کر چکے ہیں۔“

مضمون نگار خطرہ ظاہر کرتا ہے کہ آگے چل کر یہ یہودی افغان دوسرے افغانوں کو یہودیت کی طرف مائل کریں گے اور لکھتا ہے:

”افغانوں کو یہودیت کی دعوت دینے کے لیے ایک طرف تو اسرائیلی خفیہ تنظیموں کے کارکن پرانے محققین کی عبارتوں سے تاریخی دلائل پیش کر رہے ہیں، اس کے علاوہ ان افغان زعماء کے اعتراضات کو بھی مشہور کیا جا رہا ہے جو خود کو یہودی النسل مان چکے ہیں۔ ان میں امیر دوست محمد خان کے علاوہ ظاہر شاہ کی مثال بھی دی جا رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ظاہر شاہ نے اپنا نسب یہودی قبیلے بن یا مین سے جوڑا تھا۔ نیز پشتو زبان میں یہودیت کی دعوت پر مشتمل لٹریچر بھاری پیمانے پر جنوبی اور مشرقی افغانستان میں پھیلا جا رہا ہے۔“

قارئین! کیا یہ انکشاف دل دہلا دینے والا نہیں کہ افغان یہودیت قبول کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہودی لابی اور مستشرقین کی دودھ سالہ کاوشیں رنگ لانے لگی ہیں۔ حالات کا یہ پہلو بھی بے حد عجیب ہے کہ یہودی اپنی ہزار ہا سالہ تاریخ میں پہلی بار کسی قوم کو اپنے مذہب کی دعوت دے رہے ہیں، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ یہودی کبھی اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے بلکہ اپنے مذہب اور عقائد کو سات پردوں میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی خوشی سے ان کا مذہب قبول کرنا چاہے تب بھی وہ اسے آسانی سے اپنے مذہب میں قبول نہیں کرتے۔ سو بارٹا لیتے ہیں، آزما تے ہیں، پھر کہیں جا کر موقع دیتے ہیں۔ تو افغانوں کو وہ خود یہودیت کی طرف کیوں مائل کر رہے ہیں۔ کیا وہ یقین کر چکے ہیں کہ اگر افغان یہودی نہ

جنے تو جلد ہی وہ مہدی کے لشکر کا حصہ بن کر اسرائیل کو فتح کرنے پہنچ جائیں گے۔

آخری بات یہ ہے اگر بالفرض کسی طرح افغانوں کو بنی اسرائیل ہونے کا یقین دلا بھی دیا جائے تب بھی ان شاء اللہ ان کی اکثریت کے ایمانی اور اسلامی تعصب میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہود کی چالیں انہی پر الٹ جائیں گی۔ ایمان ایسی چیز ہے جو دل میں بیٹھ جائے تو پھر اللہ اور رسول کی محبت کی خاطر سگے رشتوں کو قربان کر دینا بھی آسان ہوتا ہے۔ الحمد للہ! افغان مسلمان اس دولت سے پوری طرح مالا مال ہیں۔ اسی سرمایے کے بل بوتے پر انہوں نے دنیا کی تین سپر پاورز برطانیہ، روس اور امریکا کا غرور خاک میں ملایا ہے۔ اور اسی ایمانی قوت سے وہ مستقبل میں یہود کی عالمگیریت کا خواب چکنا چور کریں گے۔ انہی سطور پر ”تاریخ افغانستان“ کا سلسلہ ختم کرتا ہوں۔ پانچ سال سے زائد مدت گزری جب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی تاریخ سے سبق حاصل کرنے اور اسے آئندہ کے لیے مشعل راہ بنانے ہمت و توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)



گزشتہ اور موجودہ صدی کے افغان حکمران ایک نظر میں

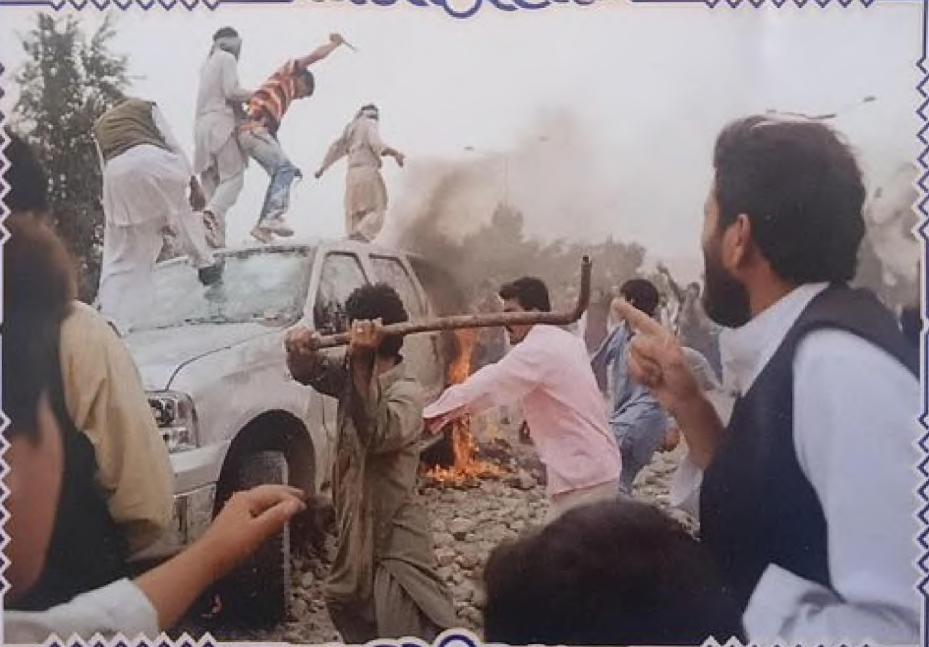
گزشتہ اور موجودہ صدی کے افغان حکمران ایک نظر میں

- ① امیر عبدالرحمن خان، اکتوبر 1881ء تا اکتوبر 1901ء
- ② امیر حبیب اللہ خان، یکم اکتوبر 1901ء تا 20 فروری 1919ء
- ③ امیر نصر اللہ خان، 20 فروری 1919ء تا 25 فروری 1919ء
- ④ شاہ امان اللہ خان، 25 فروری 1919ء تا 14 جنوری 1929ء
- ⑤ شاہ عنایت اللہ خان، 14 جنوری 1929ء تا 17 جنوری 1929ء
- ⑥ غازی حبیب اللہ (بچہ سقم)، 17 جنوری 1929ء تا 10 اکتوبر 1929ء
- ⑦ محمد نادر شاہ، 16 اکتوبر 1929ء تا 8 نومبر 1933ء
- ⑧ محمد ظاہر شاہ (آخری بادشاہ)، 8 نومبر 1933ء تا 17 جولائی 1973ء
- ⑨ سرد محمد داؤد خان، 17 جولائی 1973ء تا 27 اپریل 1978ء
- ⑩ نور محمد ترہ کئی، 27 اپریل 1978ء تا 16 ستمبر 1979ء
- ⑪ حفیظ اللہ امین، 16 ستمبر 1979ء تا 27 دسمبر 1979ء
- ⑫ ببرک کارمل، 27 دسمبر 1979ء تا 20 مئی 1986ء
- ⑬ نجیب اللہ، 20 مئی 1986ء تا 16 اپریل 1992ء
- ⑭ صبغت اللہ مجددی، 28 اپریل 1992ء تا 28 جون 1992ء
- ⑮ برہان الدین ربانی (صدر)، 28 جون 1992ء تا 27 ستمبر 1996ء
- ⑯ گلبدین حکمت یار (وزیراعظم)، 7 مارچ 1993ء تا جنوری 1994ء
- ⑰ ملا محمد عمر (امیر المؤمنین)، 27 ستمبر 1996ء تا نومبر 2001ء
- ⑱ حامد کرزئی، 22 دسمبر 2001ء تا حال





طالبان سے دوید و جنگ کے دوران امریکی فوجیوں کی بوکھلاہٹ۔



افغان شہری ایک احتجاجی مظاہرے کے دوران کابل میں امریکی سفارت خانے کے سامنے کھدی گاڑیوں کو توڑ پھوڑ رہے ہیں۔



جبل السراج جہاں طالبان اور احمد شاہ مسعود کے درمیان معرکے برپا رہے۔



سالانگ شاہراہ کی سرنگ جو مشرقی اور وسطی افغانستان کو شمالی صوبوں سے ملانے کا واحد راستہ ہے۔



سمرقند میں الخ بیگ کی تعمیر کردہ رصدگاہ



مزار شریف میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب مقبرہ



امریکی فوج طالبان کے ٹھکانوں کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے۔ چینیوک ہیلی کاپٹر فضا سے حملہ آور ہے۔



امریکی فوجی گاڑی روف میں دھنسی ہوئی ہے۔ امریکا کو یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہے۔



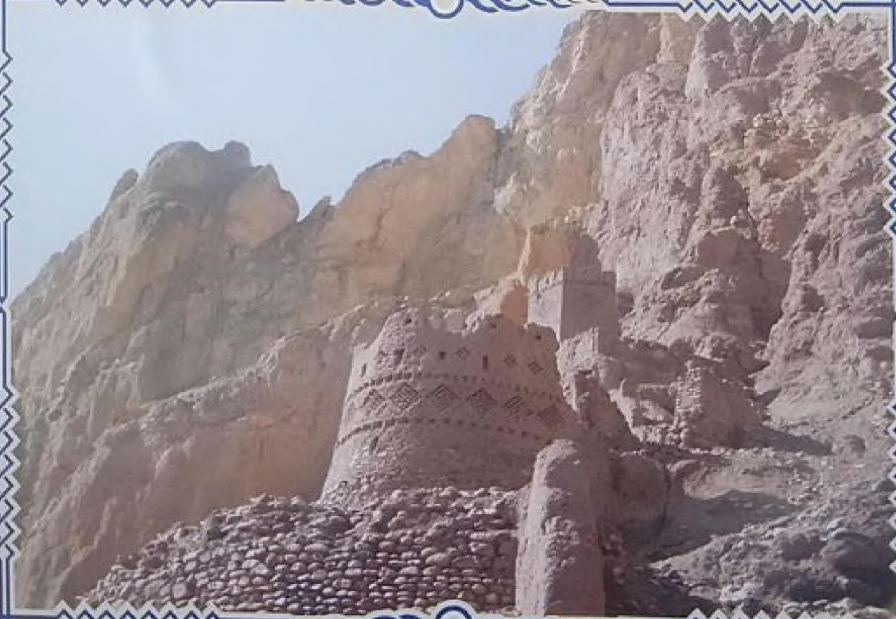
امریکی فوج سلطان محمود غزنوی کے شہر غزنی میں۔



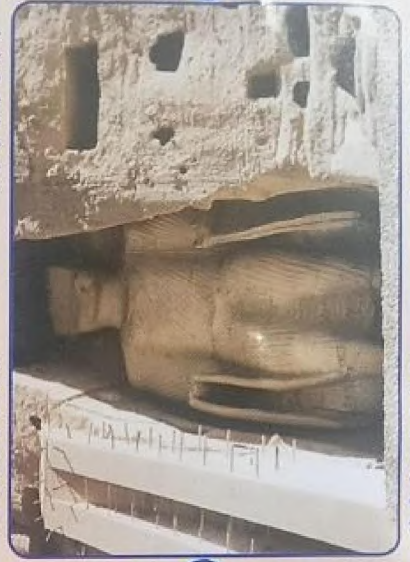
کابل میں امریکن یونیورسٹی..... امریکا تعلیم کے یہاں اپنی تہذیب و ثقافت کی کاشت کر رہا ہے۔



کابل کا شمال مشرقی صوبہ پروان، جہاں سلطان جلال الدین نے چنگیزی لشکر کو عبرت ناک شکست دی تھی۔



بامیان کا قدیم شہر اور قلعہ جسے چنگیز خان نے نیست و نابود کر دیا۔



سرونی کی خطرناک گھاٹی خالہان اسے عبور کر کے آنا گانا کابل میں داخل ہو گئے۔

باسمیان میں بدھا کا مجسمہ..... خالہان سے پہلے۔



خالہان کے ہاتھوں تباہ ہونے کے بعد صرف یہ نشانات رہ گئے۔

مبارہ ستمبر ۲۰۰۱ء..... ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاوروں پر طیاروں کا حملہ



۱۸ جنوری ۲۰۱۰ء کو کابل میں طالبان کے خودکش حملے کے بعد دھواں اٹھ رہا ہے، افغان فورس کے اہلکار تماشا دیکھ رہے ہیں۔



کابل میں طالبان کے حملے کے بعد شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ افغان بادشاہوں کا شہرہ مال شادی محل "دارالامان" نمایاں دکھائی دے رہا ہے۔



بلاک A-1، جوہر، ایف، قیو رشی روڈ، کراچی
0321-3135009 | 0321-2000870
almanhalpublisher@gmail.com
almanhalpublisher@hotmail.com
www.almanhalpublisher.com

کچھ اس کتاب کے بارے میں

تاریخ کی کتب قوم کی امانت ہوتی ہیں اور انہی پر قوموں کے تشخص کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ دور حاضر میں مستشرقین کی ایک پوری کھیپ ہماری تاریخ مسخ کرنے میں مصروف ہے۔ اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر ہم نے اپنے ماضی بعید کے ساتھ ساتھ قریبی ادوار کی تاریخ کو پوری احتیاط، دیانت داری اور صداقت کے ساتھ محفوظ نہ کیا تو اگلی نسلوں کے ہاتھوں میں تاریخ کے نام پر صرف وہی زہر آلود مواد ہوگا جو مستشرقین پیش کر رہے ہیں۔ افغانستان کی تاریخ خصوصاً ایسے فکری حملوں کا ہدف ہے۔ اہل مغرب آج میڈیا کے ذریعے وہاں کے غیور مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، کل کو اسی مواد سے وہ افغانستان کی ایسی تاریخ مرتب کریں گے جس میں ہمارے لیے جا بجا گمراہ پھندے بچھے ہوں گے۔

ان خطرات کے دفاع کے لیے ساڑھے پانچ سال قبل ہفت روزہ ضرب مومن میں ”تاریخ افغانستان“ پر مضامین کا آغاز کیا گیا۔ ابتدا میں میرا ہدف صرف قریبی دو عشروں کی تاریخ مرتب کرنا تھا۔ اس میں بھی سوویت یونین کے خلاف جہاد اور طالبان کے اسلامی دور کو خصوصی اہمیت دینا میرا محور تھا۔ مگر جب کام شروع کیا تو معلوم ہوا کہ افغانستان کا ہر دور اپنے سابقہ دور سے اس طرح بندھا ہوا ہے کہ اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ ویسے تو ہر قوم اپنے ماضی کی اسیر ہوتی ہے مگر اپنی اسلامی تاریخ اور روایات سے جس قدر مضبوط رشتہ افغانوں میں دیکھا جاتا ہے، دنیا کی کوئی اور قوم اسکی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیوں نہ افغانستان کے پورے اسلامی عہد کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور قارئین کو اس سیر میں اپنا ہم سفر بنالیا جائے۔

بائیں ہمہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تھا تو یہ توقع نہ تھی کہ اسے عوام و خواص میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوگی۔ راقم کو قارئین کی جانب سے ملنے والے بکثرت خطوط سے یہ اندازہ ہوا کہ الحمد للہ ہماری قوم خاص کر نوجوان طبقے میں اپنی تاریخ جاننے اور اس سے سبق حاصل کرنے کا زبردست ولولہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک بات اکثر خطوط اور پیغامات میں مشترک ہوتی تھی اور وہ یہ کہ اس سلسلے کو کتابی شکل میں ضرور لایا جائے۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر اب اسے کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

پہلا افغانستان پبلشرز



04599

بلاک A-1، گلستان جوہر، یونیورسٹی روڈ، کراچی

0321-3135009 | 0321-2000870

almanhalpublisher@gmail.com

almanhalpublisher@hotmail.com

www.almanhalpublisher.com

